فہرست مضامین رسالہ زمانہ جلد ۶۸ جنوری لغایۃ مئی ۱۹۳۷ء

تصاویر: مسٹر سلیم جعفر۔ حضرت آغا شاعر نظامی۔ ہز اکزالٹڈ ہائینس نواب سر میر عثمان علی خاں بہادر نظام دکن و برار
ہز مجسٹی شاہ جارج ششم، ہر مجسٹی ملکہ الزبتھ۔ لوازمات تاجپوشی۔ راجہ سر رام پال سنگھ مرحوم۔

حصۂ نثر

حصۂ نظم



زمانہ

جلد ۶۸ جنوری ۱۹۳۷ء

موسیقی

(از منشی جگیشورناتھ ورما بیتاب بریلوی، بی۔اے، ایل ایل بی)

فن موسیقی کی ابتدا کے متعلق کئی مشرقی روایات زبان زد خلایق ہیں، کہا جاتا ہے کہ نٹ راج "شنکر" نے عوام کو نٹ ودّیا کا سبق دیا۔ بعض قدیم کتب کے مطابق ہندی موسیقی یا سنگیت کلا سام وید سے مستنبط ہے۔ بہر حال اس میں شک نہیں کہ موسیقی ایک قدیم فن ہے، اور چونکہ فنِ رقص کی تمام و کمال حسن کاریاں لَے اور ترنّم کے تابع ہیں اس لئے بلحاظ قدامت موسیقی کو "نرتیہ کلا" یا فنِ رقص پر فوقیت حاصل ہے، پھر بھی یہ کہنا کہ سنگیت ودّیا یا علم موسیقی کی ابتداء، اختراعِ زبان ہی کے بعد ممکن ہے غلط ہے۔ اگر اس فن کے بنیادی اصولوں پر غائر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ اس کا آدھار "ناد" یا صوت (آواز) ہے۔ زبان سے اُسے بالواسطہ کوئی علاقہ نہیں ہے۔ لے (लय) بندی کا جو طور و طریق ماہرین نے مقرر کیا ہے، وہ محض آواز کے زیر و بم ہی تک محدود ہے۔ مثال کے لئے یوں سمجھئے۔ میگھ کو چھوڑ کر راگوں کی پانچ قسمیں گنائی گئی ہیں۔ اُن میں سے ایک خاص قسم کا نام دیش ہے۔ اس کی گت اس طرح پر منظم ہے:-

لے یا لہجہ کا اُتار چڑھاؤ	در	دا	در	وا	را	دا	دا	را	در
سُر (स्वर)	ساما	رے	ماما	پا	نی	سا	سا	سا	رے رے

دا	در	دا	را	دا را	دارا	دا را	
نی	پا دھا	ما	پا	نی دھا	پاما	گا رے	وغیرہ

متذکرہ گت کے بتانے کے لئے جن بے معنی و مہمل آوازوں کا استعمال ہوا ہے انھیں بعد میں سُروں میں مقیدّ کرلیا گیا ہے۔ جو سُر اوپر لکھے گئے ہیں اُن میں چڑھے "اُترے" اور قایم تینوں ہی سُر شامل ہیں۔ سُروں کی اس ترتیب و تقسیم سے آواز کے اُتار چڑھاؤ کا ادراک آسانی سے ہوسکتا ہے۔ اس میں شبہ نہیں۔ لیکن اگر سُروں کی امداد نہ لی جاتی تو بھی لَے کے قایم رکھنے میں کوئی امر مانع نہ ہوتا۔ اِس سے ظاہر ہے کہ غالبًا موسیقی ہی ابتدائے زبان کی غایت اور اس کا سرچشمہ ہے۔ اخذ و استنباط حروف و زبان کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس کا موجد لب و لہجہ کے بے شمار اختراعات سے کامل واقفیت رکھتا ہو۔ اور یہ یقینًا موسیقی ہی کا فیضان ہے کہ اُس نے اس تفریق کو بدرجۂ اتم واضح کیا۔ سنسکرت زبان کی تمام ابتدائی کتب نظم میں لکھی گئیں۔

اس کی وجہ صرف یہ ہے
کہ چونکہ فطری طور پر اس کی ابتدا موسیقی سے ہوئی، لہٰذا اس کی ساری کائنات پر سنگیت کا اثر و اقتدار قائم و برقرار رہنا لابدی تھا۔ اور شاید اسی لئے سنسکرت زبان کے حروف تہجی کے ذخیرے میں کرخت و ثقیل اور غیر موزوں حروف کا فقدان ہے۔

علاوہ بریں مشہور نقاد گرینگ لیمبرن کے خیال کے مطابق حسن خوبصورتی کے ساتھ موسیقی ذہن و دماغ میں مستور رہتی ہے۔ زبان پر آکر اس میں وہ خوبی باقی نہیں رہتی، اور جب لَے الفاظ کا جامہ پہن لیتی ہے تو وہ شعر کے سانچے میں ڈھل جاتی ہے۔ علمائے سنسکرت کی نگاہ میں موسیقی برہم ناد (ब्रह्म नाद) یا ذات مطلق کی آواز ہے۔ شیوجی کی رُدر وینا (रुद्रवीणा) انکا ڈمرو، "تانڈو نریتہ"، کرشن کی بانسری اور اُن کی رہتسیہ لیلا کی پیاری پیاری یاد اپنی دیرینہ لطافتوں کے ساتھ آج بھی لوگوں کے دل و دماغ پر چھائی ہوئی ہے۔ شعراء قدیم نے اسی رُدر وینا کو شیو کی رفیقۂ دلنواز، سوئی ہوئی پاروتی سے تشبیہ دیکر معجز بیانی کا پورا پورا حق ادا کر دیا ہے۔ دراصل یہی وہ محیط جزو کل موسیقی ہے جس کا راگ افلاطون اور فیثا غورث برسوں گاتے رہے ہیں۔

پاروتی کا نظر فریب رقص (لسیہ نریتہ) رُدر وینا کی جھنکار اور پکھاوج کی گونج، کرشن کی بنسی

کی تان اور رادھا کا برت (व्रत) اور کتھک ناچ (कत्थक नृत्य) آپس میں اس درجہ مخلول و مربوط ہیں کہ اب ان میں سے کسی ایک کا دوسرے کے بغیر تصور بھی نہیں کیا جاسکتا. صرف یہی نہیں بلکہ اس ہم آہنگی کا یہ عالم ہے کہ اس کا خیال آتے ہی دل پر تقدیس مذہب کی ایک ایسی روحانی کیفیت، ایک ایسا سرور سرمدی مسلط ہو جاتا ہے کہ جس کے نشہ میں یونان کے بڑے بڑے حکمار و فیلسوف برسوں سر دُھنتے رہے ہیں.

شاعرانہ روایتوں سے قطع نظر کوئی نہیں کہہ سکتا کہ کب اور کس طرح اس فنِ لطیف و بلیغ کی نشوونما ہوئی۔ تاہم جن مستند ذرائع سے اس کی قدامت پر روشنی پڑتی ہے، اُن کی مختصر کیفیت یہ ہے:-

(۱) "رگ وید" بلاشبہ دنیا کی اوّلین تصنیف ہے۔ اور اس میں موسیقی نیز مروّجہ سازوں کی جو تفصیلات درج ہیں وہ اس امر کا ناقابل تردید ثبوت ہیں کہ یہ فن اس کی ترتیب سے بہت پہلے پایۂ تکمیل کو پہنچ چکا تھا۔

(۲) سام وید، رگ وید کے بعد کی تصنیف ہے اور علم موسیقی کے جملہ قواعد و ضوابط اور انداز و اسلوب کا ماخذ ہے۔ اور اس حقیقت کا آئینہ دار ہے کہ شاعری موسیقی کی عملی طور پر کامل نشوونما کے بعد عرصۂ ظہور میں آئی۔

(۳) رامائن میں مذکور ہے کہ راکششوں اور بانروں کے سرتاج راون اور سگریو تک کو اس فن میں کامل مہارت حاصل تھی۔ ان کے درباروں میں اپسراؤں اور رامشگروں کا مستقل طور پر ملازم ہونا بھی ثابت ہے۔

(۴) "شیو پران" جس میں شیوجی کے ناچنے اور برہما کے ڈھول بجانے کا حال مندرج ہے۔

(۵) بھرت ناٹیہ شاستر جس میں شرح و بسط کے ساتھ اس فن کی باریکیوں سے بحث کی گئی ہے

(۶) "ناٹیہ شاستر" پر لکھی گئی بے شمار شرحیں اور تنقیدیں جن کا مقصد تالیف شاستر کے مطالب کو واضح کرنا اور عام فہم بنانا تھا اور جو اس کے بعد رقم ہوئیں۔

(۷) تامل ادبیات مثلاً سلپٹری گرام جو اس امر کی شاہد ہے کہ دراوڑوں کا فن موسیقی ایک آزادانہ حیثیت کا مالک تھا۔ سلپٹری گرام کا مصنف غالباً بھرت منی کا ہمعصر و ہم عہد تھا۔

(۸) سانچی و امراوتی کے سنگین مرقعے اور غارہائے اجنتہ و ایلورا کی دیواروں پر کی مصوّری۔

(۹) "سنگیت رتناکر" یہ تیرھویں صدی عیسوی کی مشہور تصنیف ہے، اس کا مصنف سارنگ دیو

اپنے عہد کا بہت بڑا راگی گذرا ہے۔ اس نے ناٹیہ شاستر کی مذکورہ راگ راگنیاں سُرتیوں میں باندھی ہیں۔

(۱۰) راگ ترنگنی۔ یہ لوچن کوی کی جدتِ فکر کی رہین ہے جو تقریباً پندرھویں صدی کے آخری حصہ تک پایۂ تکمیل کو پہونچی۔ راگ ترنگنی میں جملہ راگ راگنیوں کو بارہ مختلف ٹھاٹھوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ بھرت کھنڈے اور اُن کا اسکول آج بھی اسی مقررہ نظام کا دم بھرتے چلے آتے ہیں۔

(۱۱) راگ وِبودھ (राग विबोध) سولھویں صدی کے اوائل میں لکھی گئی۔ اس کے لائق مصنف سومناتھ نے راگ راگنیوں کی مزید تقسیم کر کے "جنکوں" اور "جنینیوں" کو ترویج دی۔

(۱۲) چتر دھونی پریکشک (चतुर ध्वनि परीक्षक) مصنفہ "ونکٹم اکھی" اس سلسلہ کی آخری کتاب کہی جا سکتی ہے۔ کہتے ہیں کہ تان سین نے بھی اس موضوع پر خامہ فرسائی کی تھی لیکن اب اس کی تصانیف نایاب ہیں۔

موسیقی ہندوؤں کے شہرۂ آفاق کمالات میں سے ایک ہے۔ عرب، جن کا قاسم کے حملہ سے صدہا سال پیشتر سے اہلِ ہند سے تجارتی و تمدنی تعلق چلا آتا ہے انھیں اس فن کا لاثانی استاد تسلیم کرتے ہیں۔ نویں صدی عیسوی میں بغداد کے ادبی حلقوں میں اِس امر کی بحث و تمحیص چھڑی کہ سیاہ و سفید اقوام میں علم و فضل کے اعتبار سے کون افضل و برتر ہے، اور ان میں سے اولیت کا سہرا کس کے سر ہے؟ اِن مباحثوں میں بڑے بڑے علماء، ادیب، مناظر اور منتہی شریک ہوئے، اب ان مجالس مناظرہ کی تفصیلی کیفیت ناپید ہو چکی ہے، تاہم یادگار کے طور پر ایک بہت مختصر سا تذکرہ ہنوز باقی ہے۔ جس کا عنوان سیاہ اقوام کی سفید قوموں پر فوقیت ہے۔ جس سے اِس طول طویل بحث و مباحثہ کا انجام بخوبی روشن ہے۔ یہ معرکہ آرا رسالہ مشہور عرب مصنف جاحظ کی تصنیف ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ "علوم و معارف کے وسیع میدان میں ہندوستانی گوروں سے بھی پیش پیش ہیں، اور جہاں تک علمی و فنی کمالات کا تعلق ہے مشرق کی دیگر سیاہ اقوام ان کا مقابلہ نہیں کر سکتیں۔ بت تراشی، تصویر سازی اور مجسموں وغیرہ کے بنانے میں تو وہ بہر طور طاق ہیں لیکن رنگ آمیزی، میناو پچیکاری اور دیگر ہر نوع کی صنعتوں میں بھی ان کا جواب نہیں ہے۔ وہ شطرنج کے موجد ہیں جو اجرام فلکی اور نجوم کی گردش کا بہترین خاکہ اور دیدہ ریزی و دماغ سوزی کا بے عدیل مشغلہ ہے، ہندوستانی نفیس تلواریں بناتے اور ان کا بہترین استعمال بھی جانتے ہیں، اُن کا گانا ہوش رُبا ہوتا ہے......"

دنیا کی تاریخ زبانِ حال سے پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ جب مختلف النسل اقوام کا آپس میں ربط و ضبط بڑھتا ہے اور مختلف النوع تہذیبوں کا باہم تصادم ہوتا ہے تو اس ارتباط و اختلاط کا کم و بیش اثر فریقین کی بود و باش، رہن سہن، تہذیب اور تمدن پر لازمی طور سے پڑا کرتا ہے۔ جس کا عکسِ لطیف ان کے علم و ادب کے آئینوں میں صاف نظر آتا ہے، اور اس اجتماع سے جہاں علوم و فنون کی ترقی ہوتی ہے وہاں ایجاد و اختراع کا میدان بھی وسیع تر ہوتا جاتا ہے۔ چنانچہ مغربی اقوام کی پیہم یورشوں سے دوسری صنعتوں کی طرح موسیقی بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہی۔ مسلم فاتح عربوں اور ایرانیوں کا اندازِ موسیقی اپنے ساتھ لے کر آئے۔(۱) ابراہیم موصلی اور زریاب اسپینی نہ صرف بلادِ مغرب کی موسیقی کے مروجہ اصولوں کا علم رکھتے تھے۔ بلکہ انھیں اس فن میں عملی طور پر یدِ طولیٰ حاصل تھا۔ ان لوگوں کی مساعی جمیلہ کا ہندی موسیقی کی موجودہ روش پر بہت کچھ اثر ہوا۔ زمانۂ حال کی موسیقی بلاشبہ اسی نوع کی متفقہ کوشش کا خوشگوار نتیجہ ہے۔ جس میں عرب، پارسی، ایرانی، عیسائی، ترک اور انگریز سبھی برابر کے حصہ دار ہیں۔

نئی نئی دھنوں کی دریافت سے لے کا میدان وسیع ہوتا گیا۔ جس سے اصنافِ موسیقی میں معتد بہ اضافہ ہوا اور نئی نئی طرزیں نکل نکل کر سامعہ نوازی کا دم بھرنے لگیں۔ جن کا ساتھ کرنے کے لئے طرح طرح کے ساز بھی عرصۂ ظہور میں آئے۔ غزل، قوالی، ٹھمری، لہرا اور دادرے کی طرح دلربا، معشوق، سرود، سارنگی، عود اور بیلا وغیرہ دل کو لبھانے لگے۔ تان پورا (طنبورہ) کو دیکھ کر امیر خسرو نے سہ تار یا ستار کی داغ بیل ڈالی۔ طبلہ، ہارمونیم، پیانو، کلارینٹ یورپ سے نکل آئے بلبل ترنگ جاپان سے آگیا، اور بہت سے پرانے والو نیتروں مثلاً گلترنگ و نسترنگ وغیرہ کا جواب نفیری اور مشک وغیرہ سے دیا گیا۔ یہ سب کچھ ہوا لیکن اس ہنگامہ آرائی سے موسیقی رفتہ رفتہ پست مذاقی کا شکار ہوتی چلی گئی۔ اور جب اس پر عامیانہ رنگ غالب آگیا تو ایک دن وہ بھی آیا کہ لوگ اس سے متنفر ہونے لگے۔ اس افراتفری کے زمانہ میں بھی ہندو اساتذۂ فن نے ہمت نہ ہاری اور برابر قدما کی تقلید کر کے پرانے انداز و اسلوب کی حفاظت کرتے رہے۔ چنانچہ آج بھی یہ علم اپنی اسی پرانی شان و شوکت کے ساتھ سینہ بسینہ چلا آرہا ہے۔ اور دلیپ کمار رائے و اودے شنکر جیسے اہلِ کمال کی منڈلیاں اطرافِ عالم میں اس کا مظاہرہ کر کے مہذب دنیا کو مسحور و متحیر کر رہی ہیں۔ اور اب اس کے ابتذال کا بظاہر کوئی امکان باقی نہیں ہے۔ پھر بھی

ماننا پڑے گا کہ نوواردوں کی اُپج سے ہندی موسیقی میں قابل ذکر ترمیم و توسیع ہوئی۔ قدیم راگ راگنیوں کے روپ میں تو کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی لیکن کہیں کہیں رنگ و روغن ضرور چڑھایا گیا ہے۔ اور اس طرح ہندو ماہرین نے غیر ملکی مطربوں اور مغنیوں کی خوش الحانی سے محظوظ ہو کر نئی نئی دُھنوں کے مطابق اُن کی چال، تان اور مُرکیوں میں مزید خوبی و خوبصورتی پیدا کرلی ہے۔ دراصل یہی کوشش و کاوش موسیقی کے موجودہ اسکولوں کا سنگ بنیاد ہے۔

خسرو ہندی اور ہندوستان کا مشہور شاعر گذرا ہے۔ وہ دراصل ترک تھا۔ لیکن سرزمین ہند سے اُسے دلی لگاؤ تھا۔ اُس نے اپنی ایک مشہور نظم میں دس وجوہ کی بنا پر مادرِ ہند کو ساری دنیا پر ترجیح دیتے ہوئے تمام علوم و فنون کا گہوارہ تسلیم کیا ہے۔ راگی کی حیثیت سے خسرو کو غیر معمولی کامیابی نصیب ہوئی۔ اپنے پیرو مرشد شیخ نظام الدین اولیاؒ کی مدح سرائی کے لئے اُس نے موسیقی کی طرز جدید قوالی کی طرح ڈالی، اس کے علاوہ اور بھی کتنی ہی نئی طرزوں کی ایجاد کا سہرا اُس کے سر ہے۔ مشہور ہے کہ اُس نے غزلیات کو کچھ ایسے انوکھے انداز سے پیش کیا کہ خود اُس کے پیر صاحب بھی وجد میں آ کر ناچ اُٹھے، اور درویشانہ رقص کے (جو ایک خاص قسم کا حال یا وجدانی کیفیت ہے) ریلے میں بہہ گئے۔ تب سے قوالی آج تک اظہار عقیدت و ارادت کا آلہ کار سمجھی جاتی ہے۔ اور اسے درویش منش و متصوفین کے پسند خاص ہونے کا فخر حاصل ہے۔ شہرۂ آفاق جاپانی پروفیسر یون نوگوچی Yone Noguchi نے قوالی کو بہت پسند کیا اور اس کی تعریف بھی کی۔

خسرو نے راگوں کی ایجاد کے ساتھ ساتھ بہت سے گانے بھی لکھے ہیں، جن میں دیہاتی لڑکیوں کے جذبات کی بہترین ترجمانی کی ہے۔ اِن گیتوں میں درد، سوز، گداز سب کچھ ہے۔ اسی لئے وہ ابھی تک دیہات کے بچّہ بچّہ کی زبان پر چڑھے ہوئے ہیں۔ اُردو زبان کی ابتدائی تاریخ شاہد ہے کہ اس عہد کے ہندو مسلمان موسیقی کی سحرکاریوں پر بے طرح مٹے ہوئے تھے۔ اُردو کا پُرانا نام ریختہ ہے۔ ریختہ کے معنی راگ کے ہیں۔ جو اس امر کی بیّن دلیل ہے کہ اُردو کی ابتدا شاعری سے ہوئی۔

علاء الدین خلجی کے حملۂ دکن کا مفصل حال تاریخ ہند میں محفوظ ہے۔ لکھا ہے کہ خلجی جب دکن سے بہت سامال غنیمت لیکر واپس ہوا تو بعض باکمال ہندو راگی اس کے ہمرکاب تھے۔ سترھویں صدی عیسوی کی مشہور فارسی تصنیف 'راگ درپن' میں لکھا ہے کہ ایک دکنی راگی اپنا کمال دکھانے کے لئے

دور دراز مسافت طے کرکے خسرو کے آقا سلطان خلجی کے دربار میں باریاب ہوا تھا۔ وجے نگر کا گوپال نائک نامی گویا اپنے عہد کا بے جوڑ مغنی تھا۔ وہ اپنے بارہ سو شاگردوں کے ساتھ پالکی پر سوار ہو کر اقطاع ہند کی سیاحت کرتا پھرتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس طویل سفر کا مقصد تیرتھ یاترا کے سوا اور کچھ نہ تھا لیکن جہاں اس کا گذر ہوتا اُس کے کمالات کا سکہ لوگوں کے دلوں پر بیٹھ جاتا، اور اس کی تحصیل و تکمیل کی شہرت سے ایک عالم گونج اُٹھتا۔ ہوتے ہوتے خلجی سلطان نے بھی اُس کی آمد آمد کا غوغا سُنا اور اُسے اپنے جوہر دکھانے کے لئے دربار میں طلب کیا۔ دلی میں بڑے کروفر کے ساتھ اس کے استقبال کی تیاریاں کی گئیں۔ جب خسرو نے یہ حال دیکھا تو ایک ضروری کام کا عذر پیش کرکے سلطان سے چند یوم کی رخصت کی درخواست کی، اور اپنے مربی سے اجازت حاصل کرکے دلی ہی میں روپوش ہو گیا گوپال خاص اہتمام کے ساتھ دربار میں لایا گیا۔ جب وہ سلطان کے حضور میں اپنے کمالِ فن کا مظاہرہ کر رہا تھا تو خسرو تختِ شاہی کے نیچے چھپا ہوا گوپال سے سبقت لے جانے کی دُھن میں منہمک تھا۔ چھ روز تک خسرو برابر اسی طرح نائک موصوف سے غائبانہ تکمیلِ فن کرتا رہا اور ساتویں دن اُس نے بھرے دربار میں اس سے ملاقات کی۔ دوران گفتگو میں اس نے شاہی مہمان سے کچھ سننے سنانے کا اشتیاق ظاہر کیا۔ گوپال نے اس کی فرمایش پر جو راگ چھیڑا خسرو نے اُسی کو مزید خوبصورتی کے ساتھ بجا کر دکھا دیا۔ گوپال نے اس ترمیم و اضافہ کی اُسے دل کھول کر داد دی۔ بالآخر نقل و تقلید سے فرصت پا کر خسرو نے نئی نئی ایرانی طرزیں بھی معزز مہمان کی خدمت میں پیش کیں لیکن یہ ساری کہانی "ایجادِ بندہ" سے زیادہ وقیع معلوم نہیں ہوتی ع

بڑھا بھی دیتے ہیں کچھ زیبِ داستاں کے لئے

جیسا کہ خود خسرو رقمطراز ہے کہ اُس نے ایک دکنی راگی سے شاعری و موسیقی کی اہمیت پر مجادلہ و مناظرہ کیا تھا۔ اس علمی بحث میں خسرو بحیثیت شاعر شاعروں کا جانبدار تھا اور اُس کا حریف راگیوں کی نمایندگی کر رہا تھا۔ جانبین سے خوب خوب مدلل و مشرح تقریریں ہوئیں لیکن معلوم نہیں کہ میدان کس کے ہاتھ رہا۔ (پھر بھی اس واقعہ سے صاف طور پر ظاہر ہے کہ یہ نوبت اُسی وقت پہنچی ہو گی جب موسیقی کے میدان میں خسرو کو اپنے مدمقابل سے زک اُٹھانی پڑی ہو گی۔ اور اُس نے یہ خفت مٹانے کیلئے شاعری کو موسیقی سے لطیف تر فن کا ماہر بتا کر اپنی فضیلت و برتری کا دعویٰ کیا ہو گا۔ اور یہ یقین کر لینے کے لئے کہ خسرو کا فریق ثانی گوپال نائک کے سوا دوسرا کوئی نہیں ہو سکتا کافی وجوہ موجود ہیں۔) گوپال کے متعلق مذکور ہے کہ وہ نہ صرف فنِ موسیقی کا استاد تھا بلکہ

جملہ علوم و معارف کا فاضل اور زبردست مقرر و مناظر بھی تھا۔

ناٹیہ شاستر میں مندرج ہے کہ راگی کو موسیقی کی عملی تعلیم لینے اور ریاض شروع کرنے سے پیشتر فنی اصول و قواعد کا عالم کامل ہونا ضروری ہے۔ اس کے بعد سرسادھن یا ابتدائی مشق کی جانب متوجہ ہونا چاہیئے۔ جبتک کوئی شخص اس میدان میں علم و عمل کے زیور سے پوری طرح آراستہ نہ ہو نائک یا گندھرو نہیں کہلا سکتا۔ گوپال نائک ہر اعتبار سے اِس فن میں یکتائے روزگار تھا۔

محمد تغلق کے عہدِ حکومت میں دولت آباد میں ایک گول کمرہ تعمیر ہوا تھا جس میں ماہرِ فن راگیوں کا اجتماع ہوتا تھا، اور گندھرو ودّیا کے بڑے بڑے پنڈت ایک دوسرے کے مقابلہ میں دادِ فن دیا کرتے تھے۔ شاہ زین العابدین بڑا متقی، عالم متبحر اور سنسکرت و تبتی زبانوں کا فاضل تھا۔ موسیقی میں بھی اُسے خاصہ دخل تھا۔ موسیٰ سلطان شرقی والیِ جونپور کو بھی اس فن سے خاص شغف تھا اور پیچیدہ سے پیچیدہ دُھنوں کی ادائیگی میں پورا ملکہ حاصل تھا۔ چنانچہ مشہور جونپوری دُھن اُسی کے نام سے منسوب ہے۔

مغل بادشاہوں نے جس طرح اس فنِ لطیف کی سرپرستی کی۔ اس کی مثال بہت کم ملتی ہے۔ تان سین اکبری دربار کے نورتن کا ایک رکن خاص تھا۔ یہ مغلوں کی غیر معمولی قدردانی کا ایک روشن ثبوت ہے۔ بابر نے اپنی تزک میں درباری گویّوں کے کمال پر استادانہ تنقید کی ہے۔ وہ ایک گویّے کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ "شبانی خاں نے جب اُسے مدعو کیا تو وہ خالی ہاتھ بزم میں چلا آیا۔ اپنے ساتھ کوئی باجہ نہ لانے کی وجہ چاہے کچھ بھی ہو لیکن اس میں ذرا بھی شک نہیں ہے کہ وہ بڑا بددماغ اور مغرور تھا۔ اپنے سامنے دوسروں کی کچھ اصل نہ سمجھتا تھا۔ پھر بھی اُس نے بار بار فرمایش کئے جانے پر بڑے تکلف کے ساتھ ساز پہ ہاتھ رکھا اور انتہائی توقف کے بعد جو کچھ بجایا وہ اتنا بھدا بُرا اور غلط تھا کہ شبانی نے اس کو انعام و اکرام دینے کے بجائے اُس کی گردن پر گھونسے لگاکر نکال دینے کا حکم دیا، اور یہی وہ اچھا کام تھا جو شبانی نے اپنی تمام زندگی میں کیا......"

پندرھویں صدی میں ترہت کے فرمانروا راجہ شیو سنگھ کے دربار میں ودّیاپتی بڑا مشہور شاعر اور مغنی ہوا ہے۔ محمد شاہ کے دربار میں محمد علی خاں اور وزیر خاں موسیقی کے دو بڑے اُستاد ہوئے ہیں۔ شاہجہاں کے دربار میں جگناتھ اس فن میں اپنا ثانی نہیں رکھتا تھا۔ مغل بادشاہ نے اُسے کویراج کا خطاب عطا کیا تھا۔ اور اُسے ایک دوسرے راگی کے ساتھ چاندی میں تول دیا تھا۔ تیموریہ

تیاگ راج کی کچھ ایسی ہوا بندھی کہ پھر ان کے بعد کسی دوسرے کا چراغ روشن نہ ہوسکا۔

ابوالفضل نے آئین اکبری میں ۳۶ گویوں کا ذکر کیا ہے۔ مشہور ہندو راگی تان سین گوالیار کا رہنے والا تھا اور راجہ رامچند بندیلہ حکمراں کے دربار میں ملازم تھا۔ کہتے ہیں کہ دنیا آج تک تان سین کا جواب پیدا نہیں کرسکی۔ گوالیار کا راجہ مان سنگھ تنوار بھی بڑا ماہر راگی تھا۔ دھرپد طرز اسی کی اُپج ہے۔ راجہ تان سین کی بڑی قدرومنزلت کرتا تھا اور اُسے ایک ایک گانے پر ایک ایک لاکھ ٹنکہ انعام دیا کرتا تھا۔ اکبر کے تان سین کو اپنے دربار میں طلب کرنے پر راجہ اس کی پالکی پکڑ کر کچھ دُور تک اُسے پہنچانے بھی گیا تھا۔ تان سین کے خاندان والے ہنوز الور میں مقیم ہیں۔ تان سین اکبر کے دربار میں آکر بھی ہمیشہ دلگیر و دل گرفتہ رہتا تھا۔ اُسے اپنے پیارے وطن کی محبت اور پہلے آقا کی مفارقت نے کبھی چین سے نہ بیٹھنے دیا۔ اکبر اس کی بے حد خاطر و مدارات اور ہر طرح دلجوئی و دلداری کرتا رہتا تھا لیکن اس کے باوجود بھی تان سین اُسے ہمیشہ بائیں ہاتھ سے سلام کیا کرتا۔ اس کا قول تھا کہ داہنا ہاتھ تو صرف راجہ کی سلامی کے لئے مخصوص ہے۔ اور اب وہ کسی دوسرے شخص کی تعظیم و تکریم کے لئے نہیں اُٹھ سکتا۔ ایک روز تان سین اکبر کی ہمراہی میں شاہی باغ میں ٹہل رہا تھا پیڑوں کے جھنڈوں میں سے گزرتے ہوئے اس کی نظر ایک پیڑ پر لٹکتے ہوئے پختہ آم پر جا پڑی تان سین نے اُسے ہاتھ بڑھا کر توڑنا چاہا، بیچارہ بہت کچھ اُچھلا کودا، ڈالیں جھکائیں لیکن دسترس نہ ہوئی۔ اکبر اُسے مایوس و مجبور دیکھ کر اُس کے سامنے جُھک گیا اور ہنستے ہوئے بولا "آؤ! میری پیٹھ پر سوار ہوکر اسے توڑ لو۔" تان سین نے فوراً دونوں ہاتھ باندھ کر اکبر کو مجرا کیا۔ یہ پہلا دن تھا کہ بادشاہ کو اپنے حسنِ اخلاق سے اس کا دل موہ لینے میں کامیابی ہوئی۔ تان سین بھی اس سے پہلے یہ نہ جان سکا تھا کہ مغل شہنشاہ اس کی اتنی توقیر کرتا ہے۔ اکبر کو دراصل اس کا اس قدر احترام منظور تھا کہ وہ اُسے "میاں تان سین" کہا کرتا تھا۔ (یہ بھی مشہور ہے کہ تان سین نے اسلام قبول کرلیا تھا لیکن قرائن سے یہ بات صحیح نہیں معلوم ہوتی ہے)

ابراہیم عادل شاہ والیٔ بیجاپور موسیقی کا مسلّم الثبوت استاد ہونے کے علاوہ صاحبِ طرز بھی تھا۔ اکبر نے اسد بیگ کو کئی گویوں کی جماعت کے ساتھ اس غرض سے بیجاپور بھیجا تھا کہ وہ وہاں جاکر عادل شاہ سے نئی نئی طرزیں سیکھ آئیں۔ کہتے ہیں کہ ایک بار تان سین ایک بہت بڑے نامی گرامی گویئے سے جو "مرھونانک" کے خطاب سے مشرف تھا اور بلگرام میں رہتا تھا بنفس نفیس ملنے گیا تھا۔ اثنائے سفر میں وہ ایک کنوئیں کے قریب پیپل کے درخت کے سایہ میں خیمہ زن ہوا۔ شام کے وقت جبکہ تان سین موج میں

تان اُڑا رہا تھا۔ کنوئیں پر بہت سی لڑکیاں پانی بھرنے کے لئے جمع ہوگئیں، اتفاقاً ایک لڑکی کا کلسہ کنوئیں کی جگت سے ٹکرا کر بج اُٹھا، اِس پر دوسری لڑکی نے چیں بہ جبیں ہو کر کہا "کیسی بُری آواز ہے اسکی؟ جس میں نہ کچھ لَے ہے نہ تال!" یکبارگی سارا مجمع قہقہہ مار کر ہنس پڑا۔ بات یہ تھی کہ تان سین اپنے گلے کی خرابی کی وجہ سے کچھ کنسرا ہوگیا تھا اور شوخ لڑکیوں کو اس کا مضحکہ اڑانے کا موقع مل گیا تھا۔ تان سین بھی سمجھتا تھا۔ اُس نے فوراً اپنی غلطی کا احساس کر کے مناسب اصلاح کر لی۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ موسیقی کا شوق کتنا عالمگیر اور اس کا صحیح ادراک کتنا عام تھا۔ دکن میں باز بہادر نامی ایک اور نامدار فنِ موسیقی کا یکتا اُستاد ہوا ہے۔ یہ اکبر کا ہمعصر تھا۔

محققین نے کلا (فن) کی دو قسمیں مانی ہیں:-

(۱) اُتم (उत्तम) یا اعلیٰ، اور

(۲) مدھم (मध्यम) یا اوسط۔

حسن کاری کی کوئی تیسری قسم نہیں ہے، شاید اسی لئے آرٹ کی نامشکور مساعی کو تھرڈ کلاس یا تیسرے درجہ کی بتا کر ناپسندی کا اظہار کیا جاتا ہے۔ جو کلا مورت آدھار (मूर्ताधार) یا تمثیل کثیف سے جس قدر آزاد ہوگی وہ اتنی ہی بلندی و رفعت کی حامل ہوگی۔ للت کلاؤں میں موسیقی اور شاعری قریب قریب ہم پلہ و ہمپایہ مانی جاتی ہیں تاہم بعض وجوہ کی بنا پر شاعری کا مرتبہ موسیقی سے بلند تر ہے۔ رسوں (नव रस) یا کیفیات کے اختلافات ان کے تاثرات اور مدارج کو پیشِ نظر رکھ کر کلاؤں کے مراتب مقرر ہوئے ہیں، اور یہی بات راگ راگنیوں کی تقسیم میں بھی ملحوظ رکھی گئی ہے۔

راگوں کی جیسی مفصل توضیح و تشریح ہندوستان میں ہوئی ہے دنیا اُس کی نظیر پیش کرنے سے قاصر ہے۔ سرگم کے (سا، رے، گا، ما، پا) ان پانچ سُروں کی تنظیم تو ویدوں ہی کے زمانہ سے شروع ہوگئی تھی لیکن دھا اور نی کچھ بعد میں بڑھا کر اس کی تکمیل کی گئی۔ گانا اور رونا انسان کی فطرت کا جزو لاینفک ہیں، اس لئے گیت ٹھاٹھوں اور راگوں کی تفریق سے پہلے معرضِ وجود میں آئے۔ اس کے بعد راگوں کی باقاعدہ تقسیم شروع ہوئی اور بائیس ۲۲ سُریاں قائم کی گئیں، بھرت نے ان میں چودہ موچھنا جنیان مزید اضافہ کیں۔ اس کے بعد سارنگ دیو، پنڈریک وٹھل، آہوبالا اور سوناتھ جی نے اپنی اپنی پسند کے مطابق موسیقی کے مختلف اصولوں کی بنیادیں قائم کیں۔

اولاً دن رات کے چوبیس گھنٹوں کے حکمراں پانچ بنیادی راگ مانے گئے اس کے بعد ایک چھٹا

ساوتری

از حضرت جگر بریلوی بی اے

ساوتری وستیہ دان ہ کی دلآویز داستان عشق و محبت کو ہمارے جادو نگار دوست حضرت جگر بریلوی نے ایک دلکش مثنوی کی صورت میں گلزار نسیم کی مقبول عام بحر میں نظم کیا ہے جس کے اکثر حصوں سے ہم بھی لطف اندوز ہو چکے ہیں۔ چنانچہ آج ہم ان کی عنایت و توجہ سے جو زمانہ کے حال پر ہمیشہ مبذول رہتی ہے اس دلآویز نظم کا ایک دلکش حصہ جو ساوتری کے کنوارپن اور شادی کی فکر کے متعلق ہے ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں۔ اُمید کہ ہمارے قدر شناس ناظرین بھی ہماری طرح جگر صاحب کے زور طبع کی داد دیں گے۔ ساوتری کے سفر کی کیفیت آئندہ پرچے میں درج کی جائے گی۔ (ایڈیٹر)

وہ غنچۂ شاخِ دلستانی
وہ نوبر نخلِ زندگانی

دن رات بڑھی برنگ اُمید
یا صبح کو جیسے نورِ خورشید

آمد ہوئی کنوارپن کی اس طرح
گلشن میں نسیم آئے جس طرح

طفلی تھی شباب کے اثر میں
ملتی تھی چاندنی سحر میں

چہرا کہ کنول کھلا ہوا تھا
یا پھول کوئی گلاب کا تھا

بوٹا سا وہ قد بدن سُنہرا
کندن سا دمک رہا تھا چہرا

چہرہ پہ وہ جوت حُسن کی تھی
تسکین ہو جس سے جان و دل کی

وہ آنکھ کا حُسن رُوح پرور
بھونرا سا کنول کی پنکھڑی پر

وہ بار حیا کہ جھک گئی آنکھ
نرگس کی تھی نیم وا کلی آنکھ

پُتلی آنکھوں کی کالی کالی
ہونٹوں سے ٹپک رہی تھی لالی

تھے لعلِ لب اس طرح نمایاں
گلنار کی جیسے سُرخ کلیاں

وہ حُسن کہ دل کو پاک کر دے
دامانِ نظر میں نور بھر دے

وہ جلوہ کہ چاندنی کو شرمائے
جس سمت عیاں ہو دھوپ کھل جائے

وہ شانِ جمال و رعبِ عصمت
کیا تابِ نظر جو دیکھے صورت

دھوکے سے جو آنکھ رخ پہ پڑ جائے
غیرت سے بشر زمیں میں گڑ جائے

جو دیکھ لے ایک بار صورت
جی چاہے کہ کیجئے عبادت
اللہ اللہ حیا کا انداز
تھا جسم لطیف صورت راز
دیکھا نہ لباس نے بھی عریاں
پتلی میں نظر ہو جیسے پنہاں
تقریر فنونِ دلنشینی
ایک جوئے حلاوت آفرینی
رفتار نسیم کو بھی شرمائے
اک موجِ شراب اُٹھ کے رہ جائے
شمع کا فور اگر بدن تھا
فانوس جمال پیرہن تھا
صورت کو شباب نے نکھارا
سیرت کو شعور نے سنوارا
تھی مادرِ مہرباں کی تعلیم
سمجھی ہستی کا رازِ تنظیم
سیکھی آئینِ خانہ داری
راہ و رسم وفا شعاری
اپنوں کی محبتوں کا تھا شوق
بیگانوں کی خدمتوں کا تھا شوق
حاصل کیا علم بھی ہنر بھی
دامن میں تھے پھول بھی گہر بھی
آئینِ نیاز و عشقِ شوہر
ہونے لگے نقش لوحِ دل پر
کھلنے لگے زندگی کے اسرار
تھی معنیِ عشق کی پرستار
تھا بت نہ ابھی کوئی نظر میں
تھا شوقِ نیاز و سجدہ سر میں
جب سولھواں سال اُس کو آیا
گلزار شباب نے کھلایا
دکھلاتی تھی جسم میں جوانی
مینا میں شراب ارغوانی
لاحق ہوئی اُس کے بیاہ کی فکر
راجا نے کیا مشیروں سے ذکر
بھیجے گئے بھاٹ اور برہمن
پورب پچھم شمال دکھن
لڑکے کی اُنھوں نے جستجو کی
راجاؤں سے مل کے گفتگو کی
ہر سمت سے تاجور ہوئے جمع
پروانے ہزار ایک تھی شمع
جب آگے وہ آئی پان لے کر
ملنا تھی نظر کہ جھک گئے سر
شادی کا خیال دل سے نکلا
ارمانِ وصال دل سے نکلا
ہوش آ گیا کچھ بدل گیا دھیان
پیدا ہوا سب کو ایک نم گیان
کیوں ہم کو گئے ہوئے ہیں پابند
فکرِ زن و آرزوئے فرزند
سب ہیچ ہے کاروبارِ دنیا
نیرنگِ ہوس بہارِ دنیا

یہ سوچ کے دل میں غیرت آئی
کچھ اور ہی دُھن انھیں سمائی

سب چھوڑ دیئے راج پاٹ رنواس
رہیئے جنگل میں لے کے سنیاس

دیوی تھی وہ فخر پارسائی
جس نے بھی ذرا نظر ملائی

آمادۂ ترک ہوگیا وہ
تجرید کی راہ پر چلا وہ

یونہی جو مشیت خدا تھی
شادی کو ہوا نہ کوئی راضی

بڑھتا چلا عالمِ جوانی
غمگیں ہوئے راجا اور رانی

آخر پدرِ شفیق و دل سوز
بیٹی سے ہوا مخاطب اِک روز

بولا اے دخترِ خوش اَختر
جان پدر و روانِ مادر

کیا تجھ سے کہوں غمِ نہانی
کیوں تلخ ہوئی ہے زندگانی

پیری ہے وبال زندگانی
پیغامِ اجل ہے ناتوانی

ہوں ایک چراغ صبحگاہی
ہے بارِ حیات و تاج شاہی

درپیش عدم کا اب سفر ہے
ہوں آج تو کل کی کیا خبر ہے

لازم ہے کہ تیرا عقد ہو جائے
دل کی یہ مراد اور بر آئے

کوشش میری رائگاں گئی ہے
بیسود ہوئی جو فکر کی ہے

چلنے نہیں دیتی کچھ بھی تقدیر
آتی ہے نظر بس ایک تدبیر

کسطرح کہوں کہ تو سفر کر
یہ بار اُٹھائے اپنے سر پر

ممکن ہے کہ تیرتھوں میں جا کر
پلٹے تو میری مُراد پا کر

راجا کا غم و ملال سُنکر
چپ رہ گئی وہ یہ حال سُنکر

سر خم تھا نگاہ جھک گئی تھی
صدمے سے زبان رک سی گئی تھی

تھا سخت قلق کہ باپ کو آہ
ہو میرے سبب یہ رنج جانکاہ

غیرت کا مقام ہے تو کیا ہے
میرے لئے اب یہی روا ہے

آسان ہو باپ کی یہ مشکل
پیری میں سکوں ہو انکو حاصل

اِس عہد سے دل میں آگیا جوش
غیرت سے رہی مگر وہ خاموش

صورت تصویر عزم دل تھی
آئینہ تھے معنیٔ خموشی

خوش ہو کے پدر نے دیں دعائیں
تقدیر نے بڑھ کے لیں بلائیں

ہندوستانی تہذیب کی قدامت

(از مسٹر شہنشاہ حسین رضوی ایم۔ اے ایل ایل۔ بی، مدیر "خیابان" لکھنؤ)



کسی قوم کی تہذیب کی عظمت کا دارومدار اس کی عمر اور قدامت ہی پر ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے ہندوستان کی تہذیب مصر و عراق سے زیادہ قدیم نہیں مصر[1] اور عراق کی قدیم تہذیب کے آثار اب بھی موجود ہیں اور زبان حال سے اس کی قدامت کی شہادت دیتے ہیں ہندوستانی تہذیب کی قدامت کے متعلق جو شہادتیں ہم کو دستیاب ہوئی ہیں اُن سے تین ہزار سال قبل مسیح سے زیادہ زمانہ نہیں تعین کیا جا سکتا۔ مغرب کا شہرۂ آفاق عالم سنسکرت پروفیسر ونٹر نٹز[2] "رگ وید" کو جو ہندوستان کی قدیم ترین کتاب ہے ڈھائی ہزار برس قبل مسیح سے پہلے کا نہیں بتلاتا۔ ونٹر نٹز کا نظریہ یہ ہے کہ بودھ مذہب اور اُس کا فلسفہ جن کی تاریخ حضرت عیسٰی سے صرف چھ سو سال قبل شروع ہوتی ہے۔ سنسکرت کے ضخیم لٹریچر کی جو صدیوں پہلے سے جمع ہوتا چلا آتا ہے پیداوار ہیں۔ اب اس لٹریچر کا تجزیہ کیجئے۔ اور ذرا اس اجمال کی تفصیل میں جائیے تو معلوم ہوگا کہ اس گراں بہا ذخیرہ کی ابتدا، ملفوظات ستر سے ہوئی اور پھر ارنیکا اپنشیاد اور برہما پیدا ہوئے۔ اس کے بعد چار وید اتھرون، یاجور، سما اور رگ شامل ہوئے اور آخر میں رگ وید کا اضافہ ہوا۔

رگ وید | یہ مد نظر رہے کہ رگ وید کی بھی ایک طویل تاریخ ہے اور کیونکر اس کے اجزائے پریشان کی ترکیب ہوئی؟ یہ بھی ایک دلچسپ موضوع ہے۔ بہرکیف رگ وید کی موجودہ تشکیل کی صورت یہ ہے کہ صدیوں سے ہزارہا گیت اور دعائیں سینہ بہ سینہ چلی آتی تھیں اسوقت تک نہ زبان کی رعایتیں تھیں نہ صرف و نحو کی پابندیاں یہ گیت کہنے کو تو بڑے رشیوں کی متبرک زبان سے نکلے ہوئے تھے مگر ابہام و بے ربطی کے عیوب سے پاک نہ تھے۔ نہ زبان میں سلاست و روانی تھی اور نہ تسلسل ہی کا کچھ لحاظ رکھا گیا تھا۔ لہذا سب سے پہلے انکو جمع کیا گیا۔ جمع کرنے کے بعد انکو ترتیب دیگئی۔ زبان کو شستہ و پُرکیف بنایا گیا۔ اور صرف و نحو کے قواعد وضع کر کے انکو اس زنجیر سے بھی جکڑ دیا گیا۔

---

[1] اہرام مصر و فراعنہ کی قبور جو حال ہی میں دریافت ہوئی ہیں۔

[2] Prof. Winternitz.

اب کیا تھا۔ رگ وید ایک منظم صورت میں آگیا۔ اس میں علم اللغات علم صرف ونحو علم معنی بیان وغیرہ وغیرہ سب سمودئے گئے۔ رگ وید نے ایک بڑا خزانہ اصطلاحات کا کھولدیا جس سے کسی خیال یا کسی نظریہ کے اظہار کے لئے الفاظ کا قحط نہیں رہا۔ بہرکیف ہم کو رگ وید کی ادبی یا غیر ادبی حیثیت سے بحث نہیں۔ رگ وید ایک دیا ہے جس کی دھندلی روشنی میں ہم اس تاریک راہ میں قدم رکھیں گے۔

تصویر کا دوسرا رُخ | ہم اس موقع پر یہ اعتراف کئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ رگ وید ہندوستانی تہذیب کی قدامت کے متعلق ایک ایسا شاہد ہے جس سے ہم صرف نتائج اخذ کر سکتے ہیں لیکن ہمکو استدلال کے لئے مادی شواہد کی ضرورت پڑیگی۔ اور اپنے ملک کی تہذیب کو قدیم ثابت کرنے کے لئے اہلِ مغرب کی نظر پیش کرنا ہوگی۔ خوش قسمتی سے اس فقدان کی تھوڑی بہت تلافی ہمارے محکمہ آثار قدیمہ نے ہڑپا[1] اور موہنجوداری[2] کے قدیم آثار کے دریافت و تحقیق سے کردی ہے اور اس نے ہماری تہذیب کو کم از کم ایک ہزار سال اور قدیم ضرور ٹھہرا دیا ہے۔

جدید شہادتیں | متذکرہ بالا شواہد کی پُرمغز تحقیق و تدقیق کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہونچے ہیں کہ وادی انڈس کی تہذیب کی تاریخ دنیا کی کسی قدیم ترین تہذیب سے موخر نہیں۔ وادی انڈس کی تہذیب کے تعین کا زمانہ قریب قریب اس عہد میں ہوتا ہے جبکہ مصر میں وادی نیل، عراق میں وادی دجلہ و فرات مغربی ایران میں کارون[3] اور کرکنج[4] اور سیستان میں وادی ہلمند[5] کی آغوش میں تہذیب نشوونما پا رہی تھی تو یہ مسلم ہے کہ دنیا کی ہر تہذیب کا ارتقا کسی بڑے دریا کی وادی میں ہوا ہے۔ پھر اگر ہم یہ کہیں کہ کوئی وجہ نہیں کہ گنگا و جمنا کی وادی میں بھی کوئی نہ کوئی تہذیب ترقی پاتی رہی ہوگی تو ہرگز تعجب انگیز نہیں وادی انڈس کی تہذیب کے عہد کا یقین عراق کی عہد تہذیب سے اس طرح کیا جاسکتا ہے کہ دونوں شواہد میں مشابہت موجود ہے۔ انڈس کی وادی سے جو نوادر دستیاب ہوئے ہیں وہ عراق کے دریافت شدہ آثار سے ملتے جلتے ہیں جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ تقریباً چار ہزار سال قبل مسیح دونوں ممالک میں ارتباط کا سلسلہ جاری تھا۔

ان شواہد میں سب سے زیادہ قابل تذکرہ پانچ مہریں ہیں جو عراق کے مختلف مقامات سے زمین کے نہ معلوم کتنے پردوں کو کھود کر برآمد کی گئی ہیں۔ ان کی شان خط اور بیل کے چہرہ کا نشان ملتا جلتا

[1] Harappa. [2] Mohenjodare. [3] Karun. [4] Karhch. [5] Helmand

ہے۔ ان میں سے دو مہریں جو آر[1] اور کش[2] ملی ہیں۔ حضرت مسیح سے دو ہزار آٹھ سو برس پہلے کی ہیں ایسی ہی مہریں مہنجو دیری کی بھی ہیں جو سطح ارض سے پچاس فٹ کی گہرائی پر ملی ہیں۔ اب سوال کو اس طرح حل کیجئے۔ کہ پہلی مہر جس گہرائی میں ملی ہے اس کو سطح قائم کیجئے اور اُس کا تعین زمان دو ہزار آٹھ سو برس قبل مسیح کیجئے اس طرح سے آخری گہرائی کی سطح کو سات تہوں پر تقسیم کیجئے اور ہر تہہ کو کم از کم پانسو برس کی قدامت دیجئے تو اس حساب سے آخری تہہ میں دستیاب ہوئی مہروں کا عہد تقریباً چار ہزار سال قبل مسیح پڑیگا متذکرہ بالا پانچ ہزار مہروں کے علاوہ مسٹر وولی[3] نے ۱۹۳۲ء میں آر میں ایک اور ہندوستانی مہر پائی تھی جس کی شناخت کے بعد یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ کم از کم دو ہزار آٹھ سو برس قبل مسیح کی ہے۔ شکاگو اور نٹل سوسائٹی کے ارکان نے عراق میں اور تحقیقات کی ہے تل اسمر (عشنونہ کا قدیم نام) نواح بغداد کے ریگستانی علاقہ میں کچھ لوحیں مہریں اور ظروف ملے ہیں جو دو ہزار پانچ سو سال قبل مسیح کے ہیں ان چیزوں میں بعض بلاشبہ ہندوستانی ہیں جنکی علامات ہاتھی بارہ سنگھے نیز دیگر جانوروں کے چہرے ہیں۔ بابل[4] میں ہاتھی کہاں؟ دوسرا ثبوت یہ ہے کہ مہنجو دیری کی ایک مہر پر ہاتھی اور بارہ سنگھا دونوں بنے ہیں جو خالص ہندی ہیں لہٰذا اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ عراق میں یہ مہریں کم از کم دو ہزار پانچ سو برس قبل مسیح ہندوستان سے پہونچی ہونگی۔

ان تمام شواہد سے یہ استدلال قوت کے ساتھ کیا جا سکتا ہے کہ ازمنہ قدیم میں بھی ہندوستان ایک وحشی ملک نہ تھا بلکہ وہ اپنے ہر گذشتہ دور میں دُنیا کی مہذب ترین اقوام کی صف میں جگہ پاتا تھا۔ اب تک جو تحقیقات کی گئی ہے وہ وادی انڈس کی تہذیب کے زمانہ کو دوسرے ممالک کی تہذیب کے زمانہ سے منطبق کرنے کے لئے کی گئی ہے لیکن ہندوستان تو ایک برِّ اعظم ہے جس کے ہر ہر خطہ میں بڑے بڑے دریا موجود ہیں۔ کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ انڈس کی وادی کی طرح برہمپتر، گنگا۔ جمنا اور ان کے معاون اور شاخ در شاخ اسی طرح وسط ہند کے دریا نربدا و تاپتی پھر دکن کے دریا گوداوری، کرشنا و کاویری کی وادیاں بھی زرخیز و مردم خیز نہ ہوں اور ان میں نوع انسان تہذیب سے بیگانہ ہو۔



---

[4] Babylon. [3] Mr. Woolley. [2] Kish. [1] Ur

ہند قدیم کی تاریخ اور اسکا منبع

از ٹھاکر جے۔ آر۔ اے

اس امر پر کہ قدیم ہند کے لوگ تاریخ کے ادراک سے بے بہرہ نہ تھے ہم پچھلے مضمون میں بحث کر چکے ہیں اس مضمون میں ہم اس سوال پر بحث کرنا چاہتے ہیں کہ ہند کی تاریخ کا منبع کیا ہے جس سے اسلاف ہند قدیم بعید کے صحیح حالات پر روشنی پڑتی ہے؟

پراچین زمانہ کے آریہ لوگ ہر فن اور علم کے شایق تھے۔ ان کی طبعی ہمہ گیری نے پرانے زمانہ میں جب باقی تمام قومیں تاریکی میں بھٹکتی پھرتی تھیں۔ بنیاد ڈالی جس سے مابعد کی قوموں نے اپنے چراغ روشن کئے میرا دعوٰی وسیع تاریخی تحقیقات پر مبنی ہے۔

اس دور افتادہ زمانہ کی تمدنی عظمت اور حکومتی شوکت کا منظر پرانوں اور رزمیہ کتابوں کے صفحوں میں دکھائی دیتا ہے۔ جو ہزار ہا سال سے ہند قدیم کا اتہاس شمار ہوتی ہیں۔ ان کے علاوہ براہمن گرنتھ بھی ہیں جنمیں بڑے بڑے تاجداروں کا بالواسطہ ذکر ملتا ہے۔ اگر احتیاط سے اُن پرانے گرنتھوں کی جانچ پڑتال کی جائے۔ تو تاریخ ہند کے بیش قیمت معلومات دستیاب ہو سکتے ہیں۔ اصل یہ ہے کہ پرانے زمانے میں ہر ایک ہندو تاجدار کے یہاں راج بھاٹ مقرر تھا جو اس کے خاندانی حالات نظم کر کے خاص تقریبوں پر دہرایا کرتا تھا۔ اسی قسم کی دیر گتھا سے آخرکار پُران اور مہابھارت وغیرہ گرنتھ رچے گئے۔ بعد کے زمانہ میں بھاٹ سوت اور ماگھد کہلاتے۔ راجپوتانہ یا گجرات کاٹھیاواڑ کے کسی راجہ کے یہاں جائیے تو وہاں اب بھی آپ کو راج بھاٹ ملیں گے۔ جو ڈیڑھ دو ہزار برس کے تاریخی واقعات زبانی بتا سکتے ہیں۔

اس وسیع ملک میں جو روس کے علاوہ تمام یورپ کے برابر ہے۔ پچھلے نو ہزار برس کے دوران میں ہزاروں تاجدار گذرے ہیں۔ اب یہ خیال کیجئے کہ ترگرت دیش[1] کے راج کل میں جس کا بانی مہاراجہ

[1] راوی اور ستلج کا درمیانی پہاڑی ملک ترگرت کہلاتا ہے۔ اس کے راج کل کے آخری راجہ سر جے چند رہبادر والی لمباگرام۔ کانگڑہ کا اپریل ۱۹۳۵ء میں انتقال ہوا تھا۔ ان کی پنشاولی (شجرہ) بشکل پوتھی ان کے خاندان کا سب سے بڑا قیمتی ورثہ ہے۔ اور یہ کل ملک ہند بلکہ ساری دنیا میں سب سے پرانا ہے۔ اس کتاب میں ۴۸۵ تاجداروں کے نام موجود ہیں۔ یہ ہر ایک آدمی نہیں دیکھ سکتا۔ کہ اس میں اچھے برے سب ہی حالات صحیح صحیح درج ہیں۔

بھوم چندر تھا۔ ابتک چار سو پچاسی حکمران گذر چکے ہیں۔ اگر ہر ایک راجہ کے حالات دس دس صفحات میں دے جائیں تو صرف اسی شاہی خاندان کی تاریخ چار ہزار آٹھ سو پچاس صفحات میں آئے گی۔ اسی طرح اور کئی شاہی خاندان گذرے ہیں۔ یہ ساری تاریخیں ملکر کئی چھکڑوں کا بوجھ ہو جائینگی اور ان کے سنبھالنے اٹھانے اور رکھنے کے لئے کثیر جگہ درکار ہوگی۔ ان تمام مشکلات کا اندازہ کر کے پرانوں میں نہایت اختصار سے کام لیا گیا ہے۔ سننے والوں کی دلچسپی کے لحاظ سے بھاٹوں نے ہر ایک واقعہ کیساتھ ایک افسانہ نتھی کر دیا ہے۔ اور تشبیہ اور استعارہ سے بلا تکلف کام لیا ہے۔ لیکن اگر اس کو دھیان میں رکھا جائے تو پڑھنے والے کو اصلیت عیاں ہو جاتی ہے۔ مثلاً ایک مشہور واقعہ یوں پیش کیا جاتا ہے "بھاگیرتھ گنگا کو سورگ (آسمان) سے لایا" (بادشاہ) سمراٹ بھاگیرت بہت دانشمند اور عالی دماغ حکمراں تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ گنگا ابتدا میں برہم پتر کی طرح تبت کیطرف بہتی تھی۔ لیکن پھر مہاراجہ دھراج بھاگیرتھ کے حکم سے انجینیروں نے پہاڑ کاٹ کر اس کا رُخ موڑ دیا جس کی وجہ سے گنگا ہمالہ کے ادھر بہتی ہوئی یو۔پی کے میدان میں داخل ہوئی جس سے آج کل لاکھوں ایکڑ آراضی سیراب ہو رہی ہے۔

اسی طرح مہاراجہ پریکشت کے سانپ کے ڈسنے سے مرنے کا افسانہ ہے۔ جس سے مراد تک ونشک ناگ" قوم کی سازش سے پریکشت کا ہلاک ہونا ہے جس کی سزا اس کے دلاور سپوت جنم جے نے اس قوم کو دیکر اس کے اشٹ دیو کا سرپ میدھ جگ کیا تھا۔

یہاں پر مروجہ تعلیمی کتابوں کا مغالطہ ظاہر کرنے کے لئے صرف ایک مشہور بیان کا ذکر کیا جاتا ہے۔ اُردو اور انگریزی تاریخ ہند کے مصنف عرصہ سے یہ بے سروپا بیان دہرائے چلے جاتے ہیں کہ ہند قدیم کے بزرگ وسطی ایشیا سے نقل مکان کر کے پنجاب میں آباد ہوئے تھے۔ اب ہمارے تاریخ نویسوں کا فقدانِ علم ملاحظہ ہو۔ سوا سو سال کا عرصہ گذرا۔ ایک ماہر نے وسطی ایشیا کو آریہ قوم کا گہوارہ ٹھہرایا تھا۔ اس کے خیال کے مطابق دو ٹولیاں تو ایران اور پنجاب کو چلی آئیں اور باقی جتھا یورپ کو چلا گیا۔ اس نظریہ کی کئی نامی عالموں نے مخالفت کی ہے۔ چنانچہ ادھر چالیس پچاس سال سے وسطی ایشیا کی بجائے سطح مرتفع آرمنیا کو آریہ جاتی کا مولد و مسکن مانا جاتا ہے۔ مگر ہمارے مورخوں کو بھی اس نئے نظریہ کی خبر ہی نہیں ہے۔ ہمارے اتہاسک گرنتھوں سے اسلاف ہند قدیم بعید کے وسطی ایشیا یا کسی اور ملک سے آکر پنجاب میں آباد ہونے کے خیال کی تائید نہیں ہوتی۔ بیس سال سے ہند و ودوان اپنے گرنتھوں کی سائنس کے قواعد سے باقاعدہ چھان بین کر رہے ہیں۔ اس عرصے میں چالیس پچاس نئی کتابیں

انگریزی زبان میں اور بیسیوں مضامین انگریزی رسالوں میں شائع ہو چکے ہیں مگر تعلیمی کتابوں کے مصنفوں کو ان قابل قدر تحقیقات کے نتائج کی کانوں کان خبر نہیں ہوئی۔ اور وہ ابھی تک وہی پرانا راگ گائے جاتے ہیں۔ اس سے یہی واضح ہوتا ہے کہ وہ تازہ تاریخی تحقیقات سے ہدایت حاصل کرنیکی مطلق پروا نہیں کرتے۔ بلکہ من مانی باتیں طلباء کو سکھا سکھا کر ہند قدیم بعید کی شوکت و جلالت پر پردہ ڈالتے ہیں۔ تین چار سال ہوئے۔ نواب احمد یار خاں صاحب دولتانہ نے پنجاب کونسل میں نصاب کی تاریخی کتابوں کے مغالطہ کا رونا رویا تھا۔ مگر یہ شکایت جو زیادہ تر ہند و تاریخ کے متعلق ہے ابھی تک بدستور قایم ہے۔

ہمارے اتہاسک گرنتھوں سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ ہندوؤں کے اولین مورث نہ تو وسطی ایشیا سے آکر پنجاب میں آباد ہوئے اور نہ انھوں نے یہاں کے اصل وحشی باشندوں کو مار کر پہاڑ و جنگل بھگایا اور آریہ سبھتا کو رائج کر کے ترقی دی۔ یہ بیان سراسر بے بنیاد ہے۔ اور اصل یہ ہے کہ ویدک لٹریچر میں جس آریہ جاتی ... کا ذکر آتا ہے وہ اسی ملک کی رہنے والی تھی۔ پران اور مہابھارت سے بھی بخوبی ثابت ہے کہ اس کی جنم بھومی "سورگ" تھا۔ وہاں پر گندھمان اور ملیہ ورت کے درمیان میرو پہاڑ تھا جس کی سدا برف پر جب سورج کی کرنیں پڑتی تھیں تو وہ جگ مگا اٹھتا تھا۔ اسی وجہ سے پراچین کال کے بھاٹ اسے "سنہری" پکارتے تھے۔ وہاں پر دو ندیاں مندا کنی اور الکا بہتی تھیں۔ شمال کی طرف جھیل مانس تھی۔ یہ شاداب اور پُر بہار خطہ "نندن بن" کہلاتا تھا جہاں ضروریات زندگی پسینہ بہائے بغیر ہاتھ آجاتی تھیں۔ سورگ دیش میں رہنے والی قوم کا مہابھارت میں دیوجاتی کے نام سے ذکر ہے۔ اس کے ہمسائے یکش اور گندھرب اور کنیر تھے۔ میری دانست میں سورگ سے مراد کمایون گڑھوال کے اونچے پہاڑ ہیں معلوم ہوتا ہے کہ جب دیوجاتی کا شمار بہت بڑھ گیا۔ اور رہنے سہنے میں دقت پیش آئی۔ تو وہاں سے اٹھ کر وہ آجکل کے روہیل کھنڈ کے شمال مشرقی خطہ میں آ بسی۔ پھر رفتہ رفتہ حال کے بریلی۔ مراد آباد۔ سہارنپور۔ مظفر نگر اور دیگر اضلاع میں پھیل گئی۔ اسی سرزمین میں آریہ سبھیتا نے نما ہوئی چنانچہ اسی خطہ میں علوم و فنون کی داغ بیل پڑی۔ بعد کے زمانہ میں اس دیش کا نام برن بھومی۔ دیو استھان۔ اور ہزاروں برس بعد آریہ ورت مشہور ہوا۔

سن عیسوی سے کوئی چھ ہزار سال پہلے ملک ہند میں آٹھ بڑی بڑی قومیں حسب ذیل آباد تھیں ان میں دو کے سوا باقی سبھی مہذب تھیں۔

(۱) اسُر۔ یہ سب سے طاقتور۔ دولت مند صنعت و تجارت۔ زراعت و دستکاری میں سب سے بڑھے ہوئے۔ جادو ٹونے جڑی بوٹی۔ اجوپ کرنے کے ہنر میں یکتا۔ بڑے اکھڑ اور مغرور تھے اس جاتی

کے بڑے بڑے تاجدار ہرن کشپ (پرہلاد بھگت کا باپ) اور بیٹا ولی اور پوتا اور وجن۔ اس کی
راج دھانی حال کے ہرپہ کے محل وقوع میں تھی۔ اور غالباً اس کا نام ہرن پورہ تھا۔ ہرناکش۔ اکپار۔
ہراند اس کا صدر مقام تھا۔ جالندھر کا راج کانگڑہ سے اوچ (بھاولپور کے جنوب مغرب میں) تک تھا۔ شہر
جالندھر اسی کے نام سے مشہور ہے۔ ستلج اور سرسوتی کے درمیان ورش پرون کا راج تھا۔ دیو اسر سنگرام
کے دوران میں سب سے زبردست اسر تاجدار تارک تھا۔ اسر اتہاس میں ورتر تاجدار بھی بہت مشہور
گذرا ہے جس کے ہر کے عرصہ تک دیوتاؤں کے سب سے بڑے تاجدار اندر سے ہوتے رہے۔ علاوہ ازیں
مدھو۔ نرک۔ کا ابھ ۔ اور سب سے بڑا فوجی انجنیئر ۔ تھا۔ شہروں اور قلعوں کے نقشے بنانے میں اسر
لوگ بے نظیر تھے۔ ان کے اشٹ دیو سیوجی تھے۔

(۲) دیوتا۔ دھرماتما۔ شرافت اور انسانیت کے پتلے۔ دھرم کرم پر جان دینے والے شائستگی اور
راستبازی میں سب سے بڑھے ہوئے۔ آبادی۔ دھن پدارتھ اور طاقت میں اسروں سے دوسرے درجہ
پر۔ مگر تہذیب فن جنگ آرائی۔ راج نیتی نظم ونسق اور دھرم بھاؤ میں سب سے بڑھ کر تھے۔ ان کا ملک سرسوتی
سے لیکر نربدا تک گویا حال کے صوبہ بہار سے کاٹھیاواڑ تک تھا۔ جودھپور کے مشرق کا سارا راجپوتانہ اور
سندھیاچل کے دونوں طرف کے علاقے دیوستھان میں شامل تھے۔ اسروں کا تسلط حال کے سندھ۔
بلوچستان صوبہ سرحد کے جنوبی اضلاع۔ جنوب مغربی پنجاب (ملتان۔ جھنگ۔ مانٹ گمری۔ لائلپور
وغیرہ) دوآبہ بست جالندھر۔ لدھیانہ۔ انبالہ۔ اور پنجاب کی جنوبی ریاستوں پر تھا۔

(۳) ناگ جاتی۔ وادی نربدا میں اور حال کے خاندیش میں آباد تھی۔ خاصی مہذب۔ واسکی
ناگ اس کا اشٹ دیو تھا۔

(۴) یکش۔ حال کے گورکھوں اور گڑھوالیوں کے اجداد۔ اچھے مہذب اور بہادر لوگ تھے۔

(۵) گندھرب۔ سب سے خوبصورت راگ رنگ کے شایق۔ دیوتاؤں کے سمبندھی۔ حال کے ضلع کانگڑہ
کلو وغیرہ ان کا اصلی وطن تھا۔ گدی لوگ ان ہی کی نسل سے ہیں۔

(۶) کنیر۔ اچھے خاصے مہذب لوگ تھے۔ حال کے شملہ۔ رامپور بشہر اور اوپر کے پہاڑوں میں رہتے تھے۔
آجکل کے کنوڑے اور کینت کنیر جاتی کی یادگار ہیں۔

(۷) راکشش بڑے بدصورت اور وحشی مردم خور۔ شائستگی سے بیگانہ دکن اور جنوبی ہند میں اب تک اس
نسل کے لوگ پائے جاتے ہیں۔

(۸) پشاچ۔ نرے وحشی۔ ان کے دیس کا تعین محال ہے۔ مگر میرا خیال ہے کہ خانہ بدوش بھیل۔

بنے۔ گونڈ وغیرہ جنگلی لوگ پشاچ جاتی کی اولاد سے ہیں۔

اس زمانہ کی آریہ اور اناریہ شان و شوکت کا افسانہ بخوف طوالت نظرانداز کیا جاتا ہے۔ اسے پھر کبھی بیان کریں گے۔ اب اتنا ہی کہنا بس ہے کہ جب دیو اسر سنگرام سو سال تک ہوتا رہا جس میں آخر کار اسروں کو کامل شکست ہوئی۔ اور وہ بھاگ کر مغرب یعنی موسوپوٹامیہ میں جا بسے۔ جہاں ان کی اولاد اب سمیری قوم کے نام سے مشہور ہے۔ اُسوقت تمام اناریہ قوموں نے راست باز دیوتاؤں کا ساتھ دیا۔ جس کے صلہ میں دیو جاتی نے اپنے معاونوں اور نیز شکست یافتہ اُسروں کو اپنے ساتھ ملا لیا۔ اناریہ جاتیوں نے آریہ سبھیا کے نشانات اور آریہ دھرم کے بڑے بڑے اُصول قبول کر لئے۔ لیکن اپنے جدی رسم و رواج اور مت متانتر نہ چھوڑے۔ اس طرح آریہ سماج اور دھرم میں اُسر جاتی کے دیوتا شیو شکتی۔ برکش اور جیو پوجا۔ ناگ جاتی کی سرپ پوجا۔ وغیرہ مل گئے جس سے صدہا سال بعد آج کل کی مرکب ہندو قوم اور متضاد باتوں کا مجموعہ ہندو دھرم رونما ہوا ہے۔ ورن آشرم بھی اسی زمانہ میں وجود میں آیا تھا۔

نامناسب نہ ہوگا اگر یہاں پر لفظ ہندو کی بھی مختصر تشریح کر دی جائے۔ مغربی ماہرین کہتے ہیں کہ لفظ "سندھو" سے بگڑ کر ایران والوں میں "ہندو" مشہور ہوا تھا۔ یہ اسی قسم کا ڈھکوسلہ ہے۔ جیسے وسطی ایشیا سے اٹھ کر ہمارے اجداد کے پنجاب میں آنے کی تھیوری۔ مسلمانوں نے اپنی کتابوں میں جو کچھ لکھا ہے اس کو یہاں پر دہرانے کی ضرورت نہیں۔ یہودیوں کی بائیبل میں لفظ ہُدُو (ہندو) آیا ہے اور دارا اعظم کے کتبہ میں بھی یہ لفظ ملتا ہے۔

لیکن "ہندو" سنسکرت لفظ "اِندو" سے بگڑا ہے۔ جیسا کہ نامی چینی سیاح ہیون سانگ لکھتا ہے۔ اور اِندو کے معنی چاند کے ہیں۔ اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ "چاند یعنی اِندو کو ہندو سے کیا نسبت ہے؟" اس کا جواب یہ ہے کہ لفظ ہندو اس ہیبتال فتح کی یاد تازہ کر رہا ہے جو ہمارے آریہ پُرکھاؤں نے سو سال کی سرفروشیوں کے بعد مغرور اُسروں پر حاصل کی تھی۔ اس معرکہ عظیم میں دیوتاؤں کے لیڈر چندر بنش کل کے تاجدار مہاراجہ جاتی کے عالی حوصلہ سپوت تھے۔ جب اُسر زیر ہو گئے۔ تو ان کے ملک پر چندر بنش کا جھنڈا لہرانے لگا۔ اور یہ "اندو راج" اور اندو دیش کے نام سے مشہور ہوا۔ عام بول چال میں اندو بگڑ کر ہندو ہو گیا۔ اسی وجہ سے "ہندوستھان" مشہور ہوا۔ جسے ایران والے "ہندوستان" کہتے ہیں۔ اس سے مراد وہ علاقے ہیں۔ جہاں پر چندر بنشی تاجداروں کا تسلط قائم ہوا تھا۔ اس طرح لفظ ہندو دیو اسر سنگرام کے کامل فتح کی یادگار ہے۔

سن و سمت کا مسئلہ پچھلی بحث کے دوران میں ہم نے چھ ہزار سال قبل مسیح کے تمدن کی عظمت کا اشارۃً ذکر

کیا تھا۔ مگر مغربی ماہروں کے معتقد کہیں گے۔ کہ چھ ہزار سال قبل مسیح میں ہندوستان کی تمدنی عظمت کا افسانہ محض ڈھکوسلہ ہے۔ اس لئے یہاں اس مسئلہ پر بھی غور کرنا مناسب ہوگا۔

مغربی ایشیا کے یونانی تاجدار، سلیوکس ظفرمند نے موریہ چندرگپت اعظم کے ہاتھوں شکست فاش کھا کر جو عہد نامہ لکھا تھا اس کی رو سے اس کا سفیر میگھستینیز دربار چندرگپت میں تعینات ہوا تھا۔ اس نے چشم دید حالات اپنی کتاب میں لکھے تھے جو بدقسمتی سے تلف ہوگئی ہے۔ مگر اس کے بیانات اور یونانی کتابوں میں پائے جاتے ہیں۔ مثلاً (۱) ایرین[1] لکھتا ہے کہ تین سو برس قبل مسیح کے ہندوا اپنے اتہاس کی ابتدا، سکندر کے حملے پنجاب سے (۶۴۶۲) برس پہلے بتاتے تھے۔ اس کے رو سے ہندو اتہاس کی ابتدا ۶۷۸۸ء قبل مسیح میں لازم آتی ہے۔ اور بقول جرمن ماہر میکس ڈنکر۔ پہلا ہندو راجہ سپ تم بھس ۶۷۸۸ء قبل مسیح میں گزرا ہے معلوم ہوتا ہے۔ کہ میگس تھینز نے اپنی کتاب میں نہایت پرانے زمانہ کے سپت رشی سمت کا ذکر کیا ہے۔ جسے ہندو رشیوں نے فلکی مشاہدات کے حساب کے لئے وضع کیا تھا۔

(۲) معرکۂ کروکشیستر ہندو اتہاس کا مرکز ثقل ہے۔ جو ہندو ماہروں کے حساب کے رو سے اکتوبر ۳۱۴۰ء قبل مسیح میں ہوا تھا اس سے پراچین زمانہ کا خاتمہ اور وسطی زمانہ کا آغاز ہوتا ہے۔ مہابھارت میں اس تباہ کن معرکہ کے وقت گرہ چال کا ذکر آتا ہے اور پھر بھیشم پتامہ کی وفات کے وقت کے نکشتروں (ستاروں) کا حال ملتا ہے۔ جس کی بنا پر کروکشیستر کے معرکۂ عظیم کی تاریخ کا تعین کیا گیا ہے۔

(۳) پہلا آریہ چکر ورتی راجہ منو دیوسوت تھا جس سے منوسمرتی وابستہ ہے اور جو جسٹس پارجیٹر کی تحقیقات کے رو سے سورج بنش کی پچانوے پیڑھیاں معرکۂ کروکشیستر سے پہلے گزرا ہے۔ اگر ایک پیڑھی کے تیس برس مانے جائیں۔ تو منو کا زمانہ سن عیسوی سے چھ ہزار سال پہلے ماننا لازم ہے۔ اور میگس تھینز کے بیان کے مطابق پہلے ہندو راجہ سپ تم بھس اور منو کے درمیان آٹھ سو برس کا فرق تعین کرنا نامناسب نہ ہوگا۔ کہ راج سے سم راج رونما ہونے میں عرصہ درکار ہوتا ہے۔

(۴) ہندو آٹھ اوتار مانتے ہیں جو بیس بیس پچیس پچیس پیڑھیوں کے بعد رونما ہوتے رہے۔ سری رامچند اور کرشن جی کے درمیان سات سو سال کا فرق بتلایا جاتا ہے۔ ہر ایک اوتار کے لئے سات سو سال مانے جائیں۔ تو آٹھ اوتاروں کے لئے پانچ ہزار چھ سو برس درکار ہوں گے۔ اس حساب سے پہلا اوتار سن عیسوی سے (۵۶۰۰ + ۳۱۴۰) ۸۷۴۰ء قبل مسیح میں ظاہر ہوا۔ اور اس کے رو سے ہندو اتہاس کا پہلا واقعہ ۸۷۴۰ء قبل مسیح میں رونما ہوا تھا۔ کیا یہ اندازہ محض بے سروپا سمجھا جائے گا؟ ہرگز نہیں۔ آگے دیکھئے۔

---

[1] جنرل بہار و اڑیسہ ریسرچ سوسائٹی صفحہ ۲۵۲ - ۲۵۳ ۱۹۱۷ء

(۵) ترگرت دیش کے راج کل کی بنشاولی مہاراجہ برجے چندر بہادر۔ والئی لمباگرام کانگڑہ کے ہاں موجود ہے۔ جس میں جیسا کہ اوپر ذکر ہوچکا ہے چار سو بچاسی راجہ ہوچکے ہیں۔ بھوم چندر کی دوسو چونتیسویں پشت میں مہاراجہ شوشرم چندر مع اپنے پینتالیس لڑکوں کے معرکۂ کروکشیستر میں کام آیا۔ اس کی دوسو اکیاونویں پشت میں سرجے چندر بہادر تھے۔ اس طرح شوشرم چندر سے سرجے چندر تک پانچہزار چھپتر برس ہوگئے ہیں۔ اس حساب سے دوسوچونتیس پیڑھیوں کے چار ہزار سات سوتیئیس برس ہونے چاہیئے۔ گویا مہاراجہ بھوم چندر اب سے نو ہزار سات سو اٹھانویں برس پہلے گزرا ہے۔ اور یہ سن عیسوی سے سات ہزار آٹھ سو باسٹھ برس پہلے اور منو سے ایک ہزار آٹھ سو باسٹھ سال قبل گزرا ہے۔

(۶) سب کے اخیر میں موہنجو داری اور ہڑپہ کے آثار قدیمہ کا ذکر ضروری ہے۔ تازہ تحقیقات کے رو سے ان کا زمانہ سن عیسوی سے چار ہزار برس پہلے قرار دیا گیا ہے۔ سرجان مارشل جن کے سامنے کسی کو دم مارنے کی مجال نہیں ہے۔ لکھتے ہیں:۔

"ہر دو مقامات میں جو بات سب سے واضح اور غیر مبہم ہے وہ یہ ہے کہ یہ تمدن نوزائیدہ نہیں۔ بلکہ بہت پرانا[51] ہے اور اس کی نمو اور پختگی اسی زمین میں ہوئی ہیں۔ اور اس کے پس پشت کئی ہزار سال کی انسانی سعی ہے۔ اگر سنہ ۴۰۰۰ قبل مسیح میں موہن جو دارو سے ہڑپہ تک پھیلا ہوا تمدن ترقی کے بہترین مرحلہ میں دکھائی دیتا ہے۔ اور اس کے پس پشت کئی ہزار سال کی انسانی سعی ہے۔" تو ظاہر ہے کہ اس سبھیا کا آغاز غالباً مسیح سے سات ہزار قبل ہوا تھا۔ پھر زمانۂ وحشت سے نکلنے کے لئے ڈیڑھ دو ہزار برس درکار ہوئے ہوں گے۔ اس لئے سنہ ۸۴۰۰ قبل مسیح میں وشنو بھگوان کے متس اوتار کے نمودار ہونے کا زمانہ بعید از قیاس نہیں ٹھہر سکتا۔ جو تازہ تحقیقات آرکیالوجی کے مطابق واجب التسلیم ثابت ہوتا ہے۔

مغربی ماہروں کی زبردستی ہے۔ کہ اب سے نوے سال پہلے وہ سمجھتے تھے۔ کہ معتبر تاریخ ہند سکندر کے حملہ پنجاب سے شروع ہوتی ہے۔ اس کے چالیس سال بعد سے وہ بھگوان گوتم بدھ کا جنم تاریخ ہند کا پہلا واقعہ قرار دینے لگے۔ بارہ برس ہوئے۔ سرجان مارشل نے وادئ سندھ کے آثار قدیمہ کا حال شائع کرتے وقت تاریخ ہند کی ابتدا سن عیسوی سے تین چار ہزار سال پہلے تخمینہ کی تھی جس سے مغرب کے تنگدل ماہروں میں اضطراب پیدا ہوگیا تھا جنکا ایک مقتدر گروہ وادئ نیل کو لوازم تمدن کا ابتدائی گہوارہ[52] قرار دیتا ہے۔

---

[51] موہنجو دارو اینڈ انڈس سویلیزیشن جلد ۱ صفحہ ۲ مقدمہ مطبوعہ ۱۹۳۱ء

[52] لندن کا نامی ماہر پروفیسر ایلیٹ اسمتھ اس گروہ کا لیڈر ہے جو مصر قدیم کو ابتدائی تمدن کا گہوارہ مانتا ہے۔ مگر نہایت سرگردہ ماہر سر آرتھر اسمتھ اور ماہر اثریات سر سیل فوڈلے اور عام شہرۂ آفاق استاد اسی سُمیری قوم کے تمدن کو سب سے پرانا مانتے ہیں۔

کیا عجب ہے کہ ہمارے مغربی محققین جن کی تعداد کثیر یہودی اصل ہے۔ اپنے مذہب اور تمدن کے سامنے ہند و تہذیب کی کوئی حقیقت ہی نہ سمجھتے ہوں۔ اور جب تاریخ یورپ یونان اور روم کی تاریخ سے شروع ہوتی ہے۔ جو ایک ہزار سال قبل مسیح سے آگے نہیں جاتی۔ تو یورپ کے ماہروں کے لئے ہندو تمدن کی قدامت تسلیم کرنا قدرتاً دشوار ہے۔

یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ ہندوؤں کے اتہاسک گرنتھوں سے ابتدائی زمانۂ وحشت کا پتہ نہیں لگتا بلکہ ان میں ہند و تہذیب کے لوازم اعلیٰ درجہ پر نظر آتے ہیں۔ البتہ حکومت کے ضمن میں ضرور ابتدائی حالت کا پتہ چلتا ہے۔ اس وجہ سے ہند و اتہاس اور سبھیا کی ابتدا کا زمانہ سن عیسوی سے نو ہزار سال کے لگ بھگ قرار دیا جائے تو خلافِ عقل نہ ہوگا۔

نوائے راز

(از ابو الفاضل راز چاند پوری)

دید ہو یا آرزوئے دید ہونی چاہیئے
زندگی کی کوئی تو اُمید ہونی چاہیئے

شکوۂ تقدیر کی تائید ہونی چاہیئے
ذکر حق کی کچھ نہ کچھ تمہید ہونی چاہیئے

تابکے سرگشتۂ کیف و خمار این و آن
تیرے ساغر میں مئے توحید ہونی چاہیئے

ہیچ ہے یہ مشرب شیخ و برہمن، ہیچ ہے
اب مذاقِ عشق کی تجدید ہونی چاہیئے

فرض ہے تقلید اہل ذوق لیکن ہمنشیں!
اجتہادی رنگ میں تقلید ہونی چاہیئے

فکر فردا ہے نہ رنج دوش، یہ کیا حال ہے
دور سوز و ساز کی تجدید ہونی چاہیئے

سختیٔ راہ طلب کی تو مجھے پروا نہیں
کامیابی کی مگر امید ہونی چاہیئے

دید روئے دوست کچھ مشکل نہیں ہو جائیگی
تیرے دل میں آرزوئے دید ہونی چاہیئے

میرے ساقی! ایک ساغر، ایک جرعہ ایک نظر
گفتۂ واعظ کی کچھ تنقید ہونی چاہیئے

خود پرستی، حق شناسی، بیخودی سب ایک ہیں
رندخوش گفتار کی تائید ہونی چاہیئے

کیا کہا، کیا بے اثر ہے بادۂ شعر جدید!
رازؔ اس الزام کی تردید ہونی چاہیئے

جستجوئے حیات

(از سید علی جواد صاحب ضابر)

چمن میں، دشت میں، آبادیوں میں صحرا میں
خزاں میں، جوشِ بہارِ سرور افزا میں

نسیمِ صبح کی رفتارِ روح پرور میں
خرامِ برق کی مستی میں شورِ دریا میں

دلِ برہمن و راہب میں، قلبِ مومن میں
حرم کے شور میں، ہنگامۂ کلیسا میں

حیاتِ گمشدہ! رہتی ہے جستجو تیری
کبھی جہاں میں، کبھی ماسوائے دنیا میں

مگر کہیں مجھے تیرا پتا نہیں ملتا
کہ جیسے قبر کا لوٹا ہوا نہیں ملتا

زمیں کو دیکھ چکا، آسماں کو دیکھ چکا
طلسم خانۂ کون و مکاں کو دیکھ چکا

نیاز و ناز میں ڈھونڈھا ہے بار بار تجھے
جبیں کو دیکھ چکا، آستاں کو دیکھ چکا

شباب و شیب میں تیری تلاش ہیم کی
جواں کو دیکھ چکا، ناتواں کو دیکھ چکا

ترے خیال میں وادی کی بستیاں دیکھیں
تری تلاش میں کوہِ گراں کو دیکھ چکا

ترے وجود کا ملتا کہیں سراغ نہیں
ضیا تو پھیلی ہوئی ہے مگر چراغ نہیں

کہاں ہے تو؟ ادھر آ! ہے جگہ مرے دل میں
تجھے میں صدر بناؤں گا اپنی محفل میں

بھنور میں ڈوبنے والوں کو میں بچاؤں گا
تجھے امید بنا کر کنار ساحل میں

چمک میں جس کی تڑپتی ہو عشرت جاوید تجھے بناؤں گا وہ تیغ دستِ قاتل میں

نگاہ ہٹ نہ سکے گی کبھی ترے رُخ سے تجھے حسین بنادوں گا چشمِ غافل میں

کبھی مری رگِ جاں میں نظر سے فصد تو کر

کبھی ذرا مری بزمِ عمل کا قصد تو کر

صدا دے شوکتِ مردہ! کہ میں اُمنگ میں ہوں کہاں ہے میری شجاعت! کہ شوقِ جنگ میں ہوں

جگا دے سوئی ہوئی طاقتوں کو یہ کہہ کر کہ ہوشیار رہوں میں آج پھر ترنگ میں ہوں

وسیع اور بنا دے کہ دم اُلجھتا ہے میں دیکھتا ہوں تو اب تک جہانِ تنگ میں ہوں

میں انقلاب کا حامی، عمل کا شیدا ہوں نہ فکرِ عیش نہ سودائے نام و ننگ میں ہوں

میں قصرِ فرقہ پرستی کو ڈھا کے دم لوں گا

یہ داغ دامنِ قومی مٹا کے دم لوں گا

میں انقلابِ مجسّم، میں انقلابِ کمال مرا عروج ہے، دینی رقابتوں کا زوال

ادھر تو آؤ ذرا قائدینِ فرقہ پرست مری نگاہوں میں ڈالو نگہ اگر ہو مجال

وہ دیکھو "دیر و حرم" کا طلسم ٹوٹ گیا وہ "دین و کفر" کے چہروں پہ دیکھو اضمحلال

بجورِ گنگ و جمن میں تمھارے خون کی دھار بہا رہا ہوں، کہ اب ہی تمھارا خون حلال

"شکایتِ شبِ ہجراں فرو گذار اے دل بشکرِ آں کہ برافگندہ پردہ روزِ وصال"

جو کفر و دیں کے مٹانے پہ آ گیا ہوں میں

تو دیکھو سارے زمانے پہ چھا گیا ہوں میں

مذہب اور متحدہ قومیت

از ڈاکٹر نجم الحسن صاحب موہانی

ہندوستان کی تباہی کا سانحہ بہت ہی دردانگیز اور عبرت خیز ہے۔ ایک طرف "اکثریت" اور "اقلیت" کے نام سے مختلف جماعتیں برسرپیکار رہیں، دوسری طرف معاشرت کی گوناگوں خرابیوں میں اضافہ ہو کر ہماری غلامی کی زنجیر مضبوط ہو رہی ہے۔ یہاں اس بات پر تفصیلی بحث کی ضرورت نہیں کہ قومیت کس بنا پر قائم ہوتی ہے، اور اس کا فرق بنی نوع انسان میں کیوں کر پیدا ہوتا ہے۔ قومیت کی پیدائش کا کوئی ایک خاص سبب نہیں بتلایا جاسکتا۔ بلکہ مختلف وجوہ سے قومیت کا قیام ہوتا ہے۔ ہندوستانی رہنما قومی حکومت کے خیال پر جان دیتے ہیں۔ لیکن جب تک وہ ایک متحدہ قومیت پیدا کرنے میں ناکام ہیں اُن کو اپنے دل سے قومی حکومت کا خیال دور کر دینا چاہیئے۔ قومی حکومت کے لئے مشترکہ وطن، مشترکہ زبان اور مشترکہ اغراضِ معاشی لازمی ہیں۔ ان کے بغیر قومی حکومت کا خیال ہی بالکل فضول ہے، اور یہی لوازمات قومیت ہیں۔ ہندوستان میں ایک قومیت ہونے پر اکثر لوگوں کے دل میں چند شکوک پیدا ہوتے ہیں جن کا دفعیہ ذیل میں کیا جاتا ہے۔

بعض کا خیال ہے کہ ایک قومیت کے لئے ایک نسل کا ہونا بہت ضروری ہے اور اس کے بغیر کچھ نہیں ہو سکتا لیکن ہمارا مشاہدہ ہے کہ مختلف نسلوں کے لوگ ایک قومیت بن جاتے ہیں۔ دور کیوں جایئے انگلستان ہی کو لے لیجئے۔ اس ملک کے اصلی باشندے برٹن تھے۔ اور اس کے بعد رومیوں اور سکسن (SAXONS) نے یہاں اپنے ڈیرے جمائے۔ اسی طرح انگلستان میں اس وقت مختلف مخلوط نسلیں موجود ہیں، اہل اسکاٹ لینڈ اپنی نوعیت میں اہل انگلستان سے بالکل الگ ہیں مگر تمام جزیرہ کو گریٹ برٹن (برطانیہ عظمیٰ) اور ہر باشندہ بلا استثنا برٹش کہلاتا ہے اور اس کو فخریہ بیان کرنا ان کے نزدیک حب الوطنی کی علامت ہے۔ بالکل یہی حال کناڈا کا ہے۔ جہاں مختلف قوموں کی نوآباد [illegible] بلکہ باعتبار مدت

وہ سب ایک ہیں۔ اِن تمام باتوں کے ہوتے ہوئے کوئی وجہ ہماری سمجھ میں نہیں آتی کہ ہندوستان کے مختلف النسل لوگ متحدہ قومیت کیوں نہ بنالیں بہرحال نسلی اختلافات کو مانع قومیت سمجھنا لوگوں کی جہالت پر دال ہے۔

دوسرا سب سے بڑھ کر مانع قومیت سبب "مذہب" خیال کیا جاتا ہے۔ اور قومیت کی راہ میں اگر کوئی وجہ مانع ہے تو اس میں کوئی شک نہیں کہ سب میں وزن دار اعتراض مذہب ہی کی طرف سے ہوتا ہے۔ لیکن مذہب پر سطحی نظر ڈالی جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ ان موانعات کا حل کیونکر آسانی سے ہوسکتا ہے۔ انسان کی فطری عادت ہے کہ وہ مظاہر کی انتہائی علّت دریافت کرنا چاہتا ہے اور جہاں تک اس کا بس چلتا ہے وہ اس میں کوشاں رہتا ہے۔ دوسرے جانب قوائے عقلیہ کی کمزوری اور اپنی محتاجی کا احساس اس کے دل میں اس کا یقین پیدا کرتا ہے کہ ایک ماوراء ادراک غیر مرئی قوت (یعنی خدا) موجود ہے۔ یہی مذہب کا اصل اصول ہے۔ مذہب کی غرض رجوع الی اللہ سے زیادہ نہیں جس کا سیاسیات سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

ہم کو اس خیال سے انکار ہے کہ خدا ہمارے ہر کام میں دخل دیتا ہے یا وہ ہماری خوشی و رنج کا شریک ہے یا کوئی خاص طریقۂ عبادت یا پرستش اِس کی خوشی یا ناراضگی کا باعث ہوتا ہے وغیرہ وغیرہ دراصل ذات باری اس سے کہیں بالاتر ہے۔ الٰہیات کا یہ نقطہ آخری ہے۔ جہاں پہنچ کر مختلف مذاہب کے امتیازی خصوصیات یکقلم بے سود ہو جاتے ہیں۔

جب مذہب کی دنیا پر حکمرانی کا وقت ختم ہو چکا ہے۔ کسی زمانہ میں تمام انسانی اعمال کا منتہا یا محور محض مذہب خیال کیا جاتا تھا۔ مگر مذہب سیاست کی ڈور کا مقابلہ نہ کرسکا۔ اب مذہب اور سیاست میں کوئی مواصلت نہیں لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ مذہب بالکل معطل ہوگیا ہے البتہ سیاسی ضروریات میں مذہب کے قیود کا کوئی اثر باقی نہیں رہا۔ غرض مذہب کو سیاسیات سے جُدا کردینے کے بعد اس کے مانع قومیت ہونے کا خرخشہ بھی باقی نہیں رہتا ہے۔

ہم بلا خوف تردید کہتے ہیں کہ "اسلام" نے کسی حد تک قومیت کا صحیح تخیّل دیگر مذاہب کے مقابلے میں پیش کیا ہے۔ اِس کا دعویٰ ہرگز نہیں کیا جا سکتا کہ اسلام نے کسی زمانہ میں بھی قومی تفریق کو بالکل نیست نابود کر دیا تھا تاہم اسلامی حکومت قومی حکومت تھی۔ فتوحات اسلامی کا سرسری جائزہ لینے کے بعد آپ معلوم کرسکتے ہیں کہ بنی عبّاس کا زمانہ قریب الختم تھا

اسپین میں عربوں کی حکومت قائم ہو چکی تھی، ایشیائے کوچک میں ترکوں نے اور ہندوستان میں مغلوں نے سلطنتیں قائم کر لی تھیں۔ مگر ہم چاہے ان سلطنتوں کو "اسلامی" کہیں لیکن دراصل یہ سب قومی حکومتیں تھیں۔ مسلمان بھی کوئی علیحدہ قومیت نہیں بناتے۔ ہندوستان کی اسلامی حکومت تو صحیح معنوں میں خالص ہندوستانی حکومت تھی کیونکہ ہندوستان میں مسلمان مذہبی حیثیت سے داخل نہیں ہوئے تھے اور نہ انہوں نے "مذہبی حکومت" قائم کی تھی غرض جہاں کہیں مسلمان گئے پیغمبر اسلام صلعم کا یہ فرمان کہ "حب الوطن، من الایمان" ان کے پیشِ نظر رہا۔

موجودہ ایرانی و ترکی حکومتیں　مذہبی حکومتیں بھی نہیں کہی جا سکتیں؛ یہ قومی حکومتیں ہیں اور سچ پوچھئے تو مذہب قومیت کا قائم کرنیوالا ہے نہ کہ مانع۔

جذباتِ فرخ

از حضرت فرخ بنارسی

نگاہِ ناز سکون آفریں کبھی نہ رہی　　خلش مٹی تو محبت کی دلگی نہ رہی

مآلِ ترکِ محبت! ارے معاذ اللہ　　جو زندگی تھی کبھی اب وہ زندگی نہ رہی

فریبِ دہر، فریبِ نظر، فریبِ حیات　　اُٹھے جو پردے تو دنیا کی دلکشی نہ رہی

جفا سے اور ذرا دل کو آشنا کر دے　　وفا کا تیری بھروسہ ہی کیا رہی نہ رہی

ملال ہی کو سمجھنے لگے مآلِ حیات　　خوشی بھی جب کسی عنواں سے خوشی نہ رہی

سکوتِ ناز نے ٹھنڈا کیا بہانۂ شوق　　بقدرِ ظرف تمنائے گفتنی نہ رہی

وہ اک فریبِ جنون یا فریبِ غفلت ہے　　جو بیخودی میں محبت کی بیخودی نہ رہی

خیالِ دوریِ منزل تھا اضطراب فروش　　پہونچ گئے لبِ ساحل تو تشنگی نہ رہی

تعینات، عبادت میں بھی! ارے توبہ!　　یہ بندگی تو حقیقت میں بندگی نہ رہی

ملا جنون میں وہ پیراہنِ جنوں فرخ
کہ جس لباس سے شرمِ برہنگی نہ رہی

جذباتِ اثر

خان بہادر مرزا جعفر علیخاں صاحب اثر بی۔ اے



تابِ نظر نہیں، نہ ہو، کیفِ نظر بڑھائے جا
دیدہ و دل کی آرزو! دیدہ و دل پہ چھائے جا

صدقہ نگاہِ مست کا، آنکھ نہ یوں چرائے جا
ڈوبے ہوئے شراب میں تیر ادا چلائے جا

اجرِ نیازِ عشق کیا؟ نیم تبسم اک نظر
اسمیں بھی ہے دریغ اگر، خاک ہی میں ملائے جا

تیرے نثار پھر کوئی خاص ادائے دلبری
شیفتۂ جمال کو شیفتہ تر بنائے جا

بادۂ ناب میں ملا، چشم سیاہ کا خمار
ہوش بقدرِ ظرف ہے ظرف کو آزمائے جا

یہ تو کوئی ادا نہیں، لطف نہیں، جفا نہیں
اے نگہ کرشمہ زا، فتنہ کوئی جگائے جا

دشنۂ غمزہ تیز کر، تجھ سے یہ کس نے کہدیا
میں کروں عرضِ مدعا اور تو مسکرائے جا

تجھ پہ نثار حسرتیں، حسرتیں کیسی؟ جنتیں!
چھین لے اور لذتیں، لذتِ غم بڑھائے جا

تیرا شعار ہے جفا، میری سرشت ہے وفا
میں تجھے آزماؤں کیا، تو مجھے آزمائے جا

خاک بھی ہو تو خاک ہو رہگذر حبیب کی
دیدۂ اعتبار میں شان وفا بڑھائے جا

دوری و قرب ایک ہی، دل کو اگر ہو یکسوئی
نقش خودی مٹائے جا، ذوقِ دوئی اٹھائے جا

پرسشِ حال ہو، نہ ہو، انکو خیال ہو، نہ ہو
اُن سے ہی لو لگی رہے، گُن بھی انہیں کے گائے جا

رقص میں خود نشاط ہے، جوش یہ ہے نشاط کا
ہوش کو خیرباد کہہ، دھوم اثر مچائے جا



جلوۂ بے پناہ

(از حضرت شایق ہندو)

سیہ کریب کی ساڑی پہ نقرئی گرزدی
اندھیری رات میں تارے سے جھلملائے ہوئے

بھری کلائی میں نازک کریلیوں کا فروغ
کہ شاخِ بید پہ اک بیل پیچ کھائے ہوئے

گداز پاؤں میں نازک سی مخملی چپل
سوادِ روم و کاشان جگمگائے ہوئے

رُخِ صبیح پہ کاکل کے ریشمی لچھے
فضائے قدس پہ جبریل پر جھکائے ہوئے

جبیں پہ قشقۂ رنگیں کی لہر دوڑا کر
حدودِ کعبہ میں آتشکدہ جلائے ہوئے

کشادہ ماتھے پہ افشاں کے تار بکھرا کر
خطِ جبیں کو خطِ کہکشاں بنائے ہوئے

بھوؤں کے بیچ میں بیندی کے نقشِ زریں سے
ہلال و بدر کی سب تابشیں اڑائے ہوئے

وہ بادہ ریز نگاہوں کی سُکر پاش ادا
کبھی پئے ہوئے خود اور کبھی پلائے ہوئے

ہے موج موج جوانی تو فوج فوج ادا
کمر لچکتی ہوئی پاؤں ڈگمگائے ہوئے

مکتب اور میانجی

(از جناب احسن مارہروی)

اب سے پچاس برس پہلے ہندُستان کے تمام شہروں، قصبوں اور دیہات میں عربی، فارسی، اور اُردو کی تعلیم کے لئے چھوٹے بڑے مکتبوں کا عام رواج تھا۔

مکتب کے دو مفہوم ہماری بول چال میں عام ہیں، ایک تقریب بسم اللہ، دوسرے درسگاہ۔

پُرانے زمانے میں شادی بیاہ کی طرح مکتب کی تقریب بھی دھوم دھام سے ہوا کرتی تھی، دستور تھا کہ جب بچہ چار سال چار ماہ چار دن کا ہوجاتا تو یہ تقریب منائی جاتی، عمر کی قید اور اس تقریب کا رواج بہت پُرانا ہے۔ اکبرنامے میں ابوالفضل نے اکبر بادشاہ کے ختنہ و مکتب کا حال لکھتے ہوئے یہی سِن اور وقت بتایا ہے۔ جب وہ دن اور زمانہ آتا کہ یہ رسم ادا کی جائے تو عصر و مغرب کے درمیان تمام عزیزوں، دوستوں کی موجودگی میں لڑکے کو لایا جاتا، سب کے سامنے کسی بزرگ خاندان کے ہاتھوں پُرانی وضع کے کپڑے، جامہ، پاجامہ، قدحیا ٹوپی پہنوا کر اور پٹکا، پگڑی، سہرا بندھوا کر دولھا بنایا جاتا، پھر ایک تختی جس پر لاکھ کا رنگ ایک طرف ہرا دوسری طرف لال پھرا ہوتا، لائی جاتی، جس پر کوئی مولوی یا بزرگ خاندان بسم اللہ الرحمٰن الرحیم اور ایک آدھ آیت قرآنی لکھتا، پھر لڑکے کو اپنی گود میں بٹھا کر بسم اللہ پڑھاتا، یہ سماں دیکھنے کے قابل ہوتا، بچہ اتنے بڑے مجمع میں گھبرا گھبرا کر چاروں طرف دیکھتا، شرما شرما کر آنکھیں جھکا لیتا، پڑھانے والے بزرگ چمکارتے، پُچکارتے، تختی پر لکھے ہوئے الفاظ دُہراتے، مٹھائیوں، کھلونوں کا لالچ دیتے مگر لڑکا ٹس سے مس نہ ہوتا، بڑی بڑی مشکلوں، خوشامدوں سے خدا خدا کر کے آہستہ آہستہ لڑکے کی زبان ہلتی اور روتی ہوئی آواز میں وہ چار آدھ کٹے حرف نکلتے، جن کو سُن کر چاروں طرف سے مبارکباد کی آوازیں بلند ہونے لگتیں، پھر مٹھائی تقسیم ہوتی جس میں اکثر بڑے بتاشے ہوا کرتے تھے۔ اس تقریب کے بعد امیروں کے لڑکے اکثر اپنے گھروں میں پڑھوائے جاتے اور ہما شما کے بچے مکتبوں میں کھینچ کھانچ کر بھجوائے جاتے جن کی مکانی صورت یہ ہوتی کہ کسی چوپال میں پھٹی پرانی دریوں کے ٹکڑے یا ٹاٹ کے بوریے بچھا دیے

جاتے، یا کسی چھپر اور اُسارے کے سامنے دو ایک چوکیاں یا کھٹیاں ڈال دی جاتیں، یا زیادہ سے زیادہ کسی اِک درے میں چٹائیاں بچھا دی جاتیں۔ یہ حالت تو عام تھی، البتہ کسی وقف یا خانقاہ کے متعلق جو وقف ہوتا اُس کی حالت ایسے غریبا مئو مکتبوں سے کچھ بہتر پائی جاتی، وہاں کی عمارت بھی مخصوص ہوتی، فرنیچر بھی اچھی حالت میں ہوتا، لڑکے بھی زیادہ ہوتے، اور میاں جی کے ساتھ ایک خلیفہ بھی ہوتا۔

ایسے مکتب عموماً مسلمانوں کے اہتمام و انتظام میں ہوتے تھے، مگر اُن میں مسلمانوں کے ساتھ ہندوؤں کے بچے بھی گھلے ملے رہتے۔ اور وہ بھی فارسی، اُردو بلکہ بعض بعض عربی بھی پڑھتے تھے۔ نصابِ تعلیم دستور و رواج کے مطابق بلحاظ عمر و لیاقت قاعدۂ بغدادی کے آنا بانا تانا سے سکندر نامے اور شاہنامے تک کا نصاب دس پندرہ برس کی عمر میں تمام ہو جاتا تھا۔

پڑھنے پڑھانے کا دستور یہ تھا کہ اگر چند لڑکے ایک کتاب میں ہم سبق ہوتے تو سب مل کر میاں جی کے سامنے بیٹھتے، ایک لڑکا، پڑھتا جاتا، باقی سنتے رہتے، پڑھنے کا یہ دَور روزانہ بدلتا رہتا، اگر آج ایک نے پڑھا، تو کل دوسرے نے، پرسوں تیسرے نے، اسی طرح باری باری سے ہر لڑکے کو پڑھنے کا موقع دیا جاتا، سبق دینے سے پہلے پڑھے ہوئے سبق کا سننا لازمی ہوتا، آموختہ سُنانے کے لئے سب ہم سبق لڑکے اُستاد کے پاس ایک ساتھ نہیں جاتے تھے۔ ایک ایک جاتا اور آموختہ سُنا کر وہیں بیٹھا رہتا۔ جب سب سُنا چکتے تو وہ لڑکا جس کی باری ہوتی نیا سبق پڑھتا۔ بڑی اور اونچی کتابیں پڑھنے والے میاں جی سے پڑھتے اور چھوٹی عمر کے بچے خلیفہ جی کے پاس ہل ہل کر اور آوازیں ملا ملا کر پڑھنے سے زیادہ چلاّتے رہتے۔

پڑھنے کے ساتھ لکھنے لکھانے کا قاعدہ یہ تھا کہ ابتدائی بچوں کی تختیوں پر اُستاد اپنے قلم سے ا، ب، ت، کو نقطوں میں لکھ دیتے، بچے اُن پر قلم پھیرا کرتے، جب اس کی مشق ہو جاتی تو نقطوں کی جگہ روشنائی کے بغیر قلم سے ایسے گہرے نقش کھینچ دیئے جاتے کہ لڑکے اُن کو روشنائی سے نمایاں کر دیتے تھے۔ اس کے بعد خود لڑکوں سے لکھوایا جاتا۔ لکھنے کا آغاز الف بے تے سے ہوتا اور آٹھ دس برس کی مشق کے بعد قطعوں اور عبارتوں پر تمام ہو جاتا۔ یہ لکھائی تختی پر ہوا کرتی جس کو روزانہ دھویا جاتا اور اُس پر ہلکی ہلکی سیلکھری، کھریا مٹی یا ملتانی لگا کر دھوپ اور ہوا میں سکھایا جاتا پھر اُس پر تھوڑے تھوڑے فاصلے سے لکیریں کھینچ لی جاتیں۔ لکیروں کی وجہ سے جب سیدھی سطروں کے لکھنے کی عادت ہو جاتی تو لکیروں کے بغیر تختیاں لکھی جاتیں، تختی بائیں گھٹنے پر رکھکر

لکھی جاتی، لکھنے کا وقت عموماً دوپہر کے بعد ہوتا، اور اُن کے دکھانے اور اصلاح لینے کا وقت مکتب کے آخری حصے میں ہوتا، تختیاں دکھانے کے بعد چھٹی ہوجایا کرتی تھی۔

ہفتے میں چھ دن پڑھائی ہوتی تھی، جمعرات کو دوپہر بعد صرف تختی لکھی جاتی اور اُس کے بعد ہی چھٹی ہوجاتی۔ جمعرات کو نیا سبق نہیں پڑھایا جاتا تھا صرف آموختہ سُنا جاتا، نئی کتاب بُدھ کے دن شروع کی جاتی، جمعرات کو اکثر بیت بازی بھی ہوا کرتی تھی، لڑکوں کی کئی کئی پارٹیاں بن جاتی تھیں، اکثر لڑکے بیت بازی کے لئے مخصوص ایسے شعر یاد کرلیتے تھے جو ص ض ط ظ جیسے مشکل حرفوں پر ٹوٹتے تھے۔ مقابل پارٹی کے لڑکے جب ایسے حرفوں کے اشعار جواب میں نہ پڑھ سکتے تو اُن پر مات ہوجاتی۔

نئی کتاب شروع ہونے پر میاں جی اور خلیفہ جی کو آغازی کے نام سے نذرانہ ملا کرتا، اور بتاشے بھی بٹا کرتے، مسلمان بچہ جب عم کے پارے میں سورۂ اقرا شروع کرتا تو اُس کے گھر سے گھنگھنیاں تقسیم ہونے کو آیا کرتی تھیں۔ بڑے لڑکے اپنی عمر اور قوت کی وجہ سے اپنے چھٹ بھیّوں پر خاص اثر رکھتے تھے، جب دو پارٹیاں کسی اختلاف کے سبب سے آپس میں ٹکراتیں اُس وقت ہر سرغنہ اپنے زیر اثر بچوں کو اُبھار کر اپنی مخالف پارٹی کے مقابلے میں لے آتا۔ یہ جنگ مصنوعی ہفتوں اور مہینوں قائم رہتی، مدتوں ایک گروہ دوسرے گروہ سے کھچا کھچا رہتا، بول چال بند رہتی، جس فریق کو موقع مل جاتا وہ استادوں سے اپنے مخالفوں کی شکایتیں کرتا اور سزائیں دلواتا، یہ نوک جھونک اُس وقت تک ختم نہ ہوتی جب تک ایک فریق اپنی ہار مان کر جرمانہ بھگتنے پر راضی نہ ہوجاتا۔

میاں جی اپنی شخصی حکومت کے مظاہرے میں کسی کی رعایت نہیں کرتے تھے، امیر، غریب، چھوٹے بڑے کسی میں کوئی امتیاز نہ ہوتا۔ سزا کا معیار میانجی کے غصے پر ہوا کرتا گوشمالی، چپت بازی کان پکڑوا کر اُٹھا بیٹھی، اور ٹانگیں پھیلوا کر مرغا بنادینا، یہ سزائیں معمولی خطاؤں پر دی جاتی تھیں، جیسے سبق یاد نہ کرنا، دیر میں آنا یا کسی کی جھوٹی چغلی کھانا، چھڑیوں اور قمچیوں کی مار سنگین جرموں پر ہوا کرتی تھی۔

جمعرات کو میاں جی کا حکم ہوتا کہ تختیوں پر نئے نئے قطعے اور شعر لکھے جائیں، جو اِس قسم کے ہوتے تھے:۔

قلم گوید کہ من شاہِ جہانم — قلم کش را بدولت می رسانم
اگر بدبخت باشد من چہ دانم — ولے یک بار دولت را رسانم

زندہ کُنی عطائے تو ور بکشی فدائے تو
دل شدہ مبتلائے تو ہر چہ کنی رضائے تو

ایک دن کسی لڑکے نے اُردو کا یہ مصرع لکھکر پیش کیا:-

شاعروں کا روزِ محشر پوست کھینچا جائے گا

میاں جی صاحب مشہور کیا، غیر مشہور شاعر بھی نہ تھے مگر معلوم نہیں اُس دن کہاں سے اُن کی رگِ شاعری اُبھر آئی، اس مصرع کو پڑھکر آپے میں نہیں رہے، پوری طاقت سے تختی کھینچ ماری پٹنے والے نے ہاتھ پر روکنا چاہا مگر ہتیلی کی کھال کیا ڈھال بن سکتی، نتیجہ یہ ہوا کہ تختی سے لے کر فرش تک خون کی ندی بہہ گئی، یہ پوچھنا کہ اس سانحے کا میاں جی صاحب پر کیا اثر ہوا، اور لڑکے کے مربیوں نے کیا بازپرس کی، بیکار ہے۔ اُس زمانے کے میاں جیوں کی حکومت خود اختیاری ایسی بے پناہ ہوتی تھی کہ اُن کی مار دھاڑ کے سامنے نہ کسی کو دم مارنے کی مجال ہوتی نہ خود میاں جی کو ایسی باتوں پر افسوس و ملال ہوتا۔

مکتبوں کی دواتوں میں روشنائی ڈالنے کے تمام لوازمات، اور قلم بنانے کی جملہ خصوصیات کو ایک فن کا درجہ حاصل تھا، جس کے ماہر خاص خاص بڑی عمر کے لڑکے ہوا کرتے تھے، قلموں کی کئی قسمیں ہوتی تھیں، کچے سرکنڈے کا قلم، پکے ہوئے سینٹھے کا قلم، واسطی قلم، بید مشک کا قلم، چھوٹے لڑکے قلم بنوانے کے لئے خوشامدیں کیا کرتے، اور اِسی فن دانی کی بدولت بڑے لڑکے چھوٹوں پر اپنی حکومت کی دھونس جماتے رہتے، قلموں میں جو ریشے ہوتے ہیں اُن کے متعلق مکتبی عقیدہ تھا کہ اس ریشے کو جو لڑکا دانتوں میں لگائے بغیر نگل لیگا وہ خوشنویس ہوجائے گا۔ اکثر لڑکے نگلنے کی کوشش کرتے مگر ناکام رہتے پھر بھی اس حرکت سے باز نہیں آتے تھے۔

اُس زمانے میں جو کتابیں مکتبوں میں پڑھائی جاتی تھیں اُن کے لئے کوئی بک ڈپو قائم نہ تھا، مہینے دو مہینے پیچھے کتب فروش گٹھریوں میں باندھ کر کتابیں لایا کرتے، اُن کی آمد لڑکوں کے لئے بڑی دلچسپی کا سبب ہوجاتی، پہلی دلچسپی تو یہی تھی کہ جب تک کتب فروش مکتب میں رہتا پڑھائی سے بے فکری رہتی، پھر کتابوں کی دیکھ بھال، میاں جی سے پسند و ناپسند کے مشورے، پھر کتابوں کے دام لانے کو گھر جانا، اور وہاں سے دیر میں آنا، غرض کتب فروشوں کا مکتب میں آنا لڑکوں کے لئے عید کا آنا ہوجاتا تھا، اور کتاب فروش کو طرح طرح کی ترکیبوں اور سازشوں سے روزانہ مکتب میں آنے کی دعوت دیجاتی تھی۔

ہفتے میں جمعہ کے علاوہ مسلمان اور ہندوؤں کے تہواروں کی بھی چھٹیاں ملی جلی ہوا کرتی تھیں، عید، بقرعید، شب برات اور ہولی، دیوالی، دسہرے میں دونوں قوموں کے بچے بلاتفریق چھٹیاں منایا کرتے تھے۔ ان موقعوں پر استاد سب شاگردوں کو مختلف رنگوں کے کاغذوں پر ان تہواروں کے متعلق دو ایک شعر لکھکر بانٹا کرتے تھے، جس کو عیدی کہتے ہیں۔ لڑکے عیدیاں لے کر اپنے اپنے گھر جاتے اور حسب حیثیت استادوں کے لئے نذرانہ لاتے، یہ ٹیکس ایسا ہوتا جو کسی طرح چھوڑا نہیں جاتا تھا۔ لڑکے ماں باپ سے لڑتے، جھگڑتے، اور جس طرح بن پڑتا کچھ نہ کچھ نقد لے کر اُچھلتے کودتے آتے اور میاں جی کی نذر کرتے۔ دو ایک عیدیاں آپ بھی سنیئے:۔

عید آئی دل کی کلیاں کھل گئیں ۔۔۔ دودھ شکر میں سوّیاں رل گئیں
پڑھ دوگانہ عیدگہ سے جب چلے ۔۔۔ ملتے ملتے چھاتیاں تک چھل گئیں

آئی شب برات پٹاخے چھوٹیں گے ۔۔۔ حلوہ بنا ہے گھر میں مزہ لے کے کھائیں گے
لائیں گے عیدی اپنے میاں جی کے واسطے ۔۔۔ دو دن کی چھٹیاں ہوئیں خوشیاں منائیں گے

میاں جی تحفے تحائف کے بہت شائق ہوا کرتے تھے، لڑکوں کے ماں باپ بھی بچوں کی خاطر اُستادوں کی خدمتیں کرتے رہتے تھے۔ جن بچوں کے گھر مکتب سے پاس ہوتے وہاں سے بآسانی فرمائشیں پوری ہوتی رہتی تھیں۔ پان، تمباکو اور اِسی قسم کی چھوٹی چھوٹی فتوحات، روز مرہ کا معمول تھا۔ کبھی کبھی دعوتوں اور جڑاول کا بوجھ بھی گھر والوں کو اٹھانا پڑتا۔

مکتبوں کی لطیف اور دلچسپ داستانیں اتنی زیادہ ہیں کہ کہنے والا تھک جائے گا مگر وہ کہانیاں ختم نہ ہوں گی۔ لہٰذا چلتے چلاتے میاں جیوں کی تین قسموں کا مختصر حال سن لیجئے اور مجھے چھٹی دیجئے:۔

قسم اول، موروثی میاں جی، جہاں دیدہ، کہن سال مُنحنی، مگر رعب دار ہوتا ہے۔ اپنی شخصی حکومت کو پوری قوت کے ساتھ قائم رکھتا ہے، کسی کا دباؤ نہیں مانتا اور نہ کسی کی اکھاڑ پچھاڑ اُسے مکتب سے بے دخل کر سکتی ہے، وہ ایسا وزنی گھن ہوتا ہے کہ کسی کے اٹھائے اُٹھ نہیں سکتا۔

قسم دوم، شکمی میاں جی جو غیر دخیل کار کی حیثیت رکھتا ہے۔ مفلوک الحال اور فضولی معلم ہوتا ہے، اکثر امیروں کی ڈیوڑھیوں پر چھوٹے چھوٹے بچوں کو پڑھانے جاتا ہے۔ قاعدۂ بغدادی اور عم کے پارے سے زیادہ نہیں پڑھا سکتا۔ مگر اپنے آپ کو بہت قابل سمجھتا ہے، کسی جگہ جم کر نہیں رہتا۔ غریب و

ربیع کی فصلوں کی طرح ہر موسم میں نئی کاشت کی فکر میں رہتا ہے۔ حقّہ، پان، اور سیر آدھ سیر آٹے دال کی فرمائش میں تامل نہیں کرتا، اگر یہ ٹیکس وصول نہ ہو تو پڑھانے میں اُس کا جی نہیں لگتا ایک حکایت مشہور ہے کہ کسی کھاتے پیتے آدمی نے ایسے شکمی میاں جی کو نوکر رکھا، وہ خشک تنخواہ دینی چاہتا تھا۔ میاں جی کا اصرار تھا کہ خوراک بھی ملنی چاہیئے۔ ضرورت و حاجت سے مجبور ہو کر شکمی میاں جی خشک تنخواہ پر راضی ہو گیا، اور بچوں کو پڑھانے لگا۔ کچھ دنوں کے بعد معلوم ہوا کہ میاں جی صاحب بچے کو صرف رواں پڑھا دیتے ہیں معنی نہیں پڑھاتے، اس کا سبب پوچھا گیا تو نہایت صفائی سے فرمانے لگے کہ جناب والا! فدوی نے پہلے ہی تنخواہ کے ساتھ خوراک کی بابت عرض کیا تھا، آپ نے صرف تنخواہ منظور فرمائی، خوراک کا بار نہیں اُٹھایا، کمترین کے پاس اس کے سوا کوئی جواب نہ تھا کہ بچّوں کو صرف رواں پڑھاتا رہے، اگر اب بھی تنخواہ کے ساتھ خوراک مقرر کر دی جائے تو معنی بھی بتاتا رہونگا۔ ایک اُجرت میں ایک ہی کام ہو سکتا ہے، دوسرا نہیں ہو سکتا کیا آپ نے یہ کہاوت نہیں سنی!

دال بھی ہم کو وہ نہیں دیتا آپ کھاتا ہے گوشت، مرغی کا

قسم سوم، گشتی میاں جی، یہ طعام تلاش اور خستہ حال گھر گھر پھر اکر اپنا پیٹ پالتا ہے، بچے، جوان، بوڑھے، بالغ نابالغ، لولے، لنگڑے، غرض کہ نوع انسانی کے ہر اَن پڑھ اور کُبڑ کو اپنے جال میں پھانسنے کی کوشش کرتا ہے، اس کی علمیت و قابلیت کی گہرائی اور اونچائی زمین کے ہلنے، گاوِ زمین کے سینگ بدلنے اور چاند میں بیٹھکر بُڑھیا کے چرخا کاتنے تک محدود ہوتی ہے۔ اُس کا پڑھانا صرف وقت گزارنے کا مشغلہ ہوتا ہے۔ اُس میں ربڑ کی خاصیت ہوتی ہے وقت کا گھٹاؤ بڑھاؤ اُس کے ہاتھ میں ہوتا ہے، کارگزاری کا اعلان کرنے کے لئے لڑکے کی آواز سے آواز ملا کر خود بھی پڑھتا رہتا ہے۔ اور جلد جلد ورق اُلٹ الٹ کر یہ دکھاتا ہے کہ اتنا زیادہ پڑھا دیا ہے، اور اگر گھٹانا چاہے تو کسی ایک حرف پر اُنگلی جما کر بیٹھ جاتا ہے اور لڑکے سے زیادہ مل ملکر ایک ہی لفظ کی جگالی کرتا رہتا ہے۔ اسی گشتی قسم کے میاں جی کا ایک لطیفہ سُنیئے، جناب ایک بچّے کو پڑھایا کرتے تھے اُس کے باپ کو معلوم ہوا کہ میاں جی صاحب اتنا سبق پڑھا دیتے ہیں کہ بچے کو یاد نہیں ہوتا جب اسکی پوچھ گچھ کی گئی تو بڑے اطمینان سے فرمانے لگے کہ یہ خبر کسی نے آپ کو غلط پہونچائی ہے میں تو اِس قدر کم پڑھاتا ہوں کہ اُس سے کم کوئی دوسرا پڑھا ہی نہیں سکتا۔ خیال فرمایئے، فَوَیْلٌ لِّلْمُصَلِّیْنَ میں سے فَوَیْ آج اور لِّلْ کل۔

"بادشاہ۔ آئین سلطنت اور ایک عورت"

ایک قصہ

(از برناڈ شا) Bernard Shaw

[چند سال ہوئے جب شاہ جارج پنجم سخت علیل تھے تو انگلستان کے نامور ادیب جارج برناڈ شا نے "بادشاہ اور ڈاکٹر لوگ" کے نام سے ولیعہد اور ایک شاہی طبیب کے درمیان ایک خیالی مکالمہ لکھا تھا۔ اب موصوف نے مندرجہ بالا عنوان سے اسی فرضی مکالمہ کا ایک دوسرا سلسلہ لکھا ہے۔ جس میں نہایت عمدہ طریقہ سے اس صورت حالات کی دلآویز تصویر کھینچی ہے جو انگلستان میں دسمبر ۱۹۳۶ء کے پہلے ہفتہ میں پیدا ہو گئی تھی۔ ا۔ ز۔]

لال بجھکڑوں کی سلطنت میں، وہی شہزادہ جس کی پریشانیوں کا حال ہم اس کے باپ کی علالت میں اس سے پہلے قلمبند کر چکے ہیں اپنے نامور والد کے انتقال کے بعد تخت سلطنت پر جلوہ گر ہوا۔ مگر، تخت پر بیٹھتے ہی وزرائے سلطنت اور مقتدایان دین سے اس کی اَن بن ہو گئی۔ چنانچہ تاجپوشی کی نوبت بھی آنے نہ پائی کہ چند ناگوار واقعات رونما ہوئے جو ذیل میں ہدیۂ ناظرین کئے جاتے ہیں:۔

بات یہ تھی کہ نئے بادشاہ کی عمر اگرچہ چالیس کے لگ بھگ تھی لیکن ابھی تک اس نے شادی نہیں کی تھی۔ مگر اب بادشاہ ہونے کے بعد اس نے اپنی خانہ آبادی کا ارادہ کیا تاکہ صاحب اہل و عیال ہو کر اپنی رعایا کے سامنے خانہ داری کا قابل قدر نمونہ پیش کر سکے۔

چونکہ مزاج کے لحاظ سے وہ بہت ذکی الحس واقع ہوا تھا اور وزرائے سلطنت کی باتیں اکثر اوقات اشتعال انگیز ہوتی تھیں، اسلئے وہ چاہتا تھا۔ کہ کوئی نیک مزاج اور شریف طبع بیوی ملے جو فرصت کے اوقات میں اس کی دلبستگی کا باعث ہو اور اس کے درد دکھ کو ہلکا کر سکے۔

اتفاق دیکھئے۔ کہ بادشاہ کی ایک ایسی خاتون سے شناسائی تھی جس میں وہ تمام خوبیاں موجود تھیں جن کا وہ خواہاں تھا۔ جہانتک مجھے یاد ہے اس خاتون کا نام مسز ڈیزی بیل تھا۔ وہ قوم سے امریکن تھی اس لئے قدرتاً اس سے پہلے دو شوہروں سے نکاح کر کے طلاق لے چکی تھی۔ اس اعتبار سے گمان غالب تھا کہ وہ بادشاہ کے لئے جو ابھی تک ناکتخدا رہنے کی وجہ سے دنیا داری سے ناواقف و ناتجربہ کار تھا۔

اچھی بیوی ثابت ہوگی۔ بظاہر اس کی پسند مناسب اور قدرتی تھی اور اسمیں کسی کو اعتراض کی گنجائش نہ تھی لیکن آپ جانتے ہیں۔ لال بجھکڑوں کے ملک میں یار لوگ ہر وقت چلتی گاڑی میں روڑے اٹکانے کو تیار رہتے ہیں۔ یہاں کے مدبران سلطنت اور ارکان حکومت بھلا اس معاملہ کو شور قیامت برپا کئے بغیر کیسے رہنے دیتے۔ ضلع کے ضلع برباد ہو جائیں انھیں پرواہ نہ ہوگی بلکہ اس کی ذمہ داری وہ بے تکلف دوسروں کے سر منڈھ دیں گے اور یہ منادی کرادیں گے کہ لوگو! اب قیامت آنیوالی ہے کیونکہ ایک غیر ملکی ڈکیٹیٹر نے یہ کہدیا ہے کہ شہر ڈوور کی سڑک پر میل کے پتھر لگے ہوئے ہیں"

✣ ✣ ✣

پس بادشاہ کو اس بات پر کوئی تعجب نہ ہوا جب ایک روز دوپہر کے وقت یا اس سے کچھ قبل یا بعد اسے اچانک یہ اطلاع ملی کہ لاٹ پادری صاحب اور وزیر اعظم دردولت پر حاضر ہیں اور فوری شرف باریابی چاہتے ہیں

✣ ✣ ✣

بادشاہ صبح کے وقت مسز بیل کی صحبت سے لطف اندوز ہو چکے تھے، اسلئے اس وقت بہت خوش تھے۔ انھوں نے ان دونوں حضرات کو فوراً طلب کر لیا۔ اور شاہانہ اخلاق سے پیش آئے۔ خدام دولت نے بادۂ ناب کے جام اور بیش قیمت سگار پیش کئے، لیکن دونوں صاحب کچھ ایسے گھبرائے ہوئے اور پریشان تھے کہ انھوں نے اس معمولی خاطر و تواضع کو بھی قبول نہ کیا۔ ان کے طرز عمل سے سخت انتشار طبع کا اظہار ہوتا تھا۔ چنانچہ بادشاہ کو بالآخر مجبوراً ان کی کیفیت مزاج اور وجہ اضطراب دریافت کرنا پڑی۔

بادشاہ:۔ کہیئے خیریت تو ہے، مزاج کیسا ہے؟

وزیر اعظم:۔ خداوند ہمارے مزاج کی کیفیت کیا دریافت فرماتے ہیں۔ ملک کے اخبارات میں ہماری مزاج پرسی ہو رہی ہے۔ فوٹو پر فوٹو چھپ رہے ہیں، حتیٰ کہ لیڈی کے ننھے کتے کی بھی تصویریں شائع ہوئی ہیں۔ اب حضور ہی فرمائیں۔ اس کے متعلق اعلیحضرت کا کیا ارادہ ہے؟

بادشاہ:۔ اسوقت تو کوئی خاص بات نہیں ہے۔ میری تاجپوشی کی رسم تو مئی میں ادا ہوگی مگر میں اپریل ہی میں ڈیزی سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔

وزیر اعظم:۔ اعلیحضرت! یہ قطعی نا ممکن ہے۔ بلکہ اس کا خیال کرنا ہی جنون ہوگا۔

لاٹ پادری:۔ (واعظانہ لہجہ میں گویا منبر پر بیٹھے ہوئے تلقین فرما رہے ہیں) شادی کا سوال ہی کیسے پیدا ہو سکتا ہے جہاں پناہ! آپ اس عورت سے شادی نہیں کر سکتے۔

بادشاہ:۔ معاف فرمائیے۔ میری رائے میں آپ اسے مسز بیل کے نام سے یاد کریں اور اگر پسند خاطر ہو تو آپ صرف ڈیزی کہہ سکتے ہیں۔

لاٹ پادری:۔ حضور والا۔ اگر مجھے نکاح پڑھانا پڑا تو مجھے اسے "یہ عورت" کہنا ہوگا پھر جو نام اسکا خانۂ خدا میں لیا جائیگا۔ اُسی نام سے آپ کے حضور میں بھی اُس کا ذکر بے جا نہیں ہو سکتا۔ لیکن مجھے نکاح پڑھانے سے انکار ہے۔

وزیر اعظم:۔ (نے کسیقدر بلند آواز سے اسکی تائید اسطرح کی) اور میں اپنے عہدہ سے مستعفی ہو جاؤنگا۔"

بادشاہ:۔ معاذ اللہ! کیسی مصیبت کا سامنا ہے۔ لیکن کیا اس بات کی یاد دلانا نامناسب ہوگا کہ اور لوگ آپکی جگہ لینے کو موجود ہیں، مثلاً سینڈی میکوسی آج ہی میری حمایت میں "شاہی پارٹی" قایم کرنے کو تیار ہیں اور تمام رعایا میری طرف ہی ہے۔ بہر حال آپکو تو تاجپوشی سے قبل ہی مستعفی ہونا پڑے گا۔

لاٹ پادری:۔ مجھ پر اس طعنہ کا کوئی اثر نہیں ہو سکتا۔ خداوند یسوع کا کلیسا اس خلاف شادی بیاہ کی اجازت نہ دے گا۔

بادشاہ:۔ اگر ایسا ہو تو میری مشکل بہت آسان ہو جائیگی۔ در اصل مذہبی رسمیات میرے لئے ایسی سہل نہیں ہیں جیسی کہ ولیم فاتح کے نزدیک تھیں جس کی موت کی خبر بھی غالباً آپ لوگوں میں سے بہت سے اصحاب نے ابھی تک نہیں سُنی ہے۔ بیچارے ولیم کو صرف مٹھی بھر قسمت آزما سپاھیوں کا خیال رکھنا پڑتا تھا۔ وہ بھی سب کے سب ایک ہی کے فرقہ کے عیسائی تھے۔ مگر مجھے پانچ نہیں بلکہ پچاس کروڑ آدمیوں کا لحاظ رکھنا ہے، ان میں صرف گیارہ فیصدی عیسائی ہیں۔ اور وہ بھی اتنے چھوٹے چھوٹے فرقوں میں بٹے ہوئے ہیں کہ اگر ایک فرقہ کے اعتقادات کی تائید میں کوئی کلمہ زبان سے نکالا جائے تو اس سے دوسرے فرقہ کے مذہبی جذبات کو ٹھیس لگ جائیگی۔ مثلاً تخت نشینی کے وقت میرا پروٹسٹنٹ فرقہ سے تعلق رکھنا پاپائے اعظم اور ان کے پیرو کلیسا کی سخت توہین ہے۔۔۔۔۔ اگر میں کسی ایسے گرجے میں جاکر نکاح پڑھالوں جسپر لمبا سا مینار بنا ہوتا ہے تو یہ کویکر فرقہ کے لوگوں کی ناراضی کا باعث ہوگا۔ اور اگر میں کلیسائے انگلستان کی انتالیس دفعات کا دم بھردوں تو گویا میں اپنی محبوب رعایا کے ایک بہت بڑے طبقہ کو مردود و ملعون قرار دیتا ہوں۔ اور کروڑوں آدمی مجھے اپنے خدا کا دشمن سمجھنے پر مجبور ہونگے بہر حال تاجپوشی کی تقریب میں بہت سی دقیانوسی مذہبی رسمیں داخل ہو گئی ہیں۔ مگر میں ان میں

کوئی تغیر و تبدل نہیں کر سکتا۔ کیونکہ یہ آپ لوگوں کا کام ہے۔ لیکن اپنی کروڑہا رعایا میں سے کسی ایک کے مذہبی جذبات کو صدمہ پہونچائے بغیر اپنی مرضی کے مطابق قانونی حیثیت سے شادی کر سکتا ہوں چنانچہ میرا یہی ارادہ ہے کہ کسی ڈسٹرکٹ رجسٹرار کے سامنے سول میرج، کر لوں گا۔ کہیئے اس بارہ میں آپ کی کیا رائے ہے ؟

لاٹ پادری :۔ اس قسم کی باتوں سے میرے کان قطعی ناآشنا ہیں۔ اور یہ بات انتہا درجہ کی قابل اعتراض ہے۔ گو اس صورت میں میرے لئے یہ ضرور آسانی ہو جائیگی کہ مجھے اس مخمصے سے نجات ملجائیگی۔

وزیر اعظم :۔ آہ بشپ صاحب! کیا آپ میرا ساتھ چھوڑے دیتے ہیں ؟

لاٹ پادری :۔ جہاں پناہ نے اسوقت ایسی خلاف توقع بات ارشاد فرمائی ہے کہ مجھے اسوقت اس کا کوئی جواب نہیں سوجھتا۔ بہرحال جب تک میں اس کا جواب سوچتا ہوں آپ اس مسئلہ کی آئینی اہمیت پر بحث کیجئے۔

وزیر اعظم :۔ جہاں پناہ! آپ آئین مملکت کی خلاف ورزی نہیں فرما سکتے۔ اور پارلیمنٹ کو سبھی قسم کے اختیارات حاصل ہیں۔ وہ حضور معلیٰ کو اس کی اجازت نہ دیگی۔

بادشاہ :۔ بیشک پارلیمنٹ کو یہی حیثیت حاصل ہے لیکن یہ شہرت اسیوقت تک قائم ہے جبتک پارلیمنٹ کوئی غیر معمولی کام نہ کرے لیکن میں بھی آئین پسندی میں آپ سے کسیطرح کم نہیں ہوں۔ آپ یہ بھی سمجھ لیں کہ اگر آپ مجھے اس مسئلہ میں ملک کی رائے دریافت کرنے پر مجبور کریں گے تو میں پارلیمنٹ برخاست کرنے اور از سر نو انتخاب کے ذریعہ استصواب رائے کرنیکو بھی تیار ہو جاؤں گا۔ میں اتنا جانتا ہوں کہ آپ کو شاندار شکست ہوگی کیونکہ عوام بادشاہ کی حمایت کریں گے نہ کہ آپکی۔ اخباری بم چخ مجھے مرعوب نہیں کرتی ہے۔

وزیر اعظم :۔ لیکن اسوقت عام انتخاب پارلیمنٹ کا کوئی سوال ہی نہیں ہے۔ سوال تو صرف یہ ہے کہ آپ اپنے وزراء کے مشورہ پر کاربند ہوں گے یا نہیں ؟ بس ہمارے اور حضور معلے کے درمیان یہی ایک سوال ہے۔

بادشاہ :۔ اچھا فرمائیے آپکی کیا صلاح ہے۔ آپ مجھے کس سے شادی کرنیکی اجازت دیتے ہیں۔ میں نے اپنا انتخاب تو کر ہی لیا ہے۔ اب آپ بھی میرے لئے کسی کو انتخاب فرما دیجئے۔ آپ کسی کی شادی کے مسئلہ پر بادہوائی باتیں نہیں کر سکتے ہیں۔ فرمائیے آپ میرے لئے کس کو پسند کرتے ہیں۔ اُسکا نام بتائیے۔

وزیر اعظم :۔ حضور معلے مجلس وزراء نے ابھی اس مسئلہ پر کوئی غور نہیں کیا ہے خداوند نعمت یہ بحث مناسب نہیں ہے۔

بادشاہ:۔ کیوں! آپ کی مراد یہ ہے کہ میں حجت میں آپ کو مات دیرہا ہوں۔ لیکن میرا ارادہ تو یہی ہے اور میرا خیال ہے کہ مجھے کرنا بھی یہی چاہیئے۔

وزیر اعظم:۔ نہیں حضور! اسمیں مات کھانیکی کوئی بات نہیں ہے۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ میں آپ کے لئے بیوی کا انتخاب نہیں کرسکتا۔ آپ ہی فرمائیے کیا میرے لئے یہ ممکن ہے۔

بادشاہ:۔ اگر نہیں ہے تو آپ مجھے اس بارہ میں صلاح و مشورہ بھی نہیں دے سکتے۔ اور جب آپ کوئی مشورہ ہی نہیں دے سکتے تو میں آپ کے مشورہ پر عمل بھی نہیں کرسکتا۔

وزیر اعظم:۔ سرکار! یہ تو فضول کی منطق ہے۔ مجھے جہاں پناہ سے ایسی توقع نہ تھی۔ میرا جو مدعا ہے۔ حضور اُسے بخوبی سمجھتے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ شاہی خاندان کی کوئی لیڈی ہو یا کم از کم امریکن تو نہ ہو۔

بادشاہ:۔ خیر آپنے آخر کا ایک بات تو ٹھکانے کی کہی۔ مگر کیسے تعجب کی بات ہے کہ انگلستان کا وزیر اعظم امریکہ والوں کو علی الاعلان "اچھوت" قرار دیتا ہے۔ افسوس آپ اس قوم کی توہین کر رہے ہیں جس کی برادرانہ دوستی پر میری سلطنت کے مشرقی جزو کی بنیاد قائم ہے۔ میرے دانشمند دوستوں اور مدبر احباب کا خیال ہے کہ بادشاہ انگلستان کی ایک امریکن لیڈی کیساتھ شادی سیاسی حیثیت سے حسن تدبیر کی بہترین مثال ہوگی۔

وزیر اعظم:۔ حضور والا! مجھے یہ بات نہ کہنا چاہیئے تھی۔ دراصل یہ اتفاقیہ زبان سے نکل گئی۔

بادشاہ:۔ خیر جانے دیجیئے میں اس کو بالکل نظر انداز کردونگا۔ لیکن آپ ابھی تک شاہی خاندان کی دلہن کا خواب شیریں دیکھ رہے ہیں۔ آپ ابھی سترھویں صدی کے بادشاہوں کی مصلحت آمیز رشتہ داریوں کے خیال میں مست ہیں۔ میں انگلستان کا بادشاہ اور برطانیہ عظمیٰ کا شہنشاہ تمام یوروپ میں ایک بھکاری کی طرح بیوی کی تلاش میں چکر لگاتا پھروں۔ اور کسی محروم تخت و تاج اور راندۂ درگاہ شاہ فرانس کی پانچویں یا چھٹی پشت کی کوئی لڑکی یا سابق شاہان آسٹریا یا سابق قیصر جرمن کے خاندان کی نام لیوا کوئی خاتون یا زار روس کی نسل کی کوئی بچی کھچی یادگار تلاش کرلاؤں جس سے اس ملک میں نہ کوئی واقف ہو اور نہ کسی کو اس کی پرواہ ہو۔ معاف کیجیئے میں ایسی حماقت نہ کرونگا۔ جسے کوئی بھی اچھی نگاہ سے نہ دیکھے۔ اگر آپ ابھی تک سترھویں صدی ہی میں رہتے ہیں تو میں بیسویں صدی کا ہوں۔ اسوقت تمام دنیا میں جمہوریت کا زور ہے۔ آجکل بڑی بڑی عظیم الشان سلطنتوں کی حکمرانی سابق رنگ سازوں، معماروں، فوج کے معمولی ترقی فتہ سپاہیوں اور پرانے موچیوں کے لڑکوں جیسے معمولی معمولی لوگوں کے سپرد

ہے۔ کیا میں ان میں سے کسی کی لڑکی سے شادی کروں۔ بہرحال آپ میرے لئے کوئی خسر تجویز فرما دیجئے۔ دنیا خالی نہیں ہے۔ شاہ ایران افندی، وا آماترک، سائینور بسارڈوں، ہر ٹلر اور روس کا فولادی بادشاہ، غرض یہ سبھی موجود ہیں اور موجودہ زمانے کے یہی بادشاہ ہیں۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ ان عظیم الشان حکمرانوں میں سے کوئی بھی اپنی کسی عزیزہ کو انگلستان کے قدامت پرست بادشاہ کے ساتھ شادی کرنیکی اجازت نہ دیگا۔ اور میں یہ بھی بتلائے دیتا ہوں کہ فی زمانہ یوروپ میں کوئی شاہی خاندان ایسا نہیں ہے جہاں میں انگلستان کی شان کو ضعف پہونچائے بغیر شادی کر سکتا ہوں اور اگر آپ کو اتنی بات بھی نہیں معلوم تو آپ کو دنیا کے حالات کی کوئی خبر نہیں ہے۔

وزیر اعظم:۔ حضور مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ اسوقت عشق و محبت میں دیوانے ہو رہے ہیں۔

بادشاہ:۔ ٹھیک! لندن کی ایک چھوٹی سی ٹولی کے نظر میں جو زمانہ حال سے دو تین صدی پیچھے ہیں ایسا ہی نظر آتا ہوں۔ لیکن نئی دنیا مجھ سے زیادہ واقف ہے۔ خیر اب اس بحث کو جانے دیجئے۔ اور یہ فرمائیے کہ آپ کس لیڈی کو میرے لئے پسند کرتے ہیں۔

وزیر اعظم:۔ حضور معلےٰ دنیا میں ہزاروں عورتیں موجود ہیں لیکن کسی کا نام نہیں لے سکتا۔

بادشاہ:۔ (لاٹ پادری صاحب) آپ ہی میرے لئے کوئی لیڈی انتخاب کر دیجئے۔

لاٹ پادری:۔ نہیں حضور والا! آپ نے یہ سوال اسقدر اچانک اور غیر متوقع کیا ہے کہ اسوقت میرا ذہن اس کے جواب سے بالکل کورا ہے۔ میری رائے میں تو ہمیں تخت سے دستبرداری کے امکان پر بھی غور کر لینا چاہیئے۔

وزیر اعظم:۔ بیشک! بیشک!! اگر جہاں پناہ تخت و تاج سے دستبردار ہو جائیں تو تمام مشکلات خود بخود حل ہو جائیں۔

بادشاہ:۔ مگر یہ تو سوچ لیجئے کہ خدمت خلق کا جو مقدس فرض میں نے اپنے اوپر لیا ہے اور جس کے لئے آپ کے احباب ایسی دلدوز اپیلیں کرتے رہتے ہیں وہ مجھے بھلا اسکی بات کی کب اجازت دے گا کہ میں بلا عذر معقول اپنے عہدے کی ذمہ داریوں سے اسطرح دستبردار ہو جاؤں۔

لاٹ پادری:۔ مگر حضور جو کارروائی تجویز کر رہے ہیں اس سے تخت شاہی کی بنیادیں ہل جائیں گی۔

بادشاہ:۔ اسوقت تک جب تک کہ میں اس تخت پر متمکن ہوں اس کے استحکام کی فکر مجھے ہونا چاہیئے۔ لیکن یہ تو فرمائیے کہ کلیسا کی بنیادوں کا کیا حال ہوگا جو مجھے اس بات پر مجبور کر رہا ہے کہ میں ایسی

عورت سے شادی کرلوں جس سے مجھے قطعی محبت نہیں ہے اور اس عورت سے جسے میں صدق دل سے چاہتا ہوں حرامکاری کرتا رہوں ؟

لاٹ پادری:۔ آپ ایسا نہ کریں۔ اس کی ضرورت ہی کیا ہے ؟

بادشاہ:۔ لیکن آپ کو خوب معلوم ہے کہ اگر میں آپ کی رائے پر کاربند ہوا تو ایسا ہی کرونگا۔ اب فرمائیے کہ آپ اپنی رائے پر قایم ہیں ؟

لاٹ پادری:۔ وزیر اعظم صاحب! میرا خیال ہے کہ اب ہم لوگوں کو تخفیف تصدیعہ کرنا چاہئیے۔ اگر توہم پرستی کو دخل دیا جائے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسوقت بادشاہ کی عقل و فہم شیطان کے زیر اثر ہے۔ وہی ان کے دماغ میں اس قسم کی دلیلیں بھر رہا ہے۔ دلیلیں تو واقعی ایسی ہیں جن کا کوئی جواب بن نہیں پڑتا۔ فی الحقیقت یہ دلیلیں تعلیم یافتہ انگریزوں کی عام روش سے اسقدر نرالی ہیں کہ مجھے اور آپ کو ان سے کوئی علاقہ ہی نہیں ہو سکتا۔

لاٹ پادری اور وزیر اعظم دونوں اٹھکر چلنے لگے۔ بادشاہ نے بھی اُٹھتے ہوئے فرمایا۔

بادشاہ:۔ علاوہ بریں میرا بھائی جو میرے بعد تخت نشین ہوگا آپکی اس حرکت کو پسند نہ کریگا۔ انکی شادی تو ایک انگریزی خاتون سے ہوئی ہے جو کسی غیر ملکی شاہزادی سے کہیں زیادہ ہر دلعزیز ہیں۔ اور جب تک میں موجود ہوں وہ تخت پر بیٹھنا پسند نہ کریگا۔ اس لئے تمھیں میرا سر قلم کرنا ہوگا۔ بہرحال آپ لوگ تخت شاہی کو بازیچۂ اطفال نہیں بنا سکتے ہیں۔ اصولی حیثیت سے آپ لوگ یا تو تخت شاہی کو بالکل اُڑا دیں یا جب تک یہ اپنی جگہ پر قایم ہے اسکا ضروری احترام کریں۔

وزیر اعظم:۔ بس جہاں پناہ آپ نے سب کچھ کہدیا اب مجھے معاف فرمائیے اور رخصت کی اجازت دیجئے۔

بادشاہ:۔ ابھی ذرا ٹھہرئیے! میرے ساتھ خاصہ کھا کر جائیے گا۔ ڈیزی بھی آتی ہوگی۔ اسکو حکم شاہی سمجھئے۔

لاٹ پادری:۔ میرا کھانے کا وقت تو گزر چکا ہے۔ اور اب سوقت مجھے بھوک بھی خوب لگی ہے۔ اگر یہی حکم شاہی ہے تو میں بھی گردن تسلیم خم کرتا ہوں۔

تینوں حضرات زینہ سے اُتر کر کھانے کے کمرے میں جارہے ہیں۔ اسی اثناء میں بادشاہ نے وزیر اعظم کے کان میں کہا:۔

"دوست من! میں تو تمھارے کان کھولے دیتا ہوں کہ اگر تم نے اپنی پسند کی کسی لیڈی کا نام لیا تو دوسرے ہی دن اس کی اور ڈیزی کی تصویریں تمام اخبارات میں پہلو بہ پہلو شائع ہو جائینگی ڈیزی کے ساتھ اس کے ننھے کتے کی بھی تصویر شائع ہوگی۔ لیلیٰ و سگ لیلیٰ!

جذباتِ فراق

(از پروفیسر فراق گورکھپوری)

رازِ عالم سے ہے شاید کہ مرا راز جدا
مجھ سے ملنے میں ہی اُس آنکھ کا انداز جُدا

کوئی عیسیٰ نفسوں سے بھی ہو دمساز جدا
دل کا انداز جدا، ساز جدا، راز جُدا

بدگماں عشق کو صد وہم و یقیں کے کھٹکے
شوخیِ چشم سخن ساز ہے غمّاز جُدا

یوں ہی کیا کم تھی تری یاد کہ دل کو چھیڑیں
زلفِ پُر خم لبِ رنگیں نگہِ ناز جُدا

عقدۂ پیچ و خمِ عشق کا کھُلنا معلوم
رازِ عالم سے ہے یہ سلسلۂ راز جُدا

تنگی و وسعتِ کونین میں نسبت کیسی
درِ توبہ سے درِ میکدہ ہو باز جُدا

آہ و زاری سے کبھی سازِ محبت نہ چھڑا
غم کا آغاز جُدا، عشق کا آغاز جُدا

حُسن کی شانِ تلوّن اُدھر اک آفتِ جاں
واہمے دل کے اِدھر تفرقہ پرداز جُدا

برقِ آواز جلا دے یہ نیستانِ جہاں
سازِ ہستی سے ہے سازِ لبِ اعجاز جُدا

بڑھتے بھی جاتے ہیں سب اہلِ جہاں سوئے عدم
عمرِ رفتہ بھی دیئے جاتی ہے آواز جُدا

بے بہ بے اُڑکے ہوئے ہوش کے انداز الگ
طرزِ برقِ نگہِ حُسن جنوں ساز جدا

شوخیِ حُسن دیئے جاتی ہے پیغامِ حیات
موت سے کھیلتے ہیں عاشقِ جانباز جدا

کچھ اشارات ادھر شوخیِ پنہاں کے فراق
ہے سکوتِ نگہِ ناز سخن ساز جُدا

ہندوستان اور دُنیا کے سیاسی حالات کا تبصرہ

از پنڈت جواہرلال نہرو صدر انڈین نیشنل کانگریس

پچھلے ماہ انڈین نیشنل کانگریس کا اجلاس پُرانے دستور کے مطابق کسی بڑے شہر میں منعقد ہونے کے بجائے صوبۂ بمبئی میں فیض پور نامی ایک معمولی گاؤں میں پنڈت جواہرلال صاحب نہرو کے زیر صدارت ہوا۔

فیض پور ریلوے اسٹیشن سے سات میل پر واقع ہے۔ تاہم اس موقعہ پر لکھو کھا آدمی تمام اطراف ملک سے وہاں جمع ہوگئے تھے۔ استقبالیہ کمیٹی نے حیرت انگیز قابلیت سے کل انتظامات ایک خاص پیمانہ پر کیے۔ پریسیڈنٹ کی سواری کے لیے چھ جوڑ بیلوں کا رتھ چُناگیا تھا۔ اس جلسے کی کامیابی کا یہ نتیجہ ہوا ہے کہ اب کانگریس کے آیندہ اجلاس بھی دیہات ہی میں ہوا کریں گے۔ اس تبدیلی سے سیاسی جدّوجہد کا دائرہ بہت وسیع ہو جائیگا یہاں پر ہم کو مفصل حالات بیان کرنے کا موقعہ نہیں ہے۔ ناظرین زمانہ تمام تفصیلات اخباروں میں پڑھ چکے ہونگے۔ البتہ ملک وبیروں ملک کے سیاسی حالات کا جو تبصرہ پنڈت جواہرلال صاحب نہرو نے اپنی پُرمغز صدارتی تقریر میں کیا ہے اُس کا خلاصہ ہم ذیل میں ہدیۂ ناظرین کر رہے ہیں۔ یہ اہم تقریر زمانہ حال کے ادبی کارناموں میں جگہ پانے کی مستحق ہے۔ یوں بھی پنڈت جواہرلال کے خیالات سے ہر صاحب فہم ہندوستانی کو واقف ہونے کی ضرورت ہے۔ وہ جو کچھ کہتے ہیں غائر مطالعہ و وسیع مشاہدہ پر مبنی ہوتا ہے۔ اور ان کے قول وفعل دونوں میں یکساں خلوص رہتا ہے جسے دوست دشمن کوئی نظر انداز نہیں کرسکتا۔ پنڈت جی ہندوستان کی قسمت کو دُنیا کی سیاسی ترقی سے وابستہ سمجھتے ہیں۔ ہم اسے زیادہ تر اپنے ہی ہاتھ میں سمجھتے ہیں اور کامیابی کے لیے اتفاق باہمی اور صبر و مستقل مزاجی سے تعمیری جدوجہد ضروری سمجھتے ہیں۔ اسکے ساتھ ہی یہ سچ ہے کہ سائنس نے دور دراز ملکوں کا بُعد فنا کر دیا ہے۔ اور آج دُنیا کے مختلف حصے ایک دوسرے سے اسقدر قریب ہوگئے ہیں کہ واقعی کسی دور اُفتادہ ملک کا بھی عرصہ تک دُنیا کے دوسرے ملکوں کے اثرات سے غیر متاثر رہنا مشکل نظر آرہا ہے۔ اس لئے مناسب ہوگا، کہ وقتاً فوقتاً آنکھ اُٹھا کر دوسرے ملکوں کے واقعات کا بھی جائزہ لیتے رہیں۔ چنانچہ اسی خیال سے ہم پنڈت جواہرلال نہرو کے تبصرہ کا ضروری حصہ زمانہ میں شایع کر رہے ہیں۔ اسکے یہ معنی نہیں ہیں کہ ہمکو انکی کھینچی ہوئی تصویر اور انکے اخذ کردہ نتایج سے کماحقہ اتفاق ہے۔ ناظرین بھی انکی رایوں کو غور سے پڑھنے کے بعد ہر مسئلہ پر خود اپنی رائے قائم کریں۔

ایڈیٹر

پنڈت جواہر لال صاحب نہرو کی تقریر کے ابتدائی حصّے کا خلاصہ جس میں اُنھوں نے دُنیا کے سیاسی حالات پر ایک سرسری ریویو کیا ہے - یہ ہے :-

ہندوستان میں آج ہم سب لوگ صوبجاتی انتخابات میں معروف ہیں جو بہت جلد ہونے والے ہیں - کانگریس نے مختلف صوبوں سے ایک ہزار سے زیادہ امیدوار کھڑے کیے ہیں - ساڑھے آٹھ ماہ ہوئے میں نے لکھنؤ میں عرض کیا تھا کہ آپ دُنیا کے ہولناک اور پُرلطف ڈرامہ کی جانب توجہ دیں - ہماری قسمتیں اس ڈرامہ کے انجام کے ساتھ وابستہ ہیں اور ہماری قسمت ہر دوسرے ملک کی قسمت کی طرح ان قوتوں اور خیالوں کی کشمکش کے نتیجہ پر منحصر ہے جو آج کل ساری دُنیا میں جاری ہے - واقعی ہماری قومی مجلسی آزادی کا مسئلہ اسی ہمہ گیر اور بین الاقوامی مسئلہ کا ایک جزو ہے اور ہمیں اپنے آپ کو سمجھنے کے لئے دوسرے لوگوں کے موجودہ رُجحانات کو بھی سمجھنا چاہیئے -

پچھلے آٹھ مہینوں میں بھی بین الاقوامی صورت حالات میں انقلاب انگیز تغیرات ہوئے ہیں ، ترقی اور رجعت کی قوتیں ایک دوسرے سے شدید معرکہ آرائی میں مشغول ہیں اور ہم بہت تیز رفتار کے ساتھ جنگ کے غار کی طرف جا رہے ہیں ، یوروپ میں فیسزم اپنی فتحیابی کا ڈنکہ بجاتا ہوا آگے بڑھ رہا ہے - اُس کی آواز زیادہ بلند ہوتی جاتی ہے اور یہ بین الاقوامی معاملات میں رہزنی اور لُٹیراپن کے اُصول کو داخل کر رہا ہے اور اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ اگر اس کو نہیں روکا گیا تو دُنیا کو ایک عالمگیر جنگ کا سامنا کرنا پڑے گا -

ہم دیکھ چکے ہیں کہ کس طرح حبش اس کا شکار ہوا ہے اور آج ہم اسپین کا سانحہ اور ہولناک ڈرامہ دیکھ رہے ہیں - فیسزم نے کس وجہ سے اتنی جلدی ترقی کی ہے کہ آج سارے یورپ اور ساری دنیا پر اپنا اقتدار قائم کرنے کی دھمکی دے رہا ہے - اسے سمجھنے کے لئے ہمیں برطانی حکومت کی غیر ملکی پالیسی کو سمجھنا چاہیئے جو اپنے تذبذب اور اختلافات کے باوجود مسلسل طور پر ہٹلر شاہی کی حمایت میں رہی ہے - انگریزی حکومت نے جرمنی سے جو بحری معاہدہ کیا تھا اُس نے فرانس کو اٹلی کے ساتھ سازباز کرنے پر مجبور کیا جس کا نتیجہ ابی سینیا کی جبریہ تباہی میں ظاہر ہوا - اس کی تہ میں سب سے بڑی بات یہ تھی کہ برطانی حکومت اٹلی کے خلاف کوئی موثر کارروائی کرنے کے لئے تیار نہ تھی - چنانچہ جب امریکہ نے اٹلی کو پٹرول سپلائی کرنے پر پابندی لگانے میں تعاون کرنے پر آمادگی ظاہر کی تو برطانیہ نے اس کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا اور وہ اہل حبش پر بم باری اور لیگ اقوام کے قائم کردہ مجموعی تحفظ کے انتشار کے منظر کو دیکھتا رہا - یہ صحیح ہے کہ برطانی حکومت ہمیشہ لیگ اور مجموعی تحفظ کے حق میں گفتگو کرتی رہی لیکن اس کے عمل نے اُس کے قول کو غلط ثابت کر دیا ہے

اس وقت اسپین میں یہ کشمکش سب سے زیادہ نمایاں اور خوفناک صورت میں ہمارے سامنے موجود ہے اور اس کے نتیجہ پر دُنیا کے آیندہ امن وامان کا انحصار ہے۔

دیکھئے اسپین میں فیسٹسوں کا اقتدار قائم ہوتا ہے یا فیسنرم اور ملوکیت پرستی کا منھ کالا ہوتا ہی۔ اس جدوجہد سے ہمکو کئی سبق ملتے ہیں اور شاید ان میں سب سے زیادہ ضروری سبق یہ ہے کہ جمہوری طریقہ کار بنیادی اختلافات کا تصفیہ کرانے اور اقتصادی اور مجلسی نظام کو دنیا کی سطح پر لانے کے لئے ملک میں بنیادی تبدیلیاں کرنے میں ناکام رہا ہے۔ اس ناکامی کا سبب وہ لوگ نہیں ہیں جو اس قسم کی تبدیلیوں کے حامی ہیں اور ان کے لئے کام کر رہے ہیں وہ لوگ تو جمہوری طریقہ کار کے سامنے سر جھکا لیتے ہیں۔ لیکن جب یہ طریقہ کار مخصوص مفاد اور ان جماعتوں پر جنھیں خاص مراعات اور حقوق حاصل ہیں اثرانداز ہوتا ہے تو یہ جماعتیں جمہوری طریقہ کار کو تسلیم کرنے سے انکار اور اسکے خلاف علم بغاوت بلند کر دیتی ہیں۔ اُن کے لئے ان کا اپنا غلبہ اور اقتدار اور انکے مخصوص مفاد کے تحفظ کا نام ہی جمہوریت ہے اور جب جمہوری طریقہ کار اُنکے اس مقصد کی تکمیل میں ناکام رہتا ہے تو وہ اُسے ترک کرکے اُسے توڑنے کوشش کرتے ہیں اور جمہوریت کا شیرازہ منتشر کرنے میں اوچھے ہتھیاروں کو استعمال کرنے اور غیر ملکی اور وطن کش قوتوں سے متحد ہونے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ چنانچہ وہ اپنے آپ کو قوم پرست اور محب وطن کہتے ہوئے بھی وہ اپنے بھائیوں کو جن کے ساتھ اُنکا خون کا رشتہ ہے ہلاک کرانے اور اپنے ملک کو غلام بنانے کے لئے زرخرید غیر ملکی فوجوں کو استعمال کرنے میں پس وپیش نہیں کرتے۔

اسوقت جمہوریت کی لڑائی جاری ہے۔ ہم اس جدوجہد کو غیر ملکی ہمدردی کی نگاہ سے نہیں دیکھ رہے ہیں بلکہ ہمیں اُس تکلیف دہ تشویش کا احساس ہے جو جنگ میں خود پڑنے سے پیدا ہوتی ہے۔

ہم نے اسپین کے مردوں اور عورتوں کی تباہی اور اپنی امیدوں کے خون کا افسوسناک منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اس دوران میں کئی مرتبہ ہم پر مایوسی کا عالم طاری ہو چکا ہے لیکن تاریک ترین مرحلوں میں بھی وہ مسئلہ جو اسپین کی آزادی کا نشان ہے اپنی پوری شان کے ساتھ ہمارے دلوں کو منور کر رہا ہے اور دُنیا کے سامنے اپنی آخری فتح کا اعلان کر رہا ہے اسپین کے اتنے مرد عورتیں اور لڑکے لڑکیاں اس خانہ جنگی کا شکار ہو چکے ہیں۔ جس سے اُمید کی جا سکتی ہے کہ اسپین میں جمہوری حکومت زندہ اور وہاں کی آزادی قائم رہے گی۔ آج ہم اسپین میں قصر آزادی کی دیواروں کے انہدام کے سانحہ کا مشاہدہ کر رہے ہیں کتنی مرتبہ یہ دیواریں مخالفوں کے ہاتھوں میں گئیں لیکن دوسرے فریق نے ان پر اپنا قبضہ دوبارہ بحال کر لیا کتنی مرتبہ دشمن ان کو مسمار کر چکے ہیں لیکن دوسرے فریق نے ان کو پھر دوبارہ تعمیر کرایا۔"

میں چاہتا ہوں اور اکثر اصحاب کی بھی خواہش ہے کہ کاش ہم اسپین میں اپنے رفیقوں کی جو تحفظ آزادی جاں گسل جد وجہد میں مصروف ہیں اپنی زبانی ہمدردی کے علاوہ کچھ موثر امداد بھی کر سکتے۔ مگر اپنی موجودہ بیچارگی کی حالت میں ہم ان کی کیا امداد کر سکتے ہیں؟۔

بہر حال اس میں آپ کے سامنے دُنیا کے اُن واقعات کے باہمی تعلق اور ان کے ایک دوسرے پر اثر انداز ہونے پر زور دونگا۔ اسی طرح ہم موجودہ دُنیا کی پیچیدہ تصویر کو کسی حد تک سمجھ سکتے ہیں کیونکہ رنگ و نسل اور دیگر اختلافات کے باوجود دُنیا کے تمام عناصر میں ہم آہنگی اور باہمی تعلق ہے۔

یورپ میں مشرق بعید کی طرح مسلسل بدامنی چلی آرہی ہے اور ہر جگہ کشمکش جاری ہے۔ فلسطین میں برطانوی ملوکیت پرستی کے خلاف عربوں کی جد وجہد بھی ہندوستان کی آزادی کی جد وجہد کی طرح اسی عالمگیر مسئلہ کا ایک جزو ہے۔ جمہوریت فیسزم۔ قوم پرستی و ملوکیت پرستی۔ سوشلزم اور سرمایہ داری جو روزانہ تنزل کی طرف قدم بڑھا رہی ہیں۔ خیالات کی اس عالمگیر کشمکش میں ایک دوسرے سے برسر پیکار ہیں۔ اور تمام کرۂ ارض پر یہ کشمکش زیادہ ڈراونی شکل اختیار کر رہی ہے۔ اس وقت اپنا اپنا اقتدار قائم کرتے ہوئے یہ لڑائیاں ہو رہی ہیں جن کی وجہ سے آج تبدل پذیر دُنیا کو ایک نئے سیاسی اور اقتصادی نظام کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔ اگر جلد ہی ایک نئے نظام تمدن کی تشکیل نہ ہوسکی تو لازمی طور پر ہر جگہ کشمکش بڑھے گی اور تصادم ہوگا۔

اس طرح بتدریج لوگوں کے دل و دماغ میں ایک انقلاب پیدا ہو رہا ہے۔ یہ ذہنی انقلاب حقیقی انقلاب کی شکل اختیار کرنا چاہتا ہے۔ اس قدرتی تبدیلی میں (جس کے حالات متقضی ہیں) جتنی تاخیر ہو رہی ہے اُتنی ہی یہ کشمکش سخت دشوار ہوتی جارہی ہے۔ در اصل موجودہ توازن ختم ہو چکا ہے لیکن ابھی تک اس کی جگہ کوئی دوسرا توازن قائم نہیں ہوا ہے۔ اس واسطے آج دُنیا میں پستی۔ تباہی اور بدبختی کا دور دورہ ہے اور دُنیا میں ہمیں تباہی کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے اور ہر لمحہ ایک خطرناک اور بھیانک جنگ کا خطرہ رہتا ہے۔

فیسسٹ ممالک کے علاوہ دُنیا کا ہر ملک اور ہر قوم آنے والی جنگ سے خوف زدہ ہے لیکن اسکے باوجود وہ سراسیگی کی حالت میں اسی کی تیاری میں مصروف ہیں اور اس طرح وہ دونوں فریقوں میں سے ایک کے ساتھ صف آرا نظر آتے ہیں۔

متوسط طبقات ہماری نظروں سے اوجھل ہو رہے ہیں یا یوں کہئے کہ یہ طبقے بھوت کی مانند ادھر اُدھر پھڑپھڑا رہے ہیں۔ اُنھیں اپنی حقیقت کا پتہ چل گیا ہے اور وہ اپنے کو خود آزار اور دائمی شکوک کا شکار محسوس کرتے ہیں۔ ہر ملک میں پُرانے فیشن کے لبرلزم کا یہی حشر ہوا ہے۔ مگر ہندوستان میں وہ لوگ

جو اپنے آپ کو لبرل کہتے ہیں اور دوسرے لوگ جو اُن کے نقطۂ خیال سے اتفاق رکھتے ہیں ابھی تک خود ستائی کے جال میں پھنسے ہوئے ہیں، لیکن دُنیا اپنا قدم بڑھائے آگے جا رہی ہے۔ بقول شاعر:-

اب تک تو عمارت رہی دو سرحدوں کے بیچ　　اب تک تو محبت رہی دو سرحدوں کے بیچ
اب لے کے اُمنگیں نئی آگے کو قدم تول　　دو شعلوں کے مابین تو رہتے ہیں فقط غول

مُلک کا سب سے بڑا مسئلہ۔ یہ نئی خواہشات کیا ہیں؟ اس دُنیا کے موجودہ مجنونانہ سسٹم کا خاتمہ کرنا جس کی وجہ سے جنگ کا خطرہ اور موجودہ کشمکش پیدا ہوتی ہے اور جو لاکھوں انسانوں کو پامال کرتا ہے۔ بیکاری اور افلاس کا خاتمہ کرنا اور بے شمار انسانوں کی قوتوں کا استخلاص اور انسانی بہبودی اور ترقی کے لئے انکو استعمال کرنا اور اُس جگہ تعمیر کا کام کرنا جہاں آج ہمارا شیوہ تخریب ہے۔

اب دیکھنا چاہیے کہ ملوکیت پرستی کیا چیز ہے۔ یہ صرف ایک ملک پر دوسرے ملک کا سیاسی تسلط نہیں ہے اسکی جڑیں اس سے زیادہ گہری ہیں اور موجودہ زمانہ کی ملوکیت پرستی سرمایہ واری کی ایک شاخ اور اُسکا جزو لائنفک ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم ملوکیت پرستی اور سوشلزم کے تہ کو سمجھے بغیر اپنے مسائل کو نہیں سمجھ سکتے۔ ہماری بیماری کی جڑ بہت گہری ہے اور اب اس کے لئے کسی انقلاب پسندانہ اور انتہا پسندانہ طریقۂ علاج کی ضرورت ہے، وہ علاج یہ ہے کہ ہماری سوسائٹی کے نظام کی ترتیب سوشلزم کے اصولوں پر مبنی ہو۔ تاہم آج ہندوستان میں ہم سوشلزم کے لئے نہیں لڑ رہے ہیں کیونکہ ہمیں ہنوز طویل مسافت طے کرنی ہے۔ لیکن ہمیں لازم ہے کہ سوشلزم کی ضرورت کو محسوس کریں تاکہ ہم اپنے مسئلہ کو سمجھ سکیں اور اسکے حل کا راستہ نکال سکیں اور لوگوں کو بتلا سکیں کہ سوراج جس کے لئے ہم کوشاں ہیں، کیا ہوگا۔ جب تک ہم اپنے مسئلہ کو اچھی طرح سے نہ سمجھ سکیں گے ہماری کارگذاری کے بے نتیجہ اور غیر مفید ثابت ہونے کا امکان قایم رہے گا۔

اسوقت کانگریس ہندوستان میں مکمل جمہوریت کی حامی ہے اور جمہوری حکومت ہی کے قیام کے لیے جدّوجہد کر رہی ہے۔ کانگریس کا مقصد سوشلزم لانا نہیں ہے۔ کانگریس کی پالیسی ملوکیت پرستی کے خلاف ہے اور وہ ہمارے سیاسی اور اقتصادی نظام میں اہم تبدیلیوں کے لئے کوشاں ہے۔ میرا خیال ہے کہ آیندہ واقعات و حالات کانگریس کو سوشلزم کے راستہ پر لے آئیں گے کیونکہ سوشلزم ہی سے تمام ہندوستان کی موجودہ بیماری کا علاج ممکن ہے۔ لیکن آج ہمارے لئے سب سے بڑا مسئلہ سیاسی آزادی اور جمہوری طرزِ حکومت حاصل کرنا ہے اور اسی وجہ سے کانگریس کو بھی دُنیا کی تمام ترقی پسند قوتوں کے ساتھ صف آرا ہو کر جنگ کی مخالفت کرنی چاہیئے۔

حال میں یوروپ میں بین الاقوامی امن کی تحریک کے سلسلہ میں ایک اہم واقعہ پیش آیا۔ بین الاقوامی

امن کی کانگریس میں جو گذشتہ ستمبر میں بروسلز میں منعقد ہوئی بہت سی انجمنیں امن کی تحریک کو تقویت پہونچانے کے لئے ایک مشترکہ پلیٹ فارم پر جمع ہوئیں۔ اس پلیٹ فارم میں ہماری انڈین نیشنل کانگریس کی نمایندگی شری وی کے۔ کرشنن نے نہایت جرأت اور دلیری کے ساتھ کی۔ لیکن کانگریس کو عالمگیر امن کی ایسی مستقل انجمن کے مقاصد کے ساتھ اتفاق کرتے ہوئے اپنی پوزیشن واضح کر دینی چاہیے۔ ہماری رائے میں امن کے مسئلہ کو ملوکیت پرستی کے مسئلہ سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا اور جنگ کے بنیادی اسباب کا خاتمہ کرنے کے لئے ملوکیت پرستی کا خاتمہ کرنا ضروری ہے۔

اس بین الاقوامی پس منظر کو واضح کرنے کے بعد پنڈت جی نے کہا کہ گو ہم موجودہ انتخابات لڑ رہے ہیں لیکن اسکے یہ معنی نہیں ہیں کہ ہم آئین نو پر عمل کرنے کو تیار ہیں۔ آپ نے آئین بنانے کے سلسلے میں کانگریس کے مجوزہ نمایندہ اسمبلی کے طلبی پر زور دیا۔ آپ نے انتخابات کے بعد ہی آئین ساز کونسلوں کے کانگریس ممبروں اور دیگر ضروری اشخاص کی ایک کانفرنس مدعو کرنے کی رائے دی۔ آپ نے کانگریس کے لئے نئے نظام حکومت کے ماتحت فیڈرل ڈھانچے کی بھی سخت مخالفت کی۔ اور کہا کہ یہ فیڈریشن غلامی میں جکڑی ہوئی ہوگی اور سیاسی حیثیت سے وہ ملک کے پست ترین عناصر کے ماتحت ہوگی کیونکہ ہندوستانی ریاستوں کو جدید آئین کے ماتحت عام ملکی معاملات میں جو دخل ہو جائے گا آپ ان ریاستوں کو "قطب از جائی جنبد" کے مصداق سمجھتے ہیں۔

آپ کی رائے میں فیڈریشن میں داخل ہونے سے پہلے دیسی ریاستوں کی رعایا کو وہی شہری اور جمہوری حقوق حاصل ہونا چاہئے جو بقیہ ہندوستان کو حاصل ہیں۔ آپ کا خیال ہے کہ جب سے ملک میں قومی تحریک کو ترقی حاصل ہوئی ہے دیسی ریاستوں کو ایک مصنوعی اہمیت حاصل ہو گئی ہے۔ چنانچہ اب فیڈریشن اسکیم میں والیان ریاست اور اُنکے وزیروں کو غیر معمولی اختیارات حاصل ہو گئے ہیں۔ اور وہ آج ایسی باتیں کرنے لگے ہیں گویا وہ آزاد حکومتیں ہیں۔ اور حوصلے یہاں تک بڑھ گئے ہیں کہ وائسرائے کے اختیارات بالادستی کے منسوخی کی بھی کوششیں ہو رہی ہیں۔ اور بعض ریاستوں میں فوجی تنظیم کی طرف بھی توجہ دی جا رہی ہے۔

اس لئے آپ کے نزدیک فیڈرل حصہ کی مخالفت محض کوئی اصولی بحث نہیں ہے۔ بلکہ آپ اس کو ہندوستان کے لئے زندگی اور موت کا سوال سمجھتے ہیں۔ اس سلسلے میں آپ نے کونسلوں کے باہر کانگریس کی پشت پر عوام کے امداد کی ضرورت کا ذکر کرتے ہوئے کانگریس کی جدوجہد کا خاص کام عوام کی تنظیم و تحریک ہی بتلایا۔

اس کے بعد آپ نے مختصراً کانگریس کی تدریجی ترقی اور اس کی موجودہ تنظیم کے حالات بتائے جو مہاتما جی کی تجویز پر ناگپور میں ۱۹۲۰ء میں عمل میں آئی۔

اس سلسلے میں آپ نے عوام ملک کی شرکت۔ کسانوں اور مزدوروں کی انجمنوں کے الحاق کے متعلق اختلاف رائے کا بھی ذکر کیا۔

روزانہ مسائل کے سلسلے میں آپ نے ملک کے کروروں آدمیوں کی غریبی اور بیکاری کا ذکر کرکے موجودہ ریلوے ہڑتال پر اظہار خیال کیا اور موجودہ نظام اراضی میں اصلاح کے مسئلہ کو آپ نے صنعت و حرفت کی ترقی سے وابستہ بتلایا۔

آخر میں آپ نے یہ کہا گو ابھی یہ دور کی باتیں ہیں لیکن ممکن ہے ہم جلد ترقی کر جائیں کیونکہ گو ہم بظاہر کمزور ہیں لیکن واقعی طاقت میں برابر بڑھ رہے ہیں، باوجود اسکے کہ ہمارے ساتھ ہر قسم کی سختگیری کی جاتی ہے۔ بہرصورت عوام کو اب یہ معلوم ہو گیا ہے کہ آخری کامیابی کی کنجی ہمارے ہی ہاتھ میں ہے۔

انتخابات میں کامیابی اہل ملک کے طویل سفر میں چھوٹا سا قدم ہے۔ ہمکو مصیبتوں اور خطروں کا سامنا کرتے ہوئے آگے ہی بڑھتے چلے جانا چاہئے مصیبتیں و خطرے ہمارے پرانے ہمسفر ہیں اور جب ہم ان پر چھا جانا سیکھ جائیں گے تو ہم کامیابی پر چھا جانا بھی سیکھ جائیں گے۔"

زمانہ تیس۳۰ سال پہلے

زمانہ بابت جنوری ۱۹۰۸ء میں نئے سال کے متعلق حضرت سرور جہان آبادی مرحوم کی ایک پُر زور نظم شایع ہوئی تھی جس کے دو بند آج پورے تیس سال بعد ہدیۂ ناظرین زمانہ ہیں:۔

دورِ نشاطِ گردوں۔ پھر دور جام جم ہے — پھر خارزار ہستی۔ گلدستۂ ارم ہے
خاموش انجمن میں بانگ خروش غم ہے — اُٹھو! کہ سونے والو! فرصت کا وقت کم ہے
دل کو نئی اُمنگیں پھر گدگدا رہی ہیں
پھر سالِ نو کی خوشیاں ہمت بڑھا رہی ہیں

اُٹھ کر ذرا تو دیکھو۔ دُنیا کا رنگ کیا ہے — رفتار کیا جہاں کی۔ قوموں کا ڈھنگ کیا ہے
ہے حفظ وضع کیا شے۔ ناموس و ننگ کیا ہے — ایثار نفس کیا ہے۔ قومی اُمنگ کیا ہے
قوموں کی ہر ترقی کا کچھ تو راز آخر
حُبّ وطن میں کردو دل کو گداز آخر

علمی خبریں اور نوٹ

ملک میں مشاہیر ادب کی قدردانی کا خیال پیدا ہو گیا ہے، چنانچہ ۱۹۳۵ء میں مولانا حالی کی صدسالہ سالگرہ کا جشن منایا جا چکا ہے۔ اب ۱۰۔ فروری ۱۹۳۷ء کو جے پور لٹریری کارپوریشن کی طرف سے شمس العلماء ڈاکٹر نذیر احمد صاحب کی صدسالہ برسی منانے کا انتظام ہو رہا ہے۔ سید سرفراز حسین صاحب رضوی سکرٹری کارپوریشن (اعجاز منزل جے پور، راجپوتانہ) نے اہل قلم کی اعانت کی اپیل کی ہے جس کی ہم بھی پرزور تائید کرتے ہیں۔

اسی طرح جنوری کی آخری تاریخوں میں گورنمنٹ سٹی کالج یونین حیدرآباد دکن نے اپنے کالج میں جشن یادگار ولی منانے کا بندوبست کیا ہے، اور ملک کے مشہور ادیبوں اور شاعروں سے "ولی کے متعلق" اپنے گراں قدر خیالات سے شرکائے جشن کو مستفید کرنے کی استدعا کی ہے۔

ہماری رائے میں اس قسم کے جلسوں اور یادگاروں کی رہنمائی کا فرض انجمن ترقی اردو یا کسی اور مرکزی انجمن کو ادا کرنا چاہئیے اردو ادب کی ترقی کے لئے اس وقت سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ کوئی بلند پایہ جماعت عوام کے ادبی جوش و سرگرمی سے فائدہ اٹھا کر تمام ادبی تحریکات کو ایک مرکز پر لے آئے تاکہ ہم کو ان سے زیادہ سے زیادہ نفع حاصل ہو سکے۔

حکیم محمود علی خاں صاحب ماہر اکبرآبادی نے "علم الحروف" پر ایک مفصل کتاب لکھی ہے جس میں فن تحریر کے ایجاد اور اسکی ترقی کی مکمل تاریخ پیش کرنے کی کوشش کیگئی ہے۔ یہ کتاب تین روپیہ قیمت پر منیجر صاحب "کنول" آگرہ سے ملسکتی ہے

پنجاب کے مشہور تاجر کتب شیخ مبارک علی صاحب اردو ادب کی توسیع و اشاعت کے لئے عرصے سے قابل قدر اولوالعزمی سے کام کر رہے ہیں۔ حال میں آپ نے کئی قابل ذکر کتابیں شائع کی ہیں جیسے مولانا ابوالکلام صاحب آزاد کا ترجمان القرآن بہت مقبول ہوا ہے اسکی دو جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔ آجکل مولانا ظفر علیخاں صاحب کا مجموعہ کلام "بہارستان" کے نام سے زیر طبع ہے۔

سید امتیاز علی صاحب تاج کے مزاحیہ مضامین کا مجموعہ "چچا چھکن" کے نام سے دارالاشاعت پنجاب لاہور کے اہتمام سے زیر طبع ہے۔

حضرت جوش ملیح آبادی کی پرجوش اور کیف آور نظموں کے دو نادر مجموعے "نقش و نگار" اور "شعلہ و شبنم" کے دلکش نام سے شائع ہو گئے ہیں "نقش و نگار" کو شائع ہوئے کئی ماہ ہو چکے ہیں لیکن دوسرا مجموعہ "شعلہ و شبنم" حال میں شائع ہوا ہے اور اسے حضرت جوش کی تمام شاعری کا نچوڑ کہنا بجا ہوگا۔ کیونکہ اسمیں ہر رنگ کے کلام کا بہترین انتخاب پیش کیا گیا ہے۔ اس مجموعہ کے چار حصے ہیں ایک کا نام رنگ و بو ہے جسمیں مناظر فطرت کی جیتی جاگتی تصویریں ہیں دوسرے حصہ میں مذہبی رنگ کی نظمیں ہیں تیسرے حصے کا نام آتشکدہ ہے اسمیں سیاسی نظمیں ہیں اور چوتھے حصے میں بادہ سرجوش کے عنوان سے جدید و قدیم غزلیں یکجا کر دیگئی ہیں۔ کتاب نہایت خوشنما اور دلکش چھپی ہے۔ قیمت صرف تین روپیہ۔ مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی یا زمانہ پریس کانپور سے طلب فرمائیے۔

کچھلے دنوں "ضرب کلیم" کے نام سے ڈاکٹر سید محمد اقبال صاحب کے اردو کلام کا ایک دوسرا مجموعہ شائع ہو چکا ہے جسمیں ہر جگہ

دورِ حاضرہ کے خلاف اعلان جنگ اور مسلمانوں کے لئے ایک نئی دعوت فکر ہے۔ اقبال اب شروع سے آخر تک اسلام اور فلسفۂ اسلام کے شاعر ہوگئے ہیں انکی شاعری کا ملکی یا بین الاقوامی رنگ بالکل مفقود ہوگیا ہے تاہم جو کچھ کہتے ہیں غور سے پڑھنے کے لایق ہوتا ہے انکا کلام ہندو مسلمان سبھوں کیلئے یکساں سبق آموز ہے۔ آپ کی ایک جدید فارسی مثنوی "پس چہ باید کرد اے اقوام مشرق" و مسافر زیر طبع ہے اور عنقریب کتبخانہ طلوع اسلام لاہور سے شائع ہونیوالی ہے۔

اُردو کے بالتصویر ہفتہ وار اخباروں میں معصر "ریاست" کو جو خصوصیت حاصل ہے وہ ابھی تک کسی دوسرے پرچے کو نصیب نہیں ہوئی ہے، اسکے بانی سردار دیوان سنگھ کی اُلو العزمی کی جس قدر تعریف کیجائے کم ہے کہ انھوں نے اہل ملک کی خاطر جنوری ۱۹۳۷ء سے اس قابل قدر پرچہ کی قیمت میں غیر معمولی کمی کردی ہے۔ "ریاست" کی سالانہ قیمت پہلے بارہ روپیہ تھی، مگر اب شائقین صرف آٹھ روپیہ دیکر اس دلکش و دلچسپ پرچے سے سال بھر تک لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔

انجمن اُردو بھوپال کے صدر جناب مائل نے نواب سر راس مسعود جنگ بہادر وزیر بھوپال کے ایما سے ایک قابل قدر کتاب "بیاضِ سحر" کے نام سے تصنیف فرمائی ہے جو اُمید ہے کہ آئندہ ماہ کے وسط تک شائع ہو جائیگی۔ اس کتاب کی لکھائی چھپائی وغیرہ میں خاص اہتمام کیا گیا ہے۔ شائقین کو یہ کتاب انجمن اُردو بھوپال سے مفت ملیگی۔

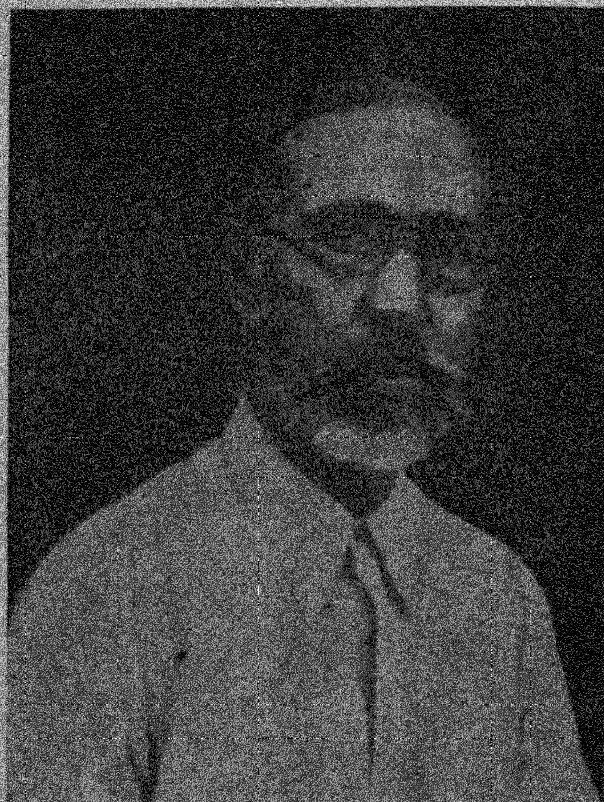
ناگری پرچارنی سبھا بنارس کی تحریک پر ۲۰۔ دسمبر کو ملک کے اکثر مقامات میں منشی پریم چند آنجہانی کا یادگاری دن منایا گیا جسمیں قدر دانان اُردو نے بھی دل کھولکر حصہ لیا۔ الہ آباد۔ لکھنؤ۔ دہلی وغیرہ میں قدر دانان پریم چند نے بلا امتیاز مذہب و ملت یکجا ہوکر انکے کمالِ فن کی داد دی۔ ہندی ساہتیہ سمیلن کے روبرو اُنکی ایک مستقل یادگار قائم کرنیکا مسئلہ بھی پیش ہے اسکے متعلق ۲۰۔ دسمبر کو ایک منتخب جلسہ بھی الہ آباد میں ہوا تھا جسمیں سر تیج بہادر سپرو، پرشوتم داس ٹنڈن۔ مسٹر جنیندر کمار اور مسٹر سجاد ظہیر نے خاص حصہ لیا تھا۔ فی الحال مختلف تجویزوں پر غور کرنے کے لئے ایک مستعد کمیٹی بنا دیگئی ہے۔

منشی صاحب کے قریب قریب تمام قصّے اور ناول اُردو زبان میں منتقل ہو چکے ہیں، البتہ اُنکا آخری ناول "گئودان" جو اُنکی وفات سے چند ہی ہفتے پہلے شائع ہوا ابھی تک اُردو میں منتقل نہیں ہوا ہے۔ مسز پریم چند صاحبہ اور اُنکے صاحبزادے اسکو عنقریب اُردو میں شائع کرنیکا ارادہ رکھتے ہیں، اور اس کے لئے ایڈیٹر "زمانہ" کی معرفت لایق مترجم کی تلاش میں ہیں، جو صاحب اس خدمت کو اپنے ذمہ لینا پسند کریں وہ ایڈیٹر "زمانہ" کانپور کو اپنی شرائط سے مطلع فرمائیں۔

"پریم چند" کی یادگار میں "زمانہ" کا جو خاص نمبر شائع ہونیوالا ہے اسکے قریب قریب سب مضامین لکھ گئے ہیں، صرف دو ایک مضامین کی کتابت باقی ہے۔ اسکا حجم اندازہ سے متجاوز ہوگیا ہے اور منشی صاحب کی نجی زندگی اور ادبی کارناموں کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جو اس یادگار نمبر میں نظر انداز ہوگیا ہو۔ ملک کے خاص خاص ادیبوں نے اسکے لئے مضامین لکھے ہیں مشہور مشہور نقادانِ فن سے تصانیف پریم چند پر جامع و مانع تنقیدیں لکھوائی گئی ہیں، منشی پریم چند کی جس قدر مختلف تصویریں میسّر ہو سکی ہیں وہ سب اسمیں ہدیۂ ناظرین کر دی جائینگی غرض ہر لحاظ سے یہ نمبر شائقینِ ادب کی قدردانی کا مستحق ہوگا۔ چونکہ یہ نمبر صرف محدود تعداد میں شائع ہوگا۔ شائقین اس کے لئے جلد ہی آرڈر بھیجیں۔ بعد کو یہ نمبر کسی قیمت پر بھی میسر نہ ہوگا۔

ہمارے مکرم پروفیسر رگھوپتی سہائے اور پروفیسر سنت پرشاد دونوں اب ہماری استدعا پر "زمانہ" کے ایڈیٹوریل بورڈ میں شامل ہوگئے ہیں۔ دونوں صاحبوں نے ہر مہینہ "زمانہ" کے لئے کچھ نہ کچھ لکھنے کا وعدہ کیا ہے، اور ہم کو امید ہے کہ عنقریب ہی ناظرین کو ان فاضل احباب کی ادبی سرگرمی کا ثبوت ملیگا۔ اس سال "زمانہ" میں چند خاص چیزیں شائع کرنیکا خیال ہے جن سے ملک کے اہل قلم کو جدید ادبی تحریکات سے روشناس ہونیکا موقع ملیگا جس کی بدولت وہ اپنی تصنیفات و تالیفات کو ملک و قوم کے لئے زیادہ مفید بنا سکیں گے۔

[illegible] اسکی [illegible] اشاعت کی طرف [illegible] مستعدی کی جاتی ہے۔



مسٹر سلیم جعفر

زمانہ

جلد   فروری ۱۹۳۷ء   نمبر ۲

ہندی رسم الخط کا ارتقاء

(از مسٹر سلیم جعفر)

رسم الخط ہندی کی تاریخ کی ابتدا حضرت عیسیٰ سے تین سو برس پہلے سے ہوتی ہے۔ اس سے پہلے کی رسم الخط اگر کوئی تھی تو اُسے زمانہ نے صفحۂ ہستی سے حرفِ غلط کی طرح مٹا دیا۔ اس میں سے صرف ایک حرف ۓ کے قائم مقام کا جسے ماترا کہتے ہیں پتا چلتا ہے اور بس۔ اس خط کا ماخذ براہمی خط بتایا جاتا ہے جس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ اس کی ایجاد کو برہماجی کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔

شروع شروع میں یہ خط ہندوستان بھر میں پھیلا ہوا تھا، صرف اس کا تھوڑا سا حصہ ایسا تھا کہ جس میں ایک اور خط رائج تھا جسے "کھروشٹی" کہتے تھے اور جو اُردو کی طرح داہنی طرف سے بائیں کو لکھا جاتا تھا۔ براہمی خط میں رفتہ رفتہ مقامی خصوصیات پیدا ہو گئیں۔ اس لئے وہ بندھیاچل کو خطِ فاصل مانکر انھیں دو بڑی شاخوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ جو خط اس کے جنوبی حصہ میں رائج تھے ان کا نام جنوبی رسم تحریر اور جو شمالی حصہ میں رائج تھے اُن کا نام شمالی رسم تحریر رکھا گیا۔ بلحاظ مقامی خصوصیات شمالی رسم تحریر کی شاخوں کا نام گپتا۔ کٹل۔ ناگری۔ شاردا۔ اور بنگلہ پڑا۔ ان میں سے پہلی تین سے موجودہ ہندی خط نکلا۔

پہلی ذیل میں جو نمونے درج کئے جاتے ہیں اُن کے دیکھنے سے ہندی خط کی ارتقائی منزیں معلوم ہونگی

---

[1] اس مضمون کا ماخذ "ہندوستان کی قدیم رسوم تحریر" مؤلفہ راؤ بہادر پنڈت گوری شنکر ہیرا چند اوجھا

ہر صدی کے نمونے دکھا کر اُن کی خصوصیتوں سے بحث کی جائیگی۔ اور حسب ضرورت ایک ایک سطر یا لفظ بھی دکھایا جائیگا تاکہ اندازہ کیا جا سکے کہ عبارت میں حرفوں کی کیسی صورت رہتی تھی۔

تیسری صدی قبل مسیح

اکہرے حروف

प प फ फ ब ब भ भ म म

𑀧 𑀧 𑀨 𑀨 𑀩 𑀩 𑀪 𑀪 𑀫 𑀫

बा मा लि टि टी मी चु सु कु टे थे गो

𑀩𑀸 𑀫𑀸 𑀮𑀺 𑀝𑀺 𑀝𑀻 𑀫𑀻 𑀘𑀼 𑀲𑀼 𑀓𑀼 𑀝𑁂 𑀣𑁂 𑀕𑁄

دوہرے حروف

म्य स्टा स्ति स्व

𑀫𑁆𑀬 𑀲𑁆𑀝𑀸 𑀲𑁆𑀢𑀺 𑀲𑁆𑀯

الفاظ

च समाजो कतव्यो बहुकं

𑀘 𑀲𑀫𑀸𑀚𑁄 𑀓𑀢𑀯𑁆𑀬𑁄 𑀩𑀳𑀼𑀓𑀁

ماترائیں

आ کی ماترا ایک چھوٹی سی آڑی لکیر ہے۔ جو حرف صحیح کے داہنی طرف اکثر اُس کے اوپر کے حصے میں لیکن کبھی کبھی بیچ میں بھی لگائی جاتی ہے۔ ज کے ساتھ یہ لکیر صرف اس کی بیچ والی لکیر کو کچھ لمبا کر کے بنائی جاتی ہے۔

इ کی ماترا کی مقررہ علامت ـا ہے۔ یہ بھی حرف کے داہنی طرف اس کے بالائی حصہ میں لگائی جاتی ہے لیکن کہیں کہیں گولائی لئے ہوئے یا ترچھی بھی ملتی ہے۔

ई کی ماترا کا مقررہ نشان لا حرف کے داہنی طرف کے بالائی حصہ میں لگایا جاتا ہے لیکن کہیں کہیں آڑی سیدھی لکیر کو ترچھا کر دیتے ہیں۔ کہیں کہیں گول نشان بھی ملتا ہے۔

उ اور ऊ کی علامتیں ایک (–) اور دو (=) لکیریں ہیں۔ یہ کبھی آڑی اور کبھی کھڑی حرف صحیح کے نیچے لگائی جاتی ہیں۔

ए اور ऐ کی علامتیں उ اور ऊ کی علامتوں سے بالکل ملتی ہوئی ہیں۔ یہ زیادہ تر حرف کے بائیں جانب اوپر کے حصہ میں لگائی جاتی ہیں۔ کبھی کبھی حرف کے بیچ میں بھی لگائی جاتی ہیں۔

ओ کا نشان اس طرح (--) کی دو لکیریں ہیں۔ ان میں سے ایک حرف کے داہنی اور

دوسری بائیں طرف لگائی جاتی ہے۔

دوہرے حروف | ملے ہوئے حرفوں میں بہت سی جگہوں میں جس حرف کا تلفظ پہلے ہونا چاہیئے اُسے اوپر اور اُس کے بعد میں تلفظ کئے جانے والے حرف کو اُس کے نیچے لگایا ہے، یہی صحیح بھی ہے لیکن کہیں کہیں اُلٹ پلٹ بھی ہوگئی ہے۔

دوسرے صدی قبل مسیح

اکہرے حرف

प फ ब भ म

حرف مع ماترا

पि बि षी जु जु पु बु बु के के को गो

الفاظ

ब न ब पु त ष कु र ष ष पि तु क ष

اکہرے حرف

त द न प म

حروف مع ماترا

गो मो यो

دوہرے حرف = ध्व

اکہرے حرف | اکہرے حرفوں میں یہ خصوصیت پیدا ہوئی کہ ان میں داہنی طرف ایک آڑی لکیر لگائی گئی جیسی کہ تیسری صدی کے حرفوں میں आ کی علامت لگائی جاتی تھی۔ یہ زیادہ تر بالائی حصہ میں لگی ملتی ہے لیکن کبھی کبھی نیچے کی طرف یا بیچ میں بھی پائی جاتی ہے۔ ایک قابل غور تبدیلی ج کی شکل بھی ہے۔ تیسری صدی میں اس کی یہ تین شکلیں تھیں۔ دوسری صدی میں اس کا رُخ بدل کر یہ ہوگیا، اگرچہ اس صدی میں اس کی وہ شکلیں معدوم نہیں ہوئی تھیں جو تیسری میں پائی جاتی ہیں۔ جیسے + یہی حال भ ۔ प اور म کا بھی ہوا۔

ماترائیں | आ کی ماترا کا نشان زیادہ تر ایسا ہے۔ ओ کی علامت کی دونوں لکیریں جوڑ کر ایک کردی گئیں، اور یہ لکیر عام طور سے حرف کے اوپر اس سے ملی ہوئی لکھی جاتی تھی گو کبھی کبھی اس سے الگ بھی ملتی ہے۔ ماتراؤں کی شکل میں بالعموم کوئی خاص بات پیدا نہیں ہوئی۔

پہلی صدی قبل مسیح

اکہرے حرف	म	म	भ	फ	प	ष	
حرف مع ماترا	मो	पो	गो	गो	शि	कि	मा
دوہرے حرف	स्व	स्य	त्स				
الفاظ	स्य	त्र	पु	रौ	व	त	

حضرت عیسٰی سے پہلے کی تین صدیوں کی تحریروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس مدت میں اکہرے حرفوں کی شکل میں کوئی نمایاں تبدیلی نہیں ہوئی۔ ہاں رفتارِ زمانہ کے ساتھ ان میں کسی قدر حُسن ضرور پیدا ہوگیا۔ اس کے علاوہ تیسری صدی کے حرف تزئین سے عاری تھے۔ دوسری صدی میں تزئین کا خیال پیدا ہوگیا اور اس نے ان کے اُوپر کے حصّوں میں اضافہ کیا۔ ماتراؤں کی شکل اگرچہ معیّن تھی لیکن ان میں سے بعض میں حرف کی شکل کیمطابق تھوڑی بہت تبدیلی کیجاتی تھی دوسری اور پہلی صدی میں جو بات بالخصوص قابل غور ہے وہ یہ ہے کہ ओ کی ماترا بدل گئی اور اُس کے لگائے جانے کی جگہ بھی۔ تیسری صدی میں دوہرے حرفوں کے بارہ میں خیال میں گنجلک نظر آتی ہے۔ حرفوں کی ترتیب آوازوں کی ترتیب کی تابع نہ تھی۔ دوسری میں یہ بات جاتی رہی۔ لیکن پہلے کی طرح حرف پُورے کے پُورے ملائے جاتے تھے۔ ان میں سے کچھ گھٹایا نہ جاتا تھا۔

(ا) پہلی اور دوسری صدی عیسوی میں بعض بعض حرفوں کی شکل میں کچھ کچھ فرق آیا، جو نقشۂ ذیل سے ظاہر ہوتا ہے۔ ماتراؤں میں کوئی خصوصیت پیدا نہیں ہوئی۔

(ب) دوہرے حرفوں میں صرف य کی شکل میں پہلی صدی میں اختصار نظر آتا ہے، لیکن دوسری صدی میں پھر جن حرفوں سے ملایا گیا ہے اُن میں پُورے کا پُورا ملا ہوا پایا جاتا ہے۔

(ج) اب تک ساکن اور متحرک حرفوں میں کوئی فرق نہ تھا، دوسری صدی عیسوی میں پہلی دفعہ

ساکن حرف ملتا ہے۔ لیکن جب کہ پہلی صدی میں حرف ساکن ظاہر کرنے کے لئے طریق اختصار
کی جھلک دکھائی دے کر غائب ہوجاتی ہے، دوسری صدی میں حرف مختصر نہیں کیا جاتا بلکہ اُس کی
جگہ ہی بدل جاتی ہے یعنی پہلے ساکن اور متحرک دونوں حرف ملا کر تلے اوپر لکھے جاتے تھے دوسری
صدی میں حرف ساکن اپنے سے پہلے کے حرف سے ملایا نہیں گیا ہے بلکہ اور حرفوں سے کسی قدر
نیچے لکھا گیا ہے۔ لیکن اس دعوے کی بنیاد ایک لفظ = सिद्धम् کے حرف آخر
= म् پر ہے۔ یہی حرف جب ایک دوسرے لفظ میں آیا ہے تو بحالت سکون کرسی سے
نیچے نہیں لکھا گیا بلکہ متحرک کرسی سے اُترا ہوا ہے مثلاً

ध र्म्म की र्ति वृ द्धयर्थ

اِس مجموعۂ حروف میں र्म्म کا دوسرا म اور त्त کا دوسرا त اور द्धय کا य متحرک
ہیں، مگر سب کے سب کرسی سے نیچے اُترے ہوئے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ چونکہ ایک حرف دوسرے
کے اوپر رکھ کر حرف ملائے جاتے تھے اس لئے دوسرے حرف کو کرسی سے بغیر اُتارے کام نہیں چل سکتا
تھا۔ त کی نسبت بھی یہی دعویٰ کیا گیا ہے لیکن مثال صاف صاف بتا دیتی ہے کہ غلط ہے۔

(د) تیسری صدی عیسوی میں ماتراؤں نے بعض بعض جگہ عجیب صورت اختیار کی ہے مگر اس
سے اُن کی جگہ میں کوئی فرق نہیں آیا۔

(ا)

	ध	च	ड	ढ	न	प
تیسری سے پہلی صدی قبل مسیح تک						
پہلی اور دوسری صدی عیسوی						

	भ	य	ष	स	ह
تیسری سے پہلی صدی قبل مسیح تک					
پہلی اور دوسری صدی عیسوی					

	(ب)		(ج)	(د)	
	र्य्य	स्य	सिद्धम्	सिरि विरपुरि	
تیسری سے پہلی صدی قبل مسیح					دوسری اور تیسری صدی عیسوی
پہلی اور دوسری صدی عیسوی					

چوتھی صدی عیسوی کے بعض بعض ملکوں کے حرف بہت ہی بھدّے ہیں اور کوئی خاص بات قابل لحاظ نہیں لیکن اِن میں دو خصوصیتیں پائی جاتی ہیں، ایک تو आ کی ماترا اپنی جگہ اور صورت بدلتی ہے یعنی حرف کے اوپر سے آڑی چل کر داہنی طرف نیچے کو اتنی جھک جاتی ہے کہ آج کل کی ماترا سے مل جاتی ہے، جیسے = दा - اور उ اور ऊ کی [1] ماترائیں کچھ کچھ آج کل کی ماتراؤں سے ملنے لگتی ہیں- = रु - = त्रू - ओ کی ماترا میں بھی یہی بات پیدا ہو جاتی ہے جیسے = मो - = लो - اِس صدی میں بھی ایک حرف ساکن کی مثال ملتی ہے لیکن یہ اسی لفظ सिद्धम् کا म् ہے۔

پانچویں صدی نے کوئی ترقی نہیں کی۔ اس کے اور چوتھی صدی کے حرفوں میں بہت کم فرق ہے لیکن ओ اور औ کی ماترائیں عجب شکل اختیار کرتی ہیں جیسے = लो اور = कौ -

اگرچہ چھٹی صدی عیسوی میں سوا حرفوں کی شکل میں کچھ خوبصورتی بڑھ جانے کے اور کوئی نئی بات نہیں پیدا ہوتی- لیکن اِس صدی میں کچھ اور ترقیاں ایسی ہوئی ہیں کہ یہ بجا طور سے دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ اس میں بعض باتیں ایسی پیدا ہوئیں جو آج تک چلی آتی ہیں اور بعض کی ابتدا اسی سے ہوتی ہے۔ حرف ساکن پہلے پہل اسی صدی میں اہمیت اختیار کرتا ہے، اب تک وہ کرسی سے نیچے لکھا جاتا تھا، لیکن اِس صدی میں اسے حروف متحرک کے پہلو میں جگہ دی گئی، اور فرق و امتیاز پیدا کرنے کے لئے اس کا سرا اُس[1] سے الگ کر کے اس کے اوپر رکھا جانے لگا جس کا کچھ کچھ رواج دوسری صدی سے ہو چلا تھا۔ ساکن त् اور म् کی شکل یہ - ہوگئی- इ کی ماترا بعض بعض حرفوں میں بالکل آج کل کی سی ملتی ہے یعنی داہنی طرف سے بائیں طرف آگئی- कि = - उ کی ماترا بالکل صاف ہوگئی

[1] ۲۱ کا کچھ کچھ رواج دوسری صدی سے ہو چلا تھا۔

= و کی ماترائیں بھی ایک مستقل سانچے میں ڈھل گئیں۔

ساتویں صدی کے نمونے سے کوئی خاص بات ظاہر نہیں ہوتی لیکن ان سے یہ پتا ضرور چلتا ہے کہ اگر عام لوگ نہیں تو کم سے کم اس کا لکھنے والا مصوری کا شیدا تھا ذرا ان تین حرفوں کی صورت ملاحظہ ہو:۔

यौ को सौ

ई ماترا کی ابتدائی شکل ت تھی اور حرف کے اوپر لگائی جاتی تھی اور اس کی شکل کے ساتھ تھوڑی بہت بدل جاتی تھی۔ اس کی موجودہ شکل کی جھلک ہمیں ساتویں صدی میں نظر آئی تھی لیکن آٹھویں صدی سے قایم و دایم ہو گئی۔ ساتویں صدی سے حرفوں کی شکل میں کچھ اس طرح کا فرق پڑنے لگا کہ انھوں نے ترقی کرتے کرتے موجودہ شکلیں اختیار کر لیں۔ مثلاً:۔

म = و म = و ब = ध و प = ।

نویں صدی کو یہ فخر حاصل ہے کہ حرف ساکن کی وہ علامت جو چھٹی صدی میں حرف کے اوپر اس لئے رکھی جاتی تھی کہ اس کا ساکن ہونا ظاہر کرے۔ اس صدی میں اس کی جگہ بدل گئی اور وہ حرف کے نیچے رکھی جانے لگی، لیکن ابھی تک اس ایجاد سے اسی وقت تک کام لیا جاتا تھا جب حرف ساکن لفظ کا حرف آخر ہوتا تھا۔ دوہرے حرفوں میں اب بھی وہی پرانا طریقہ جاری تھا یعنی حرف کے اوپر پورا حرف لکھا جاتا تھا اس لئے دوسرا حرف خود بخود کرسی سے اتر جاتا تھا۔ جیسے = वसेत् اور = यत्रस्सर्गीस्थिती۔

موجودہ شکل میں आ کی ماترا پہلی بار گیارھویں صدی میں ملتی ہے۔ اگرچہ اب حرفوں کی شکل قریب قریب ویسی ہی ہو گئی جیسی کہ ہم آج دیکھتے ہیں لیکن اب بھی دوہرے حرفوں کے ملانے کا وہی پرانا طریقہ جاری ہے یعنی حرف کے اوپر حرف رکھا جاتا ہے، جیسے:۔

ایک لفظ بھی ملاحظہ ہو:۔
सत्सेलु = स्थ = स्या =

براہمی خط کی مختلف شاخوں کے نمونے جو سولھویں صدی پر ختم ہوتے ہیں حسب ضرورت ہدیۂ ناظرین کئے جا چکے جن سے ہندی خط کے ارتقاء کا حال معلوم ہو گیا ہوگا۔ اس کے ساتھ ہی یہ امر بھی روشن ہو گیا ہوگا کہ حرف ساکن کو بتانے کے جو دو طریقے اس وقت رائج ہیں۔ ان

میں سے ایک کا پانچویں یا کم سے کم تیسری صدی قبل مسیح سے لیکر نویں صدی بعد مسیح تک کہیں پتا نہیں لگتا۔ رہا دوسرا۔ اسکا رواج سولھویں صدی تک نہیں پایا جاتا۔ اسوقت بھی دونوں حرف ساکن کو حرف متحرک سے ملانے کے لئے دونوں کو پہلو بہ پہلو رکھتے تھے۔ موجودہ طریقہ بعد کا معلوم ہوتا ہے۔ آٹھویں صدی کے تابل حرفوں سے فقط اتنی شہادت ملتی ہے کہ ہندوستان کے اُس حصۂ ملک میں حرف ساکن ظاہر کرنے کے لئے حرف پہلو بہ پہلو رکھے جاتے تھے لیکن وہاں بھی نہ تو ان میں سے کچھ کم کیا جاتا تھا اور نہ کوئی نشان لگایا جاتا تھا۔ جیسے क्कु = [illegible] - र्ट = [illegible] - त्ता = [illegible] - प्प = [illegible] - اس سے اس خیال کو تقویت پہنچتی ہے کہ موجودہ حروف کو جن کا ماخذ برہمی حروف ہیں، ان کے موجد نے متحرک ایجاد کیا اور اس کی نظر حروف صحیح کی اُس تعریف پر نہ تھی جو اُس سے پہلے اہل قواعد کر چکے تھے کہ وہ حرف علت کی مدد کے بغیر بذاتہ آواز نہیں دیتے۔ یہی وجہ ہے کہ اس وقت وہ دوہرا کام دے رہے ہیں۔ یعنی اگر مفتوح لکھنے کی ضرورت ہو تو بحال خود قایم رہتے ہیں، اور اگر لفظ کا حرف آخر واقع ہو کر ساکن ہوں تو بھی ان میں رد و بدل نہیں کرتے۔ صرف ان کے نیچے ایک نشان لگا دیا جاتا ہے۔ قواعد نویسوں کی تعریف سے یہ نتیجہ ضرور نکلتا ہے کہ ان کی تصنیفات کے زمانہ میں کوئی خط رائج ہوگا جس کے حروف صحیح اعراب کے معمول ہوں گے لیکن وہ موجودہ ناگری خط کے ماخذ سے پہلے معدوم ہو چکا تھا اور نظریۂ مذکورہ بالا پر اثر انداز نہیں ہو سکتا۔

چونکہ اس سے پہلے صرف چند ہی حرف دکھانے پر اکتفا کی گئی ہے، اس لئے ذیل میں ایک نقشہ درج کیا جاتا ہے تاکہ کل حروف تہجی کے ارتقاء کا حال بخوبی ظاہر ہو جائے۔

अ = [illegible] अ

अ = [illegible] अ

इ = [illegible] इ

उ = [illegible] उ

ए = [illegible] ए

क = [illegible] क

ख = [illegible] ख.

त = [illegible] त

थ = [illegible] थ

द = [illegible] द

ध = [illegible] ध

न = [illegible] न

प = [illegible] प

फ = [illegible] फ

झ = … झ

ञ = … ञ

ट = … ट

ठ = … ठ

ड = … ड

ड = … ड

ढ = … ढ

ण = … ण

ण = … ण

त = … त

थ = … थ

द = … द

ध = … ध

न = … न

प = … प

फ = … फ

ब = … ब

भ = … भ

भ = … भ

म = … म

य = … य

र = … र

ल = … ल

व = … व

श = … श

ष = … ष

स = … स

ह = … ह

ळ = … ळ

क्ष = … क्ष

ज्ञ = … ज्ञ

का = … का

कि = … कि

की = … की

कु = … कु

कू = … कू

के = … के

رباعی

گلشن کی روش پہ مسکراتا ہوا چل
بدمست ہوا ہے لڑکھڑاتا ہوا چل
کل خاک میں مل جائیگا یہ دورِ شباب
جوش آج تو بانکپن دکھاتا ہوا چل

مشرقی عورت سے!

مسٹر شاہد صدیقی اکبرآبادی

نہیں اب لطف کوئی مشرقیت کے فسانوں میں
اُلجھ کر رہ گئی ہیں کاکلیں مغرب کے شانوں میں

نکالی جارہی ہے کہنگی، تہذیب کے گھر سے
سنواری جارہی ہیں تن پہ پوشاکیں نئے سر سے

مرتب ہونیوالا ہے نیا آئین بیداری
فنائے ہوش کا رکھا گیا ہے نام ہشیاری

نہیں ہے کوئی شمعِ نورِ انسانی نگاہوں میں
جلائی جارہی ہیں مشعلیں منزل کی راہوں میں

تمدن کی فضا میں ہورہا ہے اہتمامِ نو
سُن اے خدمت گذارِ آدمیت اک پیامِ نو

تجھے آباد کرنا ہے محبت کی فضاؤں کو
مٹانا ہے جہاں سے خود پرستی کی جفاؤں کو

تجھے تبلیغ کرنی ہے اُصولِ آدمیت کی
جہاں والوں پہ راہیں کھولدے امن و مسرت کی

تجھے دنیا کے ہر شعبے میں اک اصلاح کرنی ہو
بدی کے بدنما پُتلوں میں رُوحِ نیک بھرنی ہے

جفا کی دلشکن مردانگی تسخیر ہو جائے
جو تو چاہے تو پھر قصرِ وفا تعمیر ہو جائے

زمانہ درپئے تخریب ہے اوسان قائم رکھ
ترقی کر، مگر نسوانیت کی شان قائم رکھ

رباعی

ارمان نہیں، آس نہیں ہے باقی
اب کچھ بھی میرے پاس نہیں ہے باقی

احساس تو باقی ہے مگر اے فیاضؔ
احساس کا احساس نہیں ہے باقی

(فیاضؔ گوالیاری)

ساوِتری کا سفر

از حضرت جگؔں بریلوی

ساوِتری کیا وطن سے نکلی ۔۔۔ بوئے گُل تر چمن سے نکلی
گلدستۂ نو بہار ہو کر ۔۔۔ اک رتھ پہ چلی سوار ہو کر
ہمراہ وزیرِ کار دیدہ ۔۔۔ خدّام قدیم و سِن رسیدہ
صحبت کے لئے سہیلیاں چند ۔۔۔ خدمت کے لئے تھیں باندیاں چند
جس سمت وہ ماہ وش گزرتی ۔۔۔ دامانِ فضا میں رنگ بھرتی
صحرا میں چلے تو حُسن برسائے ۔۔۔ گلشن میں بہار بن کے چھا جائے
خوش ہو کے پرند گیت گائیں ۔۔۔ سمجھیں کہ سحر ہے چہچہائیں
اُلفت سے درندے کھنچ کے پاس آئیں ۔۔۔ بہتے ہوئے چشمے ٹھیر جائیں
بستی نظر آئے خرم و شاد ۔۔۔ ویرانہ قدم سے اُس کے آباد
ہر سمت نئے نئے تھے منظر ۔۔۔ تہذیب ضمیر و دل کا دفتر
کوہوں سے ثبات آئے دل میں ۔۔۔ دریاؤں سے خیر چھائے دل میں
بستی میں ہو آرزوئے خدمت ۔۔۔ ویرانہ نظر فروز عبرت
عظمت کے نشان کھنڈر کسی جا ۔۔۔ محضر لئے بے ثباتیوں کا
ایما تھا گلوں کا خندہ رو ہو ۔۔۔ کہتی تھی شمیم نیک خو ہو
صحرا کی مگر تھی شان ہی اور ۔۔۔ رنگ اور تھا آن بان تھی اور
ہنگامِ سحر وہ عالمِ نور ۔۔۔ بکھرا ہوا دور تک وہ کافور
پھیلی ہوئی وہ شفق کی سُرخی ۔۔۔ سُرخی میں جھلک تجلّیوں کی
میدان میں سبز دوب کا فرش ۔۔۔ شبنم کے وہ قطرے انجمِ عرش
موتی بکھرے ہوئے پڑے تھے ۔۔۔ ہیرے اُبھرے ہوئے جڑے تھے
اب دورِ خزاں ہے اور نہ پت جھڑ ۔۔۔ سرسبز ہیں جنگل اور بیہڑ

[illegible] ۳۱۵ ... کا پہلا حصہ زمانہ جنوری ۱۹۳۶ء میں شائع ہو چکا ہے۔ (ایڈیٹر)

شاداب ہیں کیا پہاڑ، کیا بن — پھولوں سے بھرا ہوا ہے دامن
اشجار کہیں کھڑے ہیں گنجان — مخمل سا کہیں ہے سبز میدان
سایہ کسی جا گھنا گھنا ہے — منظر کہیں صاف دھوپ کا ہے
سایے میں ہوا کا ہے یہ پیغام — پھیلائیے پاؤں کیجئے آرام
اشجار میں کونپلیں نئی ہیں — دھانی، عنابی، کھٹئی ہیں
نکھرے ہوئے ہیں ہرے ہرے برگ — چکنے چکنے نئے نئے برگ
جو شاخ ہے نازنیں بنی ہے — یا حور کوئی بہشت کی ہے
شاخوں کی لچک کا اُف رے انداز — بل کھاتے ہیں گلرخانِ طناز
ننھی کلیاں غضب سجیلی — طوسی، نارنجی، زرد، نیلی
چھو جائے ہوا تو گل کھلائیں — چٹکیں، کھلیں، نکہتیں اڑائیں
پھولے ہوئے ہیں ہزار ہا پھول — خوشبو، خوش رنگ، خوشنما پھول
بل کھاتی ہے لہلہاتی ہے گھاس (ق) — پھولا کہیں زرد زرد املتاس
یا کوئی حسینہ لاجونتی — پہنے ہوئے ساری ہے بسنتی
سیمل کہیں گھنگچیاں کہیں آل — اودی اودی کہیں ہے کچنال
پھولی ہے شفق کھلا ہے ٹیسو — کیا آگ سی لگ رہی ہے ہر سو
کیا پھول ہیں سرخ رنگ گلنار — طوطے کی نوکیلی جیسے منقار
جھاڑی ہے کریل کی طرحدار — چُنری اوڑھے ہے یا کوئی نار
آموں کے شجر میں بور آیا — جنگل میں طرب کا دور آیا
بھینی بھینی گلوں کی خوشبو — ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائے دلجو
نکہت سے دماغ ہے معطر — ساری ہے سرور روح پرور
پھولوں پہ مگس کا آنا جانا — رس لے کے ہوا میں گنگنانا
بھونرا اتراتا پھر رہا ہے — رہ رہ کے گلوں پہ گر رہا ہے
پرواز میں والہانہ انداز — مستانہ ہے گونج مست آواز
خوش رنگ ہیں تتلیاں ہزاروں (ن) — پھولوں کی سی پتیاں ہزاروں
بل کھاتی ہوا میں اڑ رہی ہیں — لہرا لہرا کے ناچتی ہیں

یہ تتلیاں ہیں کہ آرزو ہیں — متوالی ہیں شوقِ رنگ و بو میں
جنگل کا پرندہ مایۂ ناز — طاؤس پری جمال و طنّاز
آئینۂ شوکت و تجمل — ہر نقش و نگار غیرتِ گل
ہے محوِ خرامِ ناز بن میں — جس طرح حسین کوئی چمن میں
وہ جلوۂ بال و پر یگانہ — ہے بن میں کھلا نگار خانہ
چڑیاں ہیں کہ چہچہا رہی ہیں — کیسی دھومیں مچا رہی ہیں
قمری کی صدائے شکوہ مندی — کوکو ہے کہ سازِ دلپسندی
کویل کی صدا جو کنجوں سے آئے — جنگل کی فضا میں جان پڑ جائے
کویل ہے کہ اک نئی دلہن ہے — ہے کنج شجر کہ پیرہن ہے
شرما شرما کے بولتی ہے — کس ناز سے قند گھولتی ہے
تھم تھم کے پپیہے کی فغاں وہ — جان و دلِ عشق پی کہاں وہ
گونجے تو فضا میں کیف بھر دے — ذرّے ذرّے کو مست کر دے
جھیلوں میں کنول کھلے ہوئے ہیں — یا جمگھٹے نازنینوں کے ہیں
رنگیں بطیں کر رہی ہیں کریال — دھل دھل کے چمکتے ہیں پر و بال
وہ آبِ خنک ہری ہری گھاس — بجھ جاتی ہے جس کو دیکھ کر پیاس
جھیلوں کی فضا میں وہ اثر ہے — ٹھنڈا ہے جگر دماغ تر ہے
ہرنوں کا پرے جمائے چرنا — وہ کودنا وہ طرارے بھرنا
کرتی ہیں کلیلیں نیل گائیں — بھڑکیں تو ہوا کے ساتھ جائیں
وہ شام کا عالم پُراسرار — وہ کیفیتِ سکون بیدار
وہ موجِ شفق کا رنگ بھرنا — گلگوں ارض و سما کو کرنا
ساکت ہیں شجر ہوا ہے خاموش — طائر چپ ہیں فضا ہے خاموش
ساری خلقت سجود میں ہے — کس کا جلوہ نمود میں ہے
پیدا ہے خموشیوں میں آواز — گونجا ہوا پردے میں ہے وہ ساز
کیف و مستی رواں ہے جس سے — آرام و سکونِ جاں ہے جس سے
حسنِ فطرت سرور بن کر — چھایا ہے دماغ و روح و دل پر

جو رنگ ہے موجبِ صفا ہے — آئینۂ قلب کو جلا ہے
دل چاہتا ہے کٹی بنا کر — قدرت کی پرستشیں کیا کر
گلرنگ ہوئی وہ نسیم پیکر — تاباں ہوئے اور دل کے جوہر
تصویرِ جمال بن گئی وہ — سر تا بقدم بہار تھی وہ
آغازِ سحر سے لے کے تا شام — کٹتے تھے مسرتوں میں ایام

جب دن کا سفر تمام ہوتا
رشیوں کے یہاں مقام ہوتا

بسنت رُت

(حضرت برق مرحوم)

بسنت آئی ہے پھر مشکبار کیا کہنا — بنے ہیں دشت وجبل لالہ زار کیا کہنا
برس رہا ہے سر لالہ زار کیا کہنا — یہ درفشانیٔ ابرِ بہار کیا کہنا
یہ جوشِ لالہ و سنبل، یہ حسن غنچہ و گل — یہ فرشِ خاک، یہ نقش و نگار کیا کہنا
جلا کے رختِ خزاں دم زدن میں خاک کیا — اُڑے وہ آتشِ گل سے شرار کیا کہنا
سمٹ کے غنچۂ نو بن گیا ہے جوشِ نمو — اس انتشار پہ یہ اختصار کیا کہنا
شگوفہ ریز ہے ہر جنبش نشاط انگیز — یہ رنگِ موجِ نسیم بہار کیا کہنا
نکھار پر ہے رُخ گل زہے کرشمۂ حسن — بہار پر ہے عروس بہار کیا کہنا
کہیں ترانۂ قمری، کہیں ہے بانگِ ہزار — بنا ہے صحن چمن لالہ زار کیا کہنا
شمیم غنچۂ دالبتہ فرح بخشِ دماغ — خجل ہے نافۂ مشک تتار کیا کہنا
سُرور اور سُرورِ شرابِ خندۂ گل — خمار اور خمار بہار کیا کہنا
بسنت رت میں ہیں گل پیرہن بسنتی پوش — گلے کا ہار ہیں پھولوں کے ہار کیا کہنا
نظر فروز ہے وہ رنگ وروپ سرسوں کا — ہے جس سے رنگِ طلا شرمسار کیا کہنا
گلِ بنفشہ، گلِ اشرفی، گلِ شرشف — نظر ہے حسن پر ان کے نثار کیا کہنا
گلال بن کے رُخ گل پہ آئی ہے سرخی — عبیر بن کے اُڑا ہے غبار کیا کہنا
فضائے سبزہ۔لب جوبار و جلوۂ گل — نظر ہے حسن پر اُن کے نثار کیا کہنا
یہ رُت بسنت کی اور برق مبتلائے الم — بہار اور دلِ داغدار کیا کہنا

مُحب

(از جناب مولوی محمد یحییٰ صاحب تنہا بی۔اے ایل ایل بی)

آپ کا نام شیخ ولی اللہ ہے اور محب تخلص ہے۔ حضرت شاہ افضل خدا نما قدس سرہٗ کی اولاد سے ہیں۔ اور مرزا رفیع السودا کے شاگرد رشید ہیں، آپ پختہ مشق اور صاحب دیوان ہیں۔ مرزا سلیمان شکوہ کی سرکار میں بصیغۂ شاعری ساٹھ روپیہ ماہوار پر ملازم ہو کر دہلی سے لکھنؤ چلے گئے تھے۔ اور شاہزادہ موصوف کے اشعار پر اصلاح دیتے تھے۔ جب سید انشاء اللہ خاں دہلی میں تشریف رکھتے تھے اور مشاعروں میں غزلیں پڑھتے تھے تو آپ بھی شریک مشاعرہ ہوتے تھے۔ سید صاحب نے مرزا عظیم بیگ کے خلاف ایک مخمس سر مشاعرہ پڑھا جس کا یہ مطلع ہے:۔

گر تو مشاعرہ میں صبا آج کل چلے   کہیو عظیم سے کہ ذرا وہ سنبھل چلے

اتنا بھی حد سے اپنی نہ باہر نکل چلے   پڑھنے کو شب جو یار غزل در غزل چلے

بحر رجز میں ڈال کے بحر رمل چلے

اور اُنھوں نے عظیم کے ساتھ سب کو لے ڈالا۔ دوسرے مشاعرہ میں محب، فراق اور حکیم قدرت اللہ قاسم وغیرہ کمریں باندھ کر آئے اور محب نے یہ قطعہ پڑھا، کیونکہ سید انشانے بادشاہ سے یہ بھی عرض کر دیا تھا کہ فلاں فلاں اشخاص حضور کی غزل پر تمسخر اور مضحکہ کرتے ہیں جس کا ان سب کو رنج تھا۔

مجلس میں اُچکے چاہیئے جھگڑا اشعار کا   ایسے ہی کسی صاحب توقیر کے آگے

یہ بھی کوئی دانش ہے کہ پہنچے یہ قضایا   اکبر ثانی یا شاہ جہانگیر کے آگے

لیکن میر مشاعرہ نے آپس میں صلح صفائی کرا دی اور اس قضیہ کو مٹا دیا۔

آپ کی تاریخ پیدائش اور تاریخ وفات کا صحیح علم نہیں لیکن جہاں تک معلوم ہو سکا ہے آپ ہدایت اللہ خاں ہدایت کے ہم عمر تھے۔ یا دو چار سال چھوٹے ہوں۔ اس لئے ہم آپ کا سن پیدائش سنہ ۱۱۴۲ھ خیال کرتے ہیں اور چونکہ قاسم کے تذکرہ کی تصنیف کے وقت آپ لکھنؤ میں وفات پا چکے تھے۔ اس لئے تاریخ وفات اندازاً سنہ ۱۲۱۴ھ فرض کی جاتی ہے۔ اس حساب سے آپ کی عمر بہتر ۷۲ سال

ہوتی ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

کلام پر تبصرہ آپ کی نسبت مجموعۂ نغز میں لکھا ہے کہ "بسیار سیر مشق دیوانے مملو انواع سخن از وے یادگارِ زمانہ است۔" ہمارے پیشِ نظر آپ کا وہ منتخب کلام ہے جو حضرت قاسم نے اپنے تذکرہ میں دیا ہے۔ اُس سے ہمیں دو باتوں کا اندازہ ہوا، ایک یہ کہ آپ تشبیہات اور رعایت لفظی کے بہت دلدادہ ہیں، دوسرے آپ کے کلام میں وہ روانی اور شستگی نہیں ہے جو ہدایت یا فراق کے یہاں ہے۔ بیشک مضامین کی تلاش آپ کے یہاں پائی جاتی ہے اور بعض شعر قابلِ تعریف ہیں۔ لیکن آپ صرف دوسرے درجہ کے شعراء میں شمار کئے جا سکتے ہیں، اس سے زیادہ آپ کا مرتبہ اِس فن میں نہیں ہے۔ ہمارے لئے یہ بھی دقت ہے کہ پورا دیوان ہمارے سامنے نہیں ہے لیکن جو کچھ کلام ہمارے روبرو ہے اور وہ کلام بہر حال منتخب ہے اُس سے ہرگز یہ قیاس نہیں کیا جا سکتا کہ دوسرے درجہ کے شاعروں میں آپ کوئی ممتاز جگہ پا سکتے ہیں۔ آپ کے اشعار جو رعایتِ لفظی سے پُر ہیں حسب ذیل ہیں:-

مارا تمام لشکرِ عشاق، زلف نے ۔۔۔ اپنا نشان کھول سرِ جنگ سانپ کا

صورتِ گلدستہ ہر نقشِ قدم پر ہے بہار ۔۔۔ ہے خرامِ ناز میں اُس گل کے گلشن زیرِ پا

کہیں پروں کو منتشر نہ کریں ۔۔۔ جھوم جھوم اُس پری کے جھونکے آج

ہم لعل لبوں کو ترے جھوٹا نہ کہیں گے ۔۔۔ تو کہہ کہ نہ لایا کبھو یک حرف بلب سچ

مدفن سے عاشقوں کے وہ گلگوں سوار حیف ۔۔۔ قدرے عناں کشیدہ نہ گزرا ہزار حیف

اُس گلِ عارض کو جوں خورشید تاباں دیکھکر ۔۔۔ شبنم بیتاب ہوکر اڑ چلا ہے رنگِ گل

آپ کی تشبیہ بھی ملاحظہ ہو:-

کیچلی ڈالے ہوئے ہر ایک کالا ناگ ہے ۔۔۔ تیل میں دیکھے جو تیرے موئے سر بھیگے ہوئے

جہاں تک دیکھا گیا آپ کا کلام صائب کے رنگ پر ہے بلکہ ناسخ کا آپ کو پیشرو کہنا چاہیئے اور کیا تعجب ہے کہ ناسخ نے آپ کے کلام کے مطالعہ کے بعد یہ رنگ اختیار کیا ہو۔

بعض اشعار میں آپ نے مبالغہ بھی بیحد کیا ہے مثلاً

وہ شعلہ خو، لبِ دریا کرے جو بادہ کشی ۔۔۔ ہو عکس اُسکے سے ماہی کباب در تہِ آب

رکیک استعارے آپ کے یہاں بھی پائے جاتے ہیں:-

رات کو سوئے تو گلے سے لپٹ ۔۔۔ وہ بھی دن پھر دکھائے گا اللہ

بڑھ کچھ تو ایک بوسے پہ لے یار اور بھی ہیں جنسِ دل کے ورنہ خریدار اور بھی

متروکات اِس مختصر کلام میں بھی حسب ذیل پائے گئے:۔

دہان باعلان نون، شعر:۔

کچھ بات تو بناؤں گو تنگ حوصلہ ہوں گر مجھ کو مجھ میں چھوڑے فکرِ دہان تیری

ٹک بجائے ذرا، کبھو بجائے کبھی۔ ہندی الفاظ کی فارسی قاعدے سے جمع جیسے ملیاں بجائے ملیں دیئے بجائے دیتے۔ اِس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ آپ نے بھی اپنے کلام میں آجکل کے متروکات جو اُس وقت رائج تھے کافی استعمال کئے ہیں۔ ذیل میں آپ کا منتخب کلام ہدیۂ ناظرین ہے

ہے زردیِ رنگِ رُخِ عشاق سے ظاہر ہے زر نہ نجھے عشق کبھی سیم بروں کا

شب جہاں رقاص وہ زہرہ جبیں تھا ہم نہ تھے ہے بجا شکوہ اس اپنے طالعِ ناساز کا

کاٹی شبِ فراق تو آنکھوں میں تا بہ صبح اب آ پہونچ کہ روز ہے پیارے وصال کا

شکستِ دل کی ہوتی ہے درستی بات کہنے میں اثر اُس سنگدل کی ہے زباں میں مومیائی کا

شہِ خوباں نے پروانہ لکھا جوں شمع عاشق کو جلانے کا جگر کے سر کٹانے کا رُلانے کا

مری دیوانگی کو دیکھ یار آپس میں کہتے ہیں کہ جانے دو میاں کیا لطف سودائی سے ملنے کا

دل تو پہلے لے چکے اب کیا ہے مطلب آپ کا بے تکلف وہ بھی کہہ دیجے کہ ہے سب آپ کا

مستوں کو غسلِ مے سے ہو راحت کہ بعد مرگ ایذا نہ دیوے دردِ سر اُن کو خمار کا

میں معتقد ہوں اپنے اس عشق کی کشش کا پھیرا مزاج آخر اُس میرزا منش کا

صحرا میں خار باغ میں گل گل میں بُو ہوا جس رنگ میں نمود ہوا یار، تو ہوا

اس بزم میں کسی کو ملا غم کسی کو عشق ساغر کو خندہ، گریہ نصیبِ سبو ہوا

تو اور تری چاہ پوچھنا کیا صدقے ترے واہ پوچھنا کیا

دلِ مومن خدا کا گھر ہے، یاں عشق بتاں پایا

غلط ہے یہ کسی کے گھر میں کوئی گھر نہیں کرتا

عبث مانع ہوئے رونے کے تم اے ناصحو اس دم عجب حالت میں تھا میں، دل سے میرے غم نکلتا تھا

دلربا اور کہیں ہے تجھسا اے مری جان نہیں ہے تجھسا

کر سیر ٹک حدیقۂ دل کی کسی کے شیخ پھر کہہ جو سبز ہووے تو باغِ جناں کی بات

اے گلِ خنداں ثباتِ عمر ہے شبنم سے کم یاں بہار رنگ پر ہنسنا ہنسنا ہے عبث

صبحِ طرب کو شامِ غم اے مہروش نہ کر | کھڑے چھپا نہ کھول نہ کاکل ملی الصباح
پھر جائے رخ صفوں کی صفوں کا کماں کی طرح | سیدھا کرے جدھر کو مرا تیرِ آہ رُخ
کب بنا سودا صبا اُس کی شمیم زلف کا | تو خریدا چاہتی ہے مشک یا عنبر کے نرخ
کیا ہے جس نے دنیا چھوڑ سطحِ خاک پر بستر | بچھا اُس کا مسیحا سے پرے افلاک پر بستر
قرار اس باغ میں جوں شبنم و گل کسکو ہے یکجا | کبھو ہے سیج پھولوں کی کبھو خاشاک پر بستر
محبسا نہ محبّ زیرِ فلک کوئی ہے تیرا | پیارے نہیں تجھسا بھی دلارام زمیں پر

سحاب و برق ہیں یا شیشہ و ساغر ہیں کیا ہم تم
کہ ہم جس وقت رو دیں تم ہنسو اُس وقت قہ قہ کر
زمیں میں گڑ گئے دیکھ اُس قدِ رعنا کو خجلت سے
لبِ جو پر اکڑتے تھے کھڑے کیا سرو لہہ کر
تو نے کیا ہے ایک مدت سے ہم کو یہ انعام مقرر
لیوے نام ہمارا پیچھے پہلے دے دشنام مقرر

ہر غنچہ ہے گلابی ہر گل ہے ساغرِ مے | یعنی نہ ہو رہا ہے گلزار تیری خاطر
ولد وز نگہ یار کی ہوتی ہے مقابل | برچھی کی اَنی سی مرے سینہ میں گڑی ہے
پار کر دینے کی خاطر کشتی امید کو | آہ سی بادِ مُراد اور اشک سا دریا ہے بس

یہ آتش باغ میں ہم نے لگی دیکھی تھی کل تجھ بن
نسیم آتش، چمن آتش، گل آتش، گل کی بُو آتش

دن وصل کے وعدے کا کبھو یاد نہ رکھنا | کیوں اے بتِ پیماں شکن اقرار فراموش
نگاہِ شوخ ہے غارت گرِ ہوش | ہجومِ خواب ہے صبحِ بناگوش
محبّ کیوں طائرِ دل کو اسیرِ عشق کرتے ہو | کہ وہاں ہے دانہ آتش دام آتش اور قفس آتش
قاصد تجھے قسم ہے خدا اس کو دئے کے بعد | تھوڑی بہت زبانی بھی اب کے نہ بھول عرض

وہ سجیں کہاں وہ دھجیں کدھر وہ اکڑ کجا وہ پھبن غلط
ترے قد سے دعوئے ہمسری جو رکھے ہے سرو چمن غلط
دین و دل سب لوٹ لیتے ہیں کہاں کا اختلاط
ہے خدا کا قہر اِن کافر بتاں کا اختلاط

تم نے تو کیا اُٹھائے ہماری وفا سے حظ
ہائے ہمیں نے خوب تمہاری جفا سے حظ

تری وضع بیگانگی نے نہ چاہا
رکھے آشنا آشنا سے توقع

غم میں پتنگ کے وہ جلے ہو جھڑے ہے آگ
خلقت کو ہے شگون کہ ہوا خندہ زن چراغ

اے بندہ پرور اتنا لازم ہے کیا تکلف
اُٹھیئے غریب خانے چلئے بلا تکلف

دیر و حرم ہے دل میں یہاں شیخ و برہمن اے محب
بھٹکیں ہیں رستہ چھوڑ کر ایک اس طرف ایک اُس طرف

لرزاں ہے مرے نالے سے جان و جگر برق
جلتے ہیں مری آہ کے شعلے سے پر برق

ہم اُس بتِ کافر کی پرستش میں ہیں لے شیخ
آنکھوں سے جسے پوجیں ہیں مردانِ خدا تک

بیشتر ابر و ہوا میں خوشنما ہے رنگِ گل
نشۂ مُل سے مگر مل کر بنا ہے رنگِ گُل

عکسِ چشمِ مستِ ساقی سے چمن میں بزم کے
مے نہیں جامِ بلوریں میں بھرا ہے رنگ گُل

یوں نوکِ ہر مژہ پہ نمایاں ہے لختِ دل
جس طرح شاخِ گل سے رہی ہو کلی نکل

ابر و باراں کو نہ لوں دیدۂ نمناک کے مول
صد چمن گل نہ خریدوں دل صد چاک کے مول

پھونکدے رشک سے گو اُس کو فلک پر نہ بکے
برقِ رخشندہ ترے غمزۂ چالاک کے مول

مزرعِ امید دل کب سبز ہووے ابر سے
اشک کی بارش سے یہ چشمِ کرم رکھتے ہیں ہم

ہم ہیں کدھر کہاں ہیں جو ہم ہیں تمہیں نہیں
سب میں تمہیں تمہیں ہو نہیں سو ہمیں نہیں

آراستہ آنکھوں کے گھر تیری ہی خاطر ہیں
چھڑکاؤ ہے پنکھا ہے چلمن ہے کٹہرے ہیں

ہم سے کیا ہموار ہے لیست و بلندِ راہِ عشق
آہ اُس جانبِ فلک اور اشک آں سوئے زمیں

بہت تھیں کبک کی رفتار کی دھومیں سو اب تیری
اِن اچپلیوں کی چالوں نے وہ سب پاؤں تلے ملیاں

ساقی کو لے بغل میں ہم توبہ توڑتے ہیں
زاہد کے سر سے شیشۂ تقویٰ کا پھوڑتے ہیں

جنوں کے پڑا ہاتھ کارِ گریباں
پھٹا اُڑ گیا تارِ تارِ گریباں

درد اُس بیدرد کے آگے کہا جاتا نہیں
بن کہے بھی سخت مشکل ہے رہا جاتا نہیں

میں ہی تم سب کا بنا تیرِ ملامت کا نشاں
اُس بتِ سرکش کو یارو کوئی سمجھاتا نہیں

اور تو کیا کہیں اِک آن جو ہم تک آؤ
نذر جی کرتے ہیں سو جان جو ہم تک آؤ

محبت سے طریقِ دوستی سے چاہ سے مانگو
مرے صاحب! کسی سے دل جو مانگو راہ سے مانگو

تو مل گلے سے غیر کے ہم بھی ترے سنور
کاٹیں گے اپنا آج گلا کیا مضائقہ

کیوں محب افسوس ہم میں اُس میں کیا تھا اختلاط
ذکر مدت کا نہیں یہ حال کا مذکور ہے

یہاں غرض گل سے نہ بلبل سے ہمیں نے ابر سے
سینۂ صدچاک و دل نالاں و چشم زار ہے

بتانِ سنگدل بے رحم ہیں سخت
ملو مت اِن سے اے بندو خدا کے

ترے جو یہی ستم رہیں گے
تو کاہیکو جیتے ہم رہیں گے

دیکھوں میں نظر بھر تجھے ایک آن تو دم لے
یہ اشک مرے دیدۂ خونبار سے تھم لے

در پہ اُس گل کے محب تم سے ہزار
پھرتے ہیں دل بیچنے والے پڑے

رہتے ہیں بے اشک یوں آنکھوں کے گھر سوکھے ہوئے
سیپ جوں خالی پڑے ہوں بے گہر سوکھے ہوئے

کس کی ہنسی کی دھوم یہ آئی چلی چلی
گُل گُل شگفتہ ہے جو چمن کی کلی کلی

مجھ صیدِ ناتواں پہ نہ صیاد ہاتھ ڈال
دب جائیں گے یہ مشتِ پر انگشت کے تلے

دام گل مانگے ہے رنگ و بو صبا کی معرفت
گلشنِ ہستی میں اُس کے چہرۂ گلفام سے

گل اندامों سے مِل کر آپ کو رسوا کیا ہم نے
بت چھُو کے ہزار افسوس ہے یہ کیا کیا ہم نے

جذباتِ سیفی
از حضرت سیفی گنوری

تاثیرِ ضبطِ عشق ہے یا کوئی راز ہے
مصروفِ التفات مرا بے نیاز ہے

لغزش قدم کو، قلب میں سوز و گداز ہے
شاید قریب مجھ سے تری بزمِ ناز ہے

سینے میں آہ دوڑتی پھرتی ہے ہر طرف
لُٹنے کو غالباً مری دنیائے راز ہے

میں نے ازل میں حُسن کو دیکھا تھا بے نقاب
اب تک مری نظر میں وہی بزمِ ناز ہے

میرا شکستِ رنگ ہے اظہارِ سوزِ غم
الفت میں ضبطِ درد بھی تفسیرِ راز ہے

چھڑتے ہی اسکے کوندتی ہیں دل میں بجلیاں
کیا برق پاش دردِ محبت کا ساز ہے

کچھ کم نہیں ہیں عشق کے سیفی تاثرات
مانا یہ میں نے حُسن بہت بے نیاز ہے

ہم لوگ

از حضرت فراق گورکھپوری ایم۔ اے



پیامِ حُسنِ چمن۔ خار زار ہیں ہم لوگ
جو سر بسر ہے خزاں وہ بہار ہیں ہم لوگ

تغافلِ نگہِ نازِ یار ہیں ہم لوگ
بلاکشانِ غمِ انتظار ہیں ہم لوگ

کوئی سمجھ نہ سکے کوئی بے خبر نہ رہے
کچھ ایسی مصلحتِ کردگار ہیں ہم لوگ

ز فرق تا بقدم بجلیوں کی رَو ہیں ہیں
نگاہِ یار ترے بے قرار ہیں ہم لوگ

نہ قرب سے ہمیں مطلب غرض نہ دوری سے
نہ جانے کیوں ہمہ تن انتظار ہیں ہم لوگ

ہمیں سے آنکھ ملی حُسن کی ہمیں سے جھکی
وہ کشتۂ نگہ شرمسار ہیں ہم لوگ

تمام خونِ جگر ہیں تمام زخم نہاں
یہ کس بہار کے آئینہ دار ہیں ہم لوگ

ہر اک نفس میں نہاں سوز و سازِ بزمِ مجاز
دلِ تپاں۔ شمعِ بے قرار ہیں ہم لوگ

ہمیں ہیں دامنِ دشتِ جنوں میں گریۂ شام
چمن میں خندۂ صبحِ بہار ہیں ہم لوگ

ارے یہ سوزِ نہانی ارے یہ شدتِ ہوش
یہ کس نگاہ کے سرمایہ دار ہیں ہم لوگ

ہر ایک برق ادا ہے پیامِ خوابِ عدم
عروسِ مرگ کے بوس و کنار ہیں ہم لوگ

ہمیں ہیں مہر و محبت ہمیں ہیں قہر و غضب
کہ سر بسر اثرِ نور و نار ہیں ہم لوگ

تمام برقِ نشیمن تمام آتشِ گل
چمن میں شعلۂ صوتِ ہزار ہیں ہم لوگ

اُٹھو اُٹھو کہ وہ زنجیرِ شامِ غم ٹوٹی
صدائے نغمۂ صبحِ بہار ہیں ہم لوگ

سوادِ شام ہیں پیراہنِ شبِ غم ہیں
وہ پو پھٹی کہ ادھر تار تار ہیں ہم لوگ

تمام شہرِ خموشاں تمام جوشِ حیات
صدائے صور ترے پردہ دار ہیں ہم لوگ

جہاں فسردہ ہوئے نبضِ کائنات چھٹی
فریبِ دہر ترے اعتبار ہیں ہم لوگ

ہیں رازدارِ غمِ کاروانِ نُہ افلاک
شکستِ رنگِ رُخِ روزگار ہیں ہم لوگ

چلے ازل سے تو رُکنے کا نام تک نہ لیا
وہ نشترِ دلِ ہستی فگار ہیں ہم لوگ

ہیں مہر و ماہ کی آنکھوں میں بھی سمائے ہوئے
یہی نہیں ہے کہ مشتِ غبار ہیں ہم لوگ

ہمارے زیر نگیں ہیں بلندی و پستی
مکین ارض و فلک اقتدار ہیں ہم لوگ

ہزار باد مخالف ہزار طوفان سے
نہ بجھ سکے وہ بھڑکتے شرار ہیں ہم لوگ

ہمیں سے لرزہ براندام ہے نظامِ جہاں
کہ فتنہ خو و قیامت شعار ہیں ہم لوگ

شجر حجر کے اُڑانے کو سمِ قاتل ہیں
بجھے ہوئے تبر آبدار ہیں ہم لوگ

ہمیں سے موج حوادث کا دل لرزتا ہے
سوار کشتیٔ طوفاں فگار ہیں ہم لوگ

پھری نہ پیٹھ کبھی رزم گاہ ہستی میں
کہ شان و نازشِ صد کارزار ہیں ہم لوگ

فریب حشر نہ تھا آفتاب محشر کے
جہاں میں جلوۂ نصف النہار ہیں ہم لوگ

ہماری جلوہ گری میں بھی شان صحرا ہے
بہار گلشنِ بے برگ و بار ہیں ہم لوگ

تمام ساز خموشی تمام ہنگامہ
امینِ جلوۂ منصور و دار ہیں ہم لوگ

جسے سکون ابد بھی ترس گیا ہے فراقؔ
وہ ساز غم وہ دلِ بے قرار ہیں ہم لوگ

جذباتِ بسملؔ

(از جناب بسملؔ الہ آبادی)

اگر یونہی وحشت کا سامان ہوگا
نہ دامن نہ اپنا گریبان ہوگا

یہ مانا ابھی قدر الفت نہیں ہے
کبھی آپ کو میرا ارمان ہوگا

بہارِ جنوں عشق میں آرہی ہے
ابھی ٹکڑے ٹکڑے گریبان ہوگا

ازل سے تمہاری تمنا میں گزری
ابد تک تمہارا ہی ارمان ہوگا

اسے سر پہ رکھیں گے سب اہلِ وحشت
تبرک ہمارا گریبان ہوگا

زمانے نے رکھا پریشان مجھ کو
زمانہ بھی تم سے پریشان ہوگا

رہے گا جو پامال راہِ وفا میں
وہ کمبخت میرا ہی ارمان ہوگا

ازل سے ہے بسملؔ بتوں کا پجاری
کہیں ایسا ہندو مسلمان ہوگا

تناسخ اور مذاہب فلسفہ

از رائے زادہ گوبند پرشاد صاحب آفتاب

تناسخ، تماسخ اور تفاسخ تینوں جُدا جُدا الفاظ ہیں۔ لیکن عرف عام میں تناسخ ہی سے تینوں الفاظ کے معنی مُراد لئے جاتے ہیں۔ تناسخ کے معنی یہ ہیں کہ آدمی مرنے کے بعد دوبارہ آدمی ہی کے قالب میں پیدا ہو، تماسخ کا مطلب یہ ہے کہ کوئی انسان مرنے کے بعد جمادات کا قالب اختیار کرے، تفاسخ قالب انسانی سے قالب نباتی میں انتقال رُوح کو کہتے ہیں لیکن جب ہم تناسخ کی بحث کرتے ہیں تو ہمارا منشا اِن تینوں نظریوں کو ایک ہی زنجیر خیال میں پیش کرنا ہوتا ہے۔

تناسخ کا مسئلہ ہر زمانے اور ہر مُلک کے لوگوں میں زیر بحث آتا رہا ہے اور چونکہ اس مسئلہ کا تعلق انتقال روحانی سے ہے۔ اس لئے وہ مذاہب جو وجود روحانی کے قائل ہیں اِس پر خصوصیت سے بحث کرتے ہیں۔

آخرالذکر اقسام کے سب مذاہب حیات بعد الموت کے قائل ہیں البتہ خالص مادہ پرست ملحد مذاہب اس کے قائل نہیں ہیں۔

خبّات۔ بھوتوں اور روحوں کے وجود پر یقین کی طرح حیات بعد الموت کا یہ تخیل بھی کہ روح دوبارہ دنیوی محبّت کے زُلف گرہ گیر میں پھنسکر کسی قالب خاص کو اختیار کرتی ہے۔ عوام الناس کا عام خیال ہے۔ لیکن اگر نظر غائر سے دیکھا جائے تو جو مذاہب "ہمہ اوست اور ہمہ از وست" کے قائل ہیں یا مذاہب تصوّف میں شمار کئے جاتے ہیں وہ تناسخ کے وجود کے قائل نہیں ہیں۔ ان مذاہب سے بعض تو ابدی روح کا وجود ماننے والے ہیں اور بعض وجود روح کے قائل نہیں بلکہ انا الحق کی صداقت کے معتقد ہیں۔ لیکن دونوں صورتوں میں روح کو "امر ابی" یا نور الہی تصور کرتے ہیں اس کو اللہ تعالیٰ کی ذات سے جُداگانہ جوہر قایم بالذات یا قدیم بالذات خیال کرنے کے لئے تیار نہیں۔ بلکہ خلقت باری تعالیٰ مانتے ہیں۔

غرض جس طرح ماسوائے عالم کو صفات الٰہی تسلیم کرتے ہیں اسی طرح روح کو بھی منجملہ ماسوا تصور فرماتے ہیں۔

یہی نظریہ ہے جس کی وجہ سے اِن مذاہب میں مسئلہ تناسخ کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی کیونکہ "انا الحق" کہنے والوں کو نظام عالم اور ازل و ابد کے رابطہ اتحاد کی احتیاج نہیں۔ اور صفت کا استحکام ہو سکتا ہے لیکن اس کا انتقال ذاتی ممکن نہیں۔ وہ ہر انتقال کے لئے اپنے موصوف کی محتاج ہے۔ مثل امرابی روح بھی قابل انتقال نہیں ہو سکتی۔ اور اگر ہو بھی تو کسی خاصۂ ذاتی کی بنیاد پر نہیں بلکہ امرابی کی وجہ سے ہوگی۔

اِن مذاہب صوفیہ کے برعکس جن میں عیسائی، مسلمان، یہودی، ویدانت وغیرہ مذاہب شامل ہیں۔ معمولی فہم کے مذاہب عام جو خلاقی ربانی کے قائل نہیں ہیں بلکہ مادہ۔ روح اور ذات الٰہی تینوں کو قدیم بالذات تسلیم کرتے ہیں۔ تناسخ کے قائل ہیں اور ہندوؤں، مصریوں، یونانیوں وغیرہ کے مذاہب عوام الناس کی بنیاد انہی مذہبی تخیلات پر رہے ہے۔

اِن مذاہب کو لازمی طور پر وجود تثنیث کی تسلیم سے ان تینوں وجودوں میں کسی رابطہ کے قیام کی ضرورت محسوس ہوئی۔ کیونکہ اگر ان وجودہائے سہ گانہ میں باہم ارتباط نہ ہو تو تخیل تثنیث بے نظم ہو جائے اور نظام عالم میں وہ بے ترتیبی ظاہر ہو جائے جو تقاضائے عقل نہیں ہو سکتی۔ اسی وجہ سے لازمی طور پر روح کے وجود قدیم بالذات ثابت کرنے کے لئے شاخسانوی نظام تناسخ اور تبدیل ہئیت باہمی درمیان موجودات کی ضرورت ماننی پڑی۔

جن اصحاب نے مذاہب عالم کو تصوفی اور غیر تصوفی اقسام میں تقسیم نہیں کیا ہے یا جو مبادیات مذاہب سے بہرہ نہیں رکھتے ہیں۔ وہ تناسخ کو خود ایک جداگانہ مسئلہ تصور فرماتے ہیں۔ لیکن فلسفۂ مذاہب کا عمیق مطالعہ کرنے والے تناسخ کو محض معمولی فہم (COMMON SENSE) کے مذاہب عامیانہ کے نظام مذہبی کی ایک اہم کڑی سمجھتے ہیں۔



مغنیہ

(از سید الطاف مشہدی ایڈیٹر رسالہ نشاط لائلپور)

یہ ترے نغماتِ شیریں کی فسوں زا کروٹیں — لہلہاتے زمزموں کا ایک بہتا آبشار
عرش پیمائے کی تانوں سے ہوائیں سلوٹیں — کوہ فرسا دیپکوں کے شعلہ ہائے سحر کار

زمزمے کی ہر لچک ہے موجِ بیتابِ خیال — وہ اُٹھی سازِ جوانی لے کے لہراتی ہوئی
لحن کی انگڑائیاں ہیں رقصِ گردابِ خیال — سرمدی کیفیتوں کے کیف برساتی ہوئی

یہ جوانی اور یہ حسنِ جہان آرا ترا — جوشش پُر سرمستیوں کی ایک موجِ سلسبیل
کارواں در کارواں جوشِ ترنم زا ترا — ہے دلِ صبر آزما کو دعوتِ کوسِ رحیل

کہہ رہا ہے اب یہ مجھ سے میرے دل کا اضطراب — کر رہی ہیں یہ تقاضا اب میری بیتابیاں
جذب ہو کر تیری تانوں میں رہوں میں کامیاب — غرق ہو کر تیرے نغموں میں رہوں میں کامراں

غزل

(از جناب محسن اعظم گڈھی)

برق بن بن کے نور جلتا ہے — غش میں موسیٰ ہیں طور جلتا ہے
چارہ گر چارہ گر نہ ہو بے چین — دل کلیجے سے دُور جلتا ہے
دل مرا جل رہا ہے سینے میں — دل میں کیف و سرور جلتا ہے
دلِ خطاوار تھا جلا تو جلا — اب جگر بے قصور جلتا ہے
بے سبب یہ دھواں نہیں محسن — آشیانہ ضرور جلتا ہے

بُدھ دھرم کی تازگی

(از رائے بہادر پنڈت شیو نراین صاحب شمیم مرحوم)

ہمارے مرحوم دوست پنڈت شیو نراین صاحب شمیم کا یہ قابل قدر مضمون ایک عرصہ سے اشاعت کے لئے محفوظ تھا ہمکو اس بات کا دلی افسوس ہے کہ آج جب یہ ہدیہ ناظرین زمانہ کیا جارہا ہے تو شمیم صاحب ہمارے درمیان موجود نہیں ہیں۔ افسوس۔ بقول شاعر؎

نویسندہ را نیست فردا اُمید نوشتہ بماند سیہ بر سفید

پروفیسر میکس ملر نے پیشگوئی کی تھی کہ ایک مرتبہ پھر ہندوستان بُدھ مت کا پیرو ہوگا۔ لیکن اُس کو کیا خیال تھا کہ یورپ میں بھی اس دھرم کی کافی اشاعت ہوگی۔ واقعی بقول مس گریس[1] ڈلبسری پریسیڈنٹ بدھ سوسائٹی "پیرس" برطانیہ۔ فرانس۔ جرمنی۔ ڈنمارک۔ اٹلی۔ ہنگری۔ سیوزرلینڈ میں بُدھ ازم کا پرچار ہورہا ہے۔ درحقیقت جنگ عظیم کے بعد یوروپ میں جو تباہی آئی ہے اُس کی تلافی بُدھ ازم کے اصولوں ہی پر چلنے سے ہوسکتی ہے۔

واضح ہو کہ انگلینڈ میں مہابودھی سوسائٹی کلکتہ و سیلون نے ایک عظیم الشان بودھی مندر تیار کیا ہے جس میں ایک پنجابی بھکشیو مستقل سکونت رکھتا ہے۔ کئی انگریز اس کے ممبر ہیں اور ہر اتوار کو لکچر ہوتے ہیں جنہیں سامعین کا خاصہ مجمع ہوجاتا ہے۔ ملک کے خیالات میں تبدیلی ہورہی ہے جس سے عیسائی پادری متفکر ہیں۔ انگریز بدھسٹ ایک رسالہ بھی شائع کرتے ہیں جس کا نام "برٹش بدھسٹ[2]" ہے۔ اسکے علاوہ ایک اور سوسائٹی بھی ہے جو تھوصافیکل سوسائٹی سے علاقہ رکھتی ہے۔ اس سوسائٹی کی جانب سے ایک اور ماہواری رسالہ بدھ ازم ان انگلینڈ[3] کے نام سے شائع ہوتا ہے۔ بدھاپسٹ (Budapest) میں بھی بودھی سوسائٹی قایم ہوگئی ہے۔ اور "بدھ سماج" روز بروز ترقی کررہا ہے۔ بدھی جماعت کے اجلاس روزمرّہ ہوتے ہیں۔ اور یوم ویساکھ (بدھ بھگوان کا جنم دن) بڑے دھوم دھام سے منایا جاتا ہے۔ لکچروں میں بودھی رسالوں کے اقتباسات سنائے جاتے ہیں۔ "ٹسرانا راگ" گایا جاتا ہے۔ جاپانی ٹھمریاں بجائی جاتی ہیں۔ علاوہ بریں ممالک بلقان سے بھی ایک رسالہ بدھ ازم کے پرچار پر نکلتا ہے۔ بلقان میں بھی ایک بودھی مندر تیار ہوگیا ہے۔

---

[1] مس صاحبہ کئی سال ہوئے لنکا تشریف لائی تھیں۔ اور ایک تقریر کے دوران میں یہ خیال ظاہر کیا تھا۔

[3] Buddhism in England [2] British Buddhist

فرانس میں دھم پاد اور مجھیما نکایا (بدھی کتب دھرم) کا ترجمہ فرانسیسی زبان میں ہوگیا ہے۔

کیمبرج یونیورسٹی میں کئی سال سے بدھ کا جنم دن (یوم ویساکھ) منایا جاتا ہے جس میں دلچسپ تقریریں ہوتی ہیں۔ اور بدھ بھگوان اور ان کی تعلیم کا تذکرہ ہوتا ہے۔ مندر بوربدر جاوا کے ملک میں اویار مدراس سے بودھی درخت پیپل لا کر لگایا گیا ہے۔ جیسا کہ کئی سال ہوئے سارناتھ بن بھی دو پودے لنکا سے لاکر لگائے گئے تھے

روس کی سوویٹ گورنمنٹ نے ایک کالج قایم کیا ہے جہاں علما کی مدد سے بدھ دھرم کی کتابیں جمع کی گئی ہیں اور پالی اور سنسکرت کی تعلیم بھی جاری کی گئی ہے تاکہ اس دھرم کی مزید تحقیقات ہوسکے۔ یوروپ امریکہ کے بودھی مندروں کی تعداد اور احوال کے متعلق ناظرین احقر کی تالیف "بدھ اور اسکی تعلیم" (اردو) ملاحظہ فرمائیں۔

ہندوستان میں میکس ملر کی پیشین گوئی پوری ہونے کے آثار معلوم ہو رہے ہیں۔ نیچر کے عجیب ڈھیرے ہیں۔ اکثر وہ غیر محسوس طاقت کام کرتی ہے اور انسان اُن کے سمجھنے سے بھی قاصر رہتا ہے واقعی آدمی کا ننھا سا دماغ اتنا ظرف نہیں رکھتا کہ بے پایاں کائنات کے انواع و اقسام کے قوانین اس کے مختصر ذہن میں سما سکیں۔ پیر۔ پیغمبر۔ رشی۔ منی۔ ہادی۔ مرشد۔ اوتار۔ فلاسفر۔ عالم محقق۔ پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ جو کچھ اُن کو کہنا ہوتا ہے وہ کہہ کر رخصت ہو جاتے ہیں۔ سائینس والے بھی قدرت کی باتیں دریافت کرتے رہتے ہیں۔ لیکن ان کی تحقیقات نامکمل ہیں۔ اور واقعہ یہ ہے کہ جتنا سائینس آگے بڑھتا ہے اتنی ہی نادانی معلوم ہوتی ہے۔ ہر نئی تحقیق سے ہماری معلومات میں اضافہ ہوتا ہے لیکن ابھی تک دریافت کی حد معلوم نہ ہوسکی۔ حضرت انسان نے بنی نوع۔ جیوانات۔ نباتات بھینٹ کئے کہ قہرمان سیر ہوں اور بشر کو مصئون رکھیں۔ بلاؤں کے روکنے کے لئے جنتر منتر ہون کئے گئے۔ مگر صدائے برنخواست تعزیر۔ توبہ۔ استغفار انکسار اور عقید تمندانہ اطاعت کی بھرمار ہوئی۔ مگر کس نمی پرسد کا معاملہ ہے۔ اس ساری سعی تجسس تفحص کے دوران میں اتنا ضرور محسوس ہوا۔ کہ پس پردہ کوئی اسرار ایسے ضرور ہیں کہ شاعر کو کہنا پڑا۔ کہ:-

"چو لاند یہ ند حقیقت رہ افسانہ زوند" واقعی "کس نکشود و نکشاید بہ حکمت ایں معارا"۔

۱۸۷۹ء میں گیا جی سے چھ میل پر اتفاقاً کھودتے کھودتے ایک رفیع الشان مندر دریافت ہوا جسکے آس پاس اور بہت سی سمادھیں نکلیں جن پر غیر زبانوں میں عبارتیں کندہ تھیں۔ اس انکشاف نے تاریخ کا ایک نیا باب کھولدیا۔ گویا بطن مادر ارض سے ایک خزینہ رونما ہوگیا۔

انگریزی گورنمنٹ کو چینی سیاحوں کے بعض سفرنامے ملے ہیں جن کا ترجمہ فرانسیسی اور انگریزی زبانوں میں ہوگیا ہے۔ ابتدا میں ان سفرناموں کو الف لیلہ کے فسانوں سے زیادہ وقعت نہ دی جاتی تھی مگر محکمہ

آثار قدیمہ کو دعائیں دیجئے جس کی کوشش سے ان سفرناموں کے حوالوں سے جابجا کھدائیاں ہوئی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ چینی سیاح افسانہ گو نہ تھے۔ اسی صحت سے اُنھوں نے ہندوستان کے بُدھسٹ زمانہ کو بیان کیا کہ جہاں ہاتھ ڈالا ان کا بیان من وعن صحیح نکلا۔ امپریل گورنمنٹ کے آثار قدیمہ کے محکمہ کی تحریک پر گوالیار۔ نظام۔ کشمیر۔ بھوپال کی حکومتوں نے بھی آثار قدیمہ کے محکمہ قایم کئے اب سب کی متفقہ کوششوں کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ بُدھی تواریخ کے اوراق لکھنے کے لئے سامان بہم ہوگیا ہے۔ یورپ کے محققین بھی متوجہ ہوگئے ہیں۔ پالی زبان کی کئی کتابیں ملی ہیں جن کے ترجمے کئے گئے ہیں۔ اور انکا اثر ہندوستان سے باہر بھی ہو رہا ہے۔ افغانستان میں کھدائی ہوئی ہے علاقہ بامیان (Bamian) سے ڈیڑھ سو فٹ بلند مورتیاں ملی ہیں اور زمین سے دوسرے بُت بھی نکلے ہیں۔ چنانچہ انکا عجائب خانہ بنایا گیا ہے۔ وسط ایشیا میں بھی کھدائی کی مہمیں بھیجی گئی ہیں۔ غرض یوروپین امریکن شائقین تاریخ جوق جوق جمع ہوتے ہیں اور جو اشیاء ملتی ہیں یورپ اور امریکہ کے عجائب خانوں کے لئے لے جاتے ہیں۔

نیپال گورنمنٹ نے بھی بُدھ بھگوان کے جنم بھومی کی جاترا (زیارت) کے لئے پختہ سڑک بنوا دی ہے اور زائرین (جاتریوں) کے لئے قیام گاہ بھی تعمیر کی ہے۔ غرض ہندوستان کے محکمہ آثار قدیمہ کی بدولت تاریخ کے طبق کے طبق کھل گئے ہیں :۔ یعنی

(الف) کپل وستو جہاں بُدھ بھگوان کے والد حکمران تھے دریافت ہوگیا ہے جس جنگل میں اور جس تالاب کے کنارے سدھارتھ شہزادہ کپل وستو بطن مادر سے پیدا ہے اس کا تعین ہوگیا ہے۔

(ب) جس مقام پر بدھ بھگوان کو نور باطن حاصل ہوا تھا یعنی بُدھ گیا کا مندر وہ بھی دریافت ہوگیا ہے اُس پیپل کے درخت کا بچہ بھی اب تک موجود ہے جس کے تلے وہ بیٹھے تھے۔

(ج) جہاں بُدھ نے پہلا وعظ سُنایا تھا اسوقت وہاں ایک عظیم الشان مندر اور کتب خانہ اور اسکول موجود ہیں اور تمام بودھی دُنیا سے جاتری آتے ہیں۔ اس مقام کو سارناتھ کہتے ہیں اس مندر میں جاپانی مصوروں نے نقش بنائے ہیں جن کا صرفہ دس ہزار روپیہ ایک انگریز نے دیا ہے۔

(د) کسنی آرا۔ ضلع گورکھپور تحصیل کاسیا میں جہاں گوتم بُدھ فوت ہوئے انکا بُت بستر مرگ کی حالت میں نکلا ہے۔ برما کے ایک رئیس نے اب یہاں تیس ہزار کی لاگت سے ایک استوپ بنوا دیا ہے۔

(س) راجگیر۔ ساوتھی۔ کوسی۔ وغیرہ وغیرہ سب مقامات جہاں بُدھ بھگوان اُپدیش دیتے رہے اب دریافت ہوگئے ہیں۔ اب ان مقاموں پر بُدھی بھکشو موجود ہیں اور بُدھ مندر بن گئے ہیں اور مورتیں استھاپت ہوگئی ہیں۔

(ہ) مدراس۔ بمبئی۔ لکھنؤ۔ کلکتہ میں بودھی مندر جینی دہارا کے نام سے بن گئے۔
(ژ) کشمیر میں بھی جو کسی زمانہ میں بودھ ازم کا مرکز تھا اب ایک بودھی سوسائٹی قایم ہو گئی ہے۔
(ذ) ہر سال بُدھ کا جنم دن نہ صرف بودھی وہاروں میں منایا جاتا ہے بلکہ غیر مذہب کے لوگ بھی اس کے سوانح عمری اور تعلیم پر غور کرنے کو جمع ہوتے رہتے ہیں۔
(س) بدھی دھرم پر اتنی کتابیں دنیا بھر کی زبانوں میں نکل رہی ہیں کہ اکثر کتب فروشوں نے اپنی فہرستوں میں ان کو ایک علیحدہ باب کے ذیل میں درج کرنا شروع کیا ہے۔ جرمنی اور فرانس میں ترجموں کی بھرمار ہو رہی ہے۔

مادرِ گیتی کے بطن سے ایک ذات بابرکات پیدا ہو گئی ہے جسکا نام چار دانگِ عالم میں درخشندہ ستارہ کے مانند چمک رہا ہے۔ یعنی گاندھی اور جس نے اُن قوموں کو منزلت دینی شروع کر دی ہے جو صدیوں سے مردود تھیں۔ اب وہ پھر طبقۂ اعلیٰ پر آ رہی ہیں۔ اس ذات بابرکات نے بے زبان جانوروں پر رحم کے اُصول کو بھی تازہ کیا ہے۔ کیا یہ بودھی طریق نہیں؟

ہندؤں نے دیگر مذاہب کے متلاشیان دین پر اپنے دھرم کا دروازہ کھولدیا ہے۔ یہ بھی بُدھ دھرم ہی کا اثر ہے جس کے اُصول کے مطابق دھرم پر کسی قوم یا ملک کا اجارہ نہیں ہو سکتا اور ہر بنی نوع انسان کو مذہب کی حقیقت کی بشارت کا حق ہے۔

کیا یہ واقعات بے معنی غیر نتیجہ خیز ہیں یا کوئی عالمگیر اثر پیدا کریں گے۔ ہم کہتے ہیں بقول حالی ؎

اگر ہو نہ یہ انقلاب اتفاقی
تو دریا میں بس اک تموج ہی باقی

رُباعیات بسمل

(۱)

ہر وقت جو گھیرے رہے پستی مجھ کو　　تو خاک بلندی میں ہو مستی مجھ کو
ہونا ہے مجھے نیست کسی دن بسملؔ　　لائی ہے کہاں کھینچ کے ہستی مجھ کو

(۲)

بدمست نہیں کس لئے مستی کے لئے　　کب خلق بلندی ہوئی پستی کے لیے
یہ راز کھلا موت سے ہم پر بسملؔ　　ہستی نہ مٹائے کوئی ہستی کے لیے

خسرو کے جذبات ہندوستانی زبان میں

ہمارے دوست سید مقبول حسین صاحب احمد پوری نے شاعر اعظم خسرو کی ایک غزل کا ٹھیٹھ ہندوستانی زبان میں ترجمہ کیا ہے۔ جو ناظرین زمانہ کی دلچسپی کے لئے درج ذیل ہے۔ امید کہ ہمارے ناظرین آپ اس جانکاہی کی داد دیں گے۔
ایڈیٹر

دلم در عاشقی آوارہ شد آوارہ تر بادا
پھرے بھٹکتے پریم کارن اور بھٹکتے پھریں تو اچھا

تنم از بیدلی بیچارہ شد بیچارہ تر بادا
جوجھ گیئو یہ تن من پریمی پران بھی جوجھ رہیں تو اچھا

بتاراج اسیراں زلف تو عیاری دارد
وا کے لمبے کیس چتر ہیں جیئہ پھانسن کی چترائی ماں

بخون ریز غریباں چشم تو عیارہ تر بادا
تو ہو تو بھی نین کے بھالے جی بھر لہو پیئیں تو اچھا

رخت تازہ است بہر مردن خود تازہ تر خواہم
چہرہ وا کو نگن منوہر، جی لیوا ، یہ جی بھی لیلے

دلت خارست بہر کشتن من خارہ تر بادا
ارے دا کو ترشول برابر اور بھی سینے چھیدیں تو اچھا

گر اے زاہد دعائے خیر می گوئی مرا ایں گو
سن تو بھگت جی مرے بھلے کی دعا جو مانگو تو یہہ کہیو

کہ آں آوارہ کوئے بتاں آوارہ تر بادا
پریم کھوج میں جو بے کل ہو، نین کہیں الجھیں تو اچھا۔

دلِ من پارہ گشت از غم نہ زاں گونہ کہ بہ گردد
ہوا ٹوک ٹوک دکھ سے کلیجہ، جڑن نہ چاہیں پریمی ٹکڑے
اگر جاناں بدیں شادست یارب پارہ تر بادا
وہ پریتم جو مگن ہو اس سے، اور بھی ٹکڑے اُڑیں تو اچھا
ہمہ گویند کز خونخوارِیش خلقے بجاں آمد
جان سے اپنی آئے تنگ انیاؤ سے سب اُس انیائی کے
من ایں گویم کہ بہرِ جانِ من خونخوارہ تر بادا
میں یہ کہوں وہ مجھ پاپی کے دل کا خون کریں تو اچھا
چو با تر دامنی خو کرد خسرو با دو چشمِ تر
دامن دھونا خسرو جی بھی سیکھ گئے دو نینن کے جل سے
بہ آبِ چشمِ مژگاں دامنت ہموارہ تر بادا
اِسی نین کے پوتر جل میں تن من ڈوب رہیں تو اچھا

غزل

(از جواد میرٹھی مرحوم)

تشنہ لب راہ میں بیٹھے ہیں جوانانِ وطن
آج تو کھل کے برس ابرِ بہارانِ وطن
ہائے تاراج کیا کس نے گلستانِ وطن
ہر نظر دیدۂ گریاں کی ہے قربانِ وطن
دور آنکلا ہوں کیا تجھ سے بیابانِ وطن
دل کو بے چین کئے دیتا ہے ارمانِ وطن
ہاں کسی دل سے مجھے آتشِ سوزاں لادو
ہائے خاموش نہ ہو۔ شمعِ فروزانِ وطن
جامِ صہبا کی عوض۔ کاسۂ درویشی ہے
ہائے اِس دور میں کیا باقی ہے سامانِ وطن
خود بخود اہلِ جنوں آئیں گے پھر پھر کے یہاں
وسعتیں اور بڑھالیں ابھی زندانِ وطن
ہاں ترے دامنِ زرتار کو اللہ رکھے
خون روتے ہیں مگر دیدۂ گریانِ وطن
گرمئ بزم ہے۔ بیٹھے ہیں جو حسّانِ وطن
تو کہاں بول اٹھا۔ حیف۔ پشیمانِ وطن

جامِ سرشار

از مسٹر علی عباس حسینی ایم - اے

پلاٹ اور اشخاص

فسانہ آزاد کے بعد رتن ناتھ سرشار کا یہ دوسرا ناول ہے جو شروع میں "اودھ" اخبار میں شایع ہوا اور بعد میں نظر ثانی کے بعد کتابی صورت میں طبع کیا گیا۔ اس ناول میں اس صحبت کا چربا اُتارا گیا ہے جس میں بدمعاش مصاحب رئیس زادوں کو بُری باتوں کی طرف مائل کرتے ہیں اور عیّاشی و شراب خواری میں لگا کے اُن کی دولت و عزت اور خاندانی وقار سب کچھ تباہ و برباد کرتے ہیں۔

نواب امین الدین حیدر ایک ناتجربہ کار رئیس زادے تھے اُن کے مصاحبوں نے اُن کے سامنے دو بہو دنوں کا ذکر کیا جن کا شمار معشوقان بازاری میں تھا۔ ایک نے کہا "بچۂ حور" ہیں دوسرے نے اُنھیں "اندر کے اکھاڑے کی پریاں" بتایا۔ تیسرے نے "پورنماشی کا چندرماں" کہا، چوتھے نے "آگ بھبوکا" کا خطاب دیا۔ بھولا بھالا رئیس زادہ اشتیاقِ دید سے بیچین ہو گیا گاڑی کسی گئی اور حُسنِ جہاں سوز کے نظارے ہونے لگے، پھر جب ایک بار ہیاؤ ٹوٹا اور دوسرے رئیس زادوں، امیرزادوں کو جن سے رات دن صحبت رہتی تھی، شراب پیتے دیکھا تو اُن کے مزاج میں بھی زمین آسمان کا فرق ہو گیا۔ شراب و کباب سے شغل ہونے لگا اور بالکل ہی آوارگی پر آمادہ ہو گئے، پہلے ایک دیہاتی عورت سے معاشقہ ہوا، پھر ظہورن، گھر کی ماما کی ایک چھوکری سے نکاح کیا، پھر مس للی ایک یوروپین سے پینگ بڑھائے۔ نتیجہ وہی ہوا جو انِ معاشیوں کا ہمیشہ ہوتا ہے۔ باپ سے چھوٹے، بیوی کو چھوڑا، لاکھوں کی دولت لٹائی، احباب چلتے نکلے اور خود ظہورن کو قتل کر کے خودکشی کر لی۔ انھیں کے ساتھی لالہ گوجرمل لاکھوں روپیوں کے آدمی شراب کی لت کی بدولت اور للی کے عشق میں زر و دولت کھو کے صحت و زندگی سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے۔

تیسرے صاحب نصرت الدولہ بالکل ہی کھُل کھیلے۔ شراب، عیّاشی اور جادو کا شوق ہوا۔

لاکھوں روپئے باتوں باتوں میں اُڑا اُڑا دیے، سارے دوست احباب نے وقت پڑنے پر دغا کی، یہاں تک کہ بیچارے مارے شرم کے روپوش ہوگئے۔ پلاٹ میں بڑا مدّ و جزر ہے اور ہر کڑی ایک دوسرے سے جڑی ہوئی ہے کوئی بات بے وجہ نہیں اور نہ کوئی جزو اس کا بے سبب لایا گیا ہے۔ جن لوگوں کو پونرٹر و نکے رئیسوں او رنوابوں کی صحبتیں دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے اُنہوں نے جو کچھ سرشار نے لکھا ہے اپنی آنکھوں دیکھا ہوگا۔ زوال سلطنت مُغلیہ کے بعد اِس قسم کے واقعات سیکڑوں گھروں کی بربادی کے باعث ہوئے ہیں۔ اب بھی اس قسم کے واقعات کبھی کبھی دیکھنے میں آتے رہتے ہیں۔ اس ناول کا پلاٹ بہت ہی دلچسپ اور حقیقت پر مبنی ہے۔ کردار کے لحاظ سے تین اہم آدمی ہیں۔ نواب امین الدین۔ حیدر نصرت الدولہ گوجرمل، عورتوں میں بیگم اور ظہورن۔ مصاحبین ایک سے ایک بڑھکر گُرگے ہیں۔ سب ایک ہی رنگ میں رنگے ہوئے۔ جھوٹے، دغاباز، مکار، عیار اور کورنمک!

نواب امین الدولہ حیدر کی سیرت میں وہ تمام کمزوریاں بدرجۂ اتم موجود ہیں جو اس طرح کے نوجوانوں میں ہوتی ہیں، جنھیں باپ دادا کی مُفت کی دولت مِل جاتی ہے۔ امین الدین بظاہر بہت ہی نیک، خلیق اور اچھے سیرت کے رئیس زادے معلوم ہوتے ہیں، مگر صحبت بد نے چند ہی دنوں میں ان کے عیوب اُبھار اُبھار کے پیش کرنا شروع کر دئے۔ سب سے پہلے خود اُن کی زبان سے ان کی سیرت کا حال اُس وقت معلوم ہوتا ہے جب اُن کے مصاحبین اُن سے بیہودہ کی تعریف کرکے بہ اصرار کہتے ہیں کہ وہ قتالۂ عالم تو کسی کو کوئی چیز ہی نہیں سمجھتی۔ نواب صاحب فرماتے ہیں۔ "توبہ کرکے اور کان پکڑ کے کہتا ہوں کہ ایک دفعہ ایں جانب کو بھی دیکھ لیں تو ہزار جان سے عاشق ہو جائیں"۔ جس سیرت میں خودبینی کی اس قدر کمزوری ہوگی وہ بہت ہی آسانی سے عیاشی اور فضول خرچی کے راستوں پر لگائی جاسکتی ہے۔ مصاحبوں نے جلدی اس کمزوری کو سمجھ لیا پھر اُنھیں مے نوش، رندمشرب اور اپنے مطلب کا بنا لینے میں آسانی سے کامیابی ہوگئی۔

دوسری کمزوری نواب صاحب کی سیرت کی اس وقت ظاہر ہوئی جب اُن کی گاڑی سے ایک کمہار کو چوٹ آئی اور وہ برتنوں سمیت زمین پر آرہا۔ "رئیس زادے کا رنگ فق اور چہرہ زرد ہو گیا، ہاتھ پانوں پھولے، یا د بتان طنّاز بھولے"۔ جب منڈیاؤں پہنچے تو فٹن بُو کی اور میاں جمّن اور تراب علی کونسلی کے ہاں بھیجے گئے۔ اس واقعہ سے یہ امر ظاہر ہے کہ نواب

حد درجہ ڈرپوک تھے، اور اُن میں انسانی ہمدردی کا بھی مادّہ نہ تھا۔ کمّہار کے گرنے کے بعد اُن کے دِل میں اس کی دوا اور علاج کا خیال نہ آیا بلکہ محض اس امر کا کہ وہ خود اپنی جان اس مخمصے سے بچالیں۔

نواب کی تیسری کمزوری اُس وقت ظاہر ہوئی جب اُنھوں نے پہلی دفعہ شراب پی۔ باوجودیکہ وہ شراب کو حرام جانتے تھے اور اُن کی تعلیم وتربیت بالکل اس کے خلاف تھی، مگر گھسیٹے کا مقدمہ کچہری میں پیش تھا اور قلب میں پنکھے لگے تھے، مصاحبوں نے چند چھینٹوں میں ان کو اپنے رنگ لگا لیا، مُصنّف کا بیان سُنئے

"مصاحب بدمعاشوں نے آپس میں سکوٹ کرلی تھی کہ جب گھسیٹے دفان ہو تو سب کے سب مِل کے نواب سے کہیں کہ حضور کا چہرہ بہت اُتر گیا ہے اُس وقت ایک کہے دوسرا تائید کرے، تیسرا کچھ بیان کرے۔ اِسی طرح وہ فقرے چُست ہوں کہ وہ خود بیمار بن بیٹھیں، تب امام الدین خاں چھیڑیں کہ حضور غم غلط کرنے کے لئے جام شراب کافی ہے، خوب ہی بھرّے دیں اور بادہ گلگلوں کی بڑھ بڑھ کے تعریفیں کریں، اگر اس رنگ میں آئے تو سُبحان اللہ، پھر کیا پوچھنا ہے روز لنڈھا کرے!"

نواب صاحب نے تھوڑے ہی پس وپیش کے بعد اس تجویز کو منظور کرلیا۔ اس سے ظاہر ہے کہ اُنکی سیرت میں استقلال نہ تھا۔ بہرحال شراب کو حرام سمجھنے کے باوجود محض دوسروں کے کہنے سُننے سے معمولی سا عذر کرکے اسے پینے لگے مصاحبوں نے خیر سے اس کا بھی یقین دلادیا کہ آپ پر نشہ کا اثر ہی نہیں ہوتا۔ چالیں تو دیکھئے۔

تراب علی۔ کیا حضور عرصہ سے اس کا شوق رکھتے ہیں!

نواب۔ اجی توبہ! آج ہی تو بسم اللہ ہوئی ہے۔

تراب علی۔ اعجاز ہے! حضور اعجاز ہے! واللہ جو بات چیت یا چال ڈھال سے ذرا بھی معلوم ہوتا ہو کہ شراب پی ہے۔

جمن۔ واللہ میں کہنے ہی کو تھا،

امام الدین۔ اجی یہ کم ظرفوں کا کام ہے کہ پی، اور بازار میں ٹو ندمچانے لگے، حضور عالی ظرف ہیں، بوتل کی بوتل پلا دیجئے ذرا تو معلوم نہ ہو، ہم ایسے کم ظرف نہیں ہیں جو بہکنے جائیں۔"

شراب نوشی کے بعد تو سیرت میں ایک خاصا انقلاب ہوجاتا ہے۔" ظہورن سے آنکھیں لڑائیں" بیگم سے جھوٹی قسمیں کھائیں، فرخندہ کو گھر میں ڈال لیا، ماں، باپ، بیوی، سب کو چھوڑا، نصرت الدولہ کے

باغ میں مہینوں بے غیرتوں کی طرح پڑے رہے، اور ہر وقت رنگ رلیوں میں مشغول رہے۔

اس سلسلے میں قابل مصنف نے گھر چھوڑنے کے وجوہ خوب ہی بیان کئے ہیں اور تمام اسباب کا بہت عمدہ تجزیہ کیا ہے ملاحظہ ہو۔

"سنا ہے کہ بڑے حضور نے کہا کہ اکیلا لڑکا ہے نہیں تو میں عاق کر دیتا" عاق کا لفظ سنتے ہی نواب صاحب آگ ہوگئے۔ بیگم صاحب کے کمرے میں بھی جانے نہیں پائے۔ اس سے اور غصہ آیا، اس پر طرہ یہ ہوا کہ نواب صاحب نے "نورن" لونڈی کے ہاتھ ایک رقعہ بھیجا جس میں دو سطریں لکھی تھیں "چھوٹے نواب میں اپنے مکان میں بدمستی اور سیہ کاری نہیں پسند کرتا، تم اب کہیں اور مکان لو" پڑھتے ہی جھلا اٹھے، کہا "ظہورن اپنی بیگم سے کہہ دینا کہ جیتے جی ہم آن کر اپنی صورت نہ دکھائیں گے" یہ کہکر چھوٹے نواب بڑے غصے میں باہر چلے گئے اور اسی دم نصرت الدولہ کے باغ میں جو شہر سے دو کوس کے فاصلے پر تھا جاکر فروکش ہوگئے۔ بس کیا تھا "دن عید رات شب برات، نہ بیوی کا خیال، نہ ماں باپ کی فکر، بی فرخندہ ہیں اور آپ، مصاحب، شراب خواری، اور سیہ کاری۔"

ان افعال کے بعد کسی نہ کسی نئے مقدمہ میں گرفتار ہونا ضروری تھا۔ جب مصیبت آئی، ماں، باپ، بیوی، سب یاد آئے، شراب پینے کا وعدہ بھی کیا، اور مصاحبین کے نکالنے کا عہد بھی۔ مگر مقدمہ سے بری ہونے کی خبر جو پائی تو اس خوشی میں اتنی پی پلائی کہ سب مدہوش ہوگئے اور ایک مصاحب کا سر توڑ ڈالا، چند ہی دنوں میں ظہورن نے پینگ بڑھائے اور بالآخر بیگم کو چھوڑ، اسے گھر میں ڈال لیا، اور اسی کے ہو رہے۔ اسی زمانے میں اُن کی سیرت کا سب سے بڑا پہلو بھی یوں نمایاں ہوا کہ جب اُن کے یار غار نصرت الدولہ کا دولت نے ساتھ چھوڑ دیا۔ اور وہ اُن کے پاس مدد کے لئے آئے تو انہوں نے اُن کے ممنون احسان ہونے کے باوجود اُن سے طوطا چشمی کی، ذرا اس وقت کی باتیں تو دیکھئے۔

"نصرت الدولہ بہادر نے کل حال کہہ سنایا اور کہا "اب قصد ہے کہ کسی طرف بھاگ جاؤں" نواب صاحب نے کہا "ہاں اب تو ایسا ہی موقع ہے بغیر اس کے نہ بنے گی۔ چپکے سے چل دیجئے۔ جورو نہ جاتا، اللہ میاں سے ناتا، کوئی رونے والا تو تم کو ہے نہیں!"

نصرت الدولہ۔ ارے یار تم لوگوں کو تو ہماری جدائی شاق گزرے گی۔

نواب۔ پھر مجبوری ہے۔"

بقول مصنف "یہی نواب صاحب ہیں جو نصرت الدولہ کی دوستی کا دم بھرتے تھے" اور اب اس قسم کی تقریر کرتے ہیں۔ نصرت الدولہ کا انکسار اور نواب صاحب کی بے رُخی تو ملاحظہ فرمائیے۔ وہ کہتے ہیں

"ہماری جُدائی تم کو شاق گزرے گی" یہ کہتے ہیں "پھر مجبوری ہے" وہ کہتے ہیں کہ اب کسی طرف بھاگ جائیں" یہ کہتے ہیں "کہ ہاں اِس کے بغیر چارہ ہی اب کیا ہے"

اس سیرت اور اس طرح کے افعال کے بعد نواب کا ظہورن کو مار کے خودکشی کر لینا ہم پر زیادہ گراں نہیں گزرتا، جو شخص اپنی محبّت کرنے والی بیوی کو چھوڑ دے، جو اسے ظہورن جیسی عورت کے ہاتھوں ذلیل کرنے کے لئے تیار ہو، جو ہر وقت شراب میں چُور رہتا ہو، اپنے دوست کو مصیبت کے وقت ذلیل سمجھے، جو دوسرے دوست کے بیمار ہوتے ہی اُس کی محبوبہ کو اپنے پہلو میں جگہ دے وہ اگر قتل عمد کا مجرم بن بیٹھے اور اس کے بعد خود اپنے ہاتھوں اپنی جان لے تو کسی کو کیا تعجب یا ہمدردی ہو سکتی ہے۔ ایسے شخص کا یہی انجام ہونا چاہیئے تھا!

نصرت الدّولہ

دوسرا کیریکٹر نصرت الدّولہ کا ہے۔ یہ بھی دولت وثروت کے نشہ میں مدہوش ہیں اور بوالہوسی و بادہ نوشی کے سوا انھیں کچھ اور سُوجھتا ہی نہ تھا، نواب امین الدین کی عادتوں کے خراب کرنے میں ان سے بڑی مدد ملی۔ یہ اُن سے سن میں کچھ بڑے تھے، انھیں چاہیئے تھا کہ اگر وہ انھیں بے راہ چلتے دیکھتے تو ٹوک دیتے مگر یہ تو اسی کو صواب سمجھتے تھے۔ ان میں اعتماد ویقین کا مادہ بھی بہت زیادہ تھا، آسلر ایک مداری آیا، اُس نے ہاتھ کی صفائی کے چند کرتب دکھاکے انھیں ایسا گرویدہ کر لیا کہ فوراً اس کے معتقد ہی نہیں بلکہ چیلے بن گئے، بھوت اپنی آنکھوں سے دیکھنے لگے، ایک دوسرے صاحب نے جو یہ حالت دیکھی فوراً کامروپ کا ذکر کرکے جادو کا بھی فدائی بنا لیا، اب کیا تھا محض جادو سیکھنے کے لئے دو صاحب کلکتہ اور وہاں سے کامروپ بھیجے گئے اور لاکھوں روپئے اُلّو بنا کے گھر میں بھر لئے جب اشتیاق بڑھا اور اُنھوں نے خود اس سفر کا ارادہ کیا تو تمام قرضداروں نے آگھیرا نتیجہ یہ ہوا کہ طرح طرح کی ذلتیں اُٹھاکے ہمیشہ کے لئے روپوش ہوگئے۔ اتنا ہم ضرور کہیں گے کہ یہ نواب امین الدّین سے کہیں زیادہ غیرت دار ثابت ہوئے۔ ان کا خاتمہ بھی فطرت کے عین مطابق ہوا لیکن ہمیں ان سے ہمدردی ہو جاتی ہے کیونکہ انھوں نے ابتدا سے انتہا تک نہ کسی سے دغا کی اور نہ کسی دوست سے بے مرّوتی برتی، نواب امین الدّین حیدر یا گوجرمل سیٹھ کی کسی محبوبہ یا معشوقہ سے اظہار عشق نہیں کیا، اور نہ دوستوں کی طوطا چشمی پر کسی کی بُرائی کی، جو کچھ کیا وہ اپنے آپکو اور نتیجہ میں دُنیا ترک کرکے روپوش ہوگئے۔

اسی سلسلے میں بشیر الدّین کا کیریکٹر قابل تقلید ہے، نصرت الدّولہ کا اُنھوں نے ایسے وقت میں

ساتھ دیا جب ساری دُنیا ان سے آنکھیں چرانے لگی تھی، وہ واقعی سچے دوست ثابت ہوئے اور اُنھوں نے دامے، درمے، قدمے، ہر طرح نصرت الدولہ کا ساتھ دیا۔ ہمیں افسوس ہے کہ مُصنّف نے انھیں کتاب کے آخری حصّے میں پیش کیا، اور نصرت الدولہ کے غائب ہوتے ہی انھیں ہماری آنکھوں سے اوجھل کر دیا۔

گوجرمل اِس افسانہ کے تیسرے فرد گوجرمل ہیں۔ چند جُملے اقتباس کئے جاتے ہیں:۔

"یہ بڑے مشہور ساہوکار...... بہت کم سن اور مشہور حسین تھے...... کیتھی جانتے تھے اور کچھ تھوڑی ناگری اور تھوڑی اُردو...... شین قاف بہت درست...... مزاج میں بوئے ریاست اس درجہ کہ ممکن کیا کسی سے دب نکلیں...... بڑا وصف ان میں یہ تھا کہ غربا اور محتاجوں کے ساتھ بڑی فیاضی سے پیش آتے تھے...... بڑے علم دوست رئیس تھے...... مگر شراب خواری اور کثرت عیاشی کے ہاتھوں بک گئے تھے۔"

پہلے ہی دن بیوروبنس انھیں بیس ہزار سے زائد کی چپت دے گئیں۔ پھر بھی جب بی شیریں پھنسیں تو سیٹھ جی جا کر چھڑا لائے مگر اس پر بھی وہ داغ دے گئیں اور لکھنؤ چھوڑ کانپور جا بسیں۔ صدمۂ مفارقت کے باوجود گوجرمل نے اپنے اشغال نہیں چھوڑے۔ جب تک امین الدین حیدر باغ میں رہے نصرت الدولہ کے ساتھ ہر روز بلا ناغہ ان سے ملنے جاتے تھے اور ہر دم شغل میگساری ہوتا تھا" اس باغ میں ساری خدائی کے افعال قبیحہ سرزد ہوتے تھے"!

ایک دن احباب کی دعوت کے سلسلے میں ایک تھیٹر والے کو بلایا اور اس کی ایکٹرس لیلا پر ہزار جان سے عاشق ہو گئے، دوسری دعوت میں اسے اپنے ساتھ لے کے لکھنؤ سے اِس طرح بھاگ گئے کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ جب بہت دنوں کے بعد واپس آئے تو حد درجے دُبلے ہو گئے تھے یہاں تک کہ آواز سے بھی ضعف پایا جاتا تھا۔ حالت یہ کہ بقول خود "چلتے ہوئے چکر آتے ہیں اور زینے پر چڑھتے ہوئے ہانپنے لگتا ہوں، قلب کے پاس میٹھا میٹھا درد ہوتا ہے، اور دست روز آتے ہیں، کوئی دن، رات میں آٹھ، دس اور غذا بہت کم ہو گئی ہے، اور جسم کی پھرتی بالکل جاتی رہی ہے۔" وجہ لیلیٰ نے بیان کی ہے:۔

"ان کا روز یہی نقشہ رہتا ہے، پی اور بیہوش ہو گئے، ڈاکٹروں نے منع کر دیا ہے کہ خبردار کثرت نہ ہونے پائے، ان کا دل و دماغ کمزور ہوتا جا رہا ہے...... روزانہ بلا ناغہ پیتے ہیں اور مدہوش ہو جاتے ہیں۔"

سیٹھ جی علیل ہو گئے مگر علالت کی حالت میں بھی انہوں نے میخواری نہ چھوڑی، بیماری کوئی دل لگی تو ہے نہیں، عارضہ روز بروز بڑھتا ہی گیا اور عارضہ کے ساتھ شراب خواری بھی، اب سیٹھ جی ہوا کھانے اور باہر آنے جانے کے قابل بھی نہیں رہے۔ اور ادھر نواب صاحب نے ان کی علالت کو غنیمت سمجھ کر مس للی سے پینگ بڑھانے شروع کئے۔

"لکھنؤ کے طبیب اور ڈاکٹر ہار گئے۔ کلکتے علاج کے لئے لے گئے، وہاں کے نامی نامی اور مسیحا نفس ڈاکٹروں نے جواب دیدیا کہ یہ مرض لا دوا ہے، شراب دماغ اور رگ و پے میں پیوست ہو گئی ہے اور کبد پتھر کا ٹکڑا ہو گیا ہے"

مصنف نے گوجرل کا حال یہیں پر ختم کر دیا ہے گویا ہماری تخیل کے ہاتھ میں اور برے نتائج اور ان کی سخت موت چھوڑ دی ہے۔ شراب کی مذمت کی یہ تینوں سیرتیں بہترین مثالیں ہیں۔

عورتوں میں صرف دو سیرتیں، بیگم صاحب اور ظہورن کی ایسی ہیں جن کے پائیدار نقوش ہمارے دلوں پر رہ جاتے ہیں۔

بیگم کی سیرت ایک شریف گھر کی بیٹھنے والی مطیع، وفادار اور باعصمت بیوی کی ہے پہلی مرتبہ اس قصے میں ان کا تعارف اس وقت ہوتا ہے جب نواب شراب خواری وعیاشی دونوں صفات سے متصف ہو چکے تھے۔ بیوی میاں سے خفا منہ لپیٹے پڑی تھیں۔ میاں نے منایا، گدگدایا اور آخر ہنسا بلا ہی لیا۔ سچ لکھا ہے مصنف نے:-

"میاں بیوی کی لڑائی جیسے ساون بھادوں کی جھڑی، ایک چھینٹا پڑا اور کھل گیا ابر محبت سے غبار کلفت دھل گیا، الغرض شکر رنجی، ع۔ "اگر ماند شبے ماند شبے دیگر نمی ماند" اور اس روٹھنے، منانے، بگڑنے، گدگدانے میں بھی لطف ہے۔ یہ خیالات نواب والا تبار کے دل میں آئے تو خوب ہی مسکرائے ؎

بگاڑ بھی نہیں ان کا بناؤ سے خالی ✤ نہ جاؤ عاشق و معشوق کی لڑائی پر

غرض دو چار ہی باتوں میں عصمت مآب بیگم کو خوش کر لیا، اور بات آئی گئی ہوئی۔"

دوسری بار جو بیگم کو طیش آتا ہے تو وہ ملازموں کی دنگا مشتی پر۔ اُن کو غصہ اس کا ہے کہ میرے نواب کی بدنامی ہوتی ہے۔ دیکھئے نواب سے کہتی ہیں:-

"ہائیں غضب خدا کا دنگا سا دنگا مچا تھا اور طرہ یہ کہ آپ بیٹھے ہیں۔ وہ رئیس کیا کہ جس کے سامنے دنگا ہو، مصاحب کشتیاں لڑیں اور رئیس بیٹھا منہ تاکا کرے"

اس شب کا سین بھی یادگار رہے، جب نواب حد سے زیادہ پی گئے تھے اور چھوٹی بیگم پر یہ راز

پہلی دفعہ کھلا کہ یہ شرابی بن بیٹھے، اطاعت شعار بیگم نے سوائے اس کے کہ ہلکی سی ملامت کی، نہ زیادہ اظہار رنج کیا اور نہ وہ بگڑیں، نہیں، بس اتنے سے زیادہ زبان نہ کھل سکی کہ۔

بیگم۔ "یہ شوق تمہیں کب سے ہوا؟ کوئی اتنی پی جاتا ہے بھلا! یہ موئے خوشامد خوروں نے اس ڈھرے لگایا ہوگا۔"

شروع سے آخر تک اسی فکر میں ہیں کہ بات پھوٹنے نہ پائے اور بڑے حضور نہ سن لیں، بلکہ نواب کھل کھیلے اور انہوں نے فرخندہ کو اپنی کوٹھی میں بلالیا اور چھوٹی بیگم نے ان کی ساری حرکتیں اپنی آنکھوں دیکھیں تو بیگم نے جو پروگرام ظہورن سے مل کے بنایا تھا وہ صرف اتنا تھا:۔

بیگم۔ .... آئیں گے نہ! پہلے تو میں بولوں ہی گی نہیں، میری آنکھوں میں خون اتر آئے گا اور جو چھیڑیں گے تو پوچھونگی کہ کیوں صاحب یہی منصفی کے معنی ہیں کہ ہم آپ پر جان دیں اور آپ ہمارے سامنے ایک چڑیل کو لے کر بیٹھیں۔ خیر!"

اب یہ مقدرات کا کھیل کہ نواب سے اور بیگم سے اس کے بعد ملاقات ہی نہیں ہوئی اور وہ نصرت الدولہ کے باغ اُٹھ گئے۔ وہاں جب گھوڑے والے معاملے میں پھنسے تو ظہورن کی زبانی ہی سُنئے وہ کہتی ہے:۔

"تیسوں کلام کی قسم کھا کے کہتی ہوں، دیکھئے ان کا پیٹھ پیچھا ہے کہ روز رویا کرتی ہیں بیچاری، تین دن سے بڑی حضور، چھوٹی حضور نے کھانا کھایا ہو تو قسم لے لیجئے۔ ہزار خرابی سے بیٹھیں تو دو نوالے زبردستی کھائے اور ہاتھ کھینچ لیا۔"

جب یہ ظہورن سے لطف لیتے گھر واپس آئے اور چھ ماہ سے زاید کے بعد چھوٹی بیگم کے پاس گئے "تو کئی منٹ تک یہ مارے جھیپ کے اور وہ مارے خوشی اور حیا کے خاموش رہیں؟ اور نہ کوئی شکایت کی اور نہ کوئی ملامت، اور جب انہوں نے باہر آتے ہی مقدمہ جیتنے کی خوشی میں خوب شراب لنڈھائی اور حاتم علی کا سر پھوڑ ڈالا تو وہ عصمت مآب پردہ کرا کے خود باہر چلی آئی اور اس طرح ہمدردی و خلوص سے انہوں نے تیمارداری اور رازداری کی کہ نواب جب ہوش میں آئے تو انہوں نے ترکِ شراب نوشی کی قسم کھائی۔

دوسرے ہی دن نواب صاحب کی بیجا چھیڑ چھاڑ میں ظہورن، بیگم سے بدتہذیبی کر بیٹھی اور بیگم صاحب نے جھلا کے حکم دیدیا کہ "اس کو کھڑے کھڑے نکال دو" جب تک یہ یہاں سے نہ نکلے گی ہمیں پانی تک پینا حرام ہے" "یہ تو ہوا مگر جس دن سے ظہورن نکالی گئی" اس روز سے نواب صاحب نے محل سرا میں قدم نہیں رکھا۔ اس سے بیگم صاحب بھی پریشان ہوئیں، ایک نواب صاحب نے آنا جانا ترک کر دیا، دوسرے ظہورن جو ان کی ایک قسم کی گوئیاں تھی وہ بھی دفعۃً چلی گئی مگر یہ بھی ٹن کی رئیس زادی تھیں، انہوں نے بھی نواب کے بلانے یا پیغام بھیجنے میں اپنی طرف سے پہل نہیں کی یہ بیگم کی طرف سے پہلی زیادتی تھی اور اسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب ظہورن ملی اور اس نے ان کے

اصرار پر یہ کہا کہ "تمھاری بیگم ہمیں کوس کوس کے کھا جائیں گی" تو نواب بولے "اس کی ایسی تیسی تمھاری لونڈی بنا کے رکھوں تو سہی !"

ظہورن کے حورِ لقا محل ہونے کے بعد نواب کو اپنے اشغال سے اتنی فرصت نہ ملی اور نہ ظہورن نے اس کا موقع ہی دیا کہ وہ چھوٹی بیگم سی عفیفہ شریف زادی کی طرف توجہ کر سکتے، مصنف نے اسی لئے ان کا حال پھر آگے نہ لکھا۔ غالباً وہ وہی بیٹھی کیا کیں جو عام طور سے اس طرح کی عصمت مآب بیویاں کرتی ہیں، یعنی کارِ خیر اور یادِ خدا، اور کبھی کبھی آہ سرد بھر کے اپنے خاوند کے لئے دعائے سلامتیِ جان و مال !

حق یہ ہے کہ بیگم اگر اتنی خاموش سیرت کی نہ ہوتیں تو شاید ایسے شوہر سے اتنے دنوں بھی نہ نبھتی !

ظہورن

بیگم کی معلانی کی چھوکری بڑی شوخ و شنگ تھی، جوان ہوتے ہی وہ نواب پر ڈورے ڈالنے لگی تھی، ڈیوڑھی میں وہ خود اسی انتظار میں کھڑی رہتی تھی کہ نواب خواہ مخواہ گوشۂ تنہائی میں اسے چھیڑیں، اس کا کوئی انداز لگاوٹ سے خالی نہ ہوتا تھا، وہ بظاہر تو بیگم کی طرفدار اور اطاعت گذار خادمہ تھی، مگر بہت پہلے سے ان کی سوکن بننے کی فکر میں تھی، اسی لئے وہ نواب کو گالوں پر ہاتھ پھیرنے اور منہ چوم لینے دیتی تھی۔ مقدمہ کا حال سن کے جب نصرت الدولہ کی کوٹھی پردہ گئی ہے تو وہ اسی لئے کہ اس طرح کی تنہائی میں نواب کو اپنے جال میں پھانس لے اور جب اس میں کامیاب ہو گئی تو ایک ذرا سی بات پر بیگم کا منہ بہ منہ جواب دینے لگی اور جھٹ استعفیٰ دیکر بیٹھ رہی اور جب اسے یقین ہو گیا کہ وہ مرغ بسمل کی طرح تڑپ رہے ہیں تو ایک دلال کے ذریعہ ان کے پاس چلی آئی اور ان کے نکاح میں آکر نواب حور لقا محل بن بیٹھی۔ پھر کیا تھا "دماغ عرش بریں پر تھا" پنجوں کے بل چلتی تھیں، زمین پر قدم ہی نہیں دھرتی تھیں اور نواب صاحب کی یہ کیفیت کہ کل جمع جتھا ان کے حوالہ کر دی، یہی سیاہ سفید کی مالک تھیں ! پھر بھی نواب سے ہمیشہ کھٹکتی رہتی تھیں کہ ایسا نہ ہو جس طرح بیگم نظر بند ہوئیں اسی طرح اب کسی نوخیز چھوکری پر میاں ریجھیں، اور ہم بھی لگا دئے جائیں، اور ہماری طرح کا محل میں داخل ہو" بس دونوں سیرتوں کا فرق اسی سے سمجھ لو کہ جب نواب مس للی پر عاشق ہوئے اور ظہورن کو معلوم ہو گیا تو اس نے بگڑ کے کہا :-

......ہم کچھ تم پر گرے پڑے نہیں ہیں، ہماری اٹھتی جوانی کو اللہ سلامت رکھے ہم سے ستر جا دی خوشامد

کریں گے، تم ہم کو چھوڑ دو گے تو ہم بھی تم ایسے تین سو ساٹھ کو چھوڑ دیں گے، یہ ڈر ہوگا گھر کی جورو ادکو، یہ ہم سے نہیں سہا جائے گا کہ ہماری چھاتی پر کوئی کودوں دلے اور ہم ٹک ٹک دیدم دم نہ کشیدم' میں کسی امیر رئیس کی لڑکی تو ہوں نہیں، مجھے ڈرکا ہے کا پڑا ہے، ورزن ہی کی لڑکی ہوں نا"

یہ باتیں زبانی ہی نہ تھیں بلکہ انپر عمل بھی کیا گیا یعنی اُسی دن چوک میں جا کو ٹھا لے بیٹھ رہی، نواب نے بھی سیر کے سلسلے میں دیکھ لیا اور رات کے وقت جا کے ایک ہی ہاتھ میں ڈھیر کر دیا۔ خس کم جہاں پاک! جیسی بے وفائی سے ابتدا کی ویسی ہی بے حیائی پر انتہا، نہ بیگم سے خلوص اور نہ نواب سے! بندۂ زر تھی، ایسی عورت کے ہاں شرافت و عفّت کہاں؟

ساری کتاب بہترین مکالموں سے بھری پڑی ہے، سرشار اس کا بادشاہ ہے، دیہاتی، انگریزی، لکھنوی، ٹکسالی، بیگماتی محاورے اور مخصوص طرز گفتگو، ماما دایئوں کی ہنسی ٹھٹھول، سافنوں کی گالی گلوج، سحر پر مولوی صاحب کا لکچر، سب کے سب اپنے اپنے محل سے بیش قیمت نگینوں کی طرح جڑے ہوئے ہیں، نظارہ و سماں بندی کا لطف دیکھنا ہو تو نواب کی پہلی دفعہ شراب نوشی دیکھئے اور پھر جنتر منتر، سحر سامری کا بیان پڑھئے، ایسا معلوم ہوتا ہے واقعی بھوت آ رہے ہیں، ارواح بلائی جا رہی ہیں۔ جن مقامات کا ذکر کیا گیا ہے اور جہاں طرز معاشرت کا خاکہ کھینچا گیا ہے، وہ ہو بہو وہیں کا ہے، پورا پلاٹ حقیقت پر مبنی ہے۔ اس طرح کے آئے دن واقعات ہوتے رہتے ہیں اور پورے حصّے کا کوئی جزو ایسا نہیں ہے جس میں شک کیا جائے یا جو کہیں سے غیر فطری معلوم ہو۔

یہ ناول ہر طرح اُردو ادب کے صفِ اوّل میں جگہ پانے کا مستحق ہے۔ سرشار نے مولوی صاحب کا وعظ جو سحر کے متعلق قلمبند کیا ہے۔ اس میں عربی کے فقرے، اصلاحات، حدیثیں، قرآنی آیتیں، سب کچھ موجود ہے۔ اس سے ثابت ہے کہ وہ عربی سے بھی بخوبی واقف تھے اور اسلامی جزئیات اور مذہب کے خاص نکات پر انھیں پورا عبور تھا۔

اسی سلسلے میں لالہ اور تراب علی سے جو باتیں ہوئی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ سرشار عربی کے علاوہ کچھ ترکی، فرانسیسی اور سنسکرت بھی جانتے تھے، لالہ جگت سنگھ نے جو روغن قاز ملنے کے لئے منتر سنائے ہیں وہ بہت پُر لطف ہیں، ان منتروں کے پڑھنے کے بعد سرشار کی سحر نگاری میں کس کو شک ہو سکتا ہے

بچپن سے خطاب

از مسٹر فیاض الدین احمد صاحب فیاض بی۔اے

چُن لو چُن لو گلاب کی کلیاں
کیونکہ وقت عزیز ہے پرّاں
کل یہی گُل جو آج ہے خنداں
شاخ پر ہوگا نزع میں غلطاں
چُن لو چُن لو گلاب کی کلیاں!

آسمانی چراغ مہر منیر
جتنی تیزی سے ہے عروج پذیر
اتنی تیزی سے خاتمہ ہے قریب
وقت یعنی غروب کا ہے قریب
چن لو چن لو گلاب کی کلیاں!

سب میں اچھا ہے سب سے پہلا ہوش
کمسنی کی بہار خون کا جوش
بدتر و بدترین عہد رہیں پھر
عمر ہو جائے گی یونہی آخر
چُن لو چُن لو گلاب کی کلیاں!

دو گھڑی عیش میں گذر کر لو
عمر ہنس بول کر بسر کر لو
کیونکہ اک بار اگر گئی یہ عمر
عمر بھر پھر نہ آئے گی یہ عمر
چُن لو چُن لو گلاب کی کلیاں!

لہ ترجمہ از رابرٹ

رباعیات

(دورِ معصوم)

تصویر تصور صنم خفتہ ہے
تخئیل کا گوہر دُرِ ناسفتہ ہے
سُرخی ہے رخوں پر نہ جبینوں پہ شکن
اُلفت کی حکایت ابھی ناگفتہ ہے

(ہمدردی)

فطرت سے کہاں تک ہے جدا تیرا دل
کر غور کہ پتھر نہیں کیا تیرا دل
رونے پہ یتیموں کے نہ رویا نہ سہی
بچوں کی ہنسی پہ بھی ہنسا تیرا دل؟

تنقیدِ کُتب

میری کہانی[1]

یہ اس شخص کی خود نوشت سوانح عمری ہے۔ جو اس وقت عام ہندوستانیوں کے دلوں پر حکمراں ہے اور جو اَب تک ہندوستان کی سب سے بڑی سیاسی جماعت انڈین نیشنل کانگرس کا تین مرتبہ پریسیڈنٹ منتخب ہو چکا ہے۔ اور یہ بے نظیر اعزاز آج تک کسی دوسرے ہندوستانی کو نصیب نہیں ہوا ہے۔ کتاب زیر ریویو اسی شخص کی آپ بیتی ہے۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے شاہزادوں کی طرح پرورش اور تعلیم پائی ہے۔ مگر اپنی حُبّ الوطنی اور اخلاقی جرأت کی وجہ سے کئی مرتبہ قید کی مصیبت جھیل چکے ہیں۔ پنڈت نہرو صاحب نے یہ سوانحی حالات جون ۱۹۳۴ء سے فروری ۱۹۳۵ء تک انگریزی زبان میں لکھے تھے جب وہ جیلخانہ میں قید و بند کی سختیاں کاٹ رہے تھے۔ اسکی وجہ تصنیف خود پنڈت جی نے دیباچے میں یہ لکھی ہے :-

"اس کے لکھنے میں دو چیزیں میرے سامنے تھیں۔ ایک تو یہ کہ اپنے لئے کوئی خاص کام ٹھہراؤں اور اسی میں لگا رہوں، کیونکہ اس کے بغیر جیل میں تنہائی کے پہاڑ سے دن کاٹے نہیں کٹتے۔ دوسرے یہ کہ ان واقعات کا جائزہ لے ڈالوں جو ہندوستان میں پچھلے زمانہ میں پیش آئے اور جن سے مجھے بھی تعلق رہا، تاکہ انہیں صاف اور سلجھی ہوئی نظر سے دیکھ سکوں۔"

بقول پنڈت جی :-

"یہ کتاب ایسے زمانہ میں لکھی گئی جو میری زندگی میں بڑی مصیبت کا وقت تھا۔ اس کا اثر کتاب میں صاف نظر آتا ہے۔ اگر میں معمولی حالت میں لکھتا تو تحریر کا رنگ کچھ اور ہوتا۔"

اس کتاب میں کیا ہے۔ اس کا جواب بھی خود پنڈت جی کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیے۔ لکھتے ہیں :-

"میں نے صرف یہ کوشش کی ہے کہ جہاں تک ہو سکے اپنے ذہن کی نشو و نما دکھاؤں۔ ہندوستان کی پچھلے زمانہ کی تاریخ لکھنا مقصود نہیں۔ دیکھنے میں یہ کتاب تاریخ ہی معلوم ہوتی ہے۔ لیکن یہ تاریخ نہیں، آپ بیتی ہے۔"

---

[1] پنڈت جواہر لال کی خود نوشت سوانح عمری کا ترجمہ شائع کردہ جامعہ ملیہ دہلی۔ قیمت چار روپیہ للعہ

"میں نے اپنے بعض رفیقوں کے متعلق آزادی سے اظہار رائے کیا ہے۔ جماعتوں اور شخصوں پر نکتہ چینی بھی کی ہے۔ اور اس میں بعض جگہ سختی سے کام لیا ہے۔ مگر میں نے اپنے نزدیک کوئی بات ایسی نہیں لکھی جس میں کسی شخص سے بیر یا جلن کی جھلک پائی جاتی ہو۔"

"میں نے جان بوجھ کر ہندوستان کے آج کل کے معاملات کو نہیں چھیڑا۔ ہاں کہیں کہیں اور باتوں کے سلسلہ میں سرسری طور پر ان کا ذکر آگیا ہے۔ جیل میں اس کا موقع نہ تھا کہ ان معاملات کی چھان بین کر کے ان سے پوری طرح بحث کر سکوں۔ غرض یہ آپ بیتی پچھلے زمانہ کے واقعات کا ایک شخصی سرسری اور ادھورا بیان ہے جو موجودہ زمانے کے لگ بھگ آ پہونچا ہے، مگر اسے چھونے سے احتیاط سے دامن بچائے ہوئے ہے۔"

اس کتاب کی سب سے بڑی خوبی اسکا اسلوب بیان اور صاف گوئی ہے بات یہ ہے کہ پنڈت جواہر لال صاحب کو تکلف و تصنع سے نفرت ہے اور نہ وہ دلخوش کن باتیں بنانا جانتے ہیں۔ وہ عملی آدمی ہیں۔ ان کی ذہنیت انقلابی واقع ہوئی ہے۔ انہوں نے بڑی ذکی الحس طبیعت پائی ہے۔ چنانچہ انھیں غم دنیا اور فکر وطن دونوں نے بیحد ستا رکھا ہے۔ انہوں نے اپنی حب الوطنی کی خاطر کڑی کڑی مصیبتیں جھیلی ہیں۔ اور جب وہ قید و بند سے آزاد ہوتے ہیں اسوقت بھی وہ چین سے بیٹھ نہیں سکتے۔ وہ بھارت ماتا کی شوکت و عظمت کے راگ نہیں الاپتے اور نہ بعض لوگوں کی طرح اسلاف کی استخواں فروشیاں کرتے ہیں ان کے سامنے ماضی نہیں بلکہ حال رہتا ہے۔ ان کو اپنے ہموطنوں کی بیکاری و تنگدستی کا خیال ہر وقت پریشان کئے رہتا ہے۔ اٹل سیاسی اعتقادات اور زبردست قوت عمل کے ساتھ ان میں بلا کی سرگرمی اور غضب کا جوش عمل ہے۔ چنانچہ الکشن کے زمانے میں انہوں نے اپنے قوت تنظیم اور قوت عمل دونوں کا غیر معمولی ثبوت دیا۔

دوسرے لیڈروں کی طرح وہ مذہب سے لاپرواہ رہے ہیں۔ اور تیاگ و نفس نفسی کی تلقین نہیں کرتے۔ درحقیقت وہ صبر و قناعت کی عادت کو ملکی ترقی کے حق میں مضر سمجھتے ہیں یوں بھی وہ مذہب کو سیاسیات سے بالکل علیحدہ رکھنا چاہتے ہیں۔ ان کے نزدیک ان دونوں کا حلقہ اثر جدا گانہ ہے۔ وہ یہ کبھی نہیں دیکھتے کہ اگلے زمانہ میں دنیا کیا تھی۔ بلکہ یہ دیکھتے ہیں کہ اس وقت دنیا کی کیا حالت ہے۔ یا دنیا کے آئندہ رجحانات کیا ہیں۔ وہ یہ چاہتے ہیں کہ دنیا میں سب لوگ آرام و آسایش سے زندگی بسر کریں اور دونوں نعمتوں سے ہر فرد بشر بہرہ اندوز ہو ترک دنیا یا تیاگ کے لئے ان کے مشرب میں کوئی جگہ نہیں ہے چنانچہ وہ لکھتے ہیں:-

"ذاتی طور پر میں افلاس و مصیبت کی تعریف کرنا مذموم سمجھتا ہوں۔ اسی طرح میں راہبانہ زندگی کو بھی اجتماعی مقصد کے لحاظ سے پسند نہیں کرتا سادگی، مساوات اور ضبط نفس کا میں قایل ہوں، مگر نفس کشی کا قایل نہیں ہوں"

پنڈت جی کا خیال موجودہ تہذیب و تمدن کے بارہ میں یہ ہے؟

"اس میں شک نہیں کہ موجودہ تہذیب میں بہت سی برائیاں ہیں۔ لیکن اس میں خوبیاں بھی بہت سی ہیں۔ اور وہ اپنی خرابیوں کو دور کرنے کی صلاحیت بھی رکھتی ہے"

آجکل کے روحانی لیڈر مشینوں کے موجودہ دور سے بہت بیزار ہیں۔ کیونکہ اس نے قدیم دستکاریاں فنا کر دی ہیں۔ اسی وجہ سے مہاتما گاندھی لوگوں کو چرخہ چلانے اور کھدر پہننے کی تلقین کرتے ہیں۔ لیکن پنڈت جواہرلال اس دور صنعت وحرفت کی ترقیوں پر بھی نظر رکھتے ہیں۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ:۔

"صنعتی دور اپنے ساتھ بہت سی برائیاں لایا ہے جن پر فوراً ہماری نظر پڑتی ہے لیکن ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ اس نے مادی خوش حالی کی ایک ایسی بنیاد قایم کر دی ہے جس سے لوگوں کی بہت بڑی تعداد کے لئے تمدنی و روحانی ترقی آسان ہو گئی ہندوستان اور دوسرے محکوم ملکوں میں ہمیں اس خوش حالی کے آثار نظر نہیں آتے تو اس میں صنعت وحرفت کے نظام کا کوئی قصور نہیں ہے بلکہ بدیسی حکومت ہے"

سیاسی عقاید کے اعتبار سے پنڈت جواہرلال نہرو کٹر سوشلسٹ ہیں اور ان کے ہندوستان کی موجودہ مصیبتوں کا علاج سوشلزم کے سوائے اور کچھ نہیں ہے۔ وہ دیہی صنعتوں کی ترقی کو پسند کرتے ہیں لیکن ملک کی ترقی کے لئے ان کو کافی نہیں سمجھتے ہیں۔ اسی لئے وہ کہتے ہیں۔ کہ:۔

"ممکن ہے کہ ہندوستان جیسے زراعتی ملک میں جہاں ہمارا موجودہ معیار زندگی بیحد پست ہے۔ دیہی صنعتوں کی ترقی سے عام لوگوں کی حالت کسی قدر بہتر ہو جائے، لیکن اوروں کی طرح ہم بھی دنیا کے دوسرے ملکوں سے وابستہ ہیں، جن سے قطع تعلق کرنا میرے خیال میں ناممکن ہے۔ اس لئے اس کے سوائے اس مسئلہ کا حل اور کوئی نہیں۔ یعنی ایک اشتراکی نظام کا قیام۔ پہلے قومی دائرہ کے اندر اور پھر ساری دنیا میں جس میں دولت کی پیدائش اور تقسیم، ریاست کی نگرانی میں مفاد عامہ کے لحاظ سے کی جائے۔ ان تمام فوائد کے باوجود جو اس وقت ہندوستان کو کھدر کی تحریک سے حاصل ہیں، میرے خیال میں یہ تحریک ایک عارضی چیز ہے۔ آئندہ ہماری اصل کوشش یہ ہوگی کہ زراعتی نظام کی از سر نو تنظیم کی جائے۔ اور صنعت کو ترقی دی جائے۔ بعض علاقوں کو کھدر

کی تحریک سے تھوڑی بہت مدد ملی ہے۔ لیکن اسی کامیابی میں خطرہ کا عنصر بھی موجود ہے۔ یعنی یہ تحریک ایک زوال پذیر نظام آراضی کو سہارا دے رہی ہے۔ اور اسی حد تک ایک بہتر نظام کے قیام میں تاخیر پیدا کر رہی ہے"۔

اس طرح بہت سے موجودہ مسائل ملکی پر پنڈت جواہر لال صاحب نے اس کتاب میں آزادانہ اظہار خیالات کیا ہے۔ اصل کتاب انگریزی زبان میں ہے اور کیا بہ لحاظ زبان اور کیا بہ اعتبار اسلوب بیان ایک ادبی شاہکار ہے۔ جامعہ ملیہ نے اردو میں اس کا ترجمہ شائع کر کے اردو داں جماعت پر ایک احسان کیا ہے۔ ترجمہ کی زبان بہت سلیس ہے۔ ہم اس کو اردو ادب میں ایک گرانبہا اضافہ سمجھتے ہیں لکھائی چھپائی اور کاغذ سبھی نفیس ہے۔ دونوں حصّے کا حجم تقریباً ایک ہزار صفحات سے زائد ہے۔ اس میں خاندان نہرو اور ہندو مسلم مشاہیر ہند کی پندرہ تصویریں بھی ہیں۔ دونوں حصّے مجلد ہیں۔

نورس[1]

مسٹر حامد اللہ افسر بی۔ اے میرٹھی کے سولہ گرانقدر اور سبق آموز ادبی، علمی، تنقیدی، اور تاریخی مضامین کا مختصر مجموعہ ہے جو پاکیزہ لٹریری زبان اور دلنشین اسلوب بیان میں لکھے گئے ہیں۔ ان میں سے بعض زمانہ میں اور دیگر ادبی رسالوں میں شائع ہو چکے ہیں۔ بہرحال "مشاعروں کی اصلاح"، "بعض اردو الفاظ کا املا"، "اردوئے جدید" وغیرہ خصوصیت کے ساتھ پڑھنے کے قابل ہیں۔ مشاعروں کی اصلاح والے مضمون میں فاضل ادیب نے صلاح دی ہے کہ :-

"مشاعروں میں غیر مردّف طرحیں دی جائیں۔ ردیف کی پابندی نہ رہنے سے یہ فائدہ ہوگا کہ شاعر کی جسقدر توجہ ردیف کی طرف رہتی ہے، وہ مضمون کی طرف منتقل ہو جائیگی۔ طرح اگر مشکل ہو تو شاعر کا سارا زور الفاظ کی بامعنی ترتیب پر صرف ہو جاتا ہے۔ طرح کے آسان ہونے کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ شعرا تخیل کی تازگی اور شگفتگی کی طرف رجوع ہو جائیں گے ورنہ مشاعرہ میں کامیابی حاصل نہ کر سکیں گے۔ دوسری صورت اصلاح کی یہ ہے کہ طرح کے ساتھ ہی کوئی مخصوص موضوع مقرر کر دیا جائے۔ تاکہ شعرا اسی زمین میں اپنی غزل کے ساتھ اسی موضوع پر قطعہ بند اشعار کہیں۔ دو چار چھ جتنے اشعار میں وہ خیال خوبصورتی کے ساتھ نظم ہو جائے نظم کریں۔ ایک اور طریقہ اصلاح کا یہ ہے کہ تمام اصناف سخن میں مشاعرے کئے جائیں۔ مثلاً ایک مشاعرہ میں

[1] مصنفہ مسٹر حامد اللہ افسر میرٹھی بی۔ اے۔ ملنے کا پتہ بھارگو اسکول بکڈپو امین آباد۔ لکھنؤ۔

رباعیاں پڑھی جائیں، ایک میں مسدس، ایک میں قطعات ایک میں مختصر مثنویاں۔اس سے ایک قسم کا تنوع بھی پیدا ہوجائے گا جو بہر طور مفید ہے"

ہمیں بھی افسر صاحب کی تجاویز سے اتفاق ہے۔ واقعی مشاعروں میں ہزلیات کی اجازت نہ ہونا چاہیئے۔

افسر صاحب کا یہ ریمارک بھی قابل توجہ ہے کہ:-

"جدید الفاظ اور محاوروں کا اضافہ ہر زبان ہوتا رہتا ہے، اور اس کے بغیر کوئی زبان ترقی نہیں کرسکتی۔ لیکن زبردستی غیر مانوس الفاظ کی بھرمار اور نئی نئی ترکیبیں گھڑنا زبان کو خراب کرنا ہے"

زبان کی طرف سے بے توجہی کا رونا افسر صاحب اس طرح روتے ہیں:-

"ہم میں سے کتنے ہیں جو باوجود معقول آمدنی ہونے کے سال بھر میں صرف پانچ روپیہ کی کتابیں بھی خرید لیتے ہوں؟ کتنے ہیں جو ایک آدھ اردو رسالہ خریدنا ضروری سمجھتے ہوں، خریدنا تو الگ رہا آپکو اکثر اچھے خاصے پڑھے لکھے حضرات ایسے مل جائیں گے جو مشہور اردو رسالوں کے نام تک نہیں جانتے، یہی وجہ ہے کہ بہتر سے بہتر کتاب کی سال بھر میں پانچ سو جلدیں بھی فروخت ہوجاتی ہیں تو بڑی کامیابی سمجھی جاتی ہے"

اس مجموعہ کے بعض مضامین اس قابل ہیں جنھیں یا جن کے اقتباسات درسی کتابوں میں رکھے جانا چاہیئے۔ یہ کتاب اسکولوں اور کالجوں کے طلباء کے لئے بہت مفید ثابت ہوگی۔ لکھائی چھپائی قابل پسند ہے۔ حجم ۱۷۲ صفحات

حمید کے سو شعر[1]

جیبی سائز کی اس مختصر سی کتاب میں خواجہ حمید الدین صاحب حمید لکھنوی کے سو شعر درج ہیں جنھیں مرزا ثاقب قزلباش لکھنوی نے منتخب کیا ہے۔ شروع میں دو صفحہ کی "عرض حال" ہے۔ ان سو شعروں میں بہت سے ایسے ہیں جو بہ لحاظ زبان قابل داد ہیں۔ اور بہت سے ایسے بھی ہیں جن میں شاعر کی پرواز تخئیل گل و بلبل، شمع و پروانہ، بستر غم اور مرنے جینے سے آگے نہیں بڑھی۔ اور بہت سے ایسے ہیں جن میں پرانے خیالات کو نئے الفاظ میں باندھا ہے۔ شروع میں مصنف صاحب کا فوٹو بھی ہے۔ لکھائی چھپائی کاغذ سب اچھا ہے۔

---

[1] قیمت چار آنہ۔ ملنے کا پتہ:- مینجر صاحب نامی پریس لکھنؤ۔

راہِ طریقت

از پروفیسر سنت پرشاد مدہوش ایم۔ اے

پیر و مُرشد سے کہا میں نے خبر گیری کر | ہے شبِ قدر مرے پیر ذرا پیری کر

پیر و مرشد نے یہ فرمایا کہ اے بندۂ عشق | چھوڑ دے حرص و ہوا اور خداگیری کر

رندِ بدمست نہ بن میکش ہشیار ہو تو | باخبر باش، رہِ عشق میں آہیری کر

کر کے شق دل کا قمر عالمِ نورانی دیکھ | چڑھ کے بُراق پہ تو آج عناں گیری کر

گوشِ دل سُن سکے جسکو۔ بزبانِ روحی | ایسا پیدا تو کوئی نغمۂ تقریری کر

قطرۂ جامِ الست آ میں چکھادوں تجھ کو
زادِ راہِ سفرِ عشق دلادوں تجھ کو

طاقتِ ضبط بھی رکھ اور پُرجوش بھی ہو | نشۂ عشق میں مدہوش بھی باہوش بھی ہو

مشعلِ روح جلا اور فنا کوش بھی ہو | مایۂ ہوش بھی رکھ راہ زنِ ہوش بھی ہو

دل کو محرومیِ قسمت پہ بھی بے لطف نہ کر | بات کہنے کی ہو کہہ ڈال یہ خاموش بھی ہو

گر سمجھ پائے تو یہ راز سمجھ بے بندے | لب کشائی بھی نہ کر اور نوا کوش بھی ہو

رازِ دل غیر نہ سمجھے یہ ترا شیوہ ہو | زاہدِ خشک بھی بن اور بلانوش بھی ہو

پیر نے دیں یہ ہدایات طریقت میں ہمیں
کوئی اُن سا نظر آیا نہ حقیقت میں ہمیں

انتخابات اسمبلی

فروری ۱۹۳۷ء کا مہینہ ہندوستان کی تاریخ میں عرصہ تک یاد رہے گا۔ نئے آئین کے ماتحت جس کا نہایت شد ومد کے ساتھ اپریل ۱۹۳۷ء سے آغاز ہورہا ہے ملک کے تمام صوبوں کی قانونی اسمبلیوں کا اس ماہ انتخاب ہوا اور گو نئے آئین کا ہر جزو ایسے سانچے میں ڈھالا گیا ہے جس سے عوام ہند کے نمائندے اہم اور ضروری امور میں بہت کچھ مفلوج ہو کر رہ جائیں گے۔ تاہم تقریباً ساڑھے تین کروڑ اہل ملک کو ایوان حکومت میں پہلی مرتبہ اپنے نفع نقصان کے موقعہ ملا ہے۔ مدبران انگلستان کو ہندوستان کے عوام الناس سے ہمیشہ یہ بدظنی رہی ہے کہ وہ اپنا نفع نقصان سمجھنے کی لیاقت نہیں رکھتے۔ انکو اس بارے میں بھی دھوکا رہا ہے کہ ہندوستانی تعلیم یافتہ لیڈران کو جمہور پر کوئی خاص اثر حاصل نہیں ہے۔ حالانکہ واقعہ اس کے بالکل خلاف ہے اور دنیا کا شاید ہی کوئی دوسرا ملک ہو جہاں تعلیم یافتہ طبقہ کو عام باشندوں پر اسقدر رسوخ حاصل ہو جیسا کہ ہندوستان میں انھیں نصیب ہے۔

اب تک برٹش گورنمنٹ کے ساتھ عوام کی خوش اعتقادی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ابتک انھیں عوام کی صدا سننے کا موقعہ ہی نہیں ملا ہے اور خود تعلیم یافتہ جماعت کو برطانوی انصاف پسندی اور رعایا پروری کے اصولوں پر اسقدر غیر معمولی بھروسہ رہا ہے اور وہ برٹش تعلق کو خدائی برکت سمجھتے رہے ہیں۔ چنانچہ کانگرس کے ابتدائی پچیس سال تک لیڈران کانگرس اور دوسرے ملکی رہنما ملکہ وکٹوریہ آنجہانی کے اعلان غدر کو حق وانصاف اور آزادی ومساوات کا محضرنامہ سمجھتے رہے ہیں اور اپنے تمام سیاسی مطالبات میں اس کا حوالہ دیتے رہے ہیں۔ مگر اب کچھ عرصہ سے اس روش میں اصولی تبدیلی ہوگئی ہے اور کانگرس میں شاہی وعدوں کی یاد دلانے کے بجائے آزادی وخود مختاری کے بنیادی حقوق پر زور دیا جارہا ہے۔ اور ملک کا افلاس اور موجودہ بے بسی کی ذمہ داری غیر ملکی حکومت پر ڈالی جارہی ہے۔ تعلیم یافتہ جماعت کے خیالات میں تبدیلی کے ساتھ ساتھ عوام میں بھی کافی بیداری ہوگئی ہے جس کی وجہ موجودہ طرز حکومت میں اصولی تبدیلی کے خواہشمند ہوگئے ہیں اور نئے لیڈروں کو رہنمائی کا موقعہ دینا چاہتے ہیں یہی وجہ ہے کہ کروڑوں کے بے دریغ صرفہ اور پرانے رسوخ واقتدار کے تمام مظاہروں کے باوجود اس مرتبہ عام انتخابات میں ملک کے زیادہ تر صوبوں میں کانگرس کو غیر معمولی (اور بعضوں کے نزدیک غیر متوقع) کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ منجملہ گیارہ صوبوں کے اسوقت سات صوبوں لیجسلیٹو اسمبلیوں میں کانگرس پارٹی کو نمایاں اقتدار حاصل ہوچکا ہے۔ مجموعی حیثیت سے بھی کانگرس کی کامیابی بہت شاندار کہی جاسکتی ہے۔ تمام ملک میں ۱۵۸۵ ممبروں کا انتخاب ہوا ہے ان میں ۷۴۲ نشستیں کانگرس کے

ہاتھ آئیں۔ تفصیلی طور پر کانگرس کو مدراس اسمبلی میں ۵۶۔ بہار میں ۷۵۔ صوبہ متوسط میں ۱۴۔ صوبہ متحدہ آگرہ واودھ میں ۴۸۔ اڑیسہ میں ۲۴ بمبئی میں ایک کی اکثریت حاصل ہوئی ہے۔ صوبہ سرحد کی اسمبلی میں بھی پچاس ممبروں میں سے اسوقت ۲۲ ممبران کانگرس پارٹی میں شامل ہو چکے ہیں۔ اس طرح ملک کے گیارہ صوبوں میں سے سات صوبوں میں کانگرس کو مقتدر پوزیشن حاصل ہوگئی ہے جسکی بدولت وہ اپنے ہاتھ میں حکومت کی باگ ڈور لیکر نئے آئین کے نقائص خامیوں اور حدبندیوں کے باوجود ملک کے روزمرہ نظم ونسق میں انقلاب عظیم کرسکتے ہیں۔ بنگال اور آسام میں بھی کانگرس کی پوزیشن بری نہیں ہے کیونکہ اسے ہر دوسری پارٹی سے زیادہ جگہیں حاصل ہوئی ہیں۔

نئے آئین کو کانگرس ناقابل قبول قرار دے چکی ہے۔ اسکا مقصد ہندستان کو پوری آزادی دلانا ہے۔ مگر پوری آزادی "مکمل سوراج" کے متعلق بہت کچھ بحث مباحثہ اور اختلاف رائے ہے۔ حال ہی میں مہاتما گاندھی نے اس بات کا پھر علانیہ اظہار کیا ہے کہ اگر بجنسہٖ ہی ملکی حقوق جو اسوقت برطانوی نوآبادیوں کو حاصل ہیں ہندوستان کو دے دئے جائیں۔ تو وہ انہیں ملک کیطرف سے بخوشی منظور کرلیں گے اور ملک اطمینان سے برٹش گورنمنٹ کیساتھ وابستہ بنا رہے گا۔ اس اعلان پر بعض حلقوں میں بڑی نکتہ چینی ہوئی ہے لیکن ہمکو یقین ہے کہ اس بارے میں ملک کی بہت بھاری کثرتِ رائے مہاتماجی سے متفق اور اُن کی ہم خیال ہے۔ گو اسوقت ضابطہ کے رو سے مہاتماجی کو کانگرس میں کوئی پوزیشن حاصل نہیں ہے۔ مہاتماجی کی موجودہ علیحدگی کانگرس کیلئے مفید ثابت ہوئی ہے۔ کیونکہ اگر انتخابات ملک میں تین سال پہلے ہوتے اور کانگرس کو اسوقت ایسی نمایاں کامیابی ہوتی تو سب کو یہی کہنے اور سمجھنے کا موقعہ ملتا کہ یہ شاندار کامیابی کانگرس کے اصولوں کی نہیں ہے بلکہ مہاتماجی کی بدولت حاصل ہوئی ہے۔ یہ حالت موجودہ کسی کو یہ کہنے کا حق نہیں ہے کہ پچھلے انتخابات میں کانگرس کی کامیابی کسی خاص شخص کے اثر واقتدار کا نتیجہ ہے۔ غرض اس کامیابی کے اگر کوئی معنی ہوسکتے ہیں تو یہ کہ کانگرس پروگرام نے عوام ملک کے دلوں میں جگہ کرلی ہے۔ اور انتہا پسندوں کی انتہا پسندی سے قطع نظر لوگ ملک کے طرز حکومت میں اصولی بلکہ انقلابی تبدیلی چاہتے ہیں۔ اس وقت ملک کو افلاس اور بیکاری دور کرنے کی زبردست خواہش ہے۔ مگر غیر ملکی حکمرانوں اور سابقہ ملکی لیڈروں دونوں سے لوگ مایوس ہو چکے ہیں۔ زمینداروں کی سخت گیریوں زیادتیوں اور جکڑ بندیوں نے آزادی حاصل کرنے کی خواہش اور بھی عام کردی ہے۔ بہرحال عوام اپنے فلاح وبہبود کے لئے یہ سمجھ کر کانگرس سے لو لگائے ہوئے ہیں کہ ؎

کامل اس فرقہ زہاد سے اٹھا نہ کوئی
کچھ ہوئے بھی تو یہی رندِ خرابات ہوئی

پنجاب اور سندھ زیادہ تر مسلم صوبے ہیں جن میں کانگرس کی پوزیشن کمزور ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکالا جارہا ہے کہ ابھی تک مسلمان کانگرس کے ساتھ نہیں ہیں۔ بنگال میں بھی کانگرس کو اکثریت نہ حاصل ہونے کی یہی وجہ قرار دی جاتی ہے صوبہ متحدہ میں مسلم امیدواران کانگرس کو عام شکست کی وجہ بھی یہی بیان کی جاتی ہے اور بمبئی۔ مدراس۔ بہار۔ اڑیسہ۔ صوبہ متوسط اور صوبہ متحدہ کی آبادی کی نوعیت سے بھی اس رائے کی تائید ہوتی ہے۔ اس طرح یہ خیال ایک حد تک درست

کہا جا سکتا ہے۔ لیکن اس پر آئندہ کے لئے بھروسہ رکھنا حماقت ہوگی۔ صوبہ متحدہ میں مسلم کانگرسی اُمیدواروں کی ناکامیابی کا ذکر کرتے ہوئے مسلمانوں کے قدیم خیرخواہ اور علی گڈھ کے پُرانے حامی خان بہادر محمد بشیر الدین صاحب ایڈیٹر "البشیر" اپنے معزز اخبار میں لکھتے ہیں کہ اس کی اصلی وجہ یہ ہے۔ کہ

"خود غرض مسلمان لیڈروں نے ان (عام مسلمانوں) کو کانگرس کی طرف سے خوفزدہ بنا دیا ہے۔ کانگرسی مسلم اُمیدواروں[1] کے خلاف ان کے حریفوں نے یہ پروپیگنڈا کیا کہ کانگرس برسر اقتدار ہو کر قربانی بند کرا دے گی تعزیہ داری بند کرا دے گی۔ مسجد کے سامنے باجا بجوائے گی۔ اور اس طرح اسلام اور مسلمان دونوں کی سلامتی ہندوستان میں دشوار ہو جائے گی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ کانگرس کے ذمہ دار لیڈر برابر ڈنکے کی چوٹ کہہ رہے ہیں کہ چھوٹے چھوٹے مذہبی جھگڑے کی باتوں کو بالکل نظر انداز کرنا چاہیئے"

سابق وائسرائے ہند لارڈ اروِن نے بھی اپنے کسی مراسلے میں کانگرس سے مسلمانوں کی علیحدگی کو محض عارضی قرار دیا تھا امر واقعہ بھی یہی ہے کہ کانگرس سے مسلمانوں کی موجودہ کنارہ کشی کسی فطری نا اہلیت۔ بنیادی مخاصمت یا اصولی مخالفت پر مبنی نہیں ہے بلکہ اسمیں جداگانہ طریقۂ نیابت خود غرض رہنماؤں اور بعض ہندو لیڈروں کے طرز عمل کو بہت بڑا دخل ہے۔ دیہات میں اس وقت بھی واقعی ان دونوں طبقوں میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ سب فرقوں کے عوام کا نفع نقصان یکساں ہے۔ اور دونوں کے خیالات وجذبات میں بھی کوئی فرق نہیں ہے۔ دونوں کی ضروریات زندگی اور ملکی خواہشات بھی ایک ہی ہیں۔ اسلئے جلد یا دیر میں جسوقت خود پرست لیڈروں کی گرفت کم ہوئی اور خیر خواہانِ ملک عام مسلمانوں کو حقیقتِ حال سے واقف کرنے کی طرف متوجہ ہوئے یا خود واقعات نے انہیں واقفِ حال کر دیا اُسی وقت عام مسلمان کانگرس میں پیش پیش نظر آنے لگیں گے۔ اسوقت بھی نوجوان مسلمانوں کا رُخ بدلا ہوا نظر آتا ہے۔

بہرصورت اسوقت کی سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ کانگرس نے دلوں میں جو اُمیدیں اور توقعات پیدا کر دی ہیں اُن کے پورا کرنے کی طرف انہماک اور ایمانداری کے ساتھ توجہ کی جائے۔ اور اس میں رفاہِ عام کے خیال کے سوائے اپنی بات اپنے جذبات یا جماعتی غرور۔ بلند آہنگ دعووں اور چلتے ہوئے فقروں کا (جن کے استعمال میں غیر معمولی فیاضی سے کام لیا گیا ہے) کوئی لحاظ نہ کیا جائے اور ملک کے سود و بہبود کے لئے ذاتی تمکنت ووقار کو بھی نثار کرنے میں دریغ نہ کیا جائے

اس وقت ملک کی آنکھیں کانگرس کی طرف لگی ہوئی ہیں ....

اور سب لوگ یہ دیکھنے کے مشتاق ہیں کہ انتخابات میں کانگرس پر جس اعتماد کا اظہار کیا گیا ہے۔ اُس کا کانگرس کی طرف سے عوام کو کیا جواب دیا جاتا ہے۔ ہم کو معلوم ہے کہ بعض حضرات نئے آئین کے ماتحت کوئی عہدہ لینے یا وزارت

---

[1] ایڈیٹر صاحب البشیر کانگرسی مسلم اُمیدواروں کے متعلق لکھتے ہیں کہ وہ "بہ اعتبار اپنی قابلیت ایثار اور قربانی کے بمقابلہ اپنے حریفوں کے ہر حیثیت سے بہت زیادہ قابل تھے" (ایڈیٹر)

قایم کرنے کے اصولاً خلاف ہیں۔ مگر اس قسم کے اصولی اختلاف رکھنے والوں کی تعداد بہت کم ہے۔ ہماری رائے میں ان اصحاب کو اپنی رائے اور ضمیر کے مطابق اس جدوجہد سے بالکل علیحدہ رہنا چاہیے تھا۔ انتخابات میں سرگرم حصہ لینے کے بعد عوام کی خدمت سے گریز کرنے کا اب کانگرس کو حق ہی باقی نہیں ہا۔ اسلئے کانگریسی رہنماؤں کو ملک کے سات صوبوں میں عنان حکومت سنبھالنے کے سوا اور کوئی چارہ کار نہیں ہے۔ آئینی نقطۂ خیال سے کسی پارٹی کو انتخابات میں قطعی اکثریت حاصل ہونے کے صرف یہی معنی ہو سکتے ہیں کہ ووٹران نے اس پارٹی کو عہدے قبول کر کے اپنے اقتدار و اختیار سے ملک کو فائدہ پہونچانے کا صریحاً فرمان دیا ہے۔ اب کانگرس کو اس ذمہ داری کے قبول کرنے میں خواہ کتنی ہی مشکلات سے سامنا ہو۔ اپنے گذشتہ طرز عمل کی وجہ سے اسکے رہنماؤں کو کتنا ہی پس و پیش کیوں نہ ہو لیکن منتخب شدہ ممبران کے لئے نظم و نسق کو ہاتھ میں لینے کے سوائے اور کوئی راستہ نہیں ہے۔

لیڈران کانگرس کو اس مسئلے کے متعلق فضول اس قدر پس و پیش ہے۔ کیونکہ ووٹران نے پہلے ہی سے ان کا منھ بند کر دیا ہے۔ چنانچہ سر جیت راجا گوپال آچاریہ۔ بلبھ بھائی پٹیل اور راجیندر پرشاد کی قلب ماہیت اسی ذمہ داری کے احساس کی بدولت ہوئی ہے۔ ملک کی عام رائے بھی یہی ہے۔ مدراس۔ بمبئی۔ بہار۔ سرحد۔ آسام و اڑلیسہ سب جگہ کثرت رائے عہدے قبول کر کے ملکی انتظامات کے ذریعہ رفاہ عام کی...... نئی تدابیر کرنے کی طرف ہے۔

صوبہ متحدہ کی پراونشل کمیٹی نے جو اختلاف رائے ظاہر کیا ہے اس کی ہم کوئی حقیقت نہیں سمجھتے ہیں کیونکہ صوبے کی دو تہائی کانگرس کمیٹیاں پہلے ہی سے عہدوں کی موافقت میں رائے دے چکی ہیں۔ بہر نوع ملک نے کانگرس کو جس پوزیشن میں رکھ دیا ہے اُس کا یہی تقاضا ہے کہ اس اہم ذمہ داری کو کانگرس لیڈران اپنے سر لیں ورنہ یہی کہنے کو ہوگا کہ کانگرس کے دعوے تو بہت تھے لیکن جب آزمایش و امتحان کا وقت آیا تو لیڈران اپنے خیالات پر عملدرآمد کی جرأت نہ کر سکے۔ آئین کی حدبندیوں کی آڑ لے کر مشکلات کا سامنا کرنے سے بھاگ گئے۔

ہم کو بھروسہ ہے کہ دہلی میں جو آل انڈیا کنونشن منعقد ہو رہی ہے اس کا فیصلہ عہدے قبول کرنے کے حق ہی میں ہوگا۔

تصحیح { مضمون "سیاسیات عالم" میں جہاں جہاں "بحر قلزم" لکھ گیا ہے وہاں پر "بحر روم" ہونا چاہیئے۔ ناظرین تصحیح فرمالیں۔ (ایڈیٹر)



علمی خبریں اور نوٹ

ہندوستانی اکیڈیمی (صوبہ متحدہ) کی پانچویں ادبی کانفرنس ۱۶ر، ۱۷ر اور ۱۸ر جنوری کو لکھنؤ میں رائے راجیشوربلی صاحب سابق وزیر تعلیم صوبہ متحدہ کے صدارت میں منعقد ہوئی۔ پہلے دن کی کارروائی رائٹ آنریبل ڈاکٹر سر تیج بہادر سپرو کے افتتاحی ایڈریس سے شروع ہوئی۔ اسکے بعد صدر کانفرنس کی تقریر ہوئی، بعدازاں اُردو سیکشن کے پریسیڈنٹ مولانا سید سلیمان صاحب ندوی اور ہندی سیکشن کے پریسیڈنٹ رائے بہادر پنڈت شیام بہاری صاحب مصر کے ایڈریس ہوئے اور سکریٹری صاحب نے اکیڈیمی کی کارگزاری بیان کی۔ سہ پہر کو مختلف موضوع پر قابل قدر مضامین پڑھے گئے اور ان پر مباحثہ بھی ہوا۔ دوسرے اور تیسرے دن بھی کئی ضروری مسائل پر غور ہوا۔ ان سب میں زیادہ اہم اُردو ہندی زبانوں کے ایک دوسرے کے قریب لانیکا مسئلہ ہے۔ اس پر ابتک تحریر و تقریر دونوں میں بحث مباحثہ تو بہت ہوچکا لیکن ابھی تک کوئی مُفید عملی تجویز طے نہیں ہوسکی۔ ہندوستانی اکیڈیمی بھی اسوقت تک اس مسئلہ پر کوئی خاص توجہ نہیں دے سکی ہے۔ اکیڈیمی نے گذشتہ دس سال کے عرصہ میں اُردو ہندی میں چند قابل قدر کتابیں ضرور شائع کیں اور بعض مفید و دلچسپ کتابوں کے ترجمے بھی طبع کرادئے، لیکن عوام کو اس سے جو توقعات تھیں وہ ابھی تک پوری نہیں ہوسکیں۔ اور جن قابل قدر مقاصد کو پیش نظر رکھ کر یہ اکیڈیمی ۱۹۲۷ء میں قائم کی گئی تھی اُن کے تکمیل کیطرف ابھی تک کوئی باضابطہ کوشش نہیں ہوسکی۔ ہمعصر سرفراز لکھنؤ نے حال میں اسکے متعلق ایک مفصل مضمون شائع کیا تھا اور وقتاً فوقتاً بعض دیگر اہل الرائے اصحاب بھی ان امور کیطرف توجہ دلاتے رہے ہیں لیکن جبتک اکیڈیمی کی رہنمائی کم سے کم دو تین ہمہ وقت کام کرنیوالوں کے سپرد نہ ہوگی یہ مقاصد یوں ہی نامکمل رہیں گے۔

پچھلی جنرل کونسل میں اکیڈیمی کے ارباب حل و عقد نے بھی اکیڈیمی کی موجودہ پالیسی میں تبدیلی کی ضرورت محسوس کی ہے۔ چنانچہ ۱۷ر جنوری کے جنرل کونسل میں نو اصحاب کی ایک سب کمیٹی اس غرض سے قائم کیگئی ہے کہ اکیڈیمی کی گذشتہ کارگزاری پر نظرثانی کرکے آئندہ کیلئے اس کے واسطے ایک دستور العمل تجویز کریں۔ اس کمیٹی کے صدر الہ آباد یونیورسٹی کے ڈاکٹر عبدالستار صدیقی صاحب اور ممبران سید ضامن علی۔ سر سید لیاقت علی۔ منشی دیانرائن نگم۔ پنڈت منوہرلال زتشی۔ مولوی سید سلیمان ندوی۔ خان بہادر مرزا جعفر علیخاں اثر۔ مسٹر رشید احمد صدیقی اور رائے بہادر رام بابو سکسینہ ہیں۔ کمیٹی کا ایک جلسہ منعقد ہوچکا ہے اور دوسرا وسط مارچ میں ہونیوالا ہے۔ ہمکو اُمید ہے کہ اس کمیٹی سے اکیڈیمی کی ادبی خدمات کا دائرہ پہلے سے زیادہ وسیع ہوجائے گا۔

آئندہ تین سال کے لئے ہندوستانی اکیڈیمی کی اُردو کمیٹی کے مولوی سید مسعود حسن رضوی۔ ڈاکٹر حفیظ۔ سید محمد ضامن علی منشی دیانرائن نگم اور رائے بہادر رام بابو سکسینہ ممبر منتخب ہوئے ہیں کمیٹی کے کنوینر سید مسعود حسن صاحب رضوی ہیں۔

جے پور لٹریری کارپوریشن کے پُرجوش ممبران کی کوشش و توجہ سے گذشتہ ۲۸ر فروری کو مہاراجہ کالج جے پور کے وسیع ہال میں شمس العلماء ڈاکٹر نذیر احمد صاحب مرحوم کی صد سالہ سالگرہ کا جشن بڑے دھوم دھام سے منایا گیا۔ یہ جلسہ ریاست جے پور کے قدردانانِ ادب کے جوش کا ایک قابل قدر مظاہرہ تھا۔ ریاست کے ریونیو ممبر خان بہادر میاں عبدالعزیز صاحب ایم۔ اے۔ سی۔ بی۔ ای کے زیر صدارت منعقد ہوا تھا۔ باہر کے مہمانوں کے علاوہ اس میں جے پور کے بہت سے معززین اور صاحبانِ ذوق بھی موجود تھے۔ ڈاکٹر نذیر احمد مرحوم کے حالات زندگی اور ادبی کارناموں پر نظم و نثر دونوں میں قابل قدر روشنی ڈالی گئی۔ کئی اہم تقریریں خاص طور پر

[illegible] قدر میں سید عبدالرشید صاحب فاضل نے مولانا مرحوم کے انشا پردازی پر۔ منشی امیرالدین خاں صاحب جوش نے [illegible] پرستی پر [illegible] السلام صاحب خیال نے انکے ادبی احسانات پر قابل قدر مضامین پڑھے۔ چیرمین صاحب کمیٹی [illegible] جلسہ اور انکے [illegible] داران و ممبران لٹریری کارپوریشن کے ادبی جوش کی جسقدر تعریف کیجائے کم ہے کیونکہ انہوں نے راجپوتانہ میں جیسے ایک مشہور و معروف محسن اُردو کے علمی احسانات کی یاد تازہ کرنے میں اسقدر اولوالعزمی سے کام لیا۔

لکھنؤ کی صنعتی و حرفتی نمایش کے موقعہ پر ۱۶ ؍جنوری کے شب ۱۷ ؍جنوری کی صبح کو ایک دھوم دھامی آل انڈیا مشاعرہ نواب صاحب چھتاری کے زیر صدارت منعقد ہوا۔ ملک کے اکثر نامور شعرا نے داد سخن دی۔ اور دو روز تک خوب لطف صحبت رہا حاضرین نے شروع سے آخر تک پوری دلچسپی کے ساتھ مختلف شعرا کے کلام کو سنا۔ لیکن دس بارہ گھنٹہ تک بزم مشاعرہ جاری رہنے پر بھی کئی معززین کو اپنا کلام سنانے کا موقعہ نہ مل سکا جس سے انکی کسیقدر دل شکنی ہوئی۔ ہماری رائے میں اس قسم کے مشاعروں میں انتظامی حیثیت سے اہم اصولی تبدیلی کی ضرورت ہے۔ ایسی صحبتوں میں صرف معدودے چند شعرا کو اپنا کلام سنانے کی زحمت دینی چاہئیے طرحی مشاعرہ کا اصل منشا مشق سخن اور ترقی فن ہے۔ اسکے لئے ہر مقام کے شاعر حضرات جب چاہیں یکجا ہو جایا کریں۔ سخنور اور سخن فہم حضرات کے علاوہ عوام کو ان صحبتوں میں مدعو کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ البتہ نامور و مستند شعرا کے کلام سننے کی عوام کو بھی وقتاً فوقتاً دعوت دی جاسکتی ہے۔ مگر اسوقت کسی مصرعہ طرح کی قید فضول ہے۔ ہماری رائے میں ایسے جلسوں میں مسلسل نظموں کو نمایاں حیثیت ملنا چاہئیے۔

ناظرین زمانہ کو یہ سنکر دلی مسرت ہوگی کہ ہز ہائی نیس مہاراجہ صاحب پٹیالہ نے اُردو کے شاعر اعظم حضرت جوش ملیح آبادی کے کمال فن کی قدر دانی میں دو سو روپیہ ماہوار کا وظیفہ مقرر فرمادیا ہے جو تاحیات ملتا رہے گا کیا اچھا ہو کہ ملک کے دیگر روسا بھی ارباب علم و فن کی قدر شناسی میں مہاراجہ صاحب پٹیالہ کی تقلید کریں۔

ہمارے مکرم مرزا محمد عسکری صاحب بی۔ اے لکھنوی (عبدالعزیز ریڈر) لکھنؤ اُردو ادب پر متعدد احسانات کرچکے ہیں۔ اب آپ کلیات میر کا ایک صحیح و مکمل ایڈیشن شائع کرنیکی فکر میں ہیں۔ چنانچہ آپ کلام میر کے متعدد نسخے جمع کرنے کی کوشش کررہے ہیں تمام ارباب شوق جنکے پاس کلام میر کے قلمی یا مطبع نول کشور کے علاوہ دیگر مطبوعہ نسخے موجود ہوں گذارش ہے کہ وہ صاحب مدوح کے پاس یہ نسخے عاریتاً یا مناسب قیمت پر بھیجدیں تاکہ وہ ان نسخوں سے مقابلہ کرکے صحیح نسخہ مرتب کرسکیں۔ اس خدمت میں سید مسعود حسن صاحب رضوی صدر شعبہ فارسی و اردو لکھنؤ یونیورسٹی بھی مرزا صاحب کے مددگار ہیں۔

ہمارے محب مسٹر علی عباس حسینی صاحب ایم۔ اے آجکل اُردو ناول نویسی کے متعلق ایک قابل قدر کتاب لکھ رہے ہیں جو اُردو ادب میں ایک قابل قدر اضافہ ہوگی۔ اس کتاب کے پہلے حصے میں ناول کے اجزا اور انکی اقسام سے بحث کیگئی ہے۔ دوسرے حصے میں اُردو کے مشہور ناول نگاروں کے طرز تحریر وغیرہ پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ اسکے بعض حصے زمانہ میں ہدیہ ناظرین ہونگے۔

زمانہ کے ایڈیٹوریل بورڈ میں مکرمی رگھوپتی سہائے فراق اور سنت پرشاد صاحب مدہوش کی شمولیت پر اکثر واقف حال احباب نے اظہار مسرت کیا ہے۔ چنانچہ ایک محب لکھتے ہیں کہ آپنے حضرات فراق و مدہوش کا انتخاب کرکے گویا صوبہ متحدہ کے مشرقی و مغربی قلابے ملاکر یکجا کردئے ہیں...... "قربان آپکی نگہ انتخاب کے"۔ واقعی دونوں صاحب پرانے محب وطن اور شیدائے ادب ہیں زمانہ پر انکی ادبی احسانات کا سلسلہ زمانہ اور ناظرین زمانہ دونوں کیلئے باعث فخر ہوگا۔

تصحیح زمانہ کے پچھلے نمبر میں جناب مائل صدر انجمن اُردو بھوپال کے تازہ تصنیف بیاض سحر کے متعلق جو نوٹ شائع ہوا تھا اسمیں [illegible] گیا ہے کہ کتاب انجمن اُردو بھوپال سے مفت ملیگی۔ مائل صاحب لکھتے ہیں کہ چھپائی کا انتظام مطبع کے ذمہ ہے اور قیمت کا [illegible] ہم کو اس غلطی کا افسوس ہے۔ ناظرین تصحیح فرمائیں۔

[illegible]



هز ایگزالٹیڈ ہائینس نواب سر میر عثمان علیخان بہادر نظام دکن و برار

زمانہ

جلد ۶۸ — مارچ ۱۹۳۷ء — نمبر ۳

فرانس کا دستوری نظامِ حکومت

آئینی حکومت کا آغاز

از خان بہادر ڈاکٹر سید نجم الدین احمد جعفری ایم اے ایل ایل ڈی بار ایٹ لا

ان ملکوں میں جو جمہوری آئین کے پابند ہیں، فرانس دو خصوصیتوں کی وجہ سے اپنی نظیر آپ ہے۔ پہلی خصوصیت یہ ہے کہ امریکہ انگلستان اور سوئٹزرلینڈ وغیرہ ممالک نے تدریجی رفتار سے چل کر جمہوری نظامِ حکومت اختیار کیا مگر فرانس نے یک بیک اور ایک فوری جوش کے زیر اثر شہنشاہیت ترک کر کے جمہوریت قائم کر لی جس میں یہ اصول عملاً تسلیم کر لیا گیا کہ سیاسی اعتبار سے ملک کے سب باشندے مساوی ہیں۔ دوسری خصوصیت یہ ہے کہ فرانس نے جمہوریت کو اپنے سیاسی مصائب کا مداوا تصور کرتے ہوئے اختیار نہیں کیا اور اس نے شخصی حکومت کے طرز و طریقوں کے مقابلے میں جمہوریت میں کوئی نمایاں فوقیت دیکھی۔ فرانس نے صرف اسلئے جمہوری آئین مروج کیا کہ وہ ایک بیّن سیاسی حقیقت کو عملاً درست تسلیم کرنے کا آرزومند تھا۔

اس سلسلے میں سب سے بڑا کام انقلاب فرانس نے کیا جسے انگلستان کے شہرۂ آفاق مدبر برک BRUKE نے بجا طور پر ٹرائے کے محاصرے کے بعد دنیا کی تاریخ کا عظیم ترین کارنامہ بتایا ہے۔ اس کہنہ سیاسی نظام کی عمر جسے انقلاب فرانس نے بیخ و بن سے اکھاڑ کر پھینک دیا، آٹھ سو برس تک تھی۔ وہ دور مطلق العنان شخصی حکومت کا تھا۔ بادشاہ کو یہ حق حاصل تھا کہ آئین اور قانون کی پرواہ نہ کرتے ہوئے جو جی میں آئے کرے۔ اس کے چھ وزرا چالیس ممبروں کی ایک کونسل کی مدد سے ملک کا انتظام کرتے تھے اور عوام میں کوئی

ان پر نکتہ چینی کا حق نہ رکھتا تھا۔ پارلیمنٹ جسے اسوقت کی اصطلاح میں اسٹیٹس جنرل (Estates General) کہتے تھے بادشاہ وقت اور بارسوخ افراد کی اغراض کی تکمیل کا آلہ کار تھی اور اسے کبھی آزادانہ طور پر قانون سازی کی فرصت ہی نہ ملتی تھی۔ سارے سیاسی نظام کی بنیاد عدم مساوات اور مراعات بخشی پر تھی۔ اور ملکی قانون کا استعمال مختلف طبقوں پر مختلف طریقوں سے ہوتا تھا۔ نامناسب نہ ہوگا اگر فرانس کے جمہوری نظامِ حکومت پر تفصیلی روشنی ڈالنے سے پہلے ہم مختصراً یہ بتا دیں کہ انقلاب فرانس کے اثرات نے کس طرح اس مفلوج سیاسی نظام کو ختم کر کے جمہوری طرزِ حکومت کی بنا اُستوار کی۔

فرانسیسی جمہوریت کا تاریخی پس منظر بربن خاندان کی حکومت کی چیرہ دستیوں سے جب ملک کا ناک میں دم آگیا تو آخر کار ۱۷۸۹ء میں احتجاج کا وہ ہلاکت خیز طوفان اُٹھا جس نے بدنصیب شاہ لوئی شانزدہم کی کشتئ حیات کو موت کے بھنور میں غرقاب کر دیا۔ یہ سیاسی طوفان ملک کے بورژو طبقے کی طرف سے اُٹھا تھا۔ ان حالات کے نقوش کو ذرا اُبھار کر دکھانے کے لئے جن کی آخری کڑی یہ طوفانِ مخالفت تھا شاہ لوئی شانزدہم کے دور کی ابتدائی واقعات کا بیان ضروری ہے۔

اس حکمران کے تخت نشین ہوتے ہی حالات کا رنگ بدلنے لگا اور اس قدر سرعت کیساتھ تغیر و تبدل ہوا کہ اس کے عہد حکومت کے خاتمے سے بہت پہلے فرانس میں قومی یگانگت کا تصور پیدا ہو کر پختہ ہوگیا۔ مذہبی مساوات پہلے ہی حاصل ہو چکی تھی۔ نمایندہ ادارے تمام ختم ہو چکے تھے۔ پرانی پارلیمنٹ یا اسٹیٹس جنرل کا ۱۶۱۴ء کے بعد سے کوئی اجلاس نہیں ہوا تھا۔ اور جیسا کہ شاہ لوئی نے ایکمرتبہ خود کہا تھا، بادشاہ ہی خود مملکت تھا۔

اس کے بعد ستر سال میں کوئی سیاسی تغیر واقع نہیں ہوا۔ مگر اہلِ ملک کے جذبات اور اُن کی رائے اور ذہنیت میں بڑی زبردست تبدیلی ہوگئی۔ اور لوگ آزادانہ طور پر شخصی حکومت کو اپنی نکتہ چینیوں کا نشانہ بنانے لگے۔ امریکہ والوں کی کامیاب جنگ آزادی کے بعد یہ خیالات اور بھی زیادہ پھیل گئے۔ مگر امریکہ میں جمہوری حکومت کی ترویج نے فرانس کے سیاسی مصلحین کے ذہنوں کو اس طرف متوجہ نہیں کیا کہ وہ بھی اپنے ملک میں جمہوری حکومت قائم کریں۔ ۱۷۸۹ء کا ہنگامہ برپا کرنے والے فرانس کیلئے طلبگار نہیں تھے۔ قومی اسمبلی عقیدۃً شہنشاہیت پسند تھی۔ چنانچہ ۱۷۹۱ء میں جو دستور اساسی اُس نے ترتیب دیا، اسکی رو سے بادشاہت برقرار رہی۔ مگر آئندہ حالات نے بادشاہت کے قیام کو ناممکن بنا دیا۔ بادشاہ کے فرار، ملکۂ وقت کی طرف سے رائے عامّہ کا ٹھکرایا جانا اور شہنشاہیت پسندوں کی سازشوں وغیرہ نے جمہوریت پسندی کے جذبہ کو اور بھی ہوا دی۔ اور ۱۷۹۱ء کے آخر تک اکثر سیاست داں انتہا پسند ہوگئے اور عوام

میں بھی بغاوت کا جذبہ سُلگنے لگا۔ خود اس مجلس قانون ساز کا طرز عمل بھی جو ۱۷۹۱ء کے دستور اساسی کی رو سے ملک پر حکمرانی کر رہی تھی اور عقیدے کے اعتبار سے شہنشاہیت پسند تھی، بادشاہت کے قیام کو ناممکن بنا رہا تھا۔ ۲۱ ستمبر ۱۷۹۲ء کو تازہ منتخبہ کنونشن (Convention) نے حالات کی رفتار کو دیکھتے ہوئے یہ فیصلہ کیا کہ بادشاہت کا عزل اور جمہوریت کے قیام کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ اسطرح بادشاہت کا چراغ گل ہوا اور جمہور نے امراء اور زعمائے کلیسا کی طاقت سلب کر دی۔

انقلاب ۱۷۹۲ء کے بانیوں نے جلدی جلدی تین مرتبہ فرانس کے لئے دستور بنانیکی کوششیں کیں۔ مگر وضع کردہ آئینوں میں سے کوئی بھی زیادہ مدت تک نہ چل سکا۔ ۱۷۹۹ء میں نپولین بونا پارٹ نے ایک دستور ترتیب دیا جو ۱۸۱۴ء تک جاری رہا۔ اُس کی رو سے چار حکمران اداروں کے ذریعے ملک میں نظام حکومت چلایا جاتا تھا۔ اوّل ٹریبونیٹ (Tribunate) جو ایک قانون ساز جماعت تھی اور جس کے ایک سو ممبر پانچ برس کے لئے منتخب ہوتے تھے۔ دوسرے کورپس لیجسلیٹیف (Corpus of Legislatif.) جس کے تین سو ممبر پانچ برس کے لئے چُنے جاتے تھے اور جو ٹریبونیٹ کی تجویزوں کو منظور یا مسترد کرتی تھی۔ اور تیسرے کیبنٹ (Cabinate) جس کے اسّی مستقل ممبر منظور شدہ قوانین کی دستوری حیثیت پر غور کرتے تھے اور چوتھے کونسل آف اسٹیٹ جو انتظامی اور آئینی مسودوں کی تیاری اور اُنکی وکالت پر مامور تھی۔

۱۸۱۴ء میں نپولین تخت سے دستبردار ہوا۔ اور تین ہفتے بعد بربن خاندان کا بادشاہ لوئی ہشتدہم فرانس کے تخت پر بیٹھا اور چھ ہفتے بعد ایک کمیشن نے جو تین سرکاری نمایندوں، نو سنیٹروں، اور کورپس لیجسلیٹف کے نو ممبروں پر مشتمل تھا، ایک نیا دستور اساسی بنایا جو برطانوی آئین سے اخذ کردہ اُصولوں پر مبنی تھا اور جس کے ذریعہ برطانوی طرز پر کابینہ ترتیب دینے کی فرانس میں پہلی مرتبہ کوشش کیگئی گذشتہ دستور کی بہ نسبت یہ آئین یقینی طور پر بہتر تھا کیونکہ اُس کی رو سے گو بادشاہ کو احکام صادر کرتے، نوکریاں دینے، صلح اور جنگ، اور قانون سازی پر نگرانی کا اختیار حاصل تھا مگر وہ ٹیکس نہیں لگا سکتا تھا اور نہ پارلیمنٹ کی مرضی کے بغیر قانون نافذ کرنے کا مجاز تھا۔

پارلیمنٹ کے دو ایوان تھے۔ چیمبر آف پیئرز (Chamber of peers) میں نامزد امراء لئے گئے اور چیمبر آف ڈپٹیز (Chamber of Deputies) میں وہ لوگ آئے جنہیں اضلاع نے پانچ برس کے لئے اپنا نمایندہ بنانا پسند کیا۔ پارلیمنٹ کیلئے سال میں کم از کم ایکمرتبہ اپنا اجلاس منعقد کرنا ضروری تھا۔ ۱۸۳۰ء کے دوسرے انقلاب نے اس "محدود بادشاہت" کو بھی ختم کر دیا۔ ایک پارلیمنٹری کمیشن نے دستور پر نظر ثانی کی اور نئے بادشاہ لوئی فلپی نے جو اَرلین خاندان سے تھا جدید دستور کو قبول کرلیا فروری ۱۸۴۸ء

کے تیسرے انقلاب کے ہاتھوں آرلین خاندان کی بادشاہت بھی ختم ہوگئی۔ اور جمہوری حکومت قائم ہوئی جس نے حق رائے دہی کو عام کر دیا۔ نمایندے اسمبلی نے ایک آئین تیار کیا اور ۴ نومبر ۱۸۴۸ء کو یہ آئین سات سو نو رائے کی کثرت سے منظور ہوگیا۔

۱۸۴۸ء میں نپولین کا بھتیجا لوئی نپولین جمہوریۂ فرانس کا صدر چنا گیا۔ ۱۸۴۹ء میں جو نمایندہ اسمبلی آئی اس کے دو تہائی ممبر شہنشاہیت پسند تھے۔ ان کی مدد سے لوئی نپولین نے ۱۸۵۲ء میں خود کو ملک سے بادشاہ منتخب کرا لیا اور جمہوریت ختم ہوگئی۔ ۱۸۷۰ء میں وہ جرمنوں کے ہاتھوں قید ہوا۔ اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اسوقت کی فرانسیسی اسمبلی نے بہت جلد تیسری جمہوریت کا اعلان کر دیا۔ اسی سال ایک نئی اسمبلی نے جو انتخاب سے وجود میں آئی تھی جرمنوں سے صلح کرنے کی غرض سے اڈولف تھیئرز نامی کو جمہوریہ فرانس کا سرعسکر نامزد کر لیا۔ یہ نامزدگی عارضی تھی اور اسوقت بھی عارضی ہی رہی جب اسمبلی نے اسے صدر جمہوریہ منتخب کر لیا۔ اس حیثیت میں تھیئرز نے جمہوری نظامِ حکومت کو استحکام دینے کی بڑی کوششیں کیں۔ مگر چونکہ اکثریت کا رجحان شہنشاہیت پسندی پر تھا اسلئے ۱۸۷۳ء میں پھر پانسہ پلٹ گیا۔ اور بربن خاندان کا ایک حمائتی مارشل مکموہن اسکی جگہ بٹھا دیا گیا۔ ۱۸۷۵ء میں شہنشاہیت پسندوں کے باہمی اختلافات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے جمہوریت پسندوں نے ایک جمہوری آئین رائج کرکے ایگزکٹو کے سرگروہ کو صدر جمہوریہ کا خطاب دیا۔ جمہوریت کے مخالفوں نے اس نظام کو درہم برہم کرنیکی کوششیں کیں مگر جب انتخابات میں جمہوریت پسندوں کو پے بہ پے اکثریتیں حاصل ہوئیں تو شہنشاہیت پسند دب گئے اور مکموہن کے استعفیٰ دینے کے بعد جولز گریوی نامی وکیل اس کی جگہ صدر بن گیا۔ اور جمہوری نظامِ حکومت رفتہ رفتہ جڑ پکڑ گیا۔

صدر جمہوریہ فرانس کا آئین امریکہ، بلجیم وغیرہ جمہوری ممالک کے دستور اساسی سے کئی باتوں میں مختلف ہے۔ اوّل تو یہ آئین تین علیحدہ علیحدہ تحریروں کی صورت میں ہے۔ پھر اسمیں متعدد اُمور کا کوئی مذکور نہیں ہے جن کے ایک حکومت کے دستور اساسی میں شامل ہونے کی توقع کی جاتی ہے۔ نہ اسمیں حقوق شہریت کا کوئی ذکر ہے۔ نہ وزرا کے تقرر اور ممبروں کے انتخاب کے طریق پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ عدل و انصاف کے سلسلے میں دستور سے صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ سینیٹ کو ہائی کورٹ بھی بنایا جا سکتا ہے اور بس۔ پرانے فرانسیسی آئینوں کے بالکل برخلاف ۱۸۷۵ء کا یہ دستور اساسی مختصر، غیر منظم اور محدود ہے۔ اسمیں صرف تین قوانین ہیں۔ ایک جمہوریت کے صدر کے انتخاب اور اس کے فرائض اور دستوری ترمیموں سے متعلق ہے۔ دوسرا اور تیسرا دونوں قوانین اسمبلی اور انتظام حکومت سے متعلق ہیں باقی تمام امور دواج اور معمولی قانون سازی کے فیصلے پر منحصر رکھے گئے ہیں۔ مگر دستور میں ترمیموں کا دروازہ ہر وقت کھلا ہے۔ اور ۱۸۷۵ء کے بعد سے اب تک فرانسیسی دستور میں

یا سنیٹر کونسا ہے جسے نئی حکومت ترتیب دینے کے لئے طلب کیا جائے۔ مگر وہ ان دونوں کا مشورہ قبول کرنے پر مجبور نہیں ہے۔ دوسرے وہ عام ملکی معاملات میں اپنے وزرا کو امدادی مشورے دیتا ہے۔

اس اعتبار سے جمہوریۂ فرانس کے صدر کی حیثیت شاہ برطانیہ (جو آئینی بادشاہ ہوتا ہے مگر حکمراں نہیں ہوتا) اور صدر جمہوریہ امریکہ (جو آئینی بادشاہ بھی ہوتا ہے اور حکمراں بھی) کے بین بین ہے۔ وزرا کی کونسل کی صدارت بھی اسی کے ذمہ ہے جس کا اجلاس ہفتہ میں دو تین مرتبہ ہوتا ہے۔ اس کونسل میں اہم سیاسی سوالات زیر بحث آتے ہیں اور ان پر فیصلہ دیا جاتا ہے۔

زمانہ تیس برس پہلے

فنِ تصویر

شاعری کی طرح مصوری بھی انسان کے نازک احساسات کا نتیجہ ہے۔ جو کام شاعر کرتا ہے۔ وہی مصور کرتا ہے۔ شاعر زبان سے مصور پینسل یا قلم سے۔ سچی شاعری کی تعریف یہ ہے کہ تصویر کھینچ دے۔ علیٰ ہذا سچی تصویر کی صفت یہ ہے کہ اسمیں شاعری کا مزہ آئے۔ شاعر کانوں کے ذریعہ سے روح کو مسرت پہونچاتا ہے اور مصور آنکھوں کے ذریعہ سے اور چونکہ قوت باصرہ بہ نسبت سامعہ کے زیادہ نازک اور ذکی الحس ہے اسلئے جو بات مصور ایک نشان ایک خط یا ذرا سا رنگ سے ادا کر دے گا وہ شاعر کے صدہا اشعار سے نہ ادا ہو سکے گی۔ شاعر جب اپنے اشعار پڑھنے لگتا ہے تو محض زبان کو اظہار خیال کے لئے کافی نہ سمجھ کر آنکھ ابرو اور انگلیوں سے ایسے اشارے کنائے کرتا ہے جن سے اس کے اشعار کا لطف دوبالا ہو جائے۔ گویا اُسے اپنا مطلب ادا کرنے کے لئے تصویر نگاری کی ضرورت ہوتی ہے۔ مگر مصور کی تصویر ہی اُس کا خیال ادا کرنیکے لئے کافی ہوتی ہے۔

زمانہ مارچ ۱۹۰۷ء — نواب رائے

غزل

ہمارے دوست منشی نوبت رائے نظرؔ کی یہ غزل زمانہ مارچ ۱۹۰۷ء میں شائع ہوئی ہے جسکو ہم نذر ناظرین کرتے ہیں (ایڈیٹر)

پس تو یہ حدیث مطرب و پیمانہ کہتے ہیں
یہ اک بھولا ہوا پھر آج ہم افسانہ کہتے ہیں

کوئی خونِ تمنا ہو جھلک آتا ہے آنکھوں میں
اسی کو اتحاد بادہ و پیمانہ کہتے ہیں

تباہی دل کی دیکھی ہے جو ہم نے اپنی آنکھوں سے
ہو اب کیسی ہی بستی ہم اُسے ویرانہ کہتے ہیں

فنا ہونے میں سوز شمع کی منت کشی کیسی
جلے جو آگ میں اپنی اُسے پروانہ کہتے ہیں

شریک ماجرائے دل ہے حال بخت خفتہ بھی
تمہیں سنتے ہی نیند آ جائے وہ افسانہ کہتے ہیں

جفا پر صبر سیکھا ہے وفا پر جان جاتی ہے
یہی ہے اور کس کو ہمت مردانہ کہتے ہیں

تمہاری زلف پیچاں میں رہا کیونکر دل وحشی
تڑا لے جائے جو زنجیر اُسے دیوانہ کہتے ہیں

معاذ اللہ ترا حسن تیری بزم عشرت میں
یہ وہ محفل ہے جسمیں شمع کو پروانہ کہتے ہیں

یہاں تو جان تک دے دی نظرؔ پاداشِ الفت میں
مگر بیداد گر باقی ابھی جرمانہ کہتے ہیں

نظرؔ لکھنوی

چاند

از منشی جگدیش سہائے سکسینہ بی۔اے ایل ایل بی

اے صدرِ بزمِ انجم، اے ماہِ عالم آرا — تیری جبیں سے شانِ فطرت ہے آشکارا
صہبائے حسن تیرے، ساغر میں جلوہ گر ہے — افلاکِ اخضری پر تو جنّتِ نظر ہے
رونق ہے تیرے دم سے دنیا کی انجمن میں — یکساں ہے نور تیرا ویرانہ و چمن میں
راتوں کو چاندنی کا تیری عجب سماں ہے — آبِ حیات گویا ظلمات میں رواں ہے
قدرت کے جو مناظر سورج کی روشنی میں — کچھ شوخ ہو گئے تھے آئینِ دلبری میں
شرم و حیا کا تو نے ان کو سبق دیا ہے — زیرِ نقابِ سیمیں اب شوخیٔ ادا ہے

مدّت سے ضو فشاں تو انجم کے درمیاں ہے — ہر خاص و عام تیرے جلوے سے شادماں ہے
قلب و جگر ہیں قرباں تیری چمک دمک پر — پیغامِ عیش لے کر آیا ہے تو فلک پر
کرتے ہیں نغمہ خوانی پیر و جواں چمن میں — مصروفِ میکشی ہیں عشاق انجمن میں
فطرت کا رازداں بھی مدہوش ہو رہا ہے — جلوہ کسی کا تیرے ساغر میں دیکھتا ہے

تو شاہدِ ازل کی تابندہ آرسی ہے — پرتو سے حُسن کے جو مبہوت ہو گئی ہے
یا بحرِ اخضری میں گردابِ نور ہے تو — جامِ جہاں نما ہے یا کوئی حور ہے تو
برقع کو جو اٹھا کر رخسارہ مبیں سے — سیرِ چمن کو نکلی بُرجِ زمرّدیں سے

ظلمت ربائے عالم تیری تجلیاں ہیں — رانی ہے حُسن کی تو انجم سہیلیاں ہیں
دیرِ فلک میں کوئی دیوی ہے جلوہ گستر — پوجا کے واسطے ہیں روشن چراغِ اختر
یا رقص کر رہا ہے طاؤس بوستاں میں — یا طائرِ بہشتی ہے دامِ کہکشاں میں
جس کے دلِ حزیں میں پنہاں ہیں داغِ حسرت — جس کے نصیب میں ہے سوزِ مدامِ فرقت
تڑپا رہا ہے جس کو فردوس کا نظارا — طوبیٰ کی شاخِ زرّیں۔ تسنیم کا کنارا

دَورِ حیات

(از پنڈت آنند نرائن مُلّا، ایم۔اے، ایل ایل، بی)

(۱)

دورِ گردوں کو مری مرضی پہ چلنا چاہیئے
اُس کو میرے ہر اشارے پر بدلنا چاہیئے

آفتابِ زندگی دنیا ہے جس کی منتظر
اُس کو میرے مشرقِ دل سے نکلنا چاہیئے

مستحق ہو جائیگی پھر زیست کہلائے گی زیست
پہلے میرے شوق کے سانچے میں ڈھلنا چاہیئے

خونِ دل کا جوشِ ارماں میں تقاضا ہے یہی
داستانِ طور کی سُرخی بدلنا چاہیئے

پھر خزاں آئے تو آئے لیکن اے بادِ بہار
ایک دن شاخِ تمنا کو بھی پھلنا چاہیئے

چاہے پھر بہ جائے اسکے ساتھ خونِ زندگی
دل میں جو کانٹا چُبھا ہے وہ نکلنا چاہیئے

شمع کی صورت اجل آئے تو جوشِ زیست میں
اپنے جلووں کی فراوانی سے جلنا چاہیئے

زندگی اُسکی ہے خطروں میں کٹے جسکی حیات
موت کی آغوش میں ہستی کو پلنا چاہیئے

بزمِ ہستی آرزوؤں پر مری تنظیم ہو
میرے پیمانے سے ہر میکش کو مے تقسیم ہو

(۲)

دل جلا کر سوزِ دل دنیا کو دکھلانے میں ہے
لطف جینے کا تڑپنے اور تڑپانے میں ہے

کہہ گیا پروانۂ جانبازِ رازِ زندگی
شعلۂ ہستی میں جلکر خاک ہو جانے میں ہے

جوئے شیرِ آرزو ہر دل میں ہے۔ لطفِ حیات
اپنی جاں تک کوہکن بنکر اُسے لانے میں ہے

سُونگھ کر کوئی مسل ڈالے تو یہ ہے گُل کی زیست
موت اُسکے واسطے ڈالی میں کُمھلانے میں ہے

ہاں، سزا دے اِس خطا پر بھی خدائے حشر تو!
مجھکو اک خط داستانِ جرم دُہرانے میں ہے '

شاہراہِ عقل و دیں بیشک ہے بے خوف و خطر | ہاں مگر لطفِ سفر اس سے بھٹک جانے میں ہے
اشک پی جانے میں لذت ہے مگر اتنی کہاں | جو انھیں نوکِ مژہ تک لاکے ٹپکانے میں ہے
چاندنی دل کی، خرد کی دھوپ میں کھلتی نہیں | نور تاروں کا چراغِ مہر بجھ جانے میں ہے
پیاس شربت سے بجھانی ہے تو جا دیر و حرم | ہاں مگر جو چیز صہبا ہے وہ میخانے میں ہے

نورِ ہستی سامنے ہے چشمِ دل عریاں تو کر
ایک بار او ڈرنے والے، جرأتِ عصیاں تو کر

(۳)

وہ ارادے سب ترے جوشِ فراواں کیا ہوئے | اپنی دنیا خود بنا لینے کے ارماں کیا ہوئے؟
زیست اِ ظالم زیست نے اِک ایک کر کے چن لئے | میری اُمیدوں کے وہ گلہائے خنداں کیا ہوئے؟
گوشۂ داماں تلک پہونچے فقط دو چار اشک | وہ متاعِ شوق کے لعلِ بدخشاں کیا ہوئے؟
جگمگاتی تھی کبھی اپنی بھی دنیائے خیال | ہائے وہ چشمِ تصوّر کے چراغاں کیا ہوئے؟
درد بڑھتا ہی گیا عمرِ رواں کے ساتھ ساتھ | درد کو درماں بنا لینے کے ساماں کیا ہوئے؟
جہدِ ہستی نے نہ دی فرصت کہ پڑھ لیں ایک شعر | حفظ تھے جو دل کو وہ دیواں کے دیواں کیا ہوئے؟
چار ہی دن میں ہوا تبدیل عنوانِ سخن | اے زبانِ عشق تیرے عہد و پیماں کیا ہوئے؟
کچھ گلِ پژمردہ باقی ہیں فقط اب یادگار | وہ اُمنگوں کے پھلے پھولے گلستاں کیا ہوئے؟
ایک صحرا سی نظر آتی ہے ہر سو زندگی | وہ فریبِ آرزو کے کاخ و ایواں کیا ہوئے؟
ہمتِ جوشِ جوانی بن گئی اب مصلحت | کیا ہوئے دنیا سے وہ لڑنے کے پیماں کیا ہوئے

خونِ دل کی کیفِ مستی میں روانی اور ہے
اصلِ ہستی اور ہے خوابِ جوانی اور ہے

نستعلیق ٹائپ

(از مسٹر سلیم جعفر)

میرا ایک مضمون بعنوان بالا "زمانہ" بابت مارچ ۱۹۳۳ء میں شائع ہوا تھا۔ اس میں نستعلیق کا ٹائپ ڈھالنے کی اُن کوششوں پر ایک نظر ڈالی گئی تھی جو اُس وقت تک مجھے معلوم تھیں، میں نے اثنائے بحث میں عرض کی تھی:-

"الفاظ اور اجزائے الفاظ کے درمیان فاصلہ نے صرف حسنِ خط ہی کو تباہ و برباد نہیں کر دیا بلکہ ٹائپ کی ترویج عام میں بھی بہت مانع ہوا...... ٹائپ گردشِ قلم کا ہم عناں نہیں ہو سکتا۔ قلم اجزائے الفاظ حتیٰ کہ الفاظ کے درمیان بھی بے وجہ فاصلہ نہیں چھوڑتا اور ضرورت ہو یا کاتب کے شعورِ حسن کا تقاضا تو وہ حرف پر حرف اور لفظ پر لفظ لکھ دیتا ہے۔ ٹائپ کو یہ بات کہاں نصیب......"

اِس مضمون کی اشاعت کے بعد مسٹر ایس۔ ایچ۔ قریشی نے اپنا ٹائپ پیٹنٹ کرا کے اُردو خواں دُنیا کی قدردانی کے لئے پیش کر دیا۔ جنوری ۱۹۳۶ء میں جب شرفِ نیاز حاصل ہوا ہے تو لہجۂ گفتگو کامیابیٔ ایجاد کی مسرت سے لبریز تھا لیکن تجارتی پہلو سے ناکامی کا گلہ زیرِ لب بھی اس میں موجود تھا۔ موصوف نے اس وقت مجھے چند نمونے دیے جن کی نقل ہدیۂ ناظرین ہے۔ (ملاحظہ ہو نمونہ جات صفحہ ۱۵۴)

قریشی صاحب کا ٹائپ حسن میں تحریرِ کلک کی ہمسری کر رہا ہے۔ اس سے زیادہ خوبصورت کوئی خوشنویس بھی شاید ہی لکھ سکے اور اگر کوئی خوشنویس فوقیت کا مدعی نکل بھی آئے تو اس کے کمال سے مدد لیکر ٹائپ ڈھالا جا سکتا ہے۔ لفظوں اور حرفوں کے درمیانی فاصلہ کا قصہ بھی بہت کچھ پاک ہو گیا ہے۔ لیکن ابھی تھوڑی بہت کسر باقی ہے۔ دیکھئے پہلی سطر میں لفظ دوزخ کی خ اپنے سے پہلے حرف ز سے کس قدر دُور جا پڑی ہے۔ کاپی نویس ہرگز اس میں اتنا فاصلہ روا نہ رکھے گا۔ اور اگر وہ روا بھی رکھے تو لفظ کی خوبصورتی میں ضرور اس سے فرق آتا ہے۔ دوسری سطر نہایت ہی خوشخط ہے لیکن لفظوں کے درمیان کے فاصلے ضرور اس کے حسن پر اثر انداز ہیں۔ تیسری سطر خاصی خوبصورت ہے مگر چوتھی سطر پھر مذاقِ صحیح پر گراں ہے۔ اس ٹائپ میں لفظ پر لفظ نہیں لکھا جا سکتا ہم

سلسلہ کے لئے ملاحظہ ہو صفحہ ۱۵۴

قریشی صاحب کے ٹائپ کے چند نمونے جنکا حوالہ پچھلے صفحہ پر دیا گیا ہے

نمبر ۱

خوف دوزخ عذاب ذات ضا

نمبر ۲

ہوئے ٹائپ میں جب سب کو

نمبر ۳

مبادا کوئی نادان دھوکہ دے یا حاسد افتری

نمبر ۴

کتاب نوٹ اور ٹائٹل سب کی

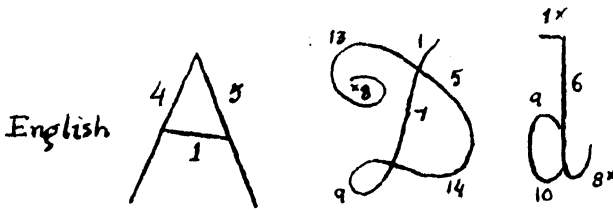
صفحہ ۱۵۳ کی عبارت سے آگے

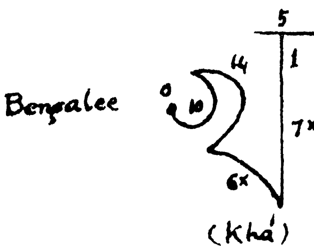
یہ ناممکن ہے۔ باوجود اِن تمام باتوں کے مسٹر قریشی کو داد نہ دینا ظلم ہے۔ وہ اس کے ہر لحاظ سے مستحق ہیں اور ہر بہی خواہ اُردو کو انھیں دریا دلی سے مبارکباد دینی چاہیئے۔

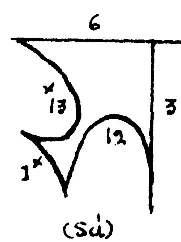
اتفاق سے حال ہی میں میرا ایک ایسے صاحب سے ملنا ہوا جنھوں نے نستعلیق ٹائپ تیار کیا ہے اور دعویٰ کرتے ہیں کہ اُن کی ایجاد میں وہ دونوں عیب نہیں ہیں جن کا میں سطور بالا میں اشارہ کرچکا ہوں اور اس طرح انھیں اُردو کی حقیقی خدمت کا موقع مل گیا ہے۔ یہ صاحب

مسٹر لال بہاری چٹرجی بی۔ اے ہیں۔ اگرچہ آپ دیگر بہی خواہانِ اُردو سے مل کر اُن سے اپنی ایجاد
کا حال بیان کر چکے اور اس کے علمی پہلو سمجھا چکے ہیں، لیکن میرے خیال سے ابھی تک اُن کی ایجاد
کی قدر و قیمت پر بحث نہیں کی گئی، اور میں اس کی نسبت اپنی رائے کا ظاہر کرنا اگر کسی اور وجہ سے
نہیں تو محض اس لئے ضروری سمجھتا ہوں کہ یہ ٹائپ میرے اعتراضوں کا جواب شافی ہے۔ بشرطیکہ
ان کا دعویٰ پایۂ ثبوت کو پہنچ جائے۔

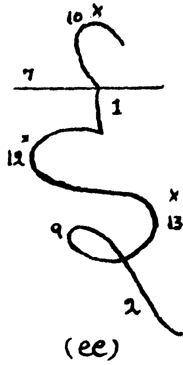
مسٹر چٹرجی نے ایک ہی طرح کے لیکن لمبائی چوڑائی میں مختلف سات ٹکڑے اُردو کے حرف
ل کے سے بنا کر ہر ٹکڑے کو اس طرح دو حصوں میں تقسیم کیا ہے کہ جس سے اس حرف کا ایک
حصہ یعنی الف اپنے دوسرے حصہ یعنی دائرہ سے جو اُلٹے نون سے بہت ملتا جلتا ہے، الگ ہو جاتا
ہے۔ اس طرح کل حروف تہجی صرف چودہ ۱۴ ٹکڑوں سے بنائے ہیں۔ ان چودہ ٹکڑوں کے علاوہ
ایک پندرھواں ٹکڑا اور ہے جو نقطے کا کام دیتا ہے۔ جہاں تک حروف بنانے کے سامان کا تعلق
ہے کل کائناتِ ایجاد یہی ہے۔ لیکن یہ ٹکڑے بذاتِ خود کوئی معنی نہیں رکھتے۔ انھیں کسی خاص
حرف کی شکل نہیں کہہ سکتے۔ یہ محض مٹی کا ایک پتلا ہیں جن میں روح پھونکنی پڑتی ہے، یا فلسفیوں
کا ہیولا ہیں جو عوارض کے ماتحت شکل ہائے گوناگوں اختیار کر لیتے ہیں۔ چونکہ یہ ٹکڑے کسی زبان کے
خاص حروف تہجی سے تعلق نہیں رکھتے اس لئے موجد نے ان میں ایک وصف یہ پیدا کر دیا ہے کہ ان
سے چاہے جس زبان کے حرف بنائے جائیں، اور یہی نہیں بلکہ ان سے تصویریں بھی بنائی جا سکتی ہیں
جیسا کہ نمونہ مندرجہ ذیل سے ظاہر ہے:۔



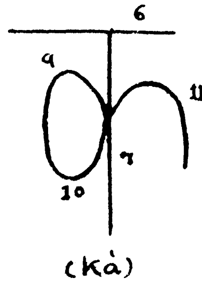




(Hindi)

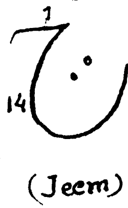


(ee)

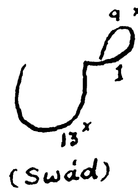


(Kȧ)

(Urdu)

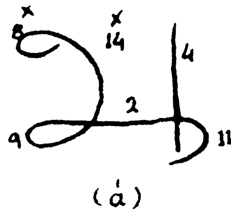


(Jeem)

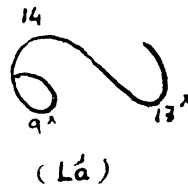


(Swád)

Tamil



(á)

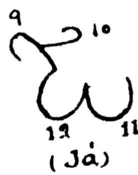


(Lá)

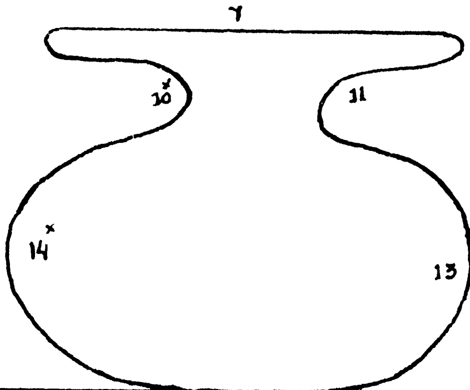
(Telugu)

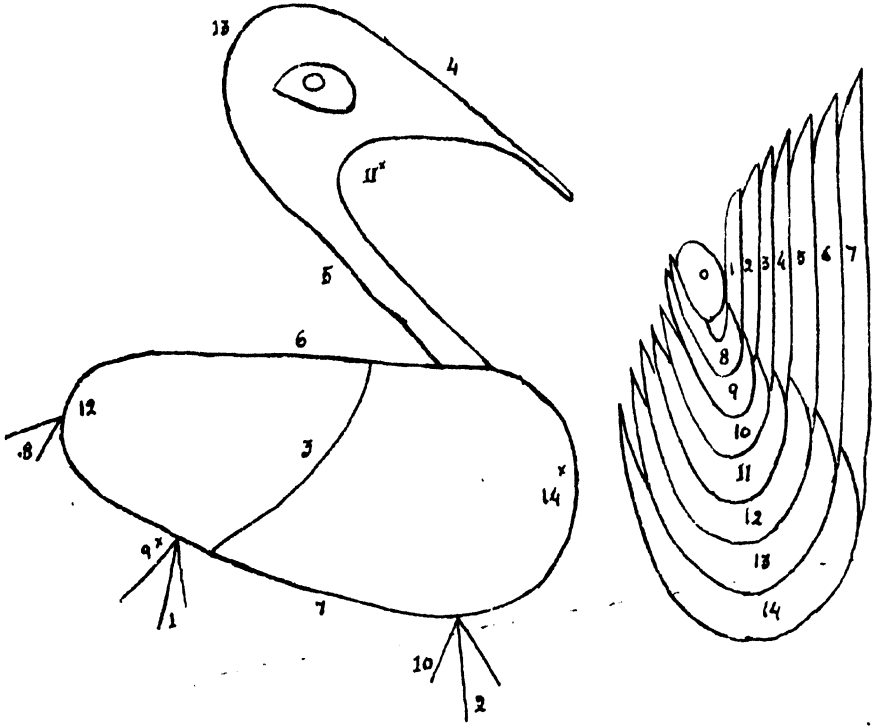


(ȧ)



(Já)





لیکن اس منزل تک یہ ایجاد کوئی قابل قدر چیز نہیں۔ گو مسٹر چٹرجی اس سے ناواقف ہوں لیکن اُن سے پہلے ایک اور بھی خواہ اُردو بچوں کو حروف تہجّی سمجھانے کے لئے اپنے قاعدہ میں کہہ چکا ہے کہ صرف آٹھ تنکوں سے بچوں کو ساری ابجد سکھائی جا سکتی ہے۔ جناب شیخ چاند بھائی صاحب بی اے اپنی تالیف "رہنمائے تعلیم یعنی سہل آموز اُردو قاعدہ" میں اس غرض کے لئے حرفوں کو اس طرح کا بناتے ہیں:-

ا ب ج د س

ص ط ع ف ق

ک ل م ن و ہ ی

اب اگر غور سے دیکھا جائے تو ا۔ ب۔ ج۔ د۔ ر۔ ک۔ ل۔ ن۔ ی سیدھے تنکوں سے بن جاتے ہیں۔ س کا سر (۳) دو تنکوں کو موڑنے سے بنتا ہے۔ ص کے سر (ص) کے لئے ایک تنکا چاہیئے۔ ط کے لئے ایک سیدھا اور ایک مڑا ہوا تنکا کافی ہے۔ ع کے سر کے لئے ایک الگ مڑا تنکا درکار ہے۔ ف۔ ق کے سروں کے لئے تنکے موڑنے پڑیں گے۔ ہ ایک تنکے سے بن جائیگی، اور نقطے کے لئے ایک تنکے کا ذرا سا سرا چاہیئے۔

یہ حرف کیسے ہی بھدے اور بھونڈے کیوں نہ ہوں لیکن اصل کی طرف رہنمائی کرتے ہیں چونکہ شیخ صاحب کا مقصد انھیں سے پورا ہوجاتا تھا، انھوں نے خوشنمائی کا خیال ہی نہ کیا، اگر وہ چاہتے تو خوبصورت حرف بھی بنا سکتے تھے۔ مثلاً دائرہ کا ایک تنکا مقرر کردیتے جو دائرہ کی طرح مڑا ہوا ہوتا۔ انھوں نے شاید اس لئے ایسا نہیں کیا کہ پھر بچوں کو مڑے مڑائے تنکے دینے پڑتے۔ ان بدصورت حرفوں میں انھیں تنکوں کو بہت کم موڑنا پڑتا ہے اور وہ بہت جلد اس کو سمجھ اور پڑھ سکتے ہیں۔

مسٹر چٹرجی کے ٹکڑے نسبتہً خوبصورت ہیں، ان کو ہر جگہ اور جس ہیئت وصورت میں چاہیں رکھ سکتے ہیں۔ چونکہ لیٹر پریس کے ٹائپ کی طرح باڈی (body) پر فیس (face) نہیں ہے بلکہ ہر ٹکڑا محض فیس ہی فیس ہے اس لئے حرفوں یا لفظوں کے درمیان فاصلے کا مسئلہ خود بخود حل ہوگیا۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی ممکن ہوگیا کہ حرف کے اوپر حرف یا لفظ کے اوپر لفظ رکھدیا جائے، جیسا کہ اس شعر سے ظاہر ہے جو انھیں ٹکڑوں سے بنایا گیا ہے۔

اے کبر کشتی از غبارِ راہ جوگان
مضطرب حال وگردان من سرگردان ترا

جیسا کہ میں سطور بالا میں عرض کرچکا ہوں ایجاد اس منزل تک قابل اعتنا نہیں ہے۔ کیا کمپوزیٹر ان ٹکڑوں کو اٹھا اٹھا کر لفظ بناتا رہیگا۔ اگر بناتا رہیگا تو کس چیز میں۔ کیا لیٹر پریس کے کمپوزیٹر کی طرح اس کے ہاتھ میں بھی اسٹک (stick) ہوگی اور وہ ان ٹکڑوں کو اس میں جمع کرتا رہے گا۔ کیا اس ایجاد کو بھی چیس (Chase) میں ویسے ہی بند کرنا پڑے گا۔ جیسے کہ لیٹر پریس میں بند کرنا پڑتا ہے۔ نہیں، اس ایجاد سے کام لینے والا دوسری تیسری انگلش ریڈر تک پڑھا ہوا ہوگا

بلکہ اس کی تعلیم اس سے کہیں زیادہ ہوگی۔ اسے ایک ایسی مشین پر کام کرنا پڑیگا جو ٹائپ رائٹر (Type-writer) کی سی ہوگی اور جسکی کی (Key) کو چھوتے ہی ایک ٹکڑا اپنی جگہ سے نکل کر ایک رولر (Roller) پر جس جگہ اور جس فاصلہ پر آپریٹر (Operator) چاہیے گا جا کر چپک جائیگا۔ اور جب یہ رولر ٹائپ سے بھر جائیگا تو اُسے اُٹھا کر ایک اور مشین میں لگا دیگا جو اسے چھاپے گی۔ اس مشین کو انکر (Inker) کی ضرورت نہیں ہے۔ اس میں اس قسم کا انتظام و اہتمام کیا گیا ہے کہ وہ خود روشنائی کو گھونٹ کر رولر پر لگا دیگی۔ مسٹر چیٹرجی کا کمال ان ٹکڑوں کا ایجاد کرنا نہیں ہے بلکہ ان سے کام لینے کے لئے دو ایسی مشینوں کا ایجاد کرنا ہے جن میں سے ایک کا کام ٹائپ کو سیٹ (Set) کرنا اور دوسری کا چھاپنا ہے۔ اس ٹائپ کو ڈسٹری بیوٹ (Distribute) کرنے کے لئے بھی ایک سہل طریقہ ایجاد کیا ہے۔

چیٹرجی کی باتوں سے معلوم ہوتا تھا کہ مشینیں ابھی تک قوۃ سے فعل میں نہیں آئی ہیں یعنی پرزوں کے نقشے وغیرہ سب تیار کر لئے گئے ہیں اور ہر پرزہ کے فعل نیز دوسرے پرزوں سے اس کے تعلق کو خیال وذہن کے ذریعہ جانچ لیا گیا ہے۔ مجھے ان مشینوں کے صرف اس حالت کے نقشے دکھائے گئے ہیں جو اُن کے تیار ہو جانے پر نظر آئے گی۔ ان دونوں نقشوں سے کسی پرزہ یا اس کے کسی فعل کا کوئی اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ یوں سمجھئے کہ دو مکانوں کے بیرونی رخوں کی دو تصویریں ہیں، جن سے اُن کی کسی قسم کی اندرونی حالت کا پتا نہیں چلتا، مگر مجھے یقین ہے کہ چیٹرجی کی یہ مشینیں محض تصویر خیالی کا رتبہ نہیں رکھتیں۔ انھوں نے ضرور کسی نہ کسی صورت میں انھیں تیار کر کے آزمائش کے بعد یہ دعویٰ کیا ہے۔ اور یہ اُن کا بخل نہیں ہے جو انھیں اس نمونے کو منظر عام پر لانے سے مانع ہے بلکہ قانون پیٹنٹ کی دقتیں ہیں جو عناں گیر ہیں اور وہ حقیقت پر اشتباہ کا پردہ ڈالتے ہیں۔ اسی لئے میں ان مشینوں پر مفصل اور حقیقی رائے زنی نہیں کر سکتا۔ اور میں نے اُن سے صاف صاف کہہ دیا کہ آپ کا دعویٰ اس وقت تک بے دلیل رہیگا جب تک آپ مشینیں تیار کر کے اسے ثابت نہ کر دیں۔ لوگ آپکی بات اس کان سنیں اور اُس کان اڑا دیں گے۔ اس پر انھوں نے ایک قہقہہ لگا کر کہا۔ مجھے بیس برس دماغ سوزی کرتے اور اپنے روپے کو آگ لگاتے گزر گئے۔ سر دست وسائل میں اس قدر گنجائش نہیں کہ دو ہزار کا بار اور اُٹھا سکوں اس لئے معترضین کا منہ بند کرنے کو اس وقت کا منتظر ہوں کہ پھر گھر پھونک کر تماشا دیکھ سکوں کیا یہ زہر خند بھی قانون پیٹنٹ کی دقتوں کی صدائے بازگشت نہ تھا؟

نوائے سرمدی

از رگھوپتی سہائے فراقؔ گورکھپوری ایم۔ اے

کچھ بھی عیاں نہاں نہ تھا، کچھ بھی زماں مکاں نہ تھا
دیر تھی اِک نگاہ کی پھر یہ جہاں جہاں نہ تھا

ساز وہ قطرے قطرے میں۔ سوز وہ ذرّے ذرّے میں
یاد تری کسے نہ تھی درد ترا کہاں نہ تھا

عشق کی آزمائشیں اور فضاؤں میں ہوئیں
پاؤں تلے زمیں نہ تھی سر پہ یہ آسماں نہ تھا

تیری خوشی کہ یاد رکھ تری خوشی کہ بھول جا
تجھ سے ذرا بھی بدگماں عالمِ رفتگاں نہ تھا

ایک کو ایک کی خبر منزلِ عشق میں نہ تھی
کوئی بھی اہلِ کارواں شاملِ کارواں نہ تھا

عشق حریمِ حُسن میں اپنے سہارے رہ گیا
صبر کا بھی پتہ نہ تھا ہوش کا بھی نشاں نہ تھا

غفلتِ حسن جاگ اُٹھی اور زبان عشق پر
آہ نہ تھی فغاں نہ تھی چہرے سے غم عیاں نہ تھا

کس کے حواس تھے بجا کون تھا اپنے ہوش میں
وقتِ بیانِ غم کوئی مائلِ داستاں نہ تھا

خلوتیانِ راز سے عالمِ وصلِ یار پوچھ
تھا نہ حجاب حسن بھی عشق بھی درمیاں نہ تھا

جلوۂ تاب آزما قایلِ عشق ہو گیا
تھی نہ صدائے الحذر نعرۂ الاماں نہ تھا

سوز نہاں میں وہ قرار قلب تپاں میں وہ صفا
شعلہ تو تھا تڑپ نہ تھی آگ تو تھی دھواں نہ تھا

دیکھ فضائے دہر کو کیفِ عدم سے بھر دیا
اے دلِ درد آشنا مٹ کے بھی میں کہاں نہ تھا

دورِ حیاتِ محض تھا اس کی حریم راز میں
کیف و اثر کا ذکر کیا زیست کا بھی نشاں نہ تھا

عشق نے اپنی جان کو روگ کئی لگا لئے
ہجر و وصال امید و بیم کون وبالِ جاں نہ تھا

اب نہ وہ پرسش و کرم اب وہ چشم آشنا
شکوۂ عشق بر طرف تجھ سے تو یہ گماں نہ تھا

پھر بھی سکونِ عشق پر آنکھ بھر آئی بار ہا
گو غمِ ہجر بھی فراقؔ کچھ غمِ جاوداں نہ تھا

کھیلتے کودتے گزرتی تھی زندگی تھی عجیب بچپن کی
دل میں تھے ولولے امنگوں کے رنج کو رنج جانتے ہی نہ تھے
خواہشیں دل کی بھولی بھالی تھیں بچپنے کی ضدّیں نرالی تھیں
روٹھ جاتے خوشی کے موقعہ پر رونے لگتے ہنسی کے موقعہ پر
کبھی خوش ہوتے تھے ملالوں پر کبھی ہنستے تھے رونے والوں پر
سرحدِ معصیت سے دُور تھے ہم اپنی منزل میں بے قصور تھے ہم
نیک و بد کچھ نہ تھا ہمیں معلوم ہم تھے دنیا کی آنکھ میں معصوم
اب وہی ہم ہیں اور غم و آلام زندگی ہو رہی ہے تلخ و حرام
ہائے بچپن کی زندگی نہ رہی غم ہی غم رہ گیا خوشی نہ رہی

یا تو قیدِ حیات کٹ جائے
یا وہی زندگی پلٹ آئے

جذباتِ بسمل

(جناب بسمل الہ آبادی)

روبروِ داورِ محشر کے وہ رسوا نہ ہوا رہ کے دنیا میں بھی جو طالبِ دنیا نہ ہوا
عشق جس ڈھنگ میں ہے اُس نے اٹھائی ذلّت حُسن جس رنگ میں ہو وہ کبھی رسوا نہ ہوا
کون سمجھائے مجھے فلسفۂ مرگ و حیات آج تک حل یہ کسی سے بھی معمّا نہ ہوا
دم بخود موسمِ گل میں ہیں اسیرانِ قفس ان کو سودا بھی باندازۂ سودا نہ ہوا
میں کچھ ایسا رہا بدمست مئے نابِ الست زندگی بھر مجھے اندیشۂ فردا نہ ہوا
میری ہستی میں تھی دراصل قضا کی ہستی نیستی کیا ہے یہ احساس بھی پیدا نہ ہوا

حضرتِ نوح کا شاگرد ہوں لیکن بسملؔ
مجھ کو طوفان اُٹھا دینے کا دعویٰ نہ ہوا

صہبائے ہند کے چند جام

(سید ظہیر الدین صاحب ایم۔اے۔ ایل ایل بی (علیگ) وکیل جون پور)

اُردو دنیائے صحافت میں اُردو کے شعرائے گذشتہ اکثر زندہ نظر آتے ہیں اور اُردو شاعری کو بسا اوقات مختلف حیثیتوں سے نمایاں کیا جاتا ہے لیکن افسوس کہ ملک کی قدیم ترین زبان بھاشا اور اس کے سخن گو حضرات کے تذکروں کی صدائیں اس فضا میں کبھی سنائی نہیں دیتیں۔ حقیقت در حقیقت یہ عام بد مذاقی اُردو اہلِ قلم کے دامن معلومات و قدردانی پر ایک بدنما داغ ہے۔ اگر حضرت نیاز فتحپوری اور بعض اہلِ نظر نے ضمناً شعر و شعراء بھاشا کا ذکر اپنی موقر تصانیف میں نہ کیا ہوتا تو اُردو عالم تصنیف و تالیف ان جواہر پاروں سے مفلس محض اور اُردو پبلک بھاشا کی ایک سرسری جھلک سے بھی قطعی محروم رہ جاتی۔

شاید اسی عام عدم توجہی کا باعث ہے کہ ہماری شاعری یا تو عرب و فارس کی ملکی خصوصیت سے لبریز ہے یا یورپین چاشنی سے ہمکنار ہو کر اب ترقی یافتہ کہلانے لگی ہے۔ حالانکہ اگر قدیم ملکی اجزا ٹٹولے جاتے تو طرزِ ادا۔ تشبیہات۔ تلمیحات اور استعارات کا اسقدر زبردست دیسی سرمایہ ہاتھ آجاتا کہ ہمیں بدیسی ساز و سامان سے نگارِ اُردو کی آرایش و زیبایش کی ضرورت ہی پیش نہ آتی اور مغربی نامانوس و خلاف مذاق کیفیات کی پیروی کئے بغیر ہم اپنی شاعری کو اس پایہ پر پہونچا دیتے کہ جو آج شیکسپیر۔ ملٹن۔ گوئٹے اور شیلی وغیرہ کی خوشہ چینی کے بعد میسر نہیں۔

میرا یہ مقصد نہیں ہے کہ اُردو شاعری ملکی خصوصیات سے قطعی معرّا اور ممالک خارجہ کی ادبی کیفیات کا خوشگوار مرکب ہے کیونکہ اسمیں جا بجا ملکی آثار و علامات پائے جاتے ہیں۔ اور بیرونی خیالات دیسی سانچہ میں ڈھل کر مانوس ہو گئے ہیں۔ تاہم ملکی شاعری کی کیفیات کو اُردو میں حل کرنے کے سلسلہ میں سوادِ اعظم اُردو کو دخل نہیں۔ بلکہ یہ چندان قدیم مسلم شعرا کی محنتوں کا طفیل ہے جنھوں نے بھاشا میں اُستادانہ شان پیدا کی یا چندان قدیم ہندو شعرا فارسی کے جگر کاویوں کا صدقہ ہے جنھوں نے فارسی کے درخت میں ہندی قلم لگائی تھی۔ عام طور پر کبھی اس طرف توجہ خاص سے کام نہیں لیا گیا۔

کاش اُردو دنیا نے ملکی چند در چند پراکرتوں مثلاً بنگالی۔ مرہٹی۔ اوڑیا۔ تامل۔ تلنگی۔ مارواڑی وغیرہ میں سے صرف قدیم ترقی یافتہ زبان برج بھاشا ہی کو بہ نگاہ غائر مطالعہ کیا ہوتا تو وہ فرسودہ خیالات اور پامال مضامین کے نئے نئے قالبوں میں ڈھالنے اور اسی قسم کی دوسری جدت طرازیوں کے بجائے بے شمار نئے خیالات انوکھے مضامین نئے طرز ادا اچھوتی تشبیہوں جدید استعاروں اور رنگارنگ جدتوں سے اُردو شاعروں کو مالا مال کر کے برادران وطن کیلئے ایک ایسی وجہ مشترک پیدا کر چکی ہوتی جو انکی نظر میں اُردو کو اسقدر کھٹکنے نہ دیتی۔ اس کمی اور کوتاہی پر جس قدر خامہ فرسائی کی جائے کم ہے۔ اس لئے صرف اسی اشارہ پر اکتفا کرتے ہوئے میں اولاً بھاشا کی مختصر خصوصیات شاعری نذر ناظرین کرتا ہوں اور اس کے بعد صہبائے ہند کے چند جام پیش کرونگا۔

خصوصیات بھاشا

(۱) بھاشا میں صریحی طور پر عورت مرد سے اور مرد عورت سے اظہار عشق کرتا ہے اور عموماً عشق جائز یعنی میاں بیوی سے اور بی بی میاں سے اس زبان میں اُردو فارسی کی طرح ضمائر کا مصلحتی استعمال اور طرز ادا سامعین کو امرد پرستی کے مغالطہ میں نہیں ڈالتا۔

(۲) تخاطب عورت کی جانب سے ہوتا ہے۔

(۳) سلاست۔ سادگی۔ لوچ اور ترنم کی حیثیت سے یہ زبان روح تغزل ہے۔

(۴) اس زبان کی تشبیہات باوجود ندرت کے عام فہم ملکی محسوسات کے مطابق اور ایسی ہوتی ہیں کہ سامع کا ذہن آسانی کے ساتھ ان کی طرف منتقل ہو جائے۔ نہ بعض ہمارے شعراء اور شعراء فارس کی طرح انکی تشبیہیں اور استعارے اپنی غرابت میں اسقدر بلند اور برتر ہوتے ہیں کہ سننے والا ان کے سمجھنے میں کوشش کرتے کرتے اپنا بلیوں خون خشک کر دے اور نتیجہ میں کوہ کندن وکاہ برآوردن کے سوا ہیچ۔ بعض اوقات اتنی بھی لذت ہاتھ نہیں آتی جو عالم فکر میں جلے ہوئے خون کی کمی کو اپنی دل خوش کن مسرتوں سے پورا کر دے۔

(۵) حسن و انداز بیان کی بدولت یہ زبان دستاویز تاثیر ہے۔

(۶) اس کی شاعری دائرہ فطرت سے بال برابر بھی متجاوز نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تیر تاثیر آئینہ تمدن اور جام جہاں نمائے ہند ہے۔

قبل اس کے کہ میں چند جام پیش کروں اس امر کا اعتراف کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ میں زبان بھاشا کا عالم نہیں ہوں لیکن چونکہ بھاشا کی شاعری سے میری طبیعت خاص طور پر متاثر ہوئی ہے اس لئے شعرا بھاشا کے کلام کو دیکھنے اور سمجھنے کی جستجو ایک عرصہ تک رہی اور چند زبان دان بھاشا

کی امداد سے بھاشا کی شاعری کے نکات سمجھنے لگا ہوں لہذا اگر کوئی نقص یا غلطی میرے سمجھنے میں رہ گئی ہو یا اگر کسی دوہے کا مطلب بیان کرنے سے قاصر رہا ہوں تو اس فن کے ماہرین میری غلطیوں کو میری بے بضاعتی پر محمول کر کے نظرانداز فرمائیں[۱]

جام اول

ہجر

پہلا گھونٹ:- دوہا- آج چندر ما دوج ہے جگ چتوت چہوں اُور
ہمرے اور وا ستر کے نین بہئے اک ٹھور

ترجمہ:- آج چاند نکلنے والا ہے اور ساری دنیا اسکو دیکھے گی (ممکن ہے کہ) میری اور میرے پیارے کی نگاہیں ایک جگہ ہو جائیں یعنی وہ بھی چاند دیکھتا ہو اور میں بھی-

خیال فرمائیے کہ ایک عورت جس کا شوہر پردیس میں ہے اور جلد اس کے آنے کی کوئی اُمید نہیں- چاند کو واسطہ قرار دیکر کس طرح اُس سے آنکھیں چار کر لیتی ہے اور اپنے دفور شوق کو کس طرح پورا کرتی ہے-

دوسرا گھونٹ:- دوہا- ارے پپہیا باورے آدھی رین مت کُوک
دھیرے دھیرے سلگتی تو کاہے دینی پھُوک

ترجمہ:- او باولے پپیہے کیوں آدھی رات کو اپنی آواز سے مجھے بیچین کر رہا ہے میں تو یونہی (فرقت کی آگ میں) آہستہ آہستہ سلگ رہی تھی تو نے اپنی "پی کہاں" کی آواز سے (کسی کی یاد تازہ کر کے) یکبارگی پھونک دیا-

اس دوہے میں پپیہے کے ساتھ باورے اور ایک مہجور بلا کے لئے آدھی رین اور سلگنے کا مفہوم کسقدر معنی خیز ہے- اور ان الفاظ میں کس قدر وسعت ہے گویا دریا کو کوزہ میں بند کر دیا ہے-

تیسرا گھونٹ:- دوہا- برست مینہ اچھیہ اتی ابن رہی جل پور
تھک تنو تو گریہ تے اُٹھت بھھورن دھور

ترجمہ:- پانی ایسا برسا ہے کہ ساری دنیا جل تھل ہو گئی ہے اے راہ گیر اگر وہ ملیں تو ان سے کہدینا کہ اس بھری برسات میں تمھارے گھر کے دروازے پر تو دھول ہی اڑ رہی تھی-

---

[۱] مجھے خصوصیات بھاشا اور چند دوہوں کے انتخاب کے ذیل میں آبحیات آزاد اور جذبات بھاشا نیاز فتحپوری سے استفادہ کرنے کا اقرار ہے-

موسم برسات جس میں کہ عاشقانہ جذبات اور بھی برانگیختہ ہو جاتے ہیں شوہر کے گھر نہ ہونے پر برسات میں دروازہ پر خاک اڑنا دردمند حالت کی کسقدر مکمل تصویر ہے۔

چوتھا گھونٹ۔ دوہا۔ کر کانپت پتیاں لکھت جل بھر آوت نین
کورو کا گج ہات دے کہہ ہی کہنا بین

ترجمہ:۔ خط لکھنے لگتی ہوں تو میرے ہاتھ کانپنے لگتے ہیں اور آنکھوں میں آنسو بھر آتے ہیں (اور خط نہیں لکھا جاتا) اے قاصد لے یہ سادہ کاغذ ہی لیجا اور جو کچھ تو دیکھ رہا ہے وہ زبانی کہدینا

اس دوہے کا مضمون نہایت نازک اور لطیف ہے۔ نزاکت یہ ہے کہ ہاتھ کانپنے اور آنکھوں میں آنسو بھر آنے کا حال پیغام میں شامل نہیں ہے۔ قاصد سے تو صرف یہ کہا گیا کہ جو حالت میری دیکھ رہے ہو وہ کہدینا۔ نامہ کی صورت میں تو صرف سادہ کاغذ ہی روانہ کیا جارہا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ جب قاصد خط کے بجائے سادہ کاغذ دیگا تو اس طرف لامحالہ یہ سوال کیا جائیگا کہ یہ سادہ کاغذ کیسا۔ اس پر قاصد خود بخود جو حالت دیکھ آیا ہے وہ بیان کردیگا۔ خیال فرمائیے کہ اس سادہ کاغذ میں کسقدر نقوشِ محبّت پنہاں ہیں۔

جام دوم

تمنّا

پہلا گھونٹ۔ دوہا۔ سجن سکارے جائیں گے اور نین مریں گے روئے
بدھنا ایسی کیجو کہ بھور کبھو نہ ہوئے

ترجمہ:۔ میرے سجن صبح کو جائیں گے اور ان کے جانے کی وجہ سے میری آنکھوں کا بُرا حال ہو جائے گا۔ خدا کرے کہ ایسا ہو کہ صبح ہی کبھی نہ ہو۔

تمنّا میں کسقدر سادگی اور خلوص ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ صبح ضرور ہوگی لیکن پھر بھی اپنے ذوق شوق میں اسے یہ نہیں سوجھتا کہ وہ ایک ایسی تمنّا کر رہی ہے جس کا پورا ہونا غیر ممکن ہے جسقدر محبت کا اظہار اس لفظ "کبھو نہ ہوئے" سے ہو رہا ہے اس کے اظہار کے لئے ایک دفتر بھی ناکافی ہے۔

دوسرا گھونٹ۔ دوہا۔ آ پیارے نین میں پلک ڈھانپ توئے لوں
ناہیں دیکھوں اور کو۔ نا توہے دیکھین دوں

ترجمہ:۔ پیارے میری آنکھوں میں آجا تاکہ میں تجھے پلک بند کرکے اپنی آنکھوں میں بٹھالوں نہ میں تیرے سوا کسی کو دیکھوں اور نہ تجھے کوئی دیکھ سکے۔

عاشق کی محبت کا فطری تقاضا یہی ہوتا ہے کہ اس کے محبوب کی طرف کوئی نظر نہ ڈالے اور وہ بھی بجز اس کے کسی کو نہ دیکھے۔ اس کیفیت کو کتنے سادہ اور دلچسپ طریقہ سے بیان کیا ہے پلکوں سے ڈھانک لینے سے دو کام کس خوبی سے لئے ہیں۔

تیسرا گھونٹ۔ دوہا:۔　کاگا سب تن کھائیو چُن چُن کھیو ماس
دو نیناں نا کھائیو۔ پیا ملن کی آس

ترجمہ:۔ اے کوّے تو میرا تمام جسم کھا لے اور سارا گوشت و پوست اپنی غذا بنا لے لیکن دونوں آنکھیں مت کھانا کیونکہ پی کے ملنے کی اُمید ہے۔

باوجودیکہ محبت میں فنا ہو چکی ہے اور گوشت پوست بھی ختم ہو چکا مگر اللہ رے تمنّا اور استقلال کہ اب بھی پیا کے ملنے کی اُمید باقی ہے مگر پیا کا دیدار آنکھ سے ہوگا۔ چنانچہ اُسے پروا نہیں گر دونوں آنکھ کے علاوہ تمام بدن کو کھا جائے فنا کی آخری منزل ارج طے کرنے کے بعد بھی ابھی تک اپنی آنکھوں سے پی کو دیکھنے کی اُمید باقی ہے۔ کس قدر کیف انگیز خیال ہے۔

جام سوم

اعجاز

دوہا:۔　نیہہ نگر ہیں درگ بیانو کے پرگٹ آئے
دوئی من کو ایک من کر دیت بہاد ٹھہرائے

ترجمہ:۔ محبت کے بازار میں آنکھیں انوکھی دَلاّل ہیں کہ دو من کو ایک من کر کے بھاؤ ٹھہرا دیتی ہیں۔

ملاحظہ فرمائیے کہ کسقدر پُر معنی دوہا ہے باوجودیکہ دو من کی چیز ایک ہی من رہ جاتی ہے لیکن پھر بھی بھاؤ طے ہو جاتا ہے اور ہر شخص ایسے سودے کا طلبگار رہتا ہے۔

جام چہارم

تشبیہات

پہلا گھونٹ۔ دوہا:۔　بھوں ڈانڑی۔ کانٹو تلک سبل پٹ۔ پُتلی باٹ
مورت تولت بترکی نیہہ نگر کے ہاٹ

ترجمہ:۔ اس کے ابرو ترازو کی ڈنڈی ہیں۔ تلک کا نشان جو الف کی طرح ماتھے پر لگایا جاتا ہے کانٹا ہے۔ آنکھیں ترازو کے پلے ہیں۔ اور پتلی بطور باٹ کے ہے۔ اس ترازو سے عورت

اپنے شوہر کی محبتؐ بازار محبت میں تول رہی ہے۔

کسقدر نادر تشبیہ ہے۔ ترازو کے لوازم کی مثال کسقدر خوبی سے دی ہے۔

دوسرا گھونٹ۔ دوہا:- ہری کنچکی کس مسی مسکی رس کے ہیر

گبست کلی گلاب کی بگست للت لکیر

ترجمہ:- ہری انگیا جو اس کے سینے پر تنگ تھی جوش جوانی کی وجہ سے مسک گئی ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گلاب کی کلی کھل رہی ہے۔ اور اس کے اوپر جو سبز پتیاں ہوتی ہیں اس کے درمیان سے سرخ لکیر ظاہر ہو رہی ہے۔

اس دوہے کی تشبیہ کا لطف وہ حضرات اٹھا سکیں گے جنہوں نے گلاب کی کلی کو کھلتے بہ نظر غور دیکھا ہے۔ اور وہی واقعی شاعر کی تلاش کی داد دے سکتے ہیں۔ عبدالرحیم خانخاناں نے بھی اسی مضمون کو ایک دوسری تشبیہ سے یوں ظاہر کیا ہے۔

تیسرا گھونٹ۔ دوہا:- رحمن انگیا نیل کی رُت میں پہنی رتیک

منو کسوٹی ہیم پر۔ دئی ہیم کی لیک

ترجمہ:- نیلی انگیا جو ہاتھا پائی میں خفیف سی مسک گئی ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے سونے کی کسوٹی پر سونے کی لکیر لگائی گئی ہے۔

کسقدر کیف آور خیال اور کیسی نادر تشبیہ ہے شاعر کی تلاش کی داد دیجئے کہ اس تشبیہ کے لئے تمام دنیا کی چیزوں کو برطرف کر کے کسوٹی پر سونے کی لکیر سے معشوق کے سنہرے رنگ کو کس خوبی سے ظاہر کیا ہے۔

جام پنجم

مبالغہ

دوہا:- بہی مدھر تا ادھر رل کر سے دینی ڈار

لائی داتوں اونکھ کی نو کھی کی مت گار

ترجمہ:- داتون (مسواک) اس کے لبوں سے ملکر شیریں ہو گئی تو اس نے ہاتھ سے گرادی اور خادمہ سے کہا کہ اونکھ کی مسواک لاکر دیدی۔

شاعر نے مسواک کو لب شیریں سے ملنے کی وجہ سے شیریں کر دیا اور ایک حسن بے خبر کے استغنا کو بھی اس دوہے میں ظاہر کر دکھایا کہ اسے یہ خبر نہیں کہ خادمہ بیچاری نے تو

مسواک ہی لاکر دی تھی لیکن یہ تو اس کے لب شیریں کا وصف تھا کہ وہ شیریں ہوگئی اور اوکھہ معلوم ہونے لگی خادمہ کا کیا قصور۔ استغنا کی کیسی اچھی مثال ہے۔

جام ششم

سادگی

پہلا گھونٹ۔ دوہا۔　جہہ رحیم تن من دیو۔ کیو ہردے میں بھون

تا سے دُکھ سکھ کہے کی رہی کتھا اب کون

ترجمہ　اے رحیم جسکو اپنا تن من دھن دیدیا اور اپنے دل میں جسکو جگہ دیدی پھر اس سے تکلیف اور راحت کا ذکر کرنا ہی کیا۔

کسقدر عالی جذبہ ہے۔ خواہ تکلیف پہونچے یا آرام۔ جب وہ دل کا مالک ہوگیا تو وہ جو چاہے کرے۔

دوسرا گھونٹ۔ دوہا۔　رحمن دھاگا پریم کا مت توڑ و چٹکا ئے

توڑے سے جوڑے نہیں۔ بیچ گانٹھ پر جائے

ترجمہ:۔　اے رحمن محبت کا رشتہ مت توڑ و کیونکہ اگر ٹوٹ گیا تو پھر جڑ نہیں سکتا اور اگر جڑا بھی تو بیچ میں گرہ ضرور پڑ جائے گی۔

ایک دقیق مسئلہ کو شاعر نے کس سادگی سے ادا کر دیا ہے۔

اس امر کی سخت ضرورت ہے کہ اُردو سے مذاق رکھنے والی ہستیاں بہت جلد ادب بھاشا کے مطالعہ کی جانب متوجہ ہو جائیں اور اس کے رنگارنگ مضامین سے گلدستۂ اُردو کو دلآویز بنانے کی کوشش کریں۔ اس طرح سے یکایک ایک محیر العقول طریقہ سے اُردو ادبیات میں ایک خاص نمایاں اور دلچسپ اضافہ ہو جائے گا جو اُس کے محاسن میں چار چاند لگا دیگا۔

رباعی

فتنے کی ندی میں ناؤ کھیتا ہوں میں　　دھوکے سے ہوا میں سانس لیتا ہوں میں

اتنے کوئی دشمن کو بھی دیتا نہیں جُل　　جتنے خود کو فریب دیتا ہوں میں

(کلیم)　　**جوش**

شباب

از جناب فطرت واسطی

مری نظر ہے جواں تیری دید کی سوگند — مرا خیال جواں ہے، اُمید کی سوگند
شباب کھیل رہا ہے، حیات کی سوگند — ابھی ہے صبح بہت دُور رات کی سوگند
ابھی تو بزم محبت سجائی ہے میں نے — ابھی تو عشق کی دنیا بسائی ہے میں نے
ابھی میں قصرِ تمنا لُٹا نہیں سکتا — ابھی میں بارِ جدائی اٹھا نہیں سکتا
مری حیات مجسم مری اُمید تمام! — مری بہار! نہ کر مجھکو رخصتی کا سلام
ابھی نہ سازِ جدائی بجانے دونگا تجھے — نہ جانے دونگا تجھے، میں نہ جانے دونگا تجھے
ابھی تو ہونے دے تکمیلِ عشق و بیتابی — ابھی تو بننے دے نظروں کو موجِ سیمابی
ابھی تو روح کو وقفِ نیاز ہونے دے — مری جبیں کو ابھی سجدہ ساز ہونے دے
ابھی وہ وقت تو آئے کہ ہوش جاتا رہے — جواں اُمیدوں کا جوش و خروش جاتا رہے

بہارِ عیش و غرورِ نشاط لے لینا
زمانہ آئے تو ہرا نبساط لے لینا

انتظار کے دن

(حضرتِ جوشؔ ملیح آبادی)

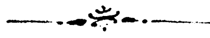
صبا ادب سے یہ کہنا کہ ہیں بہار کے دن — شراب سُرخ کی راتیں ہیں، لالہ زار کے دن
زمانہ رقص میں ہے روزگار نغمہ سرا — مگر خموش ہیں اس تیرہ روزگار کے دن
ترے خیال میں گریاں ہیں تیری یاد میں گُم — یہ ماہتاب کی راتیں یہ آبشار کے دن
فرازِ کوہ سے پھوٹے ہیں نوع بنوع چشمے — پھریں گے اب بھی نہ کیا چشم اشکبار کے دن
تجھے خبر ہو تو کیوں کر کہ کن بلاؤں میں — گذر رہے ہیں ترے شاعرِ بہار کے دن

خدا گواہ کی کاٹے سے اب نہیں کٹتیں
یہ انتظار کی راتیں یہ انتظار کے دن

(کلیم)

گورو کل یونیورسٹی

ایک مسلمان معلم کے قلم سے



دورِ حاضرہ میں جو غیر سرکاری اعلیٰ تعلیم گاہیں مشہور ہیں۔ اُن میں خصوصیت کے ساتھ ڈاکٹر ٹیگور کی "شانتی نکیتن"، جامعہ ملیہ دہلی، اور گورو کل یونیورسٹی، قابلِ ذکر ہیں۔ ہر تعلیم گاہ جداگانہ روایات اور علیحدہ تہذیب کی حامل ہوتی ہے۔ جو تعلیم گاہ کسی واحد شخص کی مالک نہیں ہوتی۔ اس کے طلباء میں بھی کوئی نمایاں انفرادیت نہیں پائی جاتی ہے۔ تعلیم کے اعلیٰ مقاصد میں سے ہے کہ طالب علم کی شخصیت کو اُبھارا جائے۔ لیکن جو تعلیم گاہ خود کسی شخصیت کی حامل نہ ہو اُس کے طلباء میں بھی یقیناً کوئی شخصیت نہیں پائی جاسکتی۔ گورو کل یونیورسٹی اُن اعلیٰ تعلیمی اداروں میں سے ہے۔ جہاں کا ماحول ایک خاص انداز رکھتا ہے۔ جہاں کی تعلیم کا جزوِ اعظم تہذیب قدیم پر مشتمل ہے۔ دراصل یہ یونیورسٹی ایک مخصوص انفرادیت کی حامل ہے۔ اور بلاشبہ یہاں کے طلباء میں ایک انوکھی شخصیت پائی جاتی ہے۔

گورو کل یونیورسٹی سورگباشی "شردھانند" جی کی مساعی جمیلہ کا نتیجہ ہے۔ اور غالباً سوامی جی ہی پہلے وہ ہندوستانی ہیں جن کے دماغ میں اعلیٰ تعلیم مادری زبان میں دینے کا خیال پیدا ہوا چنانچہ اسوقت گورو کل ہی ایسی غیر سرکاری تعلیم گاہ ہے جسمیں پانسو کے قریب طلباء تعلیم پاتے ہیں اور تقریباً ڈیڑھ لاکھ روپیہ سالانہ تعلیم پر صرف ہوتا ہے جو سب کا سب فیاض لوگوں کی سخاوت کا اثر ہے۔

سوامی جی نے اَن تھک کوششوں کے بعد ایک قطعہ آراضی حاصل کیا جہاں یونیورسٹی کی بنیاد قایم کی۔ یہ یونیورسٹی نہر گنگ کے کنارے ایک پر فضا اور صحت بخش مقام پر واقع ہے۔ یونیورسٹی کے سامنے کوہ ہمالیہ عجیب و غریب منظر پیش کرتا ہے۔ ہندوستان کا مشہور و معروف تیرتھ گاہ ہردوار یہاں سے تقریباً ۳ ½ میل کے فاصلہ پر ہے۔ ۱۹۲۴ء کے طوفانِ عظیم نے یونیورسٹی کی پرانی عمارت کو بہت نقصان پہونچایا۔ لیکن فوراً ہی چندہ کیلئے اپیل کی گئی اور عالیشان عمارت کھڑی ہوگئی۔ آراضی تقریباً سَو ایکڑ مربع ہے۔ جہاں دو آشرم بنائے گئے ہیں۔ ان میں سے ایک ابتدائی جماعتوں کے لئے وقف ہے اور دوسرے میں ثانوی اور اعلیٰ تعلیم دی جاتی ہے۔ ان دونوں آشرموں میں تین سَو سے زائد برہمچاری رہ سکتے ہیں۔ دو یگیہ شالا ہیں جن کے متعلق ایک ایک ہون کنڈ بھی ہے۔ اساتذہ

اور طلباء کے واسطے ایک علیحدہ گھاٹ بنایا گیا ہے۔ جہاں ہر صبح کو اشنان کرنا ضروری ہے۔ نہر میں کشتی رانی کا بھی انتظام ہے۔ آشرم کے کمرے نہایت نفیس بنے ہوئے ہیں۔ ہوا اور روشنی کی کافی گنجایش رکھی گئی ہے۔ ہر کمرہ میں برقی روشنی اور پانی کا اہتمام ہے۔ خس پوش اور کچے مکانات کی بجائے اب پتھر اور اینٹ کی مضبوط اور مستحکم عمارتیں تعمیر ہو گئی ہیں۔ تمام کتب خانے، تجربہ گاہیں، اور باورچی خانے وغیرہ نئے طرز پر بنائے گئے ہیں اور اپنی اپنی ضروریات کے اعتبار سے کافی ہیں۔

یونیورسٹی کے ارباب حل وعقد نے اس امر کو سختی کے ساتھ پیش نظر رکھا ہے کہ تعلیم مادری زبان میں دی جائے۔ چنانچہ تمام مضامین کی تعلیم ہندی زبان میں ہوتی ہے البتہ اعلیٰ درجوں میں پہونچکر سنسکرت کو اہمیت دی جاتی ہے۔ ابتدائی جماعتوں سے لیکر یونیورسٹی سے فارغ التحصیل ہونے تک سولہ سال کا عرصہ درکار ہے۔ گویا کل نصاب تعلیم کی تکمیل اس عرصہ میں کیجاتی ہے۔ انگریزی زبان کی تعلیم پانچویں جماعت سے شروع کیجاتی ہے۔ اور کالج کے درجات تک رہتی ہے۔ مختلف مذاہب کے مقابلہ کی تعلیم گریجویٹ ہونے کے بعد دیجاتی ہے۔ آجکل اس بات کی کوشش کیجارہی ہے کہ "پالی" زبان کی تعلیم کا بھی انتظام ہو جائے تاکہ یونیورسٹی ہر سنسکرت داں کیلئے ایک جاذب توجہ درسگاہ بنجائے خواہ کوئی مشرق سے آئے یا مغرب سے، شمال سے چلے یا جنوب سے مگر یہاں پہونچکر اُسکا دل اچاٹ نہ ہو۔ بلکہ ہر طرح کی دلچسپی محسوس کرنے لگے۔ ویدک تہذیب کے دوبارہ قایم کرنیکی بہت زیادہ سعی کی جاتی ہے اور اسکے ساتھ ہی سنسکرت کی تعلیم پر بھی بہت توجہ ہے۔

اس اجمالی بیان سے یہ خیال نہ کرنا چاہیئے کہ گوروکل یونیورسٹی کوئی پرانے زمانہ کی پاٹھ شالہ ہے جہاں پڑھ لینا اور گوروجی کی خدمت کرنا ہی کافی ہے درحقیقت گوروکل میں غذائے دماغی کے ساتھ جسمانی تربیت کا بھی پورا لحاظ رکھا جاتا ہے۔ چنانچہ ہاکی، اور فٹ بال وغیرہ کھیلوں کی باقاعدہ مشق ہوتی ہے۔ جمناسٹک، ڈنڈ اور دیسی کسرت پر بھی کافی توجہ دی جاتی ہے۔ تیرنا، کشتی چلانا وغیرہ وغیرہ بہت سی ایسی ورزشیں ہیں جن کی مدد سے طلباء کی صحت بہت اچھی رہتی ہے۔

یونیورسٹی کیلئے جس خطہ کا انتخاب کیا گیا ہے وہ ہر نووارد کیلئے کچھ نہ کچھ سامان کشش ضرور رکھتا ہے لیکن اس سے زیادہ گہرا اثر اس کے دل ودماغ پر اسقدر خوشگوار ربط وارتباط سے پڑتا ہے۔ جو بالعموم آچاریہ اور برہمچاری کے درمیان پایا جاتا ہے۔ یہ یونیورسٹی گویا ایک وسیع خاندان ہے جہاں تصنع اور نمایش کو کوئی دخل نہیں ہے۔ کیونکہ اگر گھر کے ماحول اور تعلیم گاہ کی فضا میں کوئی نمایاں فرق رکھا جائیگا تو بچہ کو اجنبیت محسوس ہوگی۔ وہ ان دونوں کے حالات سے متاثر ہوگا۔ ایک کو دوسر

پر ترجیح دیگا تعلیم ایک غیر دلچسپ شے معلوم ہوگی۔ اسلئے اس بات کی ضرورت ہے کہ ماحول مدرسہ کو اس انداز میں ڈھالا جائے کہ بچہ کو کسی تبدیلی کا احساس نہ ہونے پائے۔ واقعی تعلیم اسی صورت میں معنی خیز اور پُرلطف بن سکتی ہے۔ گورو کل میں اس اُصول کا بہت زیادہ لحاظ رکھا گیا ہے۔ سابق میں طلباء کو گھر جانے کی بہ دقت اجازت ملتی تھی اور اس کے قوانین سخت تھے لیکن اب ان میں بھی رفتہ رفتہ کمی ہو رہی ہے

بہر صورت مدرسہ کا تعلق جہاں ایک طرف خانگی زندگی سے ہے وہاں دوسری جانب معاشرت سے بھی اسکو رشتہ ہے۔ اور ان تینوں میں آپسمیں واضح طور پر مغائرت نہ ہونا چاہیئے۔ موجودہ دنیا عمل کی دنیا ہے۔ یہاں اگر علم محض ذخیرۂ معلومات کیلئے حاصل کیا جائیگا۔ اور اس سے عملی کام نہ لیا جائیگا تو یہ پڑھ لکھ کر مقصد تعلیم کو فنا کر دینے کے مُرادف ہوگا۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ذخیرۂ علم و عمل کے سرچشمہ سے اُبل کر ایک دریائے موّاج بنجائے۔ بہت بہتر ہے کہ گورو کل یونیورسٹی کے گریجویٹ کی ہستی تہذیب قدیم کی صحیح معنوں میں آئینہ دار ہے۔ لیکن اگر موجودہ ہندوستانی ماحول میں وہ اپنے کو کھپا نہ سکا تو گویا اُسکی زندگی برباد ہوگئی۔ اور کشمکش حیات میں پھنسکر اُسے ایک ناکام کی زیست بسر کرنا ہوگی۔ لیکن مقام شکر ہے کہ موجودہ روشنی کی جھلک اب ہر گورو کل کے طالب علم میں پائی جاتی ہے۔ چونکہ گورو کل یونیورسٹی میں تعلیم اعلیٰ اصولوں پر دیجاتی ہے۔ اور ہر ممکن طریقہ سے اس کی کوشش کیجاتی ہے کہ محنت، جفاکشی اور ایثار اور قربانی بنی نوع انسان کے لئے محبت اور ہمدردی ہر طالب علم کے دل میں کوٹ کوٹ کر بھر دیجائے اس سے توقع ہوتی ہے کہ گورو کل کا گریجویٹ ملک و قوم پر بار ہونے کے بجائے ہندوستان کی صحیح خدمت انجام دیگا۔

بانیان یونیورسٹی نے سادہ رہنے اور اعلیٰ خیال رکھنے کے زرّین اصول کو پیش نظر رکھ کر تعلیمی کام شروع کیا۔ موجودہ دَور عام اقتصادی پسپائی کا زمانہ ہے۔ علی الخصوص ہندوستان پر بے روزگاری کا مہیب بھوت اپنی پوری طاقت کے ساتھ مسلّط ہے۔ دوسری یونیورسٹیوں کے گریجویٹ کو اپنا وجود قائم رکھنا دوبھر ہو رہا ہے۔ لیکن اس ناخوشگوار عہد میں بھی گورو کل کا تعلیم یافتہ کسی طرح سے بھی معاشرت پر بار نہیں ہو سکتا۔ اسکو تنازع للبقا کا مسئلہ بہت زیادہ خطرناک صورت میں پیش نہیں آتا۔ وہ اپنا وزن خود کھینچتا ہے۔ دوسروں کے کندھوں پر سوار ہو کر چلنا اس کی مادر تعلیمی کیلئے ننگ ہے۔ ضبط نفس کی گراں بہا خوبی اس کی طبیعت میں داخل کر دیجاتی ہے جس سے وہ اپنی معاشرتی زندگی میں مستفید ہوتا ہے۔ اور جب تک کہ اس قابل نہ ہو جائے کہ اپنا اور اپنے اہل و عیال کا پیٹ خوبی سے پال سکے وہ سوسائٹی کے خون چوسنے والوں کی تعداد میں اضافہ کرنا مناسب خیال نہیں کرتا ہے

ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ تعلیم کا مقدس فرض ہے کہ طالب علم کی شخصیت کو ابھارے اور اسکو اُسکی انفرادیت

سے روشناس کرائے لیکن ہندوستان میں تعلیم ختم کرنے کے بعد پچانوے فیصدی طلبا اپنی شخصیت کو کچلا ہوا پاتے ہیں نہ اُن میں ذوقِ تجسس ہوتا ہے نہ مادۂ تخلیق۔ نہ اپچ ہوتی ہے نہ ہمت و استقلال۔ مگر گورو کل میں صورت حالات اسکے مختلف ہے گورو کل یونیورسٹی کے گریجویٹ کی جسمانی بشاشت اور دماغی تازگی کو دیکھ کر ہر شخص کو حقیقی مسرت ہوتی ہے۔ یونیورسٹی کے ہر طالب علم میں خدمتِ قوم کا جذبہ پایا جاتا ہے اسکی تعلیم کی بنیاد سادگی اور صداقت پر رکھی جاتی ہے۔ حق یہ ہے کہ گورو کل کا تعلیم یافتہ فارغ التحصیل ہونے کے بعد اپنی شخصیت کو ابھرا ہوا پاتا ہے۔ خواہ کتنی ہی قدیم کیوں نہ ہو۔ لیکن وہ ایک مخصوص تہذیب کا مظہر ہوتا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے۔ کہ اس تجربہ کو اعلیٰ کامیابی پر پہونچایا جائے۔ تاکہ ہندوستان کے ہر حصہ میں بے لوث قومی خادم کثیر تعداد میں مِل سکیں۔

نغمۂ نو

(از جناب محمد یعقوب صاحب کلاؔم بی۔ اے)

دلِ شگفتہ گذرگاہِ سوزِ نور نہیں — یہ جلوہ گاہِ تبسم ہے، کوہِ طور نہیں

وہ کون چیز ہیں، میں کون ہوں وہی جانیں — مرے شعور کو اتنا بھی تو شعور نہیں

جنوں میں رسمی عبادت کا ہوش ہے کسکو — مری نماز میں دخلِ خیالِ حور نہیں

خمارِ لیلیٰ کبھی، گاہ دامنِ لیلیٰ — نمازِ عشق میں سجادۂ شعور نہیں

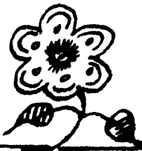
منادی حشر میں کرتے ہیں ہنس کے میرے گناہ — بہ بارگاہِ گذرگاہِ بے قصور نہیں

ہے اذنِ غمزہ کہ ساغر بگیر و بادہ بخش! — یہ بزمِ ساقی ہے، اجلاسِ "یا غفور" نہیں

چھپے ہوئے رگِ گردن کے پاس بیٹھے ہیں — نظر سے دور ہیں، لیکن دلوں سے دور نہیں

مرے گناہ تری شان کے حوالے ہیں — تو "یا رحیم" نہیں ہے کہ "یا غفور" نہیں

کلاؔم خاکِ وطن اپنی ہے سہارنپور
کنارِ گنگ نہیں، شہر کانپور نہیں



لوریاں

(از منشی گورکھ پرشاد صاحب عبرت مرحوم گورکھپوری)

والد مرحوم منشی گورکھ پرشاد صاحب عبرت جن کا انتقال بعمر ۵۹ سال ۱۹۱۸ء میں ہوا، حالی اور آزاد مرحوم سے تقریباً پندرہ سال چھوٹے تھے۔ مسلمان شعرا میں حالی اور آزاد کے بعد جدید رنگ میں حضرت بیان یزدانی میرٹھی، حضرت اسمٰعیل میرٹھی، حضرت شبلی نعمانی، حضرت نادر کاکوروی اور ان کے بعد اکبر الہ آبادی پھر ڈاکٹر سر محمد اقبال نے کامیاب شاعری کی۔ اس منزل میں ہندو شعرا میں والد مرحوم سب سے پہلے گامزن ہوئے اور کچھ ہی بعد منشی جوالا پرشاد برق، منشی درگا سہائے سرور، پنڈت برج نراین چکبست منشی تلوک چند محروم، منشی سورج نراین مہر کے کارنامے جدید رنگ میں بلند مرتبہ ہیں۔ ان معدودے چند ہندو اور مسلمان شعرا میں نصف ایسے ہیں جن کی شاعری نے بیسویں صدی میں جنم لیا۔ انداز ۱۸۸۰ء سے ۱۸۹۵ء تک ہے۔ ان کا مسدس "نشو نما ہند" مولانا حالی کے مسدس کے بعد کتابی صورت میں شائع ہوا تھا اور اتنا مقبول ہوا کہ حضرت اسمٰعیل میرٹھی نے اردو مڈل کورس مرتب کرتے وقت اس کے کچھ حصّے کورس میں داخل کئے۔ "جگانیوالی گھڑی" پر والد مرحوم کی ایک مشہور نظم آج بھی اسکولوں کے اردو نصاب میں داخل ہے۔ اُن کے زمانے میں ان کی مثنوی حسنِ نظرت جستہ جستہ "طوطیِ ہند" میرٹھ میں (جس کے مدیر حضرت بیان یزدانی تھے) شائع ہوتی رہی۔ یہ اردو زبان میں ابتک پہلی اور آخری تمثیلی نظم (ایلیگری) ہے جو ایوانِ اشاعت گورکھپور سے شائع ہو چکی ہے اور ملک کے رسالوں میں اس کا ریویو بھی ہو چکا ہے۔

پُورا کلام یکجا کرنے کی مرحوم نے زحمت ہی گوارا نہ کی لیکن اب مجھے اس فرض سے سبکدوش ہونا ہے۔ میں مجموعی حیثیت سے اُن کے کلام پر آج کچھ نہ لکھوں گا، لیکن اس وقت رواروی میں ایک اہم اور دلچسپ بات کہہ دینا چاہتا ہوں کہ نظموں کے علاوہ والد مرحوم کی کل پچاس ساٹھ غزلیں ہیں اور یہ غزلیں اردو شاعری کی تاریخ میں ایک خاموش مگر گہرے انقلاب کا مرتبہ رکھتی ہیں۔ ان غزلوں میں ساقی پیمانہ رندی و مستی ہجر و وصال حسن و عشق جنون و صحرا بہار و خزاں بلکہ تصوف کا ذکر نہیں۔ صرف حیاتِ انسانی پر براہِ راست بغیر ذو معنی انداز بیان اختیار کئے ہوئے

تنقید کی گئی ہے۔ عاشقانہ اشعار پورے کلام میں مشکل سے پندرہ بیس ہونگے۔ مگر یہ کتنے پاکیزہ شستہ اور بلند ہیں، دیکھئے:-

وہ چاہے تو دم بھر میں خوش کر دے عبرت ۔۔۔ پر ایسا مقدر ہمارا نہیں ہے

قاتل سے انتقام نہیں چاہتا مگر ۔۔۔ میں جس کا صید ہوں وہی میرا شکار ہے

اب کس لئے رہتے ہو مرے حال سے غافل ۔۔۔ کہتے تھے کہ میں تم سے خفا ہو نہیں سکتا

کہتے ہیں وہ کہ وعدۂ فردا میں حرج کیا ۔۔۔ کہتی ہے زندگی کہ میں ناپائدار ہوں

کیا ڈھونڈھتی ہے باغ میں میرے تو اے خزاں ۔۔۔ تو جانتی ہے سب کے چمن میں بہار ہے

دخل کچھ اپنا نہ تھا یارب مزاجِ یار میں ۔۔۔ غیر سے ناراض وہ کیا جانے کیونکر ہو گیا

ہماری سخت جانی پر وہ جھنجھلا کر یہ کہہ اُٹھے ۔۔۔ ہمیں کو سخت جاں کہتے تھے لیکن تم بھی پتھر ہو

کسی کی آرزو پوری ہوتی ہے ۔۔۔ کہاں جیتا رہوں گا امتحاں تک
نہ پوچھو میری نادانی نہ پوچھو ۔۔۔ عدو سے کہہ دیا رازِ نہاں تک

اے مصور جب شبیہ یار کھینچ ۔۔۔ اس کی کچھ رفتار کچھ گفتار کھینچ
کھینچ لوں جنگل کی اک تصویر میں ۔۔۔ پاؤں سے میرے ذرا تو خار کھینچ

قسمت لڑے تو پھوڑیے سر در پہ یار کے ۔۔۔ پردہ اُٹھے تو اُس رخِ تاباں کو دیکھئے
گو نامرادِ عشق ہے ناپائدار حسن ۔۔۔ لیکن نہیں یقیں دلِ ناداں کو دیکھئے
پیچ آ پڑی ہے دوست کے تعمیلِ حکم کی ۔۔۔ عبرت یہاں نہ مشکل و آساں کو دیکھئے

جس سے دل ہم یہاں لگاتے ہیں	دل میں نشتر وہی چبھوتے ہیں

تو تھا بھولا ہوا جب تک تو زمانہ رہا یاد	یاد تو جب سے ہوا تب سے زمانہ گیا بھول

ایسے اشعار مرحوم کے یہاں مستثنیات سے ہیں ورنہ جب امیر مینائی نے یہ مطلع کہا تھا

"اندھیر کر رہی ہے یہ چشم سیاہ میں	شوخی کو بند کیجئے نیچی نگاہ میں"

تو مرحوم کا مطلع یہ تھا:۔

"راحت طلب کو نیند نہیں خوابگاہ میں	محنت سے جو تھکا ہے وہ سوتا ہے راہ میں"

اس وقت صرف ایک غزل ہدیۂ ناظرین کرتا ہوں جس سے آپ کو اُردو غزل میں اس خاموش اور گہرے انقلاب کا پتہ ملے گا جس کے بانی مرحوم تھے۔

جب پسینا کر دیا اپنا لہو	تب کیا قسمت نے ہم کو سُرخرو
چھوڑ دی جب خواہش لعل و گہر	تب بچی دُنیا میں اپنی آبرو
بولتا ہے جب پپیہا، پی کہاں	اے خدا تب یاد آ جاتا ہے تو
کام وہ کرتے ہیں، کر لیتے ہیں جو	چاک اپنا اپنے ہاتھوں سے رفو
کوئی آنسو پونچھنے والا نہیں	ہم نے پھیلائیں نگاہیں چارسُو
اے مرے دل لااُبالی سے تری	میں پھرا کوچہ بہ کوچہ کُو بہ کُو

یار نے اس وقت عبرت لی خبر
جب رہی باقی نہ کوئی آرزو

یہ نہ بھولئے کہ جب یہ غزل کہی گئی اُس وقت امیر مینائی اور داغ کے رنگ کا ڈنکا بج رہا تھا۔ جہاں تک دنیا کو علم ہے اُس وقت تمام ہندوستان میں حالی کی ایک ذات تھی جو دوسرے رنگ میں غزل سرا تھی اور جہاں تک مجھے علم ہے حالی کے علاوہ صرف والد مرحوم اس رنگ میں کہہ رہے تھے ان کی تمام غزلوں میں یہی سادگی یہی نرم کیفیت، یہی خاموش معنویت، یہی فطری اور متوازن اندازِ بیان اور حیات و کائنات کی یہی کھری اور بے لاگ تنقید ہے۔ آج صرف ان کی ایک نظم ہدیۂ ناظرین کر رہا ہوں، اگر ہو سکا تو اُن کی کل غزلیں بیک وقت مع ایک مختصر تنقید کے "زمانہ" کے ایک یا دو نمبروں میں شائع ہونگی۔ اب اِس پچاس برس پہلے کہی ہوئی لطیف اور مترنم نظم سے ناظرین لطف اندوز ہوں۔

فراق

لوریاں

بل بازو کے، زور کمر کے   ماں کی اُمید، سُرور پدر کے
سُکھ آنکھوں کے، نور نظر کے   چین ہمارے سارے گھر کے

سو جا بھولے بھالے بچّے

دن گُزرا خورشید سدھارا   کوہ قاف پر آسن مارا
جمع ہوا دل پارا پارا   خواب نے گھر گھر پاؤں پسارا

سو جا بھولے بھالے بچّے

رنگ کبودی پُورب کا ہے   دھیمی دھیمی چلتی ہوا ہے
شام پیاری کا سایا ہے   وقت سُہانا اب آیا ہے

سو جا بھولے بھالے بچّے

رات نے ڈالا پردا سب پر   بند ہوئے دروازے اور در
خاموشی چھائی عالم پر   سنّاٹا ہے اندر باہر

سو جا بھولے بھالے بچے

فرشِ زمیں کے نقشے چھل گئے   پاؤں شفق کے جم کر ہل گئے
جوڑے جوڑے آ کے رل گئے   کنول کی صورت تارے کھل گئے

سو جا بھولے بھالے بچّے

چرخ پہ بکھرے ہیں سب تارے   گورے گورے پیارے پیارے
چھوٹے ہیں شب کے ہرکارے   اہل زمیں ہیں سوتے سارے

سو جا بھولے بھالے بچّے

ہوا جو ٹھنڈی ٹھنڈی آئی   آنکھ میں میٹھی نیند بھر آئی
سوتی ہے بے خوف خدائی   ہے ہر سمت اُداسی چھائی

سو جا بھولے بھالے بچّے

کُہرا پڑتا ہے سردی ہے   غفلت سے قسمت کی بدی ہے
چُپ ہے عالم آنکھ مُندی ہے   عبرت تیری بات جُدی ہے

سو جا بھولے بھالے بچّے

تنقید کتب

بادۂ مشرق[1]

"بادۂ مشرق" کے نام سے علی گڈھ کے جوان شاعر حضرت ساغر نظامی کے کلام کا ایک دلفریب مجموعہ شائع ہوا جس کے ظاہری محاسن کے متعلق بلاپس و پیش کہا جاسکتا ہے کہ لکھائی چھپائی اور دیگر آرائش و زیبائش کے اعتبار سے یہ مجموعہ آپ اپنی نظیر ہے اور ابھی تک اُردو میں بہت کم کتابیں ایسی شائع ہوئی ہیں، جو حسن طباعت و کتابت کے لحاظ سے اس کتاب کا مقابلہ کرسکیں۔ اس میں سرسالار جنگ ثالث کی ہاف ٹون تصویر بھی دیگئی ہے جن کی اَدب نوازی سے یہ مجموعہ شائع ہوا ہے۔ ساغر صاحب کا ایک "پنسل اسکیچ" بھی ہدیۂ ناظرین کیا گیا ہے - کتاب کی جلد بھی بہت خوشنما ہے اور کاغذ بھی اچھا استعمال ہوا ہے۔

معنوی حیثیت سے اس بادۂ مشرق کے دو حصّے ہیں (۱) پہلے حصّہ میں مسز سروجنی نیڈو کی فرمایشی تقریظ ہے جو "تبرکاً و تقدساً" سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی۔ اس کے بعد خواجہ حسن نظامی مولانا سیماب اکبرآبادی، مولانا عبدالحق بی۔ اے سکرٹری انجمن ترقی اُردو حیدرآباد دکن اور ڈاکٹر سیّد محمود کے مقدمے اور تقریظیں ہیں۔ خواجہ صاحب نے ساغر صاحب کو معلوم نہیں کس وجہ سے "ہرشلہ" کا خطاب دیا ہے۔

مولانا سیماب اکبرآبادی کا دیباچہ بھی کچھ اسی وضع کا ہے۔ آپ نے ساغر صاحب کو "پیغمبر سخن" کا خطاب دیا ہے۔

مولانا عبدالحق صاحب اور ڈاکٹر سید محمود کے دیباچہ میں کلام پر تنقیدی نظر ڈالی گئی ہے اور اس میں شک نہیں کہ ان دونوں صاحبوں نے جو کچھ ساغر صاحب کے متعلق لکھا ہے وہ ایک حد تک صحیح ہے۔ اور جو خوبیاں بیاں کی ہیں، وہ کم و بیش ساغر صاحب میں موجود ہیں۔

ساغر صاحب کے ایک چھوٹے سے مجموعہ نظم "صبوحی" پر ریویو کرتے ہوئے زمانہ میں بھی انکے اسلوب بیان پر روشنی ڈالنے کی کوشش کیگئی ہے۔ مگر پچھلے پانچ چھ سال کے عرصہ میں ساغر صاحب کی شاعری کہیں

---

[1] قیمت چار روپیہ۔ ملنے کا پتہ:۔ ساغر پریس۔ سپٹ بازار۔ میرٹھ۔

سے کیس پہونچگئی ہے۔ اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مختلف عنوانات کے ماتحت ساغر صاحب کے کلام کی ایک جھلک دکھادی جائے۔

ساغر صاحب نے اپنے اس مجموعہ کلام کو نہایت سلیقہ کے ساتھ مختلف عنوانات میں تقسیم کر دیا ہے چنانچہ انھیں پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوجاتا ہے کہ اس کتاب میں کیا کچھ ہوگا۔ یہ عنوانات یہ ہیں:۔ (۱) صبح نو۔ (۲) ہدیۂ روح (۳) پیام سروش (۴) حریم فطرت (۵) نقوش باقی (۶) صنمکدۂ حیات (۷) حدیث گل (۸) غنچۂ زار (۹) رموز میکدہ (۱۰) جرعۂ آخریں۔ جس میں "نغمۂ سنجان چمن" اور "یاد رفتگان" بھی شامل ہیں (۱۱) ساغرستان یعنی غزلیں (۱۲) روح بادہ۔

ساغر صاحب وطنیت وآزادی کے دلدادہ ہیں۔ آزادی وطن کے لئے اہل ملک کو ہر قسم کے ایثار وقربانی کی ترغیب دیتے ہیں۔ ان کی ذہنیت فرقہ بندی سے پاک ہے وہ ہندوستانی ہونے پر نازاں ہیں اور بلا تفریق مذہب وملت سب ہندوستانیوں کو اپنا بھائی سمجھتے ہیں۔ وہ مادر وطن کے سچے فرزند اور مناظر قدرت کے پکے پرستار ہیں۔ جذبات انسانی کی تصویر کھینچنے میں خوب مشاق ہوگئے ہیں۔ ان کی زبان میں سلاست، الفاظ میں روانی ترکیبوں میں ترنم اور بحروں میں موسیقیت ہے۔ وہ جب کبھی اپنا کلام خود سنانے بیٹھتے ہیں تو حفیظ جالندھری کی طرح اپنی خوش گلوئی اور خوش الحانی کی بدولت اپنا رنگ جمالیتے ہیں۔ ان کے کلام میں تصوف بھی ہے اور فلسفہ بھی حسن پرستی بھی ہے اور تغزل بھی۔ مصوری بھی ہے اور جذبات بھی۔ اور تمام کلام حب وطن میں ڈوبا ہوا ہے۔ وہ تشبیہات کے لئے ایران وتوران جاکر دجلہ وفرات یا جیحوں وسیحوں کی سیر نہیں کرتے۔ اپنے وطن ہی میں گنگا جمنا کے "نرمل جل اور اجل دھارا" سے دل بہلا لیتے ہیں۔ ان کے نزدیک جمنا جی کی دھارا کیا ہے؟

ع:۔　　کرشن کی بنسی کا ایک بہتا ہوا نغمہ ہے تو

اس سے بہتر جمنا جی کی اور کیا تعریف ہوسکتی ہے؟ چونکہ اس مصرعہ میں شاعر نے محاکات ومنظر نگاری کا کمال دکھایا ہے، اس لئے یہاں پر انکی اسی قسم کی بعض نظموں کے چند بند ملاحظہ ہوں۔ طلوع صبح کا منظر کس انوکھے اسلوب سے لکھتے ہیں۔ اور آفتاب عالمتاب کس طرح برآمد ہوتا ہے ؎

بربطِ نوریں پہ بھیرویں راگنی گاتا ہوا　　ساز سے کرنوں کے روشن راگ برساتا ہوا
اپنی موسیقی سے دنیا بھر کو گرماتا ہوا　　زندگی کی موج ہر اک شے میں دوڑاتا ہوا

پردۂ مشرق سے ساقی سحر پیدا ہوا
بادۂ مشرق بدست ونغمہ گر پیدا ہوا

"تتلی" کی تصویر اس طرح کھینچی ہے ؎

آئی وہ تتلی چمن میں رنگ برساتی ہوئی
دامنِ موجِ ہوا پر لغزشیں کھاتی ہوئی
ایک غبارِ رنگ و بو کی طرح لہراتی ہوئی
ذرّہ رقاص کی مانند تھرّاتی ہوئی
تیز رو اک نازنیں سیارۂ سطحِ فضا
وہ شگفتِ گل کی ایک خاموش بامعنی صدا
وہ شگوفوں کی چٹک سے شاخِ بو پھوٹی ہوئی
آئی ایک جانب سے تارے کی طرح ٹوٹی ہوئی

تاج محل آگرہ کی نسبت لکھتے ہیں ؎

جس طرح صبحِ جبیں کو شام گیسو گھیر لے
یاسمن کو جس طرح ہنگامۂ بو گھیر لے
شمع پر پروانوں کا جس طرح ہو جائے ہجوم
گنبدِ نیلوفری میں جس طرح چمکیں نجوم
جس طرح خطِ افق گرہ تجلّیات ہو
جس طرح سورج زمیں پر ہو فلک پر رات ہو
جس طرح صحرا میں ہو قیس اور لیلیٰ بام پر
جس طرح تارہ نمایاں ہو سوادِ شام پر
جس طرح فانوس میں بجلی، سویدا میں ہو نور
جس طرح ظلمات سے نورِ سحر کا ہو ظہور

بالکل ایسے ہی عیاں ابرِ سیہ میں تاج ہے
تاج کیا ایک جلوہ ہے اور جلوۂ مواج ہے

مادرِ وطن ہندوستان کی تعریف بھی ساغر صاحب کی زبانی سنئے

نغمہ زارِ روح بھی گہوارۂ الہام بھی
جنت نظارہ تیری صبح بھی ہے شام بھی
مرکزِ احرار تو ہے، مرجعِ اقوام بھی تو
میکدہ بھی، کعبہ بھی، کاشانۂ اصنام بھی

مسکرائی کلکِ قدرت تیرا نقشا کھینچکر
تجھکو خالق نے بسایا عطرِ دنیا کھینچکر

تیرے جنگل بھی ہیں اے ہندوستاں گلشن بدوش
اور کانٹے گل فشاں و گل چکان و گل فروش
کوہ تیرے ارجمند و سربلند و برف پوش
تیرے دریا موج خیز و کیف بار و پُرخروش

جلوۂ قدرت ہے تو فطرت کا کاشانہ ہے تو
جس میں ہر ایک رنگ کی مے ہے وہ میخانہ ہے تو

غرض ساغر صاحب سچے وطن پرست ہیں اور جہاں پیغمبرِ اسلامؐ، اور اولیائے کرام کی شان میں کچھ کہتے ہیں وہاں وہ سری رامچندر جی، سری کرشن جی اور گوتم بدھ کے دربار میں بھی عقیدت و ارادت کے پھول چڑھاتے ہیں۔ مہاتما گاندھی، پنڈت جواہر لال نہرو، اور پنڈت موتی لال نہرو۔ مولانا محمد علی مولانا آزاد اور خان عبد الغفار کی شان میں یکساں خلوص و عقیدت سے قصیدے لکھے ہیں۔

ساغر صاحب کی غزلیات بھی بہت دلچسپ ہوتی ہیں۔ دو چار شعر سنئے اور لطف اٹھائیے ؎

صبیح کلیوں میں میں نے سونگھی ترے تبسم کی بوئے نازک — عمیق چشموں سے میں نے دیکھا اُبل رہا ہے شباب تیرا

"جنون ہنگامہ" میری آہیں، "فساد عریاں" تری نگاہیں — تباہی کائنات ٹھہری مری جوانی، شباب تیرا

کچھ اس متانت سے جھوم کر چل، کہ ٹوٹ جائے نظام گلشن — شگفتگی بن کے پھوٹ نکلے، کلی کلی سے شباب تیرا

زینت دست حسین، رونق محفل ہوتا — تم نے جس پھول کو توڑا، وہ مرا دل ہوتا

پتہ منزل کا اب کے ڈھونڈھنا ہے آسماں ہوکر — میں پھر انگڑائی لیتا ہوں غبارِ کارواں ہوکر

کشتگان نگہ ناز کو رسوا نہ کریں — دیکھنے والوں سے کہہ دو کہ تماشا نہ کریں

مقسوم دل کردں خلش نیشتر کو میں — اب کے تری نظر سے لڑا دوں نظر کو میں

خیال میں مسکرا رہے ہیں، دماغ میں جگمگا رہے ہیں — میں ان کو دل سے بھلا رہا ہوں، وہ اور بھی یاد آرہے ہیں

دشت میں قیس نہیں، کوہ پہ فرہاد نہیں — ہے وہی عشق کی دنیا مگر آباد نہیں

غرض ساغر صاحب موجودہ زمانہ کے ایک ہونہار شاعر ہیں اور ہم کو اُن کی ذات سے بڑی بڑی اُمیدیں ہیں۔ مگر کبھی کبھی وہ عریاں قسم کی شاعری کرنے لگتے ہیں جو مذاق سلیم پر کسیقدر گراں گزرتی ہے اور بعض اوقات شائد انھیں نظر ثانی کا بھی موقعہ نہیں ملتا ہے۔ مثلاً

صحن کعبہ، مندروں کے بام و در روشن ہوئے — کوہ و صحرا، دیر و کعبہ، بحر و بر روشن ہوئے
(صفحہ ۷)

دونوں مصرعہ میں "کعبہ" کی تکرار اچھی نہیں معلوم ہوتی۔

اسی صفحہ کے اگلے بند میں آفتاب کو مخاطب کرکے فرماتے ہیں ؎

اے نقیب صبح، اے سرچشمۂ امواج نور — اے کلید خمستانِ صبح، ساقی سرور

ان دونوں مصرعوں میں "نقیب صبح" اور "کلید خمستانِ صبح" کے جملے یہ ظاہر کرتے ہیں کہ آفتاب صبح کا پیشرو ہے حالانکہ صبح طلوعِ آفتاب سے بہت پہلے ہوجاتی ہے۔ مندرجہ ذیل شعر بھی فلکیات کی کسوٹی پر صحیح نہیں اُترا ؎

قلب فطرت میں جحیم افسردہ انگارہ ہے تو — پھوٹ کر مرکز سے میدانوں میں آوارہ ہے تو

کائنات کے جس حصّہ میں ہماری زمین ہے، اس کے نظام کا مرکز خود ہی آفتاب ہے جس سے ساغر صاحب خطاب کررہے ہیں۔ آفتاب اپنے مرکز پر ہمیشہ قائم رہتا ہے۔ حالانکہ شعر کے دوسرے مصرعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ آفتاب گردش کرتا پھرتا ہے۔

وداع ہوتی ہے ظلمتِ شب، سحر کھڑی جھلملا رہی ہے ۔ اندھیریاں ہو رہی ہیں رخصت سواریِ نور آ رہی ہے

دوسرے مصرعہ میں "سواری نور" میں اضافت نہ ہونا چاہئیے۔ بہرحال یہ چھوٹی چھوٹی باتیں ہیں جو نظر ثانی میں رفع ہو جائیں گی۔ ساغر صاحب کا کلام بہ حیثیت مجموعی ہر شایق اُردو کی قدردانی کا مستحق ہے۔

مختصر تاریخ ادب اُردو [1]

تاریخ ادب اُردو پر یوں تو ابتک بہت سی کتابیں لکھی گئیں اور لکھی جائیں گی، لیکن ان میں زیادہ تعداد ایسی کتابوں کی ہے جنہیں شعرائے اُردو کا تذکرہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ کیونکہ ایسی کتاب غالباً اس وقت تک کوئی نہیں لکھی گئی جس میں شاعروں کے علاوہ نثرنگاروں کا بھی کچھ حال درج ہو۔ سید اعجاز حسین صاحب اعجاز ایم۔اے لکچرار اُردو یونیورسٹی الہ آباد نے مندرجہ بالا کتاب لکھ کر اس کمی کو بڑی حد تک پورا کر دیا ہے۔ اگرچہ فاضل مصنف نے اسلوب بیان میں ایجاز و اختصار سے بہت زیادہ کام لیا ہے بلکہ بقول ان کے "پارہ کو جملہ میں اور جملہ کو لفظوں میں پُر معنی طریقہ سے بیان کر دیا ہے" پھر بھی مصنفین کے کلام پر تنقید کرتے ہوئے تقریباً ہر جگہ اس امر کی کوشش کی گئی ہے کہ "کسی مصنف کی کوئی امتیازی خصوصیت نظرانداز نہ ہو لیکن بانکو بڑھایا بھی نہ جائے"

کتاب زیر نظر میں آٹھ باب ہیں۔ پہلے سات بابوں میں حضرت امیر خسرو رح سے لیکر مرزا یگانہ چنگیزی تک کے حالات لکھ کر ان کے کلام پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ اور آٹھواں باب مشہور و معروف ہندو شعرا کے لئے مخصوص کیا گیا ہے، اور کتاب کو حتی الامکان "اَپ ٹو ڈیٹ" بنانے کی کوشش کی ہے۔ تاہم ہمکو افسوس کیساتھ کہنا پڑتا ہے کہ کئی نامور اصحاب نظرانداز ہو گئے مثلاً منشی مہاراج بہادر، برق دہلوی۔ اور علامہ کیفی دہلوی کا حال اس تذکرہ میں درج ہونے سے رہ گیا ہے۔

اس کتاب کے دو حصّے ہیں۔ ایک میں اُردو شعرا سے بحث کیگئی ہے دوسرے حصے میں اُردو کے کئی مشہور نثرنگاروں کا حال درج ہے۔ یہ تاریخ طالبعلموں کے لئے خاص طور پر مفید ہوگی۔

منادی کا سالنامہ بابت ۱۹۳۷ء [2]

خواجہ حسن نظامی دہلوی اپنے مخصوص انداز میں اُردو لٹریچر کے اندر کچھ نہ کچھ قابل قدر اضافہ فرماتے ہی رہتے ہیں۔ پچھلے سال آپ نے خاص اہتمام کے ساتھ ایک شاندار میلادی جنتری شائع کی تھی! امسال اخبار منادی

---

[1] لکھائی چھپائی کاغذ رسمی۔ چھوٹی تقطیع کے ۲۰۷ صفحے حجم۔ قیمت دو روپیہ آٹھ آنہ۔ ملنے کا پتہ:۔ انڈین پریس الہ آباد۔

[2] لکھائی چھپائی ٹائٹل سب دیدہ زیب۔ ضخامت اچھی خاصی۔ قیمت صرف آٹھ آنہ۔

کا سالنامہ بڑے اہتمام سے شائع کیا ہے جس میں مفید مضامین کے علاوہ تقریباً ۱۷ تصویریں ہیں حضرت امام جعفر الصادقؒ کی تحریر کا عکس بہت عجیب چیز ہے۔ایک مختصر فہرست اُردو اخباروں اور رسائل کی اور دوسری فہرست حامیان اُردو کے ناموں کی بھی درج کی ہے جس سے معلومات میں کافی اضافہ ہوتا ہے۔سال بھر کے منادی اخبار کا انتخاب اور خواجہ صاحب کا روزنامچہ بھی ہے۔باقی تمام کتاب اشتہاروں سے بھری ہوئی ہے۔

نغمۂ سروش[1]

یہ چھوٹی سی کتاب جناب فضل الدین صاحب قدؔ دنیانگر ضلع گورداسپور کی سَو رباعیوں کا دلپذیر مجموعہ ہے جس میں فاضل مصنف نے نوجوانوں، طالبعلموں، مدرسوں، شاعروں، اخبارنویسوں، مسلمانوں اور ہندوؤں سب کے نام اصلاحی پیغامات دئے ہیں۔ زن وشوہر کی باہمی شکر رنجیوں، نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کی بدعنوانیوں، مکاریوں کی خرابیاں بتاکر اصلاح کرنے کی کوشش کی ہے۔ایک رباعی میں رسالہ "زمانہ" کانپور کے حال پر بھی عنایت فرمائی ہے ؎

یہ علم وفصاحت کا خزانہ کیا ہے — یہ مشترکہ قومی ترانہ کیا ہے
خوش ہو کے اسے یاد کریں گی نسلیں — تہذیب کا گلدستہ "زمانہ" کیا ہے

آفتابِ رسالت[2]

اس مختصر سی کتاب میں رائے بہادر حاجی محمد عبدالحمید خاں صاحب منظرؔ رئیس باغپت ضلع میرٹھ نے پیغمبر اسلام کی پیدائش سے لیکر وفات تک کل حالات موثر اور دلآویز پیرایہ میں نظم فرمائے ہیں۔اگرچہ اس مثنوی کے لئے کسیقدر طویل بحر پسند کی گئی ہے مگر یہ منظوم سوانح عمری شگفتگی کے ساتھ نظم کی گئی ہے۔

مُسلم بچّوں اور عورتوں کے لئے یہ کتاب دلچسپ ثابت ہوگی۔

لکھائی چھپائی کاغذ سب قابل قدر ہے۔

---

[1] لکھائی چھپائی کاغذ سب اچھے۔جیبی تقطیع کے ۶۴ صفحے ضخامت۔ہر صفحہ پر دو رباعیاں قیمت چھ آنہ ملنے کا پتہ:- منیجر صاحب رسالہ کہکشاں گلی تاراشاہ دھلی۔

[2] قیمت آٹھ آنہ۔ ملنے کا پتہ سکریٹری صاحب بزم ادب باغپت ضلع میرٹھ یا ضیاء الرحمٰن صاحب مالک علی گڑھ برقی پریس عقب جامع مسجد دھلی۔

بہاءاللہ و عصرِ جدید[۱]

یہ کتاب ایران کے بابیوں کی مختصر تاریخ ہے جسے مسٹر ایسلمنٹ نے انگریزی زبان میں لکھا اور مسٹر عباس علی بٹ بی۔اے۔بی ای ڈی نے اُردو کا لباس پہنایا ہے۔اسمیں محمد علی باب بہاءاللہ اور عبدالبہا کے مختصر سوانح حیات اور ان کی تعلیم کا خلاصہ درج ہے۔محمد علی ۱۸۱۹ء میں بمقام شیراز پیدا ہوئے پچیس سال کی عمر میں "باب" کا لقب اختیار کیا اور مہدی موعود ہونے کا دعویٰ کرکے ایک نئے مذہب کی بنیاد ڈالی، سحر بیانی اور علمی مقالات کی وجہ سے ہزاروں آدمی ان کے مرید ہوگئے۔ ایران کے مولویوں کی سخت مخالفت کی وجہ سے باب اور ان کے ایک مرید آقا محمد علی کو ۱۸۵۰ء میں تبریز میں سولی دیدی گئی۔اور لاش گولیوں سے اُڑادی گئی۔ان کے پیرو لاش کو پوشیدہ طور پر اٹھالے گئے اور مدتوں اِدھر اُدھر لئے پھرتے رہے۔بالآخر فلسطین میں جبل مل پر دفن کرکے مقبرہ بنوادیا گیا۔ محمد علی باب کے خلیفہ میرزا حسین علی بہاءاللہ کے لقب سے مشہور ہوئے چنانچہ انھیں کی وجہ سے اب بابی مذہب کو "بہائی مذہب" کہا جاتا ہے۔۱۸۵۲ء میں ایک بابی محمد صادق نے شاہِ ایران پر قاتلانہ حملہ کیا جس پر بابیوں کا قتل عام کیا گیا۔اور بہاءاللہ کو بہت سے مریدوں کے ساتھ جیل خانہ میں ڈال دیا گیا۔چار مہینہ قید رکھنے کے بعد ان لوگوں کو جلا وطن کردیا گیا۔اور وہ بغداد میں آگئے۔یہاں بھی ترکی حکومت کو ان کی وجہ سے اندیشہ ہوا اور انھیں بغداد سے قسطنطنیہ ایڈریانوپل اور فلسطین وغیرہ بھیجدیا گیا۔جہاں بہاءاللہ نے ۱۸۹۲ء میں پچھتر سال کی عمر میں وفات پائی۔ اور ان کے بیٹے عبدالبہاء ان کے جانشین ہوئے۔آخر ۱۹۲۱ء میں انکا بھی انتقال ہوا۔ محمد علی باب کو بہائی فرقہ "مبشر" کہتا ہے جس نے بقول ان کے بہاءاللہ کے ظہور کی بشارت دی۔بہاءاللہ کو یہ لوگ "جمال مبارک" کہتے۔اور خدا کا اوتار سمجھتے ہیں۔شائقین مذہب کیلئے یہ کتاب دلچسپ ثابت ہوگی۔

لکھائی چھپائی معمولی کاغذ۔حجم ۳۲۰ صفحے۔

بادۂ عرفاں[۲] یہ چھوٹی سی کتاب رائے بہادر شنکر دیال صاحب ریٹائرڈ ڈسٹرکٹ و سشن جج لکھنؤ کی پینتالیس غزلوں کا مجموعہ ہے۔رائے بہادر صاحب پرانی قسم کے شاعر ہیں اور ان کی طبیعت مذہب کی طرف مائل ہے چنانچہ ان کا کلام زیادہ تر مذہبی رنگ میں رنگا ہوا ہے۔کہیں کہیں تصوف کی جھلک بھی نظر آتی ہے۔ایک غزل ہندوستان کی فضیلت میں بھی لکھی ہے اس کا یہ شعر بہت درد انگیز ہے۔ آنکھوں میں کیوں ہماری اندھیر ہو نہ دنیا۔ بے بلبل ہو رہا ہے سارا چمن ہمارا۔ لکھائی چھپائی۔کاغذ رسمی۔حجم ۹۴ صفحے

---

[۱] ملنے کا پتہ:۔دفتر بہائی میگزین کشمیر بلڈنگ لاہور۔ [۲] قیمت چار آنہ۔نیو نائنڈ انڈیا پریس لکھنؤ سے مل سکتی ہے۔

"راج ہٹ"

(از حضرت اقبال ورما سحر ہتگامی)

سحر تھا کتنا بلند اڈورڈ ہشتم کا خیال جس نے سمجھا سلطنت کے اوج کو جان کا وبال
ترک اور ایثار کا ظاہر ہوا ایسا کمال واقعی تاریخ یورپ میں نہیں جس کی مثال
راج ہٹ نے رکھ لیا اپنے کہے کے لاج کو
تج دیا برطانیہ کے راج جیسے راج کو

اس رویہ سے دل عالم پہ حیرت چھا گئی مادی تخئیل سناٹے میں یکسر آ گئی
پھر ذرا روحانیت کے کھوج دنیا پا گئی پھر اصالت ایکبار اپنی جھلک دکھلا گئی
پھر نجانے غیب سے کیسا اشارہ ہو گیا
پھر بھرے کلجگ میں ست جگ کا نظارہ ہو گیا

تاجداری تھی مگر فطرت میں خودداری بھی تھی سربسر آزادیوں کے اک پرستاری بھی تھی
پاس راحت کا جو تھا کلفت کی ناچاری بھی تھی کیسی آسانی بھی تھی ہاں کیسی دشواری بھی تھی
کشمکش نے الغرض کیا کچھ ہویدا کر دیا
اک توازن کا سماں دونو سے پیدا کر دیا

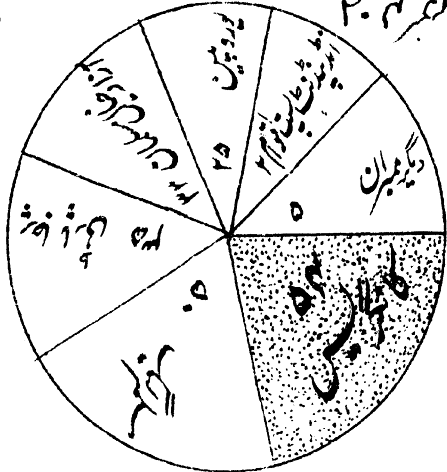
ورنہ شاہی اختیار اپنا جو کرتا رکھ رکھاؤ کر کے رہتی پارلیمنٹ اک نیا اپنا چناؤ
پھر خدا جانے کدھر ہوتا وزارت کا جھکاؤ یعنی ممکن تھا کہ یوں کلفت سے ہو جاتا بچاؤ
طبع نازک خود مگر ساری اذیت سہہ گئی
ساری برٹش قوم تکلیفوں سے بچ کر رہ گئی

اے شہ سابق کبھی تھا دہر پر تو حکمراں اور قلب دہر پہ ہے اب ترا سکہ رواں
بندشوں سے اک جہاں تک پہلے تھی محدود شاں اور تیرے بس میں ہے اب شوکت ہر دو جہاں
ہے تری کم مائگی دولت پناہی سے سوا
ہے ترا رتبہ یقیناً بادشاہی سے سوا

مختلف صوبوں کی اسمبلیوں میں جماعتی تناسب

صوبہ بنگال کی قانونی اسمبلی

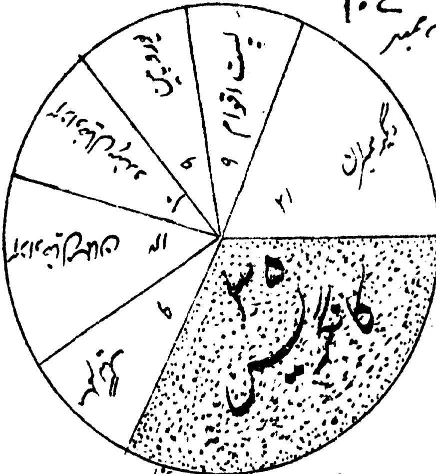
جملہ ممبر ۲۵۰



(۱) مسٹر فضل الحق　وزیر اعظم
(۲) نواب صاحب ڈھاکہ　(۳) نواب مشرف حسین
(۴) سید نوشیر علی　(۵) مسٹر حسن شہید سہروردی
(۶) راجہ سر ناظم الدین　(۷) مہاراجہ قاسم بازار
(۸) سر بجے پرشاد سنگھ رائے　(۹) مسٹر نلنی رنجن سرکار

صوبہ آسام کی قانونی اسمبلی

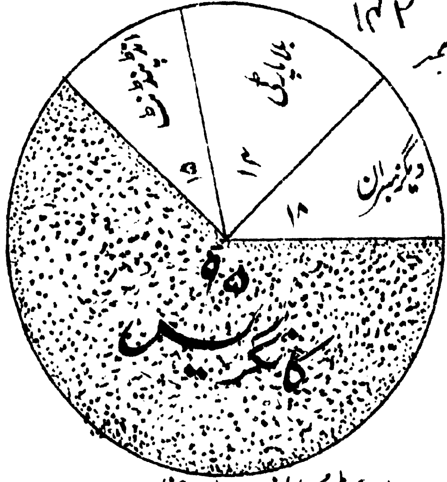
جملہ ممبر ۱۰۸



(۱) سر محمد سعد اللہ　وزیر اعظم
(۲) مسٹر روہنی کمار چودھری　(۳) ریورنڈ جے. جے ایم نکولس رائے
(۴) شمس العلماء مولانا ابو نصار محمد وحید　(۵) مولوی علی حیدر خاں

صوبہ بہار کی قانونی اسمبلی

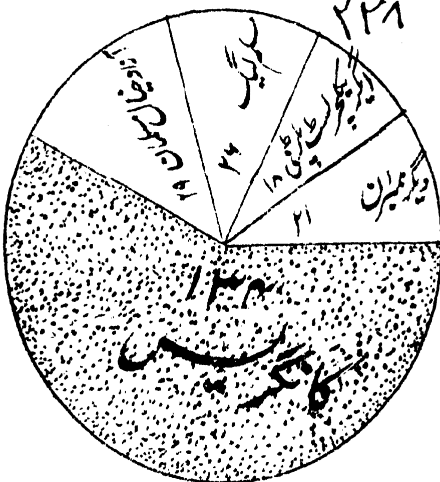
جملہ ممبر ۱۵۲



(۱) مسٹر محمد یونس　وزیر اعظم
(۲) کمار اجیت پرشاد سنگھ دیو
(۳) بابو گورو سہائے لال
(۴) نواب خان بہادر عبدالوہاب خاں

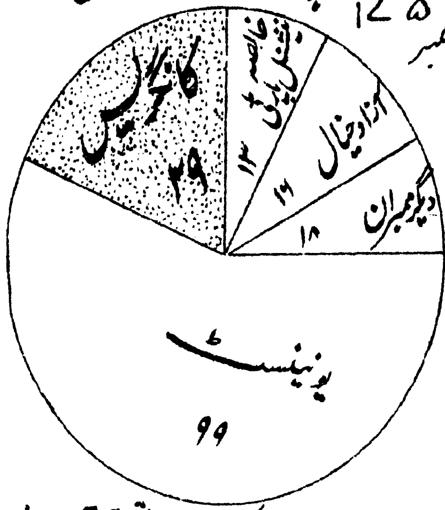
صوبہ متحدہ کی قانونی اسمبلی

۲۲۸



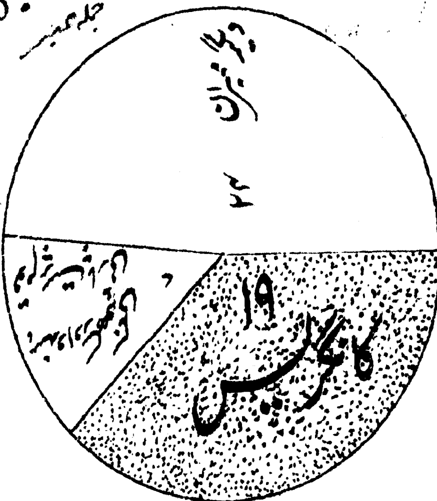
(۱) نواب صاحب چھتاری　وزیر اعظم
(۲) سر جے. پی. سری واستوا　(۳) سر محمد یوسف
(۴) راجہ صاحب سلیم پور　(۵) مہاراج کمار وزیا نگرم
(۶) راجہ صاحب تروا　(۷) راجہ جیشور دیال سیٹھ

صوبۂ پنجاب کی قانونی اسمبلی



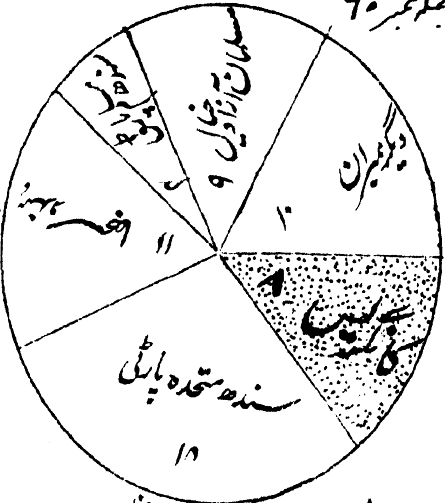
(۱) خان بہادر میجر سردار سر سکندر حیات خاں کے۔ بی۔ ای وزیر اعظم
(۲) سردار بہادر سر سندر سنگھ مجیٹھیہ سی۔ آئی۔ ای
(۳) راؤ بہادر چودھری چھوٹو رام (۴) مسٹر منوہر لال بیرسٹر ایٹ لا
(۵) میجر نوابزادہ ملک خضر حیات خاں ٹوانہ (۶) میاں عبد الحئی۔

صوبۂ سرحد کی قانونی اسمبلی



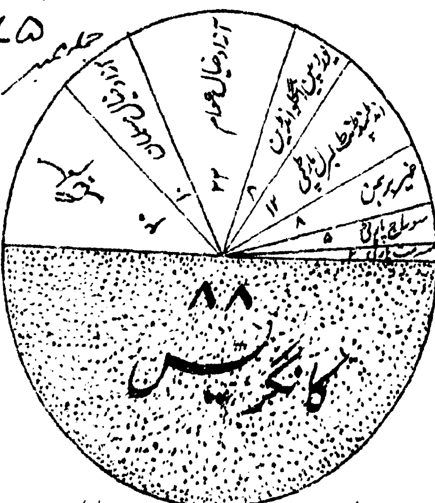
(۱) سر عبد القیوم وزیر اعظم
(۲) رائے بہادر مہر چند کھنہ
(۳) خان بہادر سعد اللہ خاں

صوبۂ سندھ کی قانونی اسمبلی



(۱) سر غلام حسین ہدایت اللہ وزیر اعظم
(۲) مسٹر مکھی گوبند رام
(۳) میر بندہ علی خان

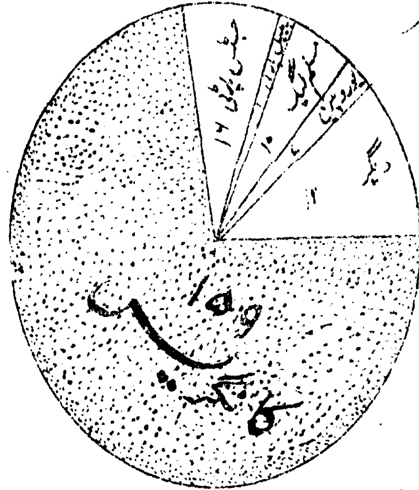
صوبۂ بمبی کی قانونی اسمبلی



(۱) سر ڈی۔ بی۔ کوپر۔ وزیر اعظم (۲) سر ایس۔ ٹی۔ کامبلی
(۳) راؤ بہادر جتانے (۴) مسٹر حسین علی رحمت اللہ
(۵) مسٹر جمناداس مہتا (۶) ایک پارہ بین

صوبہ مدراس کی قانونی اسمبلی

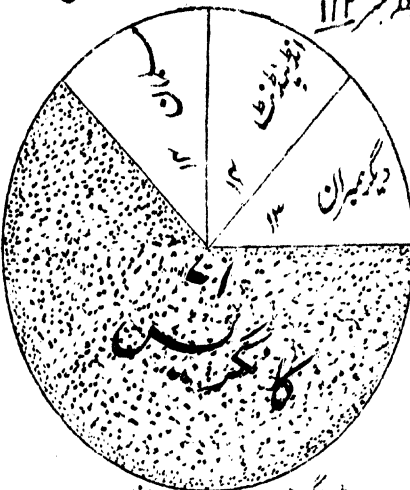
جملہ ممبر ۲۰۵



(۱) سر کے۔ وی۔ ریڈی نیڈو وزیر اعظم
(۲) مسٹر اے۔ بی۔ شیٹی سلوم
(۳) کمار راجہ ستھیا جیڈیا
(۴) مسٹر آر۔ ایم۔ پالت
(۵) راؤ بہادر ایم۔ سی۔ راجہ
(۶) مسٹر خلیفہ اللہ

صوبہ متوسط کی قانونی اسمبلی

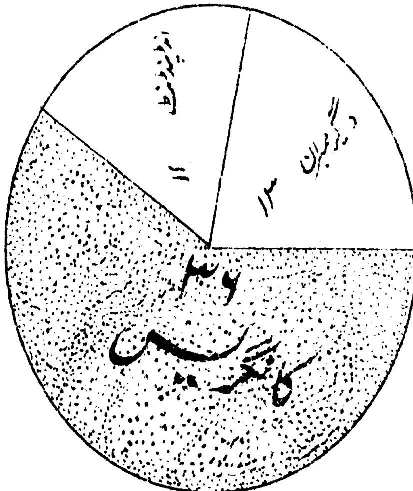
جملہ ممبر ۱۱۲



(۱) مسٹر راگھویندر راؤ وزیر اعظم
(۲) مسٹر پی۔ جی۔ کھاپرڈے
(۳) مسٹر کے۔ ایس۔ نیڈو
(۴) مسٹر ایس۔ ڈبلیو۔ اے رضوی
(۵) مسٹر وہرم راؤ بھجنگا راؤ

صوبہ اڑیسہ کی قانونی اسمبلی

جملہ ممبر ۶۰



(۱) راجہ پرلکی میدی وزیر اعظم
(۲) مسٹر منہت گوراچند پٹنائک
(۳) مسٹر لطیف الرحمن

ماہ رواں

وزارت کی مشکلات

صوبوں کی وزارت قبول کرنے کے سوال پر غور کرنے کیلئے کانگریس کا جو آل انڈیا کنونشن دہلی میں منعقد ہوا تھا اس نے عہدے قبول کرنے کے موافق فیصلہ تو دیدیا مگر گورنران سے تحفظات کے متعلق وعدہ لینے کی بظاہر جو معمولی سی شرط عائد کردی گئی تھی وہ صوبجاتی اسمبلی کے لیڈران کانگریس پارٹی کے راستے میں سنگ راہ ثابت ہوئی۔ ہر صوبہ میں کانگریسی لیڈران نے گورنر صاحبان سے اس بات کا اطمینان چاہا کہ ان کی آئینی کارروائیوں میں کبھی کوئی مداخلت نہ کیجائے گی۔ مگر ہر گورنر نے انھیں یہی جواب دیا کہ گو وہ معمولاً وزرا کے ساتھ ہمدردانہ تعاون کو نا اپنا فرض منصبی سمجھتے ہیں لیکن اس بات کا کوئی وعدہ نہیں کرسکتے کہ کبھی کسی امر میں کوئی مداخلت یا مزاحمت نہ کریں گے۔ چنانچہ کانگریسی اصحاب نے ان چھ صوبوں میں جہاں انھیں قطعی کثرت رائے حاصل ہوگئی ہے وزارت قائم کرنے کی ذمہ داری لینے سے انکار کردیا ہے اور اب اُن صوبوں میں گورنر صاحبان کی تحریک پر دُوسری جماعتوں کے معززین نے جن کے پیروان کی بہت ہی قلیل تعداد اسمبلیوں میں داخل ہوسکی ہے وزارت کے قایم کرنے کی ذمہ داری اپنے سر لیلی ہے چنانچہ ان نقشوں سے جو کسی دوسری جگہ اس نمبر میں ہدیۂ ناظرین ہیں معلوم ہوگا کہ ہر صوبہ میں وزارتیں قائم ہوگئی ہیں۔

اس اثنا میں انگلستان و ہندوستان ہر دو جگہ اس مسئلہ پر بڑے زور شور کا مباحثہ ہو رہا ہے۔ کہ منارٹی گورنمنٹ قایم کرنے میں گورنران صوبہ کا رویہ کہاں تک درست و مناسب تھا۔

یہ بات تو پایہ ثبوت کو پہونچ گئی ہے کہ گورنر صاحبان نے جو کچھ کیا وہ گورنمنٹ کے منشا اور صاحب وزیر ہند کے ایما سے کیا۔ لارڈ زٹلینڈ سکریٹری آف اسٹیٹ ہند نے کل کارروائی کی پوری ذمہ داری اپنے سر لے لی ہے اور اپنی رائے مشوروں اور گورنران کی کارروائیوں کو گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کے عین مُطابق قرار دیا ہے۔ اس سلسلے میں دارالامرا میں اُنھوں نے جو تقریر کی ہے اس کا لہجہ بہت سخت تھا۔ اور عام خیال ہے کہ انھوں نے اس تقریر میں مصالحت کی کوئی گنجائش باقی نہیں رکھی ہے۔ لیکن جو مثال اُنھوں نے اپنی رائے کی حمایت میں دی ہے وہ سراسر مضحکہ انگیز ہے۔ بقول مہاتما گاندھی قلیل تعداد جماعتوں کی حق تلفی کے بعد کانگریس کی قوت دو روز بھی باقی نہیں رہ سکتی ہے۔ اور کانگریسی وزرا اگر فرقہ وارانہ تعصبات برتیں گے تو گویا خود اپنے ہاتھوں اپنی قبر کھودیں گے۔ اسوقت تمام ملک نے بلالحاظ فرقہ و ملت کانگریس کے لیڈران سے عنانِ حکومت سنبھالنے کی خواہش ظاہر کی ہے۔ اور آل انڈیا مسلم لیگ اور اُسکے حامیوں نے بھی ہر جگہ منارٹی پارٹی کے وزرا کی قایم کی ہوئی کیبنٹ میں شریک ہونے سے انکار کردیا ہے۔ عیسائی انجمن۔ احرار کانفرنس، انگلو انڈین جماعت، کسی نے بھی منارٹی وزرا کے ساتھ دینے میں اپنا

فائدہ نہیں سمجھا ہے اور نہ کسی قلیل التعداد جماعت نے صاحب وزیر ہند کے رائے کی حمایت کی ہے بلکہ اس کے برعکس تمام ملک نے مجموعی حیثیت سے گورنمنٹ ہند اور برطانیہ سے اپیل کی ہے کہ وہ کانگریس مصالحت کی کوئی نہ کوئی صورت نکالکر موجودہ حالت کو جلد ہی ختم کریں۔

سر محمد عثمان سابق گورنر مدراس، رائٹ آنریبل مسٹر شاستری، سر کاؤس جی جہانگیر جی وغیرہ مسلمہ لبرل لیڈران نے بھی گورنمنٹ کو یہی مشورہ دیا ہے۔ برطانیہ کے بعض نامور ماہران قانون نے بھی کانگریس کی پُرزور تائید کی۔ اور ہندوستان کے یورپین پریس نے متفقہ طور پر اس موقعہ پر اپنی تمام گذشتہ روایات کو بالائے طاق رکھکر کانگریس سے مفاہمت کرنے کی زور شور کے ساتھ سفارش کی ہے اخبار ٹائمس آف انڈیا بمبئی۔ مدراس میل مدراس۔ اسٹیٹسمین کلکتہ۔ پائونیر لکھنؤ۔ سب یک زبان ہوکر حکام بالادست پر زور ڈال رہے ہیں کہ جس طرح ہوسکے وہ موجودہ جمود کو جلد ہی رفع کریں۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ ہر صوبہ کی منارٹی پارٹی کے وزرا بھی سخت مشکل میں مبتلا ہیں۔ اور بار بار کانگریس کو اپنے فیصلہ پر نظر ثانی کی دعوت دے رہے ہیں اور کانگریسی وزرا کے واسطے ہر وقت جگہ خالی کرنے پر آمادگی کا اظہار سنہ کرکے اعلان کرچکے ہیں۔ ساتھ ہی منارٹی پارٹی کے وزرا ہر جگہ اپنے موافقین کی شیرازہ بندی کی کوشش کر رہے ہیں مگر انکے کامیابی کے کوئی آثار و قرائن نظر نہیں آرہے ہیں۔ حالانکہ یہ بزرگوار قریب قریب ہر جگہ کانگریس پروگرام ہی پر عملدرآمد کرنے پر تل گئے ہیں۔ ان سب باتوں سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ میدان عمل کانگریس ہی کے ہاتھ ہے۔ وزرائے بمبئی نے حال میں اپنا جو مکمل پروگرام شایع کیا ہے وہ بعینہ کانگریسی لیڈران کا پروگرام ہے۔ تاہم گورنر بمبئی نے اس میں کوئی مزاحمت نہیں کی۔ صوبہ متحدہ میں بھی وزرا نے امسال پہاڑ جانے کا خیال ترک کرکے سرکاری اخراجات میں ڈیڑھ لاکھ کفایت کی صورت نکالی ہے۔ اس کے علاوہ وزیر مال چالیس لاکھ مزید بچت کی تجویزیں سوچ رہے ہیں۔ سرکاری افسران کی تنخواہوں میں بھی کمی کا سوال درپیش ہے۔ کسانوں کی ترقی کی بھی فکر ہے۔ اور اشاعتِ تعلیم اور حفظان صحت کی تجویزیں بھی درپیش ہیں۔ غرض اگر آئندہ چار پانچ سال کے اندر ان تمام باتوں میں سے چند ہی کمل طریقے سے ہوجائیں تو سمجھنا چاہیئے کہ بہت بڑا کام ہوا۔ تعلیم عامّہ کا مسئلہ کوئی معمولی مسئلہ نہیں ہے اور جو وزارت اس مسئلہ کو کامیابی سے حل کرسکے وہ ہمارے دلی شکریہ کی مستحق ہوگی۔

بہرصورت کہ موجودہ حالات اور واقعات کی موجودگی میں ہم لیڈران کانگریس کے انکار وزارت پر اظہار افسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتے حال ہی میں صوبہ سرحد کے گورنر نے کونسل میں یہ تقریر کرتے ہوئے یہ ارشاد کیا کہ گو گذشتہ زمانہ میں اُن کو کانگریس کے ساتھ سختی برتنا پڑی لیکن اب وہ تمام باتوں کو دل سے محو کردینے پر تیار اور تمام آئینی معاملات میں اسمبلی کے کانگریس پارٹی کے ساتھ تعاون کرنے کو آمادہ ہیں۔ پارلیمنٹ نے بھی یکم اپریل سے صوبوں کے اندرونی نظم و نسق کے متعلق سوالات پوچھنے کی ممانعت کردی ہے غرض ان باتوں سے یہی ترشح ہورہا ہے کہ تحفظات کے باوجود برٹش افسران نئے آئین کو کم سے کم صوبوں میں حکومت خود اختیاری کے مسلّمہ اصولوں پر چلانا چاہتے ہیں۔ اسوقت ذمہ دار اصحاب کی طرف سے جو جو بیانات ہوئے ہیں اُن سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ حکومت کو خواہ مخواہ روڑے اٹکانے کا

خیال نہیں ہے۔ اور گورنران روزمرہ نظم ونسق میں خواہ مخواہ مداخلت کرنے کا ارادہ نہیں رکھتے ہیں۔
وزیر اعظم پنجاب اور بہار نے بھی اپنے مختصر تجربوں کی بنا پر اس خیال کی تائید کی ہے۔ ادہر مہاتما گاندھی
اس امر کو بالکل واضح کر چکے ہیں کہ دہلی کنونشن کے رزولیوشن کا ہرگز یہ منشا نہ تھا کہ گورنران صوبہ سے کوئی خلاف
آئین وعدہ طلب کیا جائے۔ مگر ہمکو جہاں تک بعض معتبر ذرایع سے معلوم ہوا ہے کانگریس لیڈران نے
گورنر صاحبان سے جن الفاظ میں اطمینان چاہا وہ مہاتما جی کے بیان کردہ منشا سے کہیں زیادہ تھے اس
وقت تک قضیہ کو طے کرنے کے متعلق کئی اہم تجویزیں پیش کی جاچکی ہیں۔ مگر ہم کو سب سے بہتر جو
تجویز معلوم ہوئی ہے ان میں ایک رائٹ آنریبل مسٹر شاستری نے پیش کی ہے۔ یہ ہے کہ کانگریس
اپنے رزولیوشن میں لفظ معمولاً کا اضافہ کردے اور گورنران اس بات کا اطمینان دلادیں کہ وہ
معمولاً وزرا کے مشوروں کو رد نہ کریں گے۔ اخبار اسٹیٹسمین نے اس سے بھی بہتر یہ تجویز پیش کی ہے
کہ حضور وائسرائے تمام صوبجات کے گورنروں وزیروں اور کانگریسی لیڈروں کی ایک کانفرنس منعقد کرکے
اس مسئلہ کو ہمیشہ کے لئے اس طرح طے فرمادیں کہ جب کبھی کسی معاملے پر گورنر اور وزرا میں اصولی اختلاف
رائے ہو تو وہ صوبہ کی قانونی اسمبلی کے فیصلہ پر چھوڑ دیا جائے مہاتما گاندھی نے اپنی طرف سے
اس تجویز پر صاد کردیا ہے۔ اب صرف ہز ایکسیلنسی وائسرائے کی منظوری کی ضرورت ہے۔ چونکہ صاحب
ممدوح نے ابھی تک اس پر کوئی اظہار رائے نہیں کیا ہے۔ اس لئے وہ اس بارے میں آسانی سے
پیشقدمی کر سکتے ہیں۔ ہماری رائے میں ملک کی سب سے بڑی ضرورت یہی ہے کہ نئے آئین کے آغاز پر جو رخنہ
حائل ہوگیا ہے۔ وہ جلد سے جلد قابل اطمینان طریقے پر طے کردیا جائے۔ اس لئے ہم گورنمنٹ اور کانگریس
دونوں سے اپیل کرتے ہیں کہ خواہ مخواہ ضد سے کام نہ لیں اور معقول پسندی سے اس نزاع کو جو بہتوں کو
فضول معلوم ہوتی ہے طے کرلیں تاکہ عوام نے جو امیدیں ملکی نظم ونسق کے متعلق وابستہ کر رکھی ہیں
وہ پوری ہوسکیں۔

اعلیٰحضرت نظام کا جشن جوبلی

پچھلے مہینے کے اہم واقعات میں دو تقریبیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ حیدرآباد میں ہز اگزالٹیڈ
ہائینس سلطان دکن دبرار نے جس سادگی سے اپنی پچیس سالہ عہد حکومت کی نقرئی جوبلی کا جشن منایا
اس کا عوام ملک پر ایک خاص اثر ہوا ہے۔ اعلیٰحضرت نظام جس مستعدی وتندہی کے ساتھ
نظم ونسق ریاست کی نگرانی فرماتے ہیں۔ جس انصاف پسندی، دور اندیشی اور حسن تدبیر سے وہ بہ نفس
نفیس کل کاروبار حکومت کو انجام دیتے ہیں۔ اس پر نہ صرف ریاست حیدرآباد بلکہ تمام والیان ملک کو فخر
کرنے کا حق ہے۔ اسی انہاک اور توجہ کا نتیجہ ہے کہ پچھلے پچیس سال کے اندر حیدرآباد کی وسیع ریاست نے
ہر طرح کی ترقی کی ہے۔ انتظام سلطنت، مالی خوشحالی، رعایا کی ترقی، تجارتی فروغ غرض زندگی کے ہر
شعبے میں ریاست نے خاصی ترقی کرلی ہے۔ علمی وادبی حیثیت سے بھی موجودہ زمانہ میں ریاست نے
اپنے فرمانروا کے توجہ خاص کی بدولت عظیم الشان ترقی کی ہے۔ اعلیٰحضرت نے اردو زبان کی بھی شاہانہ
پیمانہ پر سرپرستی فرمائی ہے۔ غرض ہر حیثیت سے ہز اگزالٹیڈ ہائینس میر عثمان علیخان بہادر بالقابہ کی ذات

ہمایونی ملک کیلئے باعث برکت ثابت ہوئی ہے۔ اس لئے اس مبارک تقریب پر اعلیٰ حضرت اور ان کے وزراء ہمارے دلی مبارکباد کے مستحق ہیں۔ خداوند تعالےٰ آپ کا سایہ عرصہ دراز تک قائم برقرار رکھے۔

مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی جوبلی

آخری ہفتہ مارچ میں مسلم یونیورسٹی علیگڈھ میں مسلمانوں کے تعلیمی انجمن کی پنجاہ (۵۰) سالہ جوبلی بھی بڑی دھوم دھام سے منائی گئی۔ ایڈیٹر زمانہ کو بھی اردو پریس کانفرنس کے جلسے میں شرکت کے لئے علیگڈھ جانے کا اتفاق ہوا تھا۔ چنانچہ کانفرنس کے اعلےٰ انتظامات اور اس کے دفتر کی شاندار عمارات سلطان جہاں منزل کو دیکھ کر جو بیگم صاحبہ سابق فرمانروائے بھوپال کی فیاضی کی یادگار ہے۔ یہ اندازہ ہوا کہ کانفرنس کی تحریک اب مستقل بنیاد پر قائم ہے۔ اس کے مصارف کے لئے اعلےٰ حضرت حضور نظام دکن کے گراں بہا عطیہ کی رقم مستقل سرمایہ کی صورت میں بنک میں جمع ہے۔ چنانچہ اس وقت یہ انجمن مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لئے بہت کچھ کام کر رہی ہے۔ اس کی عمارت میں ایک علمی کتب خانہ بھی ہے جس میں تعلیمی مسائل و معلومات کے متعلق بہت سی اہم کتابیں اور سرکاری رپورٹیں موجود ہیں۔ منتظمان کانفرنس نے اس موقع پر کل اجلاس کانفرنس کی کارروائی کو بارہ مختلف شعبوں میں تقسیم کیا تھا۔ جس کی تفصیل یہ ہے

(۱) ابتدائی تعلیم اور مدارس اردو (۲) ثانوی تعلیم (۳) اعلیٰ تعلیم (۴) تعلیم نسواں (۵) اسلامی مدارس (۶) تعلیم بالغان (۷) ٹیکنیکل تعلیم (۸) اسلامی علوم و فنون (۹) اصلاح تمدن (۱۰) اردو کانفرنس (۱۱) اردو پریس کانفرنس (۱۲) تعلیمی نمائش۔

راقم الحروف کو اردو پریس کانفرنس کے دو اجلاسوں کے سوا جو ۲۷ مارچ کی شام اور ۲۸ مارچ کی صبح کو منعقد ہوئے اور کسی شعبے کے اجلاس میں شریک ہونے کا موقعہ نہیں ملا۔ تاہم حسن اتفاق اور مولانا نظامی بدایونی اور مولوی اکرام اللہ خاں ندوی کے لطف و کرم سے روانگی سے پہلے تعلیمی نمائش کو ایک سرسری نظر سے دیکھنے کا موقعہ مل گیا۔ اس نمائش میں مشرقی علوم و فنون کے متعلق بہت سی دلچسپ چیزیں جمع تھیں جن میں خوشخطی اور مصوری کے بیش بہا نمونے اور متعدد نادر و قدیم قلمی کتابیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ لڑکے لڑکیوں کی دستکاریوں کے بھی بہت سے دلخوش کن نمونے دکھائے گئے تھے۔ غرض بحیثیت مجموعی علمی نقطۂ خیال سے یہ شعبہ بہت کامیاب رہا۔ یہ ضرور رہی کہ ایک محدود وقت کے اندر اتنے جلسے اکٹھا ہو گئے تھے کہ ایک ہی وقت میں مختلف کمروں میں مختلف شعبوں کے جلسے ہوتے تھے اور کسی شخص کے لئے سب جلسوں میں شریک ہونا ممکن نہ تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہر جلسے میں حاضرین کی تعداد کم رہتی تھی۔

بعض شعبوں کی کارروائی قابل ذکر ہے۔ شعبۂ خواندگی کے صدر نامور محب وطن مسٹر طفیل احمد صاحب تھے۔ جن کا قابل قدر خطبہ صدارت ہم آئندہ نمبر میں ہدیۂ ناظرین زمانہ کریں گے۔ اسی طرح ثانوی تعلیم کے ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کی صدارتی تقریر جو اکثر اخبارات میں شائع ہو چکی ہے اہل وطن کے غور کی مستحق ہے۔ اعلیٰ تعلیم کے متعلق علامہ عبد اللہ یوسف علی صاحب کے ایڈریس سے اس بات کا روشن ثبوت ملتا ہے کہ مسلم بزرگان اہم ملکی مسائل کو اب محض فرقہ وارانہ نقطۂ خیال سے دیکھنے کے بجائے عام ملک کے لئے ایک تعلیمی انقلاب کی ضرورت محسوس کر رہے ہیں

کو ہمیشہ بہت بڑا دخل رہتا ہے۔ مَیں اس صاف گوئی کے لئے معافی کا خواستگار ہوں، لیکن امرِ واقعہ یہ ہے کہ ورنیکلر پریس کا سب سے بڑا نقص یہی ہے کہ وہ چھوٹے چھوٹے واقعہ کو بھی فرقہ وارانہ عینک سے دیکھنے کا عادی ہوگیا ہے، یہاں تک کہ اگر کہیں کوئی چور گرفتار ہوتا ہے یا کوئی گرہ کٹ سزا پاتا ہے یا کسی سے کوئی اور بداخلاقی سرزد ہوتی ہے تو اکثر اُردو اخبارات میں جلی حروف میں ملزم کا آبائی مذہب واضح کردیا جاتا ہے، حالانکہ ظاہر ہے کہ اخلاقی قصورواروں کو کسی مذہب سے دُور کا تعلق بھی نہیں ہوسکتا۔ اسی طرح جب کبھی سزا دینے والے حاکم اور سزا پانے والے مجرم مختلف مذاہب کے پیرو ہوتے ہیں تو اکثر اوقات اخبارات میں اس مذہبی اختلاف کی بدنما تشریح کردی جاتی ہے۔

اِسی قبیل کی اور بہت سی دل آزار باتیں ہیں جن سے ہم لوگ تھوڑی سی احتیاط سے اپنے اخبارات کو محفوظ رکھ سکتے ہیں۔

فرقہ وارانہ حقوق کی حفاظت

بہرحال وقت آگیا ہے کہ ہم ان باتوں میں ضروری اصلاح کریں۔ ابھی تک یہ مشغلہ خودغرض لیڈروں یا سرکاری ملازمت کے خواہشمندوں کے مفید مطلب ہونے کی وجہ سے مقبول و مفید ہوتا تھا۔ مگر اب یہ رویّہ پریس کی رُسوائی کا باعث ہوگا۔ یہاں پر میری یہ مُراد ہرگز نہیں ہے کہ کسی جماعت یا طبقے کی جائز شکایات درج اخبار نہ کیجائیں، یا ہم اخبارنویس کسی فرقہ کے حقوق پامال ہونے دیں یا اُن کے حقوق کی وکالت نہ کریں۔ میری منشا صرف یہ ہے کہ جس طرح سے ممکن ہو ہم اپنے زبان و قلم پر اعتدال و متانت کی پابندیاں عائد کریں، اور بہت سی ایسی باتوں کو جو راست مگر فتنہ انگیز ہیں منظرِ عام پر لانے سے پرہیز کریں۔ اس سے کسی کو کوئی مستقل نفع نہیں پہونچتا، بلکہ اُلٹا ملک کو نقصان پہونچتا ہے۔ اِن باتوں کو ذمہ دار لوگوں تک پہونچانے کے لیئے اخبارات کے علاوہ اور مؤثر ذرائع ہیں جن سے لیڈرانِ قوم فائدہ اُٹھا سکتے ہیں۔

رائے عامہ اور اُردو پریس

اِس سلسلے میں اُردو اخبارات کے لئے ایک اور غورطلب مسئلہ ہے، ابھی تک ہم کو بھی خواص اور اُن کے لیڈروں سے واسطہ تھا جن میں سے اکثر اصحاب شہروں کے نیم تعلیم یافتہ و جاہل طبقے کے رہنما ہیں اور اُنھیں سے ہر وقت کھیلا کرتے ہیں۔ اس لئے اخبارات کے لئے بھی اس کھیل میں شامل ہوجانے میں چنداں قباحت نہ تھی مگر اب ملک کی اہم سیاسی تحریکیں عوام سے براہِ راست اپیل کرنے کا فارمولا تجویز کررہی ہے۔ مثلاً کانگریس نے دیہاتی آبادی سے اقتصادی میدان میں براہ راست رابطۂ اتحاد و اشتراکِ عمل پیدا کرنے کی کوشش شروع کردی ہے۔ دوسری پارٹیوں کو بھی اپنا اثر و اقتدار برقرار رکھنا ہے تو اسی لائن پر چلنا چاہیئے۔

اور انھیں بھی اپنے طرز عمل اور کارگزاریوں کے لئے عام باشندوں سے مقبولیت کی سند لینا ہوگی۔ تو دوسرے ترقی یافتہ ملکوں کی طرح ہندوستان کا پریس بھی سلطنت کا ایک ضروری رکن بن جائیگا۔ اب تک ہمارے حکمران اُردو ہندی اخبارات کو چنداں خاطر میں نہیں لاتے ہیں، لیکن عنقریب ہی پوزیشن بدلنے والی ہے، جس میں صوبجاتی زبان کے اخبارات کی اہمیت خواہ مخواہ بڑھ جائیگی۔

اخبارات سے ملک کی توقعات

مگر پورا وقار اور اثر حاصل کرنے کے لئے ہندوستانی اخبارات کو بھی اپنی حالت درست کرنا پڑے گی۔ رفاہ عام کے مقصد کو ذاتی مفاد پر ترجیح دینا ہوگا۔ عام بہبودی کا خیال مقدم رکھنا ہوگا فرقہ وارانہ نقطۂ خیال کو معدوم کرنا ہوگا۔ اور اخبارات کو صوبہ کے مفاد کا سچا محافظ اور رائے عامہ کا صحیح ترجمان بنانا ہوگا۔ اس لئے ہماری تحریروں اور ہمارے خیالات میں اُن تمام ذمہ داریوں کا اثر نمایاں ہونا چاہیئے۔ جو ایک خود دار اور خود مختار قوم کے اخبارات کے لئے لازمی ہیں۔

ابھی تک اُردو ہندی پریس پر فرقہ وارانہ ذہنیت غالب ہے، مگر اب اس تنگ نظری کا کوئی موقعہ باقی نہیں رہا۔ اس لئے ہم اخبار نویسوں کو تعصب و تنگ دلی کی پالیسی کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہہ دینا چاہیئے۔ حال ہی میں پنجاب کے وزیر اعظم سر سکندر حیات خاں نے اِس سلسلے میں اپنے صوبے کے اخبار نویسوں سے کشادہ دلی سے تبادلۂ خیالات فرمایا تھا۔ اس ملاقات کے دوران میں آپ نے ہندوستانی پریس کی آیندہ ترقی کے لئے جو کچھ فرمایا وہ سب اخبار نویسوں کے واسطے یکساں مفید ہے۔ آپ کا عزم ہے کہ تین سال کے اندر پنجاب فرقہ پرستی کے عیب سے بالکل پاک ہو جائے۔ آپ نے اس بارے میں پریس کی اہمیت پورے طور پر محسوس کر لی ہے۔ چنانچہ ایڈیٹران اخبار کو اپنے طرف سے ہر قسم کی سہولتیں دینے کا وعدہ فرمانے کے ساتھ ساتھ آپ نے پریس ایکٹ کے متعلق بھی ایک جدید نظریہ پیش کیا ہے جو ہندوستانی سیاسیات کی تاریخ میں ایک روشن باب ہوگا۔ آپ نے اخبار نویسوں سے فرقہ وارانہ تعصبات مٹانے کی اپیل کرتے ہوئے اس بات کی تنبیہ کی ہے کہ اُن کے عہدِ حکومت میں فرقہ وارانہ اختلافات پیدا کرنے والے اخبارات کی خیر نہ ہوگی۔ اور وہ اس معاملے میں پریس ایکٹ کے دفعات سے پورا فائدہ اُٹھائیں گے۔ ہم کو اُمید ہے کہ معزز معاصرین پنجاب سر سکندر حیات خاں صاحب کو اس بارے میں سخت گیری کا موقعہ نہ دیں گے۔

فرقہ وارانہ ذہنیت

پنجاب ہو یا صوبہ آگرہ و اودھ فرقہ وارانہ ذہنیت قائم رکھنے اور اُسے ترقی دینے میں اخبارات

کسی پارٹی یا پالیٹکس سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ بلکہ ملکی حالات پر محض ایک اخبار نویس کے نقطۂ خیال سے نظر ڈالنا ہے۔ اِس وقت اس سے کوئی بحث نہیں کہ کس جماعت کو کہاں اقتدار حاصل ہوگیا ہے۔ اور انتخابات میں کس کو فتح اور کس کو شکست نصیب ہوئی۔ بلکہ فتح و شکست کے اصلی اسباب پر غور کرکے اپنے واسطے ایک صحیح راہ عمل تجویز کرنا ہے۔

عوام کی بیداری

نیا آئین خواہ کتنا ہی ناقابل اطمینان کیوں نہ ہو، لیکن اس نے عوام کی ایک بڑی تعداد کو ووٹ کا حق دیکر ہم کو اہل ملک سے براہ راست اپیل کرنے، اُن کے ضروریات وخیالات سے دلچسپی لینے اور اُن پر اثر قایم کرنے کا موقعہ دیا ہے۔ اب ہمارے لیڈروں کے لیئے صرف تعلیم یافتہ جماعت کو رضامند رکھنا کافی نہ ہوگا، کیونکہ آیندہ پبلک کاموں کی داد خواص کے بجائے عوام سے لینا ہوگی۔ اسمبلی میں بھی ملکی قائم مقاموں کو ہر مسئلہ کو عوام کے نقطۂ خیال سے دیکھنا اور ہر بات میں رفاہ عام کے خیال کو پیش نظر رکھنا ہوگا۔ عام ووٹروں کو خوش رکھنے اور اُن کے سود وبہبود کی فکر کرنا ہوگی۔ ملک کی مالی حالت درست کرکے لوگوں کے آرام وآسایش اور تعلیم وتربیت کی کوشش کرنا پڑے گی۔ مثلاً ابھی صوبۂ متحدہ میں صرف ۲۹ر۳ فیصدی آبادی کی تعلیم دینے کا انتظام ہے۔ دس ہی پانچ سال کے اندر جبریہ تعلیم وغیرہ جاری کرکے چالیس پچاس فیصدی آبادی کو حرف شناس بنانا ہوگا۔ کوشش کی جائے تو یہ آسانی سے ممکن ہے۔ آخر جاپان کی حکومت نے اس باب میں کیا کچھ نہیں کر دکھایا ہے۔ کوئی وجہ نہیں کہ ہندوستانی وزیر بھی عوام کی تعلیم کے لئے ایسی ہی کوشش نہ کریں۔

جبریہ تعلیم اور ہندوستانی اخبارات

ہم لوگ اِس باب میں کتنے پیچھے ہیں، یہ اس سے معلوم ہوسکتا ہے کہ جزائر برطانیہ میں جبریہ تعلیم کا ایکٹ ۱۸۷۰ء میں پاس ہوا تھا۔ جب سے وہاں بچوں کو ابتدائی تعلیم جبریہ دی جاتی ہے۔ ہندوستان میں بھی ایسا ہی ایکٹ پاس ہونا چاہیئے۔ جبریہ تعلیم رائج ہونے کے ساتھ ہی ہندوستانی زبان کے اخبارات کی قسمت جاگ اُٹھے گی۔ نئے اسمبلی میں تقریریں بھی زیادہ تر ہندوستانی زبان میں ہوا کریں گی۔ جس کی وجہ سے صوبجاتی سیاسیات میں دیسی زبانوں کو اُن کا جائز اور واجبی درجہ جو اس وقت انگریزی زبان نے غصب کر رکھا ہے ازسرنو واپس ملے گا۔ مجھے امید ہے کہ چند ہی سال کے اندر ہمارے صوبہ کے قانونی اسمبلی کی زبان ہندوستانی قرار دیدی جائے گی۔ اور اُس کی کُل کارروائی اُردو ہندی میں ہوا کریگی۔ ابھی تک ہم کو برٹش افسران سے عرض حال کرنا پڑتا تھا، اس لئے انگریزی اخباروں کی قدر بڑھ گئی تھی، مگر اب جبکہ ہمارا روئے سخن ہمارے واضعان قانون اور ہندوستانی وزراء سے ہوگا

کرنے کی طاقت بھی ان کو حاصل ہوگئی ہے۔ اب تک حکومت عوام کی جوابدہ نہ تھی۔ اس لئے نہ عوام کو پبلک معاملات سے چنداں دلچسپی تھی اور نہ ان کو سیاسی تعلیم دینے کی کوئی ضرورت ہی پیدا ہوئی تھی، مگر اب جب صوبجاتی وزیر رائے عامّہ کے ماتحت ہونگے تو ملک کے اخبارات کو عوام کے مسائل ملکی کے متعلق تعلیم و تربیت دینے کی خدمت اپنے سر لینا ہوگی۔

موجودہ ایکٹ میں گورنران صوبہ کو چاہے جو اختیارات ہوں لیکن چند ہی سال کے عرصے میں اُن کی حیثیت رفتہ رفتہ صرف بادشاہ سلامت کے آئینی قائم مقام کی رہ جائیگی انگلستان کے مشہور ماہر قانون سر جان سالمن کے قول فیصل کے مطابق برطانوی آئین کے روسے بادشاہ سلامت کے اختیارات ملکؔ کے عام خیالات وواقعات سے مطلع رہنے مسائل ملکی میں اپنے وزیروں کو مشورہ دینے اور اُنؔ کے سیاسی طرز عمل کے نتائج سے اُنھیں متنبہ کرنے تک محدود ہیں۔

ہندوستان میں اِس پوزیشن کے حاصل ہونے میں ابھی کچھ عرصہ درکار ہے مختلف وجوہ سے یہاں ابھی گورنروں کو ہر معاملہ میں دخل دینے کا اختیار حاصل ہے۔ لیکن بالآخر یہاں بھی گورنر جنرل اور گورنران صوبہ کو اس سے زیادہ اختیارات نہ ہونگے جو خود ملک معظم کو حکومت انگلستان میں حاصل ہیں۔

اس اثنا میں صوبجاتی پریس کی اہمیت اور اُس کا دائرۂ اثر بہت بڑھ جانا چاہیئے سیاسی ترقی کے اس نئے دَور میں گورنمنٹ اور رعایا دونوں کے نقطۂ خیال سے اخبارات کو ایک خاص پوزیشن حاصل ہونا چاہیئے۔ اس لئے ہم کو اس وقت اپنی حالت اور ذمہ داریوں کا صحیح اندازہ کرکے اپنے اصلاح و تنظیم کی طرف متوجہ ہونا چاہیئے۔ اس لحاظ سے اُردو پریس کانفرنس کی تحریک نہایت باموقعہ ہے۔

درحقیقت یہی وقت ہے کہ باہمی تبادلۂ خیالات سے ہم نئی ذمہ داریوں کے سنبھالنے کی قابلیت پیدا کرلیں تاکہ ملک وصوبہ کی سیاسیات میں اُردو اخبارات اپنے واجبی حق وحصہ سے محروم نہ رہیں۔ ملک کی تبدیل شدہ حالت کے لحاظ سے ہم کو اپنی عام پالیسی میں ترمیم و اصلاح کی سخت ضرورت ہے۔ اس لئے ہم کو یہ غور کرنا چاہیئے کہ نئے حالات میں کس طرح ہم اپنے اخباری فرائض قابل اطمینان طریقے پر ادا کرسکتے ہیں؟ موجودہ واقعات ہم کو کیا سبق دیتے ہیں؟ عام رجحان کس طرف ہے؟ اور ہم اُس سے کیا فائدہ اُٹھا سکتے ہیں؟ یہاں پر مجھ کو

تغیرات کا دور رس اثر

بہت دور رس، دیرپا اور انقلابی ہوگا۔ متمدن دنیا کی تاریخ شاہد ہے کہ ایک مرتبہ جب دفتری حکومت اور مطلق العنان وغیر ذمہ دار طرز گورنمنٹ میں جمہوری اصول کو دخل مل جاتا ہے پھر عوام کی سیاسی بیداری اور جمہور کے حقوق طلبی کی جتنی حدیں مقرر کی جاتی ہیں وہ سب کی سب بالآخر بیکار ثابت ہوتی ہیں۔ اس وجہ سے میری نگاہ میں اس تغیر و تبدل کی جو صوبوں کی گورنمنٹ میں ہو رہا ہے غیر معمولی اہمیت ہے۔

بحالت موجودہ ملک کی بے سروسامانی، برادران وطن کی باہمی ناچاقی۔ خواص کی بے لبسی اور عوام کی بیکسی دیکھ کر اکثر کمزور دل اور سست عقیدہ احباب کے دلوں میں آیندہ کی طرف سے وسوسے پیدا ہو رہے ہیں، لیکن عالمگیر افلاس و جہالت اور تمام دیگر نقائص و خامیوں کے باوجود ہندوستانیوں کے خمیر میں ابھی تک امن و صلح، حق و انصاف اور رواداری کا مادّہ باقی ہے۔ ہمارے اہل وطن فطرتاً امن پسند اور صلح جُو واقع ہوئے ہیں۔ کروروں باشندگان اب بھی پنچایتوں کے فیصلوں کے احترام کے عادی ہیں اور میلے ٹھیلوں، ہٹھوں، مزاروں خانقاہوں اور روزمرہ زندگی میں بہت سے موقعوں پر سب کے ساتھ یکساں سلوک کیا جاتا ہے۔ اور کسی کو ناگوار نہیں ہوتا۔ بقول لارڈ زٹلینڈ صدیوں پہلے گوتم بدھ کے زمانہ میں ہندوستان میں موجودہ طرز کا جمہوری نظام حکومت جاری تھا۔ ان سب باتوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہم کو تمام موجودہ مشکلات کے باوجود جمہوری اصولوں کی ترقی اور نئے دور حکومت کی کامیابی میں شک کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔ یہ ضرور ہے کہ اس وقت ہر طبقہ، ہر فرقہ اور ہر جماعت کی سیاسی ذمہ داریوں میں غیر معمولی اضافہ ہو گیا ہے۔ حب وطن اور ملکی خیر خواہی کا تقاضا ہے کہ یہ ذمہ داریاں خلوص و ایمانداری کے ساتھ ادا کی جائیں ورنہ ملک کے ساتھ بدترین غدّاری ہوگی۔ اخبار نویسوں کے فرائض بھی اس مرحلے پر بہت نازک ہیں۔

اخبار نویسوں کے فرائض کی اہمیت

مطلق العنان دفتری حکومت کے زمانہ میں سرکاری نظم و نسق میں عوام اور اُن کے قایم مقاموں کا کوئی دخل نہ تھا۔ حکمراں طبقہ عوام کے قسمت کا مالک و مختار کامل تھا۔ اس لیے اپنی رائے کے بموجب ہمارے اور اپنے سود و بہبود کے لئے جو چاہتا تھا کرتا تھا۔ لیکن اس دَور میں یہ حالت دیر تک باقی نہیں رہ سکتی۔ اور خواہ کتنے ہی روڑے کیوں نہ اٹکائے جائیں مگر اب پولٹیکل طاقت کا سررشتہ جلد ہی رائے عامہ کے ہاتھ میں آجائے گا۔ ملک نے ہر جگہ اپنی مرضی اور خواہش کے مطابق اپنے قائم مقام چُن لئے ہیں، اور ان میں ردوبدل

زمانہ

جلد ۶۸   اپریل ۱۹۳۷ء   نمبر ۴

اُردو اخبارات کی مشکلات اور اُنکی نئی ذمّہ داریاں

محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کی پچاس سالہ جوبلی کے سلسلے میں ۲۰ مارچ ۱۹۳۷ء کو علیگڈھ مسلم یونیورسٹی میں اُردو پریس کانفرنس بھی ایڈیٹر زمانہ کی صدارت میں منعقد ہوئی تھی۔ اس موقعہ پر راقم الحروف نے جو تقریر کی اس ضروری اقتباسات ذیل میں ہدیۂ ناظرین زمانہ ہیں۔

ایڈیٹر

نیا سیاسی دور۔ ہمارا ملک آج کل ایک نئے سیاسی دور سے گذر رہا ہے جس کے آخری نتائج کا ابھی کوئی صحیح اندازہ نہیں کیا جاسکتا لیکن اس سے ملکی ترقی اور قومی فلاح کی بہترین اُمیدیں ضرور وابستہ ہیں۔ تین ہی دن کے بعد یکم اپریل ۱۹۳۷ء سے صوبجات کی گورنمنٹ میں اُصولی تبدیلیاں ہو رہی ہیں جن سے نظم و نسق کی باگ ڈور بہت کچھ ہمارے منتخب قائم مقاموں کے ہاتھ میں آجائیگی۔ اور گو نئے آئین سے کسی طبقے کی تشفی نہیں ہوئی ہے، اور مقتدر مدبران انگلستان نے اس معجون مرکب آئین حکومت کے ماتحت ہندوستانی وزیروں کے اختیارات محدود کرنے میں انسانی تدابیر کی حد تک کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھی ہے۔ تاہم نئے آئین کے عملدرآمد میں سیاسی اقتدار کا مرکز قطعاً تبدیل ہو جائے گا۔ اور مختلف صوبوں کی حکومت گورنر اور اُن کے ماتحت افسروں کے بجائے عوام ہند کے قائم مقاموں کے ہاتھ میں آجائے گی۔ برٹش ماہرین جہانبانی کے تمام حزم و احتیاط کے باوجود بالآخر اس تبدیلی کا اثر

ایسی صورت میں اخبار نویسوں کو بھی سوچنا چاہیئے کہ وہ کس طبقے کی نمایندگی کریں۔

خوب سمجھ لیجئے اب کسی کو کوئی مقدس پوزیشن حاصل نہیں رہی۔ ہندوستانی اخبارات بھی اپنے رویّہ کی بدولت امریکہ کے اخبارات کی طرح رائے عامہ سے بیگانہ ہو سکتے ہیں مگر اردو پریس کے لئے یوسف بے کارواں ہوکر زندہ رہنا مشکل ہوجائیگا۔ کیونکہ امریکن پریس ایک ترقی یافتہ پریس ہے۔ اسے مقتدر سرمایہ داروں کی سرپرستی حاصل ہے جس سے اسکو لاکھوں کروروں روپیہ کی آمدنی ہوتی ہے۔ تاہم امریکہ کی سیاسی تنظیم نے اس پیشہ کو مالی حیثیت سے نفع بخش تو بنادیا ہے لیکن امریکن اخبارات کو عام رائے پر کوئی اثر حاصل نہیں۔ عام رائے اخبارات کے بہ نسبت ہمیشہ پلیٹ فارم سے زیادہ متاثر ہوتی ہے۔ چنانچہ اس دفعہ پریسیڈنشل انتخاب میں گو امریکہ کے ۶۵ فیصدی اخبارات نے مسٹر روز ولٹ کے خلاف جہادِ عظیم برپا کر رکھا تھا لیکن اس کا کوئی اثر نہیں ہوا اور عوام نے اُن کو غیر معمولی کثرت رائے سے دوبارہ منتخب کر لیا۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ امریکہ میں عوام الناس نے اِس بات کو بخوبی محسوس کر لیا ہے کہ اُن کے اخبارات اپنی ایماندارانہ رائے نہیں رکھتے، بلکہ مقتدر سرمایہ داروں کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بن گئے ہیں۔ اُردو اخبارات کے لئے یہ حالت موت کے برابر ہوگی۔ ہمارے لئے پریس کی مفروضہ طاقت کے زعمِ باطل پر واقعات سے چشم پوشی کرنا سخت غلطی ہوگی، اس لئے میں بہ منت عرض کرونگا کہ معاصرین کو غلط خیالات، غلط اُصولوں اور غلط رویّہ سے بچکر کام کرنا چاہیئے۔ فرقہ وار نقطۂ خیال کی ابھی تک چاہے جتنی قدر کی گئی ہو لیکن آیندہ کے لئے اُس کی ہر دلعزیزی ختم شدہ سمجھ لینا چاہیئے۔

سیاسی لیڈروں کو اب عوام سے واسطہ رہے گا، کانگریس اور اُس کی تقلید پر دوسری جماعتیں عوام کے پاس اپنے پیغام براہ راست بھیجنے کا بندوبست کر رہی ہیں۔ اس لئے کاروباری نقطۂ خیال سے بھی ہم کو اپنا وطیرہ بدل دینا چاہیئے اور چھوٹے چھوٹے جھگڑوں پر زیادہ توجہ دینے یا زورِ قلم صرف کرنے کے بجائے رفاہِ عام کے بڑے بڑے مسئلوں پر غور کرنا چاہیئے۔ اور اپنے اخبارات کو فرقہ وارانہ نقطۂ خیال کی نیابت سے ہٹا کر مفادِ عام کا آرگن بنا دینا چاہیئے۔ بہتر ہے کہ ہر معاملہ کو حق و انصاف کی ترازو میں تولا جائے اور ہر پہلو پر غور کرکے رائے قائم کی جائے۔ تاکہ آزاد ملکوں کے اخبارات کو جو اعلیٰ پوزیشن حاصل ہے وہی اُردو پریس کو بھی حاصل ہو۔

عوام تک پہونچنے کے لئے ہم کو اپنے اخبارات کی زبان بھی عام فہم بنانا ہوگی عوام کے

جذبات کی ترجمانی اور اُن کے حقوق کی وکالت کے لیئے ہم کو سادہ اور سلیس زبان استعمال کرنا چاہیئے۔ اپنی تحریروں میں ہم کو مشکل الفاظ اور نامانوس فقروں کے بجائے حتی المقدور سہل۔ عام فہم اور مروجہ الفاظ کو ترجیح دینا چاہیئے۔ اس کے متعلق اگر اُردو پریس کانفرنس کے ماتحت کوئی متفقہ اُصول طے ہوجائے یا مختلف الفاظ اور اصطلاحوں کے بارے میں کوئی باہمی فیصلہ ہوجائے تو وہ سب کے لئے مفید ہوگا۔ میری رائے میں ہم کو نامانوس اور اجنبی الفاظ کو یک قلم خیرباد کردینا چاہیئے۔ اور نئی نئی اصطلاحیں گڑھنے سے محترز رہنا چاہیئے، تاکہ ہماری تحریریں عوام کے ذہن نشین ہوسکیں اور اُردو کی ہردلعزیزی میں ترقی ہو۔

عام فہم زبان کا استعمال

پبلک اخلاق کے معیار کو بلند کرنا بھی اخبارات کا فرض ہے، اس لئے اشتہارات کی عبارت میں بھی تہذیب ومتانت کا مدنظر رکھنا ضروری ہے۔ خوشی کی بات ہے کہ بعض معزز اخباروں نے اس بارے میں دیگر معاصرین کے لیے ایک قابل تقلید مثال قائم کردی ہے، مثلاً معزز ہمعصر ریاست دہلی کو اشتہارات سے کثیر آمدنی ہوتی ہے، لیکن اُس میں فحش اشتہارات شائع نہیں ہونے پاتے بلکہ ان کے خلاف وقتاً فوقتاً مخالفت کی آواز بلند ہوتی رہتی ہے۔ معزز اخبار مدینہ نے بھی اپنے یہاں مخرب اخلاق اور عریاں اشتہارات کی اشاعت ممنوع کردی ہے۔ مگر مجھکو افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ اس بارے میں بعض ہندوستانی اخبارات بہت زیادہ بے احتیاطی برتتے ہیں جسکی وجہ سے کچھ دنوں سے انگلستان وغیرہ کی بنی ہوئی معمولی مقوی غذاؤں کے ہندوستانی اشتہارات میں بھی ہمارے یہاں کے اخباری مذاق کی جھلک دکھائی دینے لگی ہے[1]۔ پریس کانفرنس اس بارے میں بھی اُردو پریس کی بخوبی رہنمائی کرسکتی ہے۔

عریاں اشتہارات کی اشاعت

فحش اور مخرب اخلاق کتابوں اور دھوکہ باز لوگوں کے ہتھکنڈوں سے پبلک کو بچانے کا بار بھی اخبارات ہی کے ذمہ ہے۔ حال میں بعض انگریزی رسالوں کی تقلید میں اطراف ملک کے جعل سازوں نے انعامی معموں کے اشتہارات کے ذریعے لوگوں کو دھوکا دیکر روپیہ وصول کرنا شروع کردیا ہے یہ لوگ خود اخباروں کو بھی جن کے ذریعہ وہ روپیہ پیدا کرتے ہیں دھوکا دینے میں دریغ نہیں کرتے۔

انعامی معموں کے اشتہارات

اس میں شک نہیں کہ کاروباری حیثیت سے نیک و بد کی تمیز بہت مشکل ہے لیکن باہمی تنظیم سے ان لوگوں کی نقصان پہونچانے کی قوت محدود کی جاسکتی ہے۔ مثلاً پریس کانفرنس کے دفتر میں بدمعاملہ مشتہرین کی فہرست رکھی جاسکتی ہے اور اس سے سب اخبارات یکساں فائدہ اٹھاسکتے ہیں۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ہم لوگ اشتہاروں کے متعلق چند اُصول باہم طے کرلیں جن پر ہر اخبار میں

[1] غالباً اسی وجہ سے بعض امراض کی دواؤں کے اشتہارات کی انگلستان کو بذریعہ ڈاک روانگی ممنوع قرار دیدی گئی ہے۔

عمل کیا جائے۔

اسی طرح بد معاملہ ایجنٹوں کی فہرست بھی مرتب ہو سکتی ہے، اور ایک عام شرح کمیشن مقرر کی جاسکتی ہے۔ اتفاق رائے کے سامنے ذی اثر اور رسوخ یافتہ ایجنسیوں کو بھی مناسب شرح قبول کرنے پر مجبور ہونا پڑیگا۔ مثلاً اگر کوئی ریلوے ایجنسی ہندوستانی اخباروں اور رسالوں سے چالیس فیصدی کمیشن لینے کی عادی ہے تو اُس کا علاج اتفاق رائے سے آسانی سے ممکن ہے۔ اسی طرح اور بہت سی باتیں ہم اخبار نویسوں کی کاروباری سہولیت کے لئے ضروری ہیں۔

اُردو پریس کو تمام سرکاری اطلاعیں اُردو زبان میں ملنا چاہیئے، گورنمنٹ کو اپنے سکریٹریٹ کے ساتھ ایک پریس روم یا پریس کلب کھولنا چاہیئے، جہاں ہر اخبار نویس کو ضروری اطلاعیں بہم پہونچانے کا انتظام کیا جائے۔ گورنمنٹ پبلسٹی ڈپارٹمنٹ میں بھی اصولی اصلاح و ترقی کی بڑی ضرورت ہے۔ یہ دفاتر صرف سرکاری کارروائیوں کے متعلق صحیح اطلاعات بہم پہونچانے کا فرض ادا کریں۔ پروپیگنڈا کا کام مُلکی اخبارات پر چھوڑ دیا جائے۔ موجودہ وائسرائے لارڈ لنلتھگو نے اپنی تشریف آوری کے بعد ہی ایک تقریر کے دَوران میں اس مسئلہ پر توجہ دینے کا وعدہ فرمایا تھا اس لئے نئی اصلاحات کے اجراء کے ساتھ ہی گورنمنٹ پبلسٹی ڈپارٹمنٹ کی بھی نئی تنظیم ہونا لازمی ہے۔ میری رائے میں محکمہ اطلاعات کی رہنمائی میں غیر سرکاری عنصر اور صوبہ کے اخبار نویسوں کو کافی دخل ہونا چاہیئے۔

افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ابتک اُردو اخبار نویس اپنی تنظیم سے غافل رہے ہیں، ملک میں ایک آل انڈیا پریس ایسوسی ایشن قائم ہے، جس سے ہم نے ابتک کوئی معتدبہ فائدہ نہیں اُٹھایا ہے۔ لاہور و لکھنؤ میں حال میں جرنلسٹ ایسوسی ایشن قائم ہوگئی ہیں۔ ہر مرکزی مقام پر اس طرح کی انجمنیں قایم ہو سکتی ہیں، اور یہ تمام انجمنیں ایک تنظیم کے اندر کام کر کے اُردو اخبارات کی مشترکہ ضروریات متفقہ کوشش سے پوری کر سکتی ہیں۔ گورنمنٹ کی طرف سے جو سخت گیریاں وقتاً فوقتاً اخبارات پر عائد ہوتی ہیں اُن کا علاج بھی ایک بڑے آرگنائزیشن کی امداد سے آسانی سے ممکن ہے، دیگر کاروباری مسائل بھی متفقہ جد و جہد سے بخوبی حل ہو سکتے ہیں۔

یہ مسئلے آئے دن پیش آتے رہتے ہیں، مثلاً محصول ڈاک کے متعلق اخبارات کو جو رعایتیں حاصل تھیں اُن میں حال میں بہت فرق آگیا ہے۔ ڈپارٹمنٹل افسروں کی نظر اخبارات کی طرف خواہ مخواہ ترچھی ہوگئی ہے۔ ایسے موقعہ پر آل انڈیا انجمن اخبار نویساں بہت موثر

ایجی ٹیشن کر سکتی ہے۔

پچھلے سال میری درخواست پر بابو سری پرکاش صاحب ممبر لیجسلیٹو اسمبلی بنارس نے گورنمنٹ ہند سے ایک خفیف سی رعایت منظور کرادی تھی جس کے رُو سے ایک پیسے کے ٹکٹ ڈاک میں آٹھ تولہ وزن کے بجائے اب دس تولہ وزن کے اخبارات جاتے لگے ہیں لیکن اس سال سے عجیب سخت گیری کا برتاؤ شروع کردیا گیا ہے۔ یعنی اخبارات کی اشاعت میں ذرا سی بھی دیر ہوجائے تو وہ رعایتی شرح محصول ڈاک سے محروم کردئیے جاتے ہیں، اور اگر کسی خریدار کے پاس پچھلے پرچے بھیجنا ہوں تو وہ معمولی بک پوسٹ کی شرح سے جائیں گے۔ یہ سختی ماہوار رسالوں کے لئے بہت ہی نقصان رساں ہے۔ کیونکہ اکثر لوگ بعد میں بھی آغازِ سال سے خریدار ہونا پسند کرتے ہیں۔ کبھی کبھی ڈاک خانہ کی غفلت سے پرچے گم یا غلط تقسیم ہوجایا کرتے ہیں اور لوگ مکمل جلد رکھنے کی خاطر گم شدہ پرچے منگاتے رہتے ہیں۔ اشتہارات کے سلسلے میں بھی اکثر پچھلے پرچوں کی مانگ ہوتی ہے۔ ان سب فرمایشات کی معمولی بک پوسٹ کی شرح سے تعمیل ہوگی تو اخبارات و رسائل اور اُن کے خریداران دونوں کا دیوالہ نکل جائیگا۔ گورنمنٹ کو کم از کم یہ سخت گیری روا نہ رکھنا چاہیئے۔ اسی طرح اخبارات اور کتابوں کے قیمت طلب پارسلوں میں رجسٹری کی قید سراسر تکلیف دہ ہے۔ اگر یہ بالکل معاف نہ ہوسکے تو کم سے کم نصف کی تخفیف تو ضرور ہوسکتی ہے۔ قیمت طلب پارسلوں کا محصول بھی بہت زیادہ ہے، مثلاً ایک روپیہ کے قیمت طلب پارسل کے لیے بھی خریدار کو پانچ آنے ادا کرنا پڑتے ہیں، اس میں رعایت کی بخوبی گنجایش ہے۔

پریس کے لئے رعایات

پریس کے لئے ٹیلیفون اور تبادلہ کی شرح میں بھی بقدر نصف کے کمی ہونا چاہیئے۔ اخبارات کے رجسٹری شدہ پیکٹوں کی فیس اور چندہ کی چھوٹی چھوٹی رقم کے منی آرڈروں کی شرح بھی نصف ہوجانا چاہیئے۔

تار کے لئے اخباروں کے پتے حسب سابق بلا کسی فیس کے درج رجسٹر ہونا چاہیئے۔ ڈاک خانہ کے ونڈو (Window) ڈلیوری کے متعلق بھی اخبارات خاص رعایت کے مستحق ہیں

یہ سب مطالبے ایک مرکزی انجمن کے ذریعہ مؤثر طریقے سے پیش کئے جاسکتے ہیں۔

کاغذ اور سامان طباعت کو سستا کرنے کی کوشش بھی اشد ضروری ہے۔ ہم کو اُمید ہے کہ نئے نظام حکومت میں ہمارے قائم مقاموں کو ان سب اُمور پر خاص توجہ دینے کی توفیق ہوگی۔

اِس سلسلے میں ایک اور بات بھی قابل توجہ ہے۔ گذشتہ جنگ کے دوران میں صوبے

کے اکثر اضلاع سے سرکاری رہنمائی میں جنگی اخباروں کے شیٹ شایع ہونا شروع ہوئے تھے جنگ کے بعد تحریک نان کوآپریشن کے زمانہ میں صوبہ بھر میں خواہ مخواہ کی امن سبھائیں قائم کردی گئی تھیں۔ ان نام نہاد سبھاؤں نے افسران ضلع کی سرپرستی میں اُن جنگی خبروں والے مقامی پرچوں کو عدالتوں کے سمن اور نوٹسوں کے بھروسے پر اخباری صورت دیدی ہے۔ چنانچہ اِن برائے نام پرچوں نے جو کہیں کہیں ڈسٹرکٹ گزٹ کے نام سے بھی شایع ہو رہے ہیں اُردو پریس کو نقصان عظیم پہونچایا ہے۔ اکثر مقامات میں یہی پرچے عدالتی کاموں کے ٹھیکہ دار ہو گئے ہیں اس معاملہ میں گورنمنٹ اور عدالتہائے عالیہ کی پالیسی بے لوثی پر مبنی ہونا چاہیئے، اصل و نقل کی پہچان مشکل نہیں ہے، یہاں پر صرف اصل جنس کی حوصلہ افزائی کی خواہش ہے اور کسی خاص طبقے کی سرپرستی کا خیال نہیں۔ بہرحال گورنمنٹ کے ذمہ دار محکموں کا فرض ہونا چاہیئے کہ پریس کی دشواریوں میں مزید مشکلات کا اضافہ نہ ہونے دیں۔ بلکہ ہر قسم کی سہولت بہم پہونچائیں اخبار نویسی کے معزز پیشے کو ہر ممکن طریقے سے تقویت دینا ایک ترقی یافتہ گورنمنٹ کا فرض مقدم ہے۔

ان جزئیات کے علاوہ ہمارا سب سے اہم اور پُرزور مطالبہ پریس کی مکمل اور قطعی آزادی ہے۔ برٹش گورنمنٹ نے شروع سے اب تک اخبارات کو اُن کی واجبی آزادی سے محروم رکھا ہے۔ انگلستان میں بھی یہ آزادی مسلسل جدوجہد کے بعد حاصل ہوئی ہے لیکن وہاں ۱۶۹۳ء کے بعد سے پریس کے خلاف کوئی قانون پاس نہیں ہو سکا۔ گو انگریزی پریس اسٹامپ ڈیوٹی کی منسوخی کے بعد ہی ۱۸۵۶ء میں پورے طور پر آزاد ہوا ہے۔ اُس وقت سے اب تک برطانوی اخبارات پر (سوائے زمانہ جنگ کے) کسی قسم کی کوئی پابندی نہیں ہوتی۔ امریکہ اور اکثر یوروپین ممالک میں پریس کو پوری آزادی حاصل ہے۔ اور بہت سے آزاد ملکوں میں پریس کی آزادی کو آئینی حیثیت سے باضابطہ طور پر تسلیم کر لیا گیا ہے۔ ہمارے یہاں بھی ایسا ہی ہونا چاہیئے۔ کیونکہ سیاسی آزادی کی پہلی شرط زبان اور قلم کی آزادی ہے۔ ملٹن تو یہاں تک کہہ گیا ہے کہ خواہ کوئی اور آزادی نصیب ہو یا نہ ہو لیکن معلومات حاصل کرنے، دلی مطالب ادا کرنے اور ضمیر کے مطابق بحث و مباحثہ کرنے کی سب کو پوری آزادی ہونا چاہیئے۔ سر چارلس مٹکاف سو سال سے زائد ہوئے یہ لکھ گئے ہیں کہ پریس کی آزادی کے فوائد اس کے مضر نتائج سے کہیں زیادہ ہیں۔

درحقیقت اظہار رائے کی آزادی انسان کے ازلی حقوق میں داخل ہے اور یہ کوئی رعایت نہیں بلکہ انسانی حق ہے۔ جس کے قائم کرنے کے لئے بقول ایک فرانسیسی مصنف انسان کو ہر وقت مستعد

ڈسٹرکٹ گزٹوں یعنی سرکاری اخبارات سے اردو پریس کو نقصان

آزادی پریس کا مطالبہ

آزادی رائے کا حق

ہونے و نشانۂ ملامت بننے کے لئے تیار رہنا چاہیئے۔ وہ لکھتا ہے کہ قید اور قتل کے خوف سے بھی انسان کو اپنی رائے کے اظہار و اشاعت سے باز نہ رہنا چاہیئے"۔

پریس کی آزادی کا مفہوم

یہاں پر مختصراً پریس کی آزادی کی تشریح بیجا نہ ہوگی۔ اس آزادی کے اس کے سوائے اور کچھ معنی نہیں ہیں کہ ہر شخص کو گورنمنٹ کی طرف سے کسی طرح کی ذمہ داری یا پابندی عائد ہوئے بغیر اپنے حسبِ لخواہ ہر بات کے چھاپنے کا اختیار حاصل ہو۔ اصولی حیثیت سے آزادی پریس اور آزادی تقریر میں کوئی فرق نہیں ہے، دونوں کا ایک ہی بنیادی اصول ہے، مگر تقریر اور طباعت کی یہ آزادی کسی شخص کو معمولی قانون کی زد سے نہیں بچا سکتی، کیونکہ جو شخص اپنے حقوق کا بیجا استعمال کریگا اُسے قانون کا جوابدہ ہونا پڑے گا۔ اس حق پر اخلاقاً اور قانوناً صرف تین ہی قسم کی پابندیاں عائد ہوسکتی ہیں، چنانچہ ان قیود کے علاوہ ہندوستان میں بھی کسی مزید پابندی کی حاجت نہیں ہے۔ یہ پابندیاں یہ ہیں:-

اوّل یہ کہ مذہب اور اخلاقِ عامّہ کی بے حرمتی نہ ہونے پائے،

دوسرے یہ کہ کسی شخص کی ہتک عزت نہ کی جائے اور نہ کسی کی شہرت پر کوئی بیجا حملہ کیا جائے۔

تیسرے یہ کہ دیگر مصنفین و مؤلفین کے حقوق کاپی رائٹ قائم و برقرار رکھے جائیں۔

کسی ملک میں پریس پر اس سے زیادہ پابندیوں کی ضرورت نہیں۔ لیکن ہندوستان میں حکومت کو اہل ملک پر کبھی وثوق نہیں رہا جس کی وجہ سے ہم اس وقت تک اس ابتدائی انسانی حق سے محروم ہیں۔

پریس پر نظر عتاب

اخبارات پر شروع ہی سے حکام وقت کی نظر عتاب رہی ہے، چنانچہ لارڈ ولیسلی کے زمانہ میں چار سال کے دوران میں دو انگریز اخبار نویس یکے بعد دیگرے محض اس بنا پر ملک بدر کئے گئے تھے کہ ایک نے فوج کے متعلق ایک قابل اعتراض مضمون لکھا تھا اور دوسرے شخص نے کلکتہ کے ایک مجسٹریٹ کی نکتہ چینی کرنے کی جرأت کی تھی۔ اس کے بعد یہ حالت تو نہیں رہی لیکن مختلف اوقات میں پریس کے قوانین میں جو ردّ و بدل ہوتے رہے اُن میں پریس کی آزادی کا اصول کبھی پُورے طور پر تسلیم نہیں کیا گیا۔ اس وقت بھی گورنمنٹ کی سختیاں باقی ہیں، چنانچہ اخبارات پر جو متعدد پابندیاں عائد ہیں۔ جن سے ہر اخبار نویس اور عام اہل الرائے اصحاب بخوبی واقف ہیں اس لئے اُن کا مفصل بیان فضول ہوگا۔ ۱۹۲۲ء میں پریس ایکٹ کی ضروری ترمیمات پر غور کرنے کے لئے سر ولیم و نسنٹ ہوم ممبر کی صدارت میں ایک کمیٹی بیٹھی تھی جس کے روبرو مجھے بھی

شہادت دینے کا موقعہ ملا تھا، لیکن اس کمیٹی نے بھی ہماری دادرسی نہیں کی۔ اس کے لئے موجودہ وقت شاید کچھ زیادہ موافق ثابت ہو۔ اس لئے تمام ہندوستانی پریس کو گورنمنٹ سے مشترکہ و متفقہ طور پر آزادیٔ قلم کا حق طلب کرنا چاہیئے۔ اور پوری جدوجہد کرنا چاہیئے کہ نئے آئین میں یہ آزادی واضح طور پر تسلیم کر لی جائے۔ ہماری کانفرنس نئے وزرا صوبہ سے اس بارے میں بہت کچھ ہمدردی کی توقع کر سکتی ہے۔ میں سر سکندر حیات خاں کی تقریر کا ذکر کر ہی چکا ہوں۔ بنگال کے وزیر اعظم مسٹر اے۔ کے فضل الحق نے بھی حال ہی میں یہ خیال ظاہر فرمایا ہے کہ پریس کے قوانین و ضوابط میں بعض دفعات کے فوری ترمیم کی ضرورت کا انھیں پورا احساس ہے۔ ہم کو امید ہے کہ ہمارے صوبہ کے نئے وزیر اعظم بھی خواہ وہ کسی پارٹی کے ہوں وزرائے بنگال و پنجاب سے متفق ہونگے۔ اور مروجہ تنگ خیالی سے بالاتر ہو کر پریس کی آزادی بحال کرنے کی تدبیریں عمل میں لائیں گے۔

مگر جیسا کہ اوپر عرض کیا جا چکا ہے پریس کی آبرو بہت کچھ ہمارے ہی ہاتھوں میں ہے۔ پریس کا اصلی وقار اور واقعی اثر خود ملکی اخبارات کے طرز عمل اور کارکنانِ پریس کے تنظیم و جذبۂ خودداری پر منحصر ہوگا۔ اس میں شک نہیں کہ بعض ایڈیٹران اردو پریس کسی ملک کے اخبار نویسوں سے کم نہیں ہیں، لیکن ابھی اردو اخبارات و رسائل کے کثیر تعداد کی حالت محتاج اصلاح ہے۔

اخبارات کی مالی حالت

بدقسمتی سے اردو پریس کی مالی حالت بھی اچھی نہیں ہے۔ موجودہ اشاعتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ ان کے لئے تنظیم و ترقی کی کیا صورت ممکن ہے۔ انگلستان میں بھی پچاس سال پہلے تک اخبار نویسی کا پیشہ بالکل نفع بخش نہ تھا، وہاں اخبارات کی ترقی روٹری پریس کے رواج کے بعد سے شروع ہوئی ہے اس ترقی میں اشتہارات کی اجرت کو بھی بہت بڑا دخل ہے۔ چنانچہ صرف لندن کے اخبارات کو اشتہارات سے ایک کروڑ تیس لاکھ پاونڈ آمدنی ہوتی ہے۔ یہ ترقی زیادہ تر ۱۸۹۰ء کے بعد ہوئی ہے۔ اب انگلستان کے اخبارات کا یہ حال ہے کہ ان کی مجموعی اشاعت کا اندازہ پندرہ کروڑ روزانہ کیا جاتا ہے۔ حساب لگایا گیا ہے کہ ہر گھر میں کئی روزانہ اخبارات کی خریداری کا اوسط پڑتا ہے، اسی وجہ سے وہاں کے اخبارات کی اشاعت اس قدر ہے۔ ہم کو ہندوستان میں ان کی کثرت اشاعت کی داستان قصہ کہانیاں معلوم ہوتی ہیں مگر یہ واقعہ ہے۔ ان کی کثرت اشاعت کا اندازہ اسی سے ہو سکتا ہے کہ مزدور جماعت کے اخبار ڈیلی ہیرلڈ کی اشاعت تیس لاکھ روزانہ سے زائد ہے۔

صوبہ متحدہ کے اخبارات

سرکاری رپورٹ کے بموجب صوبہ متحدہ میں چھوٹے بڑے کل چھ سو چورانوے پرچے ہیں جن میں ۳۱ روزانہ، ۱۲ ہفتہ میں دوبار، ۲۲۷ ہفتہ وار، اور ۴۲۶ ماہوار ہیں۔ مگر ان میں سے صرف دو انگریزی دو اُردو اور چار ہندی اخباروں کی اشاعت چار ہزار سے زائد بتائی جاتی ہے، اور دو انگریزی، پانچ اُردو اور گیارہ ہندی اخبارات کی اشاعت دو اور چار ہزار کے درمیان بیان کی گئی ہے۔ افسوس اور شرم سے کہنا پڑتا ہے کہ اُردو میں ہزار دو ہزار کی اشاعت کا اوسط بہت اچھا سمجھا جاتا ہے۔ ہندی کی حالت اُردو سے کسی قدر بہتر ہے لیکن دوسری زبانوں کو دیکھتے ہوئے ابھی ہندی کو بھی بہت کچھ ترقی کرنا ہے۔

پچھلے سال صوبہ متحدہ میں کل ۳۴۴۸ مطبوعات میں سے دو ہزار ایکسو بیالیس کتابیں ہندی میں اور صرف ۴۴۴ اُردو میں، ۳۳۱ انگریزی میں طبع ہوئیں۔ انگلستان میں ۱۹۳۵ء میں کل ۱۶۶۷۸ کتابیں طبع ہوئیں یعنی روزانہ پینتالیس کتابوں کا اوسط رہا۔

درحقیقت اُردو داں جماعت ابھی تک اخبارات، رسائل، و مستقل مطبوعات پر روپیہ خرچ کرنے کی عادی نہیں ہوئی۔ جن لوگوں کی مالی حالت قابل اطمینان ہے وہ بھی اس مد میں روپیہ صرف کرنا فضول سمجھتے ہیں۔ یہ حالت اُردو پریس کی ترقی کے لحاظ سے بہت ہی قابل افسوس ہے، اس لیئے حامیانِ اُردو کو اس طرف جلد سے جلد توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

پریس کے کاروبار میں تعلیم یافتہ نوجوانوں کی کھپت

کتابوں اور اخباروں کی توسیع اشاعت سے تعلیم یافتہ نوجوانوں کے لئے حصول معاش کا ایک وسیع میدان نکل سکتا ہے۔ اس وقت انگلستان میں اخبارات کی بدولت ساٹھ ہزار آدمیوں کی بسر اوقات ہوتی ہے۔ کوئی وجہ نہیں کہ یہاں کے اخبارات اور پریس کے کاروبار میں اس سے زیادہ آدمیوں کی کھپت نہ ہو۔ لیکن یہ حالت مستقبل ہی میں حاصل ہو سکتی ہے

ایثار کی ضرورت

بہر حال آئندہ جو کچھ ہو، اِس وقت اخبار نویسوں کو بخوبی سمجھ لینا چاہیئے کہ مالی حالت درست ہونے تک جسے ابھی ایک عرصہ درکار ہے ہم کو سختیاں جھیلنا پڑیں گی۔ اس لئے اپنے پیشہ کا معیار اخبارات کی آبرو اور اپنی ذاتی وقعت قائم رکھنے کے لئے ہم کو ضبط نفس اور ایثار سے کام کرنے کے واسطے تیار رہنا چاہیئے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ یہ ایثار بالآخر بیکار نہ رہیگا۔ اور خواہ ہم دولت نہ پیدا کر سکیں لیکن عزت سے زندگی ضرور بسر کر سکتے ہیں۔ اور قومی خدمت ایمانداری سے انجام دینے کا اطمینان ہم کو یقینی حاصل ہو سکتا ہے

اخبار نویسی کا پیشہ ایک مقدس اور عظیم القدر پیشہ ہے۔ جو لوگ روپیہ پیدا کرنا چاہتے ہیں

انھیں اس طرف متوجہ نہ ہونا چاہیئے۔ البتہ مُلکی خدمت کی اس معزز پیشے میں کوئی انتہا نہیں ہے۔ اس کا میدان نہایت وسیع ہے، اور ہمت و استقلال اور دیانت سے کام کرنیوالوں کو ضمیر کی خوشنودی اور قلب کا اطمینان حاصل ہونے کے علاوہ دنیا میں بھی وقعت حاصل ہوتی ہے۔ لیکن یہ جب ہی ممکن ہوگا جب ہم آرام طلبی کی زندگی کو خیرباد کہہ کر خودداری، ایثار اور مستقل مزاجی سے راہ راست پر چلتے رہیں۔ جو صاحب اس پیشے کی طرف یہ سمجھکر رجوع ہونگے کہ تھوڑی سی محنت میں انھیں ہردلعزیزی حاصل ہو جائیگی، تھوڑی سی کوشش میں وہ آسانی سے قومی لیڈر بن جائیں گے انھیں جلد یا بدیر مایوسی سے سامنا ہوگا۔

دوسروں سے مالی امداد کی اُمید بھی فضول ہے۔ کسی زمانہ میں بعض اخبارات دیسی ریاستوں سے حصول زر کی اُمید رکھتے تھے۔ اب بعض اصحاب کو سیاسی اقتدار کے دلدادہ لیڈروں اور دیگر رہنماؤں سے نفع اُٹھانے کی فکر رہتی ہے۔ حال میں صوبہ کے ایک مقتدر رہنما نے مجھ سے شکایت کی کہ اُن سے کئی اُردو اخبار نویس پریس وغیرہ کے بہانے سے مالی امداد کے طالب ہوئے۔ ان باتوں سے اپنی عزت کھونے کے سوائے اور کوئی نتیجہ حاصل نہیں ہوتا بلکہ اُلٹا جماعت کے عزّ و وقار میں فرق آتا ہے۔ اس لئے جو صاحب اخبار نویسی کے پیشہ کو اختیار کریں وہ یہ سمجھ کر اس میں داخل ہوں کہ ابھی کم از کم ایک مدت تک اور اس پیشہ میں بمشکل بسر اوقات ہو سکے گی۔ ہاں قومی خدمت کے دلدادہ اخبار نویسوں کی خدمت مقبول عام ہوگی اور انھیں اطمینان قلب اور روحانی مسرت بھی حاصل ہوگی۔

اخبار نویس کا رتبہ معمولی اہل قلم سے بدرجہا بلند ہے، درحقیقت اُس کا درجہ بڑے سے بڑے مُدبر، نامور سے نامور محب ملک اور مشہور سے مشہور قومی لیڈر سے کسی طرح کم نہیں، اخبار نویس کا اثر بظاہر اتنا نمایاں نہ ہو مگر اُس کا رُسوخ خاموشی سے بڑھتا رہتا ہے۔ اور سب تعمیری کام کرنیوالوں کی طرح اُسکی بھی بالآخر قدر ہوتی ہے۔ البتہ اسے ہر وقت اپنی جگہ پر ایثار نفس کی ضرورت پیش آتی رہتی ہے۔ سچے اخبار نویس کو تحریر میں وزن اور متانت پیدا کرنا ہوگی، اُسے نکتہ چینی کو ذاتیات سے بالاتر رکھنا پڑے گا۔ رائے زنی میں ہردلعزیزی حاصل کرنیکی فکر سے آزاد رہنا ہوگا، اور حمایت ہو یا مخالفت دونوں میں اُسے ذاتی تعصب سے پاک رہنا ہوگا۔ وہ وکالت کریگا مگر اسکی وکالت میں طرفداری کا شائبہ نہ ہوگا وہ واقعات اور خبروں میں بھی رو و رعایت سے کام نہیں لے سکتا ہے اور نہ اختلاف رائے کی وجہ سے دوسروں سے بدظن ہو سکتا ہے بلکہ اُسے مخالفین کو اظہار رائے کا پورا موقعہ دینا پڑے گا۔ ایسا اخبار نویس

یقیناً ملک اور قوم کے اخلاق کی بلندی کا باعث ہوگا۔

خدا کرے ہمارے اخبارات اس معیار پر پورے اُتریں اور موجودہ سیاسی ترقی کے دَور میں انھیں تعمیری کام کی توفیق ہو۔

اُردو پریس ایسوسی ایشن

اُردو اخبارات و مطابع کی تنظیم و تقویت کے لئے ۲۸۔ مارچ ۱۹۳۶ء کو جو اُردو پریس ایسوسی ایشن قائم ہوئی ہے، اس کے اغراض و مقاصد یہ ہیں:-

۱۔ اُردو اخبار نویسی اور اُردو مطابع کو ترقی دینا۔

۲۔ اخبارات اور مطابع کے حقوق کی حفاظت کرنا

۳۔ اخبار نویسوں اور اہل مطابع میں باہم اتحاد قائم کرنا اور تعاون باہمی کو ترقی دینا۔

ہر اُردو اخبار اور اہل مطبع جس کو ان اغراض و مقاصد سے اتفاق ہو اس انجمن کا ممبر ہو سکتا ہے۔ فیس داخلہ ایک روپیہ اور چندہ سالانہ دو روپیہ پیشگی ہے۔ فی الحال اس کا دفتر علیگڈھ میں رہیگا۔ ایسوسی ایشن کا انتظام عہدہ داروں کے علاوہ گیارہ منتخب اصحاب کی انتظامیہ کمیٹی کے سپرد رہیگا۔ اس سال کے لئے جو عہدہ دار منتخب ہوئے ہیں اُن کے نام یہ ہیں:-

پریسیڈنٹ:- منشی دیانراین نگم، ایڈیٹر زمانہ و اخبار آزاد کانپور،

وائس پریسیڈنٹ:- مولوی نظام الدین حسین نظامی، ایڈیٹر ذوالقرنین، بدایوں،

سکرٹیری:- مولوی اکرام اللہ خاں ندوی، ایڈیٹر کانفرنس گزٹ علیگڈھ،

کمیٹی انتظامیہ کے لئے فی الحال پانچ ممبر منتخب ہو گئے ہیں، چھ کا انتخاب بعد میں نئے ممبروں سے کیا جائے گا۔ اجلاس ختم ہونے سے پہلے چودہ ایڈیٹروں نے ایسوسی ایشن کی ممبری قبول کرلی تھی۔ ہم کو امید ہے کہ تمام معاصرین اور اہل مطابع اس انجمن کی شرکت منظور فرمائیں گے۔

رُباعیاتِ جوشؔ

(از حضرت جوشؔ ملیح آبادی)

یہ رُباعیاں حضرت برقؔ مرحوم کے یادگاری مشاعرہ میں پڑھی گئی تھیں جو دہلی میں شاگردان و مداحانِ برقؔ کے اہتمام سے تاریخ ۱۴ فروری ۱۹۳۶ء کو منعقد ہوا تھا۔

۱

ماضی نے جھلک اپنی دکھائی کیا کیا
تاریخ نے کی جلوہ نمائی کیا کیا
نکلا جو بصد شکوہ سلطاں کا جلوس
شاعر کی گدائی مُسکرائی کیا کیا

۲

پی آتشِ تر، سوزِ نہانی کی قسم
جنگل میں برستے ہوئے پانی کی قسم
مہکالے نفس کو جوشؔ بوئے مے سے
بوئے لبِ گلرنگ جوانی کی قسم

۳

رندوں کو رَوَا ہے کامرانی ساقی
ہے روزِ جزا فقط کہانی ساقی
محشر میں اگر ہوئی بھی پرسش بالفرض
دے لیگی جواب نوجوانی ساقی

۴

مرنے پہ نوید جاں ملے یا نہ ملے
یہ گُنجِ بوستاں ملے یا نہ ملے
پینے میں کسر نہ چھوڑ او خانہ خراب!
معلوم نہیں وہاں ملے یا نہ ملے

۵

کیا فائدہ شیخ! تجھسے کینے میں مجھے
خشکی میں تجھے لطف سفینے میں مجھے
عیاش تو دونوں ہیں مگر فرق یہ ہے
کھانے میں تجھے مزا ہے پینے میں مجھے

(۶)

ہر ہاتھ میں تیغِ خونچکاں ہے یارب ہر پاؤں میں زنجیرِ گراں ہے یارب
مذہب کی برادری سے دل تنگ ہوں میں انساں کی برادری کہاں ہے یارب

(۷)

مفلس ہوں مگر وارثِ فطرت ہوں میں اسرارِ پیمبری کی دولت ہوں میں
اے لمحۂ وجود، ادب سے پیش آ آئندہ زمانے کی امانت ہوں میں

(۸)

ہشیار! کہ آفتاب ہونا ہے تجھے پیغمبرِ انقلاب ہونا ہے تجھے
ہر صبح کو آتی ہے یہ ساقی کی صدا بیدار! کہ خود شراب ہونا ہے تجھے

جذباتِ مدہوش

(از حضرت مدہوش ایم۔ اے)

ہم کو مطلوب ہے جو حور حقیقت میں نہیں دل کی جنت میں ہے وہ وہ گلشنِ جنت میں نہیں
ہاں وہ محدود نہیں پر وہ پریشاں بھی نہیں دل میں مرکوز ہے کونین کی وسعت میں نہیں
کور باطن ہیں جو منکر ہوے نورِ حق سے جو یہ کہتے ہیں حقیقت تو حقیقت میں نہیں
ضبطِ تحریر میں لاتے اسے اس کے شاہد اہمیت اتنی مگر حرف و حکایت میں نہیں
نور ہی نور ہے وہ پردۂ ظلمت میں نہیں شانِ واحد کا پتہ مظہرِ کثرت میں نہیں
بندۂ حرص و ہوا دور سے نظارہ کر بوالہوس کام ترا باغِ محبت میں نہیں
لطف در اصل تو کچھ کاہش و حسرت میں نہیں ترکِ لذت میں جو لذت ہے وہ لذت میں نہیں

عشق ہی زندہ ہمیں رکھتا ہے ورنہ مدہوش
خون کچھ دل میں نہیں جان حقیقت میں نہیں

قدیم ہندوستان کی تعلیمی حالت

مولانا سید طفیل احمد سابق ممبر کونسل صوبہ متحدہ کے قلم سے

یہ مضمون مولانا طفیل احمد صاحب کا وہ خطبۂ صدارت ہے جو اُنھوں نے شعبۂ خواندگی اور تعلیم با تعاون کے صدر کی حیثیت سے گزشتہ اجلاس آل انڈیا مُسلم ایجوکیشن کانفرنس کے موقعہ پر ارشاد فرمایا تھا۔ مولانا موصوف جن کے نام سے ہمارے صوبہ کی تعلیم یافتہ جماعت عموماً اور ناظرین زمانہ خصوصاً ناواقف نہ ہوں گے۔ عرصہ تک آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس علیگڈھ کے آنریری جوائنٹ سکریٹری رہے ہیں۔ آپ کا شمار ان بزرگوں میں ہے جنھوں نے تعلیمی مسئلہ پر غور کرنے میں اپنی عمریں صرف کر دی ہیں۔ سیاسیات میں بھی آپکا مسلک فرقہ وارانہ تنگدلی سے ہمیشہ پاک رہا ہے۔ جس کی شہادت آپ کی مشہور کتاب "حکومت خود اختیاری" سے ملتی ہے جو سنہ ۱۹۲۹ء میں نہرو رپورٹ کے بعد لکھی گئی تھی۔

ایڈیٹر "زمانہ"

زمانہ سابق میں خواندوں کی تعداد

اسوقت ترقی یافتہ ممالک میں خواندوں کی تعداد نوّے ۹۰ اور سّو نیصدی کے درمیان ہے برخلاف اس کے ہمارے ملک میں جو کسی زمانہ میں علم اور شائستگی کا مرکز رہ چکا ہے خواندوں کی تعداد صرف آٹھ فیصدی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ آیا ہمیشہ سے اس ملک کی جہالت کی یہی حالت رہی ہے یا کسی خاص زمانہ سے ایسا ہے۔ ڈاکٹر لیٹنر نے جو پنجاب یونیورسٹی کے مشہور پرنسپل رہ چکے ہیں۔ صاف الفاظ میں اس امر کو تسلیم کیا ہے کہ زمانہ سابق میں اس ملک میں خواندوں کی تعداد بمقابلہ اب کے بہت زیادہ تھی۔ اسی طرح مسٹر کیر ہارڈی سابق ممبر پارلیمنٹ نے اپنی کتاب میں میکس مولر کے حوالہ سے لکھا ہے کہ انگریزی عملداری سے قبل بنگال میں اسّی ہزار مدارس تھے۔ اسطرح چارسو آدمیوں کی آبادی کے لیے ایک مدرسہ کا اوسط ہوتا تھا۔ نیز لڈ لو نے اپنی تاریخ ہند میں لکھا ہے کہ یہاں کے ہر موضع میں جو اپنی قدیم حالت پر قایم ہے بچے بالعموم لکھ پڑھ سکتے ہیں مگر جس جگہ ہم نے مثل بنگال کے پرانا نظام توڑ دیا ہے وہاں گاؤں سے اسکول غائب ہو گیا ہے[1]۔

[1] تاریخ ہند جلد پاسو صفحہ ۲۰۳۔

واقعہ یہ ہے کہ ہندوستان کے پرانے نظام میں یہاں کے لوگ تعلیم کو اپنا مذہبی فرمان سمجھتے تھے۔ دیہات کے ہر مذہب کے لوگ اپنی اپنی تعلیم کا انتظام پنچایتی طریقہ سے اپنی اپنی ضروریات کے مطابق خود کرتے تھے۔ اسی کے ساتھ امرا اور حکام وقت بلا لحاظ مذہب وملت کے اپنی رعایا کے تعلیمی اور خیراتی کاموں کے لئے اوقاف کرتے رہتے تھے۔ بدقسمتی سے اسوقت سے پونے دو سو سال قبل جب یہاں کا نظام سلطنت بدلا تو نہ صرف یہ کہ حکومت کی امداد ملنی بند ہوگئی بلکہ پرانے اوقاف بھی ضبط کر لیے گئے اور پرانا پنچایتی نظام توڑ دیا گیا۔ جس سے یہاں کی تعلیم کا نظام برباد ہوگیا

مسلمان بادشاہوں اور کمپنی کی تعلیمی پالیسی کا موازنہ

موجودہ عملداری سے قبل یہاں مسلمانوں کی عملداری تھی جن کی نسبت اب یہ کہا جاتا ہے کہ وہ بڑے متعصب اور مذہبی مجنون تھے۔ مگر ان کی جو پالیسی تھی اس کا اندازہ آپ کو مسٹر چارلس گرانٹ کے رسالہ سے ہوگا۔ جو ۱۷۹۳ء میں لکھا گیا تھا۔ اس میں انہوں نے صاف الفاظ میں یہ تسلیم کیا ہے کہ

"مسلمانوں نے اپنی سلطنت کے زمانہ میں ہندوؤں کے کیرکٹر میں کوئی تبدیلی نہیں کی تھی اور انھیں اپنے حال پر چھوڑ دیا تھا۔"

مگر چارلس گرانٹ چاہتے تھے کہ وہ اس بارہ میں مسلمانوں کی پیروی نہ کریں اور یہاں کے لوگوں کو اپنی زبان پڑھا کر عیسائی بنائیں۔ ہندوستان کے لوگوں کو عیسائی بنانے کے لئے انگریزی پڑھانے کا مسئلہ سب سے اوّل ۱۷۹۲ء مسٹر ولبرفورس نے پارلیمنٹ میں پیش کیا۔ جو اس بنا پر خارج کردیا گیا کہ ایسا نہو کہ امریکہ والوں کی طرح ہندوستان کے لوگ تعلیم یافتہ ہوکر آزادی کے طلبگار ہوجائیں۔ جس سے کمپنی کی عملداری کا خاتمہ ہوجائے۔ پس یہی اندیشہ تھا جس کی وجہ سے مدت دراز تک کمپنی والوں نے کسی قسم کی تعلیم کی طرف توجہ نہ کی۔ البتہ پرائیویٹ طور پر پادری لوگ ہندوستان میں آکر اپنے مذہب کی اشاعت کی غرض سے کچھ مدارس قایم کرتے رہے اور پھر کمپنی کی طرف سے بھی اسی کام کے لئے پادری مقرر ہوئے اور حکام نے اُن کی امداد کی۔

تعلیمی کمیٹی کا تقرر

البتہ خاص ہندوستانیوں کی ضروریات کے لئے اٹھارھویں صدی کے آخر میں دو بڑے بڑے شہروں میں دو مدرسے قایم کئے گئے۔ ایک مسلمانوں کے لئے ۱۷۸۱ء میں کلکتہ مدرسہ قایم کیا گیا۔ دوسرا ہندوؤں کے لئے ۱۷۹۱ء میں سنسکرت کالج بنارس قایم ہوا۔ ۱۸۲۳ء میں سب سے پہلی بار ایک تعلیمی کمیٹی صوبہ بنگال میں قایم کی گئی۔ جس کے لئے کل ایک لاکھ روپیہ سالانہ منظور کیا گیا جو تمام عملداری کے لئے بمنزلہ اشک بلبل کے تھا۔ مگر لطف یہ ہوا کہ یہ رقم بھی دس

سال تک خرچ کیگئی۔ لیکن ۱۸۲۳ء میں حکام وقت کو اہل ہند کی جہالت کا احساس ہوا اور آنریبل ایم الفنسٹن نے اور الیف وارڈن نے اپنی متفقہ یادداشت میں تسلیم کیا کہ

"ہم نے ہندوستان کی ذہانت کے چشمے خشک کر دیئے اور ہماری فتوحات کی نوعیت ایسی ہے کہ اس سے نہ صرف یہ کہ تعلیمی ترغیب نہیں ہوتی بلکہ اس سے قوم کا علم سلب ہوا جاتا ہے اور علم کے پچھلے ذخیرے نسیاً منسیاً ہوئے جاتے ہیں اس الزام کے رفع کرنے کے لئے کچھ نہ کچھ ہونا چاہیئے۔" [1]

اس روپیہ سے اس وقت کے کالجوں کی امداد کی گئی اور آگرہ کالج قایم کیا گیا۔ مگر یہ سب کالج شہروں کے لوگوں کے لئے تھے۔ اور ان کی تعلیم کی نوعیت ایسی تھی کہ اس سے طلبا اپنے مذہب میں کمزور ہوجاتے تھے۔ اور اس سے حکام وقت خوش ہوتے تھے۔ چنانچہ دسمبر ۱۸۳۱ء میں تعلیمی کمیٹی نے اپنی ہشت سالہ رپورٹ میں لکھا تھا۔ کہ

"ہندو کالج کی حوصلہ افزائی کی طرف توجہ کرنا اس تعلیمی کمیٹی کا ایک خاص مقصد رہا ہے۔ اس سے جو نتائج حاصل ہوئے وہ امید سے کہیں زیادہ ہیں۔ زبان انگریزی کی واقفیت میں ترقی کے ساتھ اخلاقی اثرات بھی نمایاں ہوئے۔ اور اچھے خاندان اور قابلیت کے بہت سے نوجوانوں میں ہندو مذہب کی بندشوں سے آزاد ہونے کے لئے بے چینی اور اپنے رسوم کی طرف سے بے اعتنائی کا علانیہ اظہار کیا جارہا ہے۔ غالباً دوسری نسل میں کلکتہ کے ہندوؤں کے خیالات اور محسوسات میں بڑی مادی تبدیلی ہوجائے گی۔"

حکام کی اس نیت اور طرز عمل کا نتیجہ یہ ہوا کہ رعایا کو ان کی طرف سے یہ بدگمانی ہوگئی کہ وہ اپنے مدارس کے ذریعہ سے اُنہیں عیسائی بنانا چاہتے ہیں۔ چنانچہ مدراس کے لوگوں نے جن میں ہر مذہب کے لوگ شریک تھے ۱۸۵۲ء میں گورنر صاحب مدراس کے خلاف پارلیمنٹ میں ایک شکایتی درخواست بھیجی کہ سرکاری روپیہ عیسائی بنانے میں صرف کیا جاتا ہے۔

ابتدائی تعلیم کا انتظام۔ یہاں تک تو اعلیٰ کا تذکرہ ہوا۔ اب چند الفاظ ابتدائی تعلیم کی نسبت عرض کئے جاتے ہیں جس کی شروعات ۱۸۴۴ء میں ہوئی۔ جبکہ حکام نے دیسی زبان کے مدارس قایم کرنے کی طرف توجہ کی اور ایک سو ایک ۱۰۱ مدارس کھولنے کا حکم دیا۔ مگر رعایا سرکاری تعلیم کی طرف سے اس قدر مشتبہ تھی کہ مدراس میں طلبا نہیں آئے۔ البتہ ۱۸۴۵ء میں سر ولیم میور

[1] تاریخ التعلیم از سید محمود صفحہ ۳۵

لفٹنٹ گورنر صوبہ متحدہ نے خاص کوشش سے صوبہ متحدہ کے آٹھ اضلاع کی تحصیلوں میں تحصیلی مدارس قایم کئے۔ اور پھر رفتہ رفتہ اس سلسلہ کی توسیع مفصلات میں کی گئی۔ طلبا کو ان مدارس میں داخل کرانے کے لئے ڈپٹی انسپکٹران مقرر کئے گئے جو دیہات میں گشت کرتے تھے۔ اور سرکاری اثرات سے طلبا کو گھیر گھیر کر داخل کراتے تھے۔ غرض عوام الناس کی تعلیم کی ابتدا ۱۸۴۵ء سے کی گئی جس سے ملک کے خواندوں کی تعداد بڑھتی - مگر چونکہ وہ تعلیم ہندوستانیوں کی روایات اور ضروریات کے خلاف تھی اس لئے بچے اُن مدرسوں میں نہ جاتے تھے۔

سر سید احمد خاں صاحب مرحوم نے اپنے مشہور رسالہ "اسباب بغاوت ہند" میں رعایا کی ناراضی کا ایک سبب ان مدارس کو بھی قرار دیا تھا۔ سید صاحب موصوف کے الفاظ اس بارہ میں حسب ذیل ہیں:-

> "دیہاتی مکاتب کی نسبت بھی لوگوں کو یقین تھا کہ وہ صرف عیسائی بنانے کے لئے جاری ہوئے ہیں - گاؤں کے لوگ ڈپٹی انسپکٹران کو اسی لئے کالا پادری کہتے تھے - اور سمجھدار آدمی جانتے تھے کہ وہاں ان کے بچے صرف اردو پڑھکر اپنی مذہبی تعلیم سے محروم ہوجائیں گے۔ چونکہ گورمنٹ کے حکم سے بچوں کا داخلہ ہوتا تھا۔ اس لئے لوگ سمجھتے تھے کہ سرکار کا ارادہ عیسائی بنانے کا ہے"

مسلمانوں کی تعلیم

تعلیم عامہ کی نسبت اس قدر عرض کرنے کے بعد اب کچھ حال مخصوص مسلمانوں کی تعلیم کا پیش کیا جاتا ہے - جو ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانہ میں رہا ہے - اسکی بابت ڈاکٹر ہنٹر نے اپنی کتاب "مسلمان ہند" میں لکھا ہے کہ

> "انگریزی عملداری کے ابتدائی پچھتر سالوں میں ہم نے اپنے انتظامی عہدہ دار حاصل کرنے کیلئے مسلمانوں کے نظام تعلیم کو جاری رہنے دیا - اور اس دوران میں اپنا سررشتہ تعلیم مکمل کر لیا - اور جونہی کہ ایک نسل تیار ہوگئی ہم نے مسلمانوں کے نظام تعلیم کو اٹھاکر پھینک دیا - اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلم نوجوانوں پر ملازمت کے دروازے بند ہو گئے۔
>
> آگے چلکر اس پالیسی کا نتیجہ یہ لکھا ہے :- کہ یا تو عدالت، پولیس، کلکٹری اور فوج میں ہر جگہ مسلمان ہی مسلمان نظر آتے تھے، یا اب ۱۸۷۱ء میں صوبہ بنگال کے گزیٹڈ افسروں میں مسلمانوں کی تعداد صرف تیرہ فی صدی ہے - اور انجنیری اور دفاتر، حسابات میں صرف چار فی صدی رہ گئی ہے"

تعلیم میں مسلمانوں کی کمی کی وجہ جو ڈاکٹر ہنٹر نے یہ تسلیم کی ہے کہ ٹیکس تو جملہ اقوام سے لیا جاتا تھا مگر نظام تعلیم جو قایم گیا وہ صرف دیگر اقوام کے حسب حال تھا۔ لیکن اس سے بڑھکر یہ کیا گیا کہ صوبہ بنگال کی آراضی کا جو چوتھائی رقبہ مذہبی اور تعلیمی کاموں کے لئے زمانہ سابق سے وقف چلا آرہا تھا اسے سرکار نے ۱۸۲۸ء میں ضبط کر لیا جس سے مسلمانوں کے تعلیمی زوال کی تاریخ شروع ہوتی ہے۔ حکام وقت نے اس پر بس نہیں کیا بلکہ ۱۸۰۶ء میں حاجی محمد محسن صاحب نے بنگال میں جو ایک جدید عظیم الشان وقف مسلمانوں کی تعلیم کے لئے کیا تھا۔ اس کا بڑا حصہ کمپنی نے دیگر اقوام کی تعلیم پر صرف کیا۔ جس کا تذکرہ ڈاکٹر ہنٹر صاحب موصوف نے اور مسٹر سر جیمس او کنیلی نے کیا ہے۔ یہ ثانی الذکر افسر مسلمان باغیوں کی تحقیقات پر مقرر ہوئے تھے۔ انہوں نے خود اس امر کو تسلیم کیا ہے کہ مسلمانوں کی ناراضی بے بنیاد نہ تھی ان کی وفاداری کو عرصہ تک مشتبہ سمجھا گیا اور اُن کی طرف سے غفلت کی گئی۔ بالآخر ۱۸۷۱ء میں مسلمانوں کے متعلق حکومت کی پالیسی بدلی اور قرار پایا کہ انھیں بڑھایا جائے مگر جس غرض سے بالعموم تمام ملک کی اور بالخصوص مسلمانوں کی تعلیم کا انتظام کیا گیا تھا اس کی کیا غرض تھی، اس سوال کا جواب ڈاکٹر ہنٹر کے الفاظ میں ذیل کے پیرے میں ملاحظہ ہوں

مسلمانوں میں اشاعت تعلیم کی نوعیت اور اس کا مقصد ڈاکٹر ہنٹر لکھتے ہیں:۔

"میرا یقین ہے کہ مسلمانوں کی ہر جماعت کی تعلیم کا انتظام بہ سہولت بہت کم خرچ میں ہو سکتا ہے امداد کے قواعد میں کچھ سہولت پیدا کی جائے جو بالکل کافی ثابت ہوگی۔ روپیہ کی اس قدر زیادہ ضرورت نہیں جس قدر کہ مسلمانوں کی خاص ضروریات مدنظر رکھنے کی ضرورت ہے ...... مشرقی اضلاع میں جہاں کہ مذہب کا زور ہے وہاں میرے خیال میں گورنمنٹ کو مسلمان کاشتکاروں تک پہونچنے کے لئے نیا نظام قایم کرنا پڑے گا۔ لیکن اسپر جو خرچ گورنمنٹ کرے گی اس کا معاوضہ کافی ملجائے گا۔ ایسا نظام ایک زمانہ میں ہندوؤں کے لئے ضروری سمجھا گیا تھا...... لارڈ ہارڈنگ نے ایسے اضلاع میں تعلیم پھیلانے کے لئے جہاں کے لوگ خود تعلیم پھیلانا نہ چاہتے تھے بہت سے اسکول قائم کئے تھے۔ جن پر گورنمنٹ کو علاوہ فیس کے گیارہ سو پونڈ سالانہ صرف کرنا پڑتا تھا...... اس کا طریقہ یہ تھا کہ گاؤں ایک عارضی اسکول کھولدیا جاتا تھا جس میں گاؤں کے بچوں کو تعلیم تقریباً مفت ملتی تھی۔ لیکن جب اس کی قدر ہوتی تو فیس بڑھادی جاتی اور جب وہ اسکول چل نکلتا تو اس روپیہ سے دوسرے رقبہ میں اسکول کھولدیا جاتا۔ اس طریقہ سے مغربی بنگال کے جنگلوں کے اندرونی حصوں میں تعلیم پھیلادی گئی۔ میرے خیال میں مشرقی اضلاع میں یہی طریقہ اختیار کیا جائے جہاں کے لوگ مذہبی مجنون ہیں۔

ایسے اضلاع میں جو گورنمنٹ کے پشتینی بدخواہ اور ہمارے طریقہ تعلیم کے مخالف ہیں امداد کے قواعد کار آمد نہیں ہو سکتے - البتہ پچاس سستے مدرسے جن میں تھوڑی تنخواہ کے مسلمان مدرس رکھے جائیں اور جن کے اخراجات کا بڑا حصہ گورنمنٹ ادا کرے وہ ایک ہی نسل میں مشرقی بنگال کا عام پسند رنگ بدل دیں گے - ایسے مدارس شروع میں کم کامیاب ہوں گے مگر وہ رفتہ رفتہ نہ صرف مسلمان کاشتکاروں کے بچوں کو بلکہ مسلمان استادوں کو جن کی آمدنی غیر یقینی ہے کھینچ لائیں گے - ان کے لئے ۵ شلنگ فی ہفتہ کا زائد معاوضہ نعمت غیر مترقبہ ہوگا - اس طریقہ سے ہمیں اس جماعت کو اپنا طرفدار بنا لینا چاہیئے - جو بالاستقلال شدت کے ساتھ ہماری مخالف ہے"

مسلمان ڈپٹی انسپکٹر مقرر کرنے کی غرض

مسلمانوں کے تعلیمی مطالبات سے مدتوں قبل خود سر ولیم ہنٹر نے یہ تجویز کیا تھا کہ مسلمانوں کی تعلیمی ترقی کے لیے مسلمان ڈپٹی انسپکٹر مقرر کئے جائیں جنھیں مقرر کرنے کی غرض ان کی کتاب کے حسب ذیل اقتباس سے معلوم ہوگی -

"مسلمانوں کی ابتدائی اور ثانوی تعلیم کے لیے ایک سپیشل (خاص) ڈپٹی انسپکٹر کی جو انکا ہم مذہب ہو ضرورت ہوگی - اس کا پہلا فرض ان مسلمان مدرسوں اور کالجوں کے متعلق رپورٹ کرنا ہوگا - جو دلیسیوں کی نگرانی میں ہیں ...... مجھے امید نہیں کہ وہ انگریز افسران کے باقاعدہ معائنہ کو گوارا کریں گے لیکن ان میں سے بہت سے سرکاری امداد دینے کے لئے اپنے ہم مذہب ڈپٹی انسپکٹر کے معائنہ کی آسان تر طرح پر رضامند ہو جائیں گے - اس طرح پر ہمکو بنگال میں سب سے زیادہ باغی درسگاہوں کو اپنے ساتھ کر لینا چاہیئے - اگر وہ وفادار نہ بھی ہوں تو کم سے کم پُر امن تو ہوں"

خواندگی میں تنزل

اب دیکھنا یہ ہے کہ جب مسلمانوں کی تعلیم عامہ کا انتظام کرنے کا تہیہ کیا گیا تو سرکار کی تعلیمی پالیسی کی وجہ سے ہندوستان کے خواندوں کی تعداد گر کر کس درجہ پر پہونچ چکی تھی - ۱۸۷۱ء کی مردم شماری کی رپورٹ میں مجھے خواندوں کی تعداد نہیں ملی البتہ ۱۸۸۱ء کی رپورٹ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ صرف ۳½ فی صدی تھی - یعنی یہ کہ اُسوقت ایکسو آدمیوں میں سے کل ۳½ یا ایک ہزار آدمیوں میں سے کل ۳۵ خواندہ تھے -

مگر اب معلوم ہوا یہ کہ پرانا نظام تعلیم تو ٹوٹ گیا - اور زیادہ تر اس لئے ٹوٹا کہ قدیم مدارس کے پڑھے ہوئے لوگوں کو سرکار کی دس روپیہ کی نوکری بھی نہ مل سکتی تھی - اس لئے تمام تعلیم کا دارومدار سرکاری تعلیم پر رہ گیا - اس کے لیے سرکار نے کافی روپیہ نہیں دیا - اور جو دیا اس میں سے بعض صورتوں میں ۴۵ فیصدی تک افسران معائنہ اور مرکزی دفاتر پر خرچ کیا گیا - نتیجہ یہ ہوا کہ تعلیمی ترقی کی رفتار برائے نام

ہوئی۔ اس کا اندازہ گزشتہ چھ مردم شماری کی رپوٹوں سے ہو گا جن میں خواندوں کی تعداد درج ہے۔

سنہ ۱۸۸۱ء میں ۳،۵
سنہ ۱۸۹۱ء " ۴،۶
سنہ ۱۹۰۱ء " ۵،۳
سنہ ۱۹۱۱ء " ۵،۹
سنہ ۱۹۲۱ء " ۷،۳
سنہ ۱۹۳۱ء " ۸،۰

اس طرح پچاس ۵۰ سال میں خواندوں کی تعداد صرف بقدر پانچ فیصدی کے بڑھی۔ جب سنہ ۱۹۲۱ء میں جدید اصلاحات کا نفاذ ہوا اور صیغۂ تعلیم ہندوستانی وزراء کے ہاتھوں میں آیا اور لازمی تعلیم کا بھی کچھ عملدرآمد ہوا تو امید تھی کہ خواندوں کی تعداد میں کافی اضافہ ہو گا۔ مگر افسوس کہ اس زمانہ میں بھی کوئی نمایاں ترقی نہیں ہوئی۔ اس لئے اگر پچھلی رفتار کا حساب لگایا جائے تو ہندوستان کو نوّے ۹۰ فی صدی خواندوں کی تعداد تک پہونچنے کے لئے ایک ہزار سال درکار ہوں گے۔

صوبہ متحدہ میں خواندوں کی تعداد

خواندہ ہونے کے اعتبار سے جو حال تمام ہندوستان کا ہے اس سے کہیں زیادہ بدتر صوبہ متحدہ کا ہے جہاں خواندوں کی تعداد اور اس کی رفتار حسب ذیل ہے

سنہ ۱۸۸۱ء میں ۳ فی صدی
سنہ ۱۸۹۱ء " ۳،۲ "
سنہ ۱۹۰۱ء " ۳،۱ "
سنہ ۱۹۱۱ء " ۳،۴ "
سنہ ۱۹۲۱ء " ۳،۷ "
سنہ ۱۹۳۱ء " ۴،۷ "

ان اعداد سے ظاہر ہوتا ہے کہ پچاس سال میں صوبہ متحدہ میں خواندوں کی تعداد تین ۳ فی صدی سے بڑھکر ۴،۷ تک پہونچی۔ بس اگر ہم اپنا مطمح نظر متمدن ممالک کی طرح نوّے ۹۰ فی صدی رکھیں تو اس درجہ تک پہونچنے کے لئے ہمیں ڈھائی ہزار سال سے زیادہ لگیں گے۔ اس انتہائی تنزل کی حالت کو محسوس کر کے میں نے سنہ ۱۹۲۹ء میں صوبہ متحدہ کی کونسل میں ایک تجویز پیش کی تھی جس پر ایک کمیٹی مقرر کی گئی تھی۔ اس کمیٹی نے صوبہ کے بعض مقامات کا دورہ کر کے

ایک مفصل اسکیم بنائی جس کی رو سے یہ تجویز کیا گیا تھا کہ چھ اور گیارہ سال کے درمیان کی عمر کے کل لڑکے دس سال کے اندر اور اسی عمر کی لڑکیاں پندرہ سال کے اندر اسکولوں میں پہونچا دی جائیں مگر صوبہ کی مالی حالت خراب ہو جانے کی وجہ سے وہ تجویز معرض التوا میں پڑ گئی۔

ان معروضات سے میری غرض یہ ہے کہ جبکہ رعایا کا قدیم نظام تعلیم ٹوٹ چکا تو کوئی صورت بجز اس کے نہیں ہے کہ مثل دیگر ممالک کے حکومت خود وسیع پیمانہ پر اس کام کو کرے۔

پرائیویٹ کوشش | بے شک پرائیویٹ کوششوں سے اس بارہ میں کچھ نہ کچھ ہو سکتا ہے مگر تمام ملک کی ضروریات کے اعتبار سے وہ بمنزلہ نفی ہوتا ہے۔

جہانتک مجھے یاد ہے اس ملک میں تعلیم بالغان کا چرچا سنہ ۱۹۲۰ء کے بعد سے شروع ہوا ہے۔ اور بوجہ اس کے کہ برادران وطن کی تعلیم کی طرف زیادہ توجہ ہے اور ان میں جوش ہے۔ ان میں مذہبی اور سیاسی انجمنیں ہیں عوام الناس کا تعلیمی اور عام واقفیت کا معیار بلند کرنے میں پوری قوت صرف کر رہے ہیں مگر گزشتہ دو مردم شماریوں کے اعداد سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی اس بارہ میں کوئی کامیابی حاصل نہ کر سکے۔ وہ اعداد حسب ذیل ہیں:۔

	ہندو	مسلمان
سنہ ۱۹۲۱ء۔	۷،۹	۴،۶
سنہ ۱۹۳۱ء۔	۷،۲	۵،۴
	۔ ،۷	+ ،۸

اس کے معنی یہ ہوئے کہ دس سال کے عرصہ میں ہندو خواندوں کی تعداد بقدر ،۷ فی صدی کے گھٹ گئی اور مسلمان خواندوں کی تعداد بقدر ،۸ فی صدی کے بڑھ گئی۔

خیر مردم شماری کے اعداد کچھ زیادہ قابل اعتبار بھی نہیں آتے تاہم یہ بدیہی امر ہے کہ موجودہ حالات میں اس بارہ میں پرائیویٹ کوششوں کا کل تعداد پر بہت کم اثر پڑ سکتا ہے۔ اور جو کچھ کیا جا سکتا ہے وہ صرف حکومت کے ذریعہ سے کیا جا سکتا ہے۔

مگر ان واقعات اعداد شمار پیش کرنے سے میری ہرگز یہ غرض نہیں ہے کہ اس بارہ میں پرائیویٹ طور پر کچھ نہ کیا جائے۔ ہاں یہ التماس ضروری ہے کہ جو کچھ کیا جائے اس کا صحیح اندازہ رہے۔ اور ان امور کو پیش نظر رکھا جائے اور جو کام شروع کیا جائے اس میں غیر معمولی توقعات نہ قائم کی جائیں تاکہ بعد میں مایوسی نہ ہو۔ اب میں چند امور پرائیویٹ کوششوں کی نسبت عرض کرنا چاہتا ہوں اس بارہ میں ہمیں اپنی پچھلی تاریخ کا ورق الٹنا پڑے گا جبکہ ہر خواندہ شخص اپنا مذہبی فرض سمجھتا تھا کہ وہ اپنے علم سے

دوسروں کو فائدہ پہونچایئے۔ علاوہ ان علما کے جنھوں نے تعلیم وتعلم کے لئے اپنی زندگیاں وقف کر رکھی تھیں تمام بڑے اور چھوٹے عہدہ داروں کے پروگرام میں یہ داخل تھا کہ اپنے فرائض منصبی ادا کرنے کے ساتھ طلبا کو پڑھاتے تھے۔ اور چونکہ اس زمانہ میں امرا اور غربا کی سوسائٹی ایک تھی اس لئے تعلیم بالغان کا سلسلہ بھی ازخود جاری تھا۔ چنانچہ بڑے طبقہ کے اصحاب کے صحبت یافتہ لوگ بعض صورتوں میں حرف شناس بھی نہ ہوتے تھے مگر ان کی باتوں سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ اچھے خاصے لکھے پڑھے ہیں۔ اس قسم کی تعلیم بالغان شہروں اور دیہات تک محدود نہ تھی بلکہ علما اور مشائخ دیہات میں جاکر عوام الناس کی معلومات میں اضافہ اور ان کی ذہنیت میں بلندی پیدا کرتے تھے۔ اسی قسم کی روایات کی موجودگی سے اس زمانہ کے مسلمانوں کے دلوں میں یہ تجاویز پیدا ہوتی ہیں کہ مساجد کے ذریعے مسلمانوں کی تنظیم کی جائے۔ اماموں کے ذریعہ سے پوری عمر کے لوگوں کو پڑھوایا جائے۔ مگر ہر زمانہ کی تحریکات جداگانہ نوعیت رکھتی ہیں۔ اور اسوقت خالص مذہبی جذبہ کے تحت میں یہ کام ہوتا ہو مشکل معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ برادرانِ وطن میں اسوقت مذہبی جذبہ سے قطع نظر کرکے سیاسی جذبہ روبہ ترقی ہے۔ اور اب وہ اس نئے جذبہ کے تحت میں اپنے جاہل بھائیوں کو ابھارنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

غنیمت ہے کہ مذہبی جذبہ کے ساتھ سیاسی اور قومی خدمت کرنے کا جذبہ مسلمانوں میں بھی پیدا ہو گیا ہے۔ اور اب عین وقت ہے کہ اس سے فائدہ اٹھایا جائے۔

رُباعیات فراق

ناشاد کسے کہتے ہیں اور شاد کسے
مجبور کسے کہتے ہیں آزاد کسے
اک دل ہے کہ سو بھیس بدلتا ہے فراق
برباد کسے کہتے ہیں آباد کسے

۲

کتنوں کو مٹا چکی محبت تیری
کتنوں کو سُلا چکی محبت تیری
سنتے ہیں ہمیں بھی گوشِ عبرت کیلئے
افسانہ بنا چکی محبت تیری

مسلمانوں سے خطاب

(از مسٹر فیاض الدین احمد خاں فیاض گوالیاری، بی۔ اے)

اے تمناؤں کی وادی میں صدائے بازگشت
کوئے ناکامی و عبرت میں زِ بام اُفتادہ طشت
بلبلِ آوارۂ گلشن، آہوئے گم کردہ دشت
گوشِ شنوا ہے تو سُن اب بھی پیامِ انقلاب

تو کہ ہر دم مائلِ پستی ہے بے خوف و ہراس
سنگِ راہِ ارتقا ہے، کشتۂ افلاس و یاس
استخوانے چند میراثِ سلف ہیں تیرے پاس
اور اعضائے عمل ہیں تشنہ کامِ انقلاب

فاتح و مفتوح کی مٹتی ہوئی سی یادگار
اِک فریبِ ہستیِ موہوم، اِک اُجڑی بہار
یادِ یک عشرت میں تو بربادیوں سے ہمکنار
ہوش میں لائیگا تجھکو دورِ جامِ انقلاب!

شوکتِ اسلاف پر بے وقت اِترایا ہوا
حالی و اقبال کی نظموں کا بہکایا ہوا
راگ گاتا ہے وہی سو بار کا گایا ہوا
کچھ نہیں تیری نظر میں احترامِ انقلاب!

جوشِ وقتی سے اُبھارا جائیگا تو تابکے
مستقل اصلاح سے غافل رہیگا تابکے
کُنجِ گمنامی میں چُھپ چھپ کر بیٹھے گا تابکے
منتظر ہے محفل آرائی کی شامِ انقلاب!

مسلمِ ہندی ترا مذہب تو ہے اسلام! کیوں
کر رہا ہے نام کو اسلام کے بدنام، کیوں
پستی و پسپائی، اے بیگانۂ ایام! کیوں؟
کیا نہیں تیری پہنچ تا اوجِ بامِ انقلاب!

آج سے تیرہ صدی پہلے کی دُنیا پر نثار
کیا ترا مذہب ترقّی کا نہ تھا سرمایہ دار

راستے اصلاح کے اسلام نے کھولے ہزار　　نام سے اسلام کے زندہ ہے نامِ انقلاب!

تو نے دُنیا سے الگ رہنا ہی سمجھا عینِ دیں　　کیا تری رہبانیت اسلام کی دشمن نہیں
تو ہے قانونِ ترقی کی نوائے آخریں　　چاہیئے ہر دور میں دے اذنِ عامِ انقلاب!

چھُپ رہا ہے تیری نظروں میں عرب کا ریگزار　　اک چمن کی ہو رہی کیا تیرے مذہب کی بہار!
کیا نہ ہونا چاہیئے حُبِ وطن تیرا شعار؟　　بانگِ آزادی سُنا بنکر غلامِ انقلاب!

تیرا مذہب شاید اک ماحول تک محدود تھا؟　　دورِ آئندہ کا شاید راستہ مسدود تھا؟
بند مستقبل کا باب اجتہاد و سود تھا؟　　تیرا مذہب سہہ نہیں سکتا سہامِ انقلاب!

شرم کر اسلام اور اُسکی حرّیت سے شرم کر　　دینِ فطرت، مذہبِ انسانیت سے شرم کر
جذبۂ اصلاح و عالمگیریت سے شرم کر　　لے کہ تو لیتے ہوئے ڈرتا ہے نامِ انقلاب!

اِک زمانہ تھا کہ تو دُنیا سے تھا آگے بہت　　اب زمانہ بڑھ گیا تو رہ گیا پیچھے بہت
کل ترے کعبہ کے رُخ پر لوگ جھُکتے تھے بہت　　آج ہے مسجودِ کل، بیت الحرامِ انقلاب!

جانتا ہے تو ترقی کا تری کیا راز تھا؟　　وقت کی نبضوں سے ہم آہنگ تیرا ساز تھا
تجھ سے اکثر ہر نئی تہذیب کا آغاز تھا　　تیرے ہاتھوں میں رہا کی ہے زمامِ انقلاب!

علم و ایجادات بھی تھے جوشِ ایمانی کے ساتھ　　استفادہ کفر سے بھی تھا مسلمانی کے ساتھ
کسب و اخذ و اختراع اصلاحِ انسانی کے ساتھ　　عصبیت سے پاک تھا تیرا پیامِ انقلاب

نقلِ مذہب نے نہ دیکھی جب سے صورت عقل کی　　کس قدر محدود ہو کر رہ گئی دُنیا تری
مفتیوں نے جب سے سیکھا شیوۂ کافرگری　　ہو گیا کافر لیا جس نے بھی نامِ انقلاب!

اُن کتابوں ہی کو تو سمجھا کیا بالِ ہُما — عہد تک مامون کے جن کا ہوا تھا ترجمہ
تیرے اپنے بن گئے سقراط ہرما و شما — کیوں نہ اگلوں پر لگایا اتہامِ انقلاب

ہر زمانہ میں یہی مذہب کی تجھ سے عرض ہے — اپنے اہل الرائے کی تعمیل تجھ پر فرض ہے
ہو نہ یہ جب تک ادا تو زیرِ بارِ قرض ہے — سر اُٹھا کر دیکھ پائے گا نہ بامِ انقلاب

کیا اولی الامر آج تیری قوم میں پیدا نہیں — ہیں۔ مگر اُن کی اطاعت کی تجھے پروا نہیں
تو اگر اپنی پر آجائے تو تجھ میں کیا نہیں — کھینچ لے میدانِ ہمت میں حسامِ انقلاب

اعتمادِ نفس پیدا کر طلب کی راہ میں، — ہے ابھی تخلیق کی قدرت ترے اللہ میں
تھک کے کیوں بیٹھا ہے ارمانِ حصولِ جاہ میں — سعیِ پیہم کو بنا تیغِ نیامِ انقلاب

عقلِ انسانی نہ تھی محدودِ اربابِ سلف — ذہن ہیں اَخلاف کے بھی مثلِ اصحابِ سلف
جلوے بیداری کے بھی ہیں رونقِ خوابِ سلف — لامِ زلفِ لیلیٰ مقصد ہے لامِ انقلاب!

آہ لیکن تجھ پہ طاری ہے قدامت کا مرض — یہ مرض ہے قوم کے حق میں قیامت کا مرض
تھا یہی اقوامِ پارینہ کی شامت کا مرض — مٹ گئے وہ جو نہ تھے اہلِ قیامِ انقلاب

ہیں قویٰ تیرے عمل کے آج کتنے مضمحل — دہر میں آگے قدم رکھتے ترا ڈرتا ہے دل
پستیِ و ذلت میں ہو کر رہ گیا ہے پا بہ گل — دیکھتا ہے حیرت و حسرت سے بامِ انقلاب!

کارواں کے دل میں احساسِ زیاں موجود ہے — جرأتِ بیداری و بہبود ہی مفقود ہے
تیری حد بندی سے تیرا راستہ مسدود ہے — مار شیشہ پر قدامت کے رخامِ انقلاب

لوٹ جانا چاہتا ہے تو اُسی تہذیب پر — تھا جہاں نخلِ ترقی ابتداءً بار ور

بات اک حد تک حقیقت میں یہ اچھی ہے مگر
ہاتھ سے جانے نہ پائے اہتمامِ انقلاب!

اپنے گرد و پیش سے غافل مگر اصلا نہ ہو
پست رہ کر عالمِ اسلام میں رسوا نہ ہو
یہ نہو رفتارِ عالم کی تجھے پروا نہ ہو
آنکھ سے اوجھل نہ ہو جائے نظامِ انقلاب!

جاگ اُٹھے تُرک، بیداری پہ مائل ہیں عرب
تیرے رہبر تو یہی تھے کس کا منہ تکتا ہے اب!
لے رہے ہیں کروٹیں افغان و ایرانی بھی سب
تیری غفلت ہے مگر بیزارِ نامِ انقلاب!

تیرا دشمن ہے تفاخُر، تیری قاتل بے حسی
اِس مرض کی ہے دَوا خود اعتمادی و خودی
دیکھتی ہے کس کو مڑ مڑ کر تری بے ہمتی
بڑھ نہ جائے کاروانِ تیز گامِ انقلاب!

مِٹ کے بَن یا خود سنبھل اس پستیِ مذموم سے
مُنقلب ہونا ہے اِک رفتارِ نامعلوم سے
دُور ہوتی ہے یہ حالت اُمّتِ مرحوم سے
یہ سکوں پامال کر دے گا خرامِ انقلاب!

عصرِ حاضر کا تقاضا کیا ہے اس پر غور کر
طَور کچھ بے طَور ہیں تبدیل اپنے طَور کر
کب ہے حکمِ عقل کچھ کوشش نہ کر خود اَور کر
ذاتِ باری سے دعائے انصرامِ انقلاب

تنگ کب تک دائرہ رکھے گا محسوسات کا
روشنی میں دن کی رہ کر تو ہے قائل رات کا
کشمکش میں زندگی کی ساتھ دے حالات کا
زندہ رہنا ہے اگر لے تشنہ کامِ انقلاب!

روح سے تعلیمِ اسلامی کی تو ہے بے خبر
اپنے مذہب کی فروع و اصل میں تمئیز کر
نفسیاتِ دینِ فطرت پر نہیں تیری نظر
حقِ فطری ہے ترا فکرِ مدامِ انقلاب

پاک ہونا چاہیئے مذہب ترا اوہام سے
تیری رسموں کو کوئی نسبت نہیں اسلام سے
دارِ معقولات میں غافل نہ رہ انجام سے
جب ہوں دشمن مفتیِ وقت و امامِ انقلاب!

چھوڑ دے تقلیدِ کورانہ خدا کا نام لے
انتخاب وعقل سے دارِ عمل میں کام لے

بڑھ کے پھر روٹھی ہوئی قسمت کا دامن تھام لے
ہے موافق ساعتِ ماہِ تمامِ انقلاب

ذہن کو آزادیاں دے عقل کو دے وسعتیں
دُور ہیں تجھ سے ابھی علم و ہنر کی برکتیں

یادگارِ عہدِ وحشت ہیں تری یہ وحشتیں
ورنہ سر آنکھوں پہ رکھتا تو کلامِ انقلاب

حُریت میں فکر کی مضمر ہے رازِ ارتقا
تشنۂ مضراب ہے ہر تارِ سازِ ارتقا

ہے صلاحیت ترے مذہب کی نازِ ارتقا
اور تو ہے لرزہ بر اندام نامِ انقلاب!

زمانہ تیس سال پہلے

زمانہ اپریل ۱۹۰۷ء میں نامور محبِ وطن لالہ لاجپت رائے صاحب کا ایک مضمون ہماری موجودہ پولٹیکل حالت پر شایع ہوا ہے جسکے آخری حصہ کا اقتباس درج ذیل ہے:-

"ترقی کے لئے قدم اٹھانے سے پہلے ہر ایک ترقی کی خواہش رکھنے والے انسان کو سمجھ لینا چاہیئے کہ اس کی موجودہ حالت کیا ہے۔ اس حالت کو سمجھ کر پھر اسکو یہ سوچنا چاہیئے کہ اس کی آرزو کیا ہے اس کے بعد وہ اپنی آرزو کے حاصل کرنے یا اپنی غرض کو پورا کرنے کے لئے صحیح اور معقول تدبیر کرسکتا ہے۔ ورنہ اندیشہ ہے کہ اس کی تمام تدابیر محض بے تکی ہونگی۔ ہماری رائے ناقص میں اسی غلط فہمی کے باعث ہمارے بہت سے پولیٹکل لیڈر محض بے تکی ہانک لگاتے ہیں۔ نہ صرف خود ہی بے راہ ہوجاتے ہیں بلکہ اوروں کو بھی بے راہ لیجانے کی کوشش کرتے ہیں ہماری دل سے یہ دعا ہے کہ خداوند کریم ان کو سیدھے رستے پر ڈالدے تاکہ ہم بھی ان کے پیچھے پیچھے منزل مقصود کا رخ کریں۔ اور حکام گورنمنٹ کو ملک کی اصلی ضروریات کا احساس ہو۔ اور وہ سچی فراخ حوصلگی اور فیاضی کو کام میں لاکر اہل ملک کے اصلی حقوق کی حوصلہ افزائی کریں۔

لاجپت رائے

فرانس کا جمہوری دستور

(۲)

(از خان بہادر ڈاکٹر سید نجم الدین جعفری، ایم۔ اے، ایل ایل، ڈی)

صدر جمہوریت فرانس کا آئین امریکہ، اطالیہ، بلجیم، وغیرہ جمہوری ملکوں کے اساسی دستوروں سے بہت مختلف ہے۔ گو یہ آئین مدوّن ہوچکا ہے اور اس کے تین علیحدہ علیحدہ حصے ہیں تاہم اس میں بہت سے اُمور کا کوئی ذکر نہیں ہے جن کی ایک جمہوری حکومت کے دستور میں شامل ہونے کی توقع کی جاسکتی ہے، نہ اِس میں حقوقِ شہریت کا کہیں ذکر ہے اور نہ وزراء کے تقرر اور ڈپٹیوں کے انتخاب کے طریقوں وغیرہ کا کچھ مذکور ہے۔ عدل و انصاف کے سلسلے میں دستور سے صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ سینٹ کو ہائی کورٹ آف جسٹس بنایا جاسکتا ہے اور بس۔ پرانے فرانسیسی دستوروں کے خلاف ۱۸۷۵ء کا یہ دستور اساسی مختصر غیر منظم اور محدود ہے۔ اس میں صرف تین دستوری قوانین ہیں۔ پہلا جمہوریت کے صدر کے انتخاب اور اس کے فرائض اور دستوری ترمیموں سے متعلق ہے۔ باقی دو اسمبلی اور انتظامی اختیارات سے بحث کرتے ہیں۔ باقی تمام امور رواج اور معمولی قانون سازی کے فیصلے پر چھوڑ دیئے گئے ہیں۔

مگر دستور میں ترمیم کا دروازہ ہر وقت کھلا ہے چنانچہ ۱۸۷۵ء کے بعد سے اب تک اصلی دستور ترمیموں کی بدولت بہت کچھ بدل گیا ہے۔ ترمیمیں صدر یا ایوانوں کے ممبروں کی طرف سے پیش ہوسکتی ہیں اور ان پر غور کرنے کے لئے دونوں ایوانوں کے علیحدہ علیحدہ اجلاس ہوتے ہیں اور کثرت رائے سے ترمیمیں قابل قبول قرار پانے پر دونوں ایوانوں کے مشترک اجلاس میں انھیں منظور کرلیا جاتا ہے۔

کسی حکومت کے آئین کا نمایاں ترین کام کسی دستوری ادارے کے ذریعے سے قانون کا نفاذ اور اس کی ترویج ہے۔ امریکہ کی طرح فرانس میں بھی یہ خدمت ایک منتخب صدر سے لی جاتی ہے جو دونوں ایوانوں کے مشترک اجلاس میں سات سال کے لئے چُنا جاتا ہے۔

طریقۂ انتخاب یہ ہے کہ صدارت کی مدت کے اختتام سے ایک ماہ پہلے صدر جمہوریہ اپنے جانشین کے انتخاب کے لئے پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں کے ممبروں کا ایک مشترک اجلاس بلاتا ہے۔ اگر یہ اجلاس نہ بلایا جا سکے تو اختتامِ مدت سے دو ہفتہ قبل سینیٹ کا صدر ایک میٹنگ کرتا ہے۔ صدر کے مستعفی یا فوت ہو جانے کی صورت میں اسمبلی کا اجلاس بغیر کسی رسمی دعوت کے کر لیا جاتا ہے فرانس میں جمہور کا نائب صدر نہیں ہوتا اور نہ جانشینی کا کوئی قانون ہے، اس لئے کرسی صدارت خالی ہوتے ہی انتخاب ضروری ہو جاتا ہے منتخب صدر کی مدت صدارت سات سال ہوتی ہے خواہ انتخاب کسی وقت اور کسی حالت میں ہو۔

صدر کا انتخاب ایوانوں کے ہاتھ میں ہوتا ہے اور عوام کو اس سے کوئی تعلق نہیں ہوتا اور چونکہ اسے ویسے بھی بہت کم سیاسی اہمیت حاصل ہے اِس لئے انتخاب بہت عجلت اور خاموشی کے ساتھ ہو جاتا ہے۔ جہاں تک ضابطے کا تعلق ہے صدر کا انتخاب اڑتالیس گھنٹے کے اندر اندر ضروری ہے۔ دونوں ایوانوں کے مشترک اجلاس میں جب صدر کے انتخاب کا مسئلہ ممبروں کے سامنے رکھا جاتا ہے تو بحث و تحیص بالکل نہیں ہوتی صرف ووٹ لئے جاتے ہیں۔ ووٹوں کی ٹوکری ایوان کے پلیٹ فارم پر رکھ دی جاتی ہے۔ نقرئی زنجیر پہنے ہوئے ایک خدمتگار ممبران کے نام پکارتا جاتا ہے اور ممبر پلیٹ فارم کے آگے سے گذرتے ہوئے ٹوکری میں ووٹ ڈالتے جاتے ہیں۔ اس کے بعد اسمبلی کے ممبروں میں سے چند اشخاص برابر کے کمرے میں جا کر ووٹوں کا شمار کرتے ہیں اور کامیاب ہونے والے فرد کے نام کا اعلان کر دیا جاتا ہے۔ اس پر غلغلۂ مسرت بلند ہو کر ایوان منتشر ہو جاتا ہے۔ نیا صدر وزیروں کے ہمراہ پیرس میں داخل ہوتا ہے اور پیلیز دے لے ایلیزی (Palaise de L Elysee) میں قیام پذیر ہوتا ہے گذشتہ صدر کی مدت صدارت کے آخری دن نئے صدر کی صدارت کا افتتاح ہوتا ہے۔ وزیر اعظم اُس دن نئے صدر کو ایلیزی تک پہونچانے آتا ہے۔ پُرانا صدر ایک رسمی تقریر کرتا ہے اور نیا صدر اُس کا جواب دیتا ہے، اس کے بعد دونوں ہوٹیل دے ولی (Hotel de ville) میں داخل ہوتے ہیں جہاں میونسپلٹی کے نمایندگان اور محکمہ دریائے سین (Department of the Sein) کی طرف سے ان کا استقبال کیا جاتا ہے۔ عوام سڑکوں پر جمع ہو جاتے ہیں اور نعرۂ شادمانی بلند کرتے ہیں، مگر رسمی جشن میں صرف وزیر اور دونوں ایوانوں کے ممبر شریک ہوتے ہیں۔

صدر کے اختیارات بحیثیت سر عسکرِ حکومت (Chief of the Govt.) صدر کو نفاذ آئین کا اختیار ہے ۔ بحری و بری سپاہ بھی اس کے ماتحت ہے ۔ خارجی حکمت عملی بھی اسی کے اختیار میں رہتی ہے ۔ بعض معاہدے آئینی طور پر ملک سے منظوری لینے کے بعد ہی کئے جا سکتے ہیں ۔ ان پر صدر کا اختیار نہیں ۔ اسی طرح مجلس آئین ساز کی مرضی کے بغیر صدر اعلان جنگ نہیں کر سکتا لیکن سول اور ملٹری عہدوں پر افراد کے تقرر کا اختیار اُسے حاصل ہے اور وہ مجرموں کو معافیاں بھی دے سکتا ہے ۔ اس کے علاوہ تمام قومی اجتماعوں میں قوم کی نمائندگی اور جلسوں کی صدارت اس کے ذمّہ ہوتی ہے ۔ ایوانوں کے دیگر ممبروں کی طرح صدر بھی قوانین تجویز کرنے کا مجاز ہے اور سینٹ کی مرضی سے چیمبر آف ڈپٹیز (Chamber of Deputies) کو توڑ سکتا ہے ۔ اس کے علاوہ صدر دستورِ اساسی پر نظر ثانی کی غرض سے دونوں ایوانوں کا غیر معمولی اجلاس طلب کر سکتا ہے ۔

انفرادی حیثیت میں صدر ایوانوں کو کوئی پیغام نہیں دے سکتا ۔ تھیئرز (Theirs) نے ایسا کیا تھا ، مگر اسمبلی نے اس کے ذاتی اثر سے خوفزدہ ہو کر اس بات کی مخالفت کر دی جس میں ابھی تک کوئی ترمیم نہیں ہوئی ۔ صدر ایوانوں کو ایک ماہ تک ملتوی بھی رکھ سکتا ہے مگر ایک سیشن میں دو مرتبہ سے زیادہ ایسا کرنا اس کے اختیار میں نہیں ۔ ویٹو (Veto) کا اختیار بھی اسے حاصل نہیں ہے ۔ البتہ کسی منظور شدہ قانون پر دوبارہ غور کرنے کے لئے وہ دونوں ایوانوں کا اجلاس طلب کر سکتا ہے ۔

صدر اپنے یہ تمام اختیارات اپنے وزیروں کے ذریعے سے استعمال کرتا ہے ، ذاتی طور پر وہ بالکل غیر جانبدار سمجھا جاتا ہے اور قانوناً ایوان کی کوئی ملامتی تجویز اُسے معزول نہیں کر سکتی گو ایوان اپنے مخالفانہ طرز عمل سے اس کے لئے صدارت کی کرسی سنبھالے رہنا ناممکن بنا سکتے ہیں ۔ لیکن چیمبر آف ڈپٹیز اس پر بغاوت کا الزام لگا سکتا ہے ۔ اس صورت میں سینٹ جرم کی تفتیش کرتا ہے اور جرم ثابت ہو جانے کی صورت میں صدر اپنے عہدے سے ہٹا دیا جا سکتا ہے صدر کے وزراء کلیتًہ امور کے ذمّہ دار ہوتے ہیں اور اپنے افعال و اعمال کے لئے ایوانوں کے سامنے جوابدہ رہتے ہیں ۔ گویا فرانس کا صدر نہ امریکہ کے صدر کی طرح ہے (جو اسمبلی سے بے نیاز ہونے کی وجہ سے اس کی کامیاب مخالفت کر سکتا ہے اور جس کے وزراء کانگریس کے نہیں بلکہ اپنے افعال کے اس کے سامنے جوابدہ ہوتے ہیں) اور نہ وہ سوئٹزر لینڈ کے صدر کی طرح صرف

سات ممبروں کی انتظامی کمیٹی کا صدر ہوتا ہے (جسے کوئی اہم اختیارات حاصل نہیں) اس کی صحیح نظیریں برطانیہ، اٹلی وغیرہ ممالک کے آئینی بادشاہوں میں ملتی ہیں، جہاں بادشاہ صرف آئینی حیثیت سے حکمران ہوتے ہیں۔ ورنہ دراصل وزیروں کی جماعت ہی ان کے نام پر حکومت کرتی ہے اور وزراء مجالس قانون ساز کے سامنے جوابدہ ہوتے ہیں۔

البتہ دو باتوں میں فرانس کا صدر اپنے وزیروں سے بے نیاز ہوکر قدم اُٹھا سکتا ہے۔ ایک تو اس شخص کا انتخاب کرتے وقت وہ اپنی رائے کا بالکل آزادانہ استعمال کرتا ہے، جس کو وزارت ترتیب دینے کی دعوت دی جاتی ہے۔ جب ایک کابینہ مستعفی ہوجاتا ہے تو صدر اپنا آئینی فرض ادا کرتے ہوئے نمایاں ترین ڈپٹی یا سینٹر کو بلاکر نئی حکومت ترتیب دینے کی دعوت دیتا ہے۔ رواجاً اُسے سینٹ کے صدر اور چیمبر کے پریسیڈنٹ دونوں سے مشورہ کرنا چاہیئے، اور پارٹیوں کے لیڈروں اور دیگر اہل الرائے مدبرین کی رائے بھی معلوم کرنی چاہیئے، مگر وہ کسی کی رائے قبول کرنے پر مجبور نہیں۔ دوسری بات جس میں صدر اپنی رائے کا آزادی سے استعمال کرسکتا ہے یہ ہے کہ وہ چاہے تو عام ملکی معاملات کو حل کرنے میں وزیروں کو اپنے امدادی مشوروں سے مستفید کرے۔ اس اعتبار سے جمہوریۂ فرانس کے صدر کی حیثیت شاہ برطانیہ (جو آئینی بادشاہ ہوتا ہے مگر حکمران نہیں) اور صدر جمہوریۂ امریکہ کے (جو آئینی بادشاہ بھی ہوتا ہے اور حکمران بھی) بین بین ہوگئی ہے۔

(۳)

مجلس وزراء: صدر کے اختیارات کے سلسلے میں وزراء کا ذکر آیا تھا، اب ہم کابینہ اور وزراء کی پوزیشن اور ذمہ داریوں اور اختیارات پر روشنی ڈالتے ہیں۔ فرانسیسی دستور میں اول تو جمہور کے صدر کے ہر اقدام پر ایک وزیر کی دستخطی تصدیق ضروری ہے اور دوسرے وزراء مجموعی طور پر عمومی حکمت عملی کے لئے اور فرداً فرداً اپنے ذاتی افعال کے واسطے ایوانوں کے سامنے جوابدہ ہیں۔ جیسا کہ ہم بتا آئے ہیں، صدر کو اپنی جگہ بعض اختیارات حاصل ہیں مگر اصلی حکمراں وزیر ہی ہوتے ہیں اور وہ آئین سازی پر پورا قابو رکھتے ہیں، قانوناً نہیں مگر عملاً یہ وزیر یا تو ڈپٹی ہوتے ہیں یا سینٹر (Senator) اور مدت وزارت کے اختتام پر پھر اپنی پچھلی حیثیت پر آجاتے ہیں۔ یوں مزاج، خیالات اور ذہنیت کے لحاظ سے وہ اول تا آخر ممبران مجلس قانون ساز ہی رہتے ہیں۔

وزیر اعظم کابینہ کے لئے بیشتر وزراء اپنے ہی جتھے (Group) سے چُنتا ہے مگر عام طور پر وہ ایک وزیر مخالف جماعت میں سے بھی لے لیتا ہے جن سے اسے کسی قسم کی امداد کی توقع ہوتی ہے

باوصف اختلاف رائے کے وزیر مخالفین وزارت کے مقابلے میں متحدہ محاذ پیش کرتے ہیں۔ وزیر بننے کے لئے ایک ممبر پارلیمنٹ میں بیداری مغزی اور قوت تقریر وغیرہ صفات کی تلاش کی جاتی ہے عہدوں کی تفویض میں علم وفضل کا لحاظ بھی کیا جاتا ہے۔ وزیر باعتبار مدارج ومراتب صدر جمہوریہ اور ایوانوں کے صدر کے بعد آتے ہیں۔ انھیں ایکسیلنسی (Excellency) کا خطاب ہوتا ہے۔ جب وہ کسی قومی تقریب میں شرکت کے لئے کسی شہر میں جاتے ہیں تو سرکاری طور پر اُن کا ہر ممکن احترام کیا جاتا ہے، اس لحاظ سے کہ اگزیکٹیو کا حلقۂ عمل بہت وسیع ہے، بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ وزیروں کا اقتدار بھی بہت وسیع ہوگا لیکن اصل میں فرانس کی انتظامی مشین اس قدر پیچیدہ ہے کہ ایک وزیر کچھ زیادہ زور آزمائی نہیں کرسکتا کیونکہ انتظامی فرائض کی بجاآوری کے ساتھ ساتھ اسے ڈپٹیوں کے مطالبات بھی پورے کرنے پڑتے ہیں، کابینہ کے مستقبل کا خیال بھی رکھنا پڑتا ہے اور تجارتی لوگوں کا دباؤ بھی برداشت کرنا پڑتا ہے۔

وزارتوں کی مدتِ عمر بہت ہی مختصر ہوتی ہے، مگر وزارت کی تبدیلی سے ملک کی حالت میں کوئی فرق نہیں آتا۔ انگلستان میں وزارت کی تبدیلی رائے عامّہ کی تبدیلی پر دلالت کرتی ہے، فرانس میں ایسا نہیں ہے۔ وزارت کی تبدیلی سے ملک کے عام انتظام میں خلل تو ضرور پڑتا ہے مگر بے ترتیبی پیدا نہیں ہوتی کیونکہ مضبوط اور اہل مقامی انتظامی ادارے قصرِ حکومت کے بالائی حصوں کی تبدیلیوں سے متاثر ہوئے بغیر اپنا کام کئے چلے جاتے ہیں۔ اسی طرح وزارت کی تبدیلی سے فرانس کی خارجی حکمت عملی پر بھی کوئی اثر نہیں پڑتا۔

وزارتوں کے اس قدر جلدی جلدی ٹوٹنے کے وجوہات یہ ہیں:۔

چیمبر میں پارٹیوں کی کثرت، نظام کی کمی۔ نازک سیاسی صورت حالات کا فوری طور پر پیدا ہوجانا۔ مختلف الخیال گروہوں کا کسی ایسی وزارت کو توڑنے کے لئے متحد ہوجانا جسے وہ اپنی اپنی جگہ مختلف وجوہات کی بنا پر ناپسند کرتے ہوں، وغیرہ وغیرہ۔

لیکن ان سطحی وجوہ کے علاوہ بعض بنیادی وجوہات بھی ہیں، جن میں چند یہ ہیں:۔

(۱) ملک میں قدرتی تقسیم کے لحاظ سے شدید اختلاف رائے۔ (۲) رومن کیتھولک اور مخالف مذہب طبقوں میں دائمی مخاصمت (۳) مزدوروں اور کارخانہ داروں اور اہل سرمایہ میں رسہ کشی (۴) زراعتی علاقوں کی ملکی سیاسیات سے بے پروائی، اور (۵) مسلّمہ رہبر کا فقدان۔

(۴)

پارلیمنٹ کی تشکیل۔ سینٹ دستور کی رو سے آئین سازی کے اختیارات ایک قومی پارلیمنٹ کو حاصل ہیں جس کے دو ایوان ہوتے ہیں، (۱) سینٹ، اور (۲) چیمبر آف ڈپٹیز، سینٹ میں تین سو ممبر ہوتے ہیں، ان میں دو سو پچیس منتخبہ ہوتے ہیں اور پچھتر اسمبلی کے نامزد کردہ ۔ انتخاب انتخابی اداروں کے ذریعے سے ہوتا ہے ۔ان اداروں کے ممبر عام ووٹنگ سے چنے جاتے ہیں ۔ ان میں حلقۂ نیابت کے ڈپٹی، جنرل اور ڈسٹرکٹ کونسلوں کے ممبر اور کمیونوں (Communes) کے ڈیلیگیٹ شامل ہوتے ہیں۔ اُن ڈیلیگیٹوں کے اخراجات جو حلقۂ نیابت کے مرکزی مقام تک رائے دینے کے لئے آتے ہیں پبلک فنڈ سے ادا کئے جاتے ہیں۔ ہر حلقۂ انتخاب سے دو سے لیکر دس سینٹر تک آسکتے ہیں۔ آبادی کی کمی بیشی اس عدم توازن کی ذمہ دار ہے ۔ ایک سینٹر کی مدت خدمت نو برس ہے ۔ حقیقت میں سینٹ کبھی بھی نہیں ٹوٹتا، کیونکہ اس کا ایک تہائی حصہ ہر سال بدلتا رہتا ہے۔ کل حلقۂ انتخاب تین گروہوں میں تقسیم کر دیئے گئے ہیں ۔ ہر گروہ تین منتخبہ تاریخوں سے کسی ایک تاریخ پر انتخاب کر لیتا ہے ۔ چالیس برس سے نیچے کا آدمی سینٹ میں نہیں لیا جاتا عمر کی اس قید کے علاوہ اور کسی قابلیت کی چھان بین ضروری نہیں سمجھی جاتی ، حتیٰ کہ رہائش تک کی قید نہیں، گو عملاً صرف وہی لوگ منتخب ہوتے ہیں جو حلقۂ انتخاب میں رہائش دکھا سکتے ہوں یا اس سے متعلق ہوں ۔کسی ممبر کی نشست خالی ہونے پر سینٹ خود ہی اُسے پُر کر لیتا ہے۔

مالی مسودوں کو چھوڑ کر باقی معاملات میں سینٹ کے اختیارات حکمرانی چیمبر آف ڈپٹیز کے برابر برابر ہیں ۔ مالی مسودے چیمبر ہی سے چلتے ہیں ، البتہ سینٹ ان میں ترمیم کر سکتا ہے ۔ یہ کہ منسوخی یا تخفیف دفعات کے علاوہ سینٹ اخراجات میں بھی اضافہ کر سکتا ہے یا نہیں ، ما بہ النزاع مسئلہ ہے ۔ اور ابھی تک حل نہیں ہو سکا ہے۔ سینٹ نے بعض مرتبہ اخراجات میں اضافہ کرنے کی سعی کی مگر ایسے موقعوں پہ چیمبر کی طرف سے صدائے احتجاج بھی ضرور بلند ہوئی اور سینٹ نے اپنی کمزوری محسوس کرتے ہوئے چیمبر کے آگے سر تسلیم خم کر دیا۔ جہاں تک مالی مسودوں کا تعلق ہے برطانوی پارلیمنٹ میں بھی یہی صورت ہے ۔ وہاں دار العوام نے بڑی کشمکش کے بعد دار الامرا سے مالیات پر اپنا اختیار تسلیم کرا لیا ہے۔ اب برطانوی آئین یہ ہے کہ دار الامرا، عوام کے منظور کردہ مالی مسودۂ قانون کو زیادہ سے زیادہ دو برس تک ملتوی کر سکتا ہے ۔ اور دو برس کے بعد وہ مسودہ قانون بن جاتا ہے ۔

فرانس کے سینٹ کو دو خصوصی اختیارات حاصل ہیں، ایک تو یہ کہ اگر نئے چیمبر کے انتخاب سے
قبل صدر چیمبر کو توڑنا چاہے تو سینٹ موافق یا مخالف رائے دے سکتا ہے۔ دوسرے یہ کہ مخالفین حکومت
کے مجرمانہ افعال کی تفتیش کے لئے صدر کی دعوت پر سینٹ بطور ہائی کورٹ آف جسٹس اپنا اجلاس منعقد
کر سکتا ہے اور فیصلہ دے سکتا ہے۔ خارجی حکمت عملی یا تقرریوں کے سلسلے میں سینٹ کے ذمے کوئی
خاص خدمت نہیں ہے۔

سینٹروں کے انتخاب کے معاملے میں ملک کچھ زیادہ دلچسپی نہیں لیتا۔ منتخب کرنیوالے ڈیلیگیٹ
عموماً سب کے سب اوسط درجے کے طبقوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ ووٹنگ عموماً جماعت بندی کی بنیادوں
پر ہوتا ہے اور مقامی اثرات بہت کام کرتے ہیں۔ رشوت ستانی عنقا ہے۔ ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ
ایک شخص سینٹ میں داخل ہو کر سیاسی زندگی شروع کرے۔ سینٹ کے امیدوار اکثر و بیشتر وہ لوگ
ہوتے ہیں جو چیمبر کی طویل ممبری کے بعد اب زیادہ آسان زندگی کے متلاشی ہوتے ہیں۔ ذاتیات
اور گرما گرمی کا فقدان سینٹ میں بہت نمایاں ہوتا ہے۔ اِن چیزوں کے مظاہرے کے لئے چیمبر
بہت مشہور ہے۔ سینٹر ہر تجویز کو معقولیت اور تجربے کی روشنی میں دیکھتے ہیں۔ وہ پارٹی بندی کے
اثرات سے بالکل آزاد رہتے ہیں، اور نہ اُنھیں دوبارہ منتخب ہونے کی کوئی اُمید ہوتی ہے کیونکہ
ایک سینٹر دو سے زیادہ مرتبہ منتخب نہیں ہوتا۔

سینٹ اور چیمبر کے تعلقات چیمبر سے سینٹ کے تعلقات کا دارومدار سینٹ کے اختیارات پر ہے،
جو عمل میں نہ ہونے کے برابر رہ جاتے ہیں۔ اقتصادی معاملات میں سینٹ کو چیمبر کا دست نگر بننا پڑتا ہے
اور اس لئے یہ اکزکٹیو پر کوئی قابو حاصل نہیں کر سکتا۔ سینٹ خود بھی اپنی اس کمزوری کو عملاً تسلیم کرتا ہے
اور کبھی بھی چیمبر کا سدِ راہ نہیں بنتا۔ چونکہ رجحانات بیشتر جمہوریت کی طرف ہیں اور سینٹ اُن رجحانات
کا کوئی تدارک کرنے سے قاصر ہے، اُس نے چیمبر کے مقابلے میں اُس حیثیت سے بھی فروتر حیثیت پر قناعت
کر لی ہے، جو اس کی تشکیل سے آئین کے مدِ نظر تھی۔ مگر اختیارات کم ہوتے ہوئے بھی سینٹ بڑی
عمدگی کے ساتھ اپنے کاموں کو انجام دیتا ہے۔ اس کے ممبر پارلیمنٹری معاملات کے پورے ماہر ہوتے ہیں
اور چیمبر کے ماحول اور اس کی کمزوری سے پوری واقفیت رکھتے ہیں۔ اختلافی مسائل میں وہ ایسے
سلیقے کے ساتھ چیمبر سے نبرد آزما ہوتے ہیں کہ اپنی آشکارا کمزوریوں کے باوجود بھی کامیابی کے ساتھ
اس کا مقابلہ کر لیتے ہیں۔ جب وہ دیکھتے ہیں کہ چیمبر سنجیدگی کے ساتھ ایک مسودۂ قانون کو منظور کرنے
پر مصر ہے اور رائے عامہ بھی اُس کی پشت پر ہے تو سینٹ بلا چون و چرا چیمبر کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیتا ہے

اور مسودۂ قانون کی منظوری پر قطعاً معترض نہیں ہوتا۔ لیکن اس کے برخلاف جب سینٹ دیکھتا ہے کہ کوئی مسودۂ قانون صرف ہنگامی شور و شغب سے مرعوب ہو کر منظور کر لیا گیا ہے تو یہ خاموشی کے ساتھ اسے طاقِ نسیان کے حوالے کر دیتا ہے۔ اور اس موقع کا منتظر رہتا ہے کہ چیمبر کے ممبروں کا جوش ٹھنڈا پڑ جائے اور رائے عامّہ کا رُجحان کسی اور طرف ہو جائے تو مسودۂ قانون میں ترمیم کر کے چیمبر میں واپس بھیجے۔ متعدد مُضر مسوّدے اسی طرح موت کی نیند سلا دیئے جاتے ہیں۔ مگر مالی قوانین کے معاملے میں چیمبر سینٹ کو یہ چالیں نہیں چلنے دیتا۔ عموماً سال کا بجٹ آخری ممکن لمحات تک روکا جاتا ہے اور ایسی تنگ فرصت میں سینٹ کے پاس منظوری کے لئے بھیجا جاتا ہے جب ترمیم کے لئے وقت ہی نہ نکل سکتا ہو۔ سینٹ اور چیمبر کے درمیان اختلافات کے تصفیئے کی تنہا صورت یہ ہے کہ ہر ایوان کی طرف سے ایک ایک کمیشن بیٹھتا ہے۔ اور ان دونوں کمیشنوں کی کانفرنس میں اختلافی مسائل پر بحث ہوتی ہے۔ اگر یوں تصفیہ نہ ہو تو پھر کسی اور صورت سے تصفیہ ممکن نہیں اگر چیمبر اپنی رائے پر مصر ہو تو اس کی رائے بالخصوص اس وقت جب رائے عامّہ بھی اُس کی پشت پر ہو، غلبہ پا لیتی ہے۔ کابینہ میں سینٹ سے تین چار افراد ضرور لئے جاتے ہیں۔ ہر چند اپنی حیثیت کے اعتبار سے سینٹ میں یہ صلاحیت نہیں کہ قوم کی توجہ کا مرکز بن سکے۔ مگر پھر بھی سینٹروں کا احترام کیا جاتا ہے۔ اکثر اِن مسودوں میں ترمیم یا تخفیف کر دینے کی وجہ سے جو چیمبر نے بلا پس و پیش پاس کر دیئے ہوں، رائے عامّہ سینٹروں سے برہم رہتی ہے مگر سمجھدار طبقہ سینٹ کی قدر و قیمت سے خوب اچھی طرح واقف ہے۔

پارلیمنٹ کی تشکیل
چیمبر آف ڈپٹیز
Chamber of Deputies

یہ فرانس کا دارالعوام ہے، انتخاب چار برس کے لئے ہوتا ہے، ممبران کی تعداد دو سو چھبیس ۲۲۶ ہے۔ ہر مرد شہری جس کی عمر اکیس ۲۱ برس کی ہو چکی ہے رائے دے سکتا ہے۔ دیوالئے یا فوج اور بیڑے کے ملازم یا وہ جن کے سیاسی حقوق سلب ہو چکے ہیں، حق رائے دہی سے محروم ہیں۔ عورتیں بھی رائے نہیں دے سکتیں۔ ایک شخص ایک ہی جگہ سے رائے دے سکتا ہے خواہ وہ دو جگہوں سے رائے دینے کا حقدار ہو۔ صدر جمہور کے اعلان پر اور اس کے حکم سے پارلیمنٹ کے انتخابات ہوتے ہیں۔ طریق انتخاب بہت ہی سادہ اور کم خرچ ہے۔ رائیں صیغۂ راز میں رکھی جاتی ہیں۔ انتخاب کے لئے کُل ملک میں ایک ہی دن مقرر ہے، حسب قاعدہ ووٹنگ مقامی میونسپلیٹوں کی عمارتوں میں ایک انتخابی بیورو کی نگرانی میں ہوتا ہے۔ جو میئر (بحیثیت صدر) چار اسیسروں اور ایک سیکریٹری پر مشتمل ہوتا ہے

عام طور پر یہ انتخابی بیورو تمام مقامی رائے دہندوں سے شناسا ہوتا ہے مگر باقاعدگی کے خیال سے انتخابی کارڈ انتخاب سے پہلے ہی تقسیم کر دیئے جاتے ہیں۔ ہر کارڈ پر ضلع، مقام، نام انتخاب، نام رائے دہندہ، اس کا رجسٹر نمبر اور جائے انتخاب کے نام درج ہوتے ہیں۔ رائے دینے سے قبل رائے دہندہ اسیسروں میں سے کسی ایک کو اپنا کارڈ دیتا ہے اور وہ کارڈ کا مندرجہ نام سکرٹری کو پڑھکر سناتا ہے تاکہ فہرست رائے دہندگان سے کارڈ مطابق کیا جا سکے۔ پھر کارڈ رائے دہندہ کو واپس کر دیا جاتا ہے تاکہ اگر دوبارہ رائے شماری کی ضرورت پڑے تو یہ کارڈ کام آسکے۔ مگر اس کا ایک کونہ تراش دیا جاتا ہے۔ کہ موجودہ انتخاب میں دوبارہ استعمال نہ ہو سکے۔ رائے شماری کے لئے ان ہی رائے دہندگان میں سے افراد لئے جاتے ہیں اور اُن کی مدد سے افسر انتخابی امیدواروں کے ووٹ علیحدہ علیحدہ کرتا ہے۔ اس وقت میزیں اس طرح رکھی جاتی ہیں کہ ووٹر اُن کے ارد گرد پھر کر یہ دیکھ سکتے ہیں کہ آیا رائے شماری ٹھیک طور پر عمل میں آرہی ہے یا نہیں۔ جو کچھ نتیجہ برآمد ہوتا ہے فوراً مع ضروری کاغذات حلقے کے صدر مقام کو بھیج دیا جاتا ہے اور اس کا اعلان ہو جاتا ہے۔

ممبری کے امیدوار کی عمر پچیس برس سے کم نہ ہونی چاہیئے، ضروری نہیں کہ جس حلقے سے وہ کھڑا ہوا ہے اسی کی سکونت بھی دکھائے۔ اِن خاندانوں کے افراد چیمبر کے ممبر نہیں ہو سکتے جو کسی وقت فرانس پر حکمرانی کر چکے ہیں۔ ماسوا چند عمالِ حکومت بھی چیمبر کے ممبر نہیں ہو سکتے۔ امریکہ کی طرح فرانس میں بھی یہ دستور ہے کہ ایوان کا ممبر ایوان کی منظوری کے بغیر ممبری سے مستعفی نہیں ہوتا۔ سینیٹروں کو ڈپٹیوں کے مساوی معاوضہ ملتا ہے جو نو ہزار فرانک سالانہ سے بڑھکر اب پندرہ ہزار فرانک سالانہ ہے۔ چیمبر کے ممبروں میں سے اکثر اپنی ابتدائی سیاسی زندگی ہی سے حلقہ نمایندگی میں اثرات قائم کرتے آتے ہیں، وہ مقامی کونسلوں میں داخل ہوتے ہیں۔ مقامی پارٹی کے ایک سرگرم کارکن کی حیثیت سے کام کرتے ہیں اور پوری مستعدی کے ساتھ حلقے کے مفاد کا تحفظ کرتے رہتے ہیں۔ اور اس کی اغراض کی تکمیل میں جان لڑا دیتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں چیمبر کی ممبری کے سلسلے میں امیدوار کی شخصی خدمات بہت زیادہ کام کرتی ہیں۔ ایک امیدوار کو نہ صرف خوش خلقی اور ملنساری کے اوصاف سے متصف ہونا چاہیئے بلکہ اپنے حلقے کے جذبات اور توہمات کا بھی اُسے لحاظ رکھنا پڑتا ہے۔ مثلاً فرانس کا جنوبی حصہ زیادہ آزاد خیال ہے، اور اخلاقی پابندیوں کی زیادہ پرواہ نہیں کرتا۔ برخلاف اس کے شمالی علاقے ان معاملات میں زیادہ سخت ہیں اور اس لئے شمالی علاقوں سے چیمبر کے لئے کھڑے ہونے والے اشخاص کو ایسی

آراء کے اظہار اور ایسی حرکات سے اجتناب کرنا پڑتا ہے، جو اس علاقے کے باشندوں کے ضابطۂ اخلاق کی رو سے ممنوع یا مکروہ ہیں۔ ایسے لوگوں کو جو پوری طرح اپنا اثر جما چکے ہوں اس ضلع کی پارٹی کمیٹی اپنی طرف سے امیدوار کھڑا کرتی ہے اور انتخاب کے وقت بھی امیدوار زیادہ تر مقامات اُمور کی انجام دہی کے متعلق لوگوں کو یقین دلاتے ہیں اور تفصیل کے ساتھ بتاتے ہیں کہ ہم اپنے حلقے کی کیا کیا خدمات انجام دیں گے۔ ملکی سیاسیات کا تذکرہ اُن کی زبان پر نہیں ہوتا۔ جب ایک دفعہ ایک شخص چیمبر کا ممبر منتخب ہو جاتا ہے تو پھر اُس کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ آئندہ انتخاب میں کامیاب ہونے کے واسطے میدان تیار کرے۔ وہ فرداً فرداً ہر باشندۂ ضلع کے مفاد کا خیال رکھتا ہے، بالخصوص اُن لوگوں کو ضرور فائدہ پہونچاتا ہے جنھوں نے اُسے کامیاب کرانے میں حصہ لیا تھا۔ لوگ اُس سے ہر قسم کی خدمت کی توقع کرتے ہیں۔ اپنے مددگاروں میں سے کسی کے لئے وہ خطاب کا بندوبست کرتا ہے کسی کے لڑکے اور داماد کو نوکری دلواتا ہے، کسی کے لئے تمباکو فروشی کا لائیسنس حاصل کرتا ہے، مگر یہ بات فراموش نہ کرنی چاہیئے کہ جن لوگوں کیلئے وہ کام کرتا ہے اُنہی کی بدولت اسے اختیار و اقتدار حاصل ہوتا ہے۔ پھر وہ صرف اپنے رائے دہندوں کی اغراض کی تکمیل کا آلہ کار ہی نہیں رہتا، لوگ اس کی عزت بھی کرتے ہیں۔ جب تک وہ حلقۂ نیابت اور باشندوں کے مفاد کا تحفظ کرتا رہتا ہے، لوگ اُسے ممبری سے ہٹانا فضول خیال کرتے ہیں۔ مستقبل کی طرف سے اطمینان کر لینے کے بعد چیمبر کا ممبر ایوان میں اپنی پوزیشن کے استحکام کی فکر کرتا ہے۔ وہ ایوان کی بہترین کمیٹیوں میں سے ایک یا دو میں جگہ حاصل کرتا ہے اور زیادہ سے زیادہ ممبروں سے دوستانہ تعلقات قائم کرتا ہے، اس کے بعد وہ چیمبر کے بے شمار گروہوں میں سے کسی ایک میں شامل ہو جاتا ہے، عموماً وہ ایسے گروہ میں شامل ہوتا ہے جو نہ صرف باعتبار پالیسی اُسے پسند ہوتا ہے بلکہ جس کی شمولیت میں وہ اپنی آئندہ ذاتی ترقی بھی مضمر پاتا ہے۔ اِن گروہوں کے صدر ہوتے ہیں اور ایک ایک کمیٹی بھی ہوتی ہے، مگر ان لوگوں کا کوئی وجود نہیں ہوتا جنھیں انگلستان میں وِھپ (Whip) کہتے ہیں اور جو اختلافی مسائل میں رائے شماری کے وقت جماعت کی رائے مجتمع کرتے ہیں۔

رُباعی

بڑھتے چلے ہاتھ جیب و داماں کی طرف
وحشی کے قدم اُٹھے بیاباں کی طرف
ہے صبحِ بہار لڑکھڑاتی ہے نسیم
اُٹھتی ہے نظر تیری گلستاں کی طرف

فراق گورکھپوری

نگاہِ ناز میں ہو اک ادائے حسرت بھی — کبھی کبھی یوں ہی کچھ یادِ رفتگاں پیارے
ملالِ سختیِ دوراں نہ رنجِ غفلتِ دوست — عجیب بزم ہے یہ بزمِ بیکساں پیارے
یہاں کسی کو کسی کی خبر نہیں ملتی — حریمِ اہلِ محبت میں تو کہاں پیارے
کہیں نہ شیوۂ تسلیم کا بھرم کھل جائے — ترے نثار کہاں تک اب امتحاں پیارے
ترا خیال ہی وجہِ صد اضطراب رہا — ترا ہی درد رہا ہے سکونِ جاں پیارے

دلوں کو کھینچ سکے کون نام لے کے ترا
کہ تھی فراق کے دم تک یہ داستاں پیارے

رباعیاتِ فراق

(از پروفیسر رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری، ایم۔ اے)

ہاں پاک نگاہوں سے تجھے دیکھا تھا — نمناک نگاہوں سے تجھے دیکھا تھا
وہ دل ہی تھا جس نے مجھے غافل پاکے — بے باک نگاہوں سے تجھے دیکھا تھا

اے دوست بچھڑ کے تجھ سے جینے والے — چپ چاپ لہو کے گھونٹ پینے والے
اُف تک نہیں کرتے ہیں شکایت کیسی — اپنے ہاتھوں سے ہونٹ سینے والے

مجھ سے یہ عبث ہے بدگمانی تیری — یوں ہی سہی خیر، مہربانی تیری
اپنی اپنی پڑی ہے سب کو اے دل — سنتا ہی نہیں کوئی کہانی تیری

کھوتے ہیں اگر جان تو کھو لینے دے — اے دوست جو ہو جائے وہ ہو لینے دے
تجھ سے جو چھٹے صبر بھی کریں گے کبھی — اس وقت تو جی کھول کے رو لینے دے

اُمّی شعراء

از مرزا فدا علی خنجرؔ لکھنوی

"میں نے اُردو کے اَن پڑھ شاعروں کا ایک تذکرہ "تلامیذ الرحمٰن" کے عنوان سے ۱۹۲۵ء میں جمع کرنا شروع کیا تھا، جو ۱۹۲۷ء تک اس قابل ہوا کہ اُس پر تالیف کا اطلاق ہو سکے۔ اُنھیں ایّام میں بعض مشہور ادیبوں نے جستہ جستہ اس کی سیر کر کے نہ صرف قبولیت کا شرف عنایت کیا بلکہ حوصلہ افزا تحریریں بھی عطا فرمائیں اور میری محنت اور جستجو کی داد مرحمت کی۔ خصوصاً محسنِ اَدب مولوی عبدالحق صاحب بی۔ اے نے اپنے مشہور سہ ماہی رسالہ "اُردو" میں اسے بالاقساط شائع کر کے علمی قدر دانی کا ثبوت دیا۔ ان حوصلوں میں روحِ عمل پیدا کرنیوالے حالات نے مجھ میں عزم و استقلال کی جان ڈال دی اور میں نے بہار و بنگال کے متعدد اُمّی شعرا کو ڈھونڈھ نکالا۔ سطورِ ذیل میں ان حالات و واقعات پر روشنی پڑے گی جن کے ماتحت میں نے اس اہم اور اچھوتی خدمت کے لئے قلم اُٹھایا اور خدا کے فضل و کرم سے معقول حد تک کامیاب بھی ہوا۔

آخر میں ملک کے اَدب نواز حضرات سے عرض پرداز ہوں کہ اُنھیں مقامی اور بیرونی جس کسی اُمّی شاعر کے حالات و واقعات کا علم ہو، اُس کے حالات ضروری اور نمونہ کلام منیجر نامی پریس نامی پریس لین لکھنؤ کے ذریعہ سے ارسال فرما کر راقم سطور کو رہینِ منت فرمائیں۔"

احقر خنجرؔ

چند اَن پڑھ شاعروں کا ذکر کرنے سے میری مُراد ملک کے ذی علم اہلِ قلم حضرات کو ان بے نصیبوں کے حالات روشنی میں لانے کی دعوت دینا منظور ہے جو گمنامی کی گھٹا ٹوپ میں چھپے ہوئے ہیں۔ یوں تو شعرائے گزشتہ و حال کے صدہا تذکرے لکھے گئے ان میں کچھ تو مقبولِ خاص و عام ہو کر زندہ جاوید ہو گئے اور بہت سے نامقبولیت کا شکار بنے اور ایسے غائب ہوئے کہ ضرورت محسوس ہونے پر تلاش کے باوجود دستیاب نہیں ہوتے۔

تذکرہ نویسوں کا یہ اُصول رہا ہے کہ تذکرہ لکھتے وقت شعرا کے فضل و کمال پر روشنی ڈالتے ہوئے استعدادِ علمی کو سراہا کئے اور دنیا کو ان کی قابلیت سے روشناس کر کے فنِ لطیف

(شاعری) کے بھی نکات حل کرتے رہے، جس سے عوام الناس بہت کچھ مستفید ہوئے اور ہوتے رہیں گے۔ خصوصاً پروفیسر، شمس العلما مولوی محمد حسین آزاد مرحوم اس میدان میں پیش پیش ہیں۔ اُنکا لکھا ہوا تذکرہ "آبِ حیات" وہ مشہور و معروف تذکرہ ہے جو دلکشی اور نوعیت کے اعتبار سے اپنی آپ مثال ہے۔ اس کی شگفتہ عبارت، جو حقیقت میں نثر کی دل آویز شاعری ہے، بیشمار فوائد کی بھی حامل ہے۔ شاید اُس سے پہلے کسی مولف یا مورخ نے اُردو زبان کے عروج و ارتقا کی ابتدائی تاریخ کو اتنی شرح و بسط اور جامعیت کیساتھ بیان نہیں کیا۔ "آبِ حیات" نے صورت پذیر ہو کر اہلِ قلم کو متوجہ کیا۔ تحقیق و تدقیق کے دروازے کُھلے، تصنیف و تالیف کا آغاز ہوا اور اب وہ زمانہ ہے کہ شایقین کی تشنگیٔ ذوق فرد کرنے کو صد ہا مبسوط کتابیں اور رسالے موجود ہیں۔ ہر صاحبِ قلم اپنی کتاب میں کوئی نہ کوئی جدت و ندرت پیدا کر کے معلومات میں اضافہ کرنے کی کوشش کرتا ہے اور ابنائے وطن اُن سے مستفیض ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن طرۂ اولیت اُسی یکہ تاز میدان کے سر ہے جس نے عرصۂ سخن کے بیہڑ راستوں میں تگ و دو کر کے جھاڑ جھنکاڑ ہٹایا، نشیب و فراز کی دقتوں اور مشکلوں کو دفع کیا اور چندن کی طرح راستے کو صاف و ہموار کر دیا جس سے عام مصنفین کو بخوبی اور بے تکلفی کے ساتھ آگے بڑھنے کا موقع ملا۔ فی الواقع یہ ایسا تاجِ شہرت و امتیاز ہے جو دستِ قضا و قدر نے اسی فرقِ مبارک کے لئے موزوں سمجھا۔

اس ہرزہ سرائی سے میرا مطلب اِس قدر ہے کہ ناظرین کی توجہ ایک مخصوص مضمون کی طرف منعطف کردں اور وہ یہ ہے کہ ایسے روشن زمانے میں جبکہ ہر قسم اور ہر نوع پر کثرت سے تصنیف و تالیف ہو رہی ہیں، خصوصاً اردو شاعری جو ہمیشہ کی طرح چولا بدلنے کو تیار ہے، بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ بہت کچھ تبدیل ہو چکی ہو، سابق کی طرح اپنی رعنائی و زیبائی سے ہزار ہا عشاق پیدا کر رہی ہے۔ اگرچہ مزاج و مذاق میں بہت کچھ تفاوت ہی لیکن ادا شناسی اور نیاز کیشی میں دلدادگانِ سابق سے پیچھے نہیں۔ میں اب یہ بیان کرنا چاہتا ہوں کہ ہماری اُردو شاعری کے شیدائیوں کی کتنی قسمیں ہیں اور انھیں اُردو ادب کی خدمت گزاری میں کتنا دخل ہے؟ انھوں نے اپنی ملکی اور مادری زبان کو ترقی دینے، لٹریری اور علمی زبان بنانے میں کیسی کیسی آن تھک کوششیں کیں اور بالآخر عروج دیتے ہوئے ایک حد تک کامیاب ہو گئے۔

طبقات الشعرا میں پہلے تو وہ لوگ ہیں جن کو علم و فضل میں ہر طرح کی فضیلت حاصل تھی اور بقدر استعدادِ علم زبان کی خدمت کی۔ عربی، فارسی، ترکی اور سنسکرت زبانوں کے الفاظ

تراش خراش کر مستند بنائے اور انھیں زبانوں کے اعلیٰ خیالات اخذ کرکے اُردو شاعری کا اسکول قائم کیا جیسا کہ "آبِ حیات" میں تاریخ نظم اُردو کے مطالعہ سے منکشف ہوتا ہے۔ پھر جو جوں زمانہ آگے بڑھتا گیا اُردو کے کشکول میں لفظوں کا اضافہ ہوتا گیا۔ رفتہ رفتہ مغربی تہذیب کا چراغ روشن ہوا جس سے ہماری شاعری نے شرم آلود ادا سے کنارہ کش ہو کر بیباکی اور شوخی کی خصلت اختیار کی اور زبان میں مختلف زبانوں کی طرح انگریزی کے الفاظ و خیالات بھی شامل ہونے لگے اور ہنوز شامل ہو رہے ہیں۔

ہم کو اس سے بحث نہیں کہ اس خلاملا کا کیا انجام ہوا یا آیندہ کیا حشر ہوگا؟ ہمارا مقصود تو اُن کوششوں کا بیان کرنا ہے جو اُردو کی فلاح و بہبود کے لئے اختیار کی گئیں اور اختیار کی جارہی ہیں۔ ایک زمانہ وہ بھی تھا جب حامیانِ اُردو نے اس زبان کو محض نظم کے واسطے مختص کر دیا تھا۔ اُن کی تحریر و تقریر فارسی میں ہوا کرتی تھی مگر بعد میں وہ طریقہ بدل گیا، فصحا نے اِس زبان کو ہندوستان کی تمام زبانوں سے شیریں تر، سہل و ممتنع پا کر تصنیف و تالیف بھی شروع کر دی ابتدا میں قصص تصنیف و ترجمہ ہوئے، پھر تذکروں کی بنیاد پڑی جو برابر ترقی کر رہے ہیں۔ یہ تذکرے زیادہ تر نظم اُردو اور ناظمانِ اُردو کے حالات پر مبنی ہیں۔

شعرا کا دوسرا طبقہ اُن لوگوں کا ہے جن کی علمی استعداد یا تو حرف شناسی کے دائرے میں محدود رہی۔ یا بالکل اَن پڑھ اور اُمّی محض ہیں مگر زمانے کی ہوا اور فصحا کی صحبت کے فیض نے اُنہیں شیریں مقالی اور نغز گفتاری کا خاصہ مادّہ پیدا کر دیا ہے اور وہ بھی علما و فضلا کی طرح اپنا فرضِ عین سمجھ کے دل و جان سے اُردو زبان کی خدمت گذاری میں مشغول ہیں اور بنگاہِ انصاف ہیں کسی طرح سابق الذکر گروہ کے پیچھے رکھنے کے قابل نہیں، یہ اور بات ہے کہ اُن غریبوں کو قلمرانی کا سلیقہ نہ آیا اور دوسروں کی اعانت و امداد کے محتاج رہے، لیکن خیال کسی قید و بند کا ماتحت نہیں، جس صورت سے تعلیم یافتہ گروہ مضامین کی تلاش میں سر در گریباں ہو کر کوئی بات پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے، جاہل طبقے کے شعرا بھی یونہیں فکرِ شعر میں محو و منہمک نظر آتے ہیں۔ ایک صاحبِ استعداد ہزار لفظوں کا باغ لگاتا ہے تو جاہل محض سو الفاظ کے اُلٹ پھیر سے چمن بندی میں مصروف رہتا ہے۔ اِس فرق کو ملحوظ رکھتے ہوئے انصاف پسند اور حقگو طبائع اوّل الذکر سے موخر الذکر کو زیادہ لائقِ تحسین و قابلِ داد خیال کرینگے۔

باوجود اِن اسبابِ علل کے بھی ابتک کسی اہلِ قلم نے ان غریبوں کو گمنامی کی وادی سے نکال کر شہرت و ناموری کے راستے پر لانے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ اکثر تذکروں میں اختصار کے ساتھ

اِن کا ذکر موجود ہے لیکن عالموں میں اِن جاہلوں کو اس طرح گھی کھچڑی کر دیا گیا ہے جس سے نہ صرف اُن کی خداداد طبیعتوں کے جوہر دب گئے ہیں جو اپنی آب و تاب سے سخن فہموں کی نگاہ میں چکاچوند پیدا کرتے بلکہ اُنھیں اُس بحر میں غوّاصی کر کے نکالنا بھی مشکل ہو گیا۔

اکثر مورخین نے مقامی تذکرے لکھے ہیں، بعضوں نے محض ایک خاندان کو لے لیا ہے لیکن ان تخصیص کرنے والوں میں سے کسی ایک نے بھی اِن مرغانِ بے بال و پر کو نمایاں کرنے اور فضائے بسیط میں لانے کی سعی نہیں فرمائی۔

بادی النظر میں اس اغماض کی دو وجہیں معلوم ہوتی ہیں یا تو اہل قلم حضرات کی چشم پوشی اور تغافل نے صاحبانِ علم و فضل کے سامنے اُن کے کمال کا وقار قائم نہ ہونے دیا اور جہاں کہیں اُن کا تذکرہ کیا تو بالکل معمولی طریقے سے فرض ادا کر دیا۔ زیادہ برانیست اُن کی بے علمی پر حیرت و استعجاب ظاہر کر دیا اور بس! حالانکہ یہ بدنصیب شاعر ہندوستان میں پیدا ہونے کے بدلے اگر یورپ کی سرزمین میں جنم لیتے تو ذی علم گروہِ شعرا سے کہیں زیادہ قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھے جاتے جس طرح آج ہومر، ملٹن، شکسپیر وغیرہ پوجے جاتے ہیں اسی صورت سے شاید ان کی بھی پرستاری کی جاتی۔ ہندوستان کی طرح بے قدری اور ناپرسانی کی گردمیں نہ اٹے ہوتے۔

یا شاید یہ وجہ ہو کہ خود اُن شاعروں کی فطری شرم و غیرت نے جو اَن پڑھ ہونے کی وجہ سے لاحق تھی جہالت کا راز چھپانے اور مستور رکھنے پر مجبور کیا ہو اور وہ گمنامی کی گھٹا ٹوپ میں بند ہو کر رہ گئے ہوں۔ تحقیق کیا جائے تو صدہا شاعر ایسے ملیں گے جن کی علمی لیاقت نہ ہونے کے برابر ہے مگر جب کوئی تذکرہ نویس حالات معلوم کرنا چاہتا ہے تو اپنے آپ کو ہمہ داں اور جیّد عالم ثابت کرنے میں کوئی کور کسر باقی نہیں رکھتے! تذکرہ نویس تا مقدور چھان بین کرتا ہے اور آخر کار بطور خود اُن کے علم کا ایک معیار مقرّر کر دیتا ہے یا بہت کچھ تحقیقات کرنے پر حالات کی کماحقہ اطلاع نہیں ہوتی اور تذکرہ لکھنے والے کو چار و ناچار محض نام اور تخلّص پر کفایت کرنا پڑتا ہے۔

تاہم تذکرہ نویس اِس اخلاقی الزام سے نہیں بچ سکتے کہ اُنھوں نے اب تک اس ضروری کام کے انجام دینے کی مطلق کوشش نہیں کی، اُن کے خیال کا معیار بلند رہا، ہمیشہ باکمالوں کے کمال کو سراہنے کی سعی کرتے رہے، حالانکہ اُن غریبوں کو عالمِ ادب میں روشناس کرنے کی ضرورت مقدّم تھی جن کی معلومات کا دائرہ تنگ سے تنگ تر تھا۔ اُن بے نصیبوں کو وہ موقعے اور سہولتیں حاصل نہ تھیں جو پڑھے لکھے شاعروں کی طرح بطور خود اساتذہ کے کلیات و دواوین کا مطالعہ کر کے

معلوماتِ شاعری کو وسعت دے سکتے۔ حق یہ ہے کہ وہ اس معاملہ میں بجز خدا ساز طبیعت اور ذہن کی رسائی کے کسی غیر کے منّت پزیر نہیں ہوئے۔ انھوں نے جو کچھ کہا محض اپنے تخیّل اور محسوسات کے بل پر کہا۔ اُن کے کانوں نے جو کچھ سُنا اور حافظے نے جسقدر محفوظ رکھا وہی اُنکی معلومات کی دنیا بنا۔

اُن کی شاعری پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر رنگ کی شاعری میں طبع آزمائی کی اور ایک مناسب حد تک کامیاب ہوئے کوئی باریک سے باریک مضمون بھی ان کے طائرِ وہم وخیال سے بچ کے جانے نہیں پایا۔ اُن کے کلام میں تخیّل کی کمی ہے نہ محسوسات کا قحط۔ دردکی جانب توجہ کی تو صاف و سادہ زبان میں ایسے ایسے شعر نکالے جو نشتر سے زیادہ تر تیز ہیں! سننے والے سن سن کر بے اختیار آہ آہ کرنے لگتے ہیں۔ اثر خیزی جو زبان کا جزوِ اعظم ہوتی ہے۔ اُن لوگوں کا خاص حصّہ ہے، اور قدرتاً ایسا ہی ہونا بھی چاہیئے تھا، کیونکہ وہ علمی استعداد کی استمداد واستعانت سے اپنے کلام میں اَدق و مغلق الفاظ لانے سے قطعاً معذور و مجبور ہیں، اُن کی نظمیں صاف صاف اور روزمرّہ کا نادر مجموعہ ہیں مگر اسلئے توجہ کے قابل نہیں سمجھی جاتیں کہ ایک ان پڑھ شاعر کی زبان سے ادا ہوئی ہیں جو مبداء فیاض سے فطری ذوق اور طبعِ سلیم لایا ہے اور حقیقتہً وہی شاعر کہے جانے کا مستحق ہے۔ اگر یہی صفت کسی پڑھے لکھے شاعر کے کلام میں پیدا ہو جائے تو زمانہ سر دُھننے کو تیار ہے۔ قدردانانِ سخن کے تحسین وآفریں کے نعروں سے ادبی دنیا گونج جائے اور مصطلحات ومحاورات کا برمحل صرف ہو جانا اُس کے کمال کا اعجاز سمجھا جائے، لیکن یہ اُسیوقت ممکن ہے جب اُنھیں خوش نصیبوں کے یہاں جن کی علمی قابلیت تسلیم کی جا چکی ہے یہ خوبیاں پیدا ہوں۔

میں نے ان "تلامیذ الرحمٰن" کا ایک تذکرہ مرتب کیا ہے جسمیں صرف اُنھیں شاعروں کو جگہ دی ہے جن کو علم سے بہرہ نہیں ہے حتیٰ کہ اپنا نام تک لکھنے کی قدرت نہیں رکھتے۔ اگرچہ اُن کی تعداد کم ہے اور اُن میں بھی چند ایسے ہیں جو پیشہ کے لحاظ سے شرفاء کی ہم نشینی کی اہلیت نہیں رکھتے لیکن ہم نے انکو اس داد سے محروم رکھنا گوارا نہیں کیا جس کے وہ مستحق تھے اور اُنھیں سخن سنج ہونے کی جہت سے اس بزم میں لا بٹھایا۔

اگر ایسا نہ کیا جاتا تو متعدد تذکروں کی ورق گردانی کے بعد بھی نتیجہ کچھ نہ نکلتا اور شاید چند مثالوں سے زیادہ پیش نہ کی جاسکتیں۔ ہرچند موجودہ حالت میں بھی تذکرے کے مکمل ہونے کا دعویٰ نہیں کیا جاسکتا کیونکہ اکثر تذکرے اَن پڑھ شاعروں کے حالات بتانے سے قاصر ہیں، انتہائے کوشش و عرق ریزی سے چند موجودہ وگذشتہ شعرا ملے ہیں جن کے معلومہ حالات بیان کرنے پر اکتفا کی گئی ہے اور ساتھ ہی عام اہلِ قلم کو صلائے عام ہے کہ وہ بھی اپنے وطن اور اپنے ملک کے ایسے شاعروں کی ڈوبی ہوئی کشتی کو اُبھاریں

اور دنیا کو بتائیں کہ ہندوستان جنّت نشان کی خاک نے کیسے کیسے دل و دماغ رکھنے والی ہستیاں پیدا کیں؟

ہم کو بھی اقرار ہے کہ باستثنائے چند شعرا کے بہتوں کے مفصّل حالات فراہم نہ ہو سکے، لیکن یہ ہماری کوتاہی نہیں ہے بلکہ اُن پیش روؤں کے اغماض کا تلخ انجام ہے جنھوں نے نہ تو اُن کے شرح حالات لکھنے کی ضرورت سمجھی نہ کلام کا زیادہ حصّہ منتخب کیا جس سے اُنکی طبیعتوں کا اندازہ ہوتا اور کلام پر کافی روشنی ڈالنے میں سہولت ہوتی۔

ان شاعروں کا موجودہ کلام دیکھنے سے اتنا قیاس ضرور ہوتا ہے کہ وہ کسی صنفِ سخن میں نظم کرنے اور طبع رسا کے جوہر دکھانے میں بند نہ تھے، ہر بحر اور ہر زمین میں طبیعت کی جولانیاں دکھائی ہوں گی لیکن ظالم زمانہ نے اُن کی طرح اُن کے کلام کو بھی نیست و نابود کر دیا۔

سخن فہموں نے شاعری کی دو قسمیں قرار دی ہیں، ایک کا تخیّل سے تعلق اور دوسرے کو درد سے علاقہ ہے جس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ تخیّل کو دماغ اور درد کو دل سے نسبت ہے۔ دونوں قسموں کی شاعری میں سلاست بیان و فصاحتِ زبان کی شدید ضرورت ہے اور اَن پڑھ شعرا میں یہ دونوں خوبیاں فطری طریقہ سے موجود ہیں۔ تعلیم یافتہ اور قابل شعرا کی طرح اُن کے ذہن اَدق مضامین اور زبانیں مغلق الفاظ سے خالی ہیں اُنھیں گروہ اوّل کی بہ نسبت صاف اور آسان شاعری کرنیکا زیادہ موقعہ ملتا ہے جب درد کی شاعری کرتے ہیں تو قیامت ہی ڈھا دیتے ہیں اور اُس کلام سے جذباتی اور حسّیاتی طبیعتیں تڑپ تڑپ اُٹھتی ہیں، عام اِس سے کہ وہ ذی علم ہوں یا اَن پڑھ، مرد ہوں یا عورتیں، جوان ہوں یا بوڑھے شعر سنتے ہی آہ آہ کرنے لگتے ہیں تخیّل کی شاعری مشکل شاعری ہے۔ اُس کا تعلق زیادہ تر اُن لوگوں سے ہے جو تعلیم یافتہ ہیں اور سالہا سال وادیٔ سخن کی جادہ پیمائی کر کے خیالات کو پختہ اور محسوسات کو قوی کر چکے ہیں۔

بیچارے اَن پڑھ شاعر اِس شاعری میں اُس حد تک کامیاب نہیں ہوئے جس طرح اہلِ علم کو کامیابی نصیب ہوئی۔ اور ایسا ہونا بھی چاہیئے تھا۔ اگر اِس صنف میں بھی خاطر خواہ کامیابی حاصل کر لیتے تو اہلِ علم کے پاس کوئی چیز ایسی نہ رہتی جو اُنھیں اَن پڑھ شاعروں سے الگ کر کے ممتاز بنا سکتی۔ باوجود بے علمی کے جس کسی کی طبیعت لڑ گئی ہے، اُس نے اِس شاعری میں بھی بحد لطیف گل کاریاں کی ہیں جیسا کہ ناظرین کو تذکرے اس جگہ ہر دو قسم کی شاعری کی مثالیں پیش کر کے اس دیباچہ کو طویل دینا مناسب نہیں ورنہ دعوے کے ثبوت میں کچھ نہ کچھ پیش ہوتا۔

آخر میں یہ اقرار بھی ہے کہ شعرا کا زیادہ کلام فراہم نہ ہو سکا جس سے تشنہ گانِ سخن کی پیاس بجھتی۔ وجہ یہ ہے کہ وہ قافلہ بہت دور نکل گیا ہے اور اُسکے پیچھے چلنے والوں نے پیشرؤوں کے نقوشِ قدم بھی اُس حیثیت پر باقی نہ رکھے جسطرح اُنھیں باقی رکھنا چاہیئے تھا۔ مجبوری درجہ اُسی کلام پر کفایت کرنا پڑی جو تذکروں کی وساطت سے تک پہنچ سکا۔ لیکن اِس کمی کی تلافی عہدِ حاضر کے شعرا نے اپنے کلام سے پوری کر دی جو ملاحظہ سے گزرے گا۔

جذباتِ نجم

(از حضرت نجم آفندی)

موت لائے زندگانی لے گئے — پھول کلیوں کی جوانی لے گئے
ہو گیا خاموش جس کے سامنے — حرفِ غم میری کہانی لے گئے
دل ملا تھا اُن سے اُن کو دے دیا — آج اپنی مہربانی لے گئے
لے گئی اُس در پہ دُنیا دردِ دل — ہم بھی اپنی بے زبانی لے گئے
غم بھی اک دھوکا تھا راہِ عشق میں — ہم فریبِ شادمانی لے گئے

نجم چپ بیٹھا ہوں اُن کی یاد میں
جو مری جادو بیانی لے گئے

کتابِ زندگی

(از پروفیسر شمبھو ناتھ ورما ایم۔ اے)

روزِ محشر کیا بتائیں گے حساب منہ گی — وہ جو پڑھنے بھی نہ پائے تھے کتابِ زندگی
اتنی بے صبری ہے کیوں عجلت ہے آخر کس لئے — ختم ہی ہو جائے گی اک دن کتابِ زندگی
کھیلنا اور کھانا۔ سونا اور ہنسنا، بولنا — بس انھیں باتوں سے پڑھتے کیا کتابِ زندگی
رنج و غم کا نام ہی دنیا سے مٹ جاتا۔ اگر — پڑھنے والے سوچکر پڑھتے کتابِ زندگی
نظرِ ثانی کا بھلا موقع کہاں جب ہر گھڑی — کھلتا رہتا ہے نیا باب کتابِ زندگی
امتحاں کی فکر ہو جاتی ہے عقبیٰ کے لئے — ختم جب ہونے کو آئی ہے کتابِ زندگی
درحقیقت موت ہی لاتی ہے پیغامِ بقا — بارِ دیگر طبع ہوتی ہے کتابِ زندگی
سمجھے ہیں تقدیر جس کو حاصلِ تدبیر ہے — لکھتے ہیں اپنے ہی ہاتھوں سے کتابِ زندگی
روز و شب مصروف یوں رہتا تو ہوں ورما مگر — دیکھئے کب تک ہو تکمیلِ کتابِ زندگی

مباحثہ

"ہندوستانی تہذیب کی قدامت"

از مسٹر جے۔ آر۔ رائے۔ جرنلسٹ

"زمانہ" جنوری ۱۹۳۸ء میں مسٹر شہنشاہ حسین رضوی ایم۔اے، ایل ایل۔بی، مدیر "خیابان" لکھنؤ نے ایک مختصر مضمون عنوان بالا پر تحریر فرمایا ہے جسے پڑھکر مجھے بہت افسوس ہوا۔

سنسکرت الفاظ مغالطہ خیز شکل میں

سب سے پہلے ہمیں "ہندوستانی تہذیب" کے محاورہ پر اعتراض ہے جو انگریزی "انڈین سیولی زیشن" کا ترجمہ ہے معلوم نہیں "ہندو تمدن کی قدامت" یا "ملک ہند کی تہذیب قدیم" لکھنے میں کیا ہرج تھا۔ پھر آپ نے سنسکرت الفاظ کو جیسے انگریزی املا میں لکھے جاتے ہیں اُردو میں بغیر جانے بوجھے نقل کر کے غضب ڈھایا ہے۔ مثلاً "ارنیکا" "اپنیشاد" "یاجور" "سما" وغیرہ جو آپ نے لکھے ہیں "آرنیکیہ" "اُپ نشد" "یجر" اور "سام" لکھنا چاہیئے تھا۔ آگے چلکر "رگ وید" کے بارہ میں لکھتے ہیں "اس وقت تک نہ زبان کی رعایات ہیں، اور نہ صرف و نحو کی پابندیاں" معلوم نہیں یہ بے سروپا باتیں کس بنا پر لکھی گئیں۔ غالباً کسی انگریز کی خرافات کی اندھا دھند تقلید کی گئی ہے۔ رگ وید کی رچائیں لکھنے والے بڑے بلند خیال رشی تھے جو زبان کے ماہر تھے، اِن کی حرف گیری کرنا فضول ہے۔

قدامت تہذیب کا سب سے بڑا ثبوت

بہرحال مسٹر شہنشاہ حسین کو اس نازک اور پیچیدہ مسئلہ کے تمام پہلوؤں پر غور کیے بغیر قلم نہ اُٹھانا چاہیئے تھا۔ آپ رگ وید کو "ہندوستانی تہذیب کی قدامت" میں ثبوت پیش کرتے ہیں لیکن "اہرام مصر" کے "مادّی شواہد کے سامنے اسے ناچیز گردانتے ہیں" درحقیقت رگ وید ایک قیمتی دستاویز ہے۔ آپ کا قول ملاحظہ ہو "ہندوستان کی تہذیب مصر و عراق سے زیادہ قدیم ہیں۔ گو ہندو وید میں اتہاس نہیں مانتے۔ لیکن اگر رگ وید بقول میکس مولر "بنی آدم کے کتب خانہ میں سب سے پرانی پُستک" مانا جائے، تو سب سے پہلے اس کی شُستہ کامل زبان اور پھر گوناگوں خیالات پر غور کرنا بیحد ضروری ہے۔ رگ وید میں دریائے سرسوتی کا بہت دفعہ ذکر آتا ہے۔ لیکن اب شاندار ٹھاٹیں مارتے دریا کی جگہ تھانیسر سے

چند میل شمال کو برساتی نالہ پایا جاتا ہے۔ ان رچاؤں کو لکھے ہوئے کتنے ہزار برس گزر گئے، جن میں سرسوتی کا ذکر آتا ہے؟ یہ جیالوجی کا مسئلہ ہے۔ راجپوتانہ کے ریگستان میں ماہروں کے بیان کے مطابق اب سے تیس ہزار سال پہلے بحیرۂ راجپوتانہ ٹھاٹیں مارتا تھا جس میں سرسوتی گرتا تھا۔ پروفیسر ابناش چندر داس نے رگ وید کی ابتدائی رچاؤں کا زمانہ سن عیسوی سے پندرہ ہزار سال پہلے تخمینہ کیا ہے۔ مرہٹہ عالم کیتکر نے ورشاکپی سومتر کا زمانہ سات ہزار سال قبل مسیح اندازہ کیا ہے۔ لوکمانیہ تلک نے مرگ نکشتر (Orion) کے اترائین اور دکشنائین کا حساب کرکے سنہ ۵۲۰۰ قبل مسیح تسلیم کیا ہے۔ اسی سوتر سے جرمن ماہر یاکوبی نے سنہ ۲۶۰۰ برس قبل مسیح نکالا ہے، جسے یوروپ وامریکہ کے دس بارہ بہت مقتدر ماہروں نے درست تسلیم کیا ہے۔ اگر صرف زبان ہی کی ساخت پر غور کیا جائے تو اس کے نشو و نما کے لئے ہزارہا سال درکار ہوتے ہیں۔ جیسا کہ امریکہ کے سب سے بڑے ماہر علوم سنسکرت پروفیسر بلوم فیلڈ لکھتے ہیں "رگ وید سے آریہ سبھیتا (آرین تہذیب) کا ابتدائی مرحلہ نہیں بلکہ ترقی یافتہ مرحلہ نظر آتا ہے۔ ابتدائی مراحل طے کرنے میں کئی ہزار برس درکار ہوئے ہونگے۔" رگ وید سے بالواسطہ اور بلاواسطہ ہندو سبھیتا سارے جہان کی سبھیتا سے پرانی ثابت ہوتی ہے۔

راج بنشوں کی بنشاولیاں علاوہ بریں پرانے شاہی خاندانوں کی بنشاولیاں بھی ہیں جس سے ہندو سبھیتا کی قدامت ثابت ہوتی ہے۔ سب سے بڑھکر کانگڑے کے راج بنش کی بنشاولی ہے جسے سر لیپل گریفن، ڈاکٹر ہچن سن، اور ووگل، مسٹر اوڈرا ور تحقیق دنیا کے تمام شاہی خاندانوں میں سب سے پرانی تسلیم کرتے ہیں۔ اس میں چار سو پچاسی (۴۸۵) حکمرانوں کے مسلسل نام ملتے ہیں۔ اس کا بانی بھوم چند راجہ نو ہزار سات سو اٹھانوے برس ہوئے (۹۷۹۸) اس جگہ حکمران تھا جہاں اب ملتان آباد ہے۔ اس بنشاولی میں دو سو چونتیسویں (۲۳۴) پیڑھی میں سوشرم چند راجا جو اپنے پینتالیس (۴۵) بیٹوں سمیت جنگ مہابھارت میں مارا گیا تھا، اور آخری میجر جنرل راجہ جے چند والی لمباگرام کانگڑہ تھے۔ سوشرم چند سے جے چند تک (دو سو اکیاون (۲۵۱) پیڑھیاں ہوتی ہیں، جن کا زمانہ پانچ ہزار چھہتر (۵۰۷۶) سال ہوتا ہے۔ اسی اندازہ سے بھوم چند سے سوشرم چند تک چار ہزار سات سو تیئیس (۴۷۲۳) برس ہوتے ہیں۔ مگستھنیز نے اپنے زمانہ کے پنڈتوں کا وچار اسی طرح بیان کیا ہے۔ ہندو پنڈت اپنے اتہاس کی ابتدا سکندر کے حملہ سے چھ ہزار چار سو باسٹھ (۶۴۶۲) برس پہلے بتاتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہندو اتہاس سنہ ۶۷۸۶ قبل مسیح میں شروع ہوا تھا۔ اور سب سے پہلا ہندو حکمران سپت منس بیان کیا گیا ہے۔

سندھ کا تمدن سلف اوپر کے قیاسات کی تائید ماہن جوداڑو اور ہڑپہ کی قدیم زمانہ کی چیزوں کی برآمد

سے ہوتی ہے۔ یہ اسر سبھیتا کے نشانات ہیں اور اسر یہ جاتی کے مخالف اور ہمعصر تھے۔ وہ سندھ مغربی اور جنوبی پنجاب یوپی اور دیوتا لوگ بہار سے سوراشٹر تک قابض تھے۔ قدیم زمانہ کے تمدن سندھ کا زمانہ اب چار ہزار برس قبل مسیح مانا گیا ہے۔ اور بقول سر جان مارشل ماہین جاداڑا اور ہڑپہ کے آثار قدیمہ سے وہاں کی سبھیتا نئی نہیں بلکہ پرانی اور نمو کے اعلیٰ مرحلہ پر پہونچی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ اگر چار ہزار سال قبل مسیح میں یہ سبھیتا شباب کے اعلیٰ مرحلہ پر تھی، تو اس کی ابتدا اور نمو کے لئے کتنے ہزار سال لگے تھے؟ ہم صرف نو ہزار سال قبل مسیح میں اس کی ابتدا گردانتے ہیں حالانکہ مسئلۂ ارتقا کی رو سے اس سے کئی گنا زیادہ عرصہ درکار ہے۔ اگر سندھ کے سلف قدیم کے تمدن کا لحاظ کیا جائے تو آریہ سبھیتا کا زمانہ جو ہم نے تخمینہ کیا ہے بالکل معقول اور قابل قبول ہے۔

جذباتِ منوّر

(از جناب منشی بشیشور پرشاد صاحب منوّر لکھنوی)

جب آئیں تا لب اپنی دعائیں
ہم اُن کا مدعا تک بھول جائیں

کئے جائیں کئے جائیں جفائیں
لئے جائیں لئے جائیں دعائیں

چلیں گلشن میں یہ کیسی ہوائیں
گلوں نے چاک کر ڈالیں قبائیں

نہ ہونا تھا انھیں مایوس انجام
وفاداروں سے نادم ہیں وفائیں

وہ سناٹے کے عالم میں کسی سے
مری پچھلی پہر کی التجائیں

چراغ اپنا نہ پھر بھی ہو سکا گل
چلیں گو لاکھ طوفانی ہوائیں

کئے جائے کوئی مجبور ہم کو
دیئے جائیں کسی کو ہم دعائیں

وہی ہے قمری و بلبل کا آہنگ
جو اپنے ساز دل کی تھیں صدائیں

جنھیں سمجھے زمانہ اپنی آواز
اٹھیں دل سے کچھ ایسی بھی صدائیں

ہمارے روح و دل میں جذب ہو کر
اثر کو ڈھونڈھ لاتی ہیں دعائیں

کرے اقرار کوئی خواہ انکار
وفائیں ہیں بہر صورت وفائیں

نہ دریا سے شبک ہوں مثل ساحل
جہاں ہم ڈوب جائیں ڈوب جائیں

منوّر ہو گئی حد بے کسی کی
کہاں تک بار غم آخر اٹھائیں

علمی خبریں اور نوٹ

مکتبہ جامعہ دہلی اُردو کی قابل قدر خدمت کر رہا ہے، پچھلے سال اُس نے بچوں کی کتابوں کے علاوہ دس کتابیں شائع کیں جنمیں سب سے زیادہ قابل ذکر پنڈت جواہر لال نہرو کی خود نوشت سوانح عمری کا ترجمہ "میری کہانی"، حضرت جگر مراد آبادی کا مجموعہ کلام "شعلۂ طور"۔ حضرت جوش ملیح آبادی کی نظموں اور غزلوں کے دو مجموعے "نقش و نگار" "شعلہ و شبنم" منشی پریم چند کا ناول "میدان عمل" ہیں انکے علاوہ فلسفہ پر بھی دو کتابیں "فلسفۂ اسلام" اور "پستالوزی" اور سیاسی و معاشی مضامین پر بھی تین کتابیں شائع ہوئیں۔ انیں سب سے اہم کتاب دیہی صنعتوں اور دیہات کی نئی تعمیر پر مسٹر جے سی۔ کمارپّا کی تصنیف کا ترجمہ ہے۔

اس سال کا اشاعتی پروگرام اس سے بھی زیادہ نمایاں اور مصروفیت کا ہے، یہ کارگزاری ہر حیثیت سے قابل مبارکباد ہے۔

ہمیں یہ معلوم کر کے بہت خوشی ہوئی کہ حضرت جگر مراد آبادی کے مجموعہ کلام "شعلۂ طور" کے تمام نسخے چند ہی مہینوں میں ختم ہوگئے، اب اس کے دوسرے ایڈیشن کا انتظام ہو رہا ہے۔

حضرت جوش کے کلام کا ایک تیسرا مجموعہ بھی "فکر و نشاط" کے نام سے حال ہی میں شائع ہوا ہے جسمیں اس شاعر اعظم کی تازہ ترین نظمیں ہیں۔ جوش کی شاعری بقول ایک نقاد فن "دورِ جدید کے اُن تمام رجحانات کی حامل ہے جو ہندوستانی قومیت کی تشکیل کر رہے ہیں۔ ان کا کلام ایک ذکی الحس اور دردمند دل کی پکار ہے جس کو موصوف کی قادر الکلامی نے جوش اور ولولوں سے معمور کر دیا ہے"۔ اس مجموعے کی سب نظمیں اس نباض فطرت شاعر کے زبردست غور و فکر اور طویل مطالعہ و مشاہدہ کا نتیجہ ہیں۔ ہر نظم میں شاعر نے مسائل حیات اور دنیا کے رنگارنگ واقعات پر نہایت رنگین تبصرہ کیا ہے، اور اپنے مخاطب کو فکر کی پیچ در پیچ گھاٹیوں میں بھٹکتا ہوا چھوڑ کر اُسے دماغی اُلجھنوں میں نہیں ڈالا بلکہ نشاط کی سرسبز وادیوں کی بھی سیر کرائی ہے، اور ساز دل کے تاروں کو بھی چھیڑا ہے اور ان سے وہ موسیقی شعر و ادب پیدا کی ہے کہ پڑھنے والے پر عالم وجد طاری ہو جاتا ہے۔ جوش کی جدید نظموں میں رومان کو چنداں دخل نہیں ہے بلکہ حقائق و معارف کو متانت و سنجیدگی کے ساتھ شاعرانہ انداز بیان میں پیش کیا گیا ہے۔ ہم کو اُمید ہے کہ شائقین ادب اس مجموعے کی بھی قدر کریں گے۔ کسی آئندہ نمبر میں ہم انشاء اللہ جوش کی شاعری پر ایک مفصل تبصرہ شائع کریں گے۔

آج کل ہمارے رفیق مکرم حضرت فراق گورکھپوری کا مجموعۂ کلام بھی نہایت تزک و اہتمام کے ساتھ زیر طبع ہے
فراق صاحب کی شاعری میں ایک خاص انفرادیت نمایاں رہتی ہے۔ ان کی غزلیں اعلیٰ ترین تخئیل ذہنی اور واردات
قلبی کی مرقع ہوتی ہیں۔ اپنے ہر شعر میں وہ لطفِ زبان اور ترنم کے علاوہ فلسفیانہ خیالات اور عاشقانہ جذبات اس طرح
قلمبند کر دیتے ہیں جیسے کوئی دریا کو کوزے میں بھر دے۔ کہیں کہیں انکا تخئیل آسمان کے تارے توڑ لاتا ہے اور
ان کے بعض اشعار انگریزی شعرا کی بہترین نظموں کے مقابل رکھے جا سکتے ہیں۔ فراق کی زندگی شعر و سخن کی
خیالی دنیا میں بسر ہوتی ہے وہ ہر وقت علمی حیثیت سے حیاتِ انسانی کے تمام دشوار گذار مسئلوں کو عشق و حسن کی
خیالی معاملہ بندیوں سے حل کرنے کی کوشش میں رہتے ہیں۔ غرض شروع سے آخر تک اُنکی زندگی شاعرانہ
زندگی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی غزلیں ایسی "جاندار" اور اُن کے اشعار اس قدر خصوصیات کے حامل ہیں

فراق صاحب کو انگریزی ادب، مغربی فلسفہ اور یورپین سیاسیات سے خاص دلچسپی ہے۔ بچپن ہی سے
اُردو شاعری کے ماحول میں اُن کی پرورش ہوئی ہے۔ اُن کے والد ماجد اپنے وقت کے مشہور و کامیاب
شاعر تھے اور انکی بعض نظمیں آجتک زبان زد خاص و عام ہیں۔ اسلئے دیگر انگریزی تعلیم یافتہ شعرا کے خلاف
فراق کو اُردو کی شاعرانہ زبان پر بھی خاصی قدرت حاصل ہو گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے ترکیب الفاظ و بندش
خیالات اور طرزِ ادا میں جدت طبع کے کمالات کے علاوہ قدیم اُردو شاعری کی تمام دلآویزیاں موجود ہوتی ہیں
بہر حال غزل کی محدود چہار دیواری میں وہ اپنے شاعرانہ دل و دماغ کے ترجمانی کا پورا حق ادا کر دیتے ہیں اور
بعض اوقات ایک ہی شعر میں بڑے بڑے حقائق و معارف بیان کر جاتے ہیں۔

قدر دانانِ اُردو کے لئے یہ خبر دلخوش کُن ہو گی کہ حکومت حجاز نے فارسی کے ساتھ اُردو کو بھی اپنے
علمی نصاب میں شامل کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ حال میں جامع ازہر کا جو وفد ہندوستان آیا تھا اس کے
اراکین نے بھی وعدہ کیا ہے کہ وہ مصر جا کر وہاں بھی اُردو زبان کی تعلیم کا انتظام کریں گے۔ افغانستان
ایران، عراق اور فلسطین کے علمی حلقوں میں بھی اُردو زبان پہونچ رہی ہے جو آئندہ کیلئے بہت حوصلہ افزا ہے

مروجہ اُردو ہندی زبانوں کو کس طرح ادق اور نامانوس بنایا جا رہا ہے، اسکی ایک مثال حال ہی میں
کانپور میں دیکھنے میں آئی۔ اس ماہ کے شروع میں اس شہر میں لالہ لاجپت رائے صاحب مرحوم کی سرونٹ
آف دی پیوپل سوسائٹی کا سالانہ جشن بڑی دھوم دھام سے منایا گیا چنانچہ اس سلسلے میں برابر ایک ہفتہ
تک صوبہ کے علماء فضلا کے کئی عالمانہ لکچر ہوئے۔ سوسائٹی کے خاص خاص ممبران بھی اس موقعہ پر کانپور

تشریف لائے تھے جن کے اعزاز میں معززین شہر نے ۲۵۔ اپریل ۱۹۴۳ء کو ایک ایوننگ پارٹی دی، جس کا نوید ناگری حروف میں چھاپا گیا تھا اور اس میں اس پارٹی کو "اودیان بھوج" (उद्यान भोज) کے غیر مانوس نام سے موسوم کیا گیا تھا! حیدرآباد میں بھی اس قسم کی پارٹیوں کو "عصرانہ" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ مگر "اودیان بھوج" کی من گڑھت نے اس کو بھی مات کر دیا۔ معلوم نہیں ہمارے رہنمایان اپنی اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجدیں تعمیر کرنے کی دھن میں ہمکو کہاں سے کہاں لے جا رہے ہیں!

ہم کو افسوس سے لکھنا پڑتا ہے کہ کاغذ کی غیر معمولی اور غیر متوقع گرانی نے ہم کو "زمانہ" میں ادنیٰ درجہ کا کاغذ استعمال کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔ ابتک "زمانہ" ٹیٹاگڑھ مل کے بنے ہوئے اعلیٰ قسم کے سفید کاغذ پر چھپتا تھا لیکن اس طرف اس کا بازار میں قحط ہو گیا ہے اور اس ماہ یہ کانپور میں کسی قیمت پر میسر نہیں ہو سکا۔ باہر سے منگانا بھی آسان نہ تھا کیونکہ محصول ریل کے زائد اخراجات کے علاوہ اکثر شہروں میں اسکی سپلائی ختم ہو گئی ہے۔ اور مقررہ پیمانہ اور وزن کے کاغذ کی کافی مقدار بازار میں موجود نہیں ہے۔ اس وقت ملک کے اکثر اخباروں و رسالوں کو یہی دقت پیش آ رہی ہے چنانچہ اکثر احباب کو کمتر درجے کا کاغذ استعمال کرنے کا فیصلہ کرنا پڑا ہے۔ ہماری معذوری ظاہر ہے، ہم "زمانہ" کے موجودہ اخراجات میں اس وقت کوئی معتدبہ اضافہ نہیں کر سکتے ہیں، اس لئے ناچار ہم کو اس کے اعلیٰ مضامین کو ادنیٰ کاغذ پر ہدیۂ ناظرین کرنا پڑے گا۔ پریم چند نمبر بھی اس آفت ناگہانی کی زد سے محفوظ نہیں رہا۔ البتہ اسکی کتابی صورت کے لئے ہم نے پیشتر سے کاغذ خرید کر رکھا تھا۔ اس لئے اس کے زائد نسخے اعلیٰ کاغذ ہی پر طبع ہوئے ہیں۔ مگر معمولی پرچہ نئے کاغذ پر شائع ہوگا۔ "زمانہ" کی یہ مجبوری افسوسناک ہے کہ اس کے کارکنان بڑھی ہوئی قیمت اور منھ مانگے داموں پر اس کا کاغذ نہیں خرید سکتے ہیں۔ مگر بحالات موجودہ ہمارے پاس اس کا کوئی چارہ کار نہیں ہے، اس کا اصلی علاج قدردانان رسالہ کے ذمہ ہے جو اس کی توسیع اشاعت اور مالی امداد سے غافل ہیں! بہرحال ہم جس طرح سے اور جہاں تک مضامین کے متعلق اپنا فرض ادا کئے جاتے ہیں۔ امید کہ احباب کاغذ کے عارضی نقص کو نظر انداز فرمائیں گے۔

کاغذ کی غیر معمولی گرانی سے ممالک غیر کی اخباری دنیا میں بھی تہلکہ مچا ہوا ہے۔ اور امریکہ و یورپ سب جگہ کے اخبارات اپنی ضخامت کم کر رہے ہیں۔ ہندوستان کے بائیس بڑے بڑے اخبارات جن میں ہر صوبہ کے اعلیٰ ترین روزنامے شامل ہیں سر آرتھر مور منیجنگ ایڈیٹر اخبار اسٹیٹسمین کلکتہ و دہلی کی رہنمائی

میں گورنمنٹ صوبہ کی خدمت میں اس کے متعلق ایک پُرزور درخواست بھی بھیجی ہے جس میں شمار و اعداد سے موجودہ گرانی پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اخباری کاغذ کی قیمت پچھلے بارہ ماہ کے اندر ۶۶ فیصدی بڑھ گئی ہے گورنمنٹ اس کاغذ پر پچیس فیصدی ڈیوٹی لیتی ہے۔ چنانچہ اس سے اس ڈیوٹی میں تخفیف کی درخواست کی گئی ہے۔ پہلے یہ کاغذ کلکتہ میں نو پاؤنڈ فی ٹن کے حساب سے ملتا تھا مگر حال میں اسکی قیمت پندرہ پونڈ فی ٹن تک بڑھ گئی تھی اور آجکل تو سولہ پونڈ فی ٹن قیمت دینا پڑ رہی ہے۔ اسی کو دیکھکر ہندوستانی کارخانوں نے بھی اپنی قیمتوں میں غیر معمولی اضافہ کر دیا ہے۔ بہرحال اخبارات، رسائل کے لئے یہ ایک نازک وقت ہے، قیمت بڑھانے کا خیال ہی فضول ہے۔ ایسی صورت میں یا تو حجم کم کیا جائے یا کمتر قسم کا کاغذ استعمال کیا جائے، ہم نے آخری صورت اختیار کی ہے جس کے لئے ہم ناظرین سے معافی کی توقع رکھتے ہیں۔

"زمانہ" کا پریم چند نمبر

زمانہ کا پریم چند نمبر نصف کے قریب چھپ چکا ہے۔ مگر اس کا حجم اندازہ سے دوچند ہو گیا ہے یعنی بصورت موجودہ اس کی ضخامت سوا دو سو صفحات سے زائد ہوگی۔ ہم نے اس یادگار پرچہ کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ ایک میں مرحوم کے سوانح عمری پر ہر پہلو سے روشنی ڈالی گئی ہے، وجہاں تک ہو سکا ہے اُن کے خود نوشت حالات بھی جمع کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ ان کے ہم سبق، رفیق کار حضرات اور شاگرد و دیگر احباب سے مضامین لکھائے گئے ہیں جنھیں منشی پریم چند کے ساتھ مختلف اوقات میں رہنے سہنے اور کام کرنے کا موقعہ ملا ہے۔ اسی سلسلے میں آپ کی ناوقت وفات پر رہنمایانِ ملک نے جو اظہار خیالات کیا ہے اس کے مناسب اقتباسات بھی درج کر دیئے گئے ہیں۔ جہاں کہیں موقعہ ہوا ہے آپ کے اقوال اور اقتباسات بھی ہدیۂ ناظرین کر دئے گئے ہیں، غرض اس نمبر میں ہم نے حتی الامکان پریم چند جی کی زندگی اور اُن کے جذبات و خیالات کا مکمل مرقع ناظرین "زمانہ" کے سامنے پیش کرنیکی کوشش کی ہے۔

دوسرا حصہ تنقیدی ہے اور اسمیں اس نامور مصنف کے ادبی کارناموں پر ہر نقطۂ خیال سے سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ کئی نامور نقادانِ فن نے ہماری درخواست پر نہایت عرقریزی سے مختلف تصانیف پریم چند پر نہایت مفصل و مکمل تنقیدیں لکھی ہیں۔ کیا مختصر افسانے اور کیا طولانی ناول، سبھی پر ہر ممکن پہلو سے بحث کی گئی ہے۔ یہ تنقیدیں تقریباً سو سوا سو صفحات پر آئی ہیں۔ اسمیں باریک بیں نقادانِ فن نے پریم چند جی کے کمال فن کی دل کھول کر داد دی ہے [illegible]

کی اعلیٰ انشا پردازی کا کوئی پہلو نہیں بچا ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ مجموعی حیثیت سے کسی دوسرے مصنف کے ادبی کارناموں پر ایسی عالمانہ تنقیدیں آجتک کسی اُردو رسالہ میں شائع نہیں ہوئی ہیں

اسکی اشاعت میں جو تاخیر ہوگئی ہے اُسکا ہم کو ضرور افسوس ہے اور ہم اس کے لئے اپنے ناظرین سے معافی کے بھی خواستگار ہیں، لیکن ہم کو امید ہے کہ اس نمبر کے اہم مضامین اسکی تاخیر کی پوری تلافی کردیں گے۔

تیسرا حصہ منظوم ہے جس میں نامور شعرائے اُردو نے پریم چند جی کی ناوقت رحلت پر اظہار رنج و ملال کیا ہے، اور اُن کے کمال فن کو خراج تحسین ادا کیا ہے۔ یہ نظمیں بجائے خود بہت قابل قدر ہیں اور ان سے موجودہ زمانہ کے سخنوروں کے باہمی اُنس و محبت کا بہترین ثبوت ملتا ہے۔

شروع میں یہ یادگار نمبر "زمانہ" دسمبر ۱۹۳۶ء کے بجائے شائع کیا جانیوالا تھا۔ مگر اب اس کا حجم اس قدر بڑھ گیا ہے کہ یہ پرچہ رسالہ کے معمولی چار پرچوں کے برابر ہوگیا ہے۔ اس لئے ہم نے سہولت کے لحاظ سے یادگار پریم چند" کو دو حصوں میں تقسیم کردیا ہے۔ ایک حصہ "زمانہ" دسمبر ۱۹۳۶ء کے بجائے سمجھا جائیگا اور دوسرا حصہ جو تنقیدی ہے "زمانہ" جون ۱۹۳۷ء کا نعم البدل ہوگا۔ زمانہ کی موجودہ جلد مئی ۱۹۳۷ء کے پرچہ کے ساتھ ختم ہوجائے گی اور آئندہ جلد جولائی ۱۹۳۷ء نمبر سے شروع ہوگی۔ عام شائقین سے مکمل یادگار پریم چند کی قیمت مع محصولڈاک و صرفہ رجسٹری دو روپیہ لی جائیگی، مگر خریداران رسالہ سے اس کی کوئی زائد قیمت نہ لی جائیگی بلکہ اسکا حصہ اول دسمبر ۱۹۳۶ء کا پرچہ اور دوسرا حصہ جون ۱۹۳۷ء کا زمانہ شمار کیا جائے۔

پریم چند نمبر کی ایک اہم خصوصیت یہ بھی ہوگی کہ اس میں منشی صاحب مرحوم کی قلمی تحریر کے ہاف ٹون عکس کے علاوہ اُن کی بہت سی نادر و نایاب عکسی تصویریں بھی ہدیۂ ناظرین ہونگی۔ مختلف اوقات اور مختلف زمانوں کی جو تصویریں میسّر ہوسکی ہیں وہ سب ہم نے بڑی تحقیق و تلاش سے یکجا کردی ہیں۔ ان کے لئے ہم متعدد احباب کے علاوہ مسز پریم چند صاحبہ کی عنایت و توجہ کے خاص طور پر شکرگذار ہیں۔ مسز ممدوحہ نے بھی ہماری درخواست پر ہمارے مرحوم دوست کی آخری علالت اور اُن کی زندگی کے آخری لمحوں کے متعلق ایک حسرت انگیز مضمون بھی لکھا ہے جسکی دلکشی دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔

غرض ہر لحاظ سے یہ پرچہ شائقین ادب خصوصًا قدردانان پریم چند کے لئے ایک قابل قدر چیز ہوگی ہم اس یادگار نمبر کو معمول سے صرف پانچ سو زائد چھاپ رہے ہیں۔ اس لئے شائقین اس کی خریداری میں تساہل سے کام نہ لیں ورنہ پھر یہ ادبی تحفہ کسی قیمت پر بھی دستیاب نہ ہوگا۔

زمانہ

جلد ۶۸ — مئی ۱۹۳۷ء — نمبر ۵

مناجات بدرگاہ قاضی الحاجات

برائے عہد سلطنت ہز مجسٹی جارج ششم خلد اللہ ملکہ

ترجمہ نظم جان میسفیلڈ ملک الشعرائے انگلستان

از مولانا محمد یعقوب خاں، کلام۔ بی۔ اے،

اے خدائے خشک و تر! اے بادشاہِ بحر و بر!
شاہ کو توفیق دے ایسی کہ یہ ملکِ قدیم
کیسے بھائی؟ وہ جو محنت اور دماغی فکر سے
یہ جلالت زندہ جاوید کر، شہ کو عطا
اور ملکہ کو جو ہے قصرِ امارت کی مکیں،
شاہ کے ہر فرضِ روزانہ میں بن کر حصّہ دار،
شاہ بانو اور شہ دونوں کو اپنے فضل سے
تاکہ بیکاروں کی خاطر وہ کریں فکرِ معاش
دے بصیرت راہِ خوب و زشت میں پہچان کی
اور دے قلبِ عمل میں اس قدر جوش و خروش
کر عطا امن و صلح، اپنی مقدس شانتی
اور جوار باب ہیں برطانیہ پر حکمراں
دے انھیں فنِ جہانبانی میں ادراک و شعور
اور ہماری ہر تمنّا جو کہ ہونیکو نہاد

عہدِ مستقبل میں ہو اس سلطنت کا راہبر
بھائی چارے کی ریاست ہو بہ اوصافِ دگر
زندگی کو عالمِ امکاں کی کردیں خوب تر
تا ہو تیرے فضل سے نخلِ تمنّا بار ور
اس قدر تابِ تحمل دے کہ وہ باکرّوفر
پایۂ تکمیل کو پہونچائے باعقل و ہنر
اس قدر توفیق دے، اے بیکسوں کے دادگر
اور مایوسوں کو امیدوں کا بخشیں تاجِ زر
اور سیدھی راہ چلنے کے لئے نورِ بصر
ہوں مکمل کام سب کے خوب سے بھی خوب تر
اور مسرت انسدادِ جنگ کی توفیق کر
پائیں نو آبادیوں میں مالکانِ خیر و شر
مشوروں کو اُن کے کر عقل و خرد سے بہرہ ور
پوری کر اس سلطنت میں جو ہے اب آغاز پر

دُنیا کا مذہبی ماحول

(از پروفیسر سنت پرشاد مدہوش ایم ۔ اے)

آجکل فضائے عالم میں مادیت کی مسموم ہوائیں چل رہی ہیں اور دنیا کے مطلع امن پر خطرۂ جنگ کی مغموم گھٹائیں چھائی ہوئی ہیں۔ یہ خطرہ موجودہ تہذیب یا بربریت کا نتیجہ ہے جس میں ایک قوم دوسری قوم کا بلا امتیازِ مرد و زن، معصوم و گنہگار خون کر کے اپنی دولت میں اضافہ کرنا حب الوطنی سمجھتی ہے۔

یہی وقت ہے جب سچے مذہب کی اشد ضرورت ہے، مگر اس مذہب میں وہ عیسائیت شمار نہیں ہو سکتی جس نے حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لیکر آزاد خیالی کو کفر ٹھہرایا اور اسپنوزا (Spinoza) جیسے خدا پرست فلسفیوں کی حق گوئی پر کفر کا فتویٰ دیدیا اور انھیں محض اس لئے سزاوارِ عتاب ٹھہرایا کہ اُن کے آزاد خیالات برسر اقتدار پادریوں کی تعبیر کردہ ہٹ دھرمی اور عیسائیت کے محاکموں کے متضاد تھے۔ نہ اس مذہب میں اس اسلام کی گنجائش ہے جسے تنگ خیال و ظاہر پرست مُلّاؤں اور گندم نما جو فروش زاہدوں اور بادشاہوں کی ہاں میں ہاں ملانے والے قاضیوں نے اُلٹا سیدھا جامہ پہنا کر خدا پرست لوگوں کے گلے کی پھانسی بنا دیا۔ اور نہ اس میں اُس ہندو دھرم کو کوئی دخل ہو سکتا ہے جسے خود غرض پروہتوں نے اپنا پیٹ بھرنے اور دوسروں پر ظلم ڈھانے کے لئے ترتیب دیکر عوام کو جہالت اور نادانی میں رہنے پر مجبور کیا۔ بیشمار لوگوں کے لئے سنسکرت کا پڑھنا پڑھانا ممنوع اور اُن کا مندروں میں داخلہ گناہ ٹھہرایا۔ مختصر یہ کہ ہم کو اُس مذہب کی ضرورت نہیں ہے جس کی آڑ میں وہ ظلم و ستم ڈھائے گئے کہ خلق اللہ چیخ اُٹھی اور جس نے لوگوں کو ایسا برگشتہ کر دیا کہ اب وہ اس کے نام پر صلواتیں سُنانے لگے اور خدا اور مذہب دونوں کے خلاف پروپیگنڈا کرنے لگے۔

چنانچہ اشتراکیت کا بانی مارکس (Marx) لکھتا ہے کہ "مذہب لوگوں کے لئے افیون

کا کام دیتی ہے۔ فلسفۂ مارکس کے مقلد اور اشتمالیت کے بانی لینن (Lenin) کا قول ہے کہ مارکس کے عقائد (Marxism) مادیت پر مبنی اور مذہب کے جانی دشمن ہیں۔

لیونکارسکی (Lunacharsky) نے تو یہاں تک لکھدیا ہے کہ جب ہم کو عیسائیت اور عیسائیوں سے نفرت ہے، تو بہترین عیسائیوں کو بھی ہمیں اپنا بدترین دشمن ہی تصور کرنا چاہیئے۔

اسٹیپ ناف کا خیال ہے کہ "ہمارا طریق عمل ایسا ہونا چاہیئے کہ ہر ایک ضرب جو ہم اس مسیحی کلیساؤں کے مروجہ رسمیات پر لگائیں، اور ہر ایک چوٹ جو ہم پادریت پر کریں وہ عموماً مذہب کے تصور کو مضروب کردے۔ اور کسی حالت میں بھی خدا کے تصور کے خلاف ہماری لڑائی کم اور ہلکی نہ ہونے پائے۔ خواہ ہم اسے عیسیٰ کہیں یا بدھ یا کسی اور نام سے یاد کریں:

بیشک ہم کو پابند رسوم پادریوں، ظاہر پرست ملاؤں اور ہٹ دھرم پنڈتوں کی ضرورت نہیں ہے درحقیقت ہمیں اس اصلی مذہب کی ضرورت ہے جسے حضرت مسیح، پیغمبر اسلام محمد ہاشمی، کرشن مہاراج کبیر صاحب، گرونانک، مولانا روم، شمس تبریز وغیرہ کاملین نے بنی نوع انسان کی بہبودی کے لئے پیش کیا تھا۔ مگر اس وقت وہ مذہب کہاں ہے؟ سچ پوچھیئے تو اصلی مذہب معشوق کی میان موہوم ہوکے رہ گیا ہے۔ پیغمبروں اور اولیائے کاملین کے بعد اُن کی روحانی تعلیم جو علم سینہ ہوتی ہے امتدادِ زمانہ سے کچھ کی کچھ ہو جاتی ہے اور مذہب محض رسمیات و روایات کا مجموعہ بن کرہ جاتا ہے حریص و دغاباز دنیا پرست لوگ اسے دولت و ثروت حاصل کرنے کا ذریعہ بنا لیتے ہیں، وہ مذہب کی آڑ میں شکار کھیلتے ہیں، ظلم ڈھاتے ہیں اور نادان عوام کو دھوکہ دیکر اپنی مطلب برآری کرتے ہیں انہیں باتوں سے لوگ مذہب سے متنفر ہوگئے۔

مذہب کے مخالفین کا سب سے بڑا مرکز جنگِ عظیم کے بعد روس میں قائم ہوا، جہاں صدیوں سے جابر فرمانرواؤں کی حکومت رہی، اور مذہب کے پردے میں غریب رعایا پر بے شمار ظلم و ستم ڈھائے گئے جنگ عظیم میں روس نے شکست فاش کھائی اور رعایا زار کی حکومت سے باغی ہوگئی، شہنشاہ پال اور زار اور اس کے اہل خاندان تہ تیغ کئے گئے۔ حکومت کی باگ ڈور مزدوروں اور کسانوں کے ہاتھ آگئی اور اشتمالیت نے زور پکڑا تو اُن کے لیڈروں نے ان مظالم کی یاد دلاکر جو مذہب کے نام پر عوام پر روا رکھے گئے تھے لوگوں کو مذہب کا دشمن بنا کر خدا سے بھی منحرف کر دیا۔

Temple of the Saviour
آج شہر ماسکو کے متعدد عالیشان کلیسے عنقا ہوگئے ہیں عظیم الشان کلیسا کا طلائی گنبد اُڑا دیا گیا اور اس کی عمارت میں سکریٹریٹ کا دفتر آگیا ہے۔ روس میں مذہب کے

خلاف جو جنگ برپا کی گئی اس کی شدت کا اسی سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ ١٩٣٥ء میں چودہ ہزار گرجے بند کیے گئے اور تین ہزار چھ سو ستاسی مہتممانِ کلیسا کے خلاف کارروائی کی گئی اور نتیجہ یہ ہوا کہ اُنتیس پادریوں کو پھانسی دی گئی۔ ایک شہر کے بارے میں جو دریائے والگا (Volga) پر آباد ہے پتہ لگا ہے کہ آٹھ لاکھ تیس ہزار آبادی کے لئے صرف پانچ گرجے باقی رکھے گئے ہیں حکومت مہتممانِ کلیسا اور گرجوں پر کثیر رقم ٹیکس کی لگا دیتی ہے اور جب کبھی یہ ٹیکس وصول نہیں ہوتے تو کلیساؤں کی عمارتیں ضبط کر لی جاتی ہیں۔

جن ممالک میں اب بھی اہلِ کلیسا کا زور ہے وہاں بھی حامیانِ کلیسا اپنا اقتدار قائم و برقرار رکھنے کی کوششیں کر رہے ہیں۔ چنانچہ آسٹریا اور اسپین جیسے ممالک میں جہاں ہمیشہ مذہب کا حکومت پر اقتدار رہا ہے اشتمالیت اور فاسشیت کے پیروان کے خلاف جذبات برانگیختہ ہو رہے ہیں یہاں تک کہ آسٹریا میں تو حکومت پر کیتھولک پادریوں نے پورا تصرف حاصل کر لیا ہے، اور اب وہی چانسلر نامزد کرتے ہیں۔ اسپین میں بھی کلیسائی عہدہ داروں نے دیگر مخالفینِ اشتمالیت کی امداد و اعانت سے موجودہ حکومت کے خلاف (جو اشتمالیت کی علمبردار ہے) بغاوت برپا کر دی ہے۔

بایں‌ہمہ اس وقت تمام دنیا میں لامذہبیت زوروں پر ہے چنانچہ اس سال کی ابتدا میں ماسکو میں ایک بین الاقوامی کانفرنس منعقد ہوئی تھی جس میں چھیالیس ممالک کے لامذہبیت کے نمایندگان اور لاخدا شریک ہوئے تھے۔ اس کانفرنس کو دنیا کے آزاد خیال اور منکرانِ خدا کے نام[1] سے موسوم کیا گیا تھا تقریباً سولہ ہزار نمایندے اس میں شریک تھے، اس کا مدعا خدا اور مذہب کے خلاف جنگ اور پروپیگنڈا کرنا تھا۔ میڈرڈ (Madrid) پریگ (Prague) میکسیکو (Mexico) ہندوستان اور چین پر ان لامذہبیت کے علمبرداروں کی خاص نظر ہے۔

مذہب کے خلاف بغاوت اور پروپیگنڈے کا اصلی سبب یہی ہے کہ حریص و خود غرض دنیا پرست لوگوں نے اپنے سیاہی آلود ہاتھوں سے اُسے مس کر کے مذہب کو درخشاں نہ رہنے دیا۔ مذہب کی آڑ لیکر اہلِ کلیسا نے مظالم ڈھائے، اشتمالیت کے نصب العین کی آڑ لے کر اہلِ اشتمالیت نے بازارِ تعدی گرم کیا بس جن وجوہ سے لوگ مذہب اور خدا سے متنفر ہوئے اُنھیں وجوہ سے اشتمالیت کے سبز باغ سے فریب زدہ لوگ چونک رہے ہیں۔ اسٹالن آمر روس نے دیکھا کہ کہیں باوجود تشدد دبیہ شعلۂ خفتہ بھڑک نہ اُٹھے اور اشتمالی حکومت کو جلا کر

[1] World's Conference of the Godless and Free thinkers

خاک نہ کردے جیساکہ اس سے پیشتر مذہب اور مطلق العنان حکومت زار کے ساتھ ہو چکا ہے اس لئے اس دُور اندیش آمر نے حال میں اپنے جبرو تشدد کو کم کر دیا ہے اور مذہب کی پیروی جو ابتک بروئے قانون ممنوع تھی اس کی شخصی طور پر اجازت دیدی ہے ہر سیاسی نظام کو بھی جمہوری جامہ پہنانا منظور کرکے اس طرف بھی سعی شروع کردی گئی ہے۔ یہ سب مصلحت وقت کے تابع ہو رہا ہے اُس نے دیکھا کہ اگر زیادہ جبرو تشدد سے کام لیا گیا تو اندرون ملک بدامنی پھیل جانے کا اندیشہ ہو جائیگا اور پھر غیر ملکی دشمنوں کے مقابلے میں مشکلات پیدا ہو جائیں گی۔

روس میں لامذہبیت کا مرکز مستحکم ہو جانے کے بعد دوسرے ملکوں میں بھی اس کا اثر محسوس ہونے لگا ہے۔ چنانچہ اس وقت اسپین میں پادری اس طرح ذبح کئے جارہے ہیں جیسے ایک صدی قبل انگلستان میں ساحرہ عورتیں نذرِ آتش کردیجاتی تھیں۔

اٹلی اور جرمنی میں فاسیت اور نازیت کا دور دورہ ہے۔ فاسیت اور نازیت کا فلسفہ مذہب کے قطعی خلاف ہے گوفی الحال اُن کے حامی مصلحتاً مذہب کے خلاف اپنے جذبات کا اظہار نہیں کرتے بلکہ مذہب کی ناگزیر طاقت کو اپنے سیاسی مفاد کے لئے استعمال کرنا چاہتے ہیں۔ مگر انھیں یہ گوارا نہیں کہ مذہب کسی طرح آمریت کے خلاف سیاسی معاملات میں دخل اندازی کرے، چنانچہ اٹلی میں بھی حال میں نازیوں اور پادریوں میں اختلافات شروع ہوگئے ہیں، اور پوپ نے نازیوں کے رویہ پر اظہار رنج وغصہ کیا ہے۔ دوسری طرف حریفان کلیسا نازی یہ چال چل رہے ہیں کہ ہٹلر ہی کو خدا کا بیٹا (Son of God) تسلیم کرائیں، چنانچہ اس کا پروپیگنڈا شروع ہوگیا ہے اور کچھ اصحاب نے کہنا شروع کر دیا ہے کہ خدا کے بیٹے کی تمام خصوصیات ہٹلر کی شخصیت میں یکجا ہوگئی ہیں۔ بہرنوع ہٹلر کو اُنھوں نے اپنے سیاسی اغراض کے لئے خدا کا بیٹا سمجھنا سمجھانا شروع کردیا ہے۔

اور ہٹلر نے بھی کم از کم اتنا تو کہہ دیا ہے کہ اگر وہ رضائے ایزدی کو اپنے شامل حال نہ سمجھتا تو اس بارِ عظیم کا جو وہ اُٹھائے ہوئے ہے ہرگز متحمل نہ ہوسکتا۔ جرمنی لوگوں کی وفات کی خبریں بھی اخبارات میں اس طرح چھپنے لگی ہیں کہ "متوفی اڈالف ہٹلر میں ایمان رکھتے ہوئے فوت ہوا"

(Deceased) "died in the faith of Adolf Hitler"

اخبار نیویارک ٹائمس کی ایک قریبی اشاعت سے معلوم ہوا کہ جرمنی میں سرکاری ملازمان کو ہدایت کردی گئی ہے کہ وہ سرکاری کاغذات میں اُس خانہ میں جہاں شہریوں کے مذہب کا اندراج کیا جاتا ہے الفاظ کرسچین، کیتھولک، پروٹسٹنٹ لکھنے کے بجائے اندراجات ذیل کیا کریں:۔

(۱) اہل مذہب و بُت پرست (۲) منکرِ خدا (۳) لامذہب

اعداد و شمار سے پتہ لگا ہے کہ جرمنی میں بیس لاکھ منکر اور سات لاکھ لامذہب باشندے ہیں لامذہبیت کی وبا عام ہو رہی ہے۔

اب ذرا غور فرمائیے کہ مغرب میں مذہب کے امین عوام میں مذہبی شوق پیدا کرانے کی کیسی کیسی تدبیریں کر رہے ہیں۔ دو تین سال کا عرصہ گذرا کہ امریکہ کے ایک اخبار میں گرجا گھر میں عبادت کی اطلاع مشتہر کی گئی تو یہ بھی درج کر دیا گیا کہ شرکا کو بعد عبادت چائے پلائی جائے گی۔ اور سینما دکھایا جائیگا۔ درحقیقت انسان سگِ دنیا ہے، جب تک کلیساؤں سے ٹکڑے ملتے رہے وہ اپنے تئیں اہل مذہب کا گرویدہ ظاہر کرتا رہا، مگر جب سے کلیسا کی پوزیشن مختلف ہوگئی۔ نہ سدا بَرت بانٹنے کی توفیق رہی اور نہ بیمار دار کی دوا دارو کا انتظام ہی اہل کلیسا کے ہاتھ میں رہا۔ تعلیم کا اہتمام بھی کلیسا کے ماتحت نہیں رہا، رفاہ عام کا بندوبست اور خیرات کی تقسیم میں بھی کلیساؤں کو کوئی تعلق نہیں رہا کلیساؤں میں عبادت کے بہانہ سے آپس کا ملنا جلنا، خوش گپّی اور تفریح طبع ہو جاتی تھی اس کے لیئے اب سینما گھر، تھیٹر، سرکس وغیرہ کھل گئے ہیں، اب غور فرمائیے کلیساؤں کی ضرورت ہی کیا رہی ہاں اگر کوئی ایسی چیز انسان کے مفاد کی ہوتی کہ جو محض کلیساؤں سے دستیاب ہو سکتی تو لوگ ادھر متوجہ ہوتے۔

کلیساؤں کو روحانی غذا بہم پہونچانی چاہیئے تھی، روحانی ترقی کا بندوبست کرنا چاہیئے تھا، مگر جب اہل کلیسا خود اس نعمتِ عظمیٰ سے محروم ہیں تو دوسروں کو کیسے فیض پہونچا سکتے ہیں، مذہب کے ان اجارہ داروں کا یہ نصب العین نہیں ہے کہ دنیا کو روحانی ترقی نصیب ہو بلکہ یہ کہ کلیسا کا اقتدار قائم رکھ کے اُسے اپنے دُنیوی مفاد کا وسیلہ بنائے رہیں۔ اسی دنیوی مفاد کے حصول کی غرض سے یہ حضرات پہلے تو تفریق مذہب ملت در ملت کے موجب ہوئے۔ دنیا نے اہل مذہب ہی کے اندر ایسا اختلاف پایا کہ ایک مذہب دوسرے مذہب کو تسلیم کرنا درکنار مسلک کفر قرار دیتا ہے تو پھر یہی مناسب سمجھا گیا کہ مذہب کی جھنجھٹ ہی میں کیوں پڑا جائے۔ ایسی صورت میں سچے مذہب کی تحقیق و تصدیق محال ہے۔ مگر جب تفرقہ پردازان مذہب نے دیکھا کہ نتیجہ نے یہ صورت پکڑی تب اُنھیں یہ سوجھی کہ آپس میں سمجھوتہ اور اتحاد ہی بہتر ہے کیونکہ دوسری صورت میں آپس کا اختلاف ہر ایک کے شیرازہ کو فرداً فرداً منتشر کر دے گا۔ چنانچہ امریکہ کی کلیسا ہائے عیسوی کی فیڈرل کونسل کے اجلاس کے صدر ڈاکٹر ہولٹ (Dr. Holt) نے اپنی تقریر کے دوران میں

یہ فرمایا کہ "امریکوی پروٹسٹنٹزم کو یا تو ازسرِ نو تنظیم کرنا چاہیئے ورنہ اسے انتشار و انہدام کا سامنا کرنا پڑیگا۔ آپ نے یہ بھی کہا کہ پروٹسٹنٹ کلیسا کی ازسرِ نو تنظیم مناسب ہی نہیں بلکہ اشد ضروری ہے اور اگر اہلِ کلیسا یونین (Union) سے گھبراتے ہیں تو فیڈریشن تو لازمی ہے۔

ڈاکٹر نکس اور ڈاکٹر البرٹ نے کونسل مذکور کے کمیٹی کی رائے کلیسا کی موجودہ حالت کے بارے میں ظاہر کرتے ہوئے کہا کہ اب ایک ایمان، ایک ضمیر اور متحدہ چرچ "Common faith, Common conscience and United Church" کے بغیر کوئی چارہ کار نہیں ہے۔

اِن تجاویز پر کونسل کے شرکا میں کوئی چیں بجبیں نہیں ہوا حالانکہ ابھی اس زمانے کو گذرے ہوئے عرصہ نہیں ہوا جب کلیسائی اتحاد (Church Union) کا تذکرہ پروٹسٹنٹ کلیسا کے ہر فریق کو چراغ پا کر دیتا تھا۔ اس سے یہی واضح ہوتا ہے کہ اب مذہب کے اجارہ داران یہ محسوس کر چکے ہیں کہ اپنی ہستی قائم رکھنے کے لئے یہی مناسب ہے کہ ہر فرقہ اور ملت مذہبی اختلافات کے بجائے اُن پہلوؤں پر زور دے جو مشترکہ ہیں اور اس طرح اختلافات کو پس پشت ڈالکر ہم آہنگی کے پہلو کو نمایاں کرے۔

رھوڈیشیا (Rhodesia) میں تو پروٹسٹنٹ کلیسا کے مختلف فرقوں میں بین الاقوامی اتحاد (International Unification) Copper Belt Experiment کے ذریعہ عمل پیرا ہو چکا ہے۔ دیگر فرقوں میں بھی اتحاد کی سعی ہو رہی ہے چنانچہ وہ دن دور نہیں جب امریکہ کے لوتھرین چرچ (Lutheran Churches of America) بھی سب کے سب متحد ہو جائیں گے۔

اس اتحاد کی طرف گامزنی شروع ہو گئی ہے۔ اسکنڈینویا (Scandinavian) اور انگلیکن چرچ (Anglican Churches) کے پادریوں اور بشپ صاحبان کے درمیان ناروے کے مقام لارویک میں اس مسئلہ پر غور ہوا تھا کہ کہاں تک اس قسم کے یونین (اتحاد) کا امکان ہے۔ ساؤتھ ورک لندن کے بشپ اور ٹرمسو (ناروے) کے بشپ صاحبان نے ایک ہی منبر سے وعظ دیئے۔ ایسا واقعہ گذشتہ چار صدی سے کبھی نہیں ہوا تھا۔ اسی طرح میتھوڈسٹ چرچ (Methodist Church) کو بھی اتحاد (Union) اور فیڈریشن کی سوجھ رہی ہے۔

مختصر یہ کہ اجارہ داران مذہب جن کا شیوہ اب تک تفرقہ پردازی رہا ہے اب محسوس کر رہے ہیں کہ انھیں اپنی ہستی قائم رکھنے کے لئے مذہبی و ملّی نفاق و شقاق کی راہیں بند کر دینی چاہیئے

Bishop of Tromso Norway ۵۲ Bishop of South Work London ۵۱

خیر اتحاد کی کوشش خواہ کسی نیت سے کیوں نہ کی جائے مگر اس کا نتیجہ نیک ہی نکلے گا۔

اہلِ کلیسا کس نیت سے اتحاد کی کوشش کر رہے ہیں اور سیاسی آمران کس غرض سے مذہب کے خلاف علم بغاوت بلند کئے ہوئے ہیں، دونوں باتیں صاف ظاہر ہیں، مگر ایک معمولی انسان خدا اور مذہب دونوں کی ضرورت محسوس کرتا ہے۔ مادّیت کے پرستاروں نے دنیا میں بخوبی محسوس کر لیا ہے کہ دولت و شہرت کے حصول کے باوجود انھیں سکون قلب میسّر نہیں ہوتا۔ دنیا کو رسمی مذہب کی ضرورت نہیں، مگر اس کا یہ تقاضا ضرور ہے کہ وہ اپنے تئیں خدا سے جو مخزنِ محبت اور منبع سکون ہے قریب تر محسوس کرے۔ دنیا کے اندر امن و امان قائم ہونے کے لئے ضروری ہے کہ اخوّتِ انسانی کا نقش ہر بشر کے لوحِ دل پر مرتسم ہو اور وہ رضائے الٰہی سے موافقت کرتے ہوئے زندگی بسر کرے۔ انسان اس بات کا بھی متقاضی ہے کہ وہ اپنے ضمیر کو پاک محسوس کرے اور آلاتِ دنیوی سے اس کے مجروح دل پر مرہم رکھا جائے۔ یہ سب تقاضے مذہب سے پورے کئے جا سکتے ہیں اور مذہب کا فرض بھی انھیں تقاضوں کا پورا کرنا ہے۔

لوگوں کو رسمی مذہب سے نفرت پیدا ہو چکی ہے، اب انھیں تجدید مذہب کی فکر ہے، مگر یہ تجدید مذہب کی جائز کارروائی کا جائزہ لیتے ہوئے ہونی چاہیے در اصل یہ تجدید بلا مشیّت ایزدی اور بلا واسطہ الہام ناممکن ہے۔ جن لوگوں کا یہ خیال ہے کہ وہ جملہ مذاہب کو مدّنظر رکھکر عقل و ذہن کی مدد سے ایک مشترکہ مذہب مرتب کر لیں گے، اُن کی یہ خام خیالی ہے۔ اِن عقل کے پتلوں کا ایک طبقہ ایسا بھی ہے جو ایسا مذہب ایجاد کرنا چاہتا ہے جس میں خدا کو کوئی دخل نہ ہو اور عذاب و ثواب کا خیال اُمید و بیم کا باعث نہ ہو۔ یہ نافہم اپنے اس خیال کی تائید میں بودھ مذہب کا حوالہ دیتے ہیں۔

برین عقل و ہمت بہ باید گریست

سنہ ۱۹۳۰ء میں ڈاکٹر چارلس پاٹر (Dr. Charles Potter) نے ایک نئے مذہب کی بنیاد (Humanism.) انسانیت کے نام سے رکھی اور اس کی شاخیں نیویارک، شکاگو وغیرہ شہروں میں قائم ہو گئیں۔ دنیا سے قطع نظر ہندوستان کے مذہبی ماحول پر نظر ڈالئے تو معلوم ہوتا ہے کہ ہماری حالت سارے جہان سے ابتر ہے، ہمارے عوام توہم پرست ہیں اور نوجوان لامذہب ہیں۔ اعیانان مذہب فرقہ ساز و تفرقہ پرداز، سیاسی رہنمایان میں روس کے ہم خیال لوگوں اور مذہب کے مخالفوں کی تعداد بہت کافی ہے۔ افسوس ہے کہ ممالک غیر میں تو کلیسائی اختلافات مٹاکر اتحاد اور فیڈریشن کی کوششیں ہوں مگر ہندوستان میں نت نئے

مذہبی فسادات برپا ہوتے رہیں۔

عیسائی مذہب کو مقبول عام بنانے اور عیسائی حلقوں میں اتحاد و اتفاق پیدا کرنے کی غرض سے مذکورہ بالا کوششوں کے علاوہ مندرجہ ذیل مجالس بھی سرگرم کار ہیں:۔

(۱) World's Students Christian Federation.

(۲) The World's Alliance for Friendship through the Churches.

(۳) Universal Christian Council on life and Works.

(۴) World Conference on Faith and Order.

(۵) International Missionary Council.

جوانی کا خواب

(از حضرت بیتاب بریلوی)

کتنی سرور خیز ہے مستی شباب کی
لینے لگی بلائیں جوانی شراب کی

بجلی تھی یا شرار تھی جنبش نقاب کی
فتنہ بنی حجاب میں شوخی حجاب کی

ہے آئینہ بدست سنور کر جمالِ حسن
سانچے میں ڈھل رہی ہے جوانی شباب کی

برقِ نظر تھی، ٹوٹ کے تارا گرا تھا، یا
اُڑتی ہوئی کرن تھی کوئی ماہتاب کی

پھولوں سے کھیلتا ہے غرورِ شباب حسن
شیشہ میں ڈھل رہی ہے جوانی شراب کی

اب اُنکی خلوتوں کی بھی ہمراز بن گئی
اللہ یہ نصیب یہ قسمت شراب کی

بھولا ہوا سا خواب ہے افسانۂ بہار
پیری نے وہ شباب کی مٹی خراب کی

اِس سادگیِ عشق کے قربان جائیے
اِک بیوفا سے وہ بھی تمنا جواب کی

بیتاب بزم ناز کے چکر میں آگئی
شیشہ میں آکے سبز پری آفتاب کی

سرگذشتِ مذہب

از پروفیسر سنت پرشاد مدہوشؔ ایم۔ اے

کبھی وہ وقت تھا مذہب کی جلوہ ریزی تھی — کبھی وہ وقت تھا مذہب کی عطر بیزی تھی
جہاں میں چار طرف نورِ حق کی تیزی تھی — بہارِ گلشنِ مذہب کی نخل خیزی تھی
ہر ایک فرد بشر حق کا نام لیتا تھا
خدا کے نام پہ ہر شخص جان دیتا تھا

مگر وہ جنکی رگوں میں رواں تھا فتنہ و شر — دلوں میں جنکے سمایا تھا شوق نقرہ و زر
جہاں میں اوڑھ کے مذہب کی خوشنما چادر — پئے فریب ہوئے بدنصیب تنگ نظر
وہ ظلم ڈھائے کہ ساری زمین ہلنے لگی
غرض کہ خاک میں مذہب کی شان ملنے لگی

رُخِ جلیل پہ مذہب کے گرد چھائے گئی — وہ نور چھپتا گیا اُس پہ ظلمت آئے گئی
چمن میں دیں کے سیاہی قدم بڑھائے گئی — رُخِ بہار پہ گرد و غبار اُڑائے گئی
غرض کہ چھپ گیا روئے منورِ مذہب
عُروسِ صبحِ تجلّی ہے زیرِ چادرِ شب

ہزار حیف کہ بُرقع کُشا نہیں ملتا — نگاہِ تیرہ کو جلوہ نما نہیں ملتا
سراغِ منزلِ و راہ ہُدیٰ نہیں ملتا — زمین والوں کو کوئی پتا نہیں ملتا
طلسم کُفر کا یہ آرزو ہے ٹوٹے پھر
دعا خدا سے ہے مذہب گہن سے چھوٹے پھر

بہت کچھ ہے ابھی اے مہرباں جیبِ محبت میں
یہ مانا رنگِ رُخ و ہوش و حواس و صبر زائل ہیں

فرازِ طور، دروازہ حرم کا، اور وہ جلوہ
ابھی راہِ محبت میں در و دیوار حائل ہیں

فراقؔ اس سے چھڑی ہے بحثِ الفت دیکھئے کیا ہو
معاون ساری باتیں ہیں موافق سب دلائل ہیں

(۲)

وابستہ ہیں تجھی سے سب ارمانِ دوستی
تو جانِ دوستی ہے تو ایمانِ دوستی

کچھ احتیاط بھی ہے ضرور اے دلِ حزیں
یہ کم نگاہیاں ہیں نگہبانِ دوستی

کچھ عشق بے قرار بھی شرمندہ ہو چلا
اٹھتی چلی وہ نرگسِ حیرانِ دوستی

کن مشکلوں میں شکوہ بیجا ہے عشق کا
پیدا ہے جورِ حسن سے بھی شانِ دوستی

ہم باغِ خلد کو بھی نہ لائیں خیال میں
ہاتھ آ لئے اگر ترا سیر دامانِ دوستی

پھر اُٹھی وہ نگاہِ کرم مدتوں کے بعد
لے کر ہزار ہا سر و سامانِ دوستی

باغِ جہاں میں تیری ہی اے نو بہارِ ناز
پھیلی ہوئی ہے بوئے پریشانِ دوستی

یادِ نگاہِ یار پھر آئی لئے ہوئے
سامانِ صد جراحتِ پیکانِ دوستی

[illegible] نہاں سے پناہ اے خدائے عشق
بدلے ہی جا رہا ہے وہ عنوانِ دوستی

جو میں ہے صاف پیامِ نگاہِ لطف
اک تیرِ نیم کش ہے یہ پیمانِ دوستی

[illegible] تغافلِ جاناں کی شوخیاں
فرصت نہ دشمنی کی نہ امکانِ دوستی

[illegible] بھی رشکِ قسمتِ اغیار کیا کریں
یہ بھی ہیں کوئی دن کے مہمانِ دوستی

اب اور کیا کہیں کہ ہم اہلِ صفا سے بھی
آخر نہ اُٹھ سکے ترے احسانِ دوستی

برقِ نگاہِ یار میں پنہاں ہیں اے فراقؔ
صد ہا فریبِ مشکل و آسانِ دوستی

صنعتی اور حرفتی تعلیم کی ضرورت

(از مسٹر محمد حضور عالم، انسپکٹر انڈسٹریز صوبہ متحدہ، بی۔ایس سی، ایم۔آر۔ اے ایس)

یہ بحث کہ ہمیں فی زمانہ کس قسم کی صنعتی و حرفتی تعلیم کی ضرورت ہے " فی نفسہ بے حد اہم ہے کیونکہ اس کا تعلق براہِ راست ہماری معاشرت اور معیشت سے ہے۔ موجودہ عالمگیر بے روزگاری نے اس کو اور بھی اہم بنا دیا ہے چنانچہ ہماری یونیورسٹیوں کی مروجہ تعلیم کی مثال اسوقت ایسی ہے کہ جیسے کوئی شخص بھوک سے جاں بلب ہو اور اسکو تفریح کی خاطر خوشبوئیں سُنگھائی جائیں، ظاہر ہے کہ منطق و فلسفہ ادب و تاریخ خواہ عام ذہنی صلاحیتوں کو ترقی دے سکیں۔ ہماری مُفلسی کا علاج نہیں کرسکتیں۔ موجودہ زمانہ کی اشد ترین ضرورت یہ ہے کہ ہم اپنے بیکار نوجوانوں کو ایسے وسائل معاش سکھائیں جن سے وہ اپنا پیٹ پال سکیں اور ملکی دولت میں اضافہ کرسکیں۔

اسوقت جو صنعتی تعلیم اس ملک میں میسر ہے وہ گوناگوں اسباب کی بنا پر ناکافی اور نامناسب ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ بے روزگاری میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ اور ملک کی اقتصادی حالت بدسے بدتر ہو رہی ہے۔

مجھے انگلستان، جرمنی اور دیگر ممالک کے حالات کا مشاہدہ کرنے اور ہندوستان کی مخصوص ضروریات کا مطالعہ کرنے کا موقع ملا ہے اس لئے میں اس مضمون پر اظہار خیال کی جرأت کر رہا ہوں۔

ہندوستان کی موجودہ صنعتی نظام کو تین حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

اولاً۔ وہ بڑے کارخانے جو لاکھوں روپئے کے سرمایہ سے ان مخصوص مرکزوں میں چلائے جاتے ہیں۔ جہاں اُن کے واسطے خاص سہولتیں میسر ہیں۔ ان میں برقی یا دخانی طاقت استعمال ہوتی ہے۔ اور زیادہ تر کام بڑی مشینوں سے ہوتا ہے۔ ایسے کارخانوں میں گنتی کے چند ماہرین صنعت کی ضرورت ہوتی ہے ورنہ سب کام ان مزدوروں سے لیا جاتا ہے جنھیں اس صنعت کی خاص تربیت نہیں دیجاتی ہے۔ بہر حال اُنھیں قلیل اُجرت دیجاتی ہے۔ اور اصلی

نفع حصہ داران میں تقسیم ہو جاتا ہے۔ جو عموماً بڑے سرمایہ دار ہوتے ہیں۔

دوسرے وہ چھوٹے کارخانے جن میں نسبتاً کم سرمایہ لگتا ہے۔ اور جن میں زیادہ تر کام ہاتھ سے یا چھوٹی مشینوں کے ذریعے ہوتا ہے ان میں تربیت یافتہ دستکار کام بناتے ہیں۔ جنھیں کام کی قیمت خواہ تعداد کے لحاظ سے اجرت دی جاتی ہے۔ سرمایہ کے مالک ایک یا چند افراد ہوتے ہیں اور وہی نفع ونقصان کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔

تیسرے وہ گھریلو کارخانے جن میں ایک خاندان کے افراد بالکل قلیل سرمایہ سے اپنے مناسب حال دستکاریاں اپنے گھروں پر اختیار کرلیتے ہیں۔ سرمایہ یا تو ان کا ذاتی ورنہ قرض لیا ہوا ہوتا ہے۔ اور اس کی شرح سود بالعموم بہت زیادہ ہوتی ہے۔ نفع ونقصان کے ذمہ دار خود دستکار ہی ہوتے ہیں۔

دنیا میں صنعتوں کی ابتدا اس ہی تیسری صنف یعنی گھریلو دستکاریوں سے ہوئی جبکہ کوئی شخص اپنی ذاتی ضرورت کے واسطے ایک شے بناتا تھا اور اس کی ضرورت سے جسقدر فاضل ہوتا وہ کسی دوسری شے کے تبادلہ یا روپیہ کے معاوضہ میں دوسروں کو دے دیتا تھا۔ چنانچہ اسی دور نے ارتقائی مدارج طے کرتے ہوئے چھوٹے کارخانے اور پھر بعد میں بڑے کارخانے قائم کرائے، حتیٰ کہ امریکہ اور اُن دیگر ممالک میں جو صنعتی ترقی کے اوج کمال پر پہونچ گئے۔ چھوٹے کارخانے اور گھریلو دستکاریاں تقریباً نیست ونابود ہوگئیں، اور موجودہ نام نہاد ترقی کا یہ نتیجہ ہوا ہے کہ مال طلب سے زیادہ تیار ہونے لگا ہے۔ مشینوں کے بیجا استعمال نے آدمیوں کو بیکار [illegible] ور دولت کی فراوانی کے باوجود جو بالائی طبقوں میں محدود رہی۔ عوام میں افلاس وپریشانی [illegible]ی ہے۔

جو ممالک صنعت وحرفت کے اس مفروضہ ترقی کے اعلیٰ ترین مدارج تک پہونچ گئے ہیں کے لئے تو یہ بہت مشکل ہے کہ قدم پیچھے ہٹا کر کوئی جدید نظام اختیار کریں۔ لیکن ہندوستان کی [illegible]رح جو ملک ابھی اس ارتقا کے ابتدائی یا وسطی دور میں ہیں اُن کے لئے یہ ممکن ہے اور ضروری ہے کہ حالات کا جائزہ لے کر ایک ایسا طریق کار اختیار کریں جو مغربی نظام کی خرابیوں سے پاک اور قدیم ترین صنعت کی خوبیوں سے متصف ہو۔

اس غرض سے یہ دیکھنا چاہیئے کہ تینوں قسم کی صنعتوں میں کیا نقائص اور کیا خوبیاں ہیں۔ بڑے کارخانوں کی خاص خوبی یہ ہے کہ وافر سرمایہ اور مشینوں کے استعمال کی وجہ سے وہ

کم خرچ پر مال تیار کر کے ارزاں قیمت پر فروخت کر سکتے ہیں۔ اور یہی اس طریق صنعت کے رواج اور فروغ پانے کی سب سے بڑی وجہ ہے۔ ان خوبیوں کے مقابلہ میں اس نظام کی مضرتیں متعدد ہیں۔ مثلاً۔

(۱) نفع سے زیادہ تر سرمایہ دار ہی مستفید ہوتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ مشینوں کے استعمال سے انسانی محنت کے موقعے کم ہو جاتے ہیں۔ اور عوام کی بیکاری میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ تیسرے مشینوں پر مسلسل کام کرنے سے دماغی قویٰ کے استعمال کرنے کا موقعہ نہیں ملتا ہے۔ اور اسوجہ سے قویٰ ذہنی کند اور ناکارہ ہو جاتے ہیں۔ چوتھے مزدوروں کو اپنا وطن چھوڑ کر اکثر دور دراز مقامات کی سکونت اختیار کرنا پڑتی ہے۔ چنانچہ صنعت کو احتیاجی طور پر اختیار کرنے والے لوگ ضعیف مرد بچے اور پردہ نشین عورتیں جو منتقل وطن نہیں کر سکتے وہ ایسے کارخانوں میں کام کرنے سے معذور رہتے ہیں۔ پانچویں خام اجناس کو مختلف اقطاع ملک سے ایک مخصوص مرکز پر لے جانا پڑتا ہے۔ اور پھر تیار شدہ مال کو اکثر انھیں رقبوں میں واپس لانا پڑتا ہے اور اس طرح ناواجب اخراجات باربرداری برداشت کرنا ہوتے ہیں۔ ان کے علاوہ اور بھی متعدد مضرتیں ہیں۔

اب چھوٹے کارخانوں کو لیجئے۔ ان میں اور بڑے کارخانوں میں اصولاً بعض اصول مشترک ہیں مثلاً یہ کہ نفع اور نقصان کا ذمہ دار سرمایہ دار ہوتا ہے اور دستکار کو صرف معینہ حساب سے اُجرت ملتی ہے۔ لیکن بڑے کارخانوں کی اکثر خرابیاں اس طریق صنعت میں نہیں ہیں۔ اور بہ حیثیت مجموعی دستکار کے حق میں یہ بڑے کارخانوں سے بہتر ثابت ہوتا ہے۔

گھریلو دستکاریاں (Cottage Industries) بلاشبہ زمانہ قدیم کی یادگار ہیں اور اس میں بھی شک نہیں کہ چھوٹے اور بڑے کارخانوں کے مقابلہ میں ان کا زندہ رہنا اسوقت تک محال ہے جبتک ان کی بعض خلقی خرابیاں رفع نہ کر دی جائیں۔ کاریگر کے نقطۂ نظر سے جو بات اس نوع صنعت میں خاص طور پر ممتاز ہے وہ یہ ہے کہ اس میں کاریگر کسی کا ماتحت اور محکوم نہیں رہتا اور خود ہی نفع و نقصان کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ البتہ فراہمی سرمایہ اور خرید و فروخت کی دشواریاں اس قدر اہم ہوتی ہیں کہ وہ تنہا اُن پر عبور نہیں پا سکتا۔ تاہم تجربہ سے یہ ثابت ہوا ہے کہ اگر گھریلو کاریگروں کو صنعتی اتحاد عمل Industrial Corporation کے اصول پر منظم کر دیا جائے تو اسوجہ سے کہ ہندوستان کے حالات اس طریق صنعت کے لئے خاص طور پر موافق ہیں

ان کا نظام ہمارے ملک میں خصوصاً کامیاب ہو سکتا ہے۔

صنعتی اتحاد عمل سے میرا مطلب یہ ہے کہ ایک مقام کے چند کاریگر جو ایک دوسرے پر اعتبار کرتے ہوں باہمی مفاد کی خاطر قانون و ضابطہ کے مطابق اپنی جماعت مرتب کر لیں۔ جس سے انہیں کوآپریٹو بینک اور دیگر ذرائع سے معقول شرح سود پر سرمایہ میسر ہو سکے۔ اور اس کے ساتھ ہی خرید فروخت اور تیاری کے دوران میں اشتراک عمل سے اخراجات میں کفایت اور نفع میں اضافہ ہو سکے۔

درحقیقت یہ کوئی اُصولی نظریہ یا آزمائشی تجویز نہیں ہے بلکہ جاپان کے بعض ممالک نے اس پر کاربند ہو کر اپنی بعض صنعتوں کو حیرت انگیز طریقہ پر کامیاب بنا لیا ہے۔ خود ہندوستان میں بھی بعض مقامات پر یہ طریقہ خلاف توقع ترقی کا باعث ہوا ہے۔ چنانچہ بعض حلقوں میں یہ خیال کیا جاتا ہے اور میری بھی یہی رائے ہے کہ اُن چند صنعتوں کے علاوہ جس کے لئے بڑے کارخانے اور مشینیں لازمی ہیں۔ ہندوستان کی صنعتی اور اقتصادی ترقی کا ذریعہ اسی قسم کی گھریلو صنعتیں ہو سکتی ہیں۔

غرض یہ ظاہر ہونے کے بعد کہ تینوں طرح کے نظامِ صنعت کے کیا نقائص اور کیا فوائد ہیں یہ ثابت کرنا ضروری نہیں رہا کہ کسی ایسی جماعت کے واسطے جس کے پاس سرمایہ کی کمی اور کام کرنے والوں کی افراط ہو۔ چھوٹے اور گھریلو کارخانوں کو اتحاد باہمی (کوآپریشن) کے اصول پر ترتیب دینا نہایت مفید ہو سکتا ہے۔ اور اس طرح کی صنعتوں کے واسطے نہ تو اعلیٰ قابلیت کے ماہرین فن درکار ہیں اور نہ الیکٹرکل اور میکینکل انجنیر ہی کی ضرورت ہے۔ ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ ہم ایسے کاریگر تیار کریں جو بیشتر ایسے ہی مقامات پر موزوں قسم کی دستکاریاں اختیار کر کے معاش پیدا کر سکیں اور اس طرح ملکی افلاس اور ادبار کا تدارک ہو جائے۔

یہاں پر برسبیل تذکرہ میں یہ بھی عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ صنعت و حرفت کی اعلیٰ ماہرانہ تعلیم کی ضرورت عموماً بڑے کارخانوں ہی کو ہو سکتی ہے۔ اس پر وقت اور روپیہ بھی بہ نسبت دستکاری کی تعلیم کے بہت زیادہ خرچ ہوتا ہے مگر ان کی موجودہ قدر ہمت کا اندازہ اسی بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس وقت کتنے ہی ماہرین صنعت جنھوں نے ہندوستان کے علاوہ دیگر ممالک میں بھی عمر اور دولت کا کثیر حصہ صرف کر کے تعلیم اور تجربہ حاصل کیا ہے۔ ان مشاغل کے اختیار کرنے پر مجبور ہوے ہیں جن میں ان کی ماہرانہ قابلیت کی مطلقاً ضرورت نہیں ہے۔ جیسا کہ میں نے سپرو کمیٹی کے سامنے بیان کیا تھا میرے علم میں ایسی متعدد مثالیں ہیں۔ مثلاً شکر سازی کی تعلیم پائے ہوے ایک صاحب بلوے کی

ملازمت کر رہے ہیں۔ دباغت کی تعلیم پائے ہوئے حضرات مغربی اسکولوں میں سائنس ماسٹر ہیں۔ اسی طرح تیل اور صابون سازی کے ایک ماہر ایک تجارتی کمپنی کے ٹریولنگ ایجنٹ ہیں حال ہی میں ایک صاحب سے میری ملاقات ہوئی۔ جنھوں نے کئی برس تک یورپ میں مکینیکل انجنیری کی تعلیم پائی، مگر اب انشورنس ایجنٹ ہیں۔ غرض ایسی افسوسناک مثالیں کتنی ہی مل سکتی ہیں۔ شاید اس کا جزوی سبب یہ بھی ہو کہ اُن ماہرین کو صحیح قسم کی تعلیم نہیں ملی۔ لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ کارخانوں کی تعداد اور ان کی ضروریات کے مقابلہ میں ہمارے ملک میں ماہرین صنعت کی بہتات ہے۔ جس کا واضح ثبوت یہ ہے کہ ان کی قیمت بازاری یعنی (MARKET VALUE) برابر گرتی جاتی ہے۔

لہٰذا ان کی تعداد میں اضافہ کرنے کے لئے کثیر رقوم صرف کرنا کوئی دانشمندانہ فعل نہو گا۔ برخلاف اس کے آپ شاذونادر ہی پائیں گے کہ کوئی دستکار بے روزگاری کا شکار ہو یا اس کام کو چھوڑنے پر مجبور ہوا ہو جسکی اس نے فنی تربیت حاصل کر لی ہو۔ یہ بھی قابل غور ہے کہ یہ حالت اس صورت میں ہے جبکہ دستکاریاں اپنی اندرونی خرابیوں اور فقدان تنظیم کے سبب سے زوال کی حالت میں ہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ اگر ہم اپنے نوجوانوں کو موزوں قسم کی دستکاریاں سکھا کر انھیں صحیح اصول پر منظم کر دیں تو اوسط طبقہ سے بیکاری اور افلاس ایک معقول حد تک دُور ہو سکتا ہے۔

یہ سچ ہے کہ بعض دستکاریوں کے لئے حکومت نے اسکول قایم کر دئے ہیں۔ لیکن اول تو یہ ضرورت کے لحاظ سے بالکل ناکافی ہیں۔ دوسرے یہ بھی تجویز ہو رہی ہے کہ ان کو تخفیف کر کے ایسے ادارے قایم کرئے جائیں۔ جن کے چلانے کی ذمہ دار غیر سرکاری افراد یا انجمنیں اپنے ذمہ لے لیں۔ اور حکومت اُن کو مالی امداد دیتی رہے۔ حقیقتاً اگر ضروری آسانیاں میسر ہوں اور معقول امداد ملتی رہے تو یہ بہتر ہو گا کہ صنعتی مدارس کو تجارتی اصول پر چلانے کی کوشش کیجائے تاکہ طلبا کو تعلیم کے علاوہ تجارت کا عملی تجربہ بھی حاصل کرنے کا موقع ملے۔

آجکل جب کہ ہمارے نظام تعلیم میں رد و بدل کی اسکیم در پیش ہے ہمکو منتخب مقامات پر موزوں قسم کی دستکاریوں کے مدارس کھلوانے کا انتظام کرنا چاہیئے۔ تاکہ منظم کوشش کے ذریعہ سے ہم زیادہ سے زیادہ مدارس جاری کرا کے اُن کے قیام کا مستقل انتظام کرا سکیں۔ بہتر ہو اگر ہر صوبہ میں ان پر واقف کار اشخاص کی ایک کمیٹی مرتب کر دی جائے جو اس کام میں حقیقی دلچسپی لینے کو

تیار ہو تاکہ وہ ایک معینہ مدت کے اندر مختلف ترقی پذیر صنعتوں اور ان کے مرکزوں کو منتخب کر کے ایک مفصل اسکیم پیش کر دیں۔ اور مختلف شعبوں کے لئے مختلف مقامات تجویز کرنا ہونگے۔ ہر صنعت اسی مقام پر سکھلائی جائے۔ جہاں اس کے واسطے خاص سہولتیں میسر ہوں۔ اور کام سیکھنے والے بھی عموماً انھیں مقامات کے ہوں، تاکہ تربیت پانے کے بعد وہ اپنے ہی وطن میں معاش پیدا کر سکیں۔

پچھلے اجلاس میں ایجوکیشنل کانفرنس علیگڈھ میں اس کے متعلق میں نے ایک رزولیوشن بھی پیش کیا تھا، کہ اگر اس تجویز پر خاطر خواہ طریقے سے عملدرآمد کیا گیا تو اس سے مسلمانوں کی اہم ترین تعلیمی ضرورت پوری ہو جائے گی اور انکی اقتصادی مشکلات کے دور کرنے کی صحیح تدبیر ہو جائیگی۔

انگلستان کے جارج نامی بادشاہ

ملک معظم ہز مجسٹی جارج ششم سے پہلے انگلستان میں جارج نام کے پانچ اور بادشاہ ہو چکے ہیں:۔

نام	سال ولادت	سنہ جلوس	سال وفات
(۱) جارج اوّل	سنہ ۱۶۶۰ء	سنہ ۱۷۱۴ء	سنہ ۱۷۲۷ء
(۲) جارج دوم	سنہ ۱۶۸۳ء	سنہ ۱۷۲۷ء	سنہ ۱۷۶۰ء
(۳) جارج سوم	سنہ ۱۷۳۸ء	سنہ ۱۷۶۱ء	سنہ ۱۸۲۰ء
(۴) جارج چہارم	سنہ ۱۰۶۲ء	سنہ ۱۸۲۱ء	سنہ ۱۸۳۰ء
(۵) جارج پنجم	سنہ ۱۸۶۵ء	سنہ ۱۹۱۱ء	سنہ ۱۹۳۶ء

شاہی خاندان کے بڑے بوڑھے

اس وقت شاہی خاندان کے بڑے بوڑھوں میں سب سے بزرگ شاہ ایڈورڈ ہفتم کے برادر خورد ڈیوک آف کناٹ اور انکی دو بہنیں شاہزادی لوئیسی اور شہزادی بیٹرس زندہ ہیں۔ انمیں شاہزادی لوئیسی کی ولادت سنہ ۱۸۴۸ء میں ہوئی تھی انکی شادی سنہ ۱۸۷۱ء میں مارکوئس آف لورنے سے ہوئی تھی جنکو بعد میں ڈیوک آف ہرگائل کا خطاب دیا گیا تھا۔ شوہر کے انتقال کے بعد شہزادی ممدوحہ کینگسٹن میں گوشہ نشینی کی زندگی بسر کر رہی ہیں لیکن اپنے ملک کے سیاسی امور میں دلچسپی لیتی رہتی ہیں۔ شہزادی بیٹرس اپنی بڑی بہن سے نو سال چھوٹی ہیں انکی شادی ایک جرمن شہزادہ ہنری سے ہوئی تھی لیکن شادی کو دس سال ہی گذرے تھے کہ انکے شوہر کا انتقال ہو گیا اور انکا بیٹا شہزادہ مورالس ایک لڑائی میں مارا گیا۔ انکی بیٹی شہزادی اینا ہسپانیہ کے بادشاہ سے بیاہی گئی تھیں لیکن ان کے تعلقات شوہر سے کبھی خوشگوار نہ رہے اسلئے وہ اس وقت تنہائی کی زندگی بسر کر رہی ہیں۔ ان دونوں شہزادیوں کو پارلیمنٹ کی تجویز کے بموجب تیس تیس ہزار پونڈ جہیز میں ملے تھے اور چھ چھ ہزار پونڈ سالانہ وظیفہ مقرر ہوا تھا۔ شاہ جارج پنجم کی تینوں بہنوں میں سے اس وقت صرف ناروے کی ملکہ زندہ ہیں۔

خود کُشی

(از عزیزی پربھان شنکر چودھری خلف حضرت رواںؔ مرحوم)

ذیل کی نظم اردو کے نامور شاعر اور ہمارے مرحوم دوست چودھری جگت موہن لال صاحب رواںؔ کے فرزند اکبر عزیزی پربھان شنکر جی کی فکر رسا کا نتیجہ ہے۔ گو کہ یہ نظم عزیز موصوف کی ابتدائی نظموں میں ہے تاہم اس میں رواںؔ مرحوم کی تمام خصوصیات کی جھلک نمایاں ہے، اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔ (ایڈیٹر)

سرنگوں بیٹھا ہوا ہے دیر سے محوِ خیال ۔۔۔ اِک جواں خوش رنگ و خوشخو عمر جسکی بیس سال

ابرووں پر بل شکن ماتھے پہ، بکھرے سر کے بال ۔۔۔ دل بدست و جاں بلب سودا بہ سر آشفتہ حال

وقفِ آلام و مصائب، رہنِ صد رنج و محن ۔۔۔ تن کی عریانی لباس بے بہا پر خندہ زن

راز دارِ مہر و الفت، کشتۂ عہدِ وفا ۔۔۔ ٹھنڈی سانسوں میں پروتا ہے گہر بیٹھا ہوا

عشق کی زنجیر میں جکڑا ہوا گردن میں طوق ۔۔۔ ہر قدم پر جادۂ الفت میں مٹ جانے کا ذوق

کیفِ غم چھایا ہوا چہرہ پہ آنکھیں شعلہ بار ۔۔۔ توڑ کر دل کو نکل آتے ہیں نالے بار بار

دل ہی دل میں کہہ رہا ہے حالِ قلبِ دردمند ۔۔۔ آنکھ میں آنسو کے قطرے اور لب سختی سے بند

اشک پیتا ہے کبھی آنسو بہاتا ہے کبھی ۔۔۔ غم کا مارا اپنے ہونٹوں کو چباتا ہے کبھی

گر پڑا ہاتھوں سے دامانِ تحمل چھوٹ کر ۔۔۔ دل پہ وہ صدمہ اٹھایا رہ گیا دل ٹوٹ کر

پچھلی باتوں کا تصور اپنی حالت کا خیال ۔۔۔ اور وہ انجامِ الفت دوستداری کا مآل

سحر آگیں مستیاں وہ جام الفت کا خمار ۔۔۔ وہ ادائے دلربا و دل نواز و دل شکار

وہ نگاہ بے محابا وہ شباب بے پناہ ۔۔۔ جس کے آگے خود فرشتوں کا تقدس ہو تباہ

یاد آتا ہے وہ اگلا ربطِ سوز و ساز کا ۔۔۔ دلفروشی کا سماں، عالم نیاز و ناز کا

سخت جاں فرسا ہے موجودہ شعارِ زندگی ۔۔۔ اس پہ طرّہ بے زری سرمایۂ شرمندگی

اب کوئی ہمدرد ہے اس کا نہ کوئی راز دار ۔۔۔ دل کو تنہائی کی گھڑیاں کر رہی ہیں بیقرار

زخمِ دل پکسے ہوئے اور آرزوئیں پائمال ۔۔۔ کیسا ذکرِ چارہ سازی، کیسی فکرِ اندمال

آج دنیا میں شریکِ درد و غم کوئی نہیں ۔۔۔ دستگیرِ کشتۂ رنج و الم کوئی نہیں

کوندتی تھیں بجلیاں کل جسکے ہنگامِ بیاں
سرنگوں بیٹھا ہوا ہے آج وہ آتش بجاں

اب وہ یارائے تکلم وہ توانائی کہاں
اب کہاں وہ جوشِ مستی اب وہ خودرائی کہاں

پاسِ خودداری نہ حفظِ آبرو کا کچھ خیال
دوسروں کے سامنے پھیلا ہوا دستِ سوال

رعشہ براندام، چہرہ پُرشکن، اور سر کھلا
پابرہنہ، جسم عُریاں، آنسوؤں کا در کھلا

مالک و مختارِ کل تک آج سرگرمِ فغاں
الاماں تاثیرِ برگشتہ مقدر الاماں

گل تھا محویت کا عالم اور بزمِ گلعذار
آج ہیں فرقت کی گھڑیاں اور دردِ ہجرِ یار

کل بھرا تھا دامنِ دل گوہرِ مقصود سے
آج عنقا ہے مسرت چشمِ اشک آلود سے

کل تھی شامِ وصل، لٹتی تھی جوانی کی بہار
آج بربادی اسے ٹھکرا رہی ہے بار بار

کل تھی خوش بختی نگہبانِ بہارِ زندگی
آج بدبختی ہے وجہِ انتشارِ زندگی

چند ساعت سوچتا بیٹھا رہا وہ خوش جمال
مقصدِ نیرنگِ ہستی، شادمانی کا مآل

رازِ پیمانِ محبت، سرِ جانِ آرزو
حاصلِ عمر و نظامِ دلنشانِ رنگ و بُو

آخرکار اُس کے دل نے یہ دیا اس کو جواب
اِک طلسمی کارخانہ ہے یہ دنیائے خراب

گلشنِ ہستی ہے فانی، باغِ عالم خارزار
کلفت و آلام انجامِ حیاتِ مستعار

شادمانی نقشِ باطل، زندگانی بے ثبات
بر سرِ موجِ ہوا ہے کل اساسِ کائنات

چلتی پھرتی چھاؤں ہے یہ محفلِ عیش و نشاط
یہ سرود و رقص، یہ بزمِ سرور و انبساط

مُلہمِ غیبی نے جس دم کر دیا یوں راز فاش
ٹکڑے ٹکڑے دل ہوا، اس کا کلیجہ پاش پاش

دل کے ہر گوشے پہ مایوسی کے بادل چھا گئے
خون میں ڈوبے ہوئے آنسو مژہ پہ آ گئے

نوکِ نشتر بن کے سینہ میں سمائی دل کی بات
تھرتھرائے لب بڑھا شمشیر کے قبضے پہ ہات

برق سی تڑپی یکایک سینۂ صد چاک پر
دم زدن میں لوٹتا پھرتا تھا قالب خاک پر

یوں سمائی دل میں وہ دل کے پھپھولے پھوڑ کر
جیسے بجلی پار ہو جائے شفق کو توڑ کر

دفعتہً اک آہ نکلی، دل کی حرکت رُک گئی
ایک ہچکی لب تک آئی اور گردن جھک گئی

رنگِ دنیا دیکھنے والو، ادھر بھی اِک نظر
دیکھ لو آنکھوں سے انجامِ محبت کا اثر

جوشِ فطرت اور تقاضائے محبت دیکھ لو
آئینہ خانہ میں دل کے نقشِ الفت دیکھ لو

داغِ دل کوئی زمانے میں مٹا سکتا نہیں
رنگِ الفت جامۂ ہستی سے جا سکتا نہیں

دلکی یہ بندش قیامت تک ہمیں تڑپائیگی
حیف یہ بیڑی کبھی کاٹے نہ کاٹی جائیگی

شاعری

سید محمد باقر شمس لکھنوی

شمس العلما مولوی محمد حسین آزاد کا اسلوب تحریر اردو زبان کا ایک حیرت انگیز کارنامہ ہے جسکی تقلید انتہائی دشوار ہے۔ وہ اکثر بیجان چیزوں کو جاندار بلکہ انسان فرض کرکے ان کے خصوصیات بیان کرتے ہیں۔ اور اس طرح حقیقت میں افسانہ کی دلکشی پیدا کر دیتے ہیں۔ ذیل کا مضمون انھیں کے ایک مضمون (جھوٹ اور سچ کا رزم نامہ) کو پیش نظر رکھکر لکھا گیا ہے۔ ناظرین زمانہ کے تفنن طبع کے لئے ہم اسے شکریہ کے ساتھ درج ذیل کرتے ہیں۔ ایڈیٹر

شاعری شاہ طبع کی بیٹی ہے جو ملکۂ فطرت کے پیٹ سے پیدا ہوئی، اس کا پیدا ہونا تھا کہ گانے والوں کی مرادیں بر آئیں۔ قوالوں نے محفلیں جمائیں۔ دن عید رات شب برات ہو گئی۔ ہر طرف خوشی کے شادیانے بجنے لگے۔ شاہ طبع نے دیکھا کہ جب سے یہ مبارک قدم آئی ہے گھر کی رونق، دربار کی زینت، دل کے بہلاوے کا سب سامان ساتھ لائی ہے، تو بہت آؤ بھگت کی۔ اہل شعور کے مشورہ سے "شاعری" نام رکھا۔ محاکات اور تخیل دو انائیں دودھ پلانے پر مقرر کیں۔ جب ذرا ہاتھ پاؤں سنبھالے تو نک سک سے خوبصورت نکلی۔ اعضا میں بلا کا تناسب۔ نگاہوں میں غضب کا جادو۔ باتوں میں قیامت کا اثر۔ بادشاہ بھی اسکو بہت چاہنے لگا۔ رفتہ رفتہ یہ نوبت پہونچی کہ دم بھر کی مفارقت کی تاب نہ رہی۔ فکر دور اندیش کو حکم ہوا کہ روز اپنی گود میں لے کے دربار میں آیا کرے جب دربار میں آنے کی نوبت آئی تو جذبات نے کپڑے پہنائے۔ سادگی نے نہلائے اور فکر اپنی گود میں لیکے روز دربار میں آنے لگی۔ بادشاہ اور اہل دربار اس کی سحر آفرین باتوں سے خوش ہونے لگے ہر دل میں اس نے گھر کر لیا۔ اس کی باتیں ایسی پیاری ہوتی تھیں کہ سب کا دل موہ لیتی تھیں۔ جب یہ دربار میں بولنے لگتی تو سنناٹا عالم کان لگا کے سنتا، سکوت محو ہو جاتا۔ دل مزے لوٹتا۔ یہ کچھ اور بڑھی تو ایسی عقل کی تیز فطرت کی آزاد، طبیعت کی بیباک نکلی کہ ہر صحبت میں بے دھڑک پہونچنے لگی۔ اور جیسا موقع دیکھتی ویسی باتیں کرنے لگتی۔ جس محفل میں نکل جاتی اُسی میں گھل مل جاتی۔ تجرد کے گوشے میں صوفیوں کے پاس جاتی تو مجذوبانہ بڑ ہانکنے لگتی لڑائی کے میدان میں بہادروں کے پاس آتی تو رجز خوانی کرنے لگتی

رندوں کی محفل میں جاکر شراب و کباب کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیتی۔ شاہد پرستوں کی صحبت میں آ کے معشوقوں کے حسن و جمال غنجۂ و دلال کی تعریف میں لٹکے باندھ کے اور آگ میں آگ لگا دیتی۔ غم کی مجلس میں آتی تو ایسی باتیں سناتی کہ ساری مجلس میں پٹیس پڑ جاتی۔ غرض ایسی تہذیب آموختہ اور صحبت یافتہ نکلی کہ جہاں پہونچ جاتی اللہ عزیز ہو جاتی۔ کچھ اور بڑھی تو شادی کی فکر ہوئی بَرکی تلاش ہونے لگی۔ آخر شہزادہ مذاق سلیم سے بات طے پائی۔ یہ شہزادہ بھی اسی کے قابل تھا۔ صورت، شکل، لیاقت، بات چیت میں اپنا مثل نہ رکھتا تھا۔ سنجیدگی نے اسکو دودھ پلایا تھا۔ متانت نے جھولا جھولایا تھا۔ تہذیب نے تعلیم دی تھی۔ اعتدال اتالیق تھا۔ دربار میں بیٹھتا تو بردباری مسند بچھاتی۔ شگفتگی ...صبنانی کرتی۔ عقل، وقار، حلم، ظرافت اس کے وزیر خاص تھے اس نسبت کو لوگوں نے بہت پسند کیا۔ معلوم ہوتا تھا کہ قدرت نے مذاق سلیم کو شاعری کے لئے اور شاعری کو مذاق سلیم کے لئے پیدا کیا تھا۔

طرفین میں شادی کے سامان ہونے لگے۔ ملک ملک کا آدمی برات میں بلایا گیا۔ برات سجی گئی۔ براتیوں میں ایک طرف شیکسپیر۔ ملٹن۔ ہومر۔ ورجل ہیٹ لگائے کوٹ پتلون پہنے چرمر کرتے چلے جاتے ہیں۔ تو ایک طرف کالیداس۔ والمیک۔ ویاس۔ سر پر جٹا جسم پر بھبھوت ملے دھوتی باندھے، کھڑاؤں پہنے دو گز کا دسپنا ہاتھ میں لئے کھٹ پٹ کرتے چلے جا رہے ہیں۔ ایک طرف مہلہل، امراء القیس۔ فرزدق۔ متنبی۔ جفیا عگال۔ برسر قبائے عربی در بر نعلین پہنے عصا ہاتھ میں لئے چلے جاتے ہیں۔ ایک طرف فردوسی۔ انوری۔ سعدی۔ حافظ عرفی۔ قاآنی عجمی سج دھج دکھا رہے ہیں ایک طرف میر درد۔ سودا۔ سوز۔ مومن۔ آتش۔ ناسخ۔ ذوق۔ غالب۔ انیس۔ دبیر۔ تعشق، جاوید ہیں۔ ان لوگوں میں کوئی تو سولہ گز کا جامہ اوپر پٹکا بندھا ہوا۔ سر پر کھڑکی دار پگڑی، پاؤں میں گھیتلا جوتا پہنے ہے تو کوئی چوگوشیہ ٹوپی، گھٹنوں تک کا کرتا۔ مشرو کا پاجامہ، کامدار جوتا، تو کوئی نکے دار ٹوپی، انگرکھا مشرو کا پاجامہ پہنے ہوئے۔ غرض ہر وضع ہر مذہب ہر ملک کا آدمی براتی ہے۔ یہ لوگ مذاق سلیم کو دولھا بنا کے دلہن کے گھر پہونچے اور شاعری کو بیاہ کے لائے۔ معانی کا ملک الفاظ کا خزانہ جہیز میں دیا گیا۔

شاعری مذاق سلیم کے گھر میں آئی تو اور چار چاند لگ گئے۔ روز بروز اس کا حسن بڑھتا گیا۔ مذاق سلیم شہزادہ بھی اس کا تماشئی زار بن گیا۔ اس کے بغیر ایک منٹ قرار نہ لیتا۔ جب اس کی آرائش کی فکر ہوئی طرح طرح کے زیور بننے لگے۔ پیش خدمتیں نوکر رکھی گئیں شستگی نہلاتی تھی۔ صفائی کنگھی

کرتی تھی۔ جدت کپڑے بدلتی تھی۔ سادگی سرمہ لگاتی تھی۔ شوخی افشاں چھڑکتی تھی۔ نزاکت پٹیاں بناتی تھی۔ شیرینی مسی لگاتی تھی۔ صنعتیں زیور پہناتی تھیں۔ دونوں میں عشق و محبت روز بروز بڑھتی گئی۔ اور ایک کو دوسرے کی مفارقت گوارا نہوئی تو دربار میں لانے کی ٹھیری۔ تشبیہ نے جالی کی نقاب چہرے پر لگائی۔ استعارے نے چادر اڑھائی، کنایہ کے پردے پیچھے دلھن کیطرح جا کے بیٹھی تو دربار کی رونق اور بڑھی۔

کچھ دنوں بعد اس کے یہاں ایک لڑکی پیدا ہوئی اس کا نام غزل رکھا گیا۔ ماں کی بیشتر خدمتیں شوخی، سادگی، جدت، نزاکت، تشبیہ، استعارے، صنعتیں۔ اس کی بھی خدمت کرنے لگیں۔ چند ہی روز میں یہ لڑکی ماں کی طرح تیز، طرار، شوخ، چالاک، حسین، بے باک نکلی۔ اس کی پرورش و پرداخت کے لئے سعدی۔ حافظ۔ میر۔ غالب۔ آتش۔ تعشق۔ جاوید مقرر ہوئے۔ ابھی یہ لڑکی اچھی طرح جوان نہ ہوئی تھی کہ اس کے یہاں بھائی پیدا ہوا۔ اس کا نام قصیدہ رکھا گیا۔ یہ لڑکا صورت شکل سے بڑا ہونہار معلوم ہوتا تھا۔ تاڑنے والوں نے تاڑ لیا کہ اس کے قدم کی برکت سے آسمان سے ہُن برسے گا۔ یہ لڑکا صورت کا وجیہ طبیعت کا متین، دل کا مضبوط جسم کا ٹھوس نکلا۔ اس لئے کہ جزالت کے دودھ سے اس کی پرورش ہوئی تھی۔ لیکن خوشامد کا برا رگ اُس کی صحبت کو خراب کئے رہتا تھا۔ خاقانی۔ انوری۔ عرفی۔ قاآنی۔ سودا۔ مومن۔ ذوق۔ غالب۔ منیر اس کی پرورش کے لئے مقرر ہوئے۔ کچھ دنوں بعد اس کے (شاعری) یہاں ایک لڑکی اور پیدا ہوئی۔ اس کا نام مثنوی رکھا گیا۔ یہ لڑکی بڑی لمبی تڑنگی تھی۔ اور چونکہ گھر میں سب کے بعد پیدا ہوئی تھی۔ اس لئے ماں، باپ بھائی، بہن سب کی دلاری سب نے اس کی پرورش و پرداخت میں حصہ لیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ گھر میں جتنے لوگ تھے۔ سب کی خو بو اس میں آگئی۔ لیکن تعلیم و تربیت کیلئے کوئی نہ ملتا تھا۔ ہر طرف ڈھونڈھیا مچی۔ صرف چار آدمی ہاتھ آئے۔ ایران سے فردوسی۔ نظامی۔ اور ہندوستان سے میرحسن اور پنڈت دیاشنکر نسیم بلائے گئے۔ کبھی کبھی آفتاب الدولہ قلق بھی پہونچ جاتے تھے۔ ان لوگوں نے اپنی لیاقت کے ثبوت میں پینے ٹیک دیے۔ اس کے بعد شاعری کے یہاں اور بھی اولادیں ہوئیں۔ لڑکیوں میں رباعی۔ لڑکوں میں قطعہ۔ ترکیب بند۔ ترجیع بند۔ مخمس وغیرہ ان کے لیے مناسب مربیوں کی تلاش ہوئی۔ ترکیب بند اور ترجیع بند کے لیے تو کوئی ملا ہی نہیں۔ ہاں رباعی کے لیے عمر خیام اور قطعہ کے لئے ابن یمین کی تجویز ہوئی۔ ان لوگوں نے خاطر خواہ تربیت کی آخر میں ایک لڑکا پیدا ہوا اس کا نام مرثیہ رکھا گیا۔ یہ لڑکا اپنے بھائی بہنوں میں سب سے بڑھ چڑھ کر نکلا

سب کی اچھی اچھی خصلتیں اس نے لے لیں - اور ہر ایک کو اپنی طبیعت میں سمولیا - خوش قسمتی سے اس کو تربیت کرنے والے بھی اچھے ملگئے - ایرانیوں میں محتشم - مقبل - وصال اور ہندوستانیوں میں انیس - دبیر - ان لوگوں نے اسپر بڑی ریاضت کی اور خوب تربیت دیا - شاعری اپنا ہرا بھرا باغ دیکھ کر پھولوں نہ سماتی تھی - لیکن زمانہ کسی کو چین سے نہیں بیٹھنے دیتا - قضاء کار اس پر بدمذاقی کے بھوت کا سایہ ہو گیا - جو کبھی کبھی اس کو اٹھالے جاتا ہے -

یہ بھوت ایک بدصورت ڈراونی صورت رکھتا ہے - دو دو گز کے بلیے ہاتھ امرود کے برابر سر، اس میں ناک کان آنکھ اس طرح جیسے بلبلوں نے ٹھونگیں ماری ہیں یا گلہری نے کھترا ہے - گردن اتنی موٹی کہ سر اسپر ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے گنبد پر گیند، بٹیر کی طرح کا سینہ، مٹکا سا پیٹ اس میں پالے کی طرح گوسلے لگے ہوئے - ان میں بھی ایک بڑا ایک چھوٹا، انھیں کولوں میں ایک ایک ہاتھ کے برابر پیر، ان میں ہاتھ ہاتھ بھر کی انگلیاں - اسپر قد اتنا لمبا کہ تاڑ کا درخت شانوں سے آگے نہیں بڑھتا - کالا رنگ، آنکھوں سے کیچڑ نتھنوں سے ناک منہ سے رال بہتی ہوئی دانتوں میں پھپھوندی بھری - منہ سے بدبو آتی ہوئی -

افراط اس کا باپ ہے - تفریط اس کی ماں ہے - بے اعتدالی نے اس کو دودھ پلایا ہے بےسلیقگی نے پرورش کیا ہے - پھوہڑپنے نے تعلیم دی ہے - بےتمیزی کی غذا کھاتا ہے، اور بدمزاجی کے ویرانے میں رہتا ہے - جب یہ شاعری ایسی پری پیکر نازک اندام کو اٹھالیجاتا ہے تو اس بیچاری پر کیا بیتتی ہوگی - اس کا اندازہ نہیں ہو سکتا - چاہت میں تو یہ مذاق سلیم شہزادے سے کم نہیں مگر اس کی صورت دیکھ کے شاعری کو تپ چڑھ آتی ہے - یہ بہت خاطر و مدارات کرنا چاہتا ہے - اور چاہتا ہے کہ جس طرح یہ مذاق سلیم کے گھر میں چونچال رہتی ہے اسی طرح یہاں بھی رہے، اسی لئے اس کی دیکھا دیکھی اس نے بھی ویسی ہی بیش خدمتیں اور بعینہ ویسے ہی سامان آرائش مہیا کئے ہیں - لیکن سب کی سب بدسلیقہ اور بدتمیز ہیں - افشاں چھڑکنے پر آتی ہیں تو اتنی چھڑک دیتی ہیں کہ سارا منہ لپ جاتا ہے - زیور پہنانے بیٹھتی ہیں تو زیادہ اور بھدے کہ سارا جسم چھپ جاتا ہے - اور وہ بھی اس بے ڈھنگے پن سے کہ گوشواروں کی جگہ نتھ اور بلاق - نتھ اور بلاق کی جگہ بندے، جھانجھ اور چھڑے گلے میں، طوق و ہنسلی پیروں میں، غرض جو بات ہے وہ بے ڈھنگے پن کی - اور اس کے اصلی حسن کو غارت کئے ہوئے ہے - اس کی اولادوں کے ساتھ بھی اس نے یہی سلوک کیا ہے - ایسے ہی موٹے بھدے زیور بنوا ئے ہیں اور بلا امتیاز تذکیر و تانیث

ایک طرح کے زیور ایک طرح کے کپڑے پہنا دیتا ہے۔ سب کے افشاں تھوپ دیتا ہے اگر سب کو ایک جگہ بٹھا دیا جائے تو ایک کو دوسرے سے تمیز نہیں کر سکتے۔

اللہ شاعری کے حال پر رحم کرے اور اس مہلک بہوت کے پھندے سے اُس کو چھٹکارا دے۔

زمانہ تیس سال پہلے

زمانہ مئی ۱۹۰۷ء میں منشی نوبت رائے صاحب نظر لکھنوی کی یہ غزل شائع ہوئی تھی۔ ناظرین کے تفنن طبع کے لئے ہم اسے درج ذیل کرکے مرحوم کے علمی احسانات کی یاد تازہ کر رہے ہیں۔ (ا۔ ز)

اہل دل کو سرزمین عشق میں راحت نہیں
اک بلائے آسمانی ہے غم الفت نہیں

حسن دلکش میں وہ جادو ہے کہ اُسکے عشق میں
دیکھتے ہیں لوگ مجھکو اور کوئی عبرت نہیں

سر اُٹھایا بعد مُردن بھی یہ سوزِ عشق نے
آبلہ دل میں زمیں کے ہے مری تربت نہیں

نزع میں اسکے تصور سے ہے کچھ راز و نیاز
قابضِ ارواح سے کہدو ابھی فرصت نہیں

آدمی سے کہہ رہی ہے آمد و رفتِ نفس
زندگی کی کشمکش میں کوئی دم راحت نہیں

آپ اور یوں اہل دل میں گفتگوئے حسن و عشق
حضرتِ واعظ یہ بحثِ معنی و صورت نہیں

بیچ سے اُٹھے جو یہ پردہ تو حاصل ہو وصال
مجھ میں اُن میں حدِ فاصل ہے شبِ فرقت نہیں

دیکھئے انداز اپنے بندہ پرور وصل میں
پھر نہ کہیئے گا کہ انساں سے مجھے وحشت نہیں

اور کیا ہو مجھ سے واعظ تیری باتوں کا جواب
حیف اُس دل پر جو مستِ بادۂ الفت نہیں

ہو نمک پاشِ جراحت گر خدا توفیق دے
یوں جفاؤں میں تری قاتل کوئی لذت نہیں

کاروبارِ سلطنت ہیں انتظامِ وصل و ہجر
رات دن میں دو گھڑی کی بھی ہمیں فرصت نہیں

اُن کے غصے کی ادائیں گو بہت ہیں دلفریب
آنکھ اُٹھا کر اُس طرف دیکھوں نظر ہمت نہیں

بہارِ حسن

(از حضرت سالک کانپوری)

(۱)

ہوگیا ہے معتدل پھر مزاجِ روزگار پھر زمین پر بچھا ہوا ہے فرشِ زرنگار
پھر تخیلات کی بہ رہی ہے جوئبار پھر بہارا حُسن ہے خندہ ریز و نغمہ بار
آگئی ہے پھر بہار! اب بھی تم نہ آؤ گے؟

(۲)

رشکِ لالہ زار ہے کوہ کا دمن دمن ہو رہا ہے رو کشِ بہارِ خلد پھر چمن
غنچے مسکراتے ہیں بلبلیں ہیں نغمہ زن رقص میں نسیم ہے، انجمن بہ انجمن
جانِ من بہارِ من، اب بھی تم نہ آؤ گے؟

(۳)

گھر رہے ہیں پھر مسرتوں کے ابر چارسُو ہلکی ہلکی بارشیں ہو رہی ہیں کو بہ کو
جذب ہائے دل میں پھر آئی خواہش نمو تم کو سب سے پوچھتی ہے میری چشمِ جستجو
کیفِ عشق و آرزو، اب بھی تم نہ آؤ گے؟

(۴)

سر پہ پھر جنونِ حسن آجکل سوار ہے لڑکھڑا رہی چال آنکھوں میں خمار ہے
کس قدر سرور ہے، کس قدر نکھار ہے پر مسرتوں کا صرف تم پہ انحصار ہے
رُت بھی خوشگوار ہے، اب بھی تم نہ آؤ گے؟

(۵)

دامنِ نسیمِ صبحگاہ لالہ ریز ہے
عرش مشکبار ہے، فرش عطر بیز ہے
شاخِ آشیاں پہ عندلیب شعلہ ریز ہے
اندرونِ سینہ ایک شورِ حشر خیز ہے
دل کی آگ تیز ہے، اب بھی تم نہ آؤ گے؟

(۶)

جب سے تم گئے بدیس، آج تک خبر نہ لی
آتشِ فراق میں جان کس قدر جلی
اب خزاں گذر گئی، دیکھو سرسوں پھر پھلی
آگئی بسنت رُت کھل گئی کلی کلی
مدھ بھری ہوا چلی، اب بھی تم نہ آؤ گے؟

رُباعیاتِ فراق

(از حضرت فراق ایم۔ اے)

ہر سمت خوشی کا سماں ہوتا ہے
عالم ہے کہ بیہوش پڑا سوتا ہے
اے دوست مگر رات کے سنّاٹے میں
لے لے کے مرا نام کوئی روتا ہے

ہم ہیں کہ ہیں جھیلتے مصیبت بیٹھے
اور تم ہو کہ ڈھا رہے ہو آفت بیٹھے
ہم بیٹھیں اگر مسندِ گردوں نہ اُٹھے
تم اٹھو اگر ابھی قیامت بیٹھے

سونے والوں کو کیا جگاتی دنیا
افسانے تھے کون جو سناتی دنیا
دنیا کا بھرم کھلا، نہ پوچھو کیسے
جب آنکھ کھلی تو دیکھی جاتی دنیا

تنہا کب بعدِ مرگ بستر سے اُٹھا
اِک اور جنازہ بھی برابر سے اُٹھا
اُٹھا رسمِ وفا جہاں سے لے کر
بیمار ترا عجیب تیور سے اُٹھا

شیخ ولی اللہ محب

از مولوی سید احمد اللہ قادری - ایڈیٹر تاریخ

(۱)

رسالہ "زمانہ" بابت ماہ فروری ۱۹۳۷ء میں محمد یحییٰ صاحب تنہا بی - اے ایل ایل بی کا مضمون شیخ ولی اللہ محب نظر سے گزرا جس میں انہوں نے لکھا ہے کہ محب، مرزا رفیع سودا کے شاگرد رشید تھے لیکن یہ بیان صحیح نہیں ہے۔ محب، مرزا رفیع سودا کے شاگرد نہیں تھے، بلکہ شعر و سخن میں اُن کے متبع تھے چنانچہ محب کے معاصر اور اُردو کے نامور شاعر مصحفی نے اپنے "تذکرۂ ہندی" میں تحریر فرمایا ہے کہ "محب شعر میں سودا کے متبع اور ہم نشین ہیں"

شیخ ولی اللہ محب، متبع و ہم صحبت مرزا رفیع (تذکرۂ ہندی از مصحفی)

خود محب نے بھی اپنی ایک غزل میں سودا کی شاگردی سے انکار کیا ہے۔

شاگرد گو نہیں ہوں یہ اندازِ گفتگو
فیضانِ نطق مجھکو ہے مرزا رفیع کا

یحییٰ صاحب نے محب کی عمر اندازاً بہتر سال بیان کی ہے اور اس کے ساتھ یہ بھی تحریر کیا ہے کہ "ان کو محب کی تاریخ پیدائش اور وفات کا صحیح علم نہیں ہے۔ محب، ہدایت اللہ خاں ہدایت کے ہم عمر تھے یا دو چار سال چھوٹے تھے۔ اس لئے ان کا سنہ پیدائش ۱۱۴۲ھ ہے۔ قاسم کے تذکرے کی تصنیف کے وقت محب لکھنؤ میں وفات پاچکے تھے، اسلئے تاریخ وفات اندازاً ۱۲۱۴ھ فرض کی جاتی ہے"

مندرجہ بالا قیاسات محمد یحییٰ صاحب کے ہیں۔

قدرت اللہ خاں قاسم کے تذکرۂ "مجموعہ نغز" سے واضح ہوتا ہے کہ تذکرۂ مجموعہ نغز کی تصنیف کے وقت محب مرچکے تھے تو اس بنا پر یحییٰ صاحب نے محب کا سنہ وفات ۱۲۱۴ھ قرار دیا ہے۔ لیکن یحییٰ صاحب کو معلوم ہونا چاہیئے کہ "مجموعہ نغز" ۱۲۲۱ھ کی تصنیف ہے تو ایسی صورت میں کس بنا، پر محب کا سنہ وفات ۱۲۱۴ھ تصور کیا گیا۔ اگر ۱۲۱۴ھ کی بجائے محب کا سنہ انتقال ۱۲۲۰ھ یا ۱۲۲۱ھ

قرار دیا جائے تو کیا یہ قیاس درست نہ ہوگا؟

میاں مصحفی کا تذکرۂ ہندی جو ۱۲۰۹ھ میں تمام ہوا۔ اور جس کی تالیف کا آغاز ۱۲۰۱ھ سے قبل ہو چکا تھا۔ اس میں مذکور ہے کہ محب نے دو سال قبل بعارضۂ "ناسور پا" انتقال کیا۔

دو سال است کہ بہ مرض مزمن ناسور پا، وداع جہان فانی کردہ۔ مرقدش در پیر جلیل است (تذکرۂ ہندی از مصحفی)

مصحفی کی مندرجہ بالا تحریر سے محمد یحیٰی صاحب کے اس مفروضہ کی، کہ محب نے ۱۲۱۴ھ میں انتقال کیا، تردید ہو جاتی ہے چونکہ مصحفی نے تذکرۂ ہندی کی تالیف کا کام ۱۲۰۱ھ سے قبل شروع کیا اور ۱۲۰۹ھ میں اس کو اختتام کو پہنچایا۔ اس اعتبار سے مصحفی کی مندرجہ عبارت کی، صحیح تاریخ کا تعین دشوار ہے۔ اگر اس عبارت کو ۱۲۰۹ھ سے متعلق کیا جائے تو ایسی صورت میں محب کا سنہ وفات ۱۲۰۷ھ برآمد ہوتا ہے۔ غرض یہ امر بھی مشتبہ ہے۔ مگر یہ یقینی ہے کہ محب نے ۱۲۰۱ھ کے بعد اور ۱۲۰۹ھ سے دو سال قبل اس دنیا سے کوچ کیا۔

اب رہا، محب کے سنہ ولادت کی صحت کا معاملہ۔ یہ سنہ وفات سے بھی بہت زیادہ مشکوک ہے۔

بہر حال مولوی محمد یحیٰی صاحب کے دور از کار قیاسات "دربارۂ ولادت و وفات محب، ناقابل پذیرائی ہیں مولانا یحیٰی کا مضمون زیر بحث (معہ کلام) قاسم کے "مجموعہ نغز" اور آزاد کے تذکرہ "آبحیات" سے ماخوذ ہے۔ کلام وغیرہ کے بارے میں جو اشارے ہیں وہ مولانا یحیٰی کے خاص ہیں۔

راقم الحروف نے آج سے آٹھ سال قبل "شیخ ولی اللہ محب" پر ایک مضمون رسالہ عالمگیر (لاہور) میں لکھا تھا جو اس کی اپریل و مئی ۱۹۲۵ھ کی متعدد اشاعت میں طبع ہوا ہے، اسمیں یہ حالات درج کیے گئے تھے

(۲)

شیخ ولی اللہ محب تخلص۔ بارہویں صدی ہجری کے آخر زمانہ میں گزرے ہیں۔ آباؤ اجداد علاقہ سرہند قصبہ انبالہ کے رہنے والے تھے۔ شاہ عالم بادشاہ کے زمانہ میں ہندوستان آئے اور ارباب کمال کی صحبتوں سے کسب سخن کیا۔ شاہی دربار میں رسائی پائی۔ دربار سلطانی سے انہیں خاص تعلق ہو گیا۔ قمر الدین منت[۵۱] میاں شکیبا[۵۲]۔ ثناء اللہ خاں فراق[۵۳]۔ میر قدرت اللہ قاسم[۵۴] ان کے ہمعصر تھے۔ یہی وہ زمانہ تھا کہ دہلی کا کوئی

---

[۵۱] ان کا سارا خاندان شاعر ہے۔ ہندوستان کے مشہور شاعر ممنون انہی کے فرزند تھے۔ دہلی میں انکی شاعری کا بڑا چرچا تھا۔ دیکھو گلشن بیخار صفحہ ۱۹۱

[۵۲] غلام حسین نام، شکیبا تخلص۔ میر تقی میر کے شاگرد تھے۔ دیکھو گلستان سخن صفحہ ۲۹۰۔

[۵۳] دہلی کے مشہور شاعر خواجہ میر درد کے خاص شاگرد۔ ان کا اردو شاعری میں بڑا پایہ ہے۔ دیکھو گلستان سخن صفحہ ۲۸۵ و گلشن بیخار صفحہ ۱۴۹۔

[۵۴] یہ بھی خواجہ صاحب کے تلامذہ سے ہیں دیکھو سخن شعرا صفحہ ۹۷۔

گھر ایسا نہ تھا۔ جہاں شعر و سخن کا چسکا نہ ہو۔ ہر گھر اور ہر مقام پر مجلس مشاعرہ منعقد رہتی تھی۔ چنانچہ یہ بھی ان محفلوں میں شریک ہوتے۔ دراصل اسی زمانہ سے ان کے کلام میں پختگی اور استادانہ شان آئی۔

اگرچہ محب کا شمار مشاہیر شعرا میں نہیں ہے، تاہم وہ اردو شاعری میں بلند پایہ ضرور رکھتے ہیں اور ایک قدیم اہل سخن ہونے کی حیثیت سے وہ دہلی کے ان مخصوص شعرا میں ہیں جنکی شخصیت مسلّم ہے۔

جس زمانہ میں میرحسن تذکرۂ شعرائے اردو کی تدوین میں مصروف تھے۔ یہ دہلی میں رہا کرتے تھے۔ یہی ایک ایسا تذکرہ ہے جس میں ان کے حالات زیادہ وضاحت اور تحقیق سے ملتے ہیں[۱]۔ ان کی وفات کے بعد جو تذکرے تصنیف ہوئے۔ اس میں ان کے جو حالات لکھے گئے ہیں۔ وہ بالکل اسی تذکرے کی نقل یا مسخ شدہ صورت ہیں۔ بعض تذکرہ نویسوں نے اس قدر بخل برتا ہے کہ صرف نام لکھ کر دو چار شعر انتخاب کر دئے ہیں اور اکثر ایسے بھی ہیں، جنھوں نے ان کا ذکر تک نہیں کیا۔ خاص کر ان کے زمانہ کا قریب ترین تذکرہ گلستان سخن ہے جس کو قادر بخش صابر نے تالیف کیا۔ اس میں بھی ان کا تذکرہ نظر نہیں آتا۔ گلشن بیخار[۲]۔ نغمۂ عندلیب[۳]۔ اور سخن شعرا[۴] نے بھی انکا سرسری حال لکھا ہے، اس سے ان کے حالات پر کچھ روشنی نہیں پڑتی۔ البتہ آزاد کے مشہور تذکرۂ آبحیات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دہلی کے رہنے والے اور سودا سے تلمذ تھا[۵]۔ نہیں معلوم مولانا آزاد کے اس بیان کا اصلی ماخذ کیا ہے؟ ان کا ایک شعر خود اس بات کو ظاہر کر رہا ہے کہ یہ پنجاب کے علاقہ انبالہ کے باشندے تھے۔

محبؔ ہندوستان زادوں کی گویائی کو کیا پہنچے
سخن کہنے میں ہو جس کا وطن سرہند و انبالہ

اس طرح تذکرہ نویسوں سے بڑی بڑی فردگزاشتیں ہوئی ہیں۔ مولانا آزاد اور مولوی کریم الدین کی تحقیق بہ نسبت اور مورخین کے زیادہ غنیمت ہے۔ مگر ان میں بھی اکثر جگہ خامیاں ہیں۔

مولانا آزاد نے ان کو سودا کا شاگرد لکھا ہے[۶]۔ دراصل ان کو سودا سے شاگردی کا تعلق نہ تھا بلکہ یہ

---

[۱] تذکرۂ شعرائے اردو از میرحسن صفحہ ۱۸۲

[۲] گلشن بیخار صفحہ ۱۷۰

[۳] نغمۂ عندلیب صفحہ ۲۰۹

[۴] سخن شعرا، صفحہ ۴۱۵

[۵] مصنف قاموس المشاہیر نے بھی ان کا سرسری حال لکھا ہے۔ دیکھو قاموس المشاہیر جلد دوم صفحہ ۱۷۶

[۶] آب حیات حاشیہ صفحہ ۲۴۱۔

یہ ان کے کلام کو ایک اُستادِ فن ہونے کی حیثیت سے قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔

شاگرد گو نہیں ہوں یہ انداز گفتگو — فیضان نطق مجھکو ہے مرزا رفیع کا

....

ریختے کے ملک کا سودا کو بخشا تو نے راج — اس نگر میں کون ایسا ناظم و ناسق ہوا

تو نے سنی ہے مصرعہ سودا سے وہ مثل — آوازہ دہل ہے خوشش آیند دور کا

اے محب خلق میں طوفاں ہو بقول سودا — پونچھ کر چشم کریں ہم جو فشارِ دامن

ہجر میں اس کے محب خوب بقول سودا — ہو گئی جان ہوا اک نفس سرد کے ساتھ

سودا کی مغفرت پہ یقین ہے کہ وہ محب — ورد زباں ہمیشہ رکھا تھا علی علی

محب شاہِ عالم بادشاہ کے درباری شاعر تھے، ان کو بادشاہ کے مزاج میں بڑا رسوخ حاصل تھا۔ دہلی میں صرف شعرا ہی مشاعرہ نہیں کرتے تھے، بلکہ امرا، ورؤسا نے بھی اس میں خاطرخواہ حصہ لیا۔[۱]

دہلی کے اور امراء کی طرح امین الدولہ معین الملک نواب ناصر جنگ بہادر کے پاس ہمیشہ مشاعرہ ہوا کرتا تھا جس میں شہر کے نامی گرامی شاعر جمع رہتے تھے، ایسے اہم اور خاص مشاعروں میں بادشاہ بھی خود اپنی غزلیں بھجوایا کرتا تھا۔ اسی مشاعرے میں انشاءاللہ خاں انشا نے برسرِ مشاعرہ مرزا عظیم بیگ عظیم کی غزل کے ایک شعر پر اعتراض کیا جس کا عظیم بیگ کو سخت رنج ہوا، اسی رات میں انہوں نے انشاء کی ہجو لکھی اور اس کو اپنے ایک دوست کے ہاتھ انشاء کے گھر بھجوایا۔ انشاء کو اس گستاخی کی تاب نہ رہی۔ انہوں نے فوراً بادشاہ سے شکایت کی اور کہا کہ حضور کی غزل پر لوگ ہنستے ہیں۔ اس کا یہ نتیجہ ہوا کہ بادشاہ نے جملہ مشاعروں میں غزل بھیجنی موقوف کر دی۔ یہ واقعہ جب شعرا کو معلوم ہوا تو سب کمر بستہ حاضر دربار ہوئے، اس موقع پر محب نے بادشاہ کے روبرو ذیل کی غزل پڑھی۔[۲]

---

[۱] تذکرہ شعرائے اُردو از کریم الدین صفحہ ۴۳

[۲] آبحیات صفحہ ۲۴۲ تا ۲۴۴ تذکرہ شعرائے اُردو از کریم الدین صفحہ ۴۴۳ و ۴۴۴۔

سر بر خط فرمان رہے تحریر کے آگے — ہو لال زباں واں میری تقریر کے آگے

دل ہے سو نگہ تیر کے ہے تیر کے آگے — سر ہے سو خمیدہ دم شمشیر کے آگے

تدبیر پڑی ٹھوکریں کھاتی رہی برسوں — یاں حضرت انساں تری تقدیر کے آگے

ہوتا ہے ہمیں محو خدائی کا بھی آداب — جا نکلے ہیں جب اس بت بے پیر کے آگے

شیطان جسے کہتے ہیں وا ے شیخ مذدر — پیچھے ہی رہے ہے تری تذدیر کے آگے

کیا معنے ہے آئینہ نہ پانی کی بصد رنگ — اس بوقلموں شوخ کی تصویر کے آگے

کس طرح نہ ہو سلسلہ زنجیر کا برپا — دیوانوں سے اس زلف گرہ گیر کے آگے

پیچھے ہی ہٹے عشق کی صولت سے تہمتن — گو رستمی اپنے سے وہ ہو تیر کے آگے

مجلس میں جھکے چاہیئے قصنیا شعرا کا — ایسے بھی کوئی صاحب توقیر کے آگے

یہ بھی کوئی دانش ہے کہ پہنچے یہ قضایا — اکبر تئیں یا شاہ جہانگیر کے آگے

نیزے پہ ہدف کرکے رکھیں ہم سر حاسد — تیر قلم اپنے کے سر تیر کے آگے

ہو رستم میدان سخن کے بھی ہمارا — اک مصرعۂ سو مصرعہ شمشیر کے آگے

جو عرض مطالب کرے مقصد ہی کو پہنچے — باصدق محب حضرت شبیرؑ کے آگے

مرزا سلیمان شکوہ دہلی کے شہزادے۔ حاتم و انشا کے شاگرد، غزل خوب کہا کرتے تھے[1]

محب جب سرہند سے دہلی آئے تو ابتدا میں شاہ عالم بادشاہ کے دربار میں توسل پیدا کیا۔ لیکن انشا کے مقابلہ میں انکو ہمیشہ شکست ہوتی رہی۔ ان وجوہ کے باعث مجبور ہوکر شہزادہ سلیمان کی سرکار کا رُخ کیا۔ اور شہزادے کی غزلوں کا بنانا انہی کے تفویض ہوا[2]۔ ایک مدت تک انہوں نے یہیں نوکری کی۔ جب شہزادے نے دہلی کی سکونت چھوڑ کر لکھنؤ کو دارالقیام قرار دیا تو انہوں نے بھی مجبوراً دہلی کو خیرباد کہا اور فرخ آباد پہنچکر نواب مہرباں خاں کی مصاحبت میں زندگی بسر کرنے لگے[3] جس وقت میر حسن نے تذکرہ شعرائے اُردو تمام کیا ہے[4]۔ اسوقت یہ فرخ آباد میں رہا کرتے تھے[5]

---

[1] گلشن بیخار صفحہ ۹۹ و گلستان سخن صفحہ ۲۶۸

[2] آبحیات صفحہ ۲۴۱۔ سخن شعرا صفحہ ۴۱۵۔ نغمۂ عندلیب صفحہ ۵۰۹۔ گلشن بیخار صفحہ ۶۷۰، اُردو، اورنگ آباد جلد، صفحہ ۲۶۱۔ تذکرہ شعرائے اُردو از کریم الدین صفحہ ۳۴۸۔ قاموس المشاہیر جلد ۲ صفحہ ۱۷۶

[3] تذکرہ میر حسن دہلوی صفحہ ۱۸۲

[4] میر حسن کا تذکرہ ۱۱۸۸ھ و ۱۱۹۲ھ کے مابین تالیف ہوا۔

[5] تذکرہ شعرائے اُردو از میر حسن صفحہ ۱۸۲

لیکن اس کے تھوڑے ہی عرصہ بعد یہاں سے لکھنؤ چلے آئے اور پھر شہزادہ کی سرکار میں ملازمت اختیار کرلی اور ان کے یہاں حسب سابق وظیفہ ملتا رہا۔

اس دفعہ لکھنؤ آنے کے بعد پھر کہیں نہیں گئے اور یہیں انتقال کرکے پیوند خاک ہوئے[۱]۔ مولوی کریم الدین نے تذکرۂ شعراء اردو میں انکا سنہ وفات ۱۲۰۷ھ لکھا ہے جو معتبر ہے۔

مصحفی نے ان کی تصنیفات میں ایک دیوان ریختہ اور ایک مثنوی کا ذکر کیا ہے۔ جو فارسی میں تھی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اردو کی طرح فارسی میں بھی مشق سخن کرتے تھے[۲]۔ افسوس کہ مثنوی ناپید ہے۔ البتہ دیوان ہم نے دیکھا ہے۔ ان کے دیوان کا جو نسخہ ہمارے پیش نظر تھا۔ غالباً وہ خود انہی کے ہاتھ کا مسودہ تھا۔ جس سے مترشح ہوتا ہے کہ یہ مسلک امامیہ کے پیرو تھے۔

پردے سے ذکر ہاتھ نکلنے کا ہے جو سچ — تو بھی محب علی کو خدا جوں نصیر ہوں

خوف محشر کا محب اب تک غلط ہے تجھکو — کہ مددگار ترے شاہ خراسان ہوئے[۳]

مظلوم بچہ

(از حضرت جوش ملیح آبادی)

بہ حسرت مالکہ کے حکم سے اک ناتواں بچہ — جھکا میداں میں جھاڑو دے رہا ہے یکہ و تنہا

سحر کا وقت ہے شادابیاں ہیں نرم جھونکوں میں — گلی سے آرہی ہیں کھیل کی مخلوط آوازیں

پیاپے کھیل کا میدان جب آواز دیتا ہے — ذرا سا سر اٹھا کر مالکہ کو دیکھ لیتا ہے

صدائیں کھیل کی آ آ کے جب اوسان کھوتی ہیں — اسے اپنے جگر پہ ٹھوکریں محسوس ہوتی ہیں

تقاضا کم سنی کا دل میں جب دھومیں مچاتا ہے — لرز اٹھتا ہے۔ گردن موڑتا ہے سر کھجاتا ہے

دمادم جب گلی سے گیند کی آواز آتی ہے — رخ طفلی پہ اک بیچارگی سی دوڑ جاتی ہے

غریب افلاس! تجھ کو دھیان میں لاتی نہیں دنیا — ترے معصوم بچوں تک کو بہلاتی نہیں دنیا

(ماخوذ)

---

[۱] گلشن ہند صفحہ ۱۶۲ و گل رعنا صفحہ ۱۶۳

[۲] تذکرۂ ہندی قلمی۔

[۳] راقم الحروف کا ایک مضمون ولی اللہ محب پر رسالہ زمانہ بابتہ ماہ جولائی ۱۹۲۹ء میں شائع ہو چکا ہے۔

انگلستان کی رسم تاجپوشی

از پروفیسر محمد اسحاق ایم، اے،

۱۲ مئی ۱۹۳۷ء کو انگلینڈ میں تاجپوشی کی جو رسم ادا ہونے والی ہے وہ صرف نمائش اور آرائش کی رسم نہیں ہے بلکہ اس کے مقاصد بہت بلند ہیں۔ اس کے علاوہ اس رسم کی بنا صرف روایات ہی پر مبنی نہیں ہے بلکہ قانونی حیثیت سے بھی یہ رسم نہایت ضروری ہے

یہ تو غالباً ہر شخص جانتا ہے کہ انگلینڈ کا بادشاہ کبھی نہیں مرتا ہے۔ یعنی بادشاہ کی موت کے ساتھ ہی اس کے مراتب اور جاہ و جلال ولی عہد سلطنت میں جسکو پارلیمنٹ نامزد کرتی ہے مدغم ہو جاتے ہیں تاہم رسم تاجپوشی ضروری ہے کیونکہ ۱۷۰۱ء کے سٹلمنٹ ایکٹ کی رو سے رسمی تاجپوشی کے دن بادشاہ کا حلف ایک بہت ضروری اور اہم شے ہے، اور جب تک تاجپوشی کی رسم ادا نہو، اسوقت تک یہ حلف ٹھیک لیا نہیں جا سکتا ہے۔

اس ضروری رسم سے دو اہم مقاصد پورے ہوتے ہیں، اول یہ کہ لوگوں کو اپنے بادشاہ کے بادشاہی کی اقرار اور اعتراف کا موقع ملجاتا ہے، دوسرے بادشاہ کو بھی موقع ملتا ہے کہ اپنی رعایا کو آئینی حیثیت سے حکومت کرنے کا یقین دلائے۔ اس رسم کے ادا کئے بغیر قومی خدمات کے تسکین کا اور کوئی ذریعہ ہی نہیں۔

اس سال کی رسم تاجپوشی بھی اسی طرح پر ادا کی جائے گی کہ سب سے پہلے کنٹربری کے آرچ لبشپ صاحب جو انگلستان کے سب سے بڑے پادری ہیں۔ رسمی طور پر بادشاہ سلامت کو لارڈ چانسلر لارڈ گریٹ چیمبرلین، لارڈ ہائی کانسٹبل اور ارل مارشل کی معیت میں ان الفاظ میں قوم کے سامنے پیش کریں گے۔

"حضرات! میں یہاں پر آپ لوگوں کے سامنے بادشاہ جارج ششم کو جو آپ لوگوں کے حقیقی بادشاہ ہیں۔ پیش کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔ جس کی بیعت اور تعظیم کے لئے آپ حضرات یہاں جمع ہوئے ہیں۔ کیا آپ حاضرین اس کا اعتراف کرتے ہیں؟"

اس کے جواب میں ویسٹ منسٹر اسکول کے لڑکے جو پہلے ہی سے اس موقع کے لئے تیار

کئے جاتے ہیں، حاضرین کی طرف سے جواب دیں گے "شاہ جارج زندہ باد"

اس کے بعد حلف لینے کی رسم ادا کیجائے گی۔ جس کی ترکیب یہ ہوگی کہ بادشاہ سلامت بڑے پادری صاحب کے چند سوالات کے جواب دینے کے بعد منبر کے پاس جائیں گے اور اپنا سیدھا ہاتھ انجیل مقدس پر رکھکر قسم کھائیں گے کہ:۔

"اے خدا جن چیزوں کا ابھی میں نے حلفیہ وعدہ کیا ہے۔ ان پر ثابت قدم رہنے کی توفیق عطا فرمائے"

یہ قسم بادشاہ اور رعایا کے درمیان ایک طرح کا معاہدہ ہے اور اس بات کا اذعانی اقرار ہے کہ سلطنت کے احکام حسب قانون انجام پائیں گے، اور ان میں ذاتی اغراض کو کوئی دخل نہ ہوگا۔

مذکورہ سٹلمنٹ ایکٹ سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ انگلینڈ کا قانون ہر انگریز کا پیدائشی حق ہے چنانچہ بادشاہ اور ملکہ کو حسب قانون سلطنت کے کام انجام دینے پڑیں گے۔

اس کے بعد مذہب عیسوی کے رسوم کی باری آئے گی۔ بڑے پادری صاحب بادشاہ سلامت کے مذہبی روغن لگائیں گے۔ بادشاہ سلامت کی ہتھیلی، سینہ اور تاج پر روغن مذکور سے صلیب[1] بنائینگے۔ روغن کے استعمال سے پہلے شاہی اختیارات نہیں مل سکتے۔ اس کے بعد رسم لباس پوشی ادا کی جائے گی، پھر بادشاہ سلامت ہمیز اور شمشیر سے آراستہ کئے جائینگے۔ تلوار سے عدل و انصاف مراد لیجاتی ہے۔ سیدھے ہاتھ کی شہادت کی انگلی میں ایک چھلا پہنایا جائے گا۔ جو بادشاہ سلامت کی جاہ و حشمت اور مذہب عیسوی کی حمایت کی نشانی ہوگی۔ یہاں پر ورکسپ کے لارڈ بادشاہ سلامت کو ایک جوڑا دستانہ پیش کریں گے، جس کے بعد بڑے پادری صاحب ملک معظم کے سیدھے ہاتھ میں ایک صلیبی عصا دیں گے۔ جو انصاف اور شاہانہ جلال کی نشانی سمجھا جاتا ہے۔ اور بائیں ہاتھ میں ایک فاختہ والی عصا دیں گے۔ جو رحم و عدالت کی نشانی ہے۔

ان رسمیات کے ادا ہو جانے کے بعد بادشاہ سلامت کو تاج پہنایا جائے گا، اور آپ بادشاہ ایڈورڈ کی کرسی پر جلوہ افروز ہوں گے۔ شاہی تاج کو ویسٹ منسٹر ایبی کے پادری صاحب منبر کے پاس سے اٹھا کر لائیں گے اور بڑے پادری صاحب بادشاہ سلامت کو تاج پہنائینگے۔ اُس وقت حاضرین "شاہ زندہ باد" کے نعرے لگائیں گے۔ نقارے بجیں گے، انگلینڈ کے منارے سے توپیں داغی جائیں گی، نواب اور راجگان اپنی اپنی ٹوپیاں زیب سر کریں گے۔ بڑے پادری صاحب بادشاہ سلامت کو دین عیسوی کی حفاظت کرنے اور اس طرح زندگی دوام حاصل کرنے کی ترغیب لائیں گے۔

---

[1] یعنی کراس

کچھ لوگ قومی گیت گائیں گے اس کے بعد بڑے پادری صاحب انجیل مقدس پیش کریں گے اور اختتامیہ دعائیہ گیت گائے جائیں گے۔ اس کے بعد تخت نشینی ہوگی۔ بڑے پادری صاحب دوسرے پادری صاحبان، نواب وراجگان بادشاہ سلامت کو تخت پر بلند کریں گے اور بادشاہ سلامت کو استقلال اور مضبوطی کے ساتھ جمے رہنے کی درخواست کریں گے۔ بادشاہ سلامت تخت سلطنت پر رونق افروز ہونے کے بعد ہی علما، اور رؤسا بیعت کے لئے حاضر ہوں گے۔ بڑے پادری صاحب جملہ پادریوں کی طرف سے ملک معظم کے برادر عزیز ڈیوک گلاسٹر شاہی خاندان کی طرف سے اور دوسرے بزرگ مختلف خاندانوں کی طرف سے بادشاہ کے سامنے دوزانو ہوکر اظہار وفاداری کے جملے ادا کرتے ہوئے تاج کو مس کریں گے اور بادشاہ سلامت کے بائیں گال کو بوسہ دیں گے۔

جب بادشاہ سلامت اور ملکہ معظمہ کی رسم تاج پوشی ادا ہو جائے گی تو مقدس انجیل کے مطابق سات وعدوں کا اعادہ کیا جائے گا۔ دینی رسومات کے ادا کرنے کے بعد دونوں اپنی اپنی نذریں پیش کریں گے۔ بادشاہ تو اپنی سونے کی لاٹھی جس کا وزن ایک پاؤنڈ ہوگا نذر دیں گے اور ملکہ معظمہ ایک پردہ جس پر آٹھ آونس سونے کا طلائی کام ہوگا نذر چڑھائیں گی۔ اس کے بعد بادشاہ سلامت اور ملکہ معظمہ سنٹ ایڈورڈ کے گرجا میں جائیں گے، جہاں بادشاہ فاختہ والی لاٹھی بڑے پادری صاحب کے حوالے کر دیں گے، یہاں پر بادشاہ سلامت کا شاہانہ جوڑا اُتار کر زرد رنگ کا مخملی لباس پہنایا جائے گا۔ اسی طرح ویسٹ منسٹر ایبی کے مغربی دروازے سے بادشاہ سلامت اپنے دائیں ہاتھ میں صلیب والی لاٹھی اور بائیں ہاتھ میں فاختہ والی لاٹھی لئے ہوئے گزریں گے۔

شاہانِ انگلستان کی تاجپوشی کی تاریخیں

انگلستان میں اپریل و اکتوبر کے مہینوں میں سب سے زیادہ تاجپوشی کی تقریبات ہوئی ہیں۔ ان دونوں ماہ میں سے ہر ایک میں چھ چھ بادشاہوں کی تاجپوشی ہوئی ہے۔ فروری اور جولائی میں چار۔ جون۔ اگست۔ دسمبر میں تین۔ مارچ اور ستمبر میں کوئی تاجپوشی نہیں ہوئی۔

راز و نیاز

(اثرِ خامہ جناب نکہت شاہجہانپوری بی، اے۔ انجمن اسلام بمبئی)

جو اہلِ درد نہ ہوں دل کا حال کیا جانیں
جو بے کمال ہوں رنگِ کمال کیا جانیں

بڑے مزے کی ہے واللہ عشق کی اُفتاد
یہ عقل والے عروج و زوال کیا جانیں

کہاں زمین کہاں آسماں کی نیرنگی
یہ شعبدے ترے مستِ خیال کیا جانیں

ترے قدم سے ہی دُنیائے رنگ و بُو میں بہار
جو مثلِ سبزہ نہوں پامال کیا جانیں

بلا سے خرمنِ دل جل کے خاک ہو جائے
ہم اور عشق میں فکرِ مآل کیا جانیں

محال ہے کہ تری رحمتوں کی آس نہو
مرے گنہ عرقِ انفعال کیا جانیں

طلب کہاں کی؟ سلامت رہے یہ شیشۂ ناز
نیاز مند ترے اور سوال کیا جانیں

قدم قدم پہ جو حد بندیاں کریں نکہت
وہ حسن و عشق کی دنیا کا حال کیا جانیں

ہز مجسٹی شاہ جارج ششم و ملکہ الزبتھ

۱۲ مئی ۱۹۳۷ء کو ملک معظم شہنشاہ جارج ششم اور ملکہ معظمہ کوئن الزبتھ کی رسم تاجپوشی بڑے کروفر اور جاہ و حشم کے ساتھ انگلستان کے قدیم گرجا ویسٹ منسٹر ایبی میں ادا کی گئی۔

تاریخ انگلستان کا یہ عجیب واقعہ ہے کہ ملکہ وکٹوریہ کے بعد اب تک فرمانروایان برطانیہ کی دوسری اولاد ہی تخت نشین ہو رہی ہے۔ شاہ ایڈورڈ ہفتم بھی ملکہ معظمہ کی دوسری اولاد تھے، کیونکہ ان سے پہلے ایک شہزادی پیدا ہوئی تھیں۔ شاہ ایڈورڈ ہفتم کے بعد بھی ان کے دوسرے بیٹے جارج پنجم مالک تخت و تاج ہوئے کیونکہ شاہ ممدوح کے بڑے بھائی پرنس آف ویلز کا عالم شباب ہی میں انتقال ہو گیا تھا، اور اب ان کے بعد ان کے دوسرے شاہزادہ ہز رائل ہائی نس ڈیوک آف یارک کی جارج ششم کے نام سے تاجپوشی ہوئی۔ ناظرین جانتے ہیں کہ شاہ مرحوم کے بعد ان کے بڑے بیٹے ایڈورڈ ہشتم کے نام سے تخت سلطنت پر جلوہ افروز ہوئے تھے لیکن ایک سال بھی پورا نہ ہونے پایا تھا کہ حسن و عشق کے جھگڑوں کی بدولت انھیں ملک و حکومت دونوں سے کنارہ کش ہونا پڑا، اور اب وہ ڈیوک آف ونڈسر کے نام سے موسوم ہیں۔

موجودہ بادشاہ ڈیوک موصوف کی پیدائش کے ڈیڑھ سال بعد ۱۴۔ دسمبر ۱۸۹۵ء کو "یارک کاٹیج" سینڈرنگھم میں پیدا ہوئے۔ آپ کا نام البرٹ فریڈرک آرتھر جارج رکھا گیا۔ چونکہ دونوں بھائیوں کی عمر میں بہت کم فرق تھا، اس لئے دونوں کی پرورش و پرداخت ایک ہی ساتھ اور یکساں ہوئی شہزادہ جارج کی ابتدائی تعلیم مسٹر ہانسیل کے سپرد ہوئی۔ لیکن فرصت کے اوقات میں آپ کو گاؤں کے بچوں کے ساتھ فٹ بال کھیلنے کی اجازت دیدی جاتی تھی۔ انگریزوں کی یہ قابل رشک خصوصیت ہے کہ وہ اپنے شہزادوں کو بھی درس مساوات سکھانے کی کوشش کرتے ہیں اور اس لئے ان کو عوام سے ملنے جلنے اور اُن کی زندگی بسر کرنے کا پورا موقعہ دیتے ہیں۔ اسی ابتدائی تربیت کا نتیجہ ہے کہ شاہزادہ ہونے اور ہز رائل ہائی نیس ڈیوک آف یارک کا خطاب پانے کے بعد بھی پرنس البرٹ ایک سالانہ کیمپ لگایا کرتے تھے جس میں پبلک اسکولوں اور فیکٹریوں کے لڑکے مدعو

کرتے اور ان سے برادرانہ مساوات سے ملتے تھے

بہر حال جب پرنس البرٹ کی عمر چودہ سال کی ہوئی تو انھیں ایک بحری افسر کے فرائض سکھانے کے لئے آسبورن بھیجدیا گیا۔ دو سال کے بعد ۱۹۱۱ء میں وہ ڈارٹمتھ گئے جہاں انھیں مزید دو برس تک بحری معاملات کی عملی تعلیم دی گئی۔ اس تعلیم و تربیت کے دوران میں شہزادہ البرٹ سے وہی برتاؤ کیا جاتا تھا جو دیگر نوآموز یا زیر تعلیم نوجوان افسروں سے ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ آپ کو رائل ہائی نیس یا پرنس کہنے کے بجائے مسٹر جانسن کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ یہاں آپ کو دوسرے طالبعلموں کی طرح ہر قسم کی سختیاں اور بحری زندگی کی تمام مشکلات برداشت کرنا پڑتی تھیں۔ اسی مسلسل جفاکشی کی عادت نے آپ کو آئندہ زندگی کی جدوجہد کے لئے پوری طرح تیار کر دیا۔

۱۹۱۳ء میں جبکہ آپ کی عمر سترہ سال کی ہوئی آپ کو بحری سیاحت کا پہلا موقعہ ملا۔ چنانچہ آپ کمبرلینڈ نامی جہاز میں آپ امریکہ کی طرف مزید عملی تعلیم حاصل کرنے بھیجے گئے۔ اور اسی دوران میں آپ کو کناڈا، نیوفاونڈلینڈ اور جزائر غرب الہند کی سیر و سیاحت کا موقعہ ملا۔ اس طرح جب آپ کو دور و دراز بحری سفروں کا عملی تجربہ حاصل ہو گیا تو آپ کو ترقی دیکر "مڈشپ مین" (Midshipman) بناکر کالنگووڈ" نامی جہاز پر تعینات کر دیا گیا۔ ۱۹۱۴ء میں جب جنگ عظیم شروع ہوئی تو آپ اسی جہاز میں تعینات تھے۔ اس طرح جٹلینڈ کی بحری جنگ میں آپ کو بھی دوسرے قادر اندازوں کے ساتھ ایک بارہ انچ دہانہ کی توپ چلانا پڑی۔ اس سلسلے میں آپ نے جس محنت و تندہی سے اپنے فرائض منصبی ادا کئے اس کے لئے امیرالبحر جلیکو نے آپ کی کئی مرتبہ بڑی تعریف کی۔

۱۹۱۴ء میں آپ کے پیٹ میں پھوڑا ہو گیا جس کی وجہ سے عمل جراحی کرنا پڑا، مگر صحت بحال ہونے کے بعد آپ پھر جنگی بیڑے کی طرف مائل ہوئے اور سب لفٹنٹ کے عہدہ پر ترقی دیکر کمبرلینڈ جہاز پر تعینات کر دیئے گئے۔

لیکن آپ کی صحت کی طرف سے اطمینان نہیں ہوا کیونکہ آپ کی تندرستی اچھی نہیں رہتی تھی اسلئے ۱۹۱۷ء میں آپ کو ڈاکٹروں نے بحری زندگی ترک کرنے پر مجبور کیا جس کی وجہ سے آپ کو بحری خدمات سے کنارہ کش ہو کر شاہی ہوائی فوج میں داخل ہو گئے۔

اس زمانہ میں ہوائی فوج کی کوئی جداگانہ حیثیت نہ تھی بلکہ اس کو بری اور بحری سپاہ کے ماتحت سمجھا جاتا تھا۔ بہر نوع شہزادہ البرٹ نے ہوائی فوج میں خوب دل لگا کر کام کرنا شروع کر دیا۔ آپ کو جلد سے جلد رہنما کا سرٹیفکیٹ حاصل کرنے کی بیقراری تھی مگر افسروں کو جلد بازی منظور نہ تھی اور تندرستی

کے خیال سے وہ شاہزادہ ممدوح کو سخت وخراب موسم میں پرواز کرنے سے روک دیتے تھے. مگر ایک دن آپ نے فضائی کمانڈر سر لوئس گریگ سے کہا کہ آج میں ضرور پرواز کرونگا، چنانچہ اسی دن طیارہ میں سوار ہوکر اڑے اور امتحان پاس کر لیا۔

پرنس البرٹ کی طبیعت کو ٹکنیکل انجنیری سے بھی خاص مناسبت ہے، اُن کی بحری زندگی کا تقاضا تھا کہ وہ سمندری انجنیری سے واقفیت حاصل کریں اور ہوائی زندگی میں بھی اس بات کی ضرورت تھی کہ انکو ایک طیارہ کے تمام کل پرزوں کا علم ہو جائے۔ چونکہ اس زمانہ میں ہوائی فوج کی شروعات تھی اور اتنی آسانیاں اور سہولتیں بھی پیدا نہ ہوئی تھیں جتنی کہ آجکل ہیں اس لئے آپ کو اپنے کام میں بہت بڑی محنت کرنا پڑتی تھی۔ دیگر ہوابازوں کی طرح آپکو موسمی تغیرات اور لاسلکی (وائرلیس) کا علم بھی سیکھنا پڑا۔ آپ نے اس کے علاوہ موٹر انجنیری کا کام بھی اپنی خوشی سے سیکھ لیا، اور اس فن میں اتنی مہارت حاصل کرلی کہ اگر اثنائے راہ میں کوئی بگاڑ ہو جائے تو وہ موٹر کار کا انجن خود ہی درست کرکے کار چلا سکتے ہیں۔

سنہ ۱۹۱۴ء میں یکایک جنگ عظیم چھڑ جانے سے پرنس البرٹ کو اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا موقع نہیں ملا تھا لیکن جب جنگ ختم ہوکر ملک میں امن وامان ہوگیا تو ۱۹۱۹ء میں آپ کو اعلیٰ تعلیم کے لئے کیمبرج یونیورسٹی بھیجا گیا، جہاں آپ نے تاریخ، اقتصادیات وغیرہ کے مضامین لئے۔ یہ کہنا تو مبالغہ ہوگا کہ آپ کو پڑھنے کا بہت بڑا شوق ہے کیونکہ عادتاً آپ کتاب کے کیڑے نہیں ہیں لیکن یونیورسٹی میں اُن کا شمار اچھے طلباء میں کیا جاتا تھا۔ دراصل آپ کی یہ قابل قدر عادت ہے کہ جب کبھی کوئی چیز دیکھتے یا کتاب پڑھتے ہیں تو اس سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اُٹھانے کا خیال رکھتے ہیں اور غور وفکر سے کام لینے کے عادی ہیں۔

جنگ عظیم ختم ہونے کے بعد پرنس البرٹ نے مزدوروں اور کاریگروں سے تعلقات قایم کرنے شروع کئے۔ اس [illegible] سے وہ کبھی کبھی پرائیویٹ حیثیت سے فیکٹریوں، ورکشاپوں اور کوئلہ کی کانوں میں بھی تشریف لے گئے ہیں۔ یہ شوق اس قدر ترقی پذیر ہوا کہ کچھ دنوں کے بعد جب صنعت وحرفت کے مالکوں اور کارکنوں میں باہمی تعاون پیدا کرنے کی غرض سے انڈسٹریل ویلفیر (Industrial Welfare) کی تحریک جاری ہوئی تو آپ اس سوسائٹی کے پریسیڈنٹ منتخب کئے گئے۔ اس سے واضح ہے کہ آپ کو اپنے ملک کے مزدوروں اور کاریگروں کی فلاح وبہبود سے کس قدر دلچسپی ہے۔

آپ جنوری سنہ ۱۹۲۱ء ہی میں ڈیوک آف یارک بنا دیے گئے تھے لیکن کاریگروں اور مزدوروں سے مساویانہ میل جول کا سلسلہ برابر جاری رہا چنانچہ آپ کے سالانہ کیمپوں کا سلسلہ برابر قایم رہا جس میں کسی نہ کسی دیہات میں ایک کیمپ قائم کرکے دو سو لڑکے پبلک اسکولوں سے اور دو سو لڑکے فیکٹریوں سے مدعو کئے جاتے تھے.

اور شہزادہ یارک ان سب سے بدرجہ مساوات ملتے جلتے تھے، اور ان کی خاطر مدارات کا تمام خرچ اپنی جیب خاص سے ادا کرتے تھے۔ اس کیمپ کا سلسلہ پندرہ برس تک قائم رہا اور اس وقت تین ہزار کے قریب ایسے آدمی موجود ہیں جنکو اس کیمپ کی زندگی میں حصہ لینے کی وجہ سے آپ کی براہ راست شناسائی کا فخر حاصل ہے۔ آپ کو بھی اس سالانہ تقریب کی بدولت انگلستان کے اعلیٰ طبقہ کے علاوہ اوسط اور ادنیٰ درجہ کی سوسائٹی کے حالات سے پوری واقفیت ہو گئی ہے آپ ان کی روزمرہ ضروریات، خیالات اور جذبات سب کا بخوبی علم ہے۔ غرض سیاسی مساوات کا اس سے بہتر مظاہرہ اور کسی طرح ممکن نہ تھا۔ ظاہر ہے کہ ان سالانہ کیمپوں کی زندگی سے آپ کو بھی بہت بڑا فائدہ حاصل ہوا سب سے بڑی بات یہ ہوئی کہ خرابی صحت کی جو عام شکایت رہتی تھی وہ رفتہ رفتہ دور ہو گئی اور اب آپ کی صحت ہر اعتبار سے اچھی ہے اور آپ ایک تندرست اور چاق چوبند انسان ہیں۔

آپ کو مردانہ کھیلوں سے ہمیشہ سے شوق رہا، کرکٹ میں آپ کو خوب مہارت ہے اور فٹ بال بھی خوب کھیلتے ہیں، لیکن آپ کا مرغوب ترین کھیل ٹینس ہے چنانچہ ۱۹۲۶ء میں آپ کمانڈر لوئس گریگ کے ساتھ ومبلڈن ٹینس ٹورنامنٹ میں شریک ہوئے تھے اور بہت اچھا کھیل دکھایا۔ اس کے علاوہ آپ "اسکوائش ریکٹ" بھی اچھا کھیلتے ہیں، گالف بھی معمولی طور پر کھیل لیتے ہیں۔ شکار کا بھی آپ کو بہت شوق ہے اور نشانہ اچھا لگاتے ہیں۔ چنانچہ جب وہ ۱۹۲۴ء میں اپنے بڑے بھائی پرنس آف ویلز (موجودہ ڈیوک آف ونڈسر) کے ساتھ مشرقی افریقہ کی سیر و سیاحت کے لئے تشریف لے گئے تو بڑے دن کے ایام نیروبی میں گذارنے کے بعد آپ ۱۹۲۵ء کے پہلے ہفتہ میں شکار کو تشریف لے گئے اور وہاں ایک شیر ببر، ایک شیرنی، دو گینڈے، دو ارنا بھینسے، ایک تیندوا شکار کئے اور اس کے بعد یوگنڈا کے جنگلوں میں دو ہاتھی بھی شکار کئے۔

۱۹۲۷ء میں آپ ڈیوک آف یارک کی حیثیت سے سرکاری طور پر آسٹریلیا اور جنوبی سمندر کے دیگر ممالک کی سیر و سیاحت کے لئے بھیجے گئے۔ اس سفر کا اصلی مقصد یہ تھا کہ آپ اپنے نامور والد ہز مجسٹی جارج پنجم کے قائم مقام کی حیثیت سے آسٹریلیا کے دار السلطنت میں پارلیمنٹ کی جدید عمارت کا افتتاح فرمائیں۔ اس سفر میں ڈچز آف یارک بھی آپ کے ساتھ تھیں۔ شہزادی الزبتھ جو ۲۱۔ اپریل ۱۹۲۶ء کو پیدا ہوئی تھیں اپنی دادی ملکہ میری کے پاس چھوڑ دی گئی تھیں۔ اس سفر میں آپ نے جمیکا، نہر پنامہ آسٹریلیا نیوزیلینڈ اور بحر الکاہل کے جزیروں کی سیر کی۔ نیوزی لینڈ میں آپ کو میوری قوم کا سردار بنایا گیا اور جزائر فیجی میں ایک قبائلی سردار نے آپ کی خدمت میں اظہار وفاداری کے لئے وھیل کا دانت

پیش کیا۔

اسی سلسلے میں آپ نے ممالک یورپ کی بھی خوب سیر کی ہے، اور یوگوسلافیہ کے بادشاہ الیگزینڈر کی شادی میں شریک ہوئے۔ اور موجودہ شاہ پیٹر کے "دھرم باپ" بنے۔ یوگوسلافیہ کے لوگوں کو آپ سے اس قدر دلچسپی پیدا ہو گئی کہ انھوں نے اپنے بہت سے بچوں کا نام "یارک" رکھا۔ غرض جہاں کہیں آپ گئے آپ بہت ہر دلعزیز رہے اور لوگوں نے آپ کی ہر طرح سے خاطر و مدارات کی۔ غالباً اسی ہر دلعزیزی کی وجہ سے جنگ عظیم کے کچھ دنوں بعد یہ افواہ اڑی تھی کہ آپ کو پولینڈ کا تخت و تاج پیش کیا جائیگا، لیکن آپ نے اس پر یہ فرمایا تھا کہ اگر ایسا ہوا تو آپ انکار کر دیں گے۔

بادشاہ سلامت کی زبان میں بچپن ہی سے لکنت تھی چنانچہ اس نقص کے دُور کرنیکی بہت کوشش کی گئی لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا۔ دراصل اس وجہ سے گفتگو کرنے میں آپکو بڑی دقت واقع ہوتی تھی اور جب کبھی جلسہ عام میں تقریر کرنے کا موقعہ ہوتا تھا تو آپ کی طبیعت میں اس قدر گھبراہٹ پیدا ہو جاتی تھی کہ تقریر ہی نہ کر سکتے تھے۔ زبان کا یہ نقص حد درجہ پریشان کن تھا چنانچہ انتہائی کوشش کے باوجود آپ کی زبان سے حرف "ک" (K) صحیح طور سے ادا نہ ہوتا تھا، اور جب کبھی آپکو اپنے والد کے متعلق ذکر کرنے کی ضرورت ہوتی تو "کنگ" کے بجائے "ہز مجسٹی" یا "والد صاحب قبلہ" کہہ کر اپنا کام نکالا کرتے تھے۔ لیکن ۱۹۲۷ء میں جب آسٹریلیا جانے کا موقعہ آیا تو اس عیب کو دُور کرنے کی ایک آخری کوشش یہ ہوئی کہ آسٹریلیا کے ایک ماہر فن کی خدمات حاصل کی گئیں جس نے آپ کا پوری طرح معائنہ کر کے اسباب مرض کی تشخیص کر لی اور آپ کو الفاظ اور حروف کا صحیح تلفظ از سر نو سکھایا۔ اس طرح کئی مہینہ کی تعلیم اور سخت محنت کے بعد زبان قابو میں آگئی۔ اور رفتہ رفتہ لکنت کا نقص بالکل رفع ہو گیا۔ چنانچہ ۹ مئی ۱۹۲۷ء کو آسٹریلیا کی پارلیمنٹ کا افتتاح کرتے وقت آپ نے جو تقریر کی وہ بالکل صاف تھی۔ مگر اسکے لئے آپ کو کتنی محنت کرنا پڑی اس کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ سفر آسٹریلیا میں آپ روزانہ کامل دو گھنٹہ تک اس نقص کو رفع کرنیکی کوشش کرتے تھے۔ لکنت دُور ہوتے ہی آپ کی جھجک دُور ہو گئی اور آپ لوگوں سے بخوشی خاطر ملنے لگے۔

اگرچہ آپ نے براعظم یورپ کے بہت سے ملکوں کی سیر و سیاحت کی اور آپکو مختلف شاہی خاندانوں کی شہزادیوں سے ملنے کا موقعہ ملا لیکن آپ کا دل اپنے ہی ہموطن "لیڈی الزبتھ اینجلہ مارگریٹ باوس لائن" کی زلف گرہ گیر میں اسیر ہوا جو چودھویں ارل اسٹراتھمور کی سب سے چھوٹی صاحبزادی ہیں یہ خاندان بہت ہی قدیم ہے، جس کے بانی مبانی سر جان لائن نے ۱۳۷۱ء میں اسکاٹلینڈ کے بادشاہ

رابرٹ دوم کی ایک بیٹی سے شادی کی تھی۔ چنانچہ اس شادی کے بعد بادشاہ نے نوابی کے خطاب کے علاوہ گلامیس کا عالیشان قصر اور جاگیر بھی عطا فرمائی تھی۔

لیڈی الزبتھ ۴ اگست ۱۹۰۰ء کو ہرٹفورڈ شائر میں پیدا ہوئی تھیں۔ شاہزادہ البرٹ اور آپ کی سب سے پہلی ملاقات بھی اسی جگہ ہوئی۔ اس وقت شہزادہ کی عمر گیارہ سال اور لیڈی صاحبہ کی عمر چھ سال کی تھی۔ اس کے بعد دوسری ملاقات ۱۹۱۹ء میں ہوئی۔ پرانی محبت عود کر آئی اور دونوں کے جذبات میں تلاطم برپا ہوگیا، چنانچہ ایک روز محفل رقص و سرود میں پرنس نے اظہار مدعا کر ہی دیا لیکن پذیرائی نہ ہوئی۔ دوسری مرتبہ آپ نے گولف کھیلتے ہوئے شادی کی تجویز پیش کی لیکن اس مرتبہ بھی مایوسی ہوئی۔ آخر کار ایک روز جب دونوں گھوڑوں پر سوار ہوکر سیر کو نکلے تو دونوں میں وعدہ وعید ہوگیا اور جب اسکی خبر ہز مجسٹی جارج پنجم اور ملکہ میری کو ہوئی تو انھوں نے ۱۵ جنوری ۱۹۲۳ء کو شادی کی باقاعدہ منظوری دیدی، چنانچہ ویسٹ منسٹر ایبی میں نکاح ہوگیا اور شادی کا پہلا مہینہ سرے میں بسر ہوا۔

۲۱۔ اپریل ۱۹۲۶ء کو آپکی پہلی شاہزادی الزبتھ پیدا ہوئیں جو اس وقت ولیعہد ہیں۔ چار سال بعد ۲۱۔ اگست ۱۹۳۰ء کو دوسری شہزادی مارگریٹ روز پیدا ہوئیں۔

لیڈی الزبتھ (جو اب بفضلہ تعالیٰ ملکہ معظمہ ہیں) حسین و جمیل ہونے کے علاوہ شاہانہ شان و شوکت کی لیڈی ہیں۔ قدرتی وجاہت کے ساتھ ساتھ آپ میں ایک دلآویز فطری سادگی بھی موجود ہے۔ آپ کا چہرہ ہر وقت شگفتہ رہتا ہے جس کے باعث ہر شخص آپ کا گرویدہ ہو جاتا ہے۔ آپ کے مزاج میں فضول تکلف اور بیجا تصنع کو بالکل دخل نہیں ہے۔ آجکل کی فیشن ایبل خواتین کی اکثر عادتوں سے آپ کو نفرت ہے، چنانچہ سگریٹ وغیرہ سے آپکو قطعی پرہیز ہے۔ آپ بہت ہی صاف دل، پرخلوص ملکہ ہیں، اپنے شوہر نامدار سے آپ کو انتہا درجہ کی محبت ہے۔ اور خانگی امور میں آپ غیر معمولی دلچسپی لیتی ہیں۔

چونکہ ولیعہد سلطنت پرنس آف ویلز بسلسلۂ سیر و سیاحت اکثر انگلستان سے باہر رہتے تھے اور گذشتہ چند سال سے ہز مجسٹی جارج پنجم کی صحت بھی کمزور ہوگئی تھی اسلئے شہزادہ یارک کو اپنے والد نامدار کے بجائے اکثر امور سلطنت انجام دینا پڑتے تھے جس سے آپکو فن جہانبانی میں بھی بہت دخل ہوگیا ہے۔ آپکی طبیعت خاموشی پسند اور پرسکون واقع ہوئی ہے۔ صبر و تحمل عقل و دانش اور تدبر و تدبیر کی زبردست طاقتیں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہیں۔ بہت سے لوگ ایسی شخصیتوں کے مالک ہوتے ہیں جن کو دیکھتے ہی انسان گرویدہ ہو جاتا ہے اور بہت سی شخصیتیں ایسی ہوتی ہیں جو رفتہ رفتہ مگر مستقل طور پر دل میں جگہ کر لیتی ہیں۔ پہلی قسم کی شخصیت کے مالک ایڈورڈ ہشتم تھے مگر دوسری قسم کی شخصیت کے مالک ہمارے موجودہ شاہ جارج ششم ہیں۔ ہمکو پورا

بھروسہ ہے کہ وہ ایک بلند حوصلہ، جری، صاحب شعور اور دانشمند بادشاہ ثابت ہونگے اور دسمبر ۱۹۳۶ء کے افسوسناک واقعات سے تاج و تخت برطانیہ کو جو صدمہ پہونچا ہے اس کی ہز مجسٹی جارج ششم اور ملکہ الزبتھ کی ذات والاصفات سے بہت بڑی حد تک تلافی ہو جائیگی شاہ جارج ششم نجی زندگی میں سعادتمند بیٹے، وفادار شوہر اور ایک شفیق باپ ہیں، شاید ہی کوئی دن ایسا ہوتا ہو جب وہ سونے سے پہلے اپنی بچیوں کے کمرہ میں جاکر "شب بخیر" نہ کہتے ہوں اور جس روز شام کو انھیں کہیں باہر جانا نہیں ہوتا تو وہ ہمیشہ اپنا بیشتر حصہ اپنے بیوی بچوں ہی میں گذارتے ہیں۔

رسم تاجپوشی

ناظرین "زمانہ" نے دربار تاجپوشی کے شاندار جلوس اور دیگر باتوں کا حال اخباروں میں ملاحظہ فرمالیا ہوگا لیکن جو رسمیں تاجپوشی کے وقت ویسٹ منسٹر ایبے میں ادا کی جاتی ہیں، انکا حال بہت کم اصحاب کو معلوم ہوگا۔

رسم تاجپوشی کے مختلف حصے ہیں مثلاً گرجا میں داخلہ، کورنش تسلیم، شاہی حلف، تیل کی مالش، شاہی لباس اور اسلحہ کی پیشکش، کرہ سلطنت کا نذرانہ، خاتم سلطانی پہنانا اور عصائے حکومت حوالہ کرنا، سر پر تاج رکھنا، بائبل کی پیشکش دعائیں مانگنا اور برکت دینا، تخت نشینی، بیعت اور قومی ترانہ۔

بادشاہ کی تاجپوشی کے بعد ملکہ کی تاجپوشی ہوتی ہے اور انکے سر پر بھی تیل کی مالش کرکے تاج رکھا جاتا ہے اور اس کے بعد عشائے ربانی میں بادشاہ اور ملکہ دونوں شریک ہوتے ہیں جسکے بعد خدا کی حمد گائی جاتی ہے اور بادشاہ اور ملکہ دونوں ٹھکر گرجے میں چلے جاتے ہیں جہاں انکا شاہی لباس اتار کر ارغوانی مخمل کا جوڑا پہنایا جاتا ہے اور دونوں لباس زریں پہنکر اور تاج شاہی رکھکر رواں ہو جاتے ہیں۔ بادشاہ کے ہاتھ میں صلیب دار عصا اور کرہ ہوتا ہے ملکہ کے ہاتھ میں عصا کے علاوہ ہاتھی دانت کی چھڑی بھی ہوتی ہے جس کے ایک سرے پر قمری بنی ہوتی ہے۔ یہ رسم دو گھنٹے میں ختم ہوتی ہے اسکے بعد رعایا بادشاہ کو اپنا فرمانروا تسلیم کرتی ہے۔ کنٹربری کے لاٹ پادری بادشاہ کو حاضرین کے سامنے پیش کرکے کہتے ہیں "یہ آپکے مسلمہ بادشاہ ہیں بلا شک و شبہ"۔ یہ الفاظ سنکر ویسٹ منسٹر اسکول کے لڑکے نام لیکر بادشاہ سلامت کا نعرہ بلند کرتے ہیں اور اُسی وقت بگل بجائے جاتے ہیں۔ یہ رسم ہال کے مشرقی مغربی جنوبی اور شمالی چاروں طرف ادا کیجاتی ہے۔ بادشاہ کا رخ حاضرین کی طرف ہوتا ہے۔ شاہی حلف کے معنی یہ ہیں کہ بادشاہ رعایا پر قوانین ملکی کے مطابق حکومت کرنیکی قسم کھاتا ہے۔ بیعت سے مراد یہ ہے کہ رعایا بادشاہ کی فرمانبردار اور وفادار رہنے کی قسم کھاتی ہے جس تخت پر بادشاہ کو بٹھایا جاتا ہے وہ شاہ ایڈورڈ کی مسندی ہے جسکے چاروں پایوں میں شیر بنے ہوئے ہیں۔ بادشاہ کے سر پر جو تاج سب سے پہلے رکھا جاتا ہے وہ سینٹ ایڈورڈ کا تاج کہلاتا ہے اور رسم تاجپوشی کے بعد جو تاج پہنکر بادشاہ نکلتا ہے وہ تاج سلطنت کہلاتا ہے۔

تنقید کتب

پچھلے دنوں ہز اگزالٹڈ ہائی نیس نظام کے جشن جوبلی کے سلسلے میں کئی قابل قدر کتابیں شائع ہوئیں جن سے حیدرآباد کی گذشتہ تاریخ اور موجودہ ترقیوں پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ یہ کتابیں سرکار نظام کی علم دوستی کی بیّن دلیل ہیں۔ اور ان سے اعلیحضرت نظام دکن کی غیر معمولی ہر دلعزیزی کا بھی ثبوت ملتا ہے۔ بہ حیثیت مجموعی ان سے پچھلے پچیس سال کے عہد حکومت کے مکمل حالات معلوم ہوتے ہیں۔ سب سے پہلے ہم

مختصر تاریخ دکن[1]

کا ذکر کرنا چاہتے ہیں جو قلمروئے آصفیہ کے اسکولوں میں درسی کتاب کی حیثیت سے پڑھائے جانے کے لئے تالیف کی گئی ہے چنانچہ اس میں شروع سے لیکر موجودہ نظام صاحب کے عہد تک کی مختصر تاریخ دکن درج کی گئی ہے۔ ضمناً دکن کے جغرافیائی حالات اور شمالی ہند کی ہندو و مسلم سلطنتوں کے حالات بھی درج کر دئے گئے ہیں۔ پوری کتاب تین حصوں میں تقسیم ہے۔ پہلے حصہ میں قدیم ہندو زمانہ سے لیکر مسلمانوں کی فتح دکن تک کے حالات ہیں۔ دوسرے حصہ میں ۱۳۲۵ء سے لیکر ۱۷۲۴ء یعنی حضرت آصف جاہ اوّل کے زمانہ تک کے حالات درج ہیں۔ اسی کے سلسلہ میں سلاطین بہمنیہ، بریدشاہیہ، عمادشاہیہ، نظام شاہیہ، عادل شاہیہ اور قطب شاہیہ کے بھی مختصر حالات مع شجرہ لکھے گئے ہیں۔ تیسرے حصہ میں ۱۷۲۴ء سے ۱۹۰۸ء یعنی اعلیحضرت موجودہ نظام دکن کی تخت نشینی تک کے حالات ہیں اور سلاطین تیموریہ اور فرمانروایانِ دولت آصفیہ کے شجرے اور ہندوستان کے گورنر جنرلوں کی فہرست بھی درج کر دی گئی ہے۔

جہاں تک مضمون کا تعلق ہے مختصر پیمانہ پر یہ ایک عمدہ تاریخ دکن ہے۔ مگر ہم کو دلی افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ زبان کے لحاظ سے یہ طلبا۔ کو سخت گمراہ کرنیوالی کتاب ہے۔ کیونکہ اس کی عبارت میں نہ تذکیر و تانیث کا خیال رکھا گیا ہے، نہ روزمرہ کے محاورات کا۔ اور نہ واحد و جمع کا۔ جو لڑکے اس کتاب کو پڑھیں گے ان کی زبان قطعی خراب ہو جائے گی۔ ہم کو بھی تعجب ہے کہ جس کتاب کی زبان اس قدر خراب ہو وہ نصاب تعلیم میں کس طرح منظور ہو گئی۔ کتاب کی معمولی ورق گردانی پر ہی طبیعت حیران

[1] تقطیع ۲۲×۱۸، ضخامت ۲۰۷ صفحات۔ قیمت عمر ملنے کا پتہ:- پروفیسر شروانی حیرت آباد۔ حیدرآباد دکن

ہوجاتی ہے کہ کا۔ کی۔ کے کی اتنی غلطیاں کیوں جائز رکھی گئیں۔ کتابت کی غلطیاں اس کے علاوہ اور ان کے لئے شروع میں غلطنامہ کا پورا ایک صفحہ چسپاں کرنا پڑا ہے۔

بعض واقعات بھی تاریخ یا روایات کے خلاف لکھے گئے ہیں مثلاً سری رامچندر جی اور راون کی جنگ اور سیتا ہرن کے بارہ میں فاضل مصنف صاحب لکھتے ہیں:۔

"جب رامچندر جی کو ان کے والد نے چودہ برس کا دیس نکالا دیا تو چلتے چلتے وہ اپنے پیارے بھائی لچھمن جی اور اپنی چہیتی بیوی سیتا جی کے ساتھ کس طرح دکن کی طرف آئے تاکہ یہاں کے لوگوں میں آریہ تہذیب پھیلائیں، اور جو آریہ مبلغ دکن میں آریہ تہذیب پھیلا رہے تھے، انھیں دشمنوں سے بچائیں۔ انھوں نے دکن میں بہت سے راکھشسوں یعنی بیدینوں کو شکست دی اور ان کے ایک بہت ہی بڑے سردار کو نیچا دکھایا۔ اسی سردار کا بھائی راون لنکا کا راجہ تھا۔ اور جب اسے معلوم ہوا کہ میرا بھائی لڑائی میں مارا گیا ہے تو اُسے بڑا ہی غصہ آیا اور وہ دھوکہ دیکر خود سیتا جی کو لنکا اٹھا لے گیا۔"

معلوم نہیں کہ فاضل مصنف کو والمیکی اور تلسی کرت راماین کی موجودگی یہ دفتر بے معنی کہاں سے دستیاب ہوا۔ راون کا کوئی بھائی دکن میں حکمران نہ تھا جو رام چندر جی کے ہاتھ سے مارا گیا ہو۔ جنگ لنکا راون کے کسی بھائی کے قتل کی وجہ سے نہیں ہوئی۔

راماین کے متعلق اسی طرح کی اور بھی بعض غلطیاں ہیں جنکو ہم یہاں پر نظرانداز کرتے ہیں۔

عہد عثمانی میں اُردو کی ترقی

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور ایم۔ اے۔ پی ایچ ڈی پروفیسر اُردو عثمانیہ یونیورسٹی ایک مشہور مصنف ہیں۔ ان کی کئی قابل قدر کتابیں شائقین ادب سے خراج تحسین وصول کر چکی ہیں۔

یہ کتاب بھی اعلیحضرت نظام کی جوبلی کے سلسلہ میں لکھی گئی ہے۔ اسمیں اعلیحضرت سلطان العلوم شہریار دکن کے علمی ذوق وشوق اور علماء و فضلاء کی قدردانیوں پر کافی روشنی ڈالتے ہوئے پچھلے پچیس سال کے اندر حیدرآباد میں اُردو کی غیر معمولی ترقی کی مفصل سرگذشت بیان کی گئی ہے۔

اصل کتاب تین حصوں میں منقسم ہے جن میں اعلیحضرت نظام کی ادبی سرپرستی اور اس کے اثرات سے مفصل بحث کی گئی ہے۔

یوں تو اردو زبان شاہان دکن کی ہمیشہ زیر بار احسان رہے گی اور اسمیں کوئی شک نہیں کہ

مکتبہ ابراہیمیہ عابد روڈ حیدرآباد دکن

اُردو زبان محمد قلی اور عبداللہ قطب شاہ کی قدردانیوں کو کبھی فراموش نہیں کر سکتی لیکن موجودہ خسروِ دکن کے عہد میں اُردو کی جو ترقی ہوئی ہے وہ ہر اعتبار سے تمام گذشتہ دوروں سے ممتاز ہے۔ اعلیٰحضرت نے ریاست کے باہر اُردو ادیبوں کی بھی سرپرستی فرمائی ہے۔ عثمانیہ یونیورسٹی کے قیام کے علاوہ جہاں ذریعہ تعلیم اُردو زبان ہے، دارالترجمہ نے قدیم و جدید علوم وفنون کی بہت سی بیش بہا کتابوں کو اُردو میں منتقل کر دیا ہے۔

فاضل مصنف نے تقریبًا دو سو صفحات کے اندر اس ترقی کی مفصل داستان قلمبند کر دی ہے۔ کتاب کی زبان لٹریری ہے پھر بھی حیدرآبادی رنگ غالب ہے۔ اور کہیں کہیں انگریزی اسلوب بیان کی بھی ضرورت سے زیادہ تقلید کی گئی ہے۔ مثلاً ایک مقام پر فاضل مصنف نے "عہد آفریں" لکھا ہے جو (Epoch Makine) کا ترجمہ ہے۔ بعض غیر مانوس اور نامرغوب ترکیبیں بھی استعمال کی گئی ہیں۔ مثلاً "بے بساطی" "مآل بینی" وغیرہ اسی طرح کہیں مذکر کو مؤنث لکھ گئے ہیں جیسے "سوا سو کی منصب عنایت کی گئی"۔ بہرحال بہ حیثیت مجموعی کتاب قابل قدر ہے اور محنت سے لکھی گئی ہے۔ لکھائی چھپائی نفیس اور کاغذ عمدہ استعمال ہوا ہے۔

حیدرآباد دکن کی تعلیمی ترقی گذشتہ ربع صدی میں[۵]

اس کتاب میں سید عبدالقادر صاحب سروری ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل بی مددگار پروفیسر اُردو عثمانیہ یونیورسٹی نے ریاست حیدرآباد کی عام تعلیمی ترقیوں کا ذکر کیا ہے جو پچھلے پچیس سال کے اندر ہوئی ہیں۔ غرض یہ چھوٹی سی کتاب جس میں کل آٹھ باب ہیں ریاست حیدرآباد کی تعلیمی ہسٹری ہے، زبان لٹریری ہے۔ لیکن کہیں کہیں غیر مانوس اور ثقیل الفاظ بھی داخل ہوگئے ہیں مثلاً "اسمات" (جمع سمت) یا "انضمام" (ملانا) استخراج (نکالنا) صحائف (کتابیں)۔ فاضل مصنف نے بعض الفاظ نئے بھی استعمال کئے ہیں۔ مثلاً "یومیے" (روزانہ اُجرت یا انعام) "امیر" وغیرہ۔ ہمارے خیال میں یہ اصطلاحیں رائج ہونے والی نہیں ہیں۔

عصر جدید[۵]

اس چھوٹی سی کتاب میں مسٹر جانکی پرشاد نے عہد عثمانی میں حیدرآباد دکن کی عام

---

[۱] لکھائی چھپائی عمدہ ضخامت ۲۰۶ صفحات قیمت ایک روپیہ۔ ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ ابراہیمیہ عابد روڈ حیدرآباد دکن

[۵] کتابت طباعت کاغذ عمدہ ضخامت ۶ ½ جزو ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ ابراہیمیہ عابد روڈ حیدرآباد دکن

ترقیوں کا مجمل طریقہ پر ذکر کیا ہے۔ شروع میں اعلیحضرت شہریارِ دکن کے خاندانی حالات اور سلطنت آصفیہ کے قیام کے حالات بیان کئے گئے ہیں۔ اس کے بعد اعلیحضرت میر عثمان علی خاں موجودہ نظام دکن کی مختصر سوانح عمری اور شہزادگان والاشان کے حالات ہیں۔ اور بقیہ حصہ میں ریاست کے نظم و نسق، تعلیمی ترقیوں، مالی اصلاحوں، صنعت و حرفت، ریلوے، ڈاک خانہ، امپرومنٹ ٹرسٹ، مسئلہ برار اور فوج کے حالات بیان کئے ہیں۔ اور سب سے آخر میں حکومت آصفیہ کی مذہبی رواداری کی تفصیلات درج ہیں۔ غرض یہ کتاب بڑی تحقیق اور تلاش سے لکھی گئی ہے۔ جسے ریاست حیدرآباد کے مدرسوں میں بطور نصاب داخل ہونا چاہیئے۔ کتاب کی زبان بھی ٹکسالی ہے۔ گو کہیں کہیں اس میں بھی دکنی رنگ غالب ہوگیا ہے۔ بہرحال کتاب قیمتی معلومات سے پُر ہے۔

آصف نامہ[1]

مولوی حبیب اللہ صاحب وفاؔ بی ڈی ایچ اسسٹنٹ ماسٹر ہائی اسکول بیدر نے جو اس کتاب کے مصنف ہیں حیدرآباد کے ایک صاحب علم و فضل خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ آپ کے دادا مولوی حبیب اللہ ذکاؔ بھی فارسی اور اُردو کے نامور شاعر تھے جن کی تعریف مرزا غالب نے کی تھی۔ وفاؔ صاحب بھی پُرگو شاعر ہیں۔ آپ مذہبی قسم کے مصنفین میں ہیں۔ اسی لئے آپ کی شاعری پر مذہبیات کا رنگ بہت زیادہ غالب ہوگیا ہے۔ آپ کے سلاموں کا ایک مجموعہ "جام شہادت" کے نام سے بھی شائع ہوچکا ہے۔ نعتیہ کلام بھی عنقریب شائع ہونے والا ہے۔ "شمیم وفا" کے نام سے آپ نے نظموں کا مجموعہ بھی شائع کردیا ہے اب آپ سات جلدوں میں دکن کے عہد آصفیہ کی مفصل و مکمل تاریخ نظم میں لکھنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ کتاب زیر نظر انہی جلدوں کی آخری کڑی یعنی ساتویں جلد ہے۔ جس میں فاضل مصنف نے اعلیحضرت ہزاگزالٹیڈ ہائنیس موجودہ فرمانروائے حیدرآباد و برار کے عہدِ زرین کے حالات و واقعات نظم فرمائے ہیں۔ مثنوی کی ترتیب پُرانے ڈھنگ پر رکھی گئی ہے۔ یعنی حمد۔ نعت، منقبت، فضائل صحابۂ کبار، فخر و تعلّی اور سبب تالیف وغیرہ سب اسمیں موجود ہے۔ اور عہد عثمانی کے تقریباً تمام اہم واقعات بیان کردئے گئے ہیں۔ شاعری کا نمونہ مندرجہ ذیل اشعار سے کیا جا سکتا ہے جو "فوج" کے متعلق ہیں ؎

سرِ قرطاس اٹھا پرچم قلم کا | بندھا فوجِ مضامیں کا بھی تانتا

[1] کتابت چھپائی کاغذ عمدہ تقطیع ۱۸×۲۲ ضخامت تقریباً ۱۰ جز قیمت عہ ملنے کا پتہ مکتبۂ ابراہیمیہ حیدرآباد دکن

صفت الفاظ ہو زیر و زبر گر ۔۔۔ کرو بالا معانی کا ہو کشور
معانی کا بندھے وہ سلسلہ آج ۔۔۔ زمین شعر ہو میدان [illegible]

کتاب کے شروع میں ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ صاحب کا ایک فاضلانہ مقدمہ درج ہے۔

عروسِ اَدب[1]

یہ قاضی عباس حسین صاحب ظریفؔ دہلوی کے چودہ دلچسپ افسانوں کا دلفریب مجموعہ ہے۔ فسانہ ایک سے ایک بڑھ کر دلچسپ اور سبق آموز ہے۔ کہیں کہیں ہلکی ظرافت کی چاشنی بھی ہے زبان نہایت شستہ اور قابل تعریف ہے۔ ان فسانوں میں سے اکثر "ساقی" اور "شاہجہاں" یا دیگر رسالوں میں وقتاً فوقتاً شائع ہو چکے ہیں اور انکی دلچسپی پڑھنے ہی سے تعلق رکھتی ہے۔ ہم ذیل میں "ٹرین ہٹ" کا پہلا فقرہ درج کرتے ہیں جس سے قاضی صاحب کی زبان اور انکی ظرافت کی حقیقت آشکار ہو جائیگی۔

> "فرنٹیر میل کی کیا بات ہے۔ بڑی خاندانی گاڑی ہے۔ خاصے معقول شریف صورت خوش پوشاک اور اُجلے پوش اسٹیشنوں سے تو بات تک کرنی ہتک سمجھتی ہے۔ ٹھیرنا تو درکنار۔ گو لوگ چشم براہ رہتے ہیں مگر یہ پیشانی پر بل ڈالے تیکھی چتون سے گھورتی، کڑکڑاتی، چھلاوہ کی طرح آگے سے نکل جاتی ہے۔ اور ذرا خیال نہیں کرتی کہ کتنے جلوۂ جانسوز سے بیدم ہو گئے اور کتنے جگر تھام کر رہ گئے۔ لوگ چیختے چلاتے رہ جاتے ہیں۔"

پہلا فسانہ "فردوس تخیل" بہت دلچسپ اور عجیب و غریب ہے۔ اور اگرچہ وہ بادی النظر میں امریکن مصنف واشنگٹن ارونگ کے مشہور افسانہ "Rip Van Winkle" کا چربہ معلوم ہوتا ہے۔ مگر درحقیقت دونوں میں کوئی لگاؤ نہیں ہے۔ جیسا کہ ہم اوپر کہہ چکے ہیں تمام افسانوں کی زبان بہت ہی پیاری ہے۔ مبتدی افسانہ نویس اور مدارس کے طلبا اگر ان فسانوں کا مطالعہ کریں تو بہت فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

کتاب کے آخر میں ظریفؔ صاحب نے اپنی تین غزلیں بھی درج کر دی ہیں جنھیں روح ظرافت کہنا مبالغہ نہ ہوگا۔ دو تین شعر سنئے اور مسکرائیے ؎

راستے میں پھٹ گیا ٹائر جوان کی کار کا ۔۔۔ کام پھر فدوی کو کرنا پڑ گیا بیگار کا
آدمی تو آپ ہیں اور اس میں کیا شک ہو مگر ۔۔۔ دو گھڑی کے واسطے انسان بنکر دیکھئے
سر منڈاتے ہی پڑ گئے اولے ۔۔۔ آپ اسی کو بلا کہتے ہیں

[1] ملنے کا پتہ ساقی بکڈپو کھاری باؤلی دہلی۔

میر مشاعرہ

یہ پروفیسر عشرت رحمانی صاحب کا وہ مزاحیہ مختصر ڈرامہ ہے جو آل انڈیا ریڈیو اسٹیشن دہلی سے ۹ فروری سنہ ۱۹۳۶ء کو سنایا گیا تھا۔ اگرچہ پروفیسر صاحب کے اور بھی افسانے کافی شہرت رکھتے ہیں لیکن مزاحیہ ہونے کی وجہ سے زیر نظر ڈرامہ میں خاص کشش ہے۔ اشخاص ڈرامہ میں یوں تو بہت سے شریک ہیں لیکن قابل ذکر کیرکٹر چار ہیں۔ بقیر صاحب جو پرانی وضع کے ایک خوش وضع اور خوش دل رئیس ہیں جنھیں شاعر تو در کنار میر مشاعرہ بننے کا شوق ہے۔ انہی میر صاحب کو ڈرامہ کی جان یا ہیرو سمجھنا چاہیئے۔ دوسرے حضرت ایک حکیم صاحب آذر تیسرے مہاراج ایک ویدجی ہیں، یہ دونوں حضرات میر صاحب کے ہم جلیس ہیں اور انہی کی تحریک سے میر صاحب میر مشاعرہ بننے پر آمادہ ہوئے ہیں۔ چوتھا اگر قابل قدر کردار بیگم صاحبہ یعنی میر صاحب کی بیوی کا ہے جنکی زبان واقعی بیگماتی ہے حکیم صاحب اور ویدجی کی تحریک پر میر صاحب نے مشاعرہ کا اہتمام کرنا اور خود میر مشاعرہ بننا اپنے ذمہ لیا۔ آپ کے لئے غزل ویدجی اور حکیم صاحب نے کہی اور جب مشاعرہ ہوا تو وہ غزل خود اپنے ہی نام سے پڑھی، میر صاحب تاپتے رہ گئے۔ آخر میں وہ ٹربونگ ہوئی جو مشاعروں کا لوازمہ ہوگیا ہے۔ غرض بحیثیت مجموعی ڈرامہ دلچسپ ہے۔ زبان اچھی لکھنے کی کوشش کی گئی ہے تاہم کہیں کہیں تھوڑی سی پنجابیت بھی آگئی ہے جو نظر انداز کرنیکے قابل ہے۔ لکھائی چھپائی معمولی، کاغذ اچھا، قیمت آٹھ آنہ۔ ملنے کا پتہ منیجر صاحب نیرنگستان دہلی

زاد راہ

اس نام سے حالی پبلشنگ ہاؤس دہلی نے ملک کے شہرہ آفاق افسانہ نویس منشی پریم چند صاحب کے پندرہ افسانوں کا مجموعہ شایع کیا ہے۔ پریم چند کے افسانے اب کسی تنقید کے محتاج نہیں ہیں۔ یہاں پر ہم صرف اتنا ہی لکھنے پر اکتفا کرتے ہیں کہ اس مجموعہ کا ہر افسانہ سبق آموز اور دلکش ہے۔ اس میں منشی صاحب کی سب خصوصیات موجود ہیں۔ ایک جگہ فرماتے ہیں:۔

"بڑوں کے پاس دولت ہوتی ہے۔ چھوٹوں کے پاس دل ہوتا ہے۔ دولت سے عالیشان محل بنتے ہیں عیاشیاں ہوتی ہیں۔ مقدمہ بازیاں کی جاتی ہیں۔ رعب جتایا جاتا ہے۔ اور انسانوں کو کچلا جاتا ہے۔ دل سے ہمدردی ہوتی ہے۔ زخم پر مرہم رکھا جاتا ہے اور آنسو نکلتے ہیں"

زاد راہ نامی قصہ اس مجموعہ کا شاہکار اور مایہ ناز افسانہ ہے۔ "زیور کا ڈبہ" "خانہ داماد" "نیور" اخلاقی حیثیت سے سبق آموز ہیں۔ "لاٹری" "ہولی کی چھٹی" "فریب" "بڑے بھائی صاحب" بہت دلچسپ ہیں۔ "مس پدما" "زاد راہ" سوسائٹی کی کمزوریوں کا خاکہ پیش کرتے ہیں۔
ضخامت حجم ۲۴۰ صفحات۔ لکھائی چھپائی کاغذ اعلیٰ۔ قیمت عہ سلنے کا پتہ: حالی پبلشنگ ہاؤس کتاب گھر دہلی

یادِ رفتگان

راجہ سر رامپال سنگھ

اُس شخص کی موت حقیقت میں ایک انبوہ کی موت ہوتی ہے جس کے زیر سایہ عاطفت ہزاروں آدمیوں کی پرورش وابستہ ہوتی ہے، اور جس کی زندگی کے ساتھ پبلک سرگرمیوں کا سلسلہ لگا ہوا ہوتا ہے۔ چنانچہ دلی رنج و افسوس کے ساتھ لکھنا پڑتا ہے کہ ۳ اپریل ۳۶ء کو صوبہ متحدہ ایسے ہی ہردلعزیز سرپرست اور مقتدر ہستی سے محروم ہو گیا جو نہ صرف ملک کا ایک سیاسی اور سماجی لیڈر تھا بلکہ بقول حالی "یتیموں کا ماوا غریبوں کا ملجا" تھا۔ ہماری مُراد صوبہ متحدہ کے مشہور و معروف تعلقدار راجہ سر رام پال سنگھ سے ہے جو پچھتر سال کی عمر میں بمقام لکھنو رہگرائے عالم جاودانی ہو گئے۔

راجہ صاحب مرحوم صوبہ اودھ کے ممتاز سربرآوردہ تعلقداروں میں تھے۔ اور اسقدر سرگرم عمل اور باثر شخص تھے کہ اپنی عملی سرگرمیوں اور ہردلعزیزی کی بدولت برٹش انڈین ایسوسی ایشن یعنی انجمن تعلقداراں اودھ کے چار مرتبہ پریسیڈنٹ منتخب ہوئے تھے۔ راجہ کا خطاب خاندانی طور پر حاصل تھا۔ آپکے جد بزرگوار ضلع رائے بریلی کے مشہور و معروف زمیندار راجہ دینیدیال صاحب تھے جنھوں نے غدر ۱۸۵۷ء کے زمانہ میں گورنمنٹ کی نمایاں خدمات انجام دی تھیں۔

آپ کے سر سے والد کا سایہ سات ہی برس کی عمر میں اُٹھ گیا تھا۔ اسلئے آپ کی ریاست کا انتظام عرصہ تک کورٹ آف وارڈس کی نگرانی میں ہوا۔ آپ کی تعلیم کی ابتدا رائے بریلی ہائی اسکول میں ہوئی بعدہٗ تکمیل تعلیم کی غرض سے علی گڈھ کالج گئے۔ یہاں جس یورپین استاد کے سپرد آپکی تعلیم تھی، انھوں نے آپ کی خداداد ذکاوت اور درخشاں فراست کو دیکھ کر فرمایا تھا کہ جب تک ہندوستان کے رؤسا میں راجہ رام پال سنگھ جیسے شخص پیدا ہو سکتے ہیں۔ اسوقت تک انھیں اپنے مستقبل کی طرف سے ہرگز مایوس نہ ہونا چاہیئے

واقعی جو روشن توقعات اس یورپین ٹیچر نے راجہ رام پال سنگھ کی ذات سے قایم کی تھیں وہ انہوں نے اپنی آئندہ زندگی میں تمام و کمال پوری کردیں۔

اگرچہ راجہ سر رام پال سنگھ پرانی وضع کے بزرگ تھے اور ان کی رسمی تعلیم بھی تکمیل کو پہونچنے نہ پائی تھی

لیکن عہد جدید کی تمام خوبیاں آپکی ذات گرامی میں جمع ہوگئی تھیں۔ آپ اپنی فطری دریا دلی کی وجہ سے کاشتکاروں کی سرپرستی اور پرورش کی طرف مائل تھے، اور انھوں نے تمام زندگی ان کی امداد و اعانت میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھا۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ آپ کے تعلقہ کا بچہ بچہ آپ کا دم بھرتا تھا۔ آپ کی عزت و احترام کی یہ حالت تھی کہ صوبہ کے گورنر تک آپ کی توصیف میں رطب اللسان تھے۔ اِس بے نظیر ہردلعزیزی اور اس قابل قدر عزت و احترام کا اصلی اور حقیقی سبب ان کے دل اور دماغ کی خوبیاں اور وہ قابل رشک اوصاف تھے جنھیں یاد کر کے ہم آج یہ چند سطور لکھنے پر مجبور ہوئے ہیں۔

آپ کو اپنی رعایا اسقدر عزیز تھی کہ ان کے حالات سے واقفیت حاصل رکھنا آپ نے اپنا ایک مستقل فرض سمجھ رکھا تھا۔ عرصہ دراز تک وہ روزمرہ علی الصباح گھوڑے پر سوار ہو کر خود رعایا کا حال دیکھنے اور کھیتوں میں ان کے دُکھ سُکھ کی نسبت بات چیت کرتے۔ اور پھر تمام معلومات کو اپنی نوٹ بک میں درج کر کے رفع شکایات کی کوشش میں مصروف ہو جاتے۔

مرحوم نے انجمہائے امداد باہمی کو اپنی رعایا کے لئے سودمند سمجھکر اپنی ریاست میں جگہ جگہ کواپریٹو سوسائٹیاں قائم کردیں۔ بارش کی کمی یا کسی اور آفت ناگہانی کی وجہ سے جب کبھی فصلیں تباہ و برباد ہو کر قحط کی حالت طاری ہوئی تو آپ نے ہمیشہ قحط ریلیف کی غرض سے امدادی کام جاری کردئے۔ وہ اس سے خوب واقف تھے کہ مقدمہ بازی کیسی تباہ انگیز ہوتی ہے۔ اسی لئے انھوں نے معمولی نزاعات کے تصفیہ کے لئے اپنے علاقہ میں دیہاتی پنچایتیں بھی قائم کردی تھیں۔ شہروں اور قصبوں میں طبیبوں اور ویدوں کی کوئی کمی نہیں ہوتی اور ڈاکٹر اور شفاخانے بھی موجود ہوتے ہیں۔ لیکن غریب دیہاتیوں کو اس بارے میں کوئی سہولتیں نصیب نہیں ہیں۔ راجہ رام پال سنگھ صاحب نے اس طرف بھی توجہ کی۔ اور اپنی ریاست میں کئی اسپتال اور شفاخانے قائم کئے۔ کاشتکاروں کو جدید فن زراعت کی تعلیم دینے کی غرض سے نمونہ کے زراعتی فارم کھولے اور دودھ، مکھن اور گھی کی تجارت کا کام سکھانے کے لئے دودھ مکھن کا کارخانہ کھولا۔ غرض مرحوم کا دامن شفقت اپنی رعایا کے سر پر بہت وسیع تھا۔ عموماً وہ بمشکل کسی آسامی کو بے دخل کراتے تھے۔ اور زمین کو پٹہ دیتے وقت کاشتکاروں سے نذرانہ لینے کی رسم بھی موقوف کردی تھی۔ مویشیوں کی پرورش کے خیال سے دیہات کی تمام افتادہ زمینیں چراگاہوں کے لئے دیدی تھیں۔ اور جب کبھی کسانوں پر کوئی ناگہانی آفت آتی تو وہ ہمیشہ لگان معاف کر دیتے تھے۔ اکثر اوقات وہ گورنمنٹ سے بھی زیادہ چھوٹ دیدیا کرتے تھے۔ ان کی آبائی ریاست کچھ بہت بڑی نہ تھی لیکن انھوں نے اپنی کوششوں سے اسکو بہت معقول وسعت دیدی تھی

اصلاح معاشرت کے میدان میں بھی راجہ صاحب مرحوم نے بڑے بڑے کارہائے نمایاں انجام دئے۔

اپنے کاشتکاروں کے بچوں کی تعلیم کے انھوں کیلئے کئی مدرسے قائم کردئے تھے۔

راجہ صاحب مرحوم قومی ضرورتوں سے بھی بے خبر نہ تھے۔ شدھی اور سنگھٹن کے حامی اور ہندو مہاسبھا کے روح رواں تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ ہندو ہاتھ پر ہاتھ رکھے نہ بیٹھے رہیں۔ اگر انہیں دنیا میں عزت کے ساتھ جینا ہے تو ہاتھ پاؤں ہلائیں اور سنگھٹن سے اپنی اجتماعی طاقت کو بڑھائیں۔ لیکن وہ اس کے ساتھ اس بات کے بھی روادار نہ تھے کہ ہندوستان کی دوسری قوموں کے خلاف کوئی کارروائی کی جائے۔ آپ سودیشی تحریک کے دل وجان سے حامی تھے، لیکن یہ بات پسند نہ کرتے تھے کہ کسی شخص کو جبر و اکراہ کے ذریعہ سے اپنا ہم خیال بنایا جائے۔ آپ ہمیشہ ترغیب و تلقین سے کام لینا پسند کرتے تھے اور اسی طریقہ سے ہمیشہ کامیاب ہوتے تھے۔

عموماً شدھی اور سنگھٹن اور ہندو مسلم اتحاد، تحریکیں ایک دوسرے کی ضد سمجھی جاتی ہیں۔ لیکن مرحوم کے کیرکٹر کی یہ عجیب بات ہے کہ ایک طرف وہ شدھی اور سنگھٹن کے حامی تھے اور دوسری طرف وہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں اتفاق و اتحاد کے بھی علمبردار تھے اور خوب جانتے تھے کہ ہندوستان کی آئندہ ترقی کے لیے اتحاد و اتفاق اشد ضروری ہے۔

آپ پرانی فضول رسمیں بھی پسند نہ کرتے تھے۔ اور بچپن کی شادی اور پردہ کی رسم کے بھی خلاف تھے کھانے پینے کے متعلق بھی فضول قیود کے مخالف تھے۔ صوبہ متحدہ کی شاید ہی کوئی قومی تحریک ایسی ہو جو آپ کی احسانمند نہ ہو۔ اور خوبی یہ تھی کہ جس کام میں ہاتھ ڈالتے تھے اسے ہمیشہ پورا کرکے چھوڑتے تھے۔

مرحوم کو جسقدر ہندؤں کی فلاح و بہبود کا خیال تھا، اتنی ہی فکر آپ اپنی قوم یعنی ٹھاکروں کی ترقی کی تھی۔ چنانچہ اسی خیال سے انھوں نے "کشتری مہاسبھا" قائم کی۔ اور اس کو ترقی دینے کے لئے مالی امداد سے بھی دریغ نہیں کیا۔ تعلقداران اودھ میں آپ کی پوزیشن خاص طور پر سربرآوردہ تھی۔ اور حقیقت تو یہ ہے کہ آپ کی وفات حسرت آیات سے تعلقداران اودھ میں جو جگہ خالی ہو گئی ہے وہ شاید کبھی پر نہ ہوسکے گی۔ انجمن تعلقداران اودھ کے پریسیڈنٹ کی حیثیت سے آپکو جو وقار حاصل تھا وہ بہت کم لوگوں کو نصیب ہوا ہوگا۔ آپ چار مرتبہ اس معزز انجمن کی صدر منتخب ہوئے ہر قسم کا اثر و اقتدار رکھتے ہوئے بھی آپ سب کام ہمیشہ عام اتفاق رائے ہی سے طے کرنا پسند کرتے تھے غرض ان میں شرافت و اخلاق کے ساتھ ساتھ ہمت اور پامردی بھی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔

آپ نہایت خوش مزاج واقع ہوئے تھے۔ چہرہ پر ہمیشہ خوش آیند مسکراہٹ ہی رہتی تھی۔ اور اشتعال دلانے پر بھی انھیں کبھی غصہ نہ آتا تھا۔ دراصل تدبر اور تدبیر دونوں آپ کے روبرو ہر وقت

ہاتھ باندھے حاضر کھڑے رہتے تھے اور آپ مشکل سے مشکل معاملہ کو چٹکیوں میں حل کر دیتے تھے۔

سیاسی حیثیت سے آپ لبرل خیالات کے پیرو تھے اور اودھ لبرل لیگ کے پریسیڈنٹ تھے دسمبر ۱۹۲۶ء میں آل انڈیا لبرل فیڈریشن کا جو اجلاس لکھنؤ میں منعقد ہوا تھا اس کی مجلس استقبالیہ کے چیرمین بھی آپ ہی تھے۔ مگر علالت کیوجہ سے اجلاس میں شریک نہیں ہو سکے تھے۔ لیکن آپ کا صدارتی ایڈریس اجلاس میں پڑھ کر سنا دیا گیا تھا جس کے لفظ لفظ سے حُبِ وطن کی خوشبو مہکتی ہے۔

تعلقداران اَودھ نے جب "پائنیر اخبار کو خریدا تو اس کی مینجنگ کمیٹی کے سب سے پہلے پریسیڈنٹ بھی آپ ہی منتخب ہوئے۔ اور اس سے قبل آپ کچھ عرصہ تک اخبار "لیڈر" الہ آباد کے بھی ڈائرکٹر رہ چکے تھے غرض آپ کی ذات والاصفات سے صوبہ کی ہر پبلک تحریک کو تقویت حاصل تھی۔ اور گورنمنٹ میں بھی آپ کی بہت بڑی عزت و وقعت تھی۔ چنانچہ "کے سی ایس آئی" اور "سی آئی ای" کے خطاب آپ کو مل چکے تھے۔

مرحوم کے پسماندگان میں پسر متبنیٰ کے علاوہ آپ کے برادر خورد ٹھاکر ہنومان سنگھ رائے بہادر خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ پرماتما آپ کی روح کو شانتی دیں اور پسماندگان کو ان کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائیں۔

خان بہادر سعید الدین خاں مرحوم

فنا را بادۂ ہر جام کردند چہ بیدردانہ اُو را عام کردند

از مسٹر محمد حسین زبیری

موت اس عبرت سرائے فانی میں ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے۔ جو وقتِ مقررہ پر آکر نظامِ زندگی کو درہم برہم کر دیتی ہے۔ عشرت کدہ ماتم کدہ بن جاتا ہے۔ دل بیٹھ جاتے ہیں۔ آنکھیں غم وصدمہ کی ترجمانی میں آنسو بہاتی ہیں چہروں پر افسردگی چھا جاتی ہے۔ یہ سب کچھ عموماً ہوتا ہے جانے والے کا ساتھ کوئی نہیں دے سکتا۔ تھوڑی دیر کے لئے حیات مستعار کے آخری منزل کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے اس کے بعد پھر دنیا کے جالوں میں پھنس کر ہم پھر اس سے بے خبر ہو جاتے ہیں۔

اس عالمِ فانی کا یہی دستور ہے۔ ایسا ہی ہوتا ہے اور ایسا ہی ہوتا رہے گا۔ تاہم بعض نفوس قدسی اپنا دورِ حیات پورا کر کے کچھ اس انداز سے دامن جھاڑ کر اس دنیا سے اُٹھ جاتے ہیں کہ ان کی زندگی بھی سبق آموز ہوتی ہے اور ان کی موت بھی دعوت عمل کا درس دیتی ہے۔

مولوی سعید الدین خاں مرحوم سکرٹیری ایجوکیشنل بورڈ صوبہ متحدہ کا شمار بھی انہی پاک نفوس

میں تھا جنکی موت کا غم عرصہ دراز سے دلوں سے محو نہ ہوگا

۲ ر اپریل ۴۶ء بمقام لکھنؤ کنگ جارج ہسپتال میں گردہ کے آپریشن کے بعد وہ ہم سب سے ہمیشہ کے لئے جدا ہوگئے اور ۳ ر اپریل کو الہ آباد میں سپرد خاک ہوئے۔ کسی کو شان و گمان بھی نہ تھا کہ چھ سات دن کی مختصر علالت مفارقت دائمی کا پیش خیمہ بن جائیگی۔ دفن میں تقریباً پانچسو آدمی شریک تھے۔ سر شاہ محمد سلیمان چیف جسٹس ہائی کورٹ الہ آباد، جسٹس نعمت اللہ۔ سر شفاعت احمد خاں، عبدالمجید خواجہ۔ ڈپٹی عبدالرؤف صاحب، کپتان خدا داد خاں، سید آل علی صاحب نقوی دیگر عمائدین و اہالیان شہر کے علاوہ محکمہ تعلیم کے انگریز ہندو مسلمان افسران اور کلرکوں کی کثیر تعداد شریک غم تھی۔ مرحوم کی عمر تقریباً اکیاون سال کی ہوئی محکمہ تعلیم میں مختلف عہدوں پر تقریباً تیس سال کی بیش بہا خدمات کی بدولت ایک ممتاز پوزیشن حاصل کرلی تھی اور صوبہ بھر میں تعلیم سے لگاؤ رکھنے والے اشخاص میں بہت سے ان کے جاننے والے اور انکا عزت و احترام سے ذکر کرنیوالے موجود تھے۔ انکا حلقہ احباب بہت وسیع تھا اور وہ اخلاق حسنہ کا بہترین نمونہ پیش کرتے تھے۔ سلف صالحین کا رنگ انکی پاک زندگی میں جھلکتا تھا۔ صاحبان فضل کمال میں انکا شمار تھا۔ ذہانت و ذکاوت ان میں پائی جاتی تھی۔ طرز معاشرت میں نہایت سادگی و بے تکلفی طبیعت میں انکسار کے ساتھ خلوص اور نیکی کے ساتھ ایک خوشگوار ظرافت بھی تھی۔ نہایت خوش اوقات پابند صوم و صلوٰۃ اور تہجد گزار بزرگ تھے۔ انگریزی خواں طبقے میں بہت کم اصحاب ایسے پابند مذہب ہوں گے جیسے کہ مرحوم تھے۔

مگر ان کے حلقہ احباب میں جس میں حکام بالا دست سے لیکر غریب پردیسی بھی شامل تھے مذہب و ملت کی کوئی تفریق نہ تھی۔ جو شخص ان سے ایک بار مل لیا وہ ہمیشہ کے لئے انکے اخلاق کا گرویدہ ہوگیا۔ ہندو بھی ان سے خوش اور مسلمان بھی ان پر دل جان سے فدا تھے۔ وہ سب کے کام آنیوالے اور سب سے محبت کرنے والے تھے اور سچ تو یہ ہے کہ عجیب لطف و انداز کے ساتھ زندگی کی بہار دکھلا گیے اور ایسے نقش قدم چھوڑ گئے جن پر چلکر ہم اپنی زندگی سدھار سکتے ہیں۔

آج ان کی ناوقت وفات پر صوفیہ کرام کے حلقہ میں بھی صف ماتم بچھی ہوئی ہے۔ بزرگوں سے بڑی عقیدت تھی۔ حضرت شاہ محب اللہ الہ آبادیؒ اور حضرت منور علی شاہ عمر درازؒ کے مزارات پر حاضری اور فاتحہ خوانی ان کے معمول میں داخل تھی۔

گو آپکا وطن ٹونک تھا مگر ملازمت کے سلسلے میں عرصہ سے الہ آباد میں قیام تھا۔ آخر وہیں پیوند زمیں ہوئے۔ آپ نے ایک بیوہ۔ دو صغرسن لڑکیاں اور ایک لڑکا مسٹر ظفر احمد خاں ایم۔ اے۔ بی۔ سی۔ اپنی یادگار چھوڑا ہے۔ خداوند تعالیٰ مرحوم کو غریق رحمت کرے۔ اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔



راجه سر رامپال سنگهه مرحوم کے - سی - آئی - ای

لوازمات تاجپوشی ۔ یعنی تاج شاہی و تاج سینٹ اڈورڈ و شمشیران سلطنت و عصاء شاہی وغیرہ وغیرہ جو شاہان انگلستان کی رسم تاجپوشی کے وقت استعمال ہوتے ہیں۔

لوازماتِ تاجپوشی

لوازمۂ شاہی انگلستان کے لوازمات تاجپوشی میں یوں تو بہت سی چیزیں داخل ہیں لیکن جو چیزیں ویسٹ منسٹر ایبے میں تاجپوشی کے وقت بادشاہ کے سامنے پیش کیجاتی ہیں اُن میں خاص خاص یہ ہیں :-

(۱) **عقابِ زرّیں** (The Ampulla) یہ عقاب کی شکل کی ایک طلائی شیشی ہوتی ہے۔ عقاب کی گردن اُٹھی ہوئی اور پر پھیلے ہوئے ہوتے ہیں، گردن میں پیچ اور پیٹ خالی ہوتا ہے جسمیں متبرک تیل بھرا ہوتا ہے۔ شیشی کے ساتھ ایک خوبصورت جواہرنگار طلائی چمچہ بھی ہوتا ہے جسمیں عقابی شیشی سے تیل اُنڈیل کر بادشاہ کے سر میں لگایا جاتا ہے۔

(۲) **سینٹ ایڈورڈ کا تاج**۔ جو سونے کا بنا ہوا ہے اور جس کے چاروں طرف بیشمار جواہرات جڑے ہوئے ہیں۔ یہ انگلستان کا شاہی تاج ہے جسکے ذریعہ تاجپوشی کی رسم ادا ہوتی ہے مگر یہ تاج صرف تاجپوشی کے وقت کام آتا ہے۔ گو یہ روایتاً الفریڈاعظم سے بھی پہلے کا بتایا جاتا ہے لیکن درحقیقت سنہ ۱۶۶۱ء میں تیار ہوا تھا کیونکہ اصلی تاج کرامویل نے تباہ کر دیا تھا۔

(۳) **امپیریل اسٹیٹ کراؤن**۔ یہ وہ تاج ہے جو رسم تاجپوشی ادا ہونے کے بعد بادشاہ دربار کے موقعوں پر پہنتا ہے اس میں بہت سے نادر تاریخی جواہرات جڑے ہوئے ہیں، مثلاً ایڈورڈ بلیک پرنس کا لعل، سینٹ ایڈورڈ کی انگوٹھی کا پکھراج، ملکہ الزبتھ کے گوشوارے، اور اسی قسم کے بہت سے مشہور تاریخی جواہرات ہیں جنکی تعداد تین ہزار سے زائد ہے۔ سامنے "ستارۂ افریقہ" نامی ہیرا جڑا ہوا ہے جو تراشنے کے بعد بھی ½ ۳۰۹ قیراط وزن کا ہے۔

(۴) **کُرّہ** (ORB) یہ چمکدار سونے کا ایک خوبصورت اور جواہرنگار گولہ ہے جس کا قطر چھ انچ ہے اس میں سیکڑوں موتی یاقوت نیلم اور زمرد جڑے ہوئے ہیں، اوپر ایک جواہرنگار صلیب ہے۔ یہ بادشاہ کے ہاتھ میں اُس وقت دیا جاتا ہے جب وہ شاہی لباس پہن چکتا ہے۔

(۵) **عصائے شاہی**۔ یہ عصا دو قسم کے ہیں، ایک جسے عصائے سلطنت کہتے ہیں سونے کا ہے اور اسمیں بیش قیمت جواہرات جڑے ہوئے ہیں سر پر صلیب اور اسکے نیچے بہت بڑا ہیرا ہے۔ دوسرا عصا وہ ہے جسے عصائے مراحم خسروانہ کہتے ہیں یہ بھی طلائی اور جواہرنگار ہے مگر اس کے سر پر صلیب کے بجائے ایک سفید رنگ کی قمری بنی ہوئی ہے۔

(۶) **شاہی انگشتری**۔ یہ طلائی انگوٹھی ہے جس پر بیش قیمت نگینے جڑے ہوئے ہیں

(۷) **مہمیز**۔ یہ طلائی مہمیز ہیں اور زمانۂ شجاعت کی نشانی ہیں چونکہ بادشاہ خود "نائٹ" اور "نائٹ گر" ہوتا ہے اسلئے ان مہمیزوں کا ہونا ضروری ہے

(۸) **تلواریں**۔ یہ متعدد تلواریں ہیں مثلاً (۱) رحم کی تلوار (۲) سلطنت کی تلوار (۳) دنیوی عدالت کی تلوار (۴) روحانی عدالت کی تلوار۔ ان سب تلواروں کے قبضے اور نیام بیش قیمت جواہرات سے مزین ہیں۔

(۹) **سارجینٹ ایٹ آرمس کے ڈنڈے**۔ یہ چوبداروں کے طلائی اور جواہرنگار عصا ہیں۔

ماہِ رواں

اس وقت ملک میں دو مسئلے خاص دلچسپی کا باعث بنے ہوئے ہیں، ان میں ایک تو کانگریس اور وزارتوں کا مسئلہ ہے، اور دوسرا کانگریس میں مسلمانوں کی شرکت کا معاملہ ہے۔ پہلے معاملے کے متعلق ہندوستان اور انگلستان دونوں ملکوں میں بہت کچھ اظہار خیالات ہو چکا ہے۔ ہاؤس آف لارڈس میں لارڈ زٹیلینڈ وزیر ہند کی دوسری تقریر کا لہجہ مربیانہ نرم و مصلحت آمیز تھا جس سے یہی مترشح ہوتا ہے کہ گورنمنٹ برطانیہ موجودہ قانون کی حدود و شرائط کے اندر اس بات کی دل سے خواہشمند ہے کہ کانگریس صوبوں میں حکومت کی ذمہ داری قبول کرلے۔ مختلف صوبوں میں "عارضی" وزارتوں کے جو پروگرام تیار ہوئے ہیں وہ شروع سے آخر تک کانگریسی مقاصد کو پیش نظر رکھکر مرتب کئے گئے ہیں اور گورنر صاحبان کو اُن کی تیاری میں خاص دخل رہا ہے اور اُنھوں نے اس کی تیاری میں وزیروں کی پوری رہنمائی کی ہے۔ بمبئی کے وزراء نے تو قریب قریب سبھی باتوں میں کانگریس کے اعلان کردہ اصولوں کی تائید و تقلید کی ہے۔ ان سب واقعات سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ گورنر صاحبان ملکی نظم و نسق میں کانگریس کی تجویزوں کا تجربہ کرنیکو تیار ہیں اور عوام کی ترقی کی کوشش میں وزراء صوبہ کے راستے میں روڑے اٹکانا نہیں چاہتے۔ بلاشبہ وزیروں کو پورے آئینی حقوق ملنے میں کچھ وقت ضرور لگے گا، بہت سی جزوی باتیں ہونگی جنکو گورنر اپنی مرضی کے مطابق طے کرنا چاہیں گے لیکن اس کا صحیح علاج رفتہ رفتہ ہی ہو سکے گا۔ جیسے جیسے عام رائے مضبوط ہوتی جائیگی گورنروں کا رویہ ٹھیک ہوتا جائیگا۔ بحالت موجودہ جب تک مناریٹی پارٹی کی وزارتیں قائم ہیں گورنر کی آئینی حیثیت قائم ہی نہ ہونے پائیگی۔ صوبہ متحدہ ہی میں دیکھئے کہ مناریٹی وزراء کے جلسۂ شہرت کی صدارت بھی ہز اکسیلنسی گورنر صوبہ ہی کو کرنا پڑتی ہے۔ اس لحاظ سے بھی ضروری ہے کہ یہ وزارتیں جلد سے جلد ختم کی جائیں اور لیجسلیٹو اسمبلی کے باقاعدہ اجلاس شروع ہوں۔ اس طرف کانگریسی وزارتوں کے قائم ہونے کے موافق فضا پیدا ہو رہی ہے، عام رائے کا قطعی تقاضا ہے کہ کانگریسی لیڈران حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لیں عام لوگوں کے علاوہ قلیل التعداد جماعتوں کی بھی یہی خواہش ہے۔ مدراس میں جسٹس پارٹی کے رہنماؤں نے اس کا علانیہ مطالبہ کیا ہے۔ سر محمد عثمان، ڈاکٹر شفاعت احمد خاں اور بہت سے دیگر مسلم لیڈروں نے اسکی حمایت کی ہے۔ عیسائیوں کی بھی یہی خواہش ہے اور غالباً اسی وجہ سے کانگریس نے (بقول مہاتما گاندھی) مصالحت کا دروازہ قصداً کھلا رکھا ہے۔ گورنمنٹ افسران کے مصالحانہ رویہ کے ساتھ ساتھ کانگریس لیڈران بھی حسب ضرورت مناسب سہولتیں پیدا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ حال میں گورنر بمبئی اور گورنر صوبہ متحدہ نے اپنے آئینی حقوق و اختیارات کی جو توضیح کی ہے اُس سے بہت کچھ غلط فہمی دُور ہو جانا چاہیئے۔ صاحب وزیر ہند سے لیکر گورنران صوبہ تک سب اس بات کا

بار بار اعلان کر چکے ہیں کہ معمولی حالات میں وزرائے صوبہ کے وسیع میدان عمل میں ان کی طرف سے مداخلت کا خوف محض بے بنیاد ہے۔ سر سیری ہیگ بالقابہ نے ان امور کی بھی واضح طور پر حد بندی کر دی ہے جن میں وہ مداخلت کے مجاز سمجھے جا سکتے ہیں۔ ادھر کانگریس بھی کئی بار اس کا اعلان کر چکی ہے کہ اس وقت نئے گورنمنٹ انڈیا ایکٹ کی ترمیم یا تنسیخ کا کوئی سوال اس کے سامنے نہیں ہے اور وہ کوئی ایسا مطالبہ پیش کرنا نہیں چاہتی ہے جو موجودہ ایکٹ کے منافی ہو۔ مہاتما گاندھی نے اپنے مطالبے کو اب بہت ہی مختصر کر دیا ہے۔ لارڈ زٹلینڈ بھی حال میں اس بات پر اظہار افسوس کر چکے ہیں کہ کانگریسی لیڈران جن میں سے اکثر کی لیاقت و تجربہ کاری کے وہ قائل ہیں صوبوں کی حکمرانی کی ذمہ داری نہیں لے رہے ہیں۔

اس کے بعد ہی مہاتما گاندھی نے ٹائمس آف انڈیا کے خاص نامہ نگار کو جو بیان دیا ہے اسمیں انھوں نے اپنی نیک نیتی کو اور بھی واضح کر دیا ہے جس کے بعد ہماری سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ حضور والسرائے کو اس معاملے میں کانگریس لیڈران سے براہ راست بات چیت کرنے میں کون سا امر مانع ہے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ ابھی تک جس قدر سلسلہ جنبانی ہوئی ہے اسمیں حضور والسرائے کا کوئی حصہ نہیں رہا ہے۔ ہز ایکسلنسی نے حال ہی میں شملہ میں مویشی کانفرنس کے افتتاح کے موقعہ پر ایک طولانی تقریر کی لیکن انھوں نے کسی موقع پر موجودہ گتھی کے سلجھانے کی طرف کوئی اشارہ بھی نہیں کیا ہے۔

بہرحال مہاتما جی کا یہ کہنا بالکل درست ہے کہ حکام ہند ہوا سے باتیں کر رہے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کانگریس سے براہ راست گفتگو کرتے ہوئے انھیں جھجک سی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ گو وہ کانگریس کی بابت باتیں کرتے ہیں لیکن اس سے دوبدو ہو کر تبادلۂ خیالات سے گریز ہے۔ حالانکہ انتخابات کے بعد ملک میں کانگریس کی جو پوزیشن قائم ہو گئی ہے اس کا نظرانداز کرنا نہ ممکن ہے اور نہ مصلحت۔ نئے وزیراعظم برطانیہ مسٹر نیوائل چیمبرلین نے حال ہی میں دارالعوام میں اسبات کا اعلان کیا ہے کہ وہ احمقانہ ضد کی پالیسی کے کسی طرح طرفدار نہیں ہیں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ وہ اس معاملے میں والسرائے کو مناسب ہدایات بھیجکر انھیں جلد سے جلد معاملات کو رو براہ لانے کی طرف متوجہ نہیں کرتے۔ ایسے اہم موقعوں پر والسرائے کا سکوت اختیار کرنا اور ایسے ضروری معاملات کو وزیر ہند کے سر ڈال دینا کسی طرح مناسب نہیں کہا جا سکتا ہے۔ مہاتما گاندھی مکرر سہ کرر تعاون کا ہاتھ آگے بڑھا چکے ہیں لیکن لارڈ لنلتھگو ابھی تک خاموش ہیں جیسے ملک میں کوئی بات ہی نہیں ہوئی ہے حالانکہ انگلستان و ہندوستان کا کوئی مدبر ایسا نہیں بچا جس نے اس مسئلے پر اپنی رائے نہ دی ہو۔ حال میں لارڈ ہیلی نے بھی لیڈران کانگریس کے قبول عہدہ کی حمایت کی ہے۔

غرض سب کی یہ رائے ہے کہ موجودہ حالات میں خوشگوار تبدیلی ہونا چاہیے اور اس کے لئے ضروری

حسن تدبیر سے کام لینے میں عذر نہ ہونا چاہیئے۔ ورنہ موجودہ حالات کے خواہ مخواہ بد سے بدتر ہونے کا اندیشہ ہے۔ آخر جون تک کانگریس ورکنگ کمیٹی کا دوسرا جلسہ ہونیوالا ہے۔ ہمکو اُمید ہے کہ اس وقت تک یہ مرحلہ بطریق احسن طے ہو جائیگا۔ دراصل اب گورنمنٹ و کانگریس کے درمیان مصالحت ہونے میں کوئی وجہ مانع نہیں دُور اندیشی و دانشمندی کا تقاضا یہ ہے کہ موجودہ جمود کا جلد سے جلد خاتمہ ہو جائے۔

نئی گورنمنٹوں میں پنجاب میں سر سکندر حیات خاں وزیر اعظم بڑی قابلیت سے کام کر رہے ہیں۔ پانی پت کے فرقہ وارانہ فساد میں بھی وزارت پنجاب کا مناسب و منصفانہ رویہ رہا۔ بیشک ملکی نظم و نسق میں سر سکندر حیات اور اُن کے رفقا نے ایک اعلیٰ معیار پیش نظر رکھا ہے۔

پنجاب کے بعد بمبئی کے عارضی وزرا بھی اپنے فرائض کی ادائیگی میں قابلیت و مستعدی کے ساتھ منہمک ہیں۔

کلکتہ کی جوٹ ملوں کی ہڑتال کا خاتمہ وزیر اعظم بنگال کی وزارت کا پہلا کارنامہ ہے جس پر سر فضل حق ہماری مبارکباد کے مستحق ہیں۔ سر ممدوح مالکان کارخانجات اور حکام گورنمنٹ دونوں کو جلد سے جلد سمجھوتہ کی شرائط پوری کرنے کیلئے تیار کر رہے ہیں زمینداری اور لگان کے مسئلہ کے حل کرنیکا بھی انھیں خیال ہے۔

صوبہ بہار میں مسٹر یونس وزیر اعظم نے کئی موقعوں پر عوام کے ساتھ اظہار ہمدردی کی کوشش کی ہے لیکن عدالتی زبان کے متعلق کارروائی میں عجلت سے ہمکو انکی آخری کامیابی میں بہت شک ہو گیا ہے۔

صوبہ متحدہ کی وزارت ایک عجیب معجون مرکب ہے جسمیں مہاراجہ وزیانگرم جیسے ناتجربہ کار اسپورٹسمین سے لیکر نواب صاحب چھتاری جیسے جہاندیدہ مُدبر تک شامل ہیں۔ وزارت کا پروگرام بھی بدقت تمام شائع ہو چکا ہے لیکن پبلک نے اس پر شاید اس لئے زیادہ توجہ نہیں دی کہ عوام کو اس وزارت پر کوئی اعتماد نہیں ہے، اور نہ لوگ اسے دیرپا سمجھتے ہیں۔ ابتک جو کارروائیاں عمل میں آئی ہیں ان میں کام کے مقابلے میں نمود و نمائش کو زیادہ دخل دیا گیا ہے۔ یہاں تک کہ آنریبل وزیر زراعت نے جو مصیبت زدہ کسانوں کو چھوٹ دیتے وقت بھی سیاسیات کو نہیں بھولے اور کانگریس کے خلاف پروپگنڈے سے باز نہیں رہے، انھوں نے وفور جوش میں نہ تو حکام ضلع کی تحقیقات و سفارش ہی کا خیال رکھا اور نہ کسی خاص اُصول کی پابندی کی، بلکہ ہر جگہ اپنی پارٹی کو ہر دلعزیز بنانے کا لحاظ مقدم رکھا۔ اسی طرح کی اور بھی مضحکہ انگیز باتیں ہوئیں اور ہو رہی ہیں مگر انکا مفصل ذکر فضول ہے خصوصاً جبکہ نواب صاحب چھتاری نے حال ہی فرمایا ہے کہ وہ ہر وقت کانگریس کے لئے جگہ خالی کرنیکو تیار ہیں۔ موصوف نے کانگریس سے قلمدان وزارت سنبھالنے کی اپیل کی ہے۔

مسلمانوں میں مجموعی حیثیت سے کانگریس میں شامل ہونے کی تحریک زور شور سے شروع ہو گئی ہے۔ قوم پرست لیڈروں
کی ایک کانفرنس بھی اس ماہ الہ آباد میں ہوئی تھی۔ مسٹر جناح اور سر محمد یعقوب وغیرہ ابھی مسلم لیگ کے سیاسی اقتدار
کو برقرار رکھنے کیلئے سرگرم کوشش کر رہے ہیں۔ مگر سر وزیر حسن، حافظ محمد ابراہیم۔ خان بہادر سید بشیر الدین ایڈیٹر البشیر
جیسے آزمودہ کار رہنما کانگریس میں بلا کسی شرط کے شامل ہونیکے سفارشی ہیں۔ پنڈت جواہر لال نہرو کا فارمولا خاموشی
سے کام کر رہا ہے اور یہ امید ہے کہ مشترکہ مفاد کا جذبہ ہندو مسلم عوام کو عنقریب ہی بلا تفریق ایک ہی پلیٹ فارم پر
لے آئیگا۔ مسٹر ظہور احمد۔ ڈاکٹر شفاعت احمد خاں جیسے رہنما بھی کانگریس سے ملنے کے لئے معمولی اطمینان کے بعد خواہشمند ہیں
یہ باتیں صاف بتا رہی ہیں کہ ہوا کا رخ کدھر ہے۔ نوجوان طبقہ کا نقطۂ خیال صریحاً مختلف ہے اور وہ ملک کو جلد سے
جلد آزاد کرانے کی کوشش میں کسی سے پیچھے نہیں رہنا چاہتے ہیں۔

پنڈت جواہر لال صاحب نہرو کا برما کا دورہ بہت کامیاب رہا، آجکل آپ ملایا کی سیر و سیاحت میں مصروف ہیں
اہل برما نے آپکی خدمت میں تہتر ہزار روپیہ کی تھیلی پیش کر کے اپنی عقیدت کا اظہار کیا ہے۔ ہر جگہ ہزارہا آدمیوں نے
آپ کا جوش و خروش سے استقبال کیا ہے۔ پنڈت صاحب نوجوان ہندوستان کے لیڈر اور کانگریس کے صدر ہیں۔ انکی
قدر و منزلت کانگریس کے عالمگیر اثر کا ایک ناقابل تردید ثبوت ہے، مگر پنڈت نہرو کی آؤ بھگت سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ
سرکاری علیحدگی کے باوجود برما کا دل ہندوستان ہی کے ساتھ ہے۔

ہندوستان کے باہر سلطنت برطانیہ کا سب سے بڑا اور اہم واقعہ لندن میں ملک معظم جارج ششم کی تاجپوشی ہے جو
۱۲ مئی ۱۹۳۷ء کو غیر معمولی تزک و احتشام سے ہوئی۔ اس شاہانہ رسم کی دلچسپ تفصیلات کسی دوسری جگہ درج رسالہ ہیں
شاہ جارج ششم اور ملکہ الزبتھ دونوں پر غیر متوقع فرائض عاید ہو گئے ہیں مگر انھوں نے جس اسپرٹ اور بلند ہمتی سے اس
بار عظیم کو اپنے کندھوں پر لیا ہے اس سے آیندہ کیلئے بہت کچھ توقعات ہوتی ہیں۔ مطلق العنان بادشاہی کے زمانہ میں
بادشاہ وقت جو چاہتا تھا کرتا تھا، تمام سلطنت کے وسیع ذرائع اسکے اختیار میں ہوتے تھے اور وہ ان سے اپنی رائے
اور ضرورت و خواہش کے مطابق فائدہ اٹھاتا تھا۔ بادشاہ اور رعایا کے مابین خواجہ و بندہ اور آقا و ملازم کے
تعلقات ہوتے تھے لیکن اب وہ زمانہ نہیں رہا اور آئینی حیثیت سے شاہ برطانیہ کی پوزیشن اس سے بالکل مختلف ہے
شاہ جارج ششم کی تخت نشینی بالکل نئے آئین کے ماتحت ہوئی ہے جسکی رو سے بادشاہ وقت کے عزل و نصب میں
دولت مشترکہ برطانیہ کی تمام آزاد نو آبادیوں کو رائے دینے کا وہی حق حاصل ہو گیا ہے جو اہل انگلستان کو ہے۔ چنانچہ اصولی
حیثیت سے اب سلطنت برطانیہ واقعی آزاد ملکوں کی ایک دولت مشترکہ بن گئی ہے لیکن بدقسمتی سے ہندوستان برما



لالہ کملاپت سنگھانیہ مرحوم

۱۸۸۴ء　ملک التجار صوبہ متحدہ　۱۹۳۷ء

زمانہ

جلد ۶۹ — جولائی ۱۹۳۷ء — نمبر ۱

فارسی مصدروں کے مادّے

(از مسٹر سلیم جعفر)

سنسکرت اور فارسی قواعد کی مطابقت" کے شروع میں مصدر سے بحث کرتے ہوئے میں نے اِس کا ذکر کیا تھا کہ سنسکرت کی طرح فارسی کے مصدروں کے مادّے بھی بابوں میں تقسیم کئے جانے چاہئیں، یہ کام یوں تو آسان ہی تھا کیونکہ مادہ معلوم ہونے کے بعد اس کے باب کا ڈھونڈھ نکالنا کوئی بڑی بات نہیں، لیکن اُس وقت جن کتابوں سے مدد لے رہا تھا اُن میں مسٹر پلاٹس کی ہندوستانی کلاسکل ہندی اور انگلش ڈکشنری شامل نہ تھی، بعد میں وہ بھی شامل ہوگئی ہے۔ اِس کتاب میں بہت سے ایسے مصدروں کے مادّے بتائے گئے ہیں جو اُس وقت میری سمجھ میں نہ آئے تھے یا جنکا کہیں پتہ نہ لگا تھا، اب چونکہ مصدروں کی اچھی خاصی تعداد کے مادّے معلوم ہوگئے ہیں اس لئے ان کو بابوں میں تقسیم کردینا مناسب نظر آتا ہے۔ سنسکرت میں جو باب بنائے گئے ہیں وہ محض اس بات کو پیش نظر رکھکر بنائے گئے ہیں کہ صورتِ خبریہ کے بعض زمانوں اور صورتہائے امریہ اور امکانیہ میں ہر مادہ بوقت تصریف کس کس طرح کی کمی وبیشی کا طالب ہے۔ اس تقسیم کا کوئی اور مقصد نہیں۔

مسٹر پلاٹس نے بہت تحقیق سے کام لیا اور اپنے خیالات کی تائید میں سند کو پیش کیا ہے، لیکن

اکثر صورتوں میں مَیں اُن سے بوجوہ متفق نہیں ہوں، جو اپنے اپنے موقع پر بیان کردی گئی ہیں، اُن کے لکھے بعض مادّے میں نے لکھ دئیے ہیں لیکن لغات کی کتابوں میں جو معانی ان مادّوں کے ملتے ہیں اُن سے کسی خیال سے بھی فارسی کے مصدروں کے معانی کا کوئی دُور کا تعلق بھی نہیں

جن مصدروں کے مادّوں کے بارہ میں مجھے پلاٹس سے اختلاف ہے اُن کا بتایا ہوا مادّہ لکھکر مَیں نے جس مادّہ کو صحیح تصوّر کیا لکھ دیا ہے۔ لیکن اس بارہ میں یہ پابندی کی ہے کہ یا تو میرا بتایا ہوا مادّہ بے تکلف وہی معنی دیتا ہو جو وہ سنسکرت میں عام طور سے دیتا ہے یا قانون مبادلۂ اصوات میری تاویل و تعلیل کی تائید کرتا ہو۔ اس قانون کو ماننے میں پلاٹس کو بھی پس و پیش نہیں، جیسا کہ اُن کی مثالوں سے ظاہر ہے، اس کو مانے بغیر کام بھی نہیں چل سکتا۔ قانون تخریب صوتی کو بھی اس معاملہ میں نہ بھولنا چاہیئے اور نہ قانون ابدال کو۔

پلاٹس نے اپنی رائے کی تاسیس ژند کے مادّوں سے کی ہے لیکن مارٹن ہاگ کا قول ہے کہ "فارسی جدید کا ماخذ فارسی قدیم ہے اور ژند اَوستا کا سنسکرت سے گہرا تعلق ہے۔ اور اگرچہ بعض باتوں میں فارسی قدیم اور ژند اَوستا کی زبانیں ملتی جلتی ہیں، پھر بھی اُن میں بہت فرق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میخی حروف کے کتبوں کے پڑھنے میں سنسکرت اور اَوستا سے جتنی مدد ملتی ہے اتنی فارسی قدیم سے نہیں ملتی۔" ایسی حالت میں ژند سے جو شہادت پیش کی گئی ہے اس کے ہر صورت میں صحیح ہونے میں شک کرنا بے وجہ نہیں، ہمیں مستثنیات ماننے پڑیں گے۔ اور ایسے موقعوں پر تو میں ژند کی شہادت بھی بیکار سمجھتا ہوں، جہاں ژند میں کسی لفظ کے جو معنی ہیں وہ سنسکرت لے نہیں لیئے مثلاً मिह् مادّہ کو سنسکرت "ملانے" کے معنی میں نہیں استعمال کرتی مگر پلاٹس نے ژند میں اس کا مرادف मिज् بتا کر اسے "آمیختن" کا ماخذ و مادّہ مانا ہے۔ یا "اندودن" کا ماخذ وہ सम-धा کو مانتا اور اس کا مرادفِ ژند दा + हम् بتاتا ہے لیکن سنسکرت میں सम-धा کے معنی ہیں (۱) قائم کرنا۔ رکھنا (۲) جمع کرنا۔ بٹورنا۔ (۳) نشانہ مارنا یا۔ نشانہ میں چھید کرنا۔ اسی طرح اس نے ہر جگہ پڑ کو سنسکرت کے प्रति اور ژند کے पइति کا مرادف مانا ہے۔ اَوستا اور قانون مبادلہ حروف دونوں اس کی تائید کرتے ہیں، لیکن میں पश्च کو بہتر خیال کرتا ہوں۔ ति کو چ کا بدل اور ژ کو چ کا بدل مانکر پڑ کو صحیح طور سے مشتق تسلیم کیا جاسکتا ہے لیکن प्रति اُن مادّوں کے پہلے کہیں نہیں ملتا جو پزیرفتن اور پژمردن کے بنائے گئے ہیں۔ اس لئے اگرچہ प्रति بالکل خلاف قیاس نہیں ہے لیکن یہ مصدر ہم ایسے لفظ کی مدد سے کیوں نہ بنائیں جس میں شائبہ شک کم ہو اور

ف پلاٹس "پس" کا ماخذ पश्च کو مانتا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ فارسی نے पश्च سے لفظ بنائے ہیں۔

قیاس کے قرینِ صحت ہونے کا زیادہ امکان - میرے نزدیک یہ پَس पश्च یعنی جزو पश्चात् کی مسخ شدہ صورت ہے۔ पश्चात् سے مصدر بنائے گئے ہیں مثلاً तप् - पश्चात् اور اسکا مخفف पश्चार्ध اور पश्चिम میں ملتا ہے اس لئے پذیرفتن اور پژمردن میں पश्च کو ماننا ہی صحیح معلوم ہوتا ہے - ان دونوں کے لغوی معانی ہوں گے "پیچھے پیچھے چلنا" اور "بعد میں مرنا" مجازی معانی معلوم ہی ہیں۔

بعض مادّے باوجودیکہ کسی خاص باب سے تعلق رکھتے ہیں لیکن فارسی نے اپنی تصریف میں خصوصیت باب کو نظرانداز کردیا۔

ایسے تمام مصدروں کو پہلے باب یا گَن میں رکھا ہے جو غیر زبانوں سے لفظ لے کر بنائے گئے ہیں، کیونکہ اُن کی تصریف اسی باب کے مطابق کی جاتی ہے. مثلاً رقص سے رقصیدن۔

باب اوّل

مصدر	مادّہ	مصدر	مادّہ
آرامیدن	आ + रम्	انداختن	सम + तञ्च्
استادن	स्था		
آشامیدن	आ + चम्	اندیشیدن	सम् + ध्वन् (?)
آشفتن	आ + क्षुभ्		अन्तर + दृश *
آغشتن	आ + गृ یا घृ	آوردن	आ + भृ
اُفتادن	अभि + पत्		
افروختن	अभि + रुच्	باختن	
افشاندن (تعدیہ)	अभि + च्यु (چ = ش)	بافتن	
افشردن	अभि + क्षुर्		
افگندن	अभि + खन्		
آمیختن	मिह् मिश्र * عہ		
انباردن	भृ		
انجامیدن	यम یا आ یا यम् *		

مصدر	مادہ
پالائیدن	वृध्
	प्रु *
پختن	पच्
پذیرفتن	प्रति + सृप्
	पश्च + रफ़ या रव् *
پرستیدن	प्र + स्था
پروردن	प्र + वृ
پرہیزیدن	प्र + सच्
پسندیدن	वि + शद्
پنداشتن	वि + नि + धृ
پیوستن	प्रति + बन्ध
	प्र + विश *
تاختن	तञ्च, तक *
تافتن	तप्
تپیدن	तप्
تراشیدن	त्वक्ष, तृह *
۔۔دن	त्रस
	तड + कृ *
	तप्

مصدر	مادہ
خروشیدن	क्रुश्
خستن	खघ् *
خلیدن	स्खट्, शल् *
خواستن	श्वस
	स्व + अस *
خواندن	स्वन्
خوردن	स्वद्, स्वर्द *
درخشیدن	दृश्
درفشیدن	दृप् (اس کے اسم سے مصدر)
دمیدن	ध्मा
دوختن (سینا)	दुह्
دویدن	धाव्
راندن	सृप् रराण
رخشیدن	रुच (اس کے اسم سے)
رُستن	रुह्
رَستن	रह्
رشتن	रिच्
رَفتن	सृप्, रफ़ *
رُفتن	लुप्
رمیدن	रम् رَم
رنجیدان	रञ्ज

اس مادہ سے کسی طرح معنی نہیں نکل سکتے جہاں میں نے اپنی
سے کوئی مادہ پیش کیا ہے وہاں یہ نشان * لگا دیا ہے
معنی صرف جانے وغیرہ کے ہیں وہاں उप + स्था
ہے۔

نہیں معلوم ہوتا کیونکہ اضافہ ن کی توجیہ نہیں کی جا سکتی۔
سویں گن سے تعلق رکھتا ہے مگر دونوں میں یہ معانی نہیں ملتے۔

سے نزدیک "رفتن" کا مادہ रफ़ "ردیدن"

فارسی مصدر	مادّہ
روئیدن	रुह्
ریختن	रिच
زیستن	जीव + अस + तं
ترولیدن	ज्वर् عہ
ستادن	स्था
سرشتن	सृज्
سنجیدن	शक्, सं + चि *
سوختن	शुच्
شتافتن (چمکنا)	उद् (= उश = زند) + तप्
شدن	च्यु (چ-ش)
شمردن	स्मृ
شیفتن	क्षेव् *
شوریدن	ज्वर् عہ
غارتیدن	غارت
فراموشیدن	प्र + मृज् / प्र + मुच * عسہ
فرستادن	प्र + स्था
فروختن (جلنا)	अभि + रुच
فشردن	अभि + क्षुर्
فگندن	अभि + खन्
فہمیدن	(عربی) فہم
کاویدن	खिव قیاساً खव *
کشادن، گشادن، کشودن	वि + च्यु سہ / कुष *
کفیدن	कफ: (اسم سے مصدر)
کندن	खन्
گردیدن	वृ + तं, गुर्द, * कुर्द * سعہ
گرفتن	ग्रभ् = ग्रह्
گرویدن	वृ, ग्रभ् * سعہ
گریختن	वि + रिच्
گزاردن، گزاشتن، گزشتن، گستاردن	वि + वृ عہ
گشتن	वृ + तं, गच्छ् = गम् صہ

عہ اس مادہ سے کسی طرح یہ معنی نہیں نکلتے۔ جہاں میں نے اپنی طرف سے کوئی مادہ پیش کیا ہے وہاں یہ نشان * ہے۔

عسہ بہتر معلوم ہوتا ہے کیونکہ سنسکرت کے اصول قواعد کے مطابق اس میں ڑ کی آواز پیدا ہو جاتی ہے جو پلاٹس کے مادہ میں نہیں ہوتی۔

سہ یہاں چ = ش + بہتر معلوم ہوتا ہے کیونکہ اس کے معنی ہیں باہر نکالنا وغیرہ۔ گاف کی تختی میں جہاں کہیں व یا वि جزو مادہ ہے پلاٹس نے اسے گاف مانا ہے۔ قانون مبادلہ حروف اس کی تائید کرتا ہے چنانچہ گل و وَل اور گرگ و ورک لغات میں ملتا ہے

سعہ پلاٹس اپنا خیال نہیں بدلتا اور वृ کو گاف مانتا ہے جو غالباً سبب التباس ہے۔ حالانکہ ग्रह کے جزو دیں اکثر ग्रभ ہو جاتا ہے معنی دل چھین لینا وغیرہ بھی آئے ہیں۔

صہ اس مادہ میں پلاٹس نے زش کو زند کے مادہ تر سے مشتق مان کر اس تر کو तृ کا مرادف مانا ہے۔ اس مبادلے سے آگے چل کر بحث کی جائیگی۔

سہ اس کو گردیدن کی ایک صورت مانکر پلاٹس کہتا ہے کہ زند کے مادہ کا र تن سے پہلے واقع ہو کر स سے بدل گیا اور स्त گر گیا۔ زند میں स عوض र्त کے آتا ہے۔ بوپ BOPP نے اپنی قواعد میں یہی لکھا ہے اور بحوالہ اوستا میں بلکہ اس کی جو مثالیں دی ہیں وہ = अमृत اور मष्य = मर्त्य ان میں سے मष्य کو بوپ نے ... अमेष

گفتن	गुभ्[معہ] = गुब् (فارسی قدیم) गुप्*
گواریدن	वि + वृ
لافیدن	लाप: (= लप् مادہ اسم سے مصدر)
لرزیدن	घृष्
لغزیدن	لغز (عربی)
لکیدن	مَتّ (عربی)
نالیدن	नद्, नद्*
نامیدن	नामन् (नम् مادہ)
نواختن	नि + वच्
ورغلانیدن	उपरि + गृ یا घृ
وزیدن	मर یا प्र + کا تبدیلہ कल्, गुल* / वह्
ہراسیدن	हृष् [معہ]
ہشتن / ہلیدن	हृ * [لعہ]

۴ بھی پیش کیا ہے۔ اس لئے جب ٢ اور त دونوں ष का بدل ٹھہرے تو گشتن ہونا چاہیئے۔ اگر اس کو गम् = गत्छ से مشتق مانا جائے تو بہتر ہے کیونکہ गत्छ کا = ष رہ کر چ = ش مطابق قانون مبادلہ حروف ہوگا اور یوں بے تکلف گشتن بن جائیگا۔

معہ ایک تو गुभ् کے کوئی ایسے معانی نہیں جنہیں گفتن سے دور کا بھی لگاؤ ہو۔ دوسرے فارسی قدیم میں جو गुब है وہ اشارہ کرتا ہے کہ اس کا مادہ کوئی اور لفظ ہونا چاہیے۔ پھر یہ गुप् ہی کیوں نہ ہو جو دسویں گن میں معنی رکھتا ہے بولنا۔

مسہ اس مادہ سے کسی طرح یہ معنی نہیں نکلتے۔

لعہ ر کا بدل ش اور ل دونوں آسکتے ہیں

باب دوم

افزودن	अभि + शु یا श्रु, यु*
آمدن	आ + गम्
آمرزیدن	आ + मृज्
اندوختن	सम् + दुह् [عہ]
جنبیدن	गम قیاساً
چسپیدن	यु
خاستن	श्वस [عہ]
خفتن	स्वप्
خمیدن	स्वप् [عہ]
خوابیدن	स्वप्न / स्वाप्* [عہ]
خواستن	श्वस् / स्व + श्रस*
زاریدن	हृ
زدن	हन्
ستائیدن	स्तु
فرمودن	प्र + मा / प्र + ब्रू* [سہ]
فروختن	प्र + वच
فزودن	अभि + शु یا श्रु [عہ] / अभि + यु*
گزیدن	वि + हन्
لیسیدن	लिह्

عہ اس مادہ سے کسی طرح یہ معنی نہیں نکل سکتے۔ جہاں میں نے اپنی طرف سے کوئی مادہ پیش کیا ہے وہاں یہ نشان * لگایا ہے

عہ درحقیقت فارسی نے स्वप्न سے "خواب" بنایا اور پھر اس اسم سے یہ مصدر۔ स्वप्न اس مصدر کا مادہ نہیں۔ اگرچہ "خواب" اور स्वप्न کا مادہ ایک ہی ہے۔

سہ اس مصدر جعلی کے معنی ہونے چاہئیں "اپنے لئے لینا"۔

لعہ لوسے نے اپنے قواعد میں [illegible] کا مترادف مانا ہے مگر اوستا میں بھی جگہ جگہ یہ لفظ آیا ہے اور سابقہ [illegible] کے ساتھ بھی ملتا ہے۔

باب سوم

مصدر	مادّہ
آزردن - آزاردن	आ + हृ
افسردن	अभि + शर, सृ *
اندودن	सम + धा अन्तर + दु *
انگیختن	सम् + विज्
آویختن	आ + विज् ! विच्
دادن	दा
زادن	जन्
فشردن	अभि + शर, क्षुर *

باب چہارم

آشفتن	आ + क्षुभ्
پیراستن	वि + आ + राध् प्र + आ + रच् *
پیمودن	प्रति + मा प्र + मा *
جُستن	यस् *
جوشیدن	युज् قیاساً
دیدن	عہ धी, दी *
ربودن	लुप्
ساختن	शाक्
شُستن	शुध् शुच *
فرمودن	प्र + मा, ब्रु * عسہ
کاستن (گھٹنا)	कृश *
نمودن	नि + मा

عہ اس مادّہ میں یہ معنی نہیں نکلتے

عسہ باب دوم کا چوتھا نوٹ اسی مصدر کے بارہ میں ملاحظہ ہو۔

باب پنجم

آفتن	आ + कृ
آراستن	आ + राध्, रध् *
آشامیدن	आ + चम्
چیدن	चि
خریدن	क्री
درودن - دریدن	दृ, द्रु, दृ *
ستیزیدن	स्तिघ
شنیدن	श्रु
کردن	कृ
گزیدن	वि + चि
گُستردن	वि + स्तृ
گماشتن	वि + स्मृ عہ
نشستن	नि + षद्, सद् *
یافتن	आ + आप

باب ششم

آموختن	आ + मुच्
برشتن	मृज् ! भृस्ज्, भ्रस्ज *
پاشیدن	स्पृश
پرسیدن	प्रच्छ
پریدن	पर (= परी سنسکرت اسم مصدر)
	पृ * عسہ
پژمردن	प्रति + स्फर् * पश्य + म्रु *
خندیدن	स्फुर्, स्फृ, स्वन *

عہ سنسکرت میں اس معنی میں نہیں آیا بلکہ اسکے معنی ہیں بھولنا بھولانا۔

عسہ معنی کسی چیز کا ہوا سے بھرنا۔

داشتن	धृ عه
رسیدن	ऋष्
سپردن	स्फर या स्फुर, स्पृ *
سفتن	क्षिप्
کاشتن ۔ کشتن	कृष्
کُشتن	कुष्, कृष् *
کشیدن	कृष
مردن	मृ
نشستن / نوشتن	नि + पिश्, पिश *
ورزیدن	वृह्, वृज *

باب ہفتم

پرداختن	प्र + तक्ष्, परि + तक्ष् *
شکستن	छिद्, क्षुद *
گداختن	वि + तक्ष

باب ہشتم

آختن	आ + कृ या कृश
نگاریدن ۔ نگاشتن	नि + कृ
نگریستن	नि + कृ

باب نہم

آشفتن	आ + क्षुभ्

آفریدن	आ + प्री
بندیدن	बन्ध्
خریدن	क्री
شگفتن ۔ شگافتن	क्षुभ्
کشادن ۔ کشودن	कुष् *
کوشیدن	कुष्
کوبیدن ۔ کوفتن	क्षुभ्, कुप् *
گسستن / گسلیدن / گسیختن	वि + शृ
مالیدن	मृद्, मल् *

باب دہم

افتادن	अभि + पत्
آمیختن	आ + मिश्र *
بخشیدن	भज्
بیختن	विज् या विच्
پوشیدن	पुष्
پائیدن / پوئیدن	पद्
فراموشیدن	प्र + मुच् *
گریستن	गृ = गरेट زند
نکوہیدن	नि + कुत्स्
نوردیدن	नि + वृ

عہ پہلے باب میں کشتن پر جو نوٹ ہے وہ ملاحظہ ہو ... کو اگر داریدن کا مادہ مانا جائے تو مناسب ہے۔

عہ اس مادہ کے یہ معنی کہیں نہیں ملتے۔ میرے پیش کئے ہوئے مادہ کے بہت سے معانی میں سے ایک معنی دینا۔ عطا کرنا وغیرہ ہیں۔ اسلئے شاید اسے ترجیح دیجا سکے۔

عہ لغت میں اس معنی میں نہیں ملا۔ اسے कृष की بگڑی ہوئی صورت مان سکتے ہیں لیکن اس سے پہلے کن کا काष बہتر ہے۔

ملحوظ۔ بلا شک کے مادہ میں کوئی حرف کے کا بدل ہوگا میرے پیش کردہ مادہ میں حرف تقدیم و تاخیر سے گویا لفظ بنتا ہے اس قسم کی تقدیم و تاخیر جائز ہے مثلاً شگافتن کا مادہ क्षुभ

برسات کی شام

از حضرت احسان دانش (کاندھلہ)

ہوائیں دم بخود ہیں دم گھٹا جاتا ہی سینے میں
مئے جذبات ہے بیرنگ دل کے آبگینے میں

خس و خاشاک ہیں تو نسے ہوئے پتا نہیں ملتا
گلستانِ تمنا میں کوئی غنچہ نہیں کھلتا

دلوں کے ولولے مایوس ہیں آغوشِ قسمت میں
اداؤں کے شگوفے خشک ہیں باغِ نزاکت میں

جدھر دیکھو درو دیوار سے آنچیں نکلتی ہیں
پسینہ بہ رہا ہے ہڈیاں شاید پگھلتی ہیں

لپٹ دہکے ہوئے شعلوں کی آتی ہے ہواؤں میں
جہنم جذب ہوکر رہ گئے شاید فضاؤں میں

اُداسی کا سماں ہے مرغزاروں گلستانوں میں
چھپے بیٹھے ہیں خوش الحان طائر آشیانوں میں

گھٹا گردوں کی پہنائی میں گھبرائی ہوئی سی ہے
شرابِ سرخ سنجافوں پہ چھلکائی ہوئی سی ہے

نکل کر جب نقابِ ابر سے بجلی چمکتی ہے
جبینوں پر خطِ تقدیر کی سرخی جھلکتی ہے

مذاہب عالم کی پارلیمنٹ

(۲)

(از پروفیسر سنت پرشاد مدہوش ایم۔اے)

مذاہب عالم کی کانگریس کا واحد مقصد یہی ہے کہ مختلف مذاہب کی معرفت دنیا میں باہمی رفاقت اور بھائی چارہ کی اسپرٹ پیدا کی جائے۔ اس آدرش کے قائم کرنے کا سہرا ہندوستان کے قدیمی خیراندیش سرفرانسیس ینگ ہسبنڈ (Sir Francis younghusband) کے سر ہے، موصوف ہی اس تحریک کے چیرمین ہیں اور ہز ہائینس مہاراجہ گائیکواڑ بڑودہ اس کے بین الاقوامی صدر۔ سر فرانسیس کے الفاظ میں کانگریس آف فیتھس کی یہی کوشش رہی ہے کہ انسان کے اندر اشتراکیت کا جو احساس ہے اس میں جوش و وفور پیدا کیا جائے تاکہ بنی نوع انسان میں باہمی مفاہمت اور قدردانی کا مادّہ پیدا ہو اور دنیا کی فضا میں ہم آہنگی کی صدا گونجنے لگے۔ اس تحریک کے حامیوں کی تمنا ہے کہ مذاہب عالم کی کانگریس کا اجلاس زیادہ پرجوش سنساری شعور (World-Consciousness) پیدا کرنے کا موجب ہو۔ جس کی بدولت چشم تخیل کے سامنے نظامِ عالم کا ایک بہتر اور زیادہ دلآویز منظر پیش ہو جائے۔ اس نظام عالم میں بھائی چارہ کی بنیادیں روحانی حسن و محبوبیت کے مرکزی مخزن و منبع تک پہونچیں۔ حتیٰ کہ وہ شے جو انسانیت کی کونپل بن کر پھوٹتی ہے روحانیت بن کر پھولے۔

سر فرانسیس کا بیان ہے کہ اس اسپرٹ اور اس غرض و غایت کا رنگ گذشتہ جولائی کی لندن کانگریس کی ساری فضا میں چھایا رہا اور تمام حاضرین جلسہ نے اس بات کو بخوبی محسوس کیا کہ اگر واقعی صحیح اسپرٹ اور مقصد نوع انسان کی خواہشات اور ارادوں کی رہنمائی کریں تو دنیا کا رنگ کیا سے کیا ہو جائے۔

اس کانگریس کی فضا میں آزادی اور کشادہ دلی کی موجودگی کا سب سے بڑا ثبوت یہی ہے کہ مختلف اقوام کے نمایندگان نے اپنے اپنے قومی لباسوں میں ملبوس ہو کر اس میں شرکت کی۔ مختلف مذاہب کے مختلف پہلوؤں پر متعدد مقالات پڑھے اور تقریریں کیں

اس کانگریس میں زمانہ کے پرانے قدردان سر عبدالقادر صاحب ممبر انڈیا کونسل نے بھی حصہ لیا اور اسلام و اخوت عالم کے موضوع پر ایک گراں قدر مضمون پڑھا۔ ہز مجسٹی ملک معظم نے بھی اس کے لئے پیغام بھیجا تھا

جیسے مہاراجہ صاحب گائیکواڑ نے پڑھکر سنایا۔ مہاراجہ صاحب ممدوح کا صدارتی ایڈریس نہایت دلچسپ تھا جسمیں آپ نے کانگریس کی اہمیت اور فوائد پر زور دیا تھا۔ سر فرانسس کا بیان ہے کہ حاضرین نے اپنے تئیں مذہب کی اُس عین واصل بنیاد کے قریب تر محسوس کیا جس پر سنسار میں بھائی چارہ کی تعمیر ہوسکتی ہے اور دنیا میں امن قائم ہوسکتا ہے۔

بقول سر موصوف تمام شرکار کانگریس نے اس طرح یکجا ہوکر اور ایک مشترکہ مدعا کے حصول میں کام کرکے .... روح کی گہرائیوں تک پہونچنے اور روح کو آسودہ کرنیوالے سرور کا احساس و مشاہدہ کرلیا جو محض روحانی وصل سے حاصل ہوتا ہے۔

(۲)

ہند جدید کی تاریخ میں پارلیمنٹ مذاہب کا اجلاس اول بار یکم مارچ ۱۹۳۷ء کو کلکتہ ٹاؤن ہال میں شروع ہوا اور ساتویں مارچ تک اس کے ہر روز دو وقتہ اجلاس ہوتے رہے۔ اس سال یہ پارلیمنٹ سری رام کرشن کی صد سالہ سالگرہ کی یاد میں منعقد کی گئی تھی۔ صدارت کے لئے سب سے پہلے سری اروبندو گھوش کو مدعو کیا گیا تھا، مہاتما گاندھی سے اس کے افتتاح کی درخواست کی گئی تھی مگر دونوں صاحبوں نے معذوری ظاہر کی بالآخر سر برجیندر ناتھ سیل صدر منتخب ہوئے۔ یہ انتخاب نہایت مناسب ہوا کیونکہ صاحب موصوف کو ایک عالم و فلسفی کی حیثیت سے بین الاقوامی شہرت حاصل ہے۔ انھوں نے پرم ہنس سری رام کرشن کا زمانہ بھی دیکھا ہے اور اُن کے شاگرد رشید سوامی دویکانند سے اُن کے تعلقات بہت دوستانہ رہ چکے ہیں۔ پارلیمنٹ کے مختلف اجلاسوں میں مشاہیر عالم کی کافی تعداد شریک تھی۔ اہل ہند میں ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور، پنڈت مدن موہن مالویہ اور سروجنی نیڈو اور ممالک غیر کے نمایندوں میں سر فرانسس ینگ ہسبنڈ اور کرنل لنڈن برگ اور لیڈی لنڈن برگ کے اسمائے گرامی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اس سلسلہ میں مذاہب کی پارلیمنٹ منعقدہ ۱۸۹۳ء کی یاد تازہ ہوجاتی ہے جس میں سوامی دویکانند نے اپنی تقریروں سے خود بیں اہل مغرب پر جو ہندو مذہب کو فقط بت پرستی تصور کرتے ہیں، اس بات کا قائل کردیا تھا کہ ہندوستان کو ہر حال میں مادہ پرست مغرب پر مذہبی فوقیت حاصل ہے۔ سوامی جی موصوف نے اپنی تقریروں کے ذریعہ اس بات کو بھی واضح کردیا تھا کہ واصل بحق ہونے کے لئے قاموسیاتی علم یا مطالعۂ کتب دینی کی چنداں ضرورت نہیں ہے بلکہ اس کے لئے ترک لذات اور عشق الٰہی درکار ہیں اور جب تک انسان کا دل دنیوی اشیاء اور زن و زر وغیرہ کی خواہشات سے مبرا نہیں ہوتا اسے وصل الٰہی حاصل نہیں ہوسکتا۔

سوامی جی نے اس حقیقت پر بھی زور دیا تھا کہ جملہ مذاہب کی اصل تعلیم میں بیّن مشابہت ہے اور اگر کوئی شخص صدق دل سے اس پر عمل پیرا ہو تو اس پر ضرور ہی حقیقت کا انکشاف ہو جائیگا۔ اور معرفت الٰہی یعنی آتم گیان حاصل ہو جائیگا۔

واقعی جملہ مذاہب کی حقیقی تعلیم یکساں ہے، مذہب، ریلیجن، پنتھ، شینٹو (جاپانی لفظ جو مذہب کے معنی میں مستعمل ہے) وغیرہ الفاظ کے لغوی معنی "راستہ" کے ہیں۔ واقعی مذہب وہ راستہ ہے جو روح انسانی (آتما) کو منبع روحانیت (پرماتما) تک پہونچا دیتا ہے۔ روح اور مخزن روحانیت کے مابین رابطۂ اتصال روحانیت ہی کی دھار سے ہوسکتا ہے۔ اسی روحانیت کی دھار کو پکڑنا اصل مذہب ہے۔ اور وہ تمام کارروائی جو اس کی معاون ہو مذہبی کارروائی کہی جاسکتی ہے۔ بقیہ رسمیات فروعات میں داخل ہیں اور ذہنی اُدھیڑ بُن، نکتہ سنجیاں، قیاسی باتیں، بحث و مباحثہ شاستر ارتھ وغیرہ فضولیات میں شمار ہیں۔

(۳)

سر بروجیندر ناتھ سیل نے اپنے صدارتی ایڈریس کے آغاز میں سری رام کرشن کے اوائل عمر کا کچھ حال بتا کر یہ دکھلایا کہ انکی ابتدائی زندگی ہی اُن کی آئندہ روحانی عظمت کا پیش خیمہ تھی۔ ازاں بعد آپ نے برہمو مذہب (Brahmoism) کے بانی راجہ رام موہن رائے، کیشب چندر سین جن کا تعلق برہمو ازم میں New Dispensation سے تھا، مہرشی دیویندر ناتھ ٹیگور جن کا تعلق برہمو ازم میں Old Dispenation سے تھا، اور سوامی رام کرشن پرم ہنس کے مذہبی طلب و تجسس کے رجحانات کا مقابلہ کیا۔ آپ نے فرمایا کہ راجہ رام موہن رائے حقیقی معنوں میں ہند جدید کے بانی مبانی کہے جاسکتے ہیں، تمام عمر اُن کی یہی کوشش رہی کہ ایک عالمگیر مذہب کے ذریعہ ہندو، مسلمان، عیسائی اور تمام دیگر مذاہب کے پیروؤں کے درمیان ایک عالمگیر اخوت قائم ہو جائے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ تمام مذاہب کی بنیاد مشترک ہے، البتہ کچھ امتیازی غیر مشترکہ باتیں زمانی، مکانی اور تمدنی خصوصیات کی وجہ سے ہر قومی مذہب کے ساتھ وابستہ ہوگئی ہیں۔ مہرشی دیویندر ناتھ ٹیگور نے برہمو ازم میں اضافہ و اعانت کے خیال سے قدیمی ہندو رسمیات کی تنظیم ہندو اپنشدوں کی بنیاد پر کرنا چاہی اور ہندو اور عیسائی عالموں سے قطع نظر کر کے عالمگیر مذہب کی ترتیب کا کام کیشب چندر سین کے حصہ میں آیا اُنھوں نے اس ترتیب کی بنیاد اصول انتخاب پر رکھی۔ یعنی ہر مذہب کا روشن پہلو لیکر ایک نیا اور منتخب مذہب مرتب کیا۔ بودھ مت، عیسائی مذہب، اسلام

اور ویشنو دھرم میں سے ہر ایک کو منجملہ اور دیگر مذاہب کے کیشب چندر سین کے نئے مذہب میں جگہ دی گئی۔[۹]

سر موصوف نے فرمایا کہ کیشب چندر سین کا کام مختلف مذاہب سے بہترین پھول لیکر ایک دلآویز گلدستہ تیار کرنا تھا، مگر پرم ہنس رام کرشن نے اس سے آگے قدم بڑھایا، اُنھوں نے کیشب چندر سین کے خیالات سے اختلاف کرکے اولاً اس بات پر زور دیا کہ اُصولی عقائد کے علاوہ ہر مذہب کی رسمیات اور ضوابط بھی اس کے جوہر کو بخوبی نمایاں کرتے ہیں اور اس کے لئے باعثِ قوت ہوتے ہیں دوسرے ان کا یہ بھی عقیدہ تھا کہ کسی مذہب سے فیضیاب ہونے کے لئے اصولِ انتخاب پر کاربند ہونا درست نہیں ہے بلکہ اُس مذہب کے جملہ لواحقات کُلی طور پر قبول کرنے ہی سے اصلی فائدہ حاصل ہوسکتا ہے چنانچہ کہا جاتا ہے کہ وہ ہندوؤں کے ساتھ ہندو مسلمانوں کے ساتھ مسلمان اور عیسائیوں کے ساتھ عیسائی بنکر مذہب حقیقی کی معرفت حاصل کرنے کے ساعی ہوتے تھے۔ مگر ایک ہی وقت میں مختلف مذاہب کے مختلف عقائد و ضوابط اور عملیات کو دخل دینا جائز نہ سمجھتے تھے

بہر حال سر موصوف نے یہ بھی واضح کیا کہ پرم ہنس سوامی رام کرشن کی شخصیت باعتبار مذہب محض قوم پرست نہ تھی بلکہ وہ عالمگیر اور سنساری شعور (World-Consciousness) رکھنے والی ہستی تھے بہ الفاظ دیگر باعتبار مذہب سوامی رام کرشن قومیت کے نہیں بلکہ انسانیت کے قائل تھے اور دنیا کے موجودہ رجحانات اسی انسانیت کی طرف ہیں اس لئے جو کام سوامی رام کرشن نے شروع کیا تھا اُسکی تکمیل اب دورِ جدید میں ہونی چاہیئے۔

آپ نے یہ بھی فرمایا کہ ہم کو اس رجحان جدید سے بھی بے پروا نہ رہنا چاہیئے جس کا میلان لاخدا مذہب کے تصور کی طرف ہے۔ کیونکہ سچائی اور نیکی کے نصب العین بعض اوقات شخص خدا کی ہستی کے عقیدہ کا نعم البدل ثابت ہو چکے ہیں

(۴)

مہاتما گاندھی نے جو پیام اس پارلیمنٹ کے نام بھیجا اس میں آپ نے یہ سوال بھی پیش کیا کہ کیا دنیا کے تمام مذاہب جیسا کہ ہمارا خیال ہے برابر حیثیت رکھتے ہیں یا کوئی خاص مذہب ہی صداقت کا واحد مالک ہے اور دیگر مذاہب محض غلط یا غلط و صحیح کا مجموعہ ہیں؟" گاندھی جی نے امید ظاہر کی کہ

---

[۹] مگر کبیر صاحب کہہ گئے ہیں سمجھے کا مت ویک ہے کیا پنڈت کیا شیخ" یہ میرا عقیدہ ہے کہ جملہ مذاہب کی اصل تعلیم میں یکسانیت ہے۔ (راقم) سب مذاہب کا ایک ہی راستہ ہے ہاں یہ ضرور ہے کہ مختلف پیغمبر، اولیا، اوتار اور کاملین مختلف مقامات روحانی سے آئے ہیں [illegible]

اگر ان معاملات پر پارلیمنٹ میں غور کیا جائے تو مختلف مذاہب کے پیرووں کی بہت بڑی مدد اور رہنمائی ہو۔

سر فرانسیس نے اس سوال پر بحث کرتے ہوئے یہ فرمایا کہ جس طرح ہر بچہ اپنی ہی ماں کو سارے جہان میں بہترین سمجھتا ہے اسی طرح ہم لوگوں میں ہر ایک اپنے ہی مذہب کو بہترین مذہب خیال کرتا ہے۔ چنانچہ گاندھی جی کے سوال کا جواب یہ ہے کہ گو شرکائے پارلیمنٹ میں ہر شخص اپنے ہی مذہب کو بہترین خیال کرتا ہے لیکن اس کے ساتھ وہ یہ بھی محسوس کرتا ہے کہ جملہ مذاہب میں بنیادی لحاظ سے یکسانیت ہے اور اس بنیادی یگانگت کا احساس کر کے اسے دلوں میں نقش کرا دینا ہی پارلیمنٹ مذاہب کا منشا ہے۔

(۵)

مسز سروجنی نیڈو ہندوستان کی مایۂ ناز شاعرہ ہیں، انھوں نے اپنی شاعری کی بدولت بین الاقوامی شہرت حاصل کر لی ہے۔ آپ کے شاعرانہ دل کا تقاضا اس ذات سے یگانگت پیدا کرنے کا ہے جو بہمہ اوصاف حسنہ موصوف ہو۔ اوصاف کا استعمال ہمیشہ برمحل نہیں ہوتا کیونکہ حسن ازلی اوصاف سے بالاتر ہے جسن لامحدود تعینات سے باہر ہے۔ چنانچہ سروجنی نیڈو صاحبہ نے پارلیمنٹ کے ایک اجلاس میں صدارت فرمائی اور اپنی تقریر میں فرمایا کہ "میں یہ نہیں کہتی کہ خدا نے انسان کو بنایا بلکہ میرا قول یہ ہے کہ انسان نے خدا کو پیدا کیا، کیونکہ ہمیں بہترین و بالاترین ہستی کا جو شعور و حسن ہے اُس کے سوائے خدا کی ہستی کیا ہے خدا ہمارے حسن، صداقت، حکمت اور شجاعت کے تقاضا کی تشکیل و تجسیم کے سوا اور کیا ہے؟
آپ نے بھی اس بات کا اعادہ کیا کہ یہ پارلیمنٹ مذہبی اختلافات کی نہیں بلکہ مذاہب کے بنیادی اتحاد کی مظہر ہے۔ آپ نے فرمایا کہ میں خود مذہب کے کٹر اصولوں سے آزاد ہو کر میدان ترقی میں اُس راستہ پر گامزن ہوں جو کسی ایک فرقہ یا قوم نہیں بلکہ کل بنی نوع انسان کی ترقی کا راستہ ہے، آپ نے یہ بھی ہدایت کی کہ ہم کو خدا کی تلاش انسانیت کے مندر میں کرنا چاہیئے اور یگانگت خدا کا احساس ہی انسانیت کے دائرہ کو وسیع تر کرے گا۔

(۶)

پارلیمنٹ کے ایک اجلاس میں شاعر اعظم ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور نے بھی صدارت فرمائی، آپ کا ایڈریس نہایت کامیاب رہا، چنانچہ سر فرانسس نے فرمایا کہ صرف اسی ایڈریس کی بدولت اس پارلیمنٹ کا انعقاد حق بجانب کہا جا سکتا ہے۔ اپنی تقریر میں ڈاکٹر ٹیگور نے فرمایا کہ میں کوئی خاص مذہبی

انکشاف پیش نہیں کرسکتا ہوں کیونکہ میں محض شاعر ہوں، بنی نوع انسان کا شیدا، کائنات کا عاشق مگر چونکہ عشق میں کسی قدر دُور رسی اور راز بینی کا مادہ بھی ہوتا ہے اس لئے شاید میں اس بات کا دعویٰ کرسکتا ہوں کہ بعض اوقات میں نے نوع انسان کی خاموش شدہ آواز کو سُنتا ہے اور لامحدود کے لئے اس کے دبے ہوئے طلب وتقاضا کو محسوس کیا ہے۔ مجھے بھروسہ ہے کہ میں اُن لوگوں میں نہیں ہوں جو جیل خانہ میں مقید ہوں لیکن اُنھیں یہ جاننے کی خوش نصیبی حاصل نہ ہو کہ جیل خانہ میں ہیں اور جو اس غفلت میں خوش ہیں اور نہیں جانتے کہ اُن کے مکان کے سازوسامان کی گرانی اور اشیاء آرام وآسائش کی کثرت اُن کے غرۂ بے بنیاد کے قلعہ کے لئے نادیدہ دیواروں کا کام کرتی ہے اور انھیں صرف آزادی ہی سے محروم نہیں کرتی بلکہ آزادی کی خواہش ہی مٹا دیتی ہے۔

آپ نے فرمایا کہ مادی دُنیا کی ضروریات زندگی سے کہیں زیادہ طلب کرنا انسانی فطرت کا تقاضا ہے۔ چنانچہ انسان ہمیشہ سے اس طلب کو پُورا کرنے کے لئے منہمک رہا ہے اور اُس کی جدوجہد اُس کے لامحدود تخییل وتصور کے مطابق رہی ہے۔ وہ اپنے حصول مدعا کے لئے حسب ضرورت اپنے طورطریقے بدلتا رہا ہے۔ اور مسلسل ناکامیابی کے باوجود اس نے کبھی تھک کر ہار نہیں مانی۔

حیوانات کی ارتقا نسلاً بعد نسلٍ ہوتی ہے۔ نسل ترقی پذیر ہوتی جاتی ہے گو فرداً فرداً ہر حیوان مرجاتا ہے لامحدود کا مُس (touch) حیوانات کے اندر بھی ہے جو انھیں ذاتی زندگی کے آگے بقاء نسل کی طرف لے جانے کی تحریک کرتا ہے اور اُس کی خاطر انھیں ہر قربانی کے لئے آمادہ کرتا ہے۔ والدین کے اندر ایثار وقربانی کا جو مادّہ ہوتا ہے یہ وہی لامحدود کا مُس ہے جو بقاء نسل کا محرک ہوتا ہے اور اُن کے اندر ایسے اوصاف کے بیدار ہونے میں معاون ہوتا ہے جو اُن کی اولاد کو غذا اور پناہ حاصل کرنے میں معاون ہوں مگر انسانوں میں لامحدود کا حس اور زیادہ ارتقا پاتا ہے اور وہ کشمکش حیات مادی سے جس کا تعلق زمان ومکان سے ہے زیادہ بڑھکر حوصلہ رکھتا ہے۔ انسان نے محسوس کرلیا ہے کہ زندگی کا تکملہ اس کی طوالت میں نہیں ہے بلکہ عظیم وجمیل اشیاء سے حظ حاصل ہونے کی قوت میں ہے۔ جب ہمارے اندر حسین وجمیل یا خیر و صداقت کا حس ارتقا پاتا ہے (وہ صداقت جو واقعات کی تعداد سے کہیں زیادہ عمیق ہوتی ہے) تب یہ سمجھنا چاہیئے کہ ہم اُس فضا سے جس میں حیوانات ونباتات کا وجود ہے بالکل مختلف فضا میں آگئے مگر ہم اس فضا میں مدت دراز کے بعد حال ہی میں داخل ہوئے ہیں۔

موصوف نے اپنے ایڈریس میں یہ بات بھی وضاحت کے ساتھ بیان کی کہ گو زمانے پر زمانے گذر گئے

لیکن انسان خودی میں گرفتار رہ کر حرص و ہوس کی مادی زندگی بسر کرتا رہا ہے۔ مگر جب کبھی مادی زندگی کی قیود کے باہر کچھ دھندلی سی روشنی انسان کے خیال میں آتی ہے تو وہ محسوس کرتا ہے کہ اس مادی دنیا کے علاوہ عالم روحانی بھی ہے۔

یہ لفظ "روحانی" ایک مبہم لفظ ہے کیونکہ اس کے اصل مفہوم کا ہمیں ابھی تک ادراک نہیں ہو پایا۔ مگر آپ نے یقین دلایا کہ اس روحانیت کا ادراک محبت کے ذریعہ ہو سکتا ہے۔ آپ کی رائے میں اس دنیا کے ساتھ اپنی ذاتی ضروریات کے خیال سے برتاؤ کرنا غلط ہے اور کائنات کے صحیح معنی عشق و محبت ہی کی معرفت معلوم ہو سکتے ہیں۔

ابدی اظہارِ محبت و عشق، خودی سے رہائی یافتہ روح سے جواب کا منتظر ہے۔ اس رہائی و آزادی کا خاصہ منفی نہیں ہو سکتا۔ تعلقات میں مکمل آزادی کا حاصل ہونا کامل ہم آہنگی پر منحصر ہے نہ کہ محض ترکِ قیود پر۔ اگر آزادی کے اندر کچھ اور نہیں تو وہ مہمل ہے اور کچھ معنی نہیں رکھتی۔ آزادی روح اس رشتہ کی تکمیل ہے جو اس کا تمام موجودات کی مرکزی صداقت سے ہونا چاہیئے۔ اس مرکزی صداقت کی تعریف ممکن نہیں کیونکہ یہ تمام تعریفوں سے بالا ہے۔

مادیت کی امتیازی صفت یہ ہے کہ ہم اس کو ناپ سکتے ہیں، بہ الفاظ دیگر یہ محدود ہے اور اس کے حدود غیر متناہی نہیں ہیں پس انسانی تاریخ میں جو دیوانی اور فوجداری کے تنازعات ہوتے ہیں وہ انھیں حدود کی بنیاد پر ہوتے ہیں۔ چونکہ یہ حدود لامحدود نہیں لہذا کوئی شخص اپنی حدود کو بلا کسی دوسرے کے حدود پر چھینا جھپٹی کئے بغیر وسیع نہیں کر سکتا ہے

طاقت کا ناز مقدار کا ناز ہے، اپنے صید و نخچیر اور رنگروٹوں کی تعداد کا ناز ہے۔ لہذا تیز سے تیز دوربین اس طاقت کی طرف لگائیے تو امن و سکون کا ساحل خون کے بحر کے پار نظر نہیں آتا۔ یہ ایک سانحہ عظیم ہے جو اس طرح بارہا ہماری تاریخ کو برگشتہ کر دیتا ہے۔ جب کہ طاقت کی یہ ہوس جو در اصل خودی و خود پرستی ہے انسان کی مذہبی زندگی پر غالب آجاتی ہے تو وہ واحد ذریعہ جس کی بنا پر انسان اپنی روح کو آزاد کرنے کی توقع کر سکتا ہے اُس آزادی کا بدترین دشمن بن جاتا ہے

تمام بیڑیوں میں وہ بیڑیاں جو ناجائز طور پر روحانیت کا نام اختیار کر لیتی ہیں سب سے زیادہ سخت گیر ثابت ہوتی ہیں اور ان کا توڑنا سب سے زیادہ دشوار ہو جاتا ہے اور جملہ زندانہائے تنگ و تار میں سب سے زیادہ خوفناک وہ نظر نہ آنے والے محبس ہیں جن میں انسانوں کی روحیں غرور بیجا سے پیدا شدہ فریب میں گرفتار ہیں کیونکہ برملا اور بے خلاف خود پرستی میں خود پرستی کے صاف

طور پر نمایاں ہونے کی وجہ سے تحفظ کا امکان ہے جیسے وہ گندگی جو کہ دبی چھپی نہیں بلکہ دھوپ اور ہوا میں کھلی پڑی ہے آسانی سے صاف ہو سکتی ہے، لیکن خود ستائی اور مبالغہ آمیزی سے کام لیکر اپنے تئیں بہت کچھ سمجھنے والے کی مشکل ہے۔ اسی طرح اپنی بہترین حقیقت کا غیر ترقی پذیر رہنا جو زعم باطل کا لازمی نتیجہ ہوتا ہے اور اس زعم کا بے شرمی کے ساتھ اس وقت جاری رہنا جب مذہب پیکرِ بیجان ہو کر تعصبی ورلّی ہو جاتا ہے۔ مذہب کی آڑ میں دنیا پرستی کی بدترین صورت ہے۔ مذہب کی یہ صورت انسان کو تنگ دل بنانے میں جتنی مؤثر ثابت ہوتی ہے، اتنا مادّی مفاد پر مبنی کوئی مشرب نہیں ہو سکتا۔

کائنات میں جو نفاق و شقاق بے ربطی و تضاد نظر آتا ہے اس کے اندر جو پوشیدہ ہم آہنگی ہے اُس کا انسانی نقطۂ نگاہ سے ادراک کر کے اُسے جزو حیات بنا لینا تمام بزرگانِ دین کا حوصلہ رہا ہے اور اسی غرض و غایت کے لئے جملہ مذاہب وجود میں آئے مگر جب یہی مذاہب اپنے اصل ماخذ سے دُور ہو جاتے ہیں تو یہ غایت کھو بیٹھتے ہیں اور پستی کی طرف مائل ہو کر ہٹ دھرمی اور غرۂ زہد و ظاہر پرستی اور خلاف عقل رسمی پابندی بنکر رہ جاتے ہیں۔ اس وقت تعصب، تفرقہ پردازی ہٹ دھرمی، بے عقلی وغیرہ کی بدولت انسانی اخوّت اور ترقی کے راستے مسدود ہو جاتے ہیں ایسے مذہب سے کفر بدرجہا بہتر ہے۔ بقول شاعر

ہزار خندۂ کفر است بر مسلمانی

ڈاکٹر رابندر ناتھ نے مزید فرمایا کہ مذہب کا مقصد آزادی دلانا ہے، مگر مذہب ہمیشہ آزاد خیالیوں اور اخلاقی حقوق پر بیڑیاں ڈالتا رہا ہے۔ سائنس اور مذہب کو تہذیب کا ثمرہ خیال کرنا چاہیئے۔ لیکن افسوس کہ اسی مذہب نے دنیا کی سیاسی طاقتوں کو اذن عام دیکر قتل عام اور استحکام غلامی کو روا رکھا ہے، اور مزید افسوس اس بات پر ہے کہ سائنس نے بھی اس کام میں شرکت کی۔

بہرحال جب انسان یہ سمجھ لیتا ہے کہ خدا اُسکی ملکیت ہو گیا کیونکہ وہ فلاں ملت کا پیرو ہے اور دیگر مذاہب والوں کا خدا پر کوئی حق نہیں رہا تو وہ بیخوف ہو کر دست درازیاں کرنے لگتا ہے۔ ہر مذہب کی ابتدا اُسکے بانی کے ترک و ایثار سے ہوتی ہے مگر بالآخر مذہب زوال پذیر ہو کر پنڈتوں، پروہتوں، مُلّاؤں، پادریوں وغیرہ کے لئے محض حصولِ زر کا ذریعہ بن کر رہ جاتا ہے۔

واقعی دنیا کو مُلّائیت، پادریت اور پنڈتائی کے بجائے حضرت مسیح کا دیا ہوا عیسائی مذہب، محمد صاحب کا عطا کیا ہوا اسلام، اور کرشن مہاراج کا بھگتی مارگ اور سادھو سنتوں کا بخشا ہوا دھرم درکار ہے مگر آبحیات ظلمت میں ہے اور ہم کو خضر جیسے رہنما کی ضرورت ہے۔

راجہ اشوپت کی ریاضت

(از حضرت جگر بریلوی بی۔اے)

"زمانہ" کے پچھلے نمبروں میں ہم حضرت جگر کی دلآویز مثنوی "ساوتری ستیہ وان" کے کئی دلکش سین ہدیۂ ناظرین کر چکے ہیں، ذیل میں اس دلچسپ مثنوی کا وہ حصہ درج کیا جاتا ہے جس میں ہمارے نامور شاعر نے راجہ اشوپت کے تپ اور دیوی ساوتری کے درشن دینے کی کیفیت بیان کی ہے۔ (ا۔ز)

اللہ رے اَشوپت کی طاعت — اللہ رے عبادت و ریاضت
جنگل ہے کہ خانۂ خدا ہے — گھوپا ہے کہ حجرۂ دعا ہے
روحانیت تمام ساری — ذرّے ذرّے پہ کیف طاری
طاعت میں کھڑا ہے جو شجر ہے — سجدے میں پڑا ہے جو حجر ہے
روباہ، غزال، شیر، اژدر، — طاؤس، کلنگ، کبک، تیتر
چیتل، بارہے، پلنگ، لنگور — کیفیتِ بندگی سے مخمور
ہیں راجا کے آس پاس بیٹھے — چیلے ہوں کسی رشی کے جیسے
معبود کی یاد میں ہیں سب غرق — اِک رنگ میں مست ہیں نہیں فرق
محویت شہ کی ہے یہ صورت — پتھر کی دھری ہو جیسے مورت
ہے جسم میں کچھ، تو استخواں ہیں — یا کھال ہے اور جھرّیاں ہیں
آئینہ ہے آج سینۂ صاف — ہے ریش سپید تا سرِ ناف
سر پر لپٹی ہیں یوں جٹائیں — جس طرح فلک پہ ہوں گھٹائیں
بیٹھے ہوئے ہیں جمائے آسن — سمرن لئے کر رہے ہیں پوجن
لب بند ہیں، بند دیدہ و گوش — ہیں یادِ خدا میں خود فراموش
چھٹکی ہے بھبھوت تن بدن میں — ویراگ برس رہا ہے بن میں
چہرے سے جلال ہے نمودار — جنگل میں جھلک رہے ہیں انوار
مورت ہیں سکون کی سراسر — دم بھی کہیں رک رہا ہے چل کر

آئینۂ طاعت و صفا ہیں　　تصویرِ تصورِ خدا ہیں
دھونی میں اُٹھی لپٹ سی اک بار　　ساوتری ہوگئیں نمودار
اِک نور کی تھی کرن دھوئیں میں　　یا برق تھی شعلہ زن دھوئیں میں
راجا سے کہا زبان کھولو　　کیا مانگتے ہو بتاؤ، بولو
بجلی سی رہی تھی سامنے کوند　　تھی دیدۂ شاہ میں چکاچوند
پوری جو ہوئی مراد بارے　　لب کھل نہ سکے خوشی کے مارے
آخر بولے یہ مدعا ہے　　بس ایک پسر کی التجا ہے
دیوی نے دیا جواب "منظور"　　اب رنج و ملال دل سے کر دُور
پیدا ترے ہوگی ایک دختر　　ذی ہوش، جمیل، نیک اختر
بیٹوں سے کہیں عقیل و دانا　　یعنی کہ زمانہ میں یگانا
بیٹا نہ ہوا یہ غم نہ کرنا"　　معبود کا شکر کم نہ کرنا"
اب چھوڑ یہ جنگل اور دھونی　　مدت سے ہے راجدھانی سونی"
جا دیس میں اپنے راج کر تو　　دلشاد رہے گا عمر بھر تو"

غائب ہوئیں مثلِ شعلہ دیوی
راجا نے وطن کی راہ پکڑی

"زمانہ" تیس سال پہلے

زمانہ جولائی ۱۹۰۰ء میں منشی درگا سہائے سرور کی یہ نظم شائع ہوئی تھی، ناظرین زمانہ کے تفنن طبع کیلئے ہم اسکے چند اشعار درج ذیل کرکے مرحوم کے علمی احسانات کی یاد تازہ کررہے ہیں۔ (ا-ز)

پسِ فنا میری چھوٹی سی یادگار بنے　　غریب ہوں میں، وطن میں مِرا مزار بنے
جہاں تھا آہ لڑکپن کا میرے گہوارہ　　لحد وہیں مِری او دورِ روزگار بنے
قفس میں میری تسلی کے واسطے صیاد　　وطن کے پھولوں کا اک کنج خوشگوار بنے
زمیں پہ آہ! میں وہ نقشِ نامرادی ہوں　　ہزار بار بگڑ کر نہ ایک بار بنے
رُلا رہا ہے مجھے سوزِ اشتیاقِ وطن　　عجب نہیں ہے کہ آنسو مِرا شرار بنے
یہ لوحِ گورِ غریباں پہ ثبت ہو مصرع　　کہ اب سے کوئی وطن کا نہ سوگوار بنے

فرانس کا دستوری نظامِ حکومت[1]

(از خان بہادر ڈاکٹر سید نجم الدین احمد جعفری ایم۔اے۔ ایل ایل۔ ڈی)

چیمبر کا ماحول سیاسی گروہوں کے علاوہ ایوانوں میں صنعتی، زراعتی اور تجارتی مفادوں کے تحفظ کے لئے بھی مختلف گروہ بن جاتے ہیں جیسے زراعت پیشوں کا گروہ، شکر سازوں کا گروہ، شراب فروشوں کا گروہ ڈاکٹروں کا گروہ۔ ان میں سے بہت سے گروہوں کو جماعتی سیاسیات سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ وہ صرف اس لئے وجود میں آتے ہیں کہ خاص خاص صنعتی یا تجارتی ...... اغراض کی تکمیل کے لئے وزارت پر زور ڈالتے رہیں۔ چونکہ ایوانوں میں بے شمار گروہ ہوتے ہیں اور کوئی ایک گروہ بھی تنہا کل ممبروں کے ایک تہائی حصے کی رایوں کا مالک نہیں ہوتا اسلئے کوئی وزارت یقینی اکثریت کی توقع نہیں رکھتی اور اسے دو یا دو سے زیادہ گروہوں کے مشترکہ بلاک پر بھروسہ کرنا پڑتا ہے۔ جب تک بلاک غیر منقسم رہتا ہے وزارت خود کو محفوظ سمجھتی ہے لیکن اگر کسی معاملے پر بلاک منقسم ہو جائے تو وزارت کا اقتدار ختم ہو جاتا ہے

چیمبر کا نظام اور طریق کار ہر سشن کے آغاز میں ایوان اپنے ممبروں میں سے ایک بیورو چنتا ہے اور طریق کار کو آسان کرنے کے لئے قواعد بناتا ہے۔ سال بھر تک ایوان کے نجی معاملات اِسی بیورو کے افسران کے ہاتھوں سرانجام پاتے ہیں جیسے ایوان کے عملے کا تقرر، ریکارڈ تیار کرنا، رائے شماری کے وقت ووٹ گننا، حسابات رکھنا وغیرہ۔ بیورو کے صدر اور نائب صدروں اور سیکرٹریوں کو تنخواہ نہیں ملتی، مگر اس بیورو کے ممبران (Questors) کو معمولی ممبروں سے دوگنی تنخواہ ملتی ہے۔ ایوان کا اہم ترین افسر صدر ہوتا ہے۔ جمہوراور سینٹ کے پریسیڈنٹ صاحبان کے بعد امتیازمیں اسی کا درجہ ہے۔ جہاں تک اس کے فرائض کا تعلق ہے کچھ تو آئین ملکی کے وضع کردہ ہیں اور کچھ ضابطہ ایوان کی رو سے عائد ہو گئے ہیں۔ مثلاً وہ اجلاس کی صدارت کرتا ہے، تحریکوں پر رائے طلب کر کے نتائج کا اعلان کرتا ہے، چیمبر کی کارروائی کی رپورٹوں پر اس کے دستخط ہوتے ہیں، ان درخواستوں کی سماعت بھی جو ایوان کے نام موصول ہوتی ہیں اس کے ذمہ ہے۔ ایوان میں نظام قائم رکھتا اور اس کی حفاظت کرتا ہے۔ حتیٰ کہ وہ اس کے لئے حکومت سے مسلح فوجیں تک طلب کر سکتا ہے۔ اس کے اختیارات برطانوی دارالعوام کے صدر کی طرح محدود

---

[1] اس سلسلے کے پہلے مضامین زمانہ بابتہ اپریل ۱۹۳۷ء میں شائع ہو چکے ہیں۔

نہیں ہیں بلکہ امریکہ کے ایوان نمایندگان کے صدر کے اختیارات کی طرح کافی وسیع ہیں۔ اس سے یہ توقع ضرور کی جاتی ہے کہ اپنے فرائض ذمہ دارانہ طریق پر انجام دے مگر آئین کی رو سے وہ بالکل غیر جانبدار رہنے پر مجبور نہیں ہے۔ کرسیِ صدارت چھوڑ کر وہ بحث و مباحثہ میں بھی حصہ لے سکتا ہے۔ رواجاً صدر اسی جماعت کی طرفداری کرتا ہے جس میں صدر بننے سے پہلے وہ شامل تھا۔ اس طرح اُسے یہ امید ہوسکتی ہے کہ شاید کسی وقت وہ صدر جمہوریہ یا وزیر اعظم بن سکے۔

چیمبر کی سب سے پہلی نشست ہی میں ایوان خود کو گیارہ حصوں میں تقسیم کرلیتا ہے، یہ وہی طریقہ ہے جس سے برطانوی پارلیمنٹ اور امریکن کانگریس میں کمیٹیاں بنائی جاتی ہیں۔ فرانس میں انھیں کمیشن کہا جاتا ہے۔ ہر مسودۂ قانون ایوان میں پیش ہونے پر کسی ایک کمیشن کے حوالے کردیا جاتا ہے اور وہ کمیشن مجوزہ کے بیانات وغیرہ سُن کر مسودے میں ترمیم و تنسیخ وغیرہ کرتا ہے۔ کمیشن کا ایک ممبر جو رپورٹر کہلاتا ہے ترمیم شدہ مسودے کی رپورٹ ایوان کے سامنے رکھتا ہے جس میں ترمیموں کے جواز میں وجوہ بیان کیجاتی ہیں۔ رپورٹر کی اسامی (بالخصوص ایسی حالت میں جب قانون اہم ہو) مستقبل کے لئے سربلندیوں کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔ اس طریق سے وزارت کے اختیار میں بہت کچھ کمی ہو جاتی ہے۔ کیونکہ اس کے پیش کردہ مسودے بھی کمیشن سے واپس ہونے پر اُس صورت میں نہیں رہتے جو وزرا نے انھیں دی تھی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ کمیشن کے ممبران کی اکثریت وزراء کے موافق نہ ہو۔

اس صورت حال کی مشکلات مالی مسودوں کے معاملے میں بہت زیادہ نمایاں ہوتی ہیں۔ عاملہ کی مالی تجاویز ۴۳ ممبروں کے ایک کمیشن کے سامنے آتی ہیں جس کے ممبر حسب مرضی ترمیم و تنسیخ کے مجاز ہیں۔ ترمیم شدہ صورت میں جب مالی مسودے ایوان کے سامنے پیش ہوتے ہیں تو گویا ایک ایسا بجٹ پیش ہو جاتا ہے جو اس بجٹ سے بالکل مختلف ہوتا ہے جسے فنانس منسٹر نے تجویز کیا تھا۔ اور پھر جب مالی کمیشن کا رپورٹر ترمیموں کے جواز میں اپنی دلیلیں بیان کرتا ہے تو وہ اپنی جگہ ایک دوسرا فنانس منسٹر بلکہ اس کا رقیب بن جاتا ہے اور اس بات کا ہر طرح امکان ہوتا ہے کہ وزارت کے مقابلے میں اس کی رائے مان لی جائے اس طرح حکومت وقت غیر مقتدر رہتی ہے اور زیادہ سے زیادہ یہی کرسکتی ہے کہ اپنے ذاتی رسوخ سے کام لیتے ہوئے کمیشن کے ممبروں کو اپنی فنانشل پالیسی سے متفق بنانے کی کوشش کرے۔

ایوان میں بے شمار مسودے پیش کئے جاتے ہیں، مگر بہت کم قانون بنتے ہیں۔ زیادہ تعداد میں مسودے پیش ہونے کی وجہ یہ ہے کہ ہر حلقہ اپنے نمایندے سے یہ توقع کرتا ہے کہ وہ ملکی سیاسیات میں زیادہ سے زیادہ حصہ لے اور اس لئے اپنی کارگزاری دکھانے اور اپنے حلقے کو خوش رکھنے کے لئے ممبران زیادہ

سے زیادہ مسودے پیش کر دیتے ہیں جن میں سے بہت سے کمیشنوں کے تغافل کے نذر ہو جاتے ہیں کوئی وزیر مسودہ پیش کرے تو اس کے لئے فضا زیادہ موافق ہوتی ہے مگر یہ بھی ممکن ہے کہ کمیشن اس میں کوئی ایسی ترمیم کر دے کہ ایوان میں واپس آنے پر اسکی متوقع شکل و صورت ہی بدل جائے۔ ایسے مسودے بھی نسبتاً کم ہی قانون بنتے ہیں، بعض اوقات بعض اہم مسئلے کئی کئی سشن تک معرض التوا میں پڑے رہتے ہیں اور اُن کے طے ہونے کی نوبت نہیں آتی ہے۔

یہ صورت حال کم و بیش دنیا کی سبھی مجالس آئین ساز میں ہوتی ہے مگر فرانس کے ایوانِ حکومت میں اس کی خصوصیت کی وجہ یہ ہے کہ چیمبر کے ممبر قانون سازی میں اتنی دلچسپی نہیں لیتے جتنی ذاتی معاملات اور ان اُمور میں لیتے ہیں جن پر حکومتوں کے بننے اور بگڑنے کا انحصار ہوتا ہے وزیروں کی سہو یا ان کے طرفدارانہ طرز عمل پر ایسی گرما گرم بحثیں ہوتی ہیں کہ کمزور وزارتوں کی بنیادیں ہل جاتی ہیں۔ ایسے مواقع کو بہانہ بنا کر مخالفین حکومت وزرا پر حملہ کر دیتے ہیں۔ کسی ایک مخالف ممبر کی طرف سے نوٹس دیا جاتا ہے کہ وہ کسی بیان کی بنا پر فلاں وزیر سے سوالات دریافت کریگا۔ سوالات دریافت کرتے وقت وہ اس وزیر یا پورے کابینے کے طرز عمل پر شدید نکتہ چینی کرتا ہے اور ملامت کرتے ہوئے وزیر اعظم یا اس وزیر سے جس کا طرز عمل زیر بحث ہے جواب طلب کرتا ہے، کابینہ یا وزیر کسی فوری جواب پر مجبور نہیں کئے جا سکتے چنانچہ الزامی بحث کے لئے کوئی اور دن مقرر ہو جاتا ہے جب اس دن بحث ہو چکتی ہے تو اجرائے کار (Order of the Day) منظور کرنے کی تجویز پیش ہوتی ہے۔ اس تجویز کا منشا یہ ہوتا ہے کہ اب جبکہ الزامی بحث و مباحثہ ختم ہو چکا ہے تو ایوان معمول کے مطابق اپنے کام کی طرف متوجہ ہو۔ اجرائے کار کی تجویز پیش ہوتے وقت مخالفین کو کابینے کو شکست دینے کا موقع ہاتھ آتا ہے۔

تجویزیں دو قسم کی ہوسکتی ہیں، سادہ (Pure simple) یا حسب غرض (Motivé) پہلی قسم کی تجویزیں کابینے کو الزام دیئے بغیر صرف یہ ظاہر کیا جاتا ہے کہ اختتام بحث کے بعد ایوان اپنے روزمرہ کاموں کی طرف متوجہ ہو، دوسری قسم کی تجویزیں ان الفاظ کے ساتھ ہی چند ایسے الفاظ کا اضافہ کر دیا جاتا ہے جن سے وزارت کی مذمت ہوتی ہے یا جن سے اس پر اعتماد ظاہر کیا جاتا ہے مذمت کی تجویز عموماً وزارت کے دشمنوں کی طرف سے پیش کی جاتی ہے اور اعتماد کی تجویز حکومت کے خیر خواہ پیش کرتے ہیں۔ اگر ایوان وزارت پر اعتماد کی تجویز پاس کر دیتا ہے تو اس کا بیڑہ طوفان مخالفت سے صحیح سلامت نکل آتا ہے ورنہ اسکی زندگی کا خاتمہ یقینی ہوتا ہے۔

اس قسم کے ہنگامہ خیز موقعوں پر عوام میں بڑی بے چینی پھیل جاتی ہے، چنانچہ تماشائیوں کی گیلریاں کھچا کھچ بھر جاتی ہیں۔ اگر پہلے سے یہ معلوم ہو جائے کہ وزارت کی اخلاقی جرأت ختم ہو چکی ہے اور وزراء میں پھوٹ پڑی ہوئی ہے تو مخالفین کسی معمولی بات کو بہانہ بنا کر اس کے اقتدار کا خاتمہ کر دیتے ہیں۔ مگر خارجی حکمت عملی کے سلسلے میں ایسا کوئی بہانہ تلاش نہیں کیا جاتا کیونکہ روایتاً ایسی کارروائی سے ہمیشہ گریز کیا جاتا ہے جس کا نتیجہ بیرونی دنیا کی نظروں میں فرانس کی ذلت ہو۔

(۶) فرانسیسی پارلیمنٹ اور قانون سازی

پارلیمنٹ کا کام تین عنوانات پر تقسیم کیا جاتا ہے (۱) قانون سازی (۲) مالی انتظام اور (۳) حکومت کے عاملہ اور منتظمہ شعبوں کی نگرانی۔ ۱۸۷۵ء کے آئین کی رو سے صدر اور ممبران ایوان کو قوانین کے مسودے پیش کرنے کا حق ہے، وزراء جو مسودے تیار کرتے ہیں وہ بطور سرکاری بل وزیر اعظم یا کوئی اور وزیر صدر ہی کی طرف سے پیش کرتا ہے۔ چونکہ اس قسم کے مسودے عاملانہ امور سے متعلق ہوتے ہیں اس لئے قانوناً کوئی وزیر اپنی ذمہ داری پر انھیں ایوان میں پیش نہیں کر سکتا اسے لازمی طور پر مسودے پر صدر کے دستخط کرانے پڑتے ہیں۔ ممبروں کے مسودے پہلے آئین ساز کمیشن کے حوالے کئے جاتے ہیں اور اس کی رپورٹ کو پڑھ کر ایوان یہ فیصلہ کرتا ہے کہ مسودے اجلاس میں برائے غور پیش ہونا چاہیے یا نہیں۔ اگر کمیشن کی رپورٹ کسی مسودے کے خلاف ہوئی تو کم از کم چھ ماہ کے لئے اس کی پیشی روک دی جاتی ہے۔ ہر ممبر کو مسودے پیش کرنے یا ان میں ترمیمیں کرنے کا غیر محدود اختیار حاصل ہے۔ اس معاملے میں برطانوی دارالعوام اور فرانس کے چیمبر میں بڑا فرق ہے۔ اول الذکر میں قانون سازی کی تحریک ہمیشہ وزراء کی طرف سے ہوتی ہے۔ برخلاف اس کے فرانس کے ایوان عام میں یہ کام اکثر و بیشتر ممبر کرتے ہیں اور وزیروں کو کسی صورت سے بھی پارلیمنٹ کا مالک یا مختار نہیں کہا جا سکتا۔

وہ مسودے جن کا اجلاس میں پیش ہونا مسلم ہو، سینٹ میں بیورو کے سپرد ہوتے ہیں اور بیورو انھیں خاص خاص کمیٹیوں کو سونپ دیتے ہیں۔ چیمبر میں بھی ضروری مسودے اسٹینڈنگ کمیٹیوں ہی کے سپرد ہوتے ہیں۔ ان کمیٹیوں کی رپورٹیں چھاپ کر تقسیم کی جاتی ہیں اور جب چیمبر میں بحث و مباحثہ شروع ہوتا ہے تو اس وقت یہ رپورٹیں تمام ممبروں کے پاس موجود ہوتی ہیں۔ چیمبر کا ہال نیم دائرے کی شکل میں ہے بیچوں بیچ صدر کے لئے ایک اونچی آرام کرسی رکھی رہتی ہے، اس کرسی کے آگے مقررین کے لئے پلیٹ فارم (Tribune) ہے ٹریبیون کے دونوں طرف اسٹینو گرافر بیٹھتے ہیں جو اجلاس کی کارروائی کی

رپورٹیں لیتے ہیں اور یہ رپورٹیں ہر روز صبح کو سرکاری اخبار (Official Journal) میں چھپتی ہیں۔ نشستوں کا پہلا حلقہ وزراء کے لئے مخصوص ہوتا ہے، ان کے بعد ایوان کے باقی ممبروں کی نشستیں ہوتی ہیں۔ دائیں طرف قدامت پسند بیٹھتے ہیں، بائیں طرف ریڈیکل۔ یہ ضروری ہے کہ قانون کی شکل اختیار کرنے سے پہلے ہر مسودے کی ایوان میں پانچ دن کے اندر اندر دو مرتبہ خواندگی ہو۔ جو ممبر بحث و مباحثہ میں حصہ لینا چاہتا ہے وہ اس فہرست پر جو سیکرٹری کے پاس رہتی ہے اپنا نام لکھ دیتا ہے۔ ہر ممبر تحریک کر سکتا ہے کہ بحث بند کردی جائے اور اس تحریک پر رائے لیجاسکتی ہے، رائے شماری یا تو صرف ہاتھ اٹھانے سے ہوتی ہے یا پرچیاں ڈالی جاتی ہیں، یہ پرچیاں دو رنگوں کی ہوتی ہیں۔ سفید موافق رائے کیلئے اور نیلی مخالف رائے کے لئے، اہلکار باسکٹس لے کر جاتے ہیں اور پرچیاں جمع کر لاتے ہیں۔

مالیات اور مسودے انقلاب فرانس کے وقت سے ابتک قومی مالیات کے متعلق چند اصول نظام حکومت کی بنیاد بن گئے ہیں۔ یہ اصول دستور اساسی میں درج نہیں ہیں تاہم ملکی قانون کا ضروری جزو تصور ہوتے ہیں، وہ اصول یہ ہیں کہ ٹیکس لگانے کا حق عوام یا اُن کے نمایندوں ہی کو ہے، سال میں صرف ایک مرتبہ محاصل لے جائیں گے، قومی زر پیہ قوم کی مرضی سے خرچ ہوگا اور نمایندگان قوم حکومت کی امداد سے ہر سال بجٹ تیار کرینگے۔ یہ قاعدہ کہ مالی مسودے پہلے ایوان عام میں پیش ہوں ۱۸۱۴ء میں برطانوی آئین سے اخذ کیا گیا تھا اور ۱۸۷۵ء کے آئین نے اس پر تصدیق کی مہر ثبت کردی۔ بجٹ سال کے سال بنتا ہے، انگلستان میں بہت سے محصولات مستقل ہیں مگر فرانس میں تمام سال کے اخراجات اور آمدنی ایک ہی بار شمار کر لی جاتی ہیں۔ اصل میں بجٹ وزیر ہی تیار کرتے ہیں جس کی صورت یہ ہے کہ مختلف محکموں کے سرگروہ اپنے ماتحتوں کی مدد سے محکموں کے اخراجات کا تخمینہ بنا لیتے ہیں۔ فنانس منسٹر ان سب کو ایک جگہ کر کے آمدنی کا تخمینہ بھی منسلک کر دیتا ہے اور اس طرح بجٹ تیار ہو جاتا ہے۔ مالی سال یکم جنوری کو شروع ہوتا ہے اور بجٹ کی تیاری اس سے تین ماہ قبل یعنی اکتوبر یا نومبر میں شروع کر دیجاتی ہے۔ بجٹ تین ہزار صفحوں کی ایک کتاب پر مشتمل ہوتا ہے جو تکمیل کے بعد بجٹ کمیٹی کو بھیجدیجاتی ہے، یہ کمیٹی چوالیس ممبروں پر مشتمل ہوتی ہے اور اسے ایوان عام کی گیارہ اسٹینڈنگ کمیٹیوں کے ممبر منتخب کرتے ہیں، ہر اسٹینڈنگ کمیٹی سے چار ممبر بجٹ کمیٹی میں لئے جاتے ہیں ویسے ان کا انتخاب صرف ایک سال کے لئے ہوتا ہے مگر عملاً یہ اس وقت تک ممبر بنے رہتے ہیں جبتک کام پوری طرح ختم نہیں ہو جاتا۔ کمیٹی بند کمروں میں تخمینے کی جانچ پڑتال کرتی ہے اور ایک طویل رپورٹ مرتب کرتی ہے اور تین چار ماہ بعد ایک مالی مسودہ بناتی ہے جس میں نظر ثانی کی ہوئی تجاویز شامل

کر لی جاتی ہیں۔ اس کے بعد چیمبر میں بحثیں شروع ہوتی ہیں۔ اول اول مسودے پر مجموعی حیثیت سے بحث ہوتی ہے۔ پھر ایک ایک دفعہ کو لیکر اس پر بحث و تمحیص جاری رہتی ہے۔ بحث میں ممبروں کو مکمل آزادی حاصل ہوتی ہے۔ بعض پابندیوں کے ماتحت ممبر ترمیمیں پیش کر سکتے ہیں اور ایوان کو کمیٹی کے پیش کردہ مسودے میں تغیر و تبدل کرنے کا بھی اختیار ہوتا ہے۔

بحث کے بعد رائے لیجاتی ہے اور قانون بحیثیت مجموعی منظور کر لیا جاتا ہے۔ قاعدہ یہ ہے کہ کمیٹی میں آنے کے بعد بجٹ تین چار ماہ تک چیمبر کے زیر غور رہتا ہے۔ منظور ہو چکنے کے بعد بجٹ فنانس منسٹر کے پاس واپس جاتا ہے جو اسے سینٹ کے سامنے رکھتا ہے۔ اب اس کے نفاذ میں صرف چند ہفتوں کی دیر رہ جاتی ہے اس لئے سینٹ جلدی جلدی اس پر غور کرتا ہے، دونوں ایوانوں میں اختلاف پیدا ہو جائے تو بجٹ پھر چیمبر کو واپس آتا ہے اور چیمبر اس پر غور کرکے پھر سینٹ میں بھیجتا ہے۔ اس دوران میں سمجھوتے کی کمیٹیاں طرفین کو ہموار کرنے میں کوشاں رہتی ہیں۔ صرف اختلافی نکات پر بحثیں ہوتی ہیں اور بالآخر تصفیہ ہو جاتا ہے اور مکمل قانون سرکاری اخبار میں چھپ جاتا ہے۔ دونوں ایوانوں میں سے کوئی ایوان بجٹ کو نامنظور نہیں کر سکتا۔ صدر کے اعلان کے بعد سال کے پہلے دن سے اس پر عملدرآمد شروع ہو جاتا ہے۔

(۷) شعبۂ عدل و انصاف اور سول سروس

فرانس میں جج وزیر عدل کی طرف سے مقرر کئے جاتے ہیں اور یہ مستقل ہوتے ہیں۔ قاعدے کی رو سے کسی جج کو کورٹ آف اپیل کی مرضی کے بغیر علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ اگر وزارت اپنے کسی آدمی کو کسی عدالت میں جج بنانا چاہتی ہے تو اس کے لئے گنجائش نکالنے کے واسطے یہ طریقہ اختیار کرتی ہے کہ عدالت مذکور کے ججوں کو جو پہلے سے وہاں کام کر رہے ہیں ترقی دیکر ان سے حسب دلخواہ اسامیاں خالی کرا لیتی ہے اور وہ خالی اسامیاں اپنے آدمیوں کو دیدیتی ہے۔ اگر کسی جج کا رسوخ وزیروں تک ہو تو ترقی کی امید ہو سکتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں کسی نہ کسی صورت سے حکومت کا ساتھ دینا ججوں کے لئے مفید ہوتا ہے بلکہ بعض اوقات اپنے ضلع کے ڈپٹیوں سے اچھے تعلقات رکھنا بھی کام آجاتا ہے۔ ججوں کی تنخواہیں بہت کم ہوتی ہیں لیکن چونکہ ان کو عزت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے اس لئے اعلیٰ معیار کے لائق افراد اس میں آنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ججوں کے فیصلوں سے بلند پایہ قانونی لیاقت کا اظہار ہوتا ہے اس کے علاوہ سوسائٹی میں ان کی پوزیشن بہت بلند ہوتی ہے

اور ان علاقوں میں جہاں وہ رہتے ہیں چوٹی کے آدمی سمجھے جاتے ہیں۔

سول سروس کا شعبہ بتناسب آبادی کے لحاظ سے فرانس میں اتنا وسیع ہے جتنا کسی اور آزاد ملک میں نہیں، اسکی وجہ یہ ہے کہ اس ملک میں لوکل سیلف گورنمنٹ کا حلقہ بہت تنگ ہے اور زیادہ سے زیادہ کام مرکزی ایڈمنسٹریشن کے ذمہ ہے۔ لوگ سرکاری نوکری حاصل کرنے میں کوشاں رہتے ہیں خواہ وہ تنخواہ کے اعتبار سے کتنی ہی بے حقیقت کیوں نہ ہو۔ انگلستان کی طرح تمام تقرریاں عاملہ کی طرف سے کی جاتی ہیں۔ ملازمتوں میں داخلہ مقابلے سے ہوتا ہے۔ صرف چند اسامیاں اس سے مستثنیٰ ہیں جن کے عہدیدار وزارت کی تبدیلی کے ساتھ بدل جاتے ہیں۔ یہ اسامیاں وزراء اپنی مرضی سے پُر کرتے ہیں۔ ملازمت کے دوران میں ترقی مدت ملازمت اور قابلیت کے لحاظ سے ہوتی ہے مگر بعض اوقات دیگر اثرات بھی کام کرجاتے ہیں۔ بڑے بڑے محکموں کے مستقل سرعسکر مسلمہ قابلیت اور بلند مجلسی حیثیت کے لوگ ہوتے ہیں، ان کے ذاتی معائد خواہ کچھ ہوں مگر اپنے سرکاری فرائض پوری ذمہداری کے ساتھ انجام دیتے ہیں۔ مستقل سول سروس کے ملازموں کی تنخواہیں عام معیار زندگی کو دیکھتے ہوئے کم ہیں، مگر چونکہ سرکاری نوکری کو خاص طور پر مجلسی اہمیت حاصل ہے اس لئے انھیں کم تنخواہوں پر اچھی قابلیتوں کے لوگ کام کرنے آجاتے ہیں۔

ابتدائی مدارس کے مدرس بھی فرانس میں عاملہ کی طرف سے ہی مقرر ہوتے ہیں اور یہ شعبہ بھی سول سروس ہی سے متعلق سمجھا جاتا ہے۔ اعلیٰ سرکاری مدارس اور یونیورسٹیوں میں مذہبی تعلیم نہیں دیجاتی۔ مدرسوں کے تقرر کے معاملے میں کسی جانبداری سے کبھی کام نہیں لیا جاتا۔

اہم ترین افسر مقامی کو عامل (Prefect) کہتے ہیں۔ انگلستان کے نظام حکومت میں ایسا کوئی عہدہ نہیں ہے جسے پریفیکٹ کے عہدے سے تشبیہ دی جاسکے۔ اضلاع میں پریفیکٹ ہی حکومت کی نمائندگی کرتا ہے۔ اس کا تقرر وزارت وقت کرتی ہے اور وہی اسے ملازمت سے علیٰحدہ بھی کرسکتی ہے۔ اصل میں پریفیکٹ کا عہدہ ایک سیاسی عہدہ ہے جس کے لئے کسی مخصوص قابلیت کی ضرورت نہیں سمجھی جاتی۔ پریفیکٹ کو مشورے دینے کے لئے ایک کونسل ہوتی ہے ضلعوں کی تحصیلوں کا انتظام بھی پریفیکٹ کرتے ہیں ان کی تقرری اور برخواستگی بھی وزارت ہی کے ہاتھوں میں ہوتی ہے۔ سول سروس والے ازروئے قانون سیاسیات میں حصہ نہیں لے سکتے مگر ان افراد کے لئے کام کرنے میں جو وزارت کے آدمی ہوتے ہیں ان کے لئے کوئی خطرہ نہیں ہوتا۔ پریفیکٹ اور سب پریفیکٹ کھلم کھلا حکومت کے نمایندوں کے لئے کام کرتے ہیں۔

فرانسیسی نظامِ حکومت کی دو خصوصیات قابلِ غور ہیں۔ ایک تو یہ ہے کہ وزراء کو قانون سازی کے بڑے وسیع اختیارات حاصل ہیں اور وہ ایسے ہنگامی قانون نافذ کر سکتے ہیں جن کا اطلاق انتظامی شعبوں کے علاوہ شہریوں پر بھی ہوتا ہے۔ دوسری خصوصیت یہ ہے کہ مجرم ہونے کی صورت میں ایک سرکاری ملازم کی پیشی معمولی عدالت میں نہیں بلکہ ایک ٹربیونل کے سامنے ہوتی ہے جس کے رکن صرف افسرانِ حکومت ہی ہوتے ہیں اور اس کے حیطۂ اختیار میں بہت سے ایسے امور بھی ہوتے ہیں جو معمولی عدالتوں کے اختیار سے باہر ہیں۔

آٹھواں باب۔ لوکل گورنمنٹ

انقلاب سے قبل فرانس میں ایسے مقامی اداروں کا کوئی نام و نشان نہیں تھا جیسے انگلستان اور امریکہ میں پائے جاتے ہیں۔ انقلاب کا ہنگامہ ختم ہونے کے بعد ۱۷۹۹ء میں نپولین نے لوئی چہارم کے دور کے نظامِ حکومت کو از سرِ نو تعمیر کرتے ہوئے ایسی دفعات وضع کیں جن سے مرکزی حکومت کے اثرات ہر گوشہ میں مضبوطی کے ساتھ جم گئے۔ اس وقت تک بھی مقامی ادارے قائم کرنے یا عوام میں انھیں مقبول بنانے کا کوئی خیال نہیں تھا۔ صرف قدیم اضلاع کو نظر انداز کر کے ملک کو خود ساختہ حصوں میں بانٹ دیا گیا جنھیں آئین کی اصطلاح میں ڈپارٹمنٹ (Department) کہتے ہیں۔ ان ڈپارٹمنٹوں میں کوئی عاملہ جماعت نہیں رکھی گئی اور نہ مقامیت کا جذبہ برانگیختہ کیا گیا۔ مگر جب جمہوریت کا دور دورہ ہوا تو ضرورت پڑی کہ ان ڈپارٹمنٹوں کو بھی کچھ اختیارات دیئے جائیں، چنانچہ اب ہر ڈپارٹمنٹ میں ایک منتخب شدہ کونسل ہوتی ہے جسے کونسل عامہ (Conseil General) کہتے ہیں۔ اس کا انتخاب عام رائے سے ہوتا ہے ہر کینٹن سے ایک ممبر آتا ہے اور اسکی مدت ممبری چھ برس ہوتی ہے ہر تیسرے سال نصف کونسل بدل جاتی ہے۔ ایک سال میں کونسل کے دو اجلاس ہوتے ہیں۔ پہلا اجلاس ایک مہینے اور دوسرا ایک عشرے تک رہتا ہے اگر مزید اجلاس منعقد کرنے کی ضرورت پڑے تو انھیں ایک ہفتے سے زیادہ طول نہیں دیا جاتا۔ کونسل کے محصول عائد کرنے کے اختیارات بہت ہی محدود ہیں۔ عدم رضامندی کی صورت میں حکومت اسے توڑ بھی سکتی ہے۔ اس کا حلقۂ عمل کچھ زیادہ وسیع نہیں ہوتا، یہ اسکولوں وغیرہ کی دیکھ بھال کرتی رہتی ہے۔ اس کے حلقۂ اثر کے محدود ہونے کی بڑی وجہ یہ ہے کہ پریفیکٹ مرکزی حکومت کے ایجنٹ کی حیثیت سے وسیع اختیارات رکھتا ہے اور کونسل پریفیکٹ کی رپورٹ حاصل کئے بغیر کسی معاملے کا فیصلہ نہیں کر سکتی۔ پھر کونسل کے فیصلوں کو مرکزی حکومت رد بھی کر سکتی ہے۔ مگر باوصف اس کے کہ اختیارات اس قدر محدود ہیں کونسل کے انتخابات میں بڑی سرگرمی اور جوش سے مقابلے ہوتے ہیں

کیونکہ کونسل کی ممبری پبلک لائف کا دروازہ کھول دیتی ہے۔

لوکل گورنمنٹ کا دوسرا اہم جزو کمیون (Commune) ہے، اسے اہم ایک ایسی میونسپلٹی کہہ سکتے ہیں جو کارپوریشن کی طرح املاک رکھ سکتی ہے۔ اس کی ایک کونسل ہوتی ہے جس میں دس سے لیکر چھتیس تک ممبر ہوتے ہیں، ممبروں کو کچھ تنخواہ نہیں ملتی، ان کا انتخاب رائے عامہ سے چار برس کے لئے ہوتا ہے۔ اپنا میئر (Maire) ممبران خود چنتے ہیں جو کونسل کا صدر ہونے کے علاوہ ایڈمنسٹریشن کا کام بھی کرتا ہے۔ وہ ایک طرف مرکزی حکومت کا ایجنٹ ہوتا اور پریفیکٹ کی ہدایت کے مطابق کام کرتا ہے، تو دوسری طرف کونسل کے انتظامی امور کی دیکھ بھال بھی اُسی کے سپرد ہوتی ہے۔ بعض معاملات ایسے ہوتے ہیں کہ ان میں مداخلت کرکے پریفیکٹ میئر اور کونسل کے فیصلوں کو منسوخ کر دیتا ہے۔ ایک ماہ کی مدت تک پریفیکٹ میئر اور کونسل کو معطل بھی رکھ سکتا ہے، اور مرکزی حکومت چاہے تو میئر کو موقوف اور کونسل کو توڑ بھی سکتی ہے۔

یہاں پر یہ سوال ہوسکتا ہے کہ فرانس جیسے جمہوریت پسند ملک میں حکومت مقامی امور کا انتظام مقامی باشندوں کے سپرد کرنے سے کیوں گریز کرتی ہے؟ اس کا جواب کئی پہلوؤں سے دیا جاسکتا ہے۔ اول تو یہ بات ذہن نشین ہونا چاہیئے کہ سول سروس کے افراد فرانس میں بہت قوی اور قوت پسند ہیں۔ وہ اپنے فرائض پوری مستعدی اور عمدگی کے ساتھ سرانجام دیتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ ان کے شعبے سے باہر لوگ ان کاموں کو اتنی عمدگی کے ساتھ انجام نہیں دے سکتے پھر فرانس کی حکمراں جماعت کو ۱۷۹۹ء کی ڈائرکٹری کے زوال کے بعد سے ہمیشہ بغاوت کا خطرہ لاحق رہا ہے اور اسی خطرے کی وجہ سے حکومت کے شعبوں کی باگ ڈور اس نے اپنے ہاتھ میں رکھی ہے۔

مقامی جماعتوں کو اختیارات دینے کے نتائج یہ نکل سکتے ہیں کہ وہ مرکز سے ناراض ہوکر بغاوت اور سازش کا ملجا و ماوا بن جائیں۔ اس کے علاوہ خود فرانس کے باشندوں نے بھی اس سے زیادہ لوکل گورنمنٹ کبھی طلب نہیں کی جتنی انھیں حاصل ہے۔ سنہ ۱۹۱۹ء کے بعد اس قسم کی ایک تحریک اٹھی تھی کہ ڈپارٹمنٹوں کو جغرافی اعتبار سے مجتمع کرکے فرانس کو چند بڑے بڑے انتظامی علاقوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ یہ تحریک برابر اپنا کام کر رہی ہے مگر نئے نئے اور اہم تر مسائل وقت نے ابھی تک ملک کو اس کی طرف پوری طرح متوجہ نہیں ہونے دیا ہے۔

نخلِ چنار

(از پروفیسر رام پرشاد کھوسلہ ناشاد ایم۔ اے)

اے عروسِ گلشنِ کشمیر اے نخلِ چنار — دہر ہے تیرا ثنا خواں تجھ پہ ہے عالم نثار

آبِ جہلم کے کناروں پر ہے تو سایہ فگن — وادیٔ کشمیر تجھ سے غیرتِ باغِ عدن

تیرا ہر پتّا مثالِ پنجۂ خورشید ہے — تیری شاخوں کا ترنّم نغمۂ توحید ہے

رہ نوردوں کیلئے سایہ ترا جائے قیام — بھولے بھٹکوں کو ہے دیتا تو ٹھہرنے کا پیام

آئیں جو سائے میں عزّت سے بٹھاتا ہے اُنھیں — آسماں کے قہر سے گویا بچاتا ہے اُنھیں

جو تھکے ماندے ہیں اُنکو حوصلہ دیتا ہے تو — بیکسوں کو اپنے دامن میں چھپا لیتا ہے تو

دیکھکر سایہ گھنا تیرا بہل جاتا ہوں مَیں — گرتے گرتے راہِ ہستی میں سنبھل جاتا ہوں میں

بیٹھ جاتا ہوں ترے سائے میں دم لینے کو مَیں — چینِ قلبِ مضطرب کو دو گھڑی دینے کو میں

دیکھکر تجھ کو مجھے صحنِ چمن یاد آگیا — آکے تیری چھاؤں میں اپنا وطن یاد آگیا

کوہسار اور وادیاں دم سے ترے آباد ہیں
تجھ میں مضمر رازہائے ہستیِ ناشاد ہیں

رُباعی

سونے والوں کو کیا جگاتی دُنیا — افسانے تھے کون جو سُناتی دُنیا

دنیا کا بھرم کھُلا نہ پوچھو کیسے — جب آنکھ کھُلی تو دیکھی جاتی دُنیا

فراق گورکھپوری

رسم الخط[1]

(سید ابن حسن شارق بی۔ اے۔ بی ٹی۔)

ملک کے مشہور ادیب جناب اختر حسین رائے پوری نے حال ہی میں زبان کے مسئلہ کے متعلق اپنے قیمتی اور مفید خیالات کا اظہار کیا ہے۔ انکا یہ خیال غالباً بالکل درست ہے کہ مسئلہ زیر بحث زبان کا نہیں بلکہ رسم الخط کا ہے۔ اسلئے کہ اُردو خط میں لکھی ہوئی ٹھیٹ ہندی کو بھی ہم اُردو کہتے ہیں اور ہندی رسم الخط میں لکھے ہوئے اُردو مقالات کو کسی طرح اُردو نہیں کہتے خواہ وہ منشی پریم چند یا مہاشہ سدرشن ہی کے میٹھے اور صاف بول ہی کیوں نہ ہوں جب وہ ہندی رسم الخط کا جامہ پہن لیتے ہیں تو ہم اُنکو ہندی کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

اُردو رسم الخط کی حمایت میں بہت کچھ لکھا جا رہا ہے۔ جلسوں اور کانفرنسوں میں تقریریں کیجا رہی ہیں اور بڑی بڑی انجمنیں بنائی جا رہی ہیں۔ لیکن حامیانِ اُردو میں بہت کم لوگ ہیں جو تعصبات سے بلند ہو کر ٹھنڈے دل سے اِصلاح رسم الخط کے مسئلہ پر غور کرنے اور ہندی خط کے سہل الحصول ہونے کے دعوے کو قابل پذیرائی قرار دینے کو تیار ہوں اور عملی طور پر اُردو زبان کے رسم الخط کی درستی چاہنے والے لوگ تو غالباً ناپید ہیں۔

اگر انصاف سے دیکھا جائے تو ہندوستان میں ہندی زبان کو عوام کی بولی اور دیوناگری رسم الخط کو قومی۔ دفتری اور بین صوبجاتی خط ہونا چاہیئے۔ یہ اسلئے نہیں کہا جارہا کہ ہندؤں کی تعداد زیادہ ہے بلکہ اسلئے کہ ہندی رسم الخط درحقیقت بہت سہل اور آسان ہے۔ سینکڑوں بلکہ ہزاروں برس رہنے کے بعد یہاں کے باشندوں نے انسانی آوازوں کو مختلف حصّوں میں تقسیم کر لیا ہے اور بڑی جانفشانی سے ہندی ابجد کو سائنٹفک بنالیا ہے۔ مثال کے طور پر س स ہندی میں ایک آواز بغیر اعراب کے ہے لیکن اُردو میں سین۔ بتایئے کہ اُس آواز میں جو پیاس۔ آس یا راس میں میں بولی جاتی ہے یہ ی اور ن کیسے آ کو دے اور اسی طرح ج ज کے جیم میں ی اور میم

[1] اس مضمون کو ہم قریب قریب بجنسہٖ شائع کرتے ہیں کیونکہ مضمون نگار صاحب کی خاص استدعا ہے کہ اس میں ذرا سے کوئی ترمیم نہ کی جائے اور نہ اشاعت میں تعویق روا رکھی جائے۔ (ایڈیٹر)

زائد کیوں ہے۔ غرض آواز اور حرف میں مطابقت نہیں ہے۔ اس کے علاوہ ت۔ ط۔ ث وغیرہ ہم آواز حروف کے وجود سے ایک غیر ضروری مماثلت اور اشتباہ پیدا ہوتا ہے جسکی اس عجلت پسند زمانے میں نہ کوئی ضرورت ہے اور نہ اس کے قائم رکھنے کی ہندوستان کے باشندوں میں اہلیت ہی ہے۔ عرب میں ممکن ہے ق کو حلق سے اور ص کو تالو سے نکالنے کی عادت بلا کوشش پیدا ہو جاتی ہو لیکن ہندوستان میں نہ کسی کو قاری بننا ہے اور نہ حروف کی صوتی باریکیوں پر اشاعت تعلیم جیسے اعلیٰ مقصد کو قربان کرنا چاہیئے۔

اس کے علاوہ ہندی والوں نے ژ اور غ اور خ جو انکی ابجد میں نہ تھا بطریق احسن داخل کر دیئے ہیں۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اردو رسم الخط در اصل ایک قسم کی مختصر نویسی ہے اور اس سے قوم کا مجموعی وقت بچتا ہے اور اس طرح نیشنل اکانومی ہوتی ہے۔ اول تو اختصار کی ضرورت ہر شخص کو اسقدر شدید نہیں ہوتی اور جنکو ہوتی ہے اُن کے لئے شارٹ ہینڈ پہلے ہی سے ایجاد ہو چکا ہے۔ ہر عام و خاص کو مختصر نویسی پر مجبور کرنا انصاف سے بعید ہے بلکہ اُردو سیکھنے کی ہمت اس خیال سے پست ہو جاتی ہے کہ اسمیں مہارت پیدا کرنا مشکل ہوتا ہے۔ ہندوستان کے باشندے ابھی وقت کی قدر نہیں کرتے۔ اور مغرب کے جو لوگ وقت کے قیمتی ہونیکے متعلق وعظ دیتے ہیں وہ اپنی تعریف و توصیف میں مبالغہ کرتے ہیں۔ ہزار ہا کھیل کود۔ گنجفے۔ تاش۔ تماشے اور دیگر دلچسپ مشغلے موجود ہیں جنمیں انسان اپنا وقت خراب کیا کرتا ہے۔ لیکن بچت نکالنے کی اُسے یہی تدبیر نظر آتی ہے کہ لکھنے پڑھنے میں کتر بیونت کرے اور مختصر عبارت لکھے۔ اسمیں درحقیقت مبالغہ ہی مبالغہ ہے۔ ورنہ جو شخص اُردو اور ہندی دونوں رسم الخط جانتا ہے وہ اُس بات کو خوب سمجھ چکا ہے کہ ہندی اُردو سے صاف اور درخشاں ہے اور اُردو پیچیدہ اور گنجلک۔

اُصول یہ ہونا چاہیئے کہ "جو بولو وہ لکھو" اور "جو لکھا ہوا ہے وہ پڑھو"۔ ایک طرف مشترک الصوت حروف کا ابہام دوسری طرف حروف کے مختلف حالات میں مختلف الصوت ہونیکا نقص ہے پھر نقطوں اعراب اور تشدید کے نہ ہونیکی تکلیف اس کے علاوہ ہے۔ مگر ان سب خرابیوں سے قطع نظر سب سے بڑی دقت یہ ہے کہ اُردو کا رسم الخط بے بس ہے۔ آپ (mool) مُول تک تو علیحدہ لکھ نہیں سکتے۔ رہا سیاق سباق سے مطلب نکالنے کا سوال تو یہ بھی ایک کمزوری ہے کہ ایک لفظ جو کئی حروف کا مجموعہ ہو اپنا مطلب خود واضح کرنے سے قاصر ہو اور نفس عبارت کا محتاج رہے۔ انصاف سے دیکھا جائے تو یہ کوئی خوبی نہیں ہے۔ در اصل یہی وجہ ہے کہ اکثر لوگ

پڑھنے میں غلطی کر جاتے ہیں اور معنی کچھ کے کچھ نکال لیتے ہیں۔

بعض لوگ یہی پیٹ رہے ہیں کہ اس رسم الخط سے ہم ایران۔ افغانستان۔ عرب۔ عراق شام و مصر کے قریب ہیں کیونکہ وہاں بھی عربی رسم الخط رائج ہے۔ قریب ہونا دوستی کے لئے بھی ہوسکتا ہے اور جنگ کے لئے بھی۔ سارے یورپ اور امریکہ میں صرف ایک رومن رسم خط جاری وساری ہے مگر آپس میں آئے دن لڑائیاں ہوتی رہتی ہیں جب تک ایک اطالوی جرمنی زبان نہ سیکھے اس کا رسم الخط اس کی کوئی راہ نمائی نہیں کر سکتا۔

ہندوستان کے مسلمان جو بین الاقوامیت کے اِسقدر شیدائی ہیں اس حقیقت کو کیوں فراموش کر جاتے ہیں؟ بین الاقوامیت اور لیگ کا ڈھونگ عرصہ ہوا ٹوٹ چکا اور دنیا کی مختلف قوموں میں آپس میں محبت اور میل جول سے زندہ رہنے کی نیک خصلت ابھی پیدا نہیں ہوئی ہے۔ اسلئے آپ براہ مہربانی مصر و ایران پر فدا نہ ہوجئے اور عربی فارسی کے الفاظ اپنی صاف ستھری زبان میں ٹھونسیئے

مولوی وحید الدین صاحب سلیم پانی پتی نے اپنی کتاب وضع اصطلاحات علیمہ میں فرہنگ آصفیہ کا حوالہ دیکر لکھا ہے اُردو زبان میں خالص عربی فارسی الفاظ کی تعداد بقدر ½ کے ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ عرب اور ایران کی زبانوں میں بھی ہماری ہندوستان کے ½ الفاظ موجود ہیں یا نہیں اور اگر نہیں ہیں تو ہمیں بھی انکا بائیکاٹ کرنے کا حق ہے۔ جب کمال اتاترک عربی رسم الخط سے نجات حاصل کرنے کے بعد بھی مسلمان باقی رہ سکے ہیں تو ہم ہندوستانی بھی ہندی دیوناگری رسم الخط اختیار کر کے کیوں مسلمان باقی نہ رہیں گے۔ رسم الخط بدلنے سے نہ مذہب بدل جاتا ہے اور نہ تمدن مسخ ہوجاتا ہے۔ اگر ہندو اور مسلمانوں کو آپس میں ایک دل ہونا ہے تو اُن کو ایک ہی زبان اور رسم الخط رکھنا ہوگا۔ یہی وحدت خیال پیدا کرنے اور آپس میں محبت و اخلاص قائم کرنے کا بہترین ذریعہ ہے۔

رُباعی

(از حضرت شاہد صدیقی)

اپنے لئے بخشش کی دُعا کیا معنی — اور عفوِ گنہ کی التجا کیا معنی
اللہ کے انصاف پہ الزام نہ رکھ — رحمت کے بھروسے پہ خطا کیا معنی

مزدُور

(خیر بہوردی)

چھاؤں میں تاروں کی محنت کرنیوالے ہیں یہ لوگ
اپنے فرضِ منصبی پر مرنے والے ہیں یہ لوگ

صبح ہے تو کام ہے اور شام ہے تو کام ہے
کام مزدوروں کے جوشِ زندگی کا نام ہے

شانۂ محنت پہ مزدوروں کے تخت و تاج ہیں
پھر بھی یہ نانِ شبینہ کے لئے محتاج ہیں

ان کے خونِ دل سے شاہی کھیتیاں سیراب ہیں
انکی روحیں پھر بھی راحت کیلئے بیتاب ہیں

نالہ زن ہیں ان کے بچے بھوک سے شام و سحر
مفلسی کی گود میں پلتے ہیں یوں لعل و گہر

خون آلودہ ہے یارب! پنجۂ سرمایہ دار
دہر سے اب تو مٹے صہبائے دولت کا خمار

رنگ لائیں گی وفائیں ایک دن مزدور کی
دست گیری ہوگی دستِ غیب سے مجبور کی

دل میں پیدا شعلہ ہائے مستقل ہو جائیں گے
جذبِ دل بھڑکے گا شعلے مشتعل ہو جائیں گے

مدّعائے بے نوا کو رحم کی حاجت نہیں
التجائے دردِ غم شرمندۂ منت نہیں

اس جہاں کا غیب سے ہو جائیگا برہم نظام
محنتِ مزدور لے گی محنتوں کا انتقام

کلامِ نیّر

(از علامہ نیّر کاکوروی مرحوم و مغفور)

الٰہی کس طرح چھوڑوں میں شکوہ جورِ قاتل کا
کہ لے دے کر یہی اک رہ گیا ہے مشغلہ دل کا

جوانی اب کہاں البتہ کچھ کچھ داغ باقی ہیں
مہک سی رہ گئی ہے پھول تو مرجھا گیا دل کا

الٰہی مجھکو ناکامی سے مایوسی نہیں ہوتی
تری رحمت سے اتنا بڑھ گیا ہے حوصلہ دل کا

خدا آباد رکھے اسکے دم کو رہتی دنیا تک
سکت مجھ میں کہاں تھی کام آیا حوصلہ دل کا

ترا تیرِ نگہ پہلو میں یوں گھل مل کے بیٹھا ہے
کہ اس عالم میں بھی مجھکو گماں ہونے لگا دل کا

ترے دربار میں نیّر کو رہنے کی اجازت ہو
یہی ہے آرزو دل کی یہی ہے حوصلہ دل کا

رسم الخط کا مسئلہ

(از مسٹر ترلوک ناتھ - ایم۔ اے)

ہندوستان، تواریخ کے اس قدیم زمانہ سے جس پر کم وبیش گمنامی کا پردہ پڑا ہوا ہے، ان مختلف قبایل اور طبقوں کا آماجگاہ بنا رہا ہے جو گوناگوں خیالات اور طرح طرح کی زبانوں اور اطوار کے حامل تھے۔ تاہم اس خطۂ زمین اور یہاں کی آب وہوا میں میل جول کی کچھ ایسی فضا پائی جاتی ہے کہ سو پچاس سال ہی میں یہ لوگ اپنے تفرقات بھول کر باہم شیر وشکر ہو گئے۔ اس کے معنی یہی ہیں کہ اس ملک میں تفرقات کبھی دیرپا ثابت نہ ہوئے۔

دنیا کے دوسرے گوشوں میں بھی ایسے حالات بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ لیکن اُن حلقوں کی وسعت اسکی خاک پا بھی نہیں۔ اس ملک کی لمبائی چوڑائی اور اُسی کے ساتھ ساتھ یہاں کی تہذیب کی یگانگت اکثر سیاحوں کو متحیر کر دیتی ہے۔ اب بھی یہاں آئے دن نئے نئے مسئلے پیدا ہوتے رہتے ہیں جو ہماری اتفاق واتحاد کی زندگی میں آہستہ آہستہ رخنہ انداز ہوتے ہیں۔ مسلمانوں کی حکومت تھی۔ زبردست کا ٹھینگا سر پر۔ مگر اس کے ساتھ ہی ساتھ ہندو باغی راجوں کا بھی زور تھا۔ تاہم تمدنی حیثیت سے ہم میں وہ اختلاف نہ تھا جو اب بےچون وچرا مشیت ایزدی سمجھ کر مسلمہ سمجھ لیا جاتا ہی۔ نئے حل طلب مسائل میں اُردو ہندی کا قضیہ بہت کچھ پیش پیش ہی۔ مسلمانوں کو اس بات کا ڈر ہے کہ اگر اُردو ہندی میں جذب ہو گئی تو اسلامی تہذیب کا وہ اقتدار جو انھوں نے صدیوں کی کاوش سے یہاں قایم کیا ہے۔ ایک لمحہ میں برباد ہو جائے گا۔ اور ہندو صاحبان کا خیال ہی کہ ہندی ہی ہندوستان کی پُرانی زبان ہے۔ قوم پرستی کا تقاضا ہی کہ جہاں جاؤ وہیں کے ہو رہو۔ مگر ہندو اسی پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ انکا قول یہ ہی کہ یہ قانونِ قدرت ہی۔ جو جلد یا دیر میں عمل پیرا ہو کر رہے گا۔

خیر یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ اصل مسئلہ جس پر کل اختلاف کا انحصار ہے رسم الخط کا معاملہ ہی۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ملک کی معاشرتی وفطری اور لوگوں کی مادی ضروریات کا کیا تقاضا ہے؟[1]

---

[1] جسمانی ساخت کا خیال بھی ضروری ہے کیونکہ ماہرین لسانیات کا قول ہے کہ ہمارا تلفظ اور اسلئے ہمارے حروف تہجی اُنہیں کے مطابق تیار ہوتے ہیں۔

اسمیں شک نہیں کہ عربی رسم الخط اور حروف تہجی ملک عرب کیلئے زیادہ موزوں تھے مثلاً ق صرف صحرائی عرب جیسے خطوں میں مروج ہے۔ مشرقی ممالک اور اطالوی اور فرانسیسی زبانوں میں اس کا وجود نہیں۔ ہاں جرمنی اور روسی زبانوں میں کسی حد تک اس کا کچھ اثر نمایاں ہے۔

ایسے حروف کا ہماری زبان میں موجود نہ ہونا اسکی خامی کا ثبوت ہو سکتا ہے لیکن یہ بھی غور طلب بات ہے کہ انگریزی زبان باوجود اس کے کہ اسمیں "ق" موجود نہیں ہے گوشے گوشے میں پھیل گئی ہے بلکہ اکثر مقامات پر ایک عام زبان کا کام دے رہی ہے۔ گویا ق کی عدم موجودگی کسی زبان کے عام زبان ہونے کے منافی نہیں ہے۔

اردو رسم الخط کو ٹائپ یا ٹائپ رائیٹر کی صورت میں لانیکی کوشش کا (انتہائی کاوش اور مالی فراخدلی کے باوجود) جو نتیجہ نکلا وہ محتاج بیان نہیں۔ اختر حسین صاحب رائے پوری نے اپنے پچھلے مضمون میں اس کا مفصل ذکر کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ جب تک ہم پرانی ڈگر پر چلے جائیں گے اور اس رسم الخط کو تبدیل نہ کریں گے۔ اردو کی کبھی نشوونما یا ترقی نہیں ہو سکتی۔ اور سوائے ایک محدود طبقے کے وہ عام لوگوں کی زبان نہیں بن سکتی۔ اس نقص کے رفع کرنے کے لئے انہوں نے چند حروف کے حذف کرنے کی رائے دی ہے۔

اُنکی رائے واقعی قابل تحسین اور قابل غور ہے۔ لیکن کیا اچھا ہو اگر ان ہنگامی اصلاحات کو یکطرف کر کے ہندی حروف ہی کو اپنا ابجد بنا لیا جائے۔

اردو حروف فن خطاطی کے اعلیٰ معیار کا نمونہ ہیں۔ یہاں تک کہ روضۂ تاج بی بی کے بڑے دروازہ پر جو آیات قرآنی کندہ ہیں ان کو انگریز سیاح بھول بھلیاں سمجھتے ہیں۔ لیکن جب ہم آسان فہمی زود خوانی اور اُس کے ساتھ لکھائی چھپائی کی سہولتوں کا خیال کر کے اس رسم الخط کو سائنٹفک اُصولوں کی کسوٹی پر جانچتے ہیں تو اس رسم الخط کی خرابیاں ہم پر روز روشن کی طرح آشکارا ہو جاتی ہیں۔

اس ضمن میں ایک انگریز کلکٹر ضلع کا چھوٹا سا تجربہ بھی قابل ذکر ہے۔ کلکٹر موصوف کو کشتیوں کی ضرورت تھی اور اس غرض سے اُنھوں نے تحصیلدار صاحب کے نام ایک پروانہ بھیجا تھا لیکن تحصیلدار صاحب نے کشتیوں کو "کسبیوں" پڑھا اور صاحب کلکٹر کے حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب وقت معینہ پر انھیں کسبیوں کا ایک انبوہ کثیر نظر پڑا۔ یہ کوئی خیالی قصہ نہیں بلکہ ایک سچا واقعہ ہے۔ موجودہ رسم الخط میں اس قسم کی غلطیوں کا ہو جانا کچھ محال نہیں۔ پھر گلکاری کی خواہش نے ہمارے کاتبوں پر اتنا اثر جما رکھا ہے کہ وہ خواہ مخواہ لفظوں کو جوڑ جوڑ کر لکھتے ہیں (اسکی مثالیں اب بھی

روزانہ پرچوں میں بکثرت ملتی رہتی ہیں) گو آجکل اس کی کچھ روک تمام ہوگئی ہے تاہم چند الفاظ کی ملی ہوئی صورت ہماری نظروں میں کچھ اس طرح کھُب گئی ہے کہ اب ہٹائے نہیں ہٹتے اور انھیں کی وجہ سے زبان میں ایک ذو معنی کیفیت پیدا ہوگئی ہے جو کسی طرح قابل ستایش نہیں کہی جا سکتی۔

بخلاف اس کے ہندی رسم الخط لکھنے پڑھنے اور اس کے ساتھ ہی دوسری تمام روزمرہ ضرورتوں کے لئے نہایت سہل اور سائنس کے نقطۂ نظر سے بالکل مکمل ہے۔ اسمیں دوسری زبانوں کے تراجم بھی زیادہ سہولیت کے ساتھ کئے جا سکتے ہیں۔ کیونکہ اس کے جملوں کی بندش قریب قریب مغربی زبانوں ہی کی طرح ہے۔ یہ امر اس لئے اور بھی غور طلب ہے کہ ہماری دونوں ملکی زبانوں سائینٹفک اور عموماً دوسرے اصنافِ ادب سے قطعی بے بہرہ ہیں حالانکہ انکا موجود ہونا ایک متمدن قوم کی ہستی کے لئے اشد ضروری ہے۔

ایک انگریز نقاد فن کا جو اکسفورڈ یونیورسٹی میں زباندانی کا پروفیسر تھا، قول ہے کہ ہندی رسم الخط دنیا کی تمام دوسری زبانوں سے بہتر ہے۔ یہی نہیں۔ ہندوستان کی آبادی اور اُس کے تناسب سے ہندی رسم الخط جاننے والے اصحاب کی تعداد کا تخمینہ کیا جائے تو ہم اس نتیجہ پر پہونچتے ہیں۔

زبانیں	تناسب ایک دوسرے سے	تناسب ہندو ہر ایک میں
مغربی ہندی	۵۰	۴۶
بنگالی	۵	۲۴
پنجابی	۸	۷
گجراتی	۴	۴

لہ ماہرین علم لسان کا کہنا ہے کہ زبان کے دو ضروری جزو ہیں۔
(۱) بلحاظ خواندگی (۲) دوسرے بلحاظ کتابت

بلحاظ خواندگی۔ اعراب اور حروف مفردہ کے ہجے ضروری امور ہیں۔ اعراب کے خیال سے ہندی رسم الخط میں کسی قسم کی غلطی پیدا نہیں ہو سکتی۔ حروف مفردہ کے ہجّے کے متعلق یہ مسلمہ امر ہے کہ ہندی میں کل حروف بعینہ اُسی طرح بولے جاتے ہیں جس طرح ان کا استعمال کرتے ہیں مثلاً क کا تلفظ ٹھیک اُسی طرح ہے جس طرح ہم اِسے الفاظ میں استعمال کرتے ہیں مثلاً کام بخلاف اسکے اُردو میں اس علامت کو کاف کہتے ہیں جو ظاہراً کسی لفظ میں پوری طرح بولا نہیں جاتا۔ اسی طرح دوسرے حروف کی مثالیں دی جا سکتی ہیں۔

موہجانی نقطۂ نظر

	تناسب مردم شماری
بہار و اڑلیسہ	۳۷
(یو پی) صوبہ متحدہ	۴۸
صوبہ متوسط	۱۵

یعنی جن حصوں میں مغربی ہندی (جسے فارسی رسم الخط میں معرّب الفاظ[۵] کے ساتھ کچھ لوگ اُردو لینے کے مشتاق ہیں) بولی یا سمجھی جاتی ہے وہاں ہندوؤں کا تناسب بہت زیادہ ہے اور یہ طبقہ اب ہندی رسم الخط سے بخوبی واقف ہے۔ دوسرے طبقوں میں بھی اِس کا اثر نمایاں ہے۔ گویا اگر ہم اُردو زبان کا (جو برج اور فارس کے اختلاط سے پیدا ہوئی) رسم الخط فارسی سے ناگری میں تبدیل کردیں تو کوئی خاص فرق پیدا نہ ہوگا۔ ہاں چند دنوں تک جو تھوڑی بہت تکلیف ہوگی وہ شدنی ہے اور اس کارِعظیم کے مقابلے میں نفی کے برابر ہے۔

پروفیسر گراہم بیلی مصنف تواریخ اَدب ہندی و اُردو نے زبان اُردو کی ترقی کا انگلوسیکشن زبان سے (جو زمانۂ حال میں انگلش کے نام سے موسوم ہے) موازنہ کیا ہے۔ قرونِ وسطیٰ کے بیشتر ادیبوں کی کتابوں کا مطالعہ کیا جائے تو ہمیں (جو موجودہ انگریزی رسم الخط سے واقف ہیں) بڑی دقت پیش آئے گی۔ یہی نہیں جا بجا ہم عبارت کو بالکل سمجھ ہی نہ سکیں گے۔ لنگ لینڈ کی کتاب "پلیرس پلومین" اس کا نمونہ ہے۔ وہ کتابیں جو اس زمانہ سے بھی پہلے لکھی گئی تھیں اُن کی عبارت کچھ اسقدر اجنبی سی معلوم ہوگی کہ ہم موجودہ حروف کو پہچان نہ سکیں گے۔ لیکن آہستہ آہستہ چند لفظوں کے حذف کرنے اور بیشتر الفاظ کی شکل بدلنے کے بعد انگریزی زبان کو یہ زرّین زمانہ دیکھنا نصیب ہوا ہے۔ اگر ہم بھی اسی زبان کی طرح (جس کی ترقی کے اسباب اور قراین ہمارے ادب کے مختلف مدارج سے مختلف ہیں) اپنے رسم الخط

---

[۵] اُردو کی ابتدائی نشوونما کے متعلق تین رائیں ہیں۔

(۱) مولانا آزاد کی رائے یہ ہے کہ اُردو برج اور فارسی کے اختلاط سے پیدا ہوئی۔

(۲) سلطان احمد صاحب کی رائے میں اردو پنجاب کے مغربی و شمالی حصّوں میں پیدا ہوئی جس کا وہ یہ ثبوت دیتے ہیں کہ اُردو الفاظ کا تلفظ اور پُرانے الفاظ پنجاب کی زبان "لنڈی" کی طرح ہیں۔

(۳) چند انگریزی نقادوں کا قول ہے کہ یہ زبان مغربی ہندوستان میں خصوصاً گجرات اور سورت کے آس پاس کی جگہوں میں عرب تاجروں، مسلمان فاتحوں اور وہاں کی نچی زبان کے اختلاط سے پیدا ہوئی ہیں۔ یہاں پر میرا مدعا ان رایوں پر کسی قسم کا اظہار خیال نہیں ہے محض بر سبیل تذکرہ ذکر آگیا۔ راقم

کو تبدیل کردیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ہمارا ادب بھی کل قوم کے متفقہ انہماک اور دورِ حاضرہ کی بیدار مغز تعلیم یافتہ جماعت کی امداد اور دنیا کی گوناگوں کیفیات سے متاثر ہوکر ادیبوں کی کاوش کے بدولت جلد چمک نہ اٹھے۔ (طوالت کے خوف سے میں یہاں اُن حروف کی شکلوں کا مفصل تذکرہ نہیں کرسکتا)

میں جانتا ہوں کہ میری یہ تجویز قوم کے ایک طبقہ کے لئے باعث انتشار ہوگی۔ رسم الخط کی تبدیلی کے خلاف ہمارے مسلم بھائیوں کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ قرآن پاک اردو ہی کی طرح کے رسم الخط میں لکھا گیا ہے۔ جہاں تک میرا علم ہے اُردو کے رسم الخط کا جاننا قرآن پاک کے مطالعہ میں کچھ خاص طور پر معاون نہیں ہوتا اور اگر اس سے واقعی کچھ مدد ملتی بھی ہے تو کیا ہمارے دن رات کے ساتھی اور ہم قوم ملک کی بہبودی اور یگانگت کی خاطر اتنی قربانی بھی نہیں کرسکتے کہ ملکی ادب کی خاطر ناگری حروف استعمال کریں اور خاص اپنی مذہبی کتب کے مطالعہ کی لئے عربی پڑھیں۔ یہ بعینہٖ ویسا ہی ہوگا جیسا بہت سے جفاکش انگریز عبرانی زبان کو محض اس غرض سے پڑھتے ہیں کہ بائبل کا مطالعہ اس کی اصلی صورت میں کرسکیں۔

اسمیں شک نہیں ہے کہ فارسی ادب بھی بہت بیش بہا اور قابل قدر ہے تاہم کوئی وجہ نہیں کہ اس کے شہ پاروں کا ترجمہ ہندی رسم الخط میں نہ ہوسکے۔ میں فارسی۔ عربی۔ غرض کسی زبان کے الفاظ کے استعمال کے خلاف نہیں ہوں۔ جو لفظ ہماری زبان میں بخوبی داخل ہوسکیں اور آسانی سے لکھے بھی جاسکیں وہ شوق سے شامل کرلئے جائیں۔ فارسی ہمارے ادب کا خاص شعبہ ہوسکتی ہے جس طرح فرانسیسی زبان کی انگلستان میں قدر ہے اسی طرح فارسی ادب کی رنگینیاں ہمارے ادب کے لئے زینت بخش ہوسکتی ہیں۔ "ہنوز دہلی دور است" اور "سگ زرد برادر شغال" وغیرہ امثال نے تو موجودہ ہندی میں بھی جگہ حاصل کرلی ہے (اگرچہ اسمیں آجکل سنسکرت کے الفاظ حد سے زیادہ داخل کرلئے گئے ہیں) اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ فارسی دان اصحاب فارسی ادب کے نکات ہندی رسم الخط میں لکھیں تو اس زبان میں فارسی کی "موزونیت اور اثر" اور ساتھ ساتھ اس کے جذبات رنگین کا چربہ نہ اتار سکیں۔

ہندی حروف تہجی میں ادھر چند سال سے کافی تبدیلیاں کردی گئی ہیں تاکہ اُردو فارسی کی عبارت اس میں بخوبی لکھی جاسکے۔ کئی ستارہ عمدہ اُردو کتابیں مثلاً میر کے نشتر وغیرہ اس رسم الخط میں ہو بہو اتار لئے گئے ہیں۔ گویا ہندی ادیب اس زبان کو قومی حیثیت دینے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کررہے ہیں۔ انکی مراد یہ ہے کہ اپنے مخالفوں کی (اگرچہ دراصل مخالفت

کا کوئی موقعہ نہیں ہے) آؤ بھگت کا سامان بھی کر لیا جائے۔اب ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ ہم بھی دوستی کا ہاتھ بڑھائیں اور اپنی بہن بھائیوں کی سی زبان کو ہاتھوں ہاتھ لیں۔اور اس رسم الخط میں انشا پردازی کرنا باعثِ عار نہ سمجھیں بلکہ اسے قومی ترقی کا پیش خیمہ جانتے ہوئے اس میں پیش پیش رہیں تاکہ آنے والی نسلیں یہ نہ کہہ سکیں کہ ہم نے اپنے ملک کی بہبودی کے لئے ضروری سعی سے اغماز کیا۔بہرحال میری رائے اور میری تمنا تو یہی ہے۔

آزاد رو ہوں اور میرا مسلک ہے صلح کل
ہرگز کبھی کسی سے عداوت نہیں مجھے

(غالب)

نوٹ :۔ گاندھی جی نے جس زبان کو ہندی ہندوستانی سے موسوم کیا ہے وہ یہی زبان ہے جس میں الفاظ فارسی۔برج۔عربی۔سنسکرت وغیرہ ہندی حروف تہجی کے جامہ میں لکھے جائیں۔میری خواہش تو ہے کہ ہندی حروف کی جدید ترقیوں اور اصلاحات کا ذکر کیا جائے لیکن غالباً ناظرین زمانہ ان سے بخوبی واقف ہیں۔

جذباتِ شاہد

(از مولانا شاہد صدیقی اکبرآبادی)

ہوش والے امتیازِ موج و ساحل میں رہے
ہم تھے خود اک موجِ غم طوفان کے دل میں رہے

ڈال کر راہِ وفا پر اُس نے نظریں پھیر لیں
درد والے حشر تک پہلی ہی منزل میں رہے

تصل تھیں زندگی سے موت کی آسانیاں
تم نے مشکل میں ہمیں رکھا تو مشکل میں رہے

ادثے ایسے بھی ہوتے ہیں جہانِ عشق میں
ان کی نظریں دل بنائیں اور غمِ دل میں رہے

یری نظروں سے یہ اہلِ ہوش کیا لیجائیں گے
بات جب ہے کوئی دیوانہ بھی محفل میں رہے

سننے والوں نے سنی شاہد مری فکرِ سخن
پھر بھی جو دل کے مطالب تھے مرے دل میں رہے

جذباتِ فراق

(از مسٹر رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری، ایم۔ اے)

مجھکو مارا ہے ترا درد اٹھا کے پہلے
دی سزا عشق نے ہر جرم و خطا کے پہلے

آتشِ عشق بھڑکتی ہے ہوا کے پہلے
ہونٹ جلتے ہیں محبت میں دعا کے پہلے

فتنے برپا ہوئے ہر غنچۂ سربستہ سے
کھل گیا رازِ چمن چاکِ قبا کے پہلے

چال ہے بادۂ ہستی کا چھلکتا ہوا جام
ہم کہاں تھے ترے نقشِ کفِ پا کے پہلے

اب کمی کیا ہے ترے بے سر و سامانوں کو
کچھ نہ تھا تیری قسم ترک و فنا کے پہلے

عشقِ بیباک کو دعوے تھے بہت خلوت میں
کھو دیا سارا بھرم شرم نے آ کے پہلے

خود بخود چاک ہوئے پیرہنِ لالہ و گل
چل گئی کون ہوا بادِ صبا کے پہلے

ہمسفر راہِ عدم میں نہ ہو تاروں بھری رات
ہم پہونچ جائیں گے اس آبلہ پا کے پہلے

پردۂ شرم میں صد برقِ تبسم کے نثار
ہوش جاتے رہے نیرنگِ حیا کے پہلے

موت کے نام سے ڈرتے تھے ہم اے شوقِ حیات
تو نے تو مار ہی ڈالا تھا قضا کے پہلے

بے تکلف بھی ترا حسنِ خود آرا تھا کبھی
اک ادا اور بھی تھی حسنِ ادا کے پہلے

غفلتیں ہستیِ فانی کی بتا دیں گی تجھے
جو مرا حال تھا احساسِ فنا کے پہلے

ہم انھیں پا کے فراق اور بھی کچھ کھوئے گئے
یہ تکلف تو نہ تھے عہدِ وفا کے پہلے

کرکٹ میچ

(از منشی پریم چند مرحوم)

یکم جنوری ۱۹۳۵ء

آج کرکٹ میچ میں مجھے جتنی مایوسی ہوئی اُس کا اظہار نہیں کر سکتا۔ ہماری ٹیم حریفوں سے کہیں زیادہ مستحکم تھی۔ مگر ہمیں ہار ہوئی اور وہ لوگ فتح و نصرت کا ڈنکا بجاتے ہوئے ٹرافی اُڑا لے گئے۔ کیوں؟ محض اس لئے کہ ہمارے یہاں قیادت کے لئے لیاقت شرط نہیں۔ ہم قیادت کے لئے ثروت اور دولت لازمی سمجھتے ہیں۔ ہز ہائینس کپتان منتخب ہوئے۔ کرکٹ بورڈ کا فیصلہ سب کو ماننا پڑا۔ مگر کتنے دلوں میں آگ لگی، کتنے لوگوں نے حکم حاکم سمجھکر اس فیصلہ کو منظور کیا، وہ کھیلنے والوں سے پوچھئے۔ اور جہاں محض منہ دیکھی ہے وہاں اُمنگ کہاں، ولولہ کہاں، عزم کہاں آخری قطرۂ خون گرا دینے کا جوش کہاں، ہم کھیلے اور بظاہر دل سے کھیلے۔ مگر یہ حق کے لئے جان دینے والے سرفروشوں کی فوج نہ تھی۔ پیٹ اور لوٹ کے لئے لڑنے والی فوج نہ تھی، کھیل میں کسی کا دل نہ تھا۔

میں اسٹیشن پر کھڑا اپنا تیسرے درجہ کا ٹکٹ لینے کی فکر میں تھا کہ ایک نازنین نے جو ابھی کار سے اتری تھی آگے بڑھکر مجھ سے مصافحہ کیا اور بولی، آپ بھی تو اسی گاڑی سے چل رہے ہیں مسٹر ظفر؟

مجھے حیرت ہوئی یہ کون نازنین ہے اور اسے میرا نام کیونکر معلوم ہو گیا، مجھے ایک لمحہ کے لئے سکتا سا ہو گیا، گویا سارے آداب اور اخلاق کی رسمیں دماغ سے محو ہو گئی ہوں حسن میں ایک سطوت ہے جو بڑے بڑوں کا سر جھکا دیتی ہے، مجھے اپنے عجز کا ایسا احساس کبھی نہ ہوا تھا۔ میں نے نظام حیدرآباد سے۔ ہز اکسلنسی وائسرائے سے، مہاراجہ میسور سے ہاتھ ملایا ہے۔ ان کے ساتھ بیٹھکر کھایا ہے۔ مگر یہ افتادگی اور یہ فروتنی مجھ پر کبھی طاری نہ ہوئی تھی۔ بس یہی جی چاہتا تھا کہ اپنی پلکوں سے اُس کے قدموں کا بوسہ لوں۔ وہ ملاحت نہ تھی جس پر ہم جان دیتے ہیں، نہ وہ نزاکت جس کی شعرا قسمیں

کھاتے ہیں۔ اس کی جگہ ذہانت تھی، متانت تھی، وقار تھا، زندہ دلی تھی اور شوقِ اظہار تھا بے نقاب

میں نے پُرسوال انداز سے کہا، جی ہاں،

یہ کیسے پوچھوں کہ مجھے آپ سے کب نیاز حاصل ہوا، اُس کی بے تکلفی کہہ رہی تھی کہ وہ مجھ سے متعارف ہے، میں بیگانہ کیسے بنوں۔ اسی سلسلہ میں میں نے اپنی مردیت کا فرض بھی ادا کر دیا

"میرے لئے کوئی خدمت؟"

اُس نے مسکرا کر کہا، جی ہاں آپ سے بہت سے کام لونگی، چلئے اندر ویٹنگ روم میں بیٹھیں لکھنؤ کا قصد ہوگا، میں بھی وہیں چل رہی ہوں۔

ویٹنگ روم میں آکر اُس نے مجھے آرام کرسی پر بٹھایا اور خود ایک معمولی کرسی پر بیٹھکر سگرٹ کیس میری طرف بڑھاتی ہوئی بولی، "آج تو آپ کی 'بولنگ' بڑی مہلک تھی، ورنہ ہم لوگ پوری اننگ سے ہارتے"

میری حیرت اور زیادہ ہوئی، اس حسینہ کو کیا کرکیٹ سے بھی شوق ہے، مجھے اُس کے سامنے آرام کرسی پر بیٹھتے ہوئے تکلف ہو رہا تھا۔ ایسی آداب شکن حرکت مجھ سے کبھی سرزد نہ ہوئی تھی، توجہ اُسی طرف تھی، طبیعت میں کچھ انقباض سا ہو رہا تھا، رگوں میں وہ سرعت اور طبیعت میں وہ گلابی بشاشت نہ تھی جو ایسے موقع پر فطرتاً مجھ میں ہونی چاہیئے تھی۔

میں نے پوچھا، کیا آپ وہیں تشریف رکھتی تھیں؟"

اُس نے اپنا سگرٹ جلاتے ہوئے کہا، جی ہاں، اوّل سے آخر تک۔ مجھے تو صرف آپ کا کھیل جنچا، اور لوگ تو کچھ بیدل سے ہو رہے تھے، اور میں اس کا راز سمجھ رہی ہوں۔ ہمارے یہاں لوگوں میں صحیح آدمیوں کو صحیح مقام پر رکھنے کا مادّہ ہی نہیں، جیسے اس سیاسی پستی نے ہمارے سبھی اوصاف کو کچل ڈالا ہو۔ جس کے پاس ثروت ہے وہ قادر مطلق ہے، وہ کسی علمی، ادبی، معاشری جلسے کا صدر ہو سکتا ہے۔ اہل ہو یا نہ ہو، نئی عمارتوں کا افتتاح اُس کے ہاتھوں کرایا جاتا ہے بنیادیں اس کے ہاتھوں رکھوائی جاتی ہیں، تہذیبی تحریکوں کی قیادت اُسے دی جاتی ہے، وہ کانووکیشن کے خطبے پڑھیگا، لڑکوں کو انعام تقسیم کریگا۔ یہ سب ہماری غلامانہ ذہنیت کی برکت ہے، کوئی تعجب نہیں ہم اس قدر ذلیل اور پست ہیں۔ جہاں حکم اور اختیار کا معاملہ وہاں تو خیر مجبوری ہے، ہمیں پابوسی کرنی ہی پڑتی ہے۔ مگر جہاں ہم اپنی آزاد خیالی اور آزاد عملی سے کام لے سکتے ہیں وہاں بھی ہماری رسوم طلبی اور منعم پرستی ہمارا گلا نہیں چھوڑتی۔ اس ٹیم کا کپتان آپ کو ہونا چاہیئے تھا، تب دیکھتی حریف کیونکر بازی لے جاتا۔ مہاراجہ صاحب میں اس ٹیم کے کپتان بننے

کی اتنی ہی صلاحیت ہے جتنی آپ میں اسمبلی کی صدارت کی، یا مجھ میں سینما ایکٹنگ کی۔
بالکل وہی جذبات جو میرے دل میں تھے، مگر اس کی زبان سے نکلکر کتنے پُراثر اور کتنے بصیرت افروز ہوگئے تھے۔ میں نے کہا آپ بجا فرماتی ہیں، واقعی یہ ہماری کمزوری ہے۔

"آپ کو اس ٹیم میں شریک نہ ہونا چاہیئے تھا۔"

"میں مجبور تھا۔"

اِس حسینہ کا نام مس ہیلن مُکرجی ہے، ابھی انگلینڈ سے آرہی ہے، یہی کرکٹ میچ دیکھنے کے لئے بمبئی ٹھہر گئی تھی، انگلینڈ میں اس نے ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کی ہے اور خدمتِ خلق اس کی زندگی کا مقصد ہے۔ وہاں اُس نے ایک اخبار میں میری تصویر دیکھی تھی اور میرا ذکر بھی پڑھا تھا، تب سے اُسے میری جانب سے حُسنِ ظن ہوگیا ہے۔ یہاں مجھے کھیلتے دیکھکر وہ اور بھی زیادہ متاثر ہوئی، اُس کا ارادہ ہے کہ ہندوستان کی ایک نئی ٹیم مرتب کی جائے اور اُس میں وہی لوگ لئے جائیں جو قوم کی نیابت کرنے کے مستحق ہیں، اُس کی تجویز ہے کہ میں اس ٹیم کا کپتان بنایا جاؤں۔ اِسی ارادہ سے وہ سارے ہندوستان کا دَورہ کرنا چاہتی ہے۔ اس کے والد مرحوم ڈاکٹر این مُکرجی نے بہت کافی دولت چھوڑی ہے، اور وہ اس کی بلا شرکت غیرے وارث ہے۔ اس کی تجویزیں سنکر میرا دماغ آسمان میں اُڑنے لگا۔ میری زندگی کا سنہرا خواب اس غیر متوقعہ انداز سے حقیقت بن سکے گا، اس کا کسے گمان تھا۔ مشیّتِ غیب میں میرا اعتقاد نہیں، مگر آج میرے وجود کا ایک ایک ذرہ تشکّر اور عقیدت کے جذبات سے لبریز تھا۔ میں نے مناسب اور منکسر الفاظ میں مس ہیلن کا شکریہ ادا کیا۔

گاڑی کی گھنٹی ہوئی، مس مُکرجی نے فرسٹ کلاس کے دو ٹکٹ منگوائے، میں احتجاج نہ کر سکا اُس نے میرا لگیج اُٹھوایا، میرا ہیٹ خود اُٹھالیا اور بیباکانہ انداز سے ایک کمرہ میں جا بیٹھی اور مجھے بھی اندر بُلا لیا، اُس کا خانساماں تیسرے درجہ میں بیٹھا۔ میری قوتِ عمل جیسے سلب ہوگئی تھی، میں خدا جانے اِن سب معاملات میں کیوں اُسے پیش قدمی کرنے دیتا تھا جو مرد کی حیثیت سے میرے فرائض میں شامل تھے۔ شاید اس کے حُسن، اس کے ذہنی وقار اور اُس کی علو ہمتی نے مجھے مرعوب کر دیا تھا۔ گویا اُس نے کامروپ کے جادو طرازوں کی طرح مجھے بھیڑ بنا لیا ہو، اور مجھ میں قوت ارادہ غائب ہوگئی ہو۔ اتنی ہی دیر میں میری ہستی اُس کی رضا میں جذب ہوگئی تھی۔ میری خودداری کا یہ تقاضا تھا کہ میں اُسے اپنے لئے فرسٹ کلاس کا ٹکٹ نہ منگوانے دیتا اور تیسرے ہی درجہ میں آرام سے بیٹھتا، اور اگر اول درجہ میں بیٹھنا تھا تو اتنی ہی فیاضی سے دونوں کے لئے خود اول درجہ کے ٹکٹ لاتا لیکن نی الواقع

میری قوت عمل سلب ہو گئی تھی۔

۲ جنوری۔ میں حیران ہوں ہیلن کو مجھ سے اتنی ہمدردی کیوں ہے، اور یہ محض دوستانہ ہمدردی نہیں ہے، اس میں محبت کا خلوص ہے۔ رحم تو اتنا مہمان نواز نہیں ہوا کرتا۔ اور میرے کمال کا اعتراف! میں اتنا عقل سے عاری نہیں ہوں کہ اس مغالطے میں پڑوں، کمال کا اعتراف زیادہ سے زیادہ ایک سگرٹ اور ایک پیالہ چائے پا سکتا ہے۔ یہ خاطر و مدارات تو وہیں پاتا ہوں جہاں کسی میچ میں کھیلنے کے لئے مدعو ہوتا ہوں۔ تاہم وہاں یہ دلنوازی نہیں ہوتی، محض رسمی خاطر داری برتی جاتی ہے۔ اس نے تو جیسے میری آسائش کے لئے اپنے کو وقف کر دیا ہو۔ میں تو شاید اپنی معشوقہ کے سوا اور کسی کے ساتھ اس خلوص کا برتاؤ نہ کر سکتا۔ یاد رہے، میں نے معشوقہ کہا ہے، بیوی نہیں کہا۔ بیوی کی ہم خاطر داری نہیں کرتے، اس سے تو خاطر داری کروانا ہی ہمارا وطیرہ ہو گیا ہے اور شاید حق بھی یہی ہے۔ مگر فی الحال تو میں ان دونوں نعمتوں میں ایک سے بھی بہرہ ور نہیں، اس کے ناشتے، ڈنر، لنچ میں تو میں شریک تھا ہی۔ ہر اسٹیشن پر (وہ ڈاک تھی اور خاص خاص اسٹیشنوں ہی پر رکتی تھی) میوے اور پھل منگواتی اور مجھے بہ اصرار کھلاتی۔ کہاں کی کیا چیز مشہور ہے اس کا اسے خوب علم ہے، میرے عزیزوں کے لئے طرح طرح کے تحائف خریدے۔ مگر حیرت یہ ہے کہ میں نے ایک بار بھی اُسے منع نہ کیا، منع کیونکر کرتا، مجھ سے پوچھکر تو لائی نہیں، جب وہ ایک چیز لاکر محبت کے ساتھ میری نذر کرتی ہے تو میں کیسے انکار کروں۔ خدا جانے کیوں میں مرد ہو کر بھی اُس کے رُوبرو عورت کی طرح شرمیلا، کم گو، بستہ دہن ہو جاتا ہوں۔

دن کے تکان کی وجہ سے رات بھر مجھے بے چینی رہی، سر میں خفیف سا درد تھا۔ مگر میں نے اس درد میں مبالغہ کیا۔ تنہا ہوتا تو اس درد کی شاید مطلق پروا نہ کرتا، مگر آج اس کی موجودگی میں مجھے اس کے اظہار میں مزہ آ رہا تھا۔ وہ میرے سر میں تیل کی مالش کرنے لگی، اور میں خواہ نخواہ نڈھال ہوا جاتا تھا۔ میرے اضطراب کے ساتھ اس کی دہشت بڑھتی جاتی تھی، مجھ سے بار بار پوچھتی اب درد کیسا ہے، اور میں تو کلانہ انداز سے کہتا اچھا ہوں۔ اس کی نازک ہتھیلیوں کے احساس سے میری روح میں گُدگُدی ہوتی تھی۔ اس کا وہ دلکش چہرہ میرے سر پر جھکا ہوا ہے۔ اس کی گرم سانسیں میری پیشانی کے بوسے لے رہی ہیں۔ اور میں گویا جنت کے مزے لے رہا ہوں۔ میرے دل میں اب اُس پر فتح پانے کی خواہش انکھوے لے رہی ہے۔ میں چاہتا ہوں وہ میری ناز برداری کرے۔ میری طرف سے کوئی

ایسی پیش قدمی نہ ہونی چاہیئے جس سے اُس پر میری فریفتگی کا اظہار ہو۔ چوبیس گھنٹے کے اندر میری ذہنیت میں کیونکر یہ انقلاب ہو جاتا ہے۔ میں کیونکر طالب سے مطلوب بن جاتا ہوں یہ میں نہیں سمجھ سکتا۔ مجھے نہ جانے کب نیند آ جاتی ہے۔ مگر جب آنکھ کھلتی ہے تو دیکھتا ہوں وہ بدستور اسی محویت کے ساتھ میرے سر پر ہاتھ رکھے بیٹھی ہوئی ہے۔ تب مجھے اُس پر رحم آ جاتا ہے اور میں کہتا ہوں آپ اب تکلیف نہ کریں، میں بالکل اچھا ہوں۔ عاشقی کا تھوڑا سا تجربہ کسے نہیں ہوتا میں بھی مستثنیٰ نہیں ہوں۔ مگر اس معشوقی میں آج جو لطف آیا اُس پر عاشقی صدقے۔ عاشقی غلامی ہے معشوقی بادشاہت۔

میں نے ترحم کے انداز سے کہا، آپ کو میری وجہ سے بڑی تکلیف ہوئی۔

اُس نے دلسوزی کی۔ مجھے کیا تکلیف ہوئی آپ درد سے بے چین تھے اور میں بیٹھی رہتی۔ کاش یہ درد مجھے ہوتا۔"

میں عرش معلیٰ پر اُڑا جا رہا تھا۔

۵۔ جنوری۔ کل شام کو ہم لکھنؤ پہونچ گئے۔ راستے میں ہیلن سے تمدنی، سیاسی اور ادبی مسائل پر خوب باتیں ہوئیں۔ گریجویٹ تو خدا کے فضل سے میں بھی ہوں، اور تب سے فرصت کے اوقات میں کتب بینی بھی کرتا رہا ہوں، علما کی صحبت میں بھی بیٹھا ہوں۔ لیکن اُس کی وسعتِ معلومات کے سامنے قدم قدم پر مجھے اپنی بے بضاعتی کا علم ہوتا ہے، ہر ایک مسئلہ پر اُس کی اپنی رائے ہے، اور معلوم ہوتا ہے کہ اُس نے خوب تحقیق کے بعد وہ رائے قائم کی ہے۔ اُس کے برعکس میں اُن لوگوں میں ہوں جو ہَوا کے ساتھ اُڑتے ہیں، جنھیں وقتی تحریکیں زیر و زبر کر دیتی ہیں۔ میں کوشش کرتا تھا کہ کسی طرح اُس پر اپنا ذہنی وقار قائم کر دوں، مگر اس کے نظریات مجھے بے زبان کر دیتے تھے جب میں نے دیکھا کہ علمی مسائل میں اس سے پیش نہ پا سکوں گا تو میں نے ابی سینیا اور اٹلی کے معرکے کا ذکر چھیڑ دیا جس پر میں نے اپنی دانست میں بہت کچھ پڑھا تھا، اور انگلینڈ اور فرانس نے اٹلی پر جو دباؤ ڈالا ہے اُس کی تعریف میں اپنا سارا زورِ بیان صرف کر ڈالا۔ اُس نے ایک تبسم کے ساتھ کہا اگر آپ کا یہ خیال ہے کہ انگلینڈ اور فرانس محض انسانیت یا زبردست پروری کے جذبات سے متحرک ہو رہے ہیں تو آپ کی غلطی ہے۔ ان کی ملوکیت پرستی یہ نہیں برداشت کر سکتی کہ دنیا کی کوئی دوسری طاقت پھیلے اور سرسبز ہو۔ مسولینی وہی کر رہا ہے جو انگلینڈ نے بارہا کیا ہے اور آج بھی کر رہا ہے۔ پیارا

بہروپیا پن محض ابی سینیا سے سیاسی اور تجارتی مراعات حاصل کرنے کے لئے ہے۔ اگر انگلینڈ کو اپنی تجارت کے لئے بازاروں کی ضرورت ہے، اپنی زائد آبادی کے لئے قطعات زمین کی ضرورت ہے، اپنے تعلیم یافتوں کے لئے موٹے منصبوں کی ضرورت ہے تو اٹلی کو کیوں نہ ہو۔ اٹلی جو کچھ کر رہا ہے، ایمانداری کے ساتھ علانیہ کر رہا ہے۔ اس نے کبھی عالمگیر اخوت کا ڈنکا نہیں پیٹا۔ کبھی امن کا راگ نہیں الاپا۔ وہ تو صاف کہتا ہے جنگ و جدل ہی زندگی کی علامت ہے۔ انسانیت کا ارتقا جنگ ہی کے ذریعے ہوتا ہے۔ انسان کے ملکوتی اوصاف میدان جنگ میں ہی نشو و نما پاتے ہیں مساوات کے نظریئے کو وہ جنون کہتا ہے، وہ اپنا شمار بھی انھیں برگزیدہ اقوام میں کرتا ہے جنھیں رنگین آبادیوں پر حکومت کرنے کا حق ہے، اس لئے ہم اس کے طرز عمل کو سمجھ سکتے ہیں۔ انگلینڈ نے ہمیشہ روباہ بازی سے کام لیا ہے۔ ہمیشہ ایک قوم کے مختلف عناصر میں تفرقے ڈال کر یا اُن کے اختلافات کو سیاسیات کا مدار بنا کر انھیں اپنا حلقہ بگوش بنایا ہے۔ مَیں تو چاہتی ہوں کہ دنیا میں اٹلی، جاپان اور جرمنی خوب فروغ حاصل کریں اور انگلینڈ کا تسلط ٹوٹے۔ تبھی دنیا میں اصلی جمہوریت، اصلی امن پیدا ہوگا موجودہ تہذیب جب تک مٹ نہ جائیگی دنیا میں امن کا راج نہ ہوگا، کمزور قوموں کو زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں، اُسی طرح جس طرح کمزور پودوں کو، صرف اس لئے نہیں کہ اُن کا وجود اُنھیں کے لئے عذاب کا باعث ہے، بلکہ اس لئے کہ وہی دنیا کی اس کشمکش اور خونریزیوں کی ذمہ دار ہیں

مجھے بھلا اس رائے سے کیوں اتفاق ہونے لگا، مَیں نے جواب تو دیا اور ان خیالات کی اتنی ہی زوردار الفاظ میں تردید بھی کی، مگر میں نے دیکھا اس معاملہ میں وہ عقل سلیم سے کام نہیں لینا چاہتی یا نہیں لے سکتی۔

اسٹیشن پر اُترتے ہی مجھے یہ فکر دامنگیر ہوئی کہ ہیلن کو اپنا مہمان کیسے بناؤں، اگر ہوٹل میں ٹھہراؤں تو خدا جانے اپنے دل میں کیا کہے، اگر اپنے گھر لے جاؤں تو شرم دامنگیر ہوتی ہے۔ وہاں ایسی خوش مذاق اور امیرانہ مزاج نازنین کے لئے آسایش کے کیا سامان ہیں۔ یہ اتفاق ہے کہ میں کرکٹ اچھا کھیلنے لگا اور پڑھنا لکھنا چھوڑ چھاڑ کر اسی کا ہو رہا اور ایک اسکول میں ماسٹر ہوں مگر گھر کی حالت بدستور ہے۔ وہی پرانا اندھیرا بوسیدہ مکان، تنگ گلی میں، وہی پرانی روشش، وہی پرانا ڈھچر، اماں تو شاید ہیلن کو گھر میں قدم ہی نہ رکھنے دیں۔ اور یہاں تک نوبت ہی کیوں آنے لگی۔ ہیلن خود دروازے ہی سے بھاگے گی۔ کاش آج اپنا مکان ہوتا، آراستہ پیراستہ، مَیں اس قابل ہوتا کہ ہیلن کی مہمانداری کر سکتا۔ اس سے زیادہ خوش نصیبی اور کیا ہو سکتی تھی لیکن

بے سروسامانی کا بُرا ہو۔

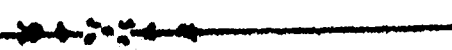
میں یہی سوچ رہا تھا کہ ہیلن نے قلی سے اسباب اُٹھوایا اور باہر آکر ایک ٹیکسی بُلالی۔ میرے لئے اس ٹیکسی میں بیٹھ جانے کے سوا دوسرا چارہ کیا باقی رہ گیا تھا۔ مجھے یقین ہے اگر میں اُسے اپنے گھر لے جاتا تو اُس بے سروسامانی کے باوجود وہ خوش ہوتی۔ ہیلن خوش مذاق ہے مگر نازک دماغ نہیں ہے۔ وہ ہر ایک قسم کی آزمائش اور تجربہ کے لئے تیار رہتی ہے، ہیلن شاید آزمائشوں کو اور ناگوار تجربوں کو بُلاتی ہے، مگر مجھ میں نہ یہ تخیل ہے نہ وہ جرأت۔

اُس نے اگر ذرا غور سے میرا چہرہ دیکھا ہوتا تو اُسے معلوم ہوتا اس پر کتنی ندامت اور کتنی بیکسی جھلک رہی تھی، مگر ظاہرداری کا نباہ تو ضروری تھا، مَیں نے احتجاج کیا، میں تو آپ کو بھی اپنا مہمان بنانا چاہتا تھا، آپ اُلٹا مجھے ہوٹل لئے جارہی ہیں۔

اُس نے شرارت کے انداز سے کہا، اِسی لئے کہ آپ میرے قابو سے باہر نہ ہوجائیں، میرے لئے اس سے زیادہ مسرت کی بات کیا ہوتی کہ آپ کی مہمان نوازی کا لطف اُٹھاؤں، لیکن محبت حاسد ہوتی ہے یہ آپ کو معلوم ہے، وہاں آپ کے احباب آپ کے وقت کا بڑا حصہ لے لیں گے آپ کو مجھ سے بات کرنے کا وقت ہی نہ ملے گا، اور مرد بالعموم کتنے بے مروت اور زود فراموش ہوتے ہیں اس کا مجھے تجربہ ہوچکا ہے۔ میں تمھیں ایک لمحہ کے لئے بھی الگ نہیں چھوڑ سکتی مجھے اپنے سامنے دیکھکر تم مجھے بھولنا بھی چاہو تو نہیں بُھول سکتے۔

مجھے اپنی اس خوش نصیبی پر حیرت ہی نہیں خواب کا گُمان ہونے لگا۔ جس حسینہ کی ایک نظر پر مَیں اپنے کو قربان کردیتا وہ یوں مجھ سے اظہار محبت کرے۔ میرا تو جی چاہتا تھا کہ اسی بات پر اس کے قدموں کو پکڑ کر سینے سے لگالوں اور آنسوؤں سے تر کردوں۔

ہوٹل میں پہونچے، میرا کمرہ الگ تھا، کھانا ہم نے ساتھ کھایا، اور تھوڑی دیر تک وہیں ہری ہری گھاس پر ٹہلتے رہے۔ کھلاڑیوں کا کیسے انتخاب کیا جائے یہی مرحلہ تھا۔ میرا جی تو یہی چاہتا تھا کہ ساری رات اس کے ساتھ ٹہلتا رہوں، لیکن اُس نے کہا آپ اب آرام کریں، صبح بہت کام کرنا ہے۔ میں اپنے کمرہ میں جاکر لیٹ رہا، مگر ساری رات نیند نہیں آئی۔ ہیلن کا باطن ابھی تک میری نظر سے چھپا ہوا ہے، ہر لمحہ وہ میرے لئے معمہ ہوتی جارہی ہے۔



۱۲- جنوری۔ آج دن بھر لکھنؤ کے کرکیٹروں کا مجمع رہا، ہیلن شمع تھی اور پروانے اُس کے

گرد منڈلا رہے تھے۔ یہاں سے میرے علاوہ دو صاحبوں کا کھیل ہیلن کو بہت پسند آیا، برجیندر اور صادق۔ ہیلن اُنھیں آل انڈیا ٹیم میں رکھنا چاہتی ہے، اسمیں کوئی شک نہیں کہ دونوں اس فن کے اُستاد ہیں لیکن اُنھوں نے جس طرح شروعات کی ہے اُس سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ کرکیٹ کھیلنے نہیں اپنی قسمت کی بازی کھیلنے آئے ہیں۔ ہیلن کس مزاج کی عورت ہے یہ سمجھنا دشوار ہے۔ برجیندر مجھ سے زیادہ قبول صورت ہے، یہ مجھے تسلیم ہے، وضع قطع سے پورا صاحب ہے، لیکن بلا کا شہدا، لوفر، میں نہیں چاہتا کہ ہیلن اُس سے کسی قسم کا تعلق رکھے، ادب تو اُسے چھو نہیں گیا، بدزبان پرلے سرے کا، بیہودہ فحش مذاق، گفتگو کا سلیقہ نہیں، محل وموقع کی تمیز نہیں۔ بعض اوقات ہیلن سے ایسے پُرمعنی کنائے کرجاتا ہے کہ میں شرم سے سر جھکا لیتا ہوں لیکن ہیلن کو شاید اس کا بازاری پن، اُس کا ابتذال محسوس نہیں ہوتا، نہیں، وہ شاید اس کے فحش کنایوں کا مزہ لیتی ہے۔ مَیں نے اُسے کبھی چیں بہ جبیں نہیں دیکھا۔ یہ مَیں نہیں کہتا کہ شگفتہ طبعی کوئی بُری چیز ہے، نہ زندہ دلی کا میں دشمن ہوں۔ لیکن ایک لیڈی کے ساتھ تو ادب وقاعدے کا لحاظ رکھنا ہی چاہیئے۔

صادق ایک معزز خاندان کا چراغ ہے، بہت ہی ثقہ، بلکہ سرد مزاج، نہایت مغرور، بہ ظاہر ترش رُو لیکن اب وہ بھی شہیدوں میں داخل ہو گیا ہے۔ کل آپ ہیلن کو اپنے اشعار سُناتے رہے اور وہ خوش ہوتی رہی۔ مجھے تو اُن اشعار میں کوئی مزہ نہ آیا۔ اس کے پہلے میں نے ان حضرت کو کبھی شاعری کرتے نہیں دیکھا۔ یہ کیفیت کہاں سے پھٹ پڑی ہے؟ حُسن میں اعجاز کی قوت ہے اور کیا کہوں۔ اتنا بھی نہ سوچا کہ اُسے اشعار ہی سُنانا ہے تو حسرت یا جگر یا جوش کے کلام سے دو چار شعر یاد کر لیتا، ہیلن سب کا کلام پڑھے تھوڑا ہی بیٹھی ہے، آپ کو شعر گفتن چہ ضرور۔ مگر یہی بات اُن سے کہدوں تو بگڑ جائیں گے، سمجھیں گے مجھے رشک آرہا ہے۔ مجھے کیوں رشک آنے لگا۔ ہیلن کے پرستاروں میں ایک میں بھی ہوں۔ ہاں اتنا ضرور چاہتا ہوں کہ وہ اچھے بُرے کی تمیز کر سکے۔ ہر شخص سے بے تکلفی مجھے پسند نہیں۔ مگر ہیلن کی نظروں میں سب برابر ہیں، وہ باری باری سے سب سے محترز رہے، اور سب سے ملتفت۔ کس کی جانب زیادہ مائل ہے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے۔ صادق کی دولت و ثروت سے وہ مطلق متاثر نہیں معلوم ہوتی۔ کل شام کو ہم لوگ سینما دیکھنے گئے تھے۔ صادق نے آج غیر معمولی فیاضی دکھائی، جیب سے روپیئے نکال کر سب کے لیے ٹکٹ لینے چلے، میاں صادق، جو دس تمول کے باوجود بھی تنگدل واقع ہوئے ہیں، میں تو خسیس کہونگا، ہیلن نے اُن کی فیاضی کو بیدار

کر دیا ہے، مگر ہیلن نے انھیں روک لیا اور خود اندر جا کر سب کے لیے ٹکٹ لائی، اور یوں بھی وہ اتنی بے دردی سے روپیے خرچ کرتی ہے کہ میاں صادق کے چھکّے چھوٹ جاتے ہیں۔ جب اُن کا ہاتھ جیب میں جاتا ہے، ہیلن کے روپیے کاؤنٹر پر جا پہونچتے ہیں۔ کچھ بھی ہو، مَیں تو ہیلن کی مزاج شناسی پر فدا ہوں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے وہ ہماری فرمائشوں کی منتظر رہتی ہے اور اُن کی تعمیل میں اُسے خاص لطف آتا ہے۔ صادق صاحب کو اُس نے اپنا البم نذر کر دیا جو یورپ کی نایاب تصاویر کی نقلوں کا مجموعہ ہے، اور جو اُس نے یورپ کے سارے نگار خانوں میں جا کر خود مرتب کیا ہے، اُسکی نظریں کتنی حُسن پسند ہیں۔ برجیندر جب شام کو اپنا نیا سوٹ پہن کر آیا جو اُس نے ابھی سِلایا ہے تو ہیلن نے مسکرا کر کہا، "چشمِ بد دُور، آج تو تم یوسفِ ثانی بنے ہوئے ہو۔" برجیندر باغ باغ ہو گیا۔ مَیں نے جب ذرا لحن کے ساتھ اپنی تازہ غزل سُنائی تو وہ ایک ایک شعر پر اُچھل اُچھل پڑی۔ بلا کی سخن فہم ہے۔ مجھے اپنے ذوقِ سخن پر اتنی مسرت کبھی نہ ہوئی تھی، مگر تحسین جب صلائے عام ہو جاتی ہے تو اُس کی کیا وقعت۔ میاں صادق کو کبھی اپنی وجاہت کا دعویٰ نہیں ہوا، معنوی حُسن سے آپ جتنے ہی بہرہ ور ہیں حُسنِ ظاہر سے اُتنے ہی بے فیض، مگر آج ساغر کے دَور میں جونہی اُن کی آنکھوں میں سُرخی آئی ہیلن نے والہانہ انداز سے کہا، بھئی تمھاری یہ آنکھیں تو جگر کے پار ہوئی جاتی ہیں، اور صادق صاحب اس وقت اُس کے قدموں پر جبہہ سائی کرتے کرتے رُک گئے، شرم مانع ہوئی۔ اُن کی آنکھوں کی اتنی قدر افزائی شاید ہی کسی نے کی ہو۔ مجھے کبھی اپنی وضع قطع کی تعریف سُننے کی تمنا نہیں ہوئی، مَیں جو کچھ ہوں جانتا ہوں، مجھے یہ مغالطہ کبھی نہیں ہو سکتا کہ میں خوش رو ہوں، یہ بھی جانتا ہوں کہ ہیلن کی یہ نوازشیں کوئی معنی نہیں رکھتیں، لیکن اب مجھے بھی یہ اضطراب ہونے لگا کہ دیکھوں مجھ پر کیا عنایت ہوتی ہے۔ کوئی بات نہ تھی مگر مَیں بے چین رہا۔ جب میں شام کو یونیورسٹی گراؤنڈ سے مشق کر کے آ رہا تھا تو میرے یہ پریشان بال کچھ اور زیادہ پریشان ہو گئے تھے۔ اُس نے گردیدہ نظروں سے دیکھ کر فوراً کہا، "تمھاری اِس زلفِ پریشاں پر نثار ہو جانے کو جی چاہتا ہے۔" میں نہال ہو گیا، دل میں کیا کیا طوفان اُٹھے کہہ نہیں سکتا۔

مگر خدا جانے کیوں ہم تینوں میں سے ایک بھی اس کی کسی ادا یا انداز یا حُسن کی الفاظ میں داد نہیں دے پاتا۔ ہمیں احساس ہوتا ہے کہ ہمیں موزوں الفاظ نہیں ملتے، جو کچھ ہم کہہ سکتے ہیں اس سے کہیں زیادہ متاثر ہیں۔ کچھ کہنے کی ہمت ہی نہیں ہوتی۔

یکم فروری - ہم دہلی آگئے، اس اثنا میں مراد آباد، نینی تال، دیرہ دون، وغیرہ مقامات کے دورے کئے، مگر کہیں کوئی کھلاڑی نہ ملا، علی گڈھ، اور دہلی سے کئی اچھے کھلاڑیوں کے ملنے کی امید ہے اس لئے ہمارا قیام یہاں کئی دن رہیگا۔ الیون پوری ہوتے ہی سب لوگ بمبئی آجائیں گے اور وہاں ایک مہینہ مشق کریں گے۔ مارچ میں آسٹریلین ٹیم یہاں سے رخصت ہوگی، تب تک وہ ہندوستان میں سارے موعودہ میچز کھیل چکی ہوگی۔ ہم اس سے آخری میچ کھیلیں گے اور خدا نے چاہا تو ہندوستان کی ساری شکستوں کی تلافی کردیں گے۔ صادق اور برجیندر بھی ہمارے ساتھ گھومتے رہے، میں تو نہ چاہتا تھا کہ یہ لوگ آئیں، مگر ہیلن کو شاید عشاق کے مجمع میں لطف آتا ہے، ہم سب کے سب ایک ہی ہوٹل میں مقیم ہیں، اور سب ہیلن کے مہمان ہیں، اسٹیشن پر پہونچے تو صدہا آدمی ہمارا استقبال کرنے کے لئے موجود تھے، کئی عورتیں بھی تھیں۔ لیکن ہیلن کو نہ معلوم کیوں عورتوں سے احتراز ہے اُن کی صحبت سے بھاگتی ہے، خاصکر حسین عورتوں کے سائے سے بھی گریز کرتی ہے۔ حالانکہ اُسے کسی حسینہ سے بدظن ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ یہ مانتے ہوئے بھی کہ حسن اس پر ختم نہیں ہوگیا ہے اُس میں جاذبیت کے ایسے عناصر موجود ہیں کہ کوئی حور بھی اس کے مقابلہ میں نہیں کھڑی ہوسکتی نک سک ہی تو سب کچھ نہیں ہے حسن مذاق، حسن گفتار، حسن ادا بھی تو کوئی چیز ہے۔ محبت اس کے دل میں ہے یا نہیں خدا جانے، لیکن محبت کے اظہار میں اُسے ید طولیٰ ہے۔ دلجوئی اور نازبرداری کے فن میں ہم جیسے دلداروں کو بھی اُس سے شرمندہ ہونا پڑتا ہے۔ شام کو ہم لوگ نئی دہلی کی سیر کو گئے، پرفضا مقام ہے، کشادہ سڑکیں، خوبصورت مربعے، دلفریب روشیں، اس کی تعمیر میں سرکار نے بے دریغ روپیہ صرف کیا ہے اور بے ضرورت۔ یہ رقم رعایا کی فلاحی تجاویز میں صرف کی جاسکتی تھی۔ مگر اس کو کیا کیجئے کہ عوام اس کی تعمیر سے جتنے متاثر ہیں اتنی کسی فلاحی تجویز سے نہ ہوتے۔ آپ دس پانچ مدرسے زیادہ کھول دیتے، یا سڑکوں کی مرمت میں، یا زراعتی تحقیقاتوں میں اس روپیہ کو صرف کردیتے، مگر عوام کو تزک واحتشام اور شان وشکوہ سے آج بھی جتنی رغبت ہے اتنی آپ کے تعمیری کاموں سے نہیں ہے۔ فرمانروا کا جو تخیل اس کے وجود کے ذرّے ذرّے میں سرایت کرگیا ہے وہ ابھی صدیوں تک نہ مٹے گا۔ فرمانروا کے لئے شان وشکوہ ضروری ہے، بے دریغ روپیہ خرچ کرنا ضروری ہے۔ کفایت شعار یا بخیل فرمانروا چاہے وہ ایک ایک پیسہ رعایا کے فلاح کے لئے خرچ کرے اتنا مقبول اور ہردلعزیز نہیں ہوسکتا۔ انگریز نفسیات کے ماہر ہیں، انگریز ہی کیوں، ہر ایک فرمانروا جس نے اپنے زوربازو

اور قوتِ فکر سے یہ درجہ حاصل کیا ہے فطرتاً نفسیات کا ماہر ہوتا ہے۔ اس کے بغیر عوام پر اُسے اقتدار کیونکر حاصل ہوتا۔ خیر، یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ مجھے ایسا اندیشہ ہو رہا ہے کہ شاید ہماری ٹیم خواب ہی رہ جائے ابھی سے ہم لوگوں میں چشمک رہنے لگی ہے۔ برجندر قدم قدم پر میری مخالفت کرتا ہے، میں آم کہوں تو وہ یقیناً املی کہے گا، اور ہیلن اس کی جانب ملتفت ہے۔ زندگی کے کیسے کیسے میٹھے خواب دیکھنے لگا تھا، مگر برجندر، احسان فراموش، خود غرض برجندر میری زندگی تباہ کئے ڈالتا ہے، ہم دونوں ہیلن کے منظورِ نظر نہیں رہ سکتے، یہ طے شدہ بات ہے، ایک کو میدان سے ہٹنا پڑیگا۔



۷۔ فروری۔ شکر ہے دہلی میں ہماری کوشش بارآور ہوئی، ہماری ٹیم میں تین نئے کھلاڑیوں کا اضافہ ہوا۔ جعفر، مہرا، اور آرجن سنگھ۔ آج ان کے کمال دیکھکر آسٹریلین کرکیٹروں کی دھاک میرے دل سے جاتی رہی۔ تینوں گیند پھینکتے ہیں، جعفر قادر انداز ہے، مہرا صبر آزما اور آرجن شاطر، تینوں مستقل مزاج، نگاہ کے سچے، اور آتھک۔ اگر کوئی انصاف سے پوچھے تو میں کہونگا کہ آرجن مجھ سے بہتر کھیلتا ہے۔ وہ دوبار انگلینڈ ہو آیا ہے۔ انگریزی معاشرت سے واقف ہے، اور مزاج شناس بھی اول درجہ کا، تہذیب اور اخلاق کا پُتلا۔ برجندر کا رنگ پھیکا پڑگیا، اب آرجن پر خاص نظرِ عنایت ہے۔ اور آرجن پر فتح پانا میرے لئے آسان نہیں ہے، مجھے تو خوف ہے کہیں وہ میرا رقیب نہ بن جائے۔



۲۵۔ فروری۔ ہماری ٹیم پوری ہوگئی، دو پلیئر ہمیں علیگڈھ سے ملے، تین لاہور سے اور ایک اجمیر سے، اور کل ہم بمبئی آگئے۔ ہم نے اجمیر، لاہور اور دہلی میں وہاں کی ٹیموں سے میچ کھیلے اور ان پر بڑی شاندار فتح پائی۔ آج بمبئی کی ہندو ٹیم سے ہمارا مقابلہ ہے، اور مجھے یقین ہے کہ میدان ہمارے ہاتھ رہیگا۔ آرجن ہماری ٹیم کا سب سے اچھا کھلاڑی ہے، اور ہیلن اس کی اتنی خاطرداری کرتی ہے کہ مجھے رشک نہیں آتا، اتنی خاطرداری تو مہمان کی ہی کی جا سکتی ہے، مہمان سے کیا خوف۔ لطف یہ ہے کہ ہر ایک شخص اپنے کو ہیلن کا منظورِ نظر سمجھتا ہے اور اس سے ناز برداریاں کرواتا ہے، اگر کسی کے سر میں درد ہے تو یہ ہیلن کا فرض ہے کہ اُس کی مزاج پرسی کرے، اُس کے سر میں صندل تک گھِس کر لگائے۔ مگر اس کے ساتھ ہی اُس کا رعب ہر ایک کے دل پر اتنا چھایا ہوا ہے کہ کوئی اُس کے کسی فعل کی تنقید کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ سب کے سب اُس کی مرضی کے غلام ہیں، وہ اگر سب کی نازبرداری کرتی ہے تو حکومت بھی ہر ایک پر کرتی ہے۔ شامیانہ میں ایک سے ایک حسین عورتوں کا

جگمگ ہوتا ہے، مگر ہیلن کے قیدیوں کی مجال نہیں کہ کسی کی طرف دیکھکر مسکرا بھی سکیں۔ ہر ایک کے دل پر ایسا خوف طاری رہتا ہے گویا وہ ہر جگہ حاضر و ناظر ہے۔ ارجن نے ایک مس پر یونہی کچھ نظر ڈالی تھی، ہیلن نے ایسی قہر کی آنکھ سے اُسے دیکھا کہ سردار صاحب کا رنگ اُڑ گیا۔ ہر ایک سمجھتا ہے کہ وہ اُس کی تقدیر کی خالق ہے اور اُسے اپنی جانب سے بدظن کر کے وہ شاید زندہ نہ رہ سکے گا۔ اوروں کی تو میں کیا کہوں، میں نے بھی گویا اپنے کو اُس کے ہاتھوں فروخت کر دیا ہے۔ مجھے تو اب یہ احساس ہو رہا ہے کہ مجھ میں کوئی ایسی چیز فنا ہو گئی ہے جو پہلے میرے دل میں حسد کی آگ سی جلا دیا کرتی تھی۔ ہیلن اب کسی سے بولے، کسی سے راز و نیاز کی باتیں کرے، مجھے اشتعال نہیں آتا، دل پر چوٹ لگتی ضرور ہے، مگر اُس کا اظہار تخلیہ میں آنسو بہا کر کرنے کو جی چاہتا ہے، وہ خودداری کہاں غائب ہو گئی نہیں کہہ سکتا۔ ابھی اس کی خفگی سے دل کے ٹکڑے ہو گئے تھے کہ یکایک اُس کی ایک نگاہ غلط انداز نے یا ایک تبسم نے گدگدی پیدا کر دی معلوم نہیں اُس میں وہ کونسی طاقت ہے جو اتنے حوصلہ مند، نوجوان دلوں پر حکومت کر رہی ہے، اسے حسبارت کہوں، مبادرت کہوں، یا کیا کہوں، ہم سب جیسے اُس کے ہاتھوں کی کٹھ پتلیاں ہیں، ہم میں اپنی کوئی شخصیت، کوئی انفرادیت، کوئی ہستی نہیں ہے، اُس نے اپنے حسن سے، اپنی فراست سے، اپنی دولت سے، اور سب سے زیادہ اپنی ہمہ گیری سے ہمارے دلوں پر تسلط قائم کر لیا ہے۔

یکم مارچ - کل آسٹریلین ٹیم سے ہمارا میچ ختم ہو گیا، پچاس ہزار سے کم تماشائیوں کا ہجوم نہ تھا ہم نے پورے اننگس سے شکست دی اور دیوتاؤں کی طرح پجے۔ ہم میں سے ہر ایک نے دل وجان سے کام کیا اور سبھی یکساں طور پر پھولے ہوئے تھے۔ میچ ختم ہوتے ہی اہل شہر کی جانب سے ہمیں ایک شاندار پارٹی دی گئی، ایسی پارٹی تو شاید وائسرائے کے اعزاز میں نہ دی جاتی ہوگی۔ میں تو تعریفوں اور مبارکبادوں کے بوجھ سے دب گیا۔ میں نے جو انیس رنوں میں پانچ کھلاڑیوں کا صفایا کر دیا تھا۔ مجھے خود اپنی ہلاکت آفرینی پر حیرت ہو رہی تھی۔ ضرور کوئی غیبی طاقت ہماری پشت پر تھی۔ اس مجمع میں بمبئی کا حسن اپنی پوری شان اور رنگینی کے ساتھ جلوہ افروز تھا اور مجھے دعویٰ ہے کہ حسن کے اعتبار سے یہ شہر جتنا خوش نصیب واقع ہوا ہے، دنیا کا کوئی دوسرا شہر شاید ہی ہو۔ مگر ہیلن اس مجمع میں بھی مرکز نگاہ بنی ہوئی تھی۔ یہ ظالم محض حسین نہیں ہے، شیریں بیان

بھی ہے، شیریں ادا بھی، سارے نوجوان پروانوں کی طرح اُس پر منڈلا ر
قبول صورت منچلے، اور ہیلن ان کے جذبات سے کھیل رہی تھی، اُسی طرح جیسے
جذبات سے کھیلا کرتی تھی۔ ہمارا جمکار جیسا شکیل جوان میں نے آج تک نہیں دیکھا
رعب ٹپکتا ہے، اُن کے عشق نے کتنے حسینوں کو دلفگار کیا ہے، کون جانے۔ مردانہ دلکشی کا
جادو سا بکھیرتا چلتا ہے۔ ہیلن اُن سے بھی اُسی آزادانہ بے تکلفی سے ملی جیسے دوسرے ہزاروں
نوجوانوں سے۔ اُن کے حُسن کا، اُن کی دولت کا، اُس پر مطلق کوئی اثر نہ تھا، نہ جانے اتنا غرور، اتنی
خودداری اِس میں کہاں سے آگئی ہے۔ کبھی نہیں ڈگمگاتی، کہیں مرعوب نہیں ہوتی، کبھی مائل نہیں
ہوتی۔ وہی بذلہ سنجی ہے، وہی اظہار محبت۔ کسی کے ساتھ خصوصیت نہیں، دلجوئی سب کی، مگر اسی
استغنا کی شان کے ساتھ۔

ہم لوگ سیر کرکے کوئی دس بجے رات کو ہوٹل پہونچے تو سبھی زندگی کے نئے خواب دیکھ رہے تھے
سبھی کے دلوں میں ایک دھکدھکی سی ہو رہی تھی کہ دیکھیں اب کیا ہوتا ہے، اُمید و بیم نے سبھی کے دلوں
میں طوفان برپا کر رکھا تھا، گویا آج ہر ایک کی زندگی کا ایک یادگار واقعہ ہونے والا ہے، اب کیا پروگرام
ہے، اِس کی کسی کو خبر نہ تھی، سبھی زندگی کے خواب دیکھ رہے تھے، ہر ایک نے اپنے دل میں سودائے
خام پکا رکھا تھا، ہر ایک کو یقین تھا کہ ہیلن کی خصوصی نگاہ اس پر ہے، مگر یہ اندیشہ بھی ہر ایک کے دل
میں تھا کہ خدانخواستہ کہیں ہیلن نے بیوفائی کی تو یہ جان اس کے قدموں پر رکھ دیگا۔ یہاں سے
زندہ گھر جانا قیامت تھا۔

اُسی وقت ہیلن نے مجھے اپنے کمرہ میں بُلا بھیجا۔ جا کر دیکھتا ہوں تو سبھی کھلاڑی جمع ہیں ہیلن
اُس وقت اپنی شربتی بیلدار ساڑی میں آنکھوں میں چکا چوندھ پیدا کر رہی تھی، مجھے اُس پر جھنجلاہٹ
ہوئی، اِس مجمع عام میں مجھے بُلا کر قواعد کرانے کی کیا ضرورت تھی، میں تو خاص برتاؤ کا مستحق تھا۔ میں
بھول رہا تھا کہ شاید اسی طرح ان میں سے ہر ایک اپنے کو خاص برتاؤ کا مستحق سمجھتا ہو۔
ہیلن نے کرسی پر بیٹھے ہوئے کہا۔ دوستو، میں کہہ نہیں سکتی کہ میں آپ لوگوں کی کتنی
مشکور ہوں، اور آپ نے میری زندگی کی کتنی بڑی آرزو پوری کر دی، آپ میں سے کسی کو مسٹر
رتن لال کی یاد آتی ہے؟

رتن لال! اُسے بھی کوئی بھول سکتا ہے، وہ جس نے پہلی بار ہندوستان کی کرکٹ ٹیم کو
انگلینڈ کی سرزمین پر اپنے کارہائے نمایاں دکھانے کا موقع عطا کیا، جس نے اپنے لاکھوں روپئے اس

ملکشتوں سے مایوس ہوکر وہیں انگلینڈ میں خودکشی کرلی۔ اُس کی وہ صورت

ے سامنے پھر رہی ہے۔"

ہا "خوب اچھی طرح، ابھی بات ہی کے دن کی ہے"۔

اس شاندار کامیابی پر میں آپ کو مبارکباد دیتی ہوں، انشا اللہ آیندہ سال ہم انگلینڈ کا دورہ کریں گے، آپ لوگ ابھی سے اس مہم کے لئے تیاریاں کیجئے، لطف تو جب ہے کہ ہم وہاں ایک میچ بھی نہ ہاریں، متواتر ہمارے ہاتھ میدان رہے۔ دوستو! یہی میری زندگی کا مقصد ہے کسی مقصد کی تکمیل کا عمل ہی زندگی ہے۔ ہمیں کامیابی وہیں ہوتی ہے جہاں ہم اپنے پورے حوصلے سے سرگرم عمل ہوں، وہی مقصد ہمارا خواب ہو، ہمارا عشق ہو، ہمارا مرکز حیات ہو، ہم میں اور اس مقصد کے بیچ میں اور کوئی خواہش کوئی آرزو حائل نہ ہو۔ معاف کیجئے گا، آپ نے اپنے مقصد کے لئے جینا نہیں سیکھا۔ آپ کے لئے کرکیٹ محض ایک مشغلۂ تفریح ہے۔ آپ کو اس سے عشق نہیں، اسی طرح ہمارے صدہا دوست ہیں جن کا دل کہیں اور ہوتا ہے دماغ کہیں اور، اور وہ ساری زندگی ناکام رہتے ہیں۔ آپ کے لئے میں زیادہ دلچسپی کی چیز تھی، کرکیٹ تو محض مجھے خوش کرنے کا ذریعہ تھا، پھر بھی آپ کامیاب ہوئے۔ ملک میں آپ جیسے ہزارہا نوجوان ہیں جو اگر کسی مقصد کی تکمیل کے لئے جینا اور مرنا سیکھ جائیں تو معجزے کر دکھائیں جائیے اور وہ کمال حاصل کیجئے، میرا حسن اور میری راتیں بازیچۂ نفس بننے کے لئے نہیں ہیں، نوجوانوں کی آنکھوں کو خوش کرنے اور اُن کے دلوں میں سُرور پیدا کرنے کے لئے جینا میں شرمناک سمجھتی ہوں۔ حیات کا مقصد اس سے کہیں اونچا ہے۔ سچی زندگی وہی ہے جہاں ہم اپنے لئے نہیں، سب کے لئے جیتے ہیں"

ہم سب سر جھکائے سنتے رہے اور جھنجھلاتے رہے اور ہیلن کمرہ سے نکل کر کار پر جا بیٹھی۔ اُس نے اپنی روانگی کا انتظام پہلے ہی کر لیا تھا۔ قبل اس کے کہ ہمارے ہوش و حواس صحیح ہوں اور ہم صورت حال سمجھیں وہ رخصت ہو چکی تھی۔

ہم سب ہفتے بھر تک بمبئی کی گلیوں، ہوٹلوں، بنگلوں کی خاک چھانتے رہے۔ ہیلن کہیں نہ تھی۔ اور زیادہ افسوس یہ ہے کہ اُس نے ہماری زندگی کا جو آئیڈیل رکھا وہ ہماری پہونچ سے اونچا ہے۔ ہیلن کے ساتھ ہماری زندگی کا سارا جوش اور ولولہ غائب ہو گیا ہے۔



زبانِ اُردو

از مولوی محمد اسمٰعیل صاحب رزمی جیپوری

[ذیل کے دو بند اس طویل نظم کے درج کئے جاتے ہیں جو جے پور کے جلسہ یادگار ڈاکٹر نذیر احمد خاں صاحب دہلوی میں پڑھے گئے تھے پوری نظم مولوی صاحب کی شان میں ایک قصیدہ ہے۔ اور یہ دونوں بند اس کی تشبیب ہیں۔ ا۔ ز]

یاد ایام کہ جب دورِ زماں تھا اپنا — یاد ایام کہ جب سکّہ رواں تھا اپنا
یاد ایام کہ جب بزمِ وطن تھی اپنی — یاد ایام کہ جب دیس یہاں تھا اپنا
یاد ایام کہ جب ملک یہ اپنا گھر تھا — یاد ایام کہ ہر پیر و جواں تھا اپنا
پھاگ اڑاتی ہوئی ہر عید یہاں آتی تھی — ماہِ ہولی مہ عید رمضاں تھا اپنا
پریم مندر کبھی آباد نظر آتا تھا — ایک سا نغمۂ ناقوس واذاں تھا اپنا
میزباں اور یہ مہماں ملے یوں دونوں — اتحادِ ازلی روح و رواں تھا اپنا
سات جگ بیت گئے تھے ملے بچھڑے پھر بھی — پریم ہی پریم یہاں تھا وہ سماں تھا اپنا
کیا فقط ہند کہ سنسار میں ہم ہی ہم تھے — تذکرہ مشرق و مغرب نہ کہاں تھا اپنا

کوئی آثار دوئی کے نہ رہے تھے باقی
بس فقط ایک یہاں نام نشاں تھا اپنا

آہ وہ بزم، نہ وہ مئے نہ وہ اب ساقی ہے — یادگار اس کی مگر ایک یہاں باقی ہے
برج بھاشا نے ابھی رنگ نیا بدلا تھا — اور تعمیر ہوئی ایک نئی سی دنیا
ایک ایجاد زباں اور ہوئی دنیا میں — اتحاد آہ وہ اے قوم ہوا کیا تیرا
تھا وہ اک وقت کہ تعمیر ہوئی اُردو کی — متّحد قوم نے اک ساتھ لیا تھا حصّا
متحد قوم نے سینچا جو اسے مل جل کر — راس آئی اسے اس دیس کی یہ آب و ہوا
محنتِ قوم سے یہ نخل پھلا پھولا یوں — دیس پر چار طرف آج ہے اس کا سایا
پھول اسی نخلِ رطب زیر میں ایسے پھولے — بس گیا باس سے ان کی یہ زمانہ سارا
اک بہارِ ابدی باغ ادب میں آئی — جانِ فردوس ہے اب اس کی ہوا کا جھونکا

گلشن حضرت چکبست شگفتہ شاداب روضۂ حضرت سرشار معطر، دعنا

سید و شبلی و آزاد و جناب حالی ان میں ایک ایک ہے خلاق نئی دنیا کا

گو کہ ان میں ہر اک استاد ہے معمارِ زباں

معنیٔ ارضِ ادب ہیں تو نذیر احمد خاں

نوائے سروش

(از دلیپراج صاحب سروش)

ہوں خاکساروں کی خاکِ پا تو، غرورِ اہلِ غرور ہوں میں

مجھے خوشامد سے عار ہے، اے ندیم مردِ غیور ہوں میں

نہ دیکھ میرا وجود احقر، نگاہ کو راز آشنا کر

کہ ایک اک شے ہے کانِ جوہر، شرارۂ برقِ طور ہوں میں

زمیں ہے یا بزمِ آسماں ہے، مجھی سے روشن یہ سب جہاں ہے

تجسسِ غیر رائگاں ہے، بذاتِ خود شمعِ نور ہوں میں

رضائے حق پر کئے ہوں سر خم، نگہ طرازی سے باز دائم

نہ خوفِ عقبےٰ نہ فکرِ عالم، شرابِ وحدت سے چُور ہوں میں

حیات کٹتی ہے میری فرفر، مگر ہے خالی عمل کا ساغر

خدایا ہر ہر نفس کرم کر، اسیرِ فسق و فجور ہوں میں

ہوں لطف اندوز روئے دریا، بلا کے طوفاں سے جنگ بیرا

حیاتِ جاوید کا نظارا، سکوتِ ساحل سے دور ہوں میں

خیال میرے لطیف و شیریں، بیان میرا عجیب رنگیں

سروشِ خمخانۂ محبت کا رندِ غرقِ سرور ہوں میں

تنقید کتب

تاریخ فلسفۂ سیاسیات[۱]

سیاسیات کا جسے عرف عام میں ریاست کہہ سکتے ہیں زندگی کے تقریباً تمام شعبوں پر اثر پڑتا ہے تاہم سیاسیات و ریاست کا صحیح مفہوم سمجھنا اس وقت تک مشکل ہے جب تک کوئی شخص فطرت انسانی کی خصوصیات سے کسی قدر واقف نہ ہو۔ لیکن سیاسیات کا رنگ زمانہ کے ساتھ ساتھ بدلتا رہتا ہے۔ اسی وجہ سے بعض مفکرین کا قول ہے کہ سیاسیات کوئی مستقل اور مدون علم نہیں ہے۔ اور چونکہ انسان کی سیاسی زندگی ہنوز پایۂ تکمیل کو نہیں پہونچی ہے، اس لئے علم سیاسیات بھی مکمل نہیں ہوا ہے۔ باینہمہ ہر قوم اور ہر ملک کی زندگی کا دارومدار سیاسیات ہی پر ہے۔ اور جو قومیں سیاسی حیثیت سے کمزور ہوتی ہیں، وہ جلد ہی مٹ جاتی ہیں۔

افلاطون کے زمانہ سے آج تک یہ مسئلہ بحث طلب رہا ہے کہ سیاسیات فلسفہ ہے یا علم یا محض فن۔ سچ پوچھئے تو وہ فلسفہ، علم اور فن سب کچھ ہے۔ کیونکہ رہنمایان ملک کے لئے وہ فلسفہ ہے، مصلحین معاشرت کے لئے ایک علم ہے، اور مدبرین کی نظر میں وہ فن ہے۔ اور قدیم یونانیوں کا تو اوڑھنا بچھونا سیاسیات ہی تھا۔

کتاب زیر نظر اسی دلچسپ موضوع پر جامعہ ملیہ دھلی کے فاضل پروفیسر محمد مجیب صاحب بی، اے (آکسن) کی تصنیف ہے اس موضوع کو تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے تاریخی، نظری، علمی۔ فاضل مصنف نے اس کتاب میں صرف حصۂ اول سے بحث کی ہے اور ہر دور کے فلسفیوں اور مدبروں کے نظریوں کو بیان کر دیا ہے۔ سہولت مطالعہ کے لئے کتاب کو چار حصوں میں اور ہر حصہ کو مختلف ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ اور جو کچھ لکھا ہے اس میں قدیم و جدید یوروپ کے فلاسفروں کے نظریوں سے استفادہ کیا گیا ہے۔ اگرچہ کتاب کا موضوع خشک اور غیر دلچسپ ہے لیکن فاضل مصنف کا انداز بیان کافی دلآویز ہے۔

ہمیں افسوس ہے کہ فاضل مصنف نے ہندوستان کی طرف توجہ نہیں فرمائی۔ ورنہ چانکیہ وغیرہ کی راج نیتی، میں بہت کچھ قابل قدر مسالہ مل سکتا ہے۔

کتاب صوبۂ متحدہ کی ہندوستانی اکیڈیمی کے اہتمام سے شائع ہوئی ہے اور اپنے موضوع کی اہمیت کے لحاظ سے قابل قدر اور کتبخانوں میں رکھے جانے کی مستحق ہے۔ ٹائپ میں چھپی ہے اور کاغذ دبیز استعمال ہوا ہے۔

۱؎ قیمت چار روپیہ، ملنے کا پتہ ہندوستانی اکیڈیمی الہ آباد۔

سیاسی نصب العین[1]

یہ کتاب انگلستان کے مشہور مورخ ڈیلائل برنس کی کتاب کا ترجمہ ہو جسے مسٹر کرشن چندر رائے سکسینہ ایم۔اے پروفیسر تاریخ عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد نے اُردو زبان میں کیا ہے۔ اصل کتاب ۱۹۱۵ء میں آکسفورڈ یونیورسٹی پریس سے شائع ہو کر اس قدر مقبول عام ہوئی تھی کہ اب تک اُس کے دس ایڈیشن چھپ کر فروخت ہو چکے ہیں۔ اس لئے ایسی بلند پایہ کتاب کے مضامین کی تعریف فضول ہے۔ البتہ جس محنت و جانفشانی سے قابل مترجم نے اس کتاب کو نہایت شگفتہ و عالمانہ زبان میں اُردو میں ترجمہ کیا ہے وہ بہت قابل قدر ہے۔ کسی غیر زبان کی کتاب خصوصاً علمی کتاب کا ترجمہ اُردو یا ہندی میں کرنا آسان کام نہیں ہے۔ مگر پروفیسر صاحب کی کوشش بڑی حد تک کامیاب ہوئی ہے۔ کہیں کہیں زبان میں کسی حد تک سلاست کی ضرور کمی ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ ہماری ملکی زبان "تصعید" "صعودماضیہ" جیسے موٹے موٹے اور غیر مانوس عربی الفاظ کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ اس قسم کے الفاظ کی وجہ سے بعض مقامات پر ترجمہ کی عبارت مہمل ہو گئی ہے۔ مثلاً

> "حریت ہو خواہ نظام اور خواہ اتحاد ہو جو ان میں سے ہر ایک چیز کے نسبت کل جماعتوں کا خیال یکساں ہے اور اگر ان کے بارے میں معمولی طور پر معقول نکتہ چینی بھی کیجاتی ہے تو یہ باور کیا جاتا ہے کہ یہ چیزیں جماعتی اغراض سے علیحدہ ہیں" (صفحہ ۲۴۰)

ہم کو اُمید ہے کہ آئندہ ایڈیشن میں یہ نقص بھی دور ہو جائے گا۔ لکھائی چھپائی کاغذ سب عمدہ ہے کتاب مجلد ہے۔ اور اس کا حجم ۴۸۴ صفحات ہے

انمول جواہرات[2]

یہ کتاب گیارہ گرانقدر و بلند پایہ مضامین کا بیش بہا مجموعہ ہے جو مسٹر ہرچرن لال صاحب ؔ رتن کے حکمت نگار قلم سے نکلکر مختلف ملکی اخباروں و رسالوں میں شائع ہو چکے ہیں۔ بعض مضامین نئے بھی ہیں۔ ان مضامین کو پڑھ کر ہر شخص کے دل میں ان کے مصنف کی وقعت اور محبت دل میں پیدا ہو جائیگی واقعی فاضل مصنف ایک سچے محب وطن معلوم ہوتے ہیں اور "ہریجن تحریک" اور "ہندو مسلم عیسائی اتحاد"

---

[1] قیمت درج نہیں ہے۔ ملنے کا پتہ:۔ رشی کیس حمایت نگر حیدرآباد دکن

[2] قیمت آٹھ آنہ (۸؍) ملنے کا پتہ:۔ سرن داس صاحب پریم نگر دیال باغ آگرہ

کے عنوان سے جو مضامین انھوں نے اس کتاب میں لکھے ہیں ان سے بخوبی ثابت ہوتا ہے کہ ان کے پہلو میں دل اور دل میں قوم و وطن کا سچا درد ہے۔ یہ مضامین ہر حیثیت سے جواہر پاروں کا ایک بیش بہا خزانہ ہیں۔ ورمن صاحب کے زور قلم کا اندازہ مندرجہ ذیل اقتباس سے بخوبی ہو سکتا ہے:۔

"جس چیز پر نگاہ پڑتی ہے، دلفریب۔ جو نظارہ ہے، باعث کشش۔ جو شے ہے، جاذب توجہ۔ جو کیفیت ہے۔ ہوشربا۔ جو حالت ہے، سربستہ راز، جو صورت ہے، ایک معمہ۔ انسان جس قدر اس دلفریب کائنات کا مشاہدہ کرتا ہے، اپنے تئیں متحیر و مبہوت پاتا ہے۔ اور وہ اس طلسم خانہ میں اپنی ناچیز ہستی پر غور کرکے مہر بلب ہو جاتا ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ محبوب، پریم اور دلکشی کا بھنڈار، عقل و حکمت کا منبع، جس کی یہ سب رعنائیاں، رونمائیاں، جلوہ آرائیاں اور دلفریبیاں ہیں، پس پردہ کائنات کے اس مادی طبقہ میں اپنا لطیف اظہار کر رہا ہے اور کل خلقت اس کے طواف میں مست و سرشار مجسم حرکت و رقصاں ہے ؎

جو جلوہ ہے پردہ ہے جو پردہ ہے، جلوہ ہے
وہ بزم تماشہ بھی کیا بزم تماشہ ہے

تصوف دیکھئے:۔

"خدا نہ ہندو ہے، نہ مسلمان اور نہ وہ عیسائی ہے، وہ خدا ہے اور سب کا خدا ہے، اور دنیا کے تمام مذاہب جو اس سے ملنے کا راستہ بتاتے ہیں اسی کے ہیں۔ اس حقیقت کو ہرگز نظر انداز نہیں کیا جا سکتا"

حکمت و فلسفہ کے بھی چند جواہر پارے پرکھ لیجئے:۔

"تم جسم دماغ اور روح کی تثلیث ہو (۲) روح کی غذا خدا کی محبت ہے (۳) مذہب انسان اور خدا کے مابین ذاتی تعلق ہے (۴) مذہب حقیقی محبت اور خالص روحانیت ہے"

اس مجموعہ کے ایک مضمون میں ہربرٹ این کاسن کے مضمون کا عطر کھینچکر رکھدیا گیا ہے جو بہت ہی روح پرور اور نگہت بیز ہے۔ ہم اس دماغ سوزی پر فاضل مصنف کو مبارکباد کا مستحق سمجھتے ہیں۔ یہ مضامین اس قابل ہیں کہ ہمارے نوجوانان قوم انھیں غور سے پڑھیں اور ان سے فائدہ اٹھائیں۔

کتابت، چھپائی، کاغذ سب پسندیدہ ہے بڑی تقطیع کے چار جزو پر اس کا حجم ہے۔

سالنامہ شاعر ۱۹۳۷ء [1]

یہ بصارت نواز اور بصیرت افروز سالنامہ حضرت اعجاز صدیقی اکبرآبادی کی ادبی کاوشوں کا نتیجہ ہے

---

[1] شائقین قصر الادب آگرہ سے طلب فرمائیں۔

اور ۵۲۸ صفحات پر نہایت حسن و خوبی کے ساتھ شائع ہوا ہے۔ اس رسالہ کے سرپرست ہمارے صوبے کے مشہور و معروف شاعر اور ہمارے محترم دوست مولانا سیماب اکبرآبادی ہیں اعجاز صاحب سیماب صاحب کے فرزند ارجمند ہیں۔ اس لئے ہم اس قابل قدر نمبر کی شاندار کامیابی پر اپنے محترم دوست کو تہ دل سے مبارک باد دیتے ہیں۔

یہ قابل قدر سالنامہ تین حصّوں میں منقسم ہے۔ پہلے حصّہ میں مشہور اہل قلم کے مضامین نظم و نثر ہیں دوسرے حصّہ میں آگرہ اسکول کا بیان ہے جس کا مستقل عنوان "کارواں" رکھا گیا ہے۔ اس میں بھی آگرہ اسکول یا بالفاظ دیگر پیروان حضرت سیماب کے گرانقدر مضامین نظم و نثر ہیں، تیسرا حصّہ اگرچہ اصولاً آگرہ اسکول ہی کا ایک حصّہ ہے لیکن اس میں حضرت سیماب کے شاگردوں کا تذکرہ مع نمونہ کلام ہے۔ اس طرح اس نمبر میں ایک سو بارہ شاعروں کے حالات مع انتخاب کلام درج ہیں۔ اور ایک سو پانچ شعراء کے فوٹو بھی شامل ہیں۔ بہرحال شائقین اُردو کے لئے یہ ایک نہایت قابل قدر اور دلچسپ رسالہ ہے۔ جس میں ہر مذاق کے حضرات کے لئے دلچسپی کا سامان موجود ہے۔ ہم اس سالنامہ کی ترتیب پر اعجاز صاحب کو تہ دل سے مبارکباد دیتے ہیں۔ لکھائی چھپائی عمدہ قیمت عہ ۱۲/ جو اس کی خوبیوں کو دیکھتے ہوئے کچھ بھی نہیں ہے۔

عورت[۱]

ہمعصر ہمدرد صحت دہلی نے اس عنوان سے ایک خاص نمبر شائع کیا ہے۔ جسے حکیم حاجی عبدالحمید صاحب دہلوی نے خاص دماغ سوزی سے مرتب کیا ہے۔ یہ نمبر ایک مستقل کتاب کی حیثیت رکھتا ہے۔ کل کتاب کو گیارہ ابواب میں تقسیم کر کے صنف نازک کے متعلق تمام ضروری باتیں لکھدی گئی ہیں۔ مثلاً باب اوّل میں بعض جنسی امتیازات کا ذکر ہے۔ دوسرے باب میں نسوانی امراض اور ان کا علاج درج ہے۔ تیسرے باب میں بعض جدید مباحث لکھے گئے ہیں۔ چوتھے باب میں امراض نسواں کے متعلق ہندوستان بھر کے مشہور حکماء حاذق کے مجرب نسخے درج ہیں۔ پانچویں باب میں عورتوں کی جسمانی صحت کو قایم رکھنے کی تدابیر بتائی گئی ہیں۔ چھٹے باب میں ویدک علاج کا ذکر ہے۔ ساتویں باب میں مختلف مضامین ہیں۔ آٹھویں باب میں قدیم زمانہ میں عورت کی معاشرتی حالت کا ذکر ہے۔ نویں باب میں مختلف ممالک میں عورتوں کی موجودہ حیثیت کا بیان ہے۔ دسویں باب میں جمالیاتی

[۱] ضخامت ۲۰۲ صفحات۔ قیمت بارہ آنہ۔ ملنے کا پتہ:- ہمدرد منزل دہلی۔

پہلو پر نظر ڈالی گئی ہے۔ اس رسالہ کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ہر مضمون کسی نہ کسی ماہر فن کا لکھا ہوا ہے،
اس میں ۴۳ مشہور اطباء و اہل قلم اور دیگر ۲۴ تصویریں ہیں جن میں ۲۵ تصویریں لیتھو کی ہیں۔ اس میں
عورتوں کے متعلق بہت سے دلچسپ معلومات اور اعداد و شمار بھی درج کردئے گئے ہیں۔ غرض یہ نمبر مفید
اور دلچسپ مضامین کا قابل قدر مجموعہ ہے۔ لکھائی چھپائی بہت عمدہ، ٹائیٹل رنگین ہے۔

رسالہ موسی کا ولی نمبر

کچھ عرصہ ہوا سٹی کالج حیدرآباد کے اولوالعزم طلباء نے "ولی" دکنی کا یوم بڑے دھوم دھام سے منایا
تھا۔ چنانچہ اس کے کل حالات اُس سہ ماہی رسالہ کے ولی نمبر میں شائع کئے گئے ہیں جو سٹی کالج حیدرآباد کے
طلباء کے زیر اہتمام المُوسیٰ کے نام سے نکلتا ہے۔

اس نمبر میں جتنے مضامین نظم و نثر ہیں، ان سب میں ولی دکنی کے حالات اور ان کے کلام پر
مختلف پہلوؤں سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ مضامین کی تعداد تیس کے قریب ہے جو سب کے سب
بڑی قابلیت سے لکھے گئے ہیں۔ یوم ولی کے جلسہ میں سر سالار جنگ کی بصیرت افروز تقریر بھی اس
میں درج کردی گئی ہے۔ اس میں ۲۴ تصویریں بھی دی گئی ہیں جس سے اس خاص نمبر کی دلکشی میں
بہت اضافہ ہوگیا ہے۔ مضامین میں مسٹر زین العابدین متعلم مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کا مضمون "اردو شاعری
میں ولی کا رتبہ" خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ اور "ولی کے سن وفات" پر مولوی عبدالحق صاحب سکریٹری
انجمن ترقی اُردو کا تحقیقی مضمون بھی بہت قابل قدر ہے۔ "ولی کے وطن" کے عنوان سے ڈاکٹر سید
محی الدین قادری زور پروفیسر جامعہ عثمانیہ کا مضمون بھی خوب ہے۔ قدردانان ولی اس نمبر کو ضرور
ملاحظہ فرمائیں۔ لکھائی چھپائی، کاغذ سب عمدہ۔ ضخامت ۲۷۲ صفحات۔ ملنے کا پتہ۔ دفتر الموسیٰ حیدرآباد دکن

IMPORTANT PLACE NAMES OF THE WORLD.

پنجاب ٹکسٹ بک کمیٹی نے جغرافیائی ناموں کی ایک انگریزی اُردو فہرست شائع کی ہے جس سے
اسکولوں کے طلبا، بہت فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ ہم نے سرسری نظر ڈال کر ہندوستانی و بعض ایشیائی ناموں
کو جو دیکھا تو بعض مقامات پر کچھ غلطیاں معلوم ہوئیں جس کا اندازہ مندرجہ ذیل فہرست سے ہوسکتا ہے

انگریزی نام	ترجمہ	اصلاح	کیفیت
Rewah.	ریوہ	لکھا ہے حالانکہ صحیح لفظ ریواں ہے جو	ہند ملکھنڈ کی ایک ریاست کا صدر مقام ہے

انگریزی نام	ترجمہ	اصلاح	کیفیت
اسیطرح ۳- Nander.	ناندیر نہیں بلکہ	ناندیڑ ہے	
Sinai Peninsula کو	جزیرہ نمائے صنعا لکھا ہے مگر	جزیرہ نمائے سینا لکھنا چاہئے	یہ وہ علاقہ ہے جہاں کوہ طور واقع ہے۔ صنعا یمن کا شہر ہے
۴- Irrawaddy.	ایراودی نہیں بلکہ	ایراوتی کے نام سے مشہور ہے	برہما کا دریا ہے جو راجہ اندر کے ہاتھی ایراوت سے منسوب ہے
۵- Kumaon. کو	کماؤں نہیں بلکہ	کمایوں۔ لکھتے ہیں	
۶- Mohmera.	مہمیرا نہیں بلکہ	محمرہ ہونا چاہئے	یہ خوزستان کا دارالحکومت ہے
۷- Sambhar Lake کو	جھیل سابمر لکھا ہے حالانکہ عام طور پر لوگ	جھیل سانبھر کہتے ہیں	
United Provinces کو	اضلاع متحدہ لکھا ہے مگر	صوبہ متحدہ یا ممالک متحدہ ہونا چاہئے۔	
۹- Jordan.	یردون	اُردن	
۱۰- Caucasia.	کاکیشیا	قفقاز۔ قاف	

اُمید کہ یہ غلطیاں آئندہ ایڈیشن میں دور کردی جائیں گی۔

بچوں کی کتابیں[۱]

دنیا کے بچے | بچوں کیلئے درسی کتابیں لکھنا واقعی مشکل ہے کیونکہ اچھی یا بری تعلیم و تربیت کی بنیاد انھیں ابتدائی کتابوں پر قایم ہوتی ہے۔ ہمکو یہ دیکھکر بہت خوشی ہوئی کہ جامعہ ملیہ دہلی نے اسطرف توجہ کرکے بچوں کیلئے آسان زبان میں بہت چھوٹی چھوٹی کتابیں تیار کردی ہیں۔ یہ چھوٹی سی کتاب جو ایڈیٹر صاحب پیام تعلیم کی تصنیف ہے بھی اسی قابل قدر سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ اس کتاب میں مختلف ملکوں کے بچوں کے حالات بہت دلچسپ پیرائے میں لکھے گئے ہیں اور مختلف ملکوں کے بچوں کو ان کے ملکی یا قومی نام سے یاد کیا گیا ہے۔ جابجا تصویریں بھی دیدیگئی ہیں جس سے کتاب کی دلچسپی میں خاصہ اضافہ ہوگیا ہے۔ لکھائی چھپائی کاغذ عمدہ۔ چھوٹی تقطیع کے ۶۷ صفحے۔ قیمت چھ آنہ۔

کائنات | اس کتاب میں مولوی محمود علی خانصاحب نے آسان اور دلچسپ بیان میں جغرافیہ کی وہ باتیں لکھی ہیں جنکا تعلق علم ہیئت سے ہے۔ کتاب دلچسپ اور بچوں کے پڑھنے کے قابل ہے۔ اسمیں ستاروں اور سیاروں کا ضروری حال سمجھایا گیا ہے اور مزید آسانی کیلئے نقشے بھی دیدیے ہیں قیمت ۴ ر

چھوٹا چوہا | اسمیں چھوٹے چھوٹے بچوں کے لئے ایک چوہے کے بچہ کی کہانی لکھی ہے۔ کہانی دلچسپ اور زبان پیاری ہے کہ بچے اٹھتے بیٹھتے پڑھتے لوٹ جائیں گے قیمت ۱ ر

مرغی اور چیل | مرغی اور چوزہ کی یہ دلچسپ کہانی دہلی کی سلیس اور منجھی ہوئی زبان میں خاص ننھے ننھے بچوں کے لئے لکھی گئی ہے۔ قیمت ۲ ر

بچوں کی کہانیاں | یہ مولوی عبدالواحد صاحب سندھی استاد پرائمری اسکول جامعہ کی لکھی ہوئی چار دلچسپ کہانیوں کا مجموعہ ہے۔ جو ننھے ننھے بچوں کے لئے لکھی گئی ہیں۔ ہر کہانی سبق آموز اور دلچسپ ہے۔ قیمت ۲ ر

---

[۱] یہ سب کتابیں مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی سے مل سکتی ہیں۔

رفتار زمانہ

پچھلے نمبر میں صوبجات کے سیاسی جمود کو جلد سے جلد ختم کرنے پر بہت زور دیا گیا تھا تمام ملک کی یہی خواہش تھی کہ لیڈران کانگرس صوبوں کی حکومت کا بار اپنے سر لیں۔ مدبران خیر خواہان برطانیہ بھی اس خواہش کا بارہا اظہار کر چکے تھے۔ البتہ لارڈ لنلتھگو نے اس مسئلہ پر غلط فہمی پیدا کرنیوالا سکوت اختیار کر رکھا تھا جس سے شکوک میں اضافہ ہو رہا تھا۔ آخر اُنھوں نے بھی اس ناگوار جمود کو ختم کرنیکی غرض سے ۲۲ جون کو ایک طولانی بیان شائع کیا جس میں اُنھوں نے مدبران کانگریس سے اپنی بدظنی دور کرنے کی پُرزور اپیل کرتے ہوئے اطمینان دلایا کہ ایکٹ کے قانونی الفاظ کی صورت خواہ کتنی ہی خشک ہو لیکن روزمرہ کے نظم و نسق میں وزراء کو بہت کچھ اختیارات حاصل ہوں گے اور گورنران صوبجات کے کاموں میں کبھی کوئی مداخلت نہ کریں گے بلکہ ان کے مشوروں کے مطابق عمل کرنے کے پابند ہونگے۔ نئے ایکٹ نے گورنروں کی مداخلت کی جو حدیں مقرر کردی ہیں۔ ان میں بھی گورنران اپنے اختیارات کے استعمال میں معمولاً وزیروں کے مشوروں پر کاربند ہوں گے اور جب کبھی ان کے متعلق ہر ممکن کوشش کے باوجود دونوں میں اختلاف رائے ہوگا تو وزراء کو اپنی پوزیشن صاف کرنے کا پورا موقعہ رہے گا۔ اس بیان میں لارڈ لنلتھگو نے ذاتی حیثیت سے بھی مدبران کانگرس کو اپنی دلی ہمدردی کا پورا یقین دلایا اور انھیں اُن کے آئینی مقاصد کی تکمیل میں ہر طرح کی سہولتیں دینے کا وعدہ کیا۔ گورنر مدراس و گورنر اڑیسہ نے بھی اس اپیل کی پُرزور تائید کی اور ملک کے تمام اخبارات نے بلا استثنار کانگریس سے وزارت قبول کرنے کے حق میں فیصلہ دینے کی پُرزور اپیل کی۔ چنانچہ کانگریس ورکنگ کمیٹی نے ان حالات اور عام خیالات سے متاثر ہوکر اول ہفتہ جولائی میں وار دھا میں کئی دن کے غور و خوض اور بحث مباحثہ کے بعد صوبوں میں کانگریسی وزارتیں قایم کرنے کی اجازت دیدی۔ ہمارا خیال ہے کہ اب تک ہمارے لیڈران عوام کی رہنمائی کیا کرتے تھے لیکن اس معاملہ میں کانگریس کو عموماً اور صدر کانگریس پنڈت جواہر لال نہرو کو خصوصاً عام رائے کے سامنے سر تسلیم خم کر دینا پڑا۔ چنانچہ وسط جولائی تک تمام صوبوں کے عارضی وزرا نے اپنے استعفے داخل کر دئے اور ایک ہفتہ کے اندر ہندوستان کے چھ صوبوں میں جہاں قانونی اسمبلی میں کانگریس پارٹی کو اکثریت حاصل ہے مختلف لیڈران کانگریس نے قلمدان وزارت سنبھال لئے۔ سب سے پہلے مدراس میں ہمارے پرانے محب وطن مسٹر راجگوپال آچاریہ نے وزارت کی ذمہ داری قبول کی۔ اور صوبے کے نو بہترین اصحاب کو اپنا رفیق کار بنایا۔ صوبہ متوسط میں ڈاکٹر این بی کھرے۔ صوبہ بہار میں مسٹر سری کرشن سنہا۔ اڑیسہ میں مسٹر بشوناتھ داس۔ بمبئی میں مسٹر کھیر۔ صوبہ متحدہ میں پنڈت گوبند بلبھ پنتھ وزیر اعظم ہوئے ہیں۔ کانگریس کو مسلمان وزراء کے انتخاب میں بعض جگہ خاص دقت پیش آئی لیکن وہ کہیں اپنے اعلان کردہ اصولوں سے نہیں ہٹے۔ چنانچہ اڑیسہ میں کوئی مسلمان وزیر مقرر نہیں ہوسکا اور بابو راجندر پرشاد صاحب سے جب وہاں کے بعض مسلمانوں نے شکایت کی تو آپ نے فرمایا کہ اڑیسہ کی قانونی اسمبلی میں صرف چار مسلمان ممبر منتخب ہوئے ہیں جن میں دو صاحب انگریزی زبان سے ناواقف ہیں اُن سے قطع نظر کانگریس تیسرے صاحب کو عارضی وزارت میں شامل ہونے کی وجہ سے اور چوتھے صاحب کو کانگریسی اُمیدوار کے خلاف جدوجہد کرنے کی علت میں اپنی وزارت میں شامل نہیں کرسکتی ہے۔ لیکن اگر ان میں سے کوئی صاحب قوم کی خاطر مستعفی ہوکر کسی قابل مسلمان کانگریسمین کو اپنی جگہ ممبر منتخب کرادیں

تو وہ وزارت میں شامل کرلئے جائینگے۔ گورنر اُڑیسہ نے بھی اسمبلیس مداخلت سے انکار کر دیا ہے۔ درحقیقت کانگریسی وزراء کے سامنے ہندو مسلمان سب یکساں ہیں۔ ان کا مقصد اور منشا مجموعی حیثیت سے اہل ملک کی خدمت کرنا ہے جس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ انھوں نے کانگریسی وزراء کی نگرانی کے لئے جو سب کیٹی بنائی ہے اس میں مولانا ابوالکلام آزاد صاحب کو شامل کرکے ادراس کی سپرد بنگال۔ صوبہ متحدہ۔ پنجاب اور سرحد کے وزراء کی نگرانی کردی ہے۔

کانگریسی وزراء نے حکومت کی باگ ڈور سنبھالتے ہی ملکی نظم ونسق میں ایک نئی روح پھونکدی ہے۔ ہر جگہ انھوں نے پولیس اور حکام سے اپیل کی ہے کہ وہ عوام کی خدمت نہ کہ حکومت اپنا فرض مقدم سمجھیں۔ ہر جگہ اُنھوں نے سالہا سال کے قیدیوں کو آزاد کر دیا ہے۔ اخباروں کی ضمانتیں واپس کردی ہیں۔ جلسوں کی کارروائیاں قلمبند کرنے کی ممانعت کردی ہے۔ اور ہر جماعت کو اپنے خیالات کے اظہار کا پورا حق دیدیا ہے۔ اُنھوں نے کہیں بھی اپنے لئے مکان و سواری کے علاوہ پانچ سو روپیہ ماہوار سے زائد تنخواہیں مقرر نہیں کی ہیں۔ اور اب تک کسی مقام میں وزراء اور عہدیداروں کے انتخاب میں بیجا طرفداری سے کام نہیں لیا ہے صوبہ متحدہ میں اُنھوں نے ایڈوکیٹ جنرل کے معزز عہدے پر ڈاکٹر نراین پرشاد استھانہ ایڈوکیٹ ہائی کورٹ کو انتخاب کیا ہے حالانکہ موصوف لبرل پارٹی کے ایک رکن خاص تھے۔ ہر صوبہ میں بعض وزراء ایسے ہیں جو محض قومی خدمت کے خیال سے اپنی ہزار ہا روپیہ ماہوار کی آمدنی قربان کرکے صرف پانچ سو روپیہ ماہوار پر کام کرنے پر رضامند ہوگئے ہیں۔ اس سلسلہ میں مدراس میں ڈاکٹر راجن۔ بمبئی میں مسٹر منشی اور صوبہ متحدہ میں ڈاکٹر کیلاش ناتھ کاٹجو کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ڈاکٹر راجن تھوڑی ہی دن ہوئے کانگریس سے معتوب ہو چکے تھے۔ مگر ملکی خدمت کے جذبات نے انھیں مسٹر راج گوپال آچاریہ کی تعمیل ارشاد پر مجبور کر دیا۔ ایثار نفس کی اس سے بہتر اور کیا مثال ہوسکتی ہے۔ الہ آباد ہائی کورٹ میں ڈاکٹر کاٹجو کی چوٹی کی پریکٹس تھی مگر ملک کی ضرورت پر اُنھوں نے لاکھوں روپیہ کے آمدنی کی پروہ نہ کی۔ صوبہ متحدہ کی وزارت نے مسز وجے لکشمی پنڈت کو حفظان صحت کی وزارت سپرد کرکے اس بات کو بھی ثابت کر دیا کہ ترقی یافتہ ہندوستان میں عورتوں مردوں دونوں کو ملکی خدمت کا یکساں موقع دیا جائے گا۔ اور کسی طبقہ یا کسی فرقہ کے ساتھ کوئی ناقابلیت وابستہ نہ رہے گی۔

اس اثناء میں ان سب صوبوں میں قانونی اسمبلیوں کے افتتاحی اجلاس بھی ہو چکے ہیں۔ اور سب جگہ عوام نے ہر ممکن طریقے سے اپنے خوشنودی کا ثبوت دیا۔ ہر صوبے میں کانگریسی وزراء کا عوام نے غیر معمولی جوش و خروش سے خیر مقدم کیا ہے۔ لکھنؤ میں پراونشل لیجسلیٹو اسمبلی کے افتتاحی جلسے کے دن دور دور سے ہزار ہا کسان اپنے بال بچوں سمیت پرانی وضع کی بیل گاڑیوں میں چڑھ کر لکھنؤ آئے۔ کہتے ہیں کہ کئی گھنٹے پہلے کونسل ہاؤس کے راستوں میں تل دھرنے کی جگہ باقی نہ رہ گئی تھی۔

ہر اسمبلی کا اجلاس بندے ماترم کے دلخوش کن گیت سے شروع ہوا۔ ہر جگہ قومی جھنڈے لہرائے گئے۔ ان تمام مظاہروں سے اگر کوئی بات ثابت ہوتی ہے تو یہی کہ اس وقت تمام ملک کی آنکھیں کانگریس کی طرف لگی ہوئی ہیں۔ اور لوگ پُرانے طبقے سے مایوس ہوکر اب اپنے فلاح و بہبود کی تمام اُمیدیں نئے وزراء سے وابستہ کئے ہوئے ہیں۔

آخر اگست سے قانونی اسمبلیوں کے بجٹ سیشن شروع ہوں گے۔ اس وقت ہمارے نئے وزراء آمد و خرچ کی مدیں جانچ رہے ہیں۔ ہمکو پوری اُمید ہے کہ وہ اہل ملک کی ترقی و بہبود کی کوشش میں اپنی طرف سے کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھیں گے۔ ملک میں عرصہ دراز سے کئی اہم مسئلے تصفیہ طلب ہیں۔ کئی صیغوں میں انقلابی کارروائیاں کرنے کی اشد ضرورت ہے۔

عوام کے افلاس دور کرنے اور تعلیم یافتہ جماعت کی بیکاری رفع کرنے کی جلد سے جلد جو تدبیر ممکن ہو کرنا چاہیئے۔ تقریباً ہر محکمہ میں اصولی تبدیلیاں ضروری ہیں۔ اُن کی طرف سے ہمارے پرانے وزراء اب تک آنکھیں بند کئے رہے۔ مگر اب اہل ملک کا نگرس سے اپنی مشکلات کے حل کی اُمید رکھتے ہیں۔ ہمکو اُمید ہے کہ نئے وزرا ایثار و خلوص کیساتھ ہمت و جرأت مستقل مزاجی اور ثابت قدمی سے ان اہم مسائل کی طرف متوجہ ہوں گے اور آئندہ تین چار سال ہی کے اندر کچھ کرکے دکھا دیں گے۔

"ایں دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد"

سری صاحب جی مہاراج مرحوم

اس اثناء میں نا وقت موت نے اہل ملک کو کئی بزرگ ہستیوں کے سایہ سے محروم کر دیا۔ سر صاحب جی مہاراج۔ لالہ کملاپت سنگھانیہ اور سر پشپکنوالا نے اپنے اپنے حلقۂ اثر میں ملک کو جو فائدہ عظیم پہونچایا اس کی یاد آسانی سے دلوں سے محو نہیں ہو سکتی۔ افسوس اب انکی صرف یاد ہی یاد باقی رہ گئی!

تقدس آب سر آنند سروپ صاحب جی مہاراج بانی دیال باغ آگرہ کی صحت ایک عرصہ سے قابل اطمینان نہ تھی لیکن جس سرگرمی، انہماک اور اولوالعزمی کے ساتھ وہ آخر تک اپنے فرائض منصبی انجام دیتے رہے اُس کو دیکھتے ہوئے کس کو گمان ہو سکتا تھا کہ وہ اس قدر جلد داغ مفارقت دے جائیں گے۔ آپ رادھا سوامی مت کے پانچویں گرو کی حیثیت سے لکھو کھا اہل ملک کے روحانی رہنما تھے۔ لیکن آپ نے روحانیت کی تعلیم دینے کے ساتھ ساتھ اہل ملک کے سامنے اپنی مدد آپ کرنے کا ایک شاندار اور کامیاب نمونہ بھی قایم کر دیا۔

دیال باغ آگرہ کی بستی جو باہمی تنظیم، باہمی خود اعتمادی اور ایثار نفس کا ایک بہترین نمونہ ہے پچیس سال ہوئے صرف پانچ ہزار کے ابتدائی سرمایہ سے قایم ہوئی تھی لیکن آپ کی ہدایت و رہنمائی میں اب تک اس پر پچاس لاکھ سے زائد صرف ہو چکا ہے۔ لطف یہ کہ آپ نے اس کے لئے کبھی ملک کے عوام یا روساء سے چندہ کی اپیل نہیں کی۔ شروع میں البتہ آپ نے اپنے سو منتخب معتقدین سے پچاس پچاس روپیہ کی امداد لیکر پانچ ہزار کا ابتدائی سرمایہ اکٹھا کیا تھا۔ اس چندے میں بھی آپنے پچاس روپیہ کی حد اس لئے مقرر کی تھی کہ اُس وقت آپ اپنی آمدنی کے لحاظ سے اس سے زیادہ چندہ دینے کی استطاعت نہ رکھتے تھے۔

اس وقت دیال باغ کی بستی ہندوستان میں آپ اپنی نظیر ہے۔ جسمانی محنت سے حصول معاش کی کوشش کے ساتھ ساتھ روحانیت کے اعلیٰ مدارج طے کرنے کا جو تجربہ صاحب جی نے دیال باغ میں شروع کیا وہ بہ حیثیت مجموعی بالآخر کامیاب ہو گا یا نہیں اس کا جواب مستقبل میں ملے گا۔ لیکن ہندوستان کے موجودہ افلاس و تنگدستی کے رفع کرنے کی یہی تدبیر ہے جو ہمیں دیال باغ میں سر صاحب جی مہاراج نے عملی طور پر تبلائی ہے۔ اس وقت ہاتھ پاؤں توڑ کر یاد الٰہی میں مصروف ہو جانا مقتضائے زمانہ نہیں ہے بلکہ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہر فرد ملک اپنی جگہ پر پوری قوت سے کام کرکے ملک کی صنعت و حرفت میں توسیع و ترقی کی کوشش کرے۔ اور ملک کو ضروریات زندگی کے لئے غیر ممالک کی دست نگری سے بے نیاز کر دے ہر شخص سب کے لئے زندگی بسر کرے اور سب کو ہر فرد بشر کی پرواہ ہو۔ دیال باغ میں صاحب جی مہاراج نے یہی سبق اہل ملک کو عموماً اور اپنے پیروان طریقت کو خصوصاً سکھایا۔ یہ اُن کی پچیس سال کی مسلسل کوششوں کا نتیجہ ہے کہ آج دیال باغ میں ہزارہا اہل ملک نیکی

ونیک نفسی کی زندگی بسر کرتے ہوئے عزت وآبرو کی روٹیاں کھا رہے ہیں۔ آپ نے خیر وبرکت کے اس چار میل مربعہ رقبے میں بیالیس ۴۲ قسم کے صنعتی کارخانے جاری کر کے لوگوں کو طرح طرح کی صنعت وحرفت کی تعلیم وتربیت حاصل کرنے کا موقعہ دیا۔ آج ساڑھے تین ہزار پیروان کے علاوہ دو ہزار سے زائد آدمی اُن کارخانوں میں مصروف کار ہیں ان متعدد کارخانوں سے جو مال تیار ہوتا ہے اُس کی قیمت آٹھ لاکھ روپیہ سالانہ سے زائد ہوتی ہے۔ دیال باغ میں زمانہ حال کے باہمی رشک ورقابت کا کہیں نام ونشان بھی دیکھنے میں نہیں آتا ۔ ادنیٰ سے ادنیٰ مزدوروں سے لیکر بڑے سے بڑے افسران تک ایثار ومحبت کی اسپرٹ میں اپنے فرایض منصبی ادا کر رہے ہیں۔ ساری بستی بیرونی امداد سے مستغنی ہے۔ جو کام ہے جماعت کے لئے ہے۔ جو چیز ہے رفاہ عام کے لئے ہے۔ جو کمائی ہے سب کے آرام وآسایش کے واسطے ہے۔ صاحب جی مہاراج نے اس بستی سے ذاتی سرمایہ داری کا جذبہ اس خوبی وکامیابی کے ساتھ فنا کر دیا ہے کہ ذاتی اولوالعزمی اور انفرادی کا گرمجوشی مفقود نہیں ہونے پائی۔ دراصل اس بستی کی بنیاد ملکی اتفاق۔ قومی اتحاد اور امداد باہمی کے اصولوں پر رکھی گئی ہے۔ سر صاحب جی مہاراج کے دل ودماغ کی جس قدر بھی تعریف کی جائے کم ہے کہ اُنھوں نے دیال باغ میں اپنی زندگی بھر ان اعلیٰ اُصولوں سے کہیں بھی سر مو انحراف نہیں ہونے دیا۔ آج ملک کی بدقسمتی سے وہ ہمارے درمیان نہیں ہیں لیکن ان کا چشمۂ فیض ابھی جاری ہے اور خلوص نیت اور صدق دل سے ہماری دعا اور تمنا ہے کہ ان کے ہاتھ کا لگایا ہوا باغ دن دونی رات چوگنی ترقی کر کے تمام ملک کو صنعت وحرفت کا سر سبز وشاداب گلزار بنا دے۔

سر صاحب جی مہاراج صرف پچپن ۵۵ سال کی عمر میں ملک کو داغ مفارقت دے گئے۔ آپ انبالہ کے ایک متوسط الحال خاندان میں ۱۸۸۱ء میں پیدا ہوئے تھے پندرہ سال کی عمر میں مٹریکولیشن کا امتحان پاس کر کے آپ دیانند کالج لاہور میں داخل ہوئے ابھی آپکی تعلیم تکمیل تک نہ پہونچنے پائی تھی کہ آپ کے والد کا انتقال ہو گیا جس سے آپ مالی پریشانیوں میں مبتلا ہو گئے۔ چنانچہ آپ نے مجبوراً تار گھر میں ملازمت کر لی۔ چونکہ شروع ہی سے آپ مذہبی خیالات کے آدمی تھے اس لئے آپ کو مذہبی مسائل کی تحقیق کا بڑا شوق تھا چنانچہ آپ نے مختلف مذاہب کا مطالعہ کیا اور جب آپ کو رادھا سوامی مت سے روحانی تسکین حاصل ہو گئی تو آپ اس مت کے تیسرے گورو سری مہاراج صاحب کے چیلے ہو گئے اور اُنہیں کے زیر ہدایت روحانی مدارج حاصل کرنے لگے۔ بالآخر ۱۹۱۳ء میں چوتھے گورو سری سرکار صاحب کی وفات پر آپ سری صاحب جی مہاراج کے نام سے اُن کی جانشین ہوئے اور سرکاری ملازمت سے مستعفی ہو کر آپ ہمہ تن اس جماعت کی توسیع وترقی میں مصروف ہو گئے ۱۹۱۵ء میں دیال باغ کی بنیاد قائم کی اور نمونہ کے طور پر بہت سی صنعتیں جاری کیں۔ اسپتال۔ ڈاکخانہ۔ بنک۔ اسکول کالج وغیرہ قائم کر کے آپ نے ہر طرح سے اس قابل رشک بستی کو مکمل بنا دیا اور اس کے تمام باشندوں میں ایثار اور امداد باہمی کی خصوصیت پیدا کر دی آپ نے اپنے پیروؤں کو صاف ستھری زندگی بسر کرنے کی تلقین کی اور صبر وتحمل اور حُسن اخلاق کی حوصلہ افزائی کی۔ آپ نے امداد باہمی کے ایسے اُصول وضع کئے کہ ہر شخص ان پر کاربند ہو کر اپنے اور جماعت دونوں کے فلاح وبہبود کی کوشش کر سکتا ہے۔ آپ نے اپنے فرقے میں تفریق ذات کو بالکل مٹا دیا۔ چنانچہ اس وقت ست سنگیوں میں شادی بیاہ کے متعلق ذات پات کی کوئی قید باقی نہیں ہے۔ اور نہ چھوت چھات یا ادنیٰ یا اعلیٰ کا کوئی خیال ہے۔ دیال باغ کی امداد کے لئے ست سنگی اصحاب ہر ماہ اپنی آمدنی کا ایک جز دنذر کرتے رہتے ہیں۔ بستی کے باشندے دیال باغ ہی کی بنی ہوئی چیزیں استعمال کرتے ہیں۔ اور آپس میں برادرانہ محبت سے پیش آتے ہیں۔ سری صاحب جی مہاراج نے زندگی کے ہر پہلو میں

تنظیم کی کوشش کی۔ یہاں تک کہ دیال باغ کے رہنے والوں کے لئے کھانے پینے۔ پہننے اور شادی و موت سب کے متعلق مفصل قواعد بنادئے گئے ہیں جن کی پابندی سب پر فرض ہے۔ دیال باغ کی کل جائداد ست سنگ کی ملکیت ہے۔ ہر باشندہ سنگت کے مرضی سے رہتا ہے۔ اور رفاہ عام کے خیال کو مد نظر رکھتا ہے۔ حتیٰ کہ اس کا سرمایہ بھی اصولی حیثیت سے بالآخر سنگت ہی کا سرمایہ ہے۔ جس کے نفع سے وہ اور اس کی اولاد مستفید ہوگی۔ اصل رقم بالآخر سنگت کے مجموعی سرمایہ میں شامل ہو جاتی ہے۔ دیال باغ کی تمام تنظیم میں خدمت خلق اور رفاہ عام دونوں نقطہ خیال کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔

راقم الحروف کو کئی دفعہ صاحب جی مہاراج سے طولانی گفتگو کا شرف حاصل ہو چکا ہے۔ چنانچہ ذاتی واقفیت کی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ صاحب جی مہاراج کی ناوقت وفات سے موجودہ زمانہ کا ایک بہترین رہنما اُٹھ گیا۔ ان کی ذات سے بڑی بڑی اُمیدیں وابستہ تھیں۔ اُنھیں اپنے اعلیٰ مقاصد میں حیرت انگیز کامیابی حاصل ہوئی تھی لیکن آئندہ جو کچھ وہ کرنیوالے تھے اس کے آگے گزشتہ کارنامے بھی پس پشت پڑ جاتے۔ فروری کے آخری ہفتہ میں ایک مفصل ملاقات کے دوران میں اُنہوں نے اپنا یہ ارادہ ظاہر فرمایا تھا کہ دیال باغ کو وہ صنعتی تحقیقات کا بھی مرکز بنانا چاہتے ہیں اسی لئے وہ وہاں ایک انڈسٹریل و کیمیکل لبریٹری قایم کرنے کی فکر کر رہے تھے اُنکا دوسرا ارادہ یہ تھا کہ دیال باغ میں ٹینری کے کام کو غیر معمولی ترقی دی جائے اور اس پر کروڑ روپیہ تک لگا دیا جائے۔ وہ اس سے ہزار روپیہ روزانہ آمدنی کی توقع کرتے تھے۔ غرض ان کو ہر وقت یہی فکر رہتی تھی کہ کسطرح دیال باغ ملکی صنعت و حرفت کے ترقی کا ایک بہترین نمونہ بن جائے اور اہل ہند اس کے بدولت اپنے پاوں پر کھڑے ہونے کے قابل ہو جائیں۔

صاحب جی مہاراج خواہ مخواہ ضروریات زندگی کم کرنے یا تکلیف سے عمر بسر کرنے کے طرفدار نہ تھے۔ اُن کی دلی خواہش اور کوشش تھی کہ ملک کی دولت میں اضافہ ہو اور ہمارے ہموطن بھی آرام و آسایش کے ساتھ صاف ستھری زندگی بسر کر سکیں۔ افسوس ناوقت موت نے آپ کے کام کو تکمیل تک نہ پہونچنے دیا۔ تمام ملک کے لئے آپ کی وفات ایک سانحہ عظیم ہے۔ جس کا غم دلوں سے کبھی محو نہ ہوگا۔

لالہ کملاپت سنگھانیہ

لالہ کملاپت صاحب نہ صرف کانپور بلکہ صوبہ آگرہ و اودھ کے تجارتی حلقوں کے سرتاج تھے۔ اُن کی صحت بھی اس طرف کئی سال سے اچھی نہیں تھی۔ چنانچہ یکم جون کی صبح کو آپ بھی صرف ۵۳ سال کی عمر میں داغ مفارقت دے گئے۔

آپ ۱۸۸۴ء میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ کے بزرگ فرخ آباد میں ہُنڈی کا کاروبار کرتے تھے۔ کانپور میں آپ کی فرم بیجناتھ رام ناتھ کے نام سے ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانہ میں قایم ہوئی تھی۔ چنانچہ اس وقت جب یہاں کوئی بنک نہ تھا تو ہنڈی پرچوں کا کل کاروبار اسی فرم کے معرفت ہوتا تھا۔ آپ کے والد لالہ جگی لال کا کانپور کے اکثر بڑے بڑے کارخانوں سے تعلق تھا۔ چنانچہ عرصہ دراز تک آپ یہاں کے بڑے بڑے ملوں کے سول ایجنٹ رہے۔ آپ نے ۱۹۲۱ء میں انگریزوں کے کاروباری تجربات سے متاثر ہو کر کانپور کا پہلا سودیشی کاٹن مل قایم کیا۔ اس کے بعد آپ نے اتھرٹن ویسٹ مل بھی اپنی شرکت میں قایم کیا۔ بعدہٗ آپ نے ایک جوٹ مل جاری کیا۔ جس کی کامیابی کے بعد لکشمی رتن مل۔ آئیس فیکٹری۔ آئیل مل اور کئی

شوگر مل کھولے۔ غرض آپ کی ذات سے ہندوستانی کاروباری حلقے کو جو شاندار ترقی حاصل ہوئی اُس پر ملک کو جس قدر فخر ہو کم ہے۔ لالہ کملاپت کی یہ تجارتی لیاقت اور کاروباری تجربے صوبہ کے ہندوستانی انگریز بھی یکساں فائدہ اُٹھاتے تھے وہ بھی ہر شخص کو نیک صلاح دینے کے عادی تھے۔ درحقیقت انکو دوسروں کو مدد دینے میں ہمیشہ بڑی خوشی ہوتی تھی۔ اپنا ایمان بھر وہ بلا نمود و نمایش دوسروں کی حاجت روائی کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ انکی سدابرت سے سینکڑوں آدمیوں کو روزانہ کھانا ملتا ہے۔ انہوں نے سینکڑوں لڑکیوں کے بیاہ میں مدد کی۔ صدہا طالبعلموں کو وظیفے دئے اور یتیم بیواؤں کی پرورش کی۔ کانپور کے قریب قریب سب اسکول و کالج انکی فیاضی سے مستفید ہوئے۔ اُن کی خیرات کا اندازہ دس ہزار روپیہ ماہوار کیا جاتا ہے۔ اُنھوں نے اپنے خاندانی ٹرسٹ سری دوارکادھیس کی بھی از سر نو تنظیم کی اور انہیں کی کوشش قابلیت و خوش سلیقگی سے اب اس ٹرسٹ کے پاس کروڑوں روپیہ کی جائداد ہوگئی ہے جس کا ہر سال باقاعدہ طور پر آڈٹ ہوتا ہے۔ آپنے اپنی زندگی میں تقریباً چار لاکھ روپیہ مختلف چندوں میں دیا ہوگا۔ مرنے سے دو دن پہلے آپ نے یکمشت پانچ لاکھ روپیہ خیرات کی غرض سے علیحدہ کر دیا۔ اس رقم سے کانپور میں ایک عظیم الشان زنانہ اسپتال اور مواضعات کانپور میں سو اسکول تعمیر کئے جائیں گے۔ اسی رقم سے دس ہزار روپیہ الہ آباد کی ہریجن بستی کے لئے اور پچھتر ہزار روپیہ ہندی زبان کے پرچار کے لئے دئے گئے ہیں مگر لالہ کملاپت صاحب کی سب سے بڑی دولت انکا ذاتی کریکٹر تھا۔ ان کے طریقے ہمیشہ نکتہ چینی سے بالاتر رہے۔ وہ ترپن سال کانپور ہی میں رہے۔ مگر زندگی کے کسی مرحلے پر آپ کے ذات والاصفات پر کبھی کسی کو غلط اتہام لگانے یا حملہ کرنے کی ہمت نہیں ہوئی۔

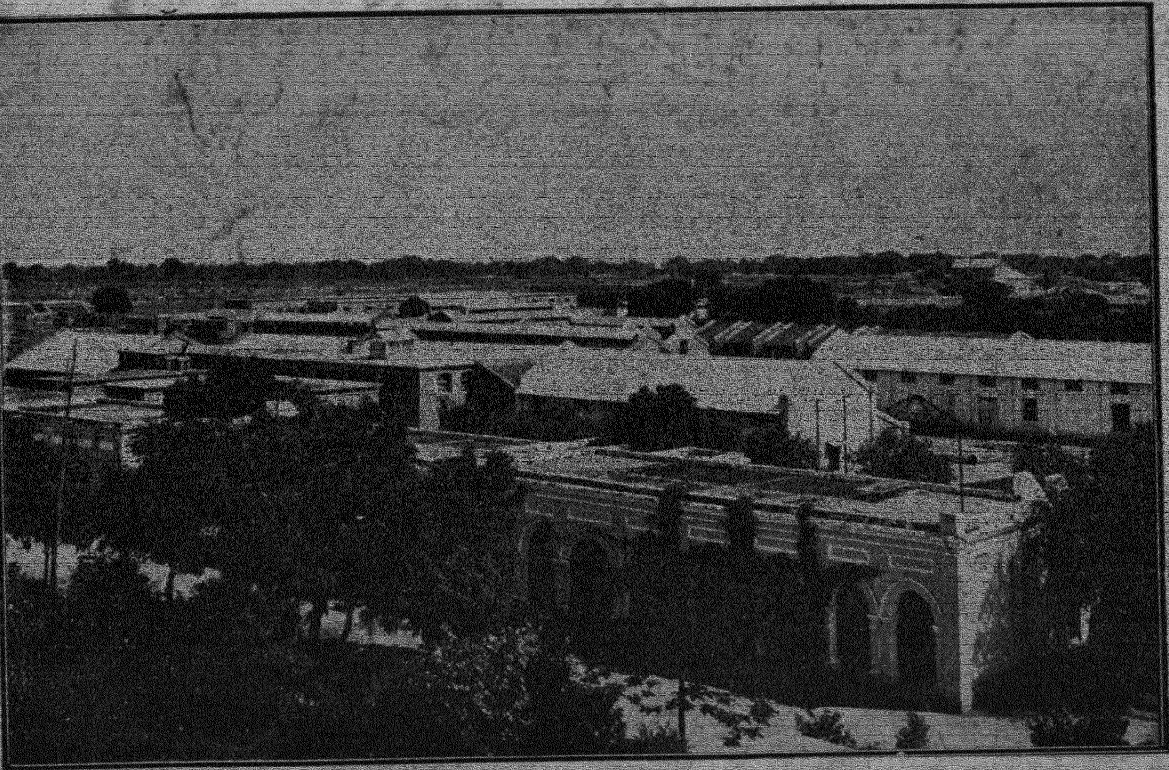
غرض حسن سلوک اور اخلاقی عظمت کی بدولت اُنکو ملک کے تجارتی حلقوں میں بہت بڑی وقعت حاصل تھی۔ وہ بات کے بھی بڑے دھنی تھے۔ جو بات کہدی پتھر کی لکیر ہوگئی۔ جس سے جو مراسم قایم ہوئے وہ آخر عمر تک اُنھیں نبھاتے رہے۔ وہ بڑے مردم شناس اور دوسرے کی قابلیت کے قدردان تھے۔

ایک دفعہ اُنھیں اپنے مل کی مشینری خریدنا تھی اور اُنھوں نے ایک کمپنی سے اس کا زبانی سودا کر لیا تھا مگر دوسرے ہی دن اُنھیں دوسری کمپنی سے دو لاکھ روپیہ کم قیمت پر وہی مشنری ملتی تھی۔ لیکن اُنھوں نے اپنی زبانی معاہدہ کو توڑنا گوارا نہ کیا اور دو لاکھ روپیہ کی بچت کا کوئی لحاظ نہ کیا۔

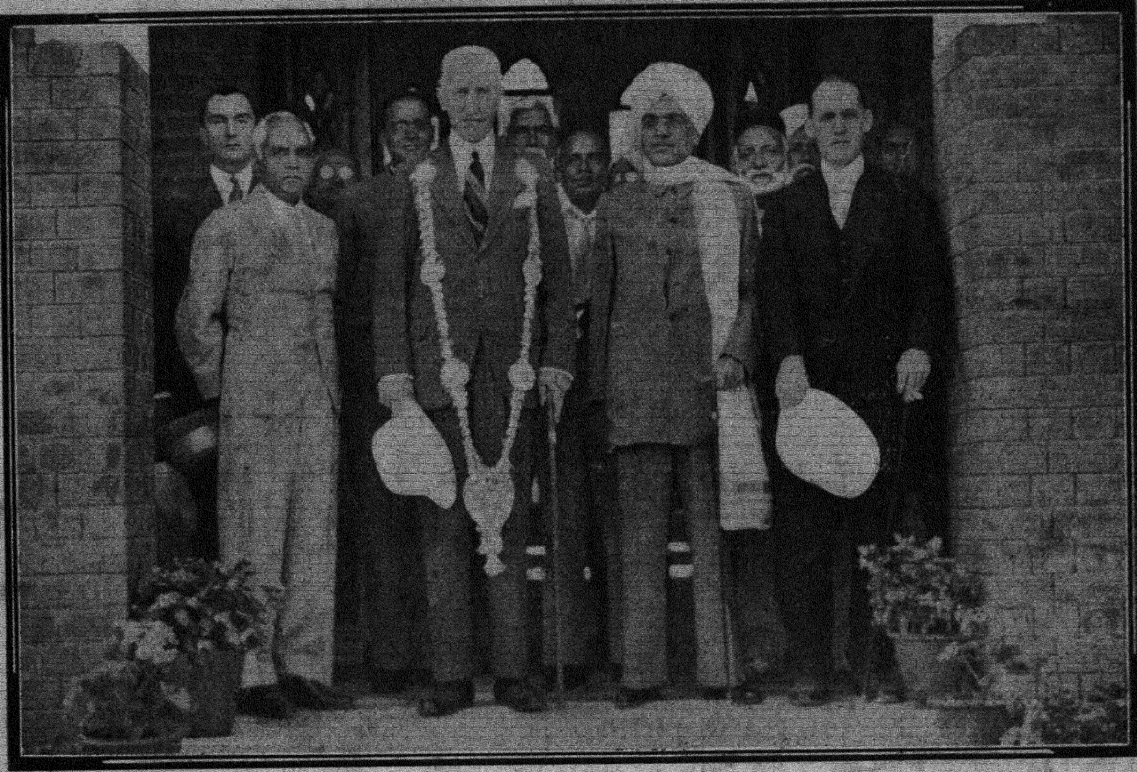
گو انہیں کوئی باقاعدہ تعلیم حاصل کرنیکا موقع نہ ملا تھا لیکن ان کی ذہانت اور معاملہ فہمی کا یہ حال تھا کہ ان کی گفتگو سے ہمیشہ یہی ثابت ہوتا تھا کہ اُنھیں ہر معاملہ میں بصیرت کامل حاصل ہے اور وہ اسکے متعلق تمام باتوں سے بخوبی واقف ہیں۔ انکا نقطۂ خیال بھی زمانہ حال کے عین مطابق تھا۔ وہ خود مریا حرکت میں روزانہ اپنی ڈائری لکھا کرتے تھے جس میں وہ اپنے تمام تجربات اور روزمرہ کے خاص خاص واقعات قلمبند کرتے تھے۔ جب کبھی کسی نئے کارخانہ کھولنے کا اُنھیں خیال ہوتا تو وہ اس بابت ایک مکمل یادداشت تیار کر لیا کرتے تھے اور اسی پر کاربند ہوتے تھے۔

اصلاح تمدن میں بھی وہ ہمیشہ قابل قدر مثال قایم کرنے کی فکر میں رہتے تھے۔ چنانچہ کانپور کی مارواڑی برادری میں سب سے پہلے انہوں نے غیر ملکی سفر کیا۔ اور خورد و نوش کی بندشوں کو توڑ کر ..... ملکی اتفاق و اتحاد کو ترقی دینے کی کوشش کی ان سب باتوں پر بھی مزاج میں نمود و نمایش یا تصنع و تکلف کو مطلق دخل نہ تھا۔ وہ بہت سادگی سے زندگی بسر کرنے کے عادی تھے۔

غرض لالہ کملاپت کی ذات میں بہت سی خوبیاں جمع ہوگئی تھیں اور اُن کی وفات ایک ملکی سانحہ ہے۔



دیال باغ کے صنعتی کارخانہ جات
جنکی ساختہ اشیا ولایتی اشیا کا مقابلہ کرتی ہیں



ہز ایکسیلینسی لارڈ ولنگڈن دیال باغ میں
(شری صاحب جی مہاراج آپ کے بائیں جانب رونق افروز ہیں)

زمانہ

نمبر ۲ اگست ۱۹۳۷ء جلد ۶۹

فلسفۂ سائنس اور قادرِ مطلق

(از ٹھاکر جے۔ آر۔ رائے جرنلسٹ)

ہم نے دانستہ اس مضمون کا یہ عنوان تجویز کیا ہے، کیونکہ اسمیں ایک طرف تو ارباب سائنس کے تازہ خیالات کا لب لباب پیش کرنا ہے اور دوسری طرف ان روشن خیال حضرات کے قیاسات کی خام خیالی دکھانا ہے، جن کے ذہن پر نصف صدی کی پرانی سائنٹفک راؤں کا نقش ابتک قائم ہے، ضمناً یہ بھی ثابت کرنا ہے کہ انیسویں صدی کی معلومات سائنس کی روشنی میں برہمانڈ کے خالق سے انکار کرنا سراسر غلط اور موجودالوقت سائنس کے ارشاد کے خلاف ہے۔

سائنٹفک خیالات میں انقلاب عظیم

اس میں تو کوئی شبہ نہیں ہے کہ اپنے زمانہ میں بالواسطہ یا براہ راست جو سائینسی قیاسات ہم نے حفظ کئے تھے یا اپنے بڑوں سے لیکچروں کے دوران میں سُنے تھے، وہ ابتک ہمارے دماغ اور دل پر حاوی ہیں۔ گو اقلیم سائنس میں عظیم انقلاب واقع ہوچکا ہے۔ مگر ہمیں کانوں کان اس کی خبر نہیں ہوئی، کہ مادہ پرستی جس کا چالیس برس پیشتر اتنا شور تھا وہ اب حرفِ غلط کی طرح مٹ چکی ہے، اور اس کی جگہ پر چوٹی کے ماہران سائنس نے جو مذہب کھڑا کیا ہے، وہ فلسفۂ دین کے استادوں کے عقیدہ کے عین موافق ہے۔ سائنٹفک خیالات کے متعلق غلط فہمی پھیلانے میں یورپ کے عقل پرستوں نے بڑا حصہ لیا ہے، جن کی

سستی کتابیں بڑے بڑے شہروں میں بکتی ہیں۔ انگریزی تعلیم یافتہ اُنھیں لے کر شوق سے پڑھتے اور اہل مذہب پر لے دے کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ عقلیت کے شیدا سیموئیل بکنگ کی مشہور کتاب جو ساٹھ سال پہلے طبع ہوئی تھی سب کتب خانوں میں پائی جاتی ہے، جس میں ۱۸۷۵ء کے سائینسی مذہب کی رو سے مسیحی مذہب پر نگاہ ڈال کر اُسے سراسر مہمل اور ناقابلِ تسلیم قرار دیا گیا ہے۔ مگر بنیادی اُصول تمام بڑے اور آسمانی مذاہب کے یکساں ہیں۔ اگر یورپ کا مقبول عام مذہب سائینس کی نقیض ہے تو اسلام اور ہندو دھرم بھی سائینس کی رو سے نامعقول ثابت ہونگے۔ پچھلے سال کے شروع میں لاہور کے مشہور اخبار ٹریبون میں کسی آزاد خیال مخالف مذہب نے مضامین لکھ کر ایشور واد کا مضحکہ اُڑایا اور بار بار سائینس کی تعلیمات کا آسرا لیتا رہا۔ راقم مضمون نے جس سائینس کے قلعہ میں پناہ لے کر اہل مذہب کے سب سے بڑے عقیدہ ایشور واد پر گولہ باری کی وہ خود بوسیدہ اور متزلزل ہے۔ اس قسم کے مضامین دیگر انگریزی اخباروں میں بھی آئے دن شایع ہوتے ہیں۔ اس وجہ سے یہ لازم آتا ہے کہ دیار سائینس کی موجودہ حالت پر گہری نگاہ ڈال کر اصلیت واضح کی جائے۔

بطور کلیہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ چالیس پچاس برس پہلے کے سائینسی خیالات اب لغو ثابت ہو کر متروک ہو چکے ہیں۔ آج کل کے فلسفہ سائینس کے سب سے افضل خیالات تھیالوجی (دینیات) کے عین موافق ہیں۔ اس سے مراد یہ ہے کہ چوٹی کے سائینس داں پرماتما کے قایل ہیں۔ وسیع اور گہری تحقیقات سے نہیں بلکہ عقیدۂ خدا کی طرف ہدایت حاصل ہوئی ہے۔

مادہ کی کہنہ سال کائنات کا طلسم

انیسویں صدی میں یا اس سے پیشتر مادہ پرستی (Materialism) کا عقیدہ ہر مہذب ملک میں مروج تھا۔ موجودات کائنات مادہ کی گوناگوں صورتیں قرار دی گئی تھیں۔ سب سے پہلے ہندو حکماء نے اُسے پرماتما کی طرح انادی قرار دیا تھا۔ چارواک فرقہ کے حکماء نے اسے سب کچھ تسلیم کیا تھا۔ جین مت کے عقیدہ کا ایک بڑا اُصول مادہ پرستی ہے۔ افلاطون نے بھی مادہ کو خدا کے ساتھ کائنات کی ترکیب میں برابر کا شریک ٹھہرایا ہے۔ انیسویں صدی کے سائینس پر بھی پُرانے فلسفی خیالات کا اثر غالب رہا۔ اس وجہ سے ہر جگہ اسی کا چرچا تھا۔ مادہ کے بھانت بھانت سروپ کے سامنے پرماتما کی ہستی غیر ضروری سمجھی گئی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سائینس کی دنیا میں تخیلات کا اوّل و آخر مادہ ہی قرار دیا گیا۔ اور عالی دماغ ماہر اسی کے گُن گانا اپنا پرم دھرم سمجھنے لگے۔ لیکن جب ۱۸۹۶-۹۷ء میں ایکسرے اور ریڈیم کا انکشاف ہوا۔ تو نکتہ رس نگاہوں نے تاڑ لیا۔ کہ صدہا سال کا مذہب مادہ پرستی تھوڑے ہی دنوں کا مہمان ہے۔ چنانچہ

پانچ ہی دس سال کے اندر یہ خیال صحیح ثابت ہوگیا۔ سالمہ (Atom) (پرمانو) جو دو ہزار برس تک ناقابلِ تفریق شمار ہوتا رہا۔ ریڈیم اور ایکسرے کے ذریعہ سے مرکب ثابت ہوا۔ اور اس کے اجزاء ترکیبی علیحدہ کئے گئے۔ اس سے رفتہ رفتہ الکٹرون (برقپارون Electron) کا مسئلہ ظہور میں آیا۔ مادہ مادہ نہ رہا۔ بلکہ وہ برقی قوت کا مرکزِ ثقل تسلیم کیا گیا۔ جب مادہ نیست ہو کر بجلی کے پردوں میں روپوش ہوگیا۔ تو مادہ پرستی کیسے ٹھہر سکتی۔ چنانچہ وہ بھی نابود ہو چکی۔ تصورِ مادہ کے تغیر سے نہایت وسیع اور مستقل نتائج برآمد ہوئے ہیں۔ اب اقلیم طبعیات میں الکٹرون۔ نظریۂ ضافیہ (Relativity) اور کانٹم (Quantem.) تھیوری کا عمل دخل ہے۔* اس سے عالم اور انسان کے بارہ میں سائینسی تصور بدل گیا ہے۔ چنانچہ اس انقلاب عظیم کو آوٹ لائن آف بلیف" (Out line of Belief) کے مؤلفوں نے یوں بیان کیا ہے۔

"تیس سال پہلے سائینس کا نقشہ کلیتہً بدل چکا ہے۔ پرانا نظریہ کہ عالم آپ سے آپ وجود میں آیا ہے۔ نیست ہوگیا ہے۔ مادہ کی چھان بین کرنے سے وہ روحانی وجود ثابت ہوا ہے۔ جس سے موجودات اور ہمارا من معرض وجود میں آیا ہے۔ ہیولیٰ کا خیال آج کل کے سائینس سے خارج ہو چکا ہے۔ مادہ اور قوت ایک ہی چیز ثابت ہوئے ہیں۔ من وجود اولین ہے اور مادہ اسی سے پیدا ہوا ہے۔"[1]

اس سے ظاہر ہے کہ ارباب سائینس کے تخیلات سے مادہ کلیتہً ناپید ہے۔ وہ اب اسے خاطر ہی میں نہیں لاتے۔ اور اس کی کوئی حقیقت نہیں سمجھتے۔ اس وجہ سے مادہ پرستی کا اعتقاد ارشادات سائینس کے خلاف اور نامعقول ہے۔

تصورِ روحانیت کا ظہور اور غلبہ — اب جبکہ مادہ پرستی متروک ہو چکی تو ارباب سائینس کا کیا مذہب رہا؟ اس اہم مسئلہ پر غور کرنا بھی ضروری ہے۔ اسے فلاسفر آئیڈیل ازم (Idealism) کہتے ہیں ماہران فلسفۂ مذہب اسے پرسنیلٹی (Personality) مانتے ہیں۔ اول الذکر سے مراد قوتِ تخیل ہے۔ اور یہ مادیت کے نقیض ہے۔ اس تصور میں عالم روحانیت عقلی اور اخلاقی تخیلات شامل ہیں۔ اعلیٰ درجہ کے مذہب میں سب سے افضل خیال روحانیت کا ہے۔ جس میں جیوآتما اور پرماتما دونوں کا عقیدہ پایا جاتا ہے۔ موخرالذکر سے شخصیت اور ویاکتی مراد ہے۔ اس میں چیتن شکتی اور ارادت کا خیال بھی موجود ہے۔ اس مت کے رو سے پرماتما اور آدمی شخصیت سے آراستہ ہیں کہ وہ سوچنے اور اپنی

---

[1] جلد ۱ حصہ ۲ مقدمہ۔ جلد ۲ صفحہ ۸۰۷ مطبوعہ ۱۹۳۵ء

* اب ماہرین سائینس نے انسٹین کے نظریہ اضافی کا بھی تار و پود بکھیر دیا ہے۔ ا۔ ز۔

مرضی کے مطابق کام کرنے کی طاقت سے بہرہ ور ہیں۔ اس وقت شہرۂ آفاق ماہران سائنس روحانیت اور شخصیت کے قائل ہیں۔ وہ انسان کے روحانی تجربات اور روحانی امنگ اُبھارنے اور اخلاقی تمنّا پیدا کرنے والی باتوں کی حقیقت تسلیم کرتے ہیں۔ نامی جرمن ماہر پروفیسر زبی لیفنگ راوی ہے۔

"جن معاملات پر فلاسفر اور ماہر سائینس رائے زنی کرنے میں بے بس ہیں۔ ان کی بابت شاعر۔ صنّاع اور رشی اظہار خیال کرنے میں حق بجانب ہیں۔ بلکہ ان کا یہ خاص حق ہے کہ وہ اطمینان کے ساتھ رائے زنی کریں"

اس کا مطلب یہ ہے کہ خدا کی ہستی صرف سائینس دانوں اور فلاسفروں کی خیال آرائیوں کا مضمون نہیں ہے۔ بلکہ شعراء اور رشی اور صنّاع جو کچھ کہتے ہیں۔ اس سے چشم پوشی ممکن نہیں ہے۔ "آؤٹ لائن آف بلیف" کے مؤلف لکھتے ہیں۔

"ہمارے تصور عالم میں سب سے مقدم امر یہ ہے کہ اس کے اندر آتمک شکتی کام کر رہی ہے۔ فلسفۂ سائینس کے استادوں کے نزدیک یہ مت قبولیت عام حاصل کر رہا ہے۔ کہ مظاہر کی دنیا میں مانسک شکتی ہے۔ جس سے ہر ایک بیجان اور جاندار نیز انسان معرض وجود میں آئے ہیں" (جلد ۱ صہ ۲۲۔۵۱۳)

اس اجمالی بحث کا ماحصل یہ ہے کہ اولین ہستی مانسک ہے۔ اسی کے اشارہ سے مادہ وجود پذیر ہوا تھا۔ یہ عین مناسب ہے کہ اس خیال کی تائید (Mentalism.) میں آج کل کے سب سے بڑے ماہرین کے خیالات پیش کئے جائیں۔

سر جے۔ جینز کا فلسفۂ روحانیت

سر جے۔ جینز (Jeans) دنیائے سائینس کے نہایت بلند خیال ماہر ریاضیات جن کی حکیمانہ خیال آرائیوں سے دنیائے سائینس میں بہت ہلچل پیدا ہوگئی ہے برہمانڈ کو ماہر اعظم ریاضیات کا منصوبہ قرار دیتے ہوئے۔ لکھتے ہیں:۔

"برہمانڈ کو مادی ہیئت میں پیش کرنا محال ہے۔ اس کا کارن میری دانست میں یہ ہے کہ یہ اب تصور روحانی بن گیا ہے۔ عالم کا بہترین تصور یہی ہو سکتا ہے گو یہ بھی ناقص ہے۔ کہ یہ خالص تخئیل ہے۔ یعنی کسی ماہر ریاضیات کا منصوبہ ہے" ("آؤٹ لائن آف بلیف" جلد ۱ صہ ۸۲)

ماہر موصوف کی رائے میں ہماری عقل اور عمل عالم میں گہری مشابہت پائی جاتی ہے۔ آپ کا یہ بھی خیال ہے کہ علم ریاضی عقل انسانی کی ایجاد ہے جسے تجربہ سے کوئی مناسبت نہیں ہے۔ آپ کی رائے میں عقل انسانی اور برہمانڈ کا منصوبہ ایک ہی ہستی کی قدرت سے مرتب ہوا تھا۔ آپ کہتے ہیں۔

"اس دنیا کا استاد ریاضیات مادیات سے سروکار نہیں رکھتا۔ بلکہ خالص تصور سے بحث کرتا ہے۔ اس

ـه اناٹمی آف سائینس (Anatomy of Science.)

کے خیالات اس کی عقل کی اتبع ہیں۔ اور تخیل پر مبنی ہیں۔" (آؤٹ لائن آف بلیف" جلد ۲)

اس سے عیاں ہوتا ہے کہ سر جیمز جینز کے نزدیک مادیت نابود ہوگئی ہے۔ بر ہمانڈ میں خالص افضل تصوّر پایا جاتا ہے۔ اور عقل کل وجود اوّلین (پرتھم پدارتھ) ہے۔

دیگر ماہروں کی رائے

سر آرتھر ایڈنگ بھی ریاضیات اور فلکیات کے نہایت ممتاز ماہر سائینس ہیں۔ ان کی رائے میں عالم محسوسات کا وجود شعور و ادراک کی بنیاد نہیں اور وہ خارجی مادۂ عالم کو من کے مشابہ قرار دیتے ہیں۔ ہمارے ادراک میں من کا عمل اور اظہار سب سے زیادہ قوی اور براہ راست ہے۔ باقی ادراکات عمل استخراج سے نصیب ہوتے ہیں۔ آپ فرماتے ہیں"

"معنوی شخصیت یعنی شعور ذاتی اور فعل مختاری کے ادراک کا کونسا طبعی نعم البدل مادہ پرست پیش کر سکتے ہیں۔ شعور و ادراک کے سلسلہ سے خارج ہر ایک وجود کا ذکر محض لایعنی ہے۔" (آؤٹ لائن آف بلیف جلد ۲ صفحہ ۸۲)

اس سے ظاہر ہے کہ اقلیم سائینس کے دوسرے شہرۂ آفاق ماہر بھی وجود روحانی یعنی پرماتما ہی کی ہستی کو سب سے مقدم اور افضل گردانتے ہیں۔

پروفیسر اے۔ این۔ وائٹ ہیڈ فلسفۂ سائینس کے استادوں میں سب سے زیادہ مشہور ہیں جن کی تصنیفات سے دنیائے سائینس میں تہلکہ پیدا ہوگیا ہے۔ آپ بھی جینز اور ایڈنگ ٹن کی طرح ریاضیات کے لاثانی اُستاد ہیں۔ آپ کا یہ قول ہے۔

"جو افضل خیالات اب دنیائے سائینس میں مقبول و مقدم ہیں۔ سائینسی مادیت ان کی نقیض ہے۔"

ان تینوں ماہروں کے خیالات سے جرمنی کے نہایت سرکردہ سائینس دانوں کو پورا اتفاق ہے۔ اور وہ من و شعور کو سب سے مقدم اور اساسی تصوّر قرار دیتے ہیں۔ میکس پلانک راوی ہے۔

"شعور کی تشریح مادی قانون اور تصوّر کے رو سے نہیں ہو سکتی۔ میں شعور کو اوّلین اور مادہ کو اس کی اتبع تسلیم کرتا ہوں۔"

دوسرا بلند پایہ جرمن ماہر شِیر ڈر (Schradre) کہتا ہے۔

"شعور کی تشریح اس قاعدہ سے ممکن نہیں۔ کہ جس سے مادیات کی ترکیب کی توضیح کی جاتی ہے۔ اس کا کارن یہ ہے کہ شعور سب سے مقدم ہے۔"

برطانیہ کے سرکردہ ماہر پروفیسر جے۔ ایس۔ ہالڈین۔ فیلو رائل سوسائٹی لنڈن۔ ماہران سائینس کے ایمان خدا کی بابت یوں لکھتے ہیں۔

"اصلی دنیا افضل ترین باتوں کی روحانی دنیا ہے۔ اور افضل ترین باتیں سب سے عظیم روحانی وجود کی منظہر ہیں جسے

اہل مذہب خدا پکارتے ہیں۔" (آوٹ لائن آف بلیف" جلد ۱ صہ ۶۰۹)

سائکالوجی کے استاد اعظم ڈبلیو جیمز کی رائے ہیں۔

"عالم مرئی روحانی عالم کا ضروری حصّہ ہے جس کے کارن اس کی قدر و قیمت اور اسے اہمیت حاصل ہے۔"

سر جے۔ جینز کا یہ قول ناطق ہے

"دنیائے سائینس میں یہ بات قبولیت عامہ حاصل کر رہی ہے کہ فلسفہ سائینس روحانیت کی طرف رہنمائی کر رہا ہے۔"

ماہروں کی خدا پرستی

اس مختصر بحث سے ظاہر ہے کہ آج کل کے شہرہ آفاق ماہران سائینس جن میں البرٹ آئن اسٹائن بھی ہے جس کے ریاضی تصورات سے سر آئیزک نیوٹن اور اقلیدس کے مسلمات دیرینہ مسائل تہ و بالا ہوتے جاتے ہیں۔ قادر علی الاطلاق کو اہل مذہب کی طرح وجود روحانی جو عقل و شخصیت سے آراستہ ہے۔ تسلیم کرتے ہیں۔ جس سے مادّیت اور دہریت (Agnosticism) کا قلع قمع ہو چکا ہے۔

تھوڑے عرصہ کا ذکر ہے کہ ایک ماہر نے جرمنی کے تمام ماہران سائینس کے نام اس مضمون کا خط لکھ کر استدعا کی کہ آپ اپنے مذہبی عقیدہ کی نسبت اظہار خیال کیجئے۔ تین سو ماہروں کے جواب سے ظاہر ہوا کہ فقط پانچ فیصدی ماہر لاادریت کے معتقد ہیں۔ اور مادیت کے وکیل صرف دو پائے گئے باقی سب کے سب خدا کی ہستی کے قایل پائے گئے۔ اسی طرح برطانیہ اور اضلاع متحدہ امریکہ کے ماہروں کی نوّے سے پچانوے فیصدی اکثریت نے اپنے کو مذہب کا حامی ظاہر کیا ہے۔ جس سے یہ عیاں ہوتا ہے۔ کہ سائینس دانوں کی بھاری اکثریت ایشو وادی اور آستک ہے۔ جو لوگ سائینس کا نام لیکر مادّیت کی وکالت کرنے کے درپے ہیں وہ راستی اور حقیقت سے جان بوجھ کر انکار کرتے اور نا اہلوں کو چھل دیتے ہیں۔

سائینس کا قول ناطق

پچھلی بحث سے یہ واضح ہوتا ہے۔ کہ فلسفۂ سائینس سے ایمانِ خدا کی ناقابل بیان تائید و تصدیق ہوتی ہے۔ اور اس کا فتویٰ عقل انسانی اور سائینس کے طریق عمل سے ہم پونچتا ہے۔ بقول سر جے۔ جینز برہمانڈ ایک تخیئل اور تصوّر (Thought) ہے۔ مگر اس کے ساتھ متفکر (Thinker) اور چیتن شکتی کا خیال لازم اور ضروری ہے کہ خیال فقط متفکر ہی کے دل میں پیدا ہو سکتا ہے۔ لیکن ارباب سائینس سے اصول استخراج (Induction) کے پس پشت یہ کلیہ ہے کہ برہمانڈ کے مظاہر ممکن الفہم ہیں۔ اور کائنات کی یک رنگی اور عقلیت سے براہ راست خدا پرستی کے اصول موضوعہ کی تائید ہوتی ہے۔ اس امر کو خوب یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ عقلیت (Rationality) امر اتفاقی نہیں ہے۔ بلکہ عالم کی تکوین میں ابتدا ہی سے مت پدارتھ کی مانند ودیعت ہوئی ہے۔ برہمانڈ کی ممکن الفہم (Intelligibility) خاصیت اس امر پر دال ہے۔ برہمانڈ کے اندر جو حکمت کام کر رہی ہے اسے انسان کی عقل سے گہری مشابہت ہے۔ عقل اور اخلاق

مترادف ہیں۔ اور اخلاقی یقین ہر قسم کے سائینسی استدلال کی لازمی شرط۔ ایمان یا بشواس انسان کی بہترین عقل ہے ابتداء میں جب محسوسات کے پس پشت نظام طبعی کو سمجھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ تو اعتقاد اور یقین سے عقل ظہور پذیر ہوتی ہے۔ اس امر سے یہ واضح ہوتا ہے کہ طبعیات عقل انسانی اور انسان کے ماحول کے مابین مناسبت سے حاصل ہوتا ہے۔ اس سے براہ راست یہ امر ثابت ہوتا ہے۔ کہ خدا پرستی وہ اُصول موضوعہ ہے۔ جو سائینس کی تحقیقات اور طریق استخراج کے لئے بے حد لازم ہے۔ انسان کا شعور جبلی وہ انکشاف ہے جس کی وساطت سے برہمانڈ کی روحانی توجیہ کی جا بہم پہونچتی ہے۔

فلسفۂ سائینس اور خدا

قصہ کوتاہ فلسفۂ سائینس کے رو سے جو خدا واجب الوجود ثابت ہوتا ہے۔ وہ حکمت و قرینہ کا بانی اور باقاعدہ نمو کا محرک اور دنیا کے سالمات و موجودات میں اتحاد و اتصال پیدا کرنے والا خیالات؛ فرائض اور حکمت کا موضوع آخری ہے۔

راقم الحروف کا یہ پختہ عقیدہ ہے کہ سائینس اور علمی تحقیقات اور فلسفیانہ تجسّس کی روشنی میں خدا پر ایمان لانا نامعقول نہیں ٹھہر سکتا۔ فلسفۂ سائینس سے ارض و سما کے خالق کے ایمان کو خاص تقویت حاصل ہوتی ہے۔ اور اس کی ہستی ایسے معقول طریقہ سے واجب التسلیم ثابت ہے۔ جو منطق اور فلسفہ مسلمہ ہے۔ گو فلسفۂ مذہب کے عالی دماغ ماہروں نے خدا پرستی کے ثبوت میں ایک خاص علم مرتب کر رکھا ہے۔ تو بھی میرا یہ بشواش ہے۔ کہ خدا کا ادراک مطلق انسان کی باطنی طاقت سے بعید ہے۔ بلکہ حق الامر یہ ہے کہ جو پرماتما فلسفیانہ استدلال سے سدھ کیا جائے۔ وہ نہ تو غیر محدود ہے اور نہ قابل عبادت۔ خدا پرستوں کا یہ اعتقاد ہے۔ کہ خدا کی ہستی برہمانڈ کی تمام ناقابل بیان حقیقتوں سے بدرجہا بڑی ہے۔ اس وجہ سے یہ امر موجب حیرت نہیں ہے۔ اگر ہر قسم کا استدلال ناکافی سمجھا جائے۔ اس ناقابل بیان اور ممتنع الفہم ہستی کو ثابت کرنے کے لئے کائنات کے علاوہ انسان کی معنوی اخلاقی اور روحانی کیفیتوں سے بھی ثبوت مہیّا کرنا لازم ہے جس سے تصوّر خدا عقل اور تجربہ کے رو سے بالکل واجب التسلیم عیاں ہوتا ہے۔ فلسفۂ سائینس کا اُصول موضوعہ یہ ہے۔ کہ دنیا میں قرینہ اور قاعدہ اور یکسانیت اور اتحاد نوع ہے جو حکمت انسانی کی دسترس سے بالا نہیں ہے۔ اور اس کا طریق عمل اور تغیّر و تبدّل انسان اپنی زبان سے ادا کرنے کی قدرت سے بہرہ ور ہے۔ اور یہ قیاس فکر انسانی کا افضل ترین موضوع ہے اور برہمانڈ کے اندر عقل کل پر دال ہے۔ حکیمانہ استدلال سے ہم محدود سے غیر محدود ہستی کی طرف ہدایت حاصل کرتے ہیں اور عقل و حکمت سے جو ہستی سدھ ہوتی ہے۔ انتہ کرن اور حاسۂ روحانیہ اس پر صاد کرتا ہے۔



ابرِ رواں کو دیکھکر

(از حضرت برج لال جگی رعنا۔ ضیائی۔ بی۔ اے۔)

فلک پہ ابرِ رواں کے سیاہ پرچم ہیں
نہیں یہ میری پریشانیاں مجسم ہیں

نہیں یہ منظرِ صد داغ ہے زمانے میں
مرا فسانہ ہے جاری نگارخانے میں

نہیں یہ مانیٔ خورشید کی ہیں تحریریں
فضا میں آب سے کھینچی ہوئی ہیں تصویریں

نہیں یہ رحمتِ باری کا شامیانہ ہے
کہ جس کا سایہ کلیدِ شراب خانہ ہے

نہیں یہ منظرِ طرفہ ہے چشمۂ خضر میں
ہیں موتیوں کے جزیرے رواں سمندر میں،

نہیں ادھر سے کوئی شہسوار گذرا ہے
مثالِ ناوکِ ضیغم شکار گذرا ہے

یہ ابر سایہ ہے جس کے رمیدہ آہو ہے
برنگِ نکہتِ عنبر پریدہ آہو ہے

نہیں یہ عشق کا پھیلا ہوا فسانہ ہے
کہ جس میں آہ کا اڑتا ہوا ترانہ ہے

نہیں نہیں یہ سحابِ لطیف و نرم نہیں
کسی حسین کے کفن کی ہے چادر مشکیں

ہوائیں جس کو اڑا کر فلک پہ چھائی ہیں
چتا کی آگ کے شعلوں سے چھین لائی ہیں

اٹھا کے دوش پر اس حسرتوں کی دنیا کو
بڑھی ہیں درد صفت سرزمین گنگا کو

رکیں گی جا کے ہوائیں یہ رودِ گنگا پر
جھکیں گی جا کے ہوائیں یہ رودِ گنگا پر

ہوائے گنگ میں اک اضطراب اٹھے گا
مثالِ موجۂ پر پیچ و تاب اٹھے گا

وہ اضطراب بڑھے گا خیال کی صورت
فلک پہ چمکے گا جا کر ہلال کی صورت

وہ اضطراب ہواؤں کو جا کے چھیڑیگا
وہ اضطراب گھٹاؤں کو جا کے چھیڑیگا

بجائے آب گھٹاؤں سے پھول برسیں گے
وہ پھول صورتِ رنگِ قبول برسیں گے

وہ پھول سینۂ گنگا میں تہ نشیں ہونگے
بہارِ حسن سے فردوس آفریں ہونگے



ابتدائے زندگی

از منشی رام نراین صاحب نگم

ابتدائے آفرینش میں جب خلقت کی تشکیل مکمّل نہ ہوئی تھی تو آفتاب ایک ابر نما دہکتا ہوا سفید روشنی والا گیس کا گولہ تھا۔ وقتاً فوقتاً گیس کے بادل آفتاب سے علیحدہ ہوکر منجمد ہوئے اور اُن سے نظام شمسی کے مختلف سیّارے بنے۔ اُنہیں سیّاروں میں سے ایک ہماری دنیا ہے۔ آفتاب کے گرد باقاعدہ گردش کرتی ہوئی دنیا متواتر اُس کے زیر اثر رہی۔ زمین کی گردش ہی موسمی تبدیلیوں۔ بہار و خزاں۔ سرما و گرما کا موجب ہے۔ ہر سیّارے اپنے محور پر بھی گردش کرتے رہتے ہیں اس لئے زمین کی اس قسم کی گردش رات اور دن کا باعث ہوتی۔ ابتدائی زمانہ میں جب سیّارے اپنے اپنے محور پر استحکام کے ساتھ قایم نہ ہوئے تھے اور اُن کے حرکات وغیرہ میں مکمل باقاعدگی نہ تھی تو سیّاروں سے چاند اُسی طرح پیدا ہوئے تھے جس طرح آفتاب سے خود سیّارے سب سیّاروں میں ایک ہی چاند نہیں ہے بلکہ مرّیخ Mars میں دو۔ مشتری Jupiter میں نو اور زحل Saturn میں دس چاند ہیں۔ حالانکہ ہماری دنیا میں صرف ایک ہی چاند ہے۔ ہر ایک چاند اپنے سیّارے کے زیر اثر ہے اور اُس کے ساتھ ساتھ گردش میں رہتا ہے۔ چنانچہ ہماری دنیا جو ابتدائً کثیر التعداد اجزاء سے مرکّب اور ایک پگھلا ہوا گولا تھی رفتہ رفتہ جب سرد ہوئی تو بالائی سطح زمین بنی۔ جب باقاعدگی پیدا ہوئی تو وزنی اجزا نیچے اور سُبک اجزا اوپر ہو گئے۔ مدتوں اُوپر کو اُچک اُچک کر سُبک اجزاء نے بڑی دنیا بنائی اور وزنی اجزا سے سمندر کی تہ بنی۔ اُس زمانہ میں زمین کے اُوپر اس قسم کا کرۂ ہوائی نہ تھا جیسا کہ موجودہ زمانہ میں ہے لہذا جاندار ہستی کا وجود بھی ممکن نہ تھا۔ مدتوں بعد کیمیاوی تبدیلیوں کے بدولت زمین کے اندر سے Carbon dioxide اور پانی پیدا ہوئے۔ اوّل الذکر بالکل ہی گیس کی صُورت میں ہونے کے باعث اوپر چڑھ گیا۔ پانی کا کچھ حصّہ بھاپ کی صُورت میں تبدیل ہوکر اوپر گیا۔ اور باقی زمین پر رہا تاکہ ہر وقت اور ہر موسم میں ہوا میں بھاپ کی نمی اور زمین پر پانی کی تری مُیسّر رہے اس کے بعد آکسیجن پیدا ہوئی جو اور ضروریات کے علاوہ اغراض تنفّس کے لئے بھی لازمی ہے۔ مادّی اشیاء کی زندگی پر درجہ حرارت کا نہایت زبردست اثر ہے۔ سفید رنگ کے درجہ حرارت میں جیسا کہ آفتاب میں ہے صرف عناصر قایم رہ سکتے ہیں۔ اس سے کم درجہ حرارت میں سادہ مرکبات جو ایک سے زیادہ اجزاء

سے مرکب ہوں اور اُس سے بھی کمتر درجہ حرارت میں وہ مرکبات قایم رہ سکتے ہیں جو متعدد اجزائے سے بنے ہوں۔
جب زمین کافی سرد ہو چکی اور پانی بھی اتنی مقدار میں پیدا ہو چکا کہ تمام کرۂ زمین کی ضروریات کافی طور سے پُوری ہو سکیں اور پانی کی بھاپ مینھ کی صُورت میں زمین کو سرسبز و شاداب کرنے کے لئے کافی جمع ہو چکی تب کہیں زندگی کا وجود ہوا۔ انواع واقسام کے پودے زمین سے اُگے اور ہوا سے اپنی غذا حاصل کرنے لگے۔ خس و خاشاک سے جانوروں کے اجسام بنے۔ غلّوں سے چڑیوں کے رنگا رنگ پر بنے اور غذا ہی سے انسان بنا جو اشرف المخلوقات اور عقل و دانش کا پُتلا مانا گیا ہے۔ مگر مذکورہ بالا ہستیاں کسی نہ کسی جاندار ہستی کے توسّل سے پیدا ہوئی ہیں۔

سوال یہ ہے کہ جس وقت دُنیا میں کسی ذی رُوح کا وُجود نہ تھا تو سب سے پہلی جاندار ہستی کیونکر پیدا ہوئی؟ کون و فساد کا عمل ازل سے جاری رہا ہے ابھی جاری ہے اور ابد تک جاری رہے گا خواہ اس کی رفتار کتنی ہی سُست کیوں نہ ہو اور بعض حالتوں میں اُسکے وُجود کو معلوم کرنا مشکل کیوں نہ ہو۔ مذہب اور سائینس نے جن ازلی حقیقتوں کا انکشاف کیا ہے وہ جیسی تھیں ویسی ہی ہیں اور وہی رہیں گی البتہ انسانی معاملات۔ فہم و ادراک میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ جاندار ہستیوں کے (Analysis) (کیمیاوی تفریق) سے یہ صاف معلوم ہو گیا ہے کہ اُنکی ساخت غیر ذی رُوح مادّوں سے ہوئی ہے مگر جب مشیّت ایزدی سے مادّوں کا مجموعہ پریشان ہو جاتا ہے اور وہی ہستی جو پہلے دنیا کی رونق و فرحت کا سامان تھی مُشت خاک ہو جاتی ہے تب انسان کی آنکھیں کھلتی ہیں ؎

موت نے کر دیا لاچار وگرنہ انسان ہے وہ خود بیں کہ خدا کا بھی نہ قائل ہوتا

آیا کوئی ایسا بھی ترقی کا وقت آئے گا کہ جب رموز آفرینش سے انسان کما حقہٗ آگاہ ہو سکیگا اُس خالق کائنات کو بہتر معلوم ہے جسکی قدرت کاملہ کا آئے دن کا یہ کرشمہ ہے کہ نیستی سے ہستی۔ ہستی میں ترقی اور بالآخر نیستی ہوتی چلی آتی ہے اور ماضی سے حال اور حال سے مستقبل پیدا ہوتے چلے آتے ہیں

بہر حال انسان باوجود اپنی محدود عقل و دانش کے ہمیشہ سے اس مسئلہ کو حل کرنیکی فکر میں رہا ہے۔ ایک فلسفی کا یہ قول تھا کہ زندگی کا وجود پانی میں ہوا تھا۔ ارسطاطالیس کی رائے میں زندگی کا وجود خود رو طریقہ پر ہوا یعنی غیر جاندار چیزوں کی حالت میں تبدیلیاں ہونے سے ہی جاندار پیدا ہوتے ہیں مثلاً خشک اجسام جب نم ہوئے تو اُن میں سے جانور پیدا ہوئے اسیطرح نم اجسام جب خشک ہوئے تو اُن میں سے جانور پیدا ہوئے۔ غرض ایک طبقہ خود رو طریقہ کا قایل ہے مگر ڈاکٹر (Redi) نے یہ ثابت کر دکھایا کہ گوشت اگر مکھیوں وغیرہ سے بالکل محفوظ رکھا جائے تو اُس میں از خود کیڑے نہیں پیدا ہوتے ہیں

سترہویں صدی کے اختتام پر جب (Microscope) (خوردبین) ایجاد ہوئی اور حشرات الارض کی وہ دُنیا نمایاں ہوئی جو خالی آنکھ سے قطعاً نہ دیکھی جا سکتی تھی تب پھر ایک بار خودرو طریقہ کا خیال مضبوط ہوا۔ (Spallanzani) نے اُس کی تردیدی دلایل و ثبوت پیش کئے اور بالآخر اٹھارہویں صدی کے وسط میں (Pasteur) نے اس خیال کا خاتمہ کر دیا۔

بعدہٗ یہ خیالات ظاہر کئے گئے کہ جاندار اجسام ہماری دُنیا کے علاوہ کسی دوسرے سیارے یا شہاب سے یہاں پہونچے ہوں گے۔ جب دو بڑے بڑے سیاروں میں تصادم ہوتا ہے تو اُنکا کچھ حصّہ تو پگھل جاتا ہے اور کچھ حصّہ اِدھر اُدھر جا گرتا ہے اس طرح قرین قیاس ہے کہ اُس ملبہ میں کچھ جاندار اجسام بھی شامل ہوں جو تصادم کے صدمہ سے بچے رہے ہوں اور ہماری دُنیا میں آ کر سرسبز ہوئے ہوں۔ جدید سائنس نے بھی تسلیم کیا ہے کہ چھوٹے چھوٹے حشرات الارض خودرو طریقہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ ایک طبقہ کا خیال یہ ہے کہ غیر جاندار اجسام سے ہی جاندار اجسام بنتے ہیں کیونکہ پودوں کا جسم غیر جاندار اشیاء (Carbon dioxide) پانی اور معدنی نمکیات سے بنتا ہے نہ کہ کسی ذی روح کے توسل سے۔ اس عمل کو جاری کرنے کی قوّت براہ راست آفتاب سے حاصل ہوتی ہے اور تمام جاندار دُنیا۔ پودے۔ جاندار۔ انسان وغیرہ کا دار و مدار (Chlorophyll) (پودوں میں سبز رنگ پیدا کرنے والا مادہ) پر ہے جس میں آفتاب سے حاصل کی ہوئی قوّت کو جذب کرنے کی صلاحیت ہے تاکہ اُس قوّت سے وہ حیرت انگیز مرکب تیار ہو سکے جس کا براہ راست تعلق زندگی سے ہے۔ بیسویں صدی میں پودوں کے متعلق بہت سی نئی نئی معلومات ہوئی ہیں جن کا سہرا فخر ہندوستان پروفیسر بوس کے سر ہے اور اب یہ امر مُسلمہ ہے کہ بجز حرکت و آواز کے ذی رُوح اجسام کی تمام علامات نمو پودوں میں پائی جاتی ہیں۔ یعنی (۱) بالیدگی (۲) ازدیاد (۳) تکمیل غذا (۵) تنفس (۶) نمود و انکشاف (۷) (Protoplasm) (مادہ حیات) کی موجودگی۔ (Protoplasm[1]) ایک حیرت انگیز مرکب ہے جس کو زندگی کے نام سے موسوم کیا جا سکتا ہے لیکن جس کو مذکورہ بالا اجزاء میں شامل کر کے (Protoplasm) بنانے اور اُس حیرت انگیز جزو کو کما حقہٗ پہچاننے میں سائنس قاصر ہے کیں سے یہ جواب ملتا ہے کہ زمین سرد ہونے پر مختلف عناصر کے خالص ذرّات جو پہلے بالکل پگھلے ہوئے تھے رفتہ رفتہ سرد ہو کر اور ایک دوسرے میں گھُل مل کر ایک گاڑھے قوام کی صورت میں تبدیل ہوئے جیسا کہ چند پہاڑوں میں (Silica) اور (Alumina) کے اجتماع سے ظاہر ہے۔ یہی وہ قوام ہیں جن کی موجودگی بے جان مُرکب اجسام میں پائی جاتی ہے اور جان پڑنے سے قبل کی حالت

---

[1] وہ مرکب جسمیں کاربن۔ ہائیڈروجن۔ آکسیجن۔ نائٹروجن۔ سلفر۔ فاسفورس کے علاوہ ایک ایسا حیرت انگیز جزو شامل ہے جسکو زندگی کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

میں زندگی کی بنیاد ہوتے ہیں۔ چنانچہ صورت حال جیسی جیسی تبدیل ہوتی رہی ویسے ہی انواع واقسام کے اجسام رونما ہوتے گئے اور موقع مناسب سے زندگی کا وجود بھی ہوا جس کا ثبوت جاندار مخلوق کی نقشوں سے ملتا ہے جو قدیم ترین پہاڑوں میں مدفون ملتی ہیں۔ چند اقسام کی شکر اور (Protein) جیسی کہ سرسبز پودے پیدا کرتے ہیں اور نیز (Cells) انہیں بے جان اجزا سے جنسے وہ قدرت کے ہاتھوں بنی ہیں سائنس دان اپنے کیمیا خانوں میں تیار کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ موجودہ صورت میں زندگی کی بنا، وہ قوت ہی جو روشنی سے حاصل ہوتی ہے۔ اس سے یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ جس زمانہ میں (Colloids) (گاڑھے قوام) پیدا ہو رہے تھے اور غالباً (Chlorophyll) کے وجود سے بہت پہلے وہ گاڑھے قوام روشنی سے متاثر ہوئے اور رفتہ رفتہ ان میں یہ صلاحیت پیدا ہوئی کہ ان سے پیچیدہ تر مرکبات پیدا ہو سکیں جن کے Molecules (چھوٹے سے چھوٹے ذرات) میں جاندار (Molecules) بھی شامل تھے۔ زندگی کے وجود کا مذکورہ بالا طریقہ نہ صرف ابتدائی زمانہ ہی سے متعلق ہے بلکہ آج دن بھی اسی طریقہ پر عمل ہو رہا ہے اور ماہرین سائنس کا خیال ہے کہ اگر کسی ارضی سماوی آفت سے زندگی کا وجود قطعاً کالعدم ہو جائے تب بھی اسی طریقہ سے زندگی کا وجود از سر نو قایم ہو جائے گا۔ اس کے ثبوت میں اس قسم کی دلایل پیش کیجاتی ہیں کہ ہم روزمرہ اپنی آنکھوں دیکھتے چلے آتے ہیں کہ اُدسر زمینوں اور پہاڑوں پر رفتہ رفتہ ہرے بھرے سبزہ زار لہلہا اٹھتے ہیں اور جانور وہاں اپنا گھر بنا لیتے ہیں۔ آگ لگنے یا آتش فشاں پہاڑوں سے جو خطے تباہ و ویران ہو جاتے ہیں وہ بھی زمانہ کے ہاتھوں سبزہ کے مخملی فرش سے مزین دیکھے جاتے ہیں۔

دورِ جدید

جناب بسمل الہ آبادی

اُپدیش دے رہا تھا برہمن یہ ریل میں
لڑنے میں وہ نہیں ہے جو ہے لطف میل میں

کالج میں کیا ملے گا ہمیں دین کا سبق
دُنیا پڑی ہوئی ہے وہاں پاس فیل میں

قیمتی وقت کے کھونے کا نتیجہ کیا ہے
جاگ کر سوچئے سونے کا نتیجہ کیا ہے

کہہ رہا ہے کوئی ہنس ہنس کے یہ ہم سے بسمل
آپ روتے ہیں تو رونے کا نتیجہ کیا ہے

فرانس کا دستوری نظام حکومت[1]

از ڈاکٹر خان بہادر سید نجم الدین احمد صاحب جعفری ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ ڈی

(۹) فرانس کی سیاسی پارٹیاں

چیمبر کے ماحول کا خاکہ پیش کرتے وقت ہم نے پارٹیوں اور وزارت کے تعلق کی طرف ایک سرسری اشارہ کیا تھا۔ اب ہم یہاں پر تفصیل سے کام لیتے ہوئے فرانس کی سیاسی پارٹیوں پر روشنی ڈالتے ہیں۔

فرانسیسی پارلیمنٹ میں پارٹیوں کی بڑی کثرت ہے۔ اور اسی سبب سے فرانس میں وزارت بہت غیر مستحکم رہتی ہے۔ اس ملک کا پارلیمنٹی طریق کار برطانیہ سے اخذ کیا گیا ہے لیکن عملاً فرانس کی پارلیمنٹ برطانوی پارلیمنٹ سے بہت مختلف واقع ہوئی ہے۔ برطانیہ میں وزارت ایوان کے سامنے جوابدہ اور اپنے طرز عمل کی ذمہ دار ہونے کے ساتھ ہی مستحکم بھی ہوتی ہے مگر فرانس میں وزارت کو ہر گھڑی شکست کا خطرہ لاحق رہتا ہے۔ بار بار اور جلد جلد نازک صورت حالات پیدا ہو جاتی ہے اور چیمبر اور حکومت کے درمیان تصادم ہوتے رہتے ہیں۔ انیسویں صدی کے وسط سے لیکر ۱۹۱۴ء تک انگلستان میں صرف بارہ وزیر اعظم بدلے گئے۔ اس کے برخلاف فرانس میں ۱۸۹۹ء سے لیکر ۱۹۱۴ء تک یعنی صرف پندرہ برس میں بارہ دفعہ وزارت تبدیل ہوئی۔ ۱۸۷۵ء سے لیکر ۱۹۱۴ء تک انگلستان میں صرف گیارہ وزارتیں قائم ہوئیں مگر فرانس میں اس عرصہ میں پچاس وزارتیں قائم ہو ہو کر ٹوٹ گئیں۔ ۱۸۷۵ء سے لیکر ۱۹۱۰ء تک کے درمیانی وقفے میں ہر چار سال بعد ایک وزارت ٹوٹتی رہی۔ ان اعداد و شمار سے معلوم ہوتا ہے کہ انگلستان میں ایک وزارت کم از کم چند برس تک تو زندہ رہنے کی توقع کر سکتی ہے اور اُسے یقین ہوتا ہے کہ اپنی بعض پالیسیوں پر عمل پیرا ہو سکے گی۔ اس کے برعکس فرانس میں وزرا کے سر پر ہر وقت خطرات منڈلاتے رہتے ہیں۔ وہ اصلاحات کا ایک وسیع پروگرام شائع تو کر دیتے ہیں مگر یہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ وہ اپنے وعدوں کی تکمیل کے لئے زیادہ عرصہ تک زندہ نہ رہ سکیں گے۔ اس طرح بعض اہم مسودے سالہا سال تک غیر فیصلہ کن حالت میں پڑے رہتے ہیں اور وزارتوں کے چراغ جلتے بجھتے رہتے ہیں۔

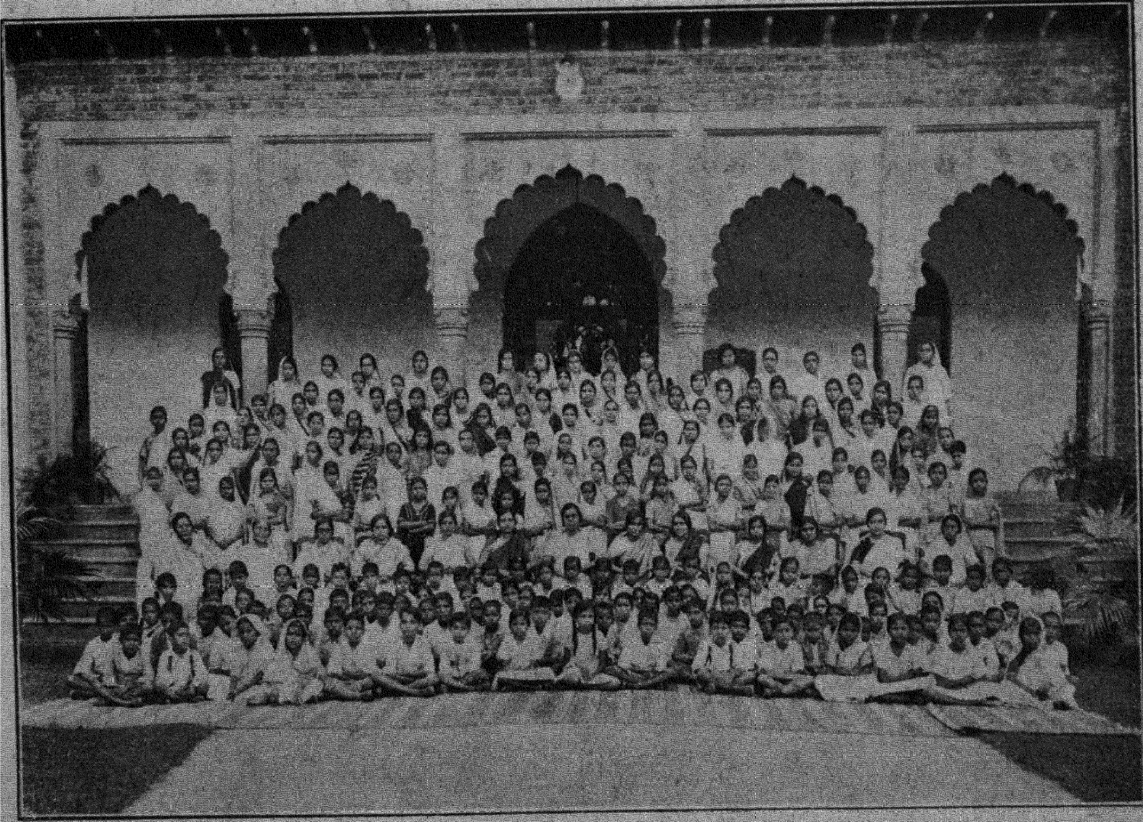
جیسا کہ ابتدا میں کہا گیا اس صورت حال کی سب سے بڑی وجہ پارٹیوں کی کثرت ہے۔ انگلستان میں بھی

---

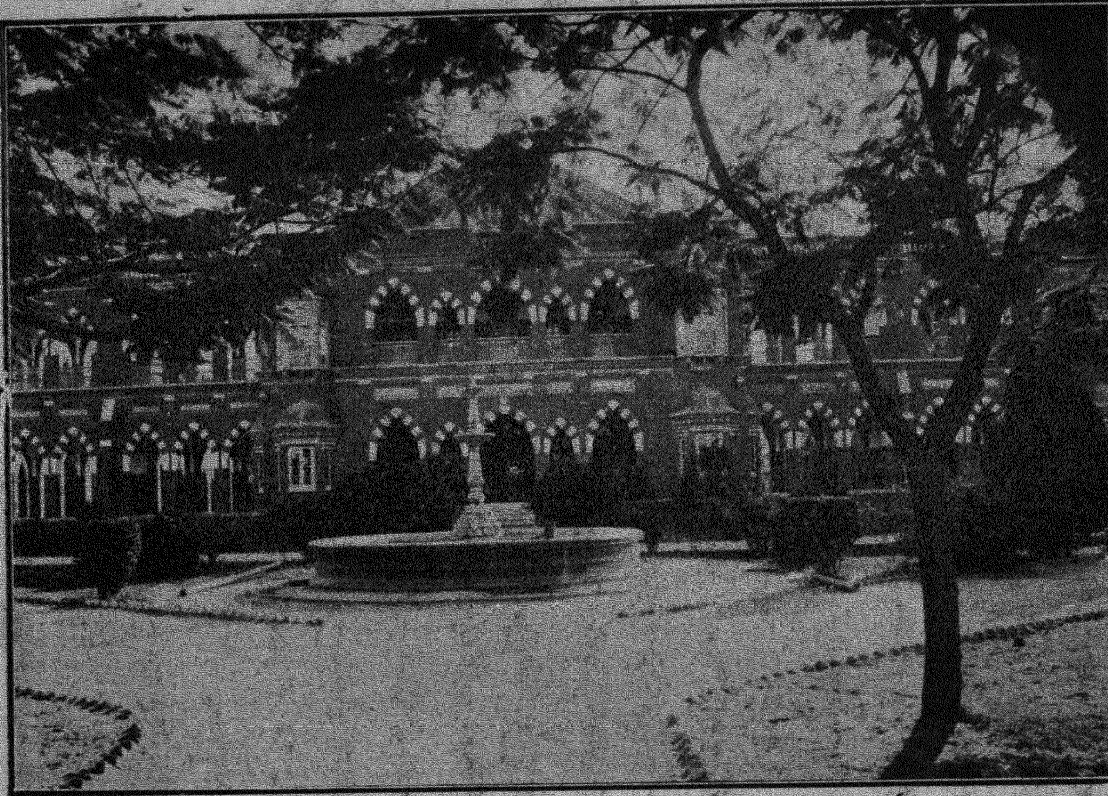
[1] سلسلہ کے لیے ملاحظہ ہو زمانہ جولائی ۱۹۳۶ء صفحہ ۲۰

بلاشبہ متعدد پارٹیاں ہیں۔ اور وہاں بھی بعض اوقات سیاسی الجھنیں کافی صبر آزما ثابت ہوتی ہیں۔ پھر بھی قوم کی سیاسی زندگی دو بڑی بڑی سیاسی پارٹیوں تک محدود رہتی ہے جن میں سے ہر پارٹی اپنی جگہ کافی قوت اور رسوخ کی مالک ہوتی ہے۔ اور اس طاقت کے بل پر حکومت چلاتی ہے۔ برخلاف اس کے فرانس میں کوئی ایک پارٹی کبھی اتنی قوی نہیں ہے کہ تنہا حکومت کا بوجھ سنبھال سکے اس لئے حکومت حاصل کرکے اُسے کامیابی کے ساتھ چلا سکنے کے لئے کئی اور پارٹیوں کی امداد حاصل کرنا پڑتی ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی حکومت ہمیشہ غیر مستقل رہتی ہے۔ پارٹیوں کی تنظیم کو دیکھا جائے تو ہر چند وہ ایوان کے اندر کم و بیش منظم ہوتی ہیں مگر ایوان کے باہر ان کا کوئی نظام نہیں اور نہ ملک میں ان کی شاخیں اس طرح پھیلی ہوتی ہیں جس طرح امریکہ اور انگلستان وغیرہ ممالک میں سیاسی جماعتیں منظم طور پر ملک کے ہر حصے میں کام کرتی رہتی ہیں۔ غالباً یہ کہنا صحیح ہوگا کہ ملک جماعتوں کی جگہ سیاسی رجحانات میں بٹا ہوا ہے۔ اگر ایک حصہ کلیسائی سامراج پسندوں کے ساتھ ہے تو دوسرا معتدل جمہوریت پسندوں سے ہم آہنگ ہے۔ تیسرا انتہا پسندوں کا ہمنوا ہے اور چوتھا سوشلسٹوں کے زیر اثر ہے۔ انگلستان میں تو قدامت پسند، لبرل اور لیبر پارٹیاں ملک کے ہر حصے میں اپنی شاخیں قائم کئے ہوئے ہیں اور پروپیگنڈا کرکے لوگوں کو اپنی پارٹی میں شامل کرنے کی کوشش کرتی رہتی ہیں۔ فرانس میں صورت حال اس کے بالکل برعکس ہے۔ یہاں شاخیں قائم کرنے کی ضرورت ہی نہیں۔ افراد ملک میں سے جو جو جس جس پارٹی کے خیالات سے متفق ہوتے ہیں اُس کے حق میں ووٹ دے دیتے ہیں۔ گویا انتخابات چار قسم کے رجحانات کے درمیان ایک جنگ ہوتے ہیں۔ کسی پارٹی کی طرف سے کسی اُمیدوار کو مالی امداد دی جا سکتی ہے یا کوئی پارٹی اس کی ہمت افزائی کر سکتی ہے لیکن امیدوار اپنے کو اس پارٹی کا نمائندہ ظاہر نہیں کرتا۔ مقامی کمیٹیاں صرف اسی لئے بنائی جاتی ہیں کہ ان کے توسط سے ممبران عوام تک پہونچکر اقتدار اور خطابات حاصل کریں اور اپنے احباب اور رشتہ داروں کو فائدہ پہونچائیں۔ ان کی غرض سیاسی اور انتخابی لڑائیاں لڑنا نہیں ہوتا۔

فرانس میں ۱۸۱۵ء میں پہلے پہل شہنشاہیت پسندوں اور جمہوریت پسندوں کے اختلافات کی بنا پر پارٹیاں ظہور میں آئیں۔ مگر ان دونوں میں سے کوئی ایک طبقہ بھی اس قسم کی کوئی پختہ اور کامیاب پارٹی نہیں بنا سکا جیسی انگلستان کی پارٹیاں ہیں۔ ۱۸۴۸ء کے بعد سے جب شہنشاہیت قطعی طور پر اُڑا دی گئی جمہوریت پسندوں کو عروج حاصل ہونا شروع ہوا۔ ہر چند زوال شہنشاہیت کے بعد جتنے جمہوری نظام قائم ہوئے وہ صحیح معنوں میں جمہوریت قائم نہیں کر سکے مگر جہاں تک حالات کا تعلق ہے جمہوریت پسندوں ہی کے اصول فروغ پاتے گئے۔ ۱۸۷۱ء کی نمائندہ اسمبلی عقیدے کی رو سے شہنشاہیت پرست تھی اور اس میں شہنشاہیت پرستوں اور جمہوریت پسندوں کی ۵ اور ۳ کی نسبت تھی۔ مگر اس وقت ان دونوں مختلف الخیال لوگوں کی کوئی مضبوط اور پختہ سیاسی پارٹیاں نہیں تھیں صرف غیر منظم سیاسی گروہ تھے جو ایک دوسرے سے حسد کرتے تھے۔ شہنشاہیت پسند مثلاً (LEGITIMITS)



پریم ودیالیہ دیال باغ یعنی لڑکیوں کا ہائی سکول



رادھاسوامی ایجوکیشنل انسٹی ٹیوٹ کی شاندار عمارت
امسال انسٹی ٹیوٹ ھذا کا طالبعلم انٹرمیڈیٹ کے امتحان میں یو-پی-بھر میں اول رہا

بربن (BOURBON) اور بونا پارٹسٹ (BONAPARTIST) نامی گروہوں میں بٹے ہوئے تھے۔ جمہوریت پسند نسبتاً زیادہ متحد تھے۔ مگر ان میں بھی تین جماعتیں تھیں۔ انتہا پسند دایاں بازو (EXTREME LEFT) دایاں بازو (LEFT) اور مرکزی دایاں بازو (CENTRE LEFT) اور شہنشاہیت پسندوں کی شدید مخالفت کی موجودگی میں بھی یہ جماعتیں اشتراک عمل نہیں کر سکتی تھیں۔ چیمبر میں ابتدا ہی سے جمہوریت پسندوں کو غلبہ حاصل تھا۔ ۱۸۷۵ء میں فرانس میں جمہوری آئین نافذ ہوا اور ملک میں مقبولیت حاصل کرتا گیا۔ سیاسی پارٹیوں کی باہمی رقابت بھی کم ہوگئی اور شہنشاہیت پسندوں نے جو جمہوری حکومت کے مخالف ہونے کی وجہ سے ریڈیکل کہلاتے تھے اپنی پارٹی کا نام قدامت پسند پارٹی رکھ لیا۔

اس اثنا میں جمہوریت پسندوں میں بھی بڑی اہم تبدیلیاں ہو چکی تھیں۔ کچھ نہیں تو بھی جمہوریت پسند چیمبر کے اندر سات گروہوں میں بٹے ہوئے تھے اور یہ سات گروہ ایک ساتھ کوئی کام نہیں کر سکتے تھے تاوقتیکہ مخالفوں کی طرف سے شدید مخالفت کی صورت میں دباؤ نہ پڑے۔ ۱۸۸۱ء میں اپنے لیڈر گمبٹا (GAMBETTA) کے انتقام پر انتہا پسند دائیں بازو والے جمہوریت پسندوں سے الگ ہوگئے اور انہوں نے ایک جداگانہ پارٹی بنا کر اس کا نام ریڈیکل پارٹی رکھ لیا۔ اس کے بعد پارلیمنٹ میں تین سیاسی گروہ ہوگئے۔ قدامت پسند، جمہوریت پسند اور ریڈیکل۔ ان میں سے کوئی ایک پارٹی کبھی تن تنہا حکومت کا بوجھ نہیں سنبھال سکی اور ہمیشہ دو پارٹیوں کے اشتراک سے کام چلا۔ اب سیاسی پارٹیوں میں صرف برائے نام تفریق ہے کیونکہ آجکل کے قدامت پسندوں میں شہنشاہیت کی تائید کا کوئی جذبہ نہیں پایا جاتا اور جمہوریت پسندوں میں بھی ہر خیال کے لوگ شامل ہیں۔

سوشلسٹ پارٹی

گو حقیقت میں بہت پہلے سے فرانس میں سوشلزم کے عقائد کی پرورش ہو رہی تھی۔ مگر پارلیمنٹ میں سوشلزم کا حامی عنصر سب سے پہلے ۱۸۹۳ء میں داخل ہوا۔ جب انتخابات میں سوشلسٹوں کے پانچ لاکھ کے قریب ووٹ پڑے اور چیمبر میں چالیس سوشلسٹ ممبر ہو کر آئے۔ ۱۸۹۷ء تک سوشلسٹ متحد ہو کر کام کرتے رہے۔ ۱۸۹۹ء میں یہ سوال پیدا ہوا کہ آیا ایک سوشلسٹ لیڈر ملیرانڈ کو وزیر تجارت کا عہدہ قبول کرنا چاہیے یا نہیں؟ اس سوال پر سوشلسٹوں کی پارلیمنٹی جماعت میں انتشار ہوگیا۔

سن ۱۹۰۱ء سے ۱۹۰۵ء تک سوشلسٹوں میں دو پارٹیاں تھیں۔ ایک کارل مارکس کے فلسفے کی حامی تھی، دوسری دیگر جمہوریت پسندوں سے اشتراک عمل کر کے ان میں سوشلزم کا پرچار کرنا چاہتی تھی۔ ایمسٹرڈم میں ۱۹۰۴ء میں سوشلسٹوں کی کانگریس ہوئی اور دوسری پارٹی کے عقیدے کے خلاف تجویز منظور ہوگئی۔ اس سے سوشلسٹوں کے اتحاد کے لئے میدان صاف ہوگیا۔ ۱۹۰۵ء میں روئین کے مقام پر کانگریس ہوئی اور متحدہ سوشلسٹ پارٹی (UNITED SOCIALIST) پارٹی کا قیام عمل میں آیا جس کے بنیادی اصول یہ تھے۔

(۱) سوشلسٹ پارٹی ایک جماعتی پارٹی قرار دی گئی اور اُس کا مقصد ذرائع پیداوار و تبادلہ میں سوشلزم کا اثر داخل کرنا قرار پایا۔

(۲) پارلیمنٹ کے سوشلسٹ ممبروں کے متعلق طے ہوا کہ وہ بورژوا اور پارٹیوں کے خلاف ہوں گے اور وہ اِن وسائل کے قیام میں اپنی طرف سے کوئی امداد نہ دیں گے جن سے بورژوا کا پارلیمنٹ میں غلبہ ہو۔

(۳) سوشلسٹ مزدور جماعت کے حقوق اور ان کی آزادی کے لئے جدوجہد کریں گے۔

(۴) پالیسی اور اصولوں کے متعلق اخبارات میں اظہار رائے کی پوری آزادی ہوگی۔

(۵) مگر یہ رائیں ہر حال میں سوشلسٹ مطبوعات اور نیشنل کانگریس کے فیصلوں کے مطابق ہونگی۔

یونائیٹڈ سوشلسٹ پارٹی کا اثر و رسوخ بہت جلد بڑھ گیا اور روز بروز اسے غیر معمولی اکثریت حاصل ہوتی گئی۔ اس لئے کہ اپنے بنیادی اصولوں پر کامیابی کے ساتھ عمل پیرا ہوسکے، یہ پارٹی تمام صنعتی جماعتوں کو متفق رکھتی ہے کچھ عرصہ سے فرانس میں سوشلسٹ پارٹی کو حیرت انگیز طور پر تمام فرقوں اور پیشوں میں غیر معمولی ہر دلعزیزی حاصل ہے۔ بہت سے تعلیم یافتہ دولتمند اور صاحب حیثیت افراد سوشلسٹوں کے ہمنوا ہیں۔ متعدد سوشلسٹ لیڈر ایسے ہیں جو بورژوا طبقے کے ہیں مگر سوشلسٹوں کی قیادت کر رہے ہیں۔ سیاسی عقائد کے اعتبار سے سوشلسٹ جنگ کے خلاف ہیں مگر جب جنگ عظیم کا آغاز ہوا اور جرمنی کی طرف سے فرانس پر حملے کا خطرہ یقینی ہوگیا تو ایک مشترکہ وزارت ترتیب دی گئی جس میں سوشلسٹ بھی شریک ہوئے۔ جب تک جنگ عظیم جاری رہی، یہ وزارت قائم رہی۔ مگر ۱۹۱۷ء میں سوشلسٹوں کی ایک جماعت کی مخالفت نے اِس وزارت کو ٹوٹنے پر مجبور کر دیا۔ اس کے بعد ایک اور مشترکہ وزارت بنی۔ اسکو سوشلسٹوں کا بھی اعتماد حاصل تھا۔ تاہم سوشلسٹوں کی طرف سے مخالفت جاری رہی اسی ڈھنگ سے ۱۹۲۰ء تک کئی کئی وزارتیں بن کے بگڑ گئیں۔

جنگ عظیم کے دوران میں چونکہ تمام قوم کی توجہ ملکی حفاظت پر مرکوز تھی۔ سیاسی پارٹیوں کو آپس کے جماعتی حسد کے اظہار کا کوئی موقع نہ ملا۔ لیکن جنگ عظیم کے خاتمے پر جماعت بندی کے جذبے نے پھر جوش مارا۔ ریڈیکل سوشلسٹ پارٹی تو تجدید کی سعی میں ہی ختم ہوگئی۔ البتہ یونائیٹڈ سوشلسٹ پارٹی نے اپنا کھویا ہوا وقار بڑی حد تک حاصل کر لیا چند نئی پارٹیاں بھی اسی اثنا میں عالم وجود میں آگئیں۔ ایک کا نام جدید جمہوریت (DEMOCRATIC NOUVELLE) تھا۔ اس نے وزرا پر جو غیر ضروری حملے ہوا کرتے تھے اُن پر اعتراض کیا۔ اور یہ مطالبہ کیا کہ آئین ساز اور انتظامی جماعتوں کو ایک دوسرے سے بالکل علیحدہ کر دینا چاہیئے۔ اس کے ساتھ ہی اس پارٹی نے بالشوزم کی مذمت کی ایک اور پارٹی اپنے آپ کو جمہوریت چہارم (FOURTH REPUBLIC) کہتی تھی۔ یہ حکومت اور انتظامی شعبوں کی تنظیم چاہتی تھی۔ ایک اور پارٹی دی بلوک نیشنل ری پبلک جمہوریت پسندوں اور ریڈیکل سوشلسٹوں کی مرکب ہے

ایک تیسری پارٹی یونین رپبلکن ایٹ ڈیموکریٹک UNION REPUBLICAINE ET DEMOCRATIQUE ز
یونائٹڈ سوشلسٹوں اور بلوک نیشنل پارٹی کے بین بین ہے۔

موجودہ حکومت فرانس "متحدہ محاذ" یعنی کئی پارٹیوں کے اشتراک عمل پر قائم ہے جن کی پشت پر فرانس کی رائے عامہ ہے۔ یہ پارٹیاں اپنے مختلف عقیدوں کے لحاظ سے اکثر ٹکرا جاتی ہیں مگر وزارت کے سرعسکر مسٹر ایم بلوم اپنے سیاسی تجربہ اور دانشمندی سے وزارت کو خطرات میں سے محفوظ رکھے ہوئے ہیں۔؎

شاعر کی جنّت

(از حضرت مدہوش۔ ایم۔ اے)

جذب کر لونگا میں اُس کے حُسنِ لامحدود کو | توڑ دونگا اس طلسمِ شاہد و مشہود کو
مجھکو حورانِ بہشتی کیسے بھرما جائینگی؟ | ایک شاعر کی نگاہیں اور دھوکا کھائینگی؟
دور بیں آنکھیں مری ہو جائینگی محدود بیں؟ | توبہ توبہ جی نہیں ہرگز نہیں ہرگز نہیں
جو ہے شاعر کی نگاہوں میں وہ جنّت اور ہے | اُس کا عالم اور ہے اُس کی حقیقت اور ہے
اُس کی جنّت میں ہیں دونوں ناظر و منظور ایک | حُسنِ خود مختار و عشقِ بے بس و مجبور ایک
حُسن لامحدود میں ہے شانِ عشقِ بے کنار | ہے نمایاں عشق کے پہلو میں حُسنِ تابدار
حُسن کی کروٹ میں جذبہ عشق کا روندا ہوا | عشق کی بیداریوں میں حُسن ہے سویا ہوا
ہے یہ وہ دُنیا جہاں ہیں حامد و محمود ایک | ہے دوئی عنقا وہاں ہیں ساجد و مسجود ایک
عاشق و معشوق میں ہوتا نہیں کچھ امتیاز | ہو کے رہتے ہیں وہاں ہم رنگ محمود و ایاز
دُودھ کی نہریں نہیں اور چشمۂ کوثر نہیں | صرف جوہر عشق کا ہے خاک و خاکستر نہیں

ذرّہ ذرّہ عالمِ شاعر کا ہم آہنگ ہے
واں رباب و عود سے ہم ساز سازِ چنگ ہے

؎ اس مضمون کے لکھنے کے بعد مسٹر بلوم کی وزارت بھی ختم ہوگئی اور اب وہ نئی سوشلسٹ وزارت میں وزیر مال ہیں

طلسمِ زندگی

از حضرت احسان دانش صاحب کاندھلا

صبحدم اِک دن فلک پر ہلکا ہلکا ابر تھا
رقص کرتی تھی فضاؤں میں ہوائے جاں فزا

پھول کی ہر ایک پتّی پر تھا فطرت کا نکھار
دل پہ جادو کر رہے تھے رنگ و بوئے لالہ زار

دفعتاً چمکی اُفق پر مہر کی پہلی کرن
جگمگا اُٹھی گلابی بدلیوں کی انجمن

آشیاں میں چہچہائی بلبلِ شیریں نوا
نرم و نازک ڈالیوں نے شکر کا سجدہ کیا

جسم میں پھونکی ہوئی تھی صبح نے روحِ بہار
جس طرح ساون کی پچھلی رات میں چھت پر پھوار

یا کہیں کہسار کے دامن میں شغلِ مے کشی
یا لبِ جُو چاندنی میں میٹھی میٹھی راگنی

یا کھلے میداں میں جب ہو چودھویں شب جلوہ گر
بانسری کی نیم گرم آواز کا دل پر اثر

میں تھا سرتاپا غریقِ نشۂ زارِ حسنِ دوست
خارزاروں میں جھلکتی تھی بہارِ حسنِ دوست

جا رہا تھا والہانہ طرز سے گاتا ہوا
اشرف المخلوق کہلانے پہ اِتراتا ہوا

تھی مرے دائیں طرف گورِ غریباں کی زمیں
جسمیں زیرِ خاک سوتے تھے ہزاروں نازنیں

پاس کونے کی طرف برگد کے سائے کے قریب
جب نظر اُٹھی تو دیکھا ماجرائے غم عجیب

آنسوؤں کی بارشوں میں فاتحہ کے شور میں
اِک جواں میّت اُتاری جا رہی تھی گور میں

رُو نمائی کے لئے جب وا کئے بندِ کفن
تلملا اُٹھی مری عبرت کی غافل انجمن

دل یہ بولا آہ بس یہ ہے مآلِ زندگی
اُڑ گیا اِک آن میں رنگِ جمالِ زندگی

اُڑ گئی غم خانۂ دل سے مسرت کی جھلک
چھن گیا آنکھوں کا جادو لُٹ گئی رُخ کی دمک

مٹ گیا زعمِ جوانی کُھل گیا رازِ شباب
زندگی ہے رہگزاروں میں کسی پیاسے کا خواب

طبع پر جسکی گراں کل تک تھی ہمرازوں کی بات
سرنگوں ہے آج وہ پیشِ اصولِ کائنات

اسکی اُمیدوں کا دنیا میں کوئی والی نہیں
اسکے سانسوں کو فضاؤں میں جگہ خالی نہیں

طنطنہ اس کا گھٹاؤں کی گرج میں کھو گیا — رعب کا شعلہ جلالِ برق میں گم ہو گیا
رُک گئی ساحل پہ جا کر کشتیِ عمرِ عزیز — چُپ ہے کیوں یہ خاک کا پتلا کہاں گم ہے تمیز
یہ وہ شعلہ ہے جسے گردوں دبا سکتا نہ تھا — اب کھُلا! موجِ فنا کی تاب لا سکتا نہ تھا
آنکھ سے جاتے رہے موجِ نظر کے پیچ و تاب — اب نہیں چھِڑتا ارادوں سے تکلم کا رباب
الوداع اس کو غرور و ناز و عشوہ کہہ گئے — شہپرِ مرغِ تکلم قطع ہو کر رہ گئے
مطلعِ ہستی پہ ابرِ نیستی چھا کر رہا — ذرہ ذرہ اپنے مرکز کی طرف جا کر رہا
کل جو گویا تھا وہ سب بھولا ہوا ہے قیل و قال — دیکھ! آنکھیں کھول! یہ ہے زندگانی کا مآل!!!
نزع کے ٹھنڈے پسینوں میں تبسم بہہ گئے — دل کی شریانوں میں جذبے سرد ہو کر رہ گئے
کل تھا جس کی گفتگو میں خود ستائی کا وفور — آج اس کی عاجزی پر خون روتا ہے غرور
کِھل کے فوراً زندگانی کی کلی مرجھا گئی — شوق کے ذی روح نغموں پر خموشی چھا گئی
خود نمائی کا سفینہ غرقِ دریا ہو گیا — بھولے بھالے! یہ ہے انجامِ حیاتِ بے وفا

جینے والے زندگی ملتی ہے مرنے کے لئے
شرم! آئینہ اُٹھاتا ہے سنورنے کے لئے

خیالاتِ پریشاں

(از مسٹر شایق ہندو)

لرزاں ہے اُن کے دستِ نگاریں میں جامِ مے — جلوہ طرازیِ یدِ بیضا لئے ہوئے
ہم اور زندگی کا ہر اک نفسِ مستعار — وہ اور عذرِ وعدۂ فردا لئے ہوئے
زاہد ہے میکدہ میں بھی تابشِ وہ طور کی — لیکن حجابِ ساغر و مینا لئے ہوئے
دل کو غمِ دوام کی دولت نصیب ہو — آئی ہے موتِ مرگ کا مژدہ لئے ہوئے
ہے کچھ فضائے ابر میں میخانہ کا فروغ — شانِ نمودِ وادیِ سینا لئے ہوئے
تجدیدِ حرفِ شوق تھی ہر اک نگاہِ شوق — ہم رہ گئے حجابِ تقاضا لئے ہوئے

دیال باغ

ایک واقف حال کے قلم سے

دیال باغ جس کا ترجمہ بزبان اُردو "ریاض رحیم" ہوگا، شہر آگرہ سے ایک میل کے فاصلہ پر رادھا سوامی مذہب کے پیروان کی ایک حیرت انگیز بستی ہے۔ جو ایک نئی تہذیب کا نمونہ پیش کر رہی ہے جنوری ۱۹۱۵ء میں ۴۰ ایکڑ زمین خریدی گئی اور ایک شہتوت کا پودا لگا کر اس نئی بستی کی بنیاد رکھی گئی۔ عقیدتمند رادھا سوامیوں کے حسن خلوص وایثار سے بہت جلد توسیع و ترقی ہوئی چنانچہ اس وقت اس کا رقبہ تین ہزار ایکڑ اور اس کی آبادی اکتیس سو نفوس پر مشتمل ہے۔ جس میں ۹۶۰ طالب علم ہیں۔ اِس کی تعمیر کا کام مبلغ ۵ ہزار کی قلیل رقم سے شروع کیا گیا تھا۔ یہ رقم ستّوا راوت کیشوں نے فی کس پچاس روپیہ پیش کر کے فراہم کی تھی لیکن اب تک آراضیات، مکانات و کارخانہ جات پر ۵۶ لاکھ ۸۶ ہزار ۶ سو روپیہ صرف ہو چکا ہے۔

عمارتوں کی تعمیر میں چاہے وہ عمارتیں سکونتی ہوں چاہے دفتروں اور مختلف ادارات کی ہوں یہ بات خاص طور پر ملحوظ رکھی گئی ہے کہ بین المکانات تنگی نہ ہو، گلیاں اور سڑکیں کشادہ رہیں۔ ہوا اور دھوپ کی آمد و رفت میں رُکاوٹ نہ ہو۔ المختصر حفظان صحت، ترتیب، خوشنمائی، و دلکشی کے اصولوں کو پیشِ نظر رکھ کر کام کیا گیا ہے۔ پبلک انسٹی ٹیوشنز جدا گانہ احاطوں میں قائم کئے گئے ہیں۔ اور سکونتی مکانات علیحدہ مقامات پر بنائے گئے ہیں۔ ساکنان دیال باغ اور رادھا سوامی مذہب کے زائرین کی زندگی کو کامیاب و خوشگوار بنانے کے لئے اندرون نو آبادی ضروریات زندگی اور جملہ سہولتیں مہیّا کرنے کی کوشش کی گئی ہے چنانچہ بجلی گھر، واٹر ورکس، آٹا تیل کی چکیاں، فارم، فیکٹریاں، ہسپتال اور اسٹور وغیرہ قائم کئے گئے ہیں صاف سڑکیں اور دو رویہ سرسبز سایہ دار درخت، خوبصورت باغات، شفاف فوارے، کھیل کے کشادہ میدان، بہشت بریں کا نقشہ جما رہے ہیں۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ؎

اگر فردوس بر روئے زمین است
ہمین است و ہمین است و ہمین است

اِس نو آبادی میں آرٹس، سائینس، دستکاری، میکنیکل، الیکٹریکل اور آٹو موبائیل انجنیرنگ کی تعلیم دینے کے لئے اسکول اور کالج اور عملی تعلیم کے لئے مشین شاپ اور فیکٹریاں موجود ہیں۔ روپیہ کے لین دین کے لئے بنک۔ نو آبادی کے اخباروں اور کتابوں کی اِشاعت کے لئے پریس، یتیموں اور بیکسوں کیلئے

آشرم، لڑکیوں کی تعلیم کے لئے گرلز ہائی اسکول، حاملہ عورتوں کے لئے جدید ترین لوازم سے آراستہ، زچہ خانہ، زراعتی فارم، دودھ، مکھن، کریم بہم پہونچانے کے لئے ایشیا بھر میں بے نظیر ڈیری کا اہتمام کیا گیا ہے۔ اس بہشتی فضا میں زاید از تین ہزار یارانِ طریقت عشق الٰہی میں سرشار۔ اپنے مرشد کے احکام پر گوش برآواز اور ہر فرمان پر کاربند ہو کر کچھ ایسی زندگی بسر کر رہے ہیں کہ انھیں دین و دنیا دونوں کی نعمتوں کا لطف حاصل ہے دیال باغ کی فضا میں چاروں طرف سکون چھایا ہوا ہے اور پریم برستا ہے۔ غرض ع بہشت آنجا کہ آزارے نہ باشد والا مضمون پوری طرح صادق آتا ہے۔

اس نوآبادی کی اقتصادی سرگرمیوں کا اس بات سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس کساد بازاری کے زمانہ میں بھی ۱۹۳۶-۳۷ء میں مبلغ چھ لاکھ چھیالیس ہزار پانچسو پچپن روپیہ کی قیمتی اشیا کی برآمد ہوئی۔ بہ مقابلہ آمد مبلغ تین لاکھ ترانوے ہزار چھ سو اٹھاون دوران سال ۱۹۲۶-۲۷ء سال گذشتہ میں دیال باغ کے فارموں اور فیکٹریوں نے دس لاکھ اکیاون ہزار سات سو تیس روپیہ کا مالیتی سامان بنا کر فروخت کیا۔ تنخواہ دار ملازمین و مزدوروں کی تعداد میں بھی بڑا اضافہ ہوا ہے۔ اور یہ معمولی بات بھی نہیں کہ اس بے روزگاری کے وقت قریباً دو ہزار نفوس کے کسب معاش کا اہتمام اس نوآبادی کے اندر ہو گیا ہے۔ تقریباً چھتیس ہزار روپیہ ماہانہ تنخواہوں میں صرف ہوتا ہے۔

اس وقت دیال باغ میں پچاس قسم کی صنعتیں جاری ہیں۔ کارخانہ ماڈل انڈسٹریز میں بجلی کے پنکھے، بجلی کے اسٹوو د چولھے، گھڑیاں، گراموفون۔ کالجوں ہسپتالوں کے اوزار۔ لیبوریٹری کے ترازو اور روزن۔ بیالوجی کے ماڈل، فونٹین پن، نلری کا سامان، چاقو وغیرہ، نب، سیاہی، بٹن، کھلونے، لالٹین، آٹا پیسنے، آلو چھیلنے کی کلیں، دس ہارس پاور کے موٹر وغیرہ تیار ہوتے ہیں۔ لیدر ورکنگ اسکول میں طلبار کو چرمی اشیا بنانے کی تعلیم دی جاتی ہے اور لیدر گڈس فیکٹری میں بوٹ شوز، سوٹ کیس وغیرہ ہر قسم کا چرمی سامان تیار ہوتا ہے۔

ٹیکسٹائل فیکٹری میں سوتی، ریشمی، مرسرائیزڈ اور اونی کپڑے، دھوتیاں، ساریاں، رومال، تولیئے وغیرہ چار سو قسم کے پارچہ جات تیار ہوتے ہیں۔ کارخانہ انگریزی چرم اور ٹینریز بھی سرعت کے ساتھ ترقی پذیر ہیں۔ کارخانہ کے ملازمین کے لئے رہائشی مکانات کا مناسب بندوبست کیا گیا ہے اور دیگر سہولتیں مہیا کی گئی ہیں۔

مشہور صحیفہ نگار پال برنٹن اپنی تصنیف A search in secret India. میں دیال باغ کے متعلق دیگر باتوں کے لکھتے ہیں کہ:—

میں نے سر عمارت میں مزدوروں کو نہ صرف آسودہ و مطمئن پایا بلکہ انھیں سرگرم کار اور پرجوش دیکھا۔

ایسی جگہ ٹریڈ یونین کا قائم نہ کرنا واقعی سخت بے عنوانی بلکہ ستم ظریفی ہوگی۔ ہر شخص اپنا کام اعلیٰ ہو یا ادنیٰ
اس طرح انجام دیتا ہے گویا وہ اُس کے لئے ذریعہ مسرت ہے۔"

رادھا سوامی مذہب کے پیروان کے مرحوم پیر مُرشد عرش مکانی سر صاحب جی مہاراج قدس سرہٗ کے فرمان کے بموجب مجلس انتظامیہ اس اصول پر کاربند ہے کہ سوائے گورنمنٹ کے "ست سنگ" کے حلقہ کے باہر کسی شخص سے کسی قسم کی مالی امداد منظور نہ کی جائے چنانچہ متعدد غیر ملکی سیاحوں نے لاکھوں کی رقمیں پیش کیں لیکن بہ شکریہ۔ انکار کر دیا گیا۔ دیال باغ کے اسکولوں اور کالجوں میں ہر طبقہ کے طلبا بلا لحاظ قوم و ملت بھرتی کئے جاتے ہیں چنانچہ بتاریخ یکم اگست ۱۹۳۵ء کے طلبار کا شمار حسب ذیل تھا۔

انٹرمیڈیٹ کالج	ست سنگی	۲۶۴	دیگر	۱۱۹
ٹکنیکل کالج	ست سنگی	۴۲	دیگر	۵۰
لیدر ورکنگ اسکول	ست سنگی	۹	دیگر	۱۹
گرلز ہائی اسکول	ست سنگی	۲۶۰	دیگر	۲۹

ملازمین کا شمار و تقسیم حسب ذیل تھی:۔

ست سنگی ۳۶۷، دیگر ۱۹۶ جن میں قریباً دو تہائی مسلمان۔ جملہ ملازمین کو بلا لحاظ تفریق مذہب یکساں حقوق حاصل ہیں۔

رادھا سوامی مذہب کے پیروان کی یہ سرگرمیاں کسی دنیوی مفاد یا حصول دولت کی غرض سے نہیں۔ جس پروگرام کی تکمیل میں وہ منہمک ہیں وہ اس جد و جہد اور خدمت خلق کو رضائے ایزدی اور اطاعتِ فرمان مُرشدی سمجھتے ہیں۔ اِس لئے یہ مالک کی خوشنودی کے طالب بے غرض خدمات حسنہ و مساعیِ جمیلہ میں لگے ہوئے ہیں اور اُن کا اصول یہ ہے ۔ رباعی

جو فرض ہے کر اور پریشان مت ہو انکار سے تو دست و گریباں مت ہو
کر سعی عمل لطف اطاعت کے لئے اندیشۂ انجام میں غلطاں مت ہو (رئیس)

اُنہوں نے اپنے عقل و دانش کے زعم پر نہیں بلکہ مالک کے لُطف و کرم کا آسرا لے کر کام شروع کیا مگر اپنی طرف سے جانفشانی میں کوئی کسر نہ چھوڑی نتیجہ یہی ہوا ع۔

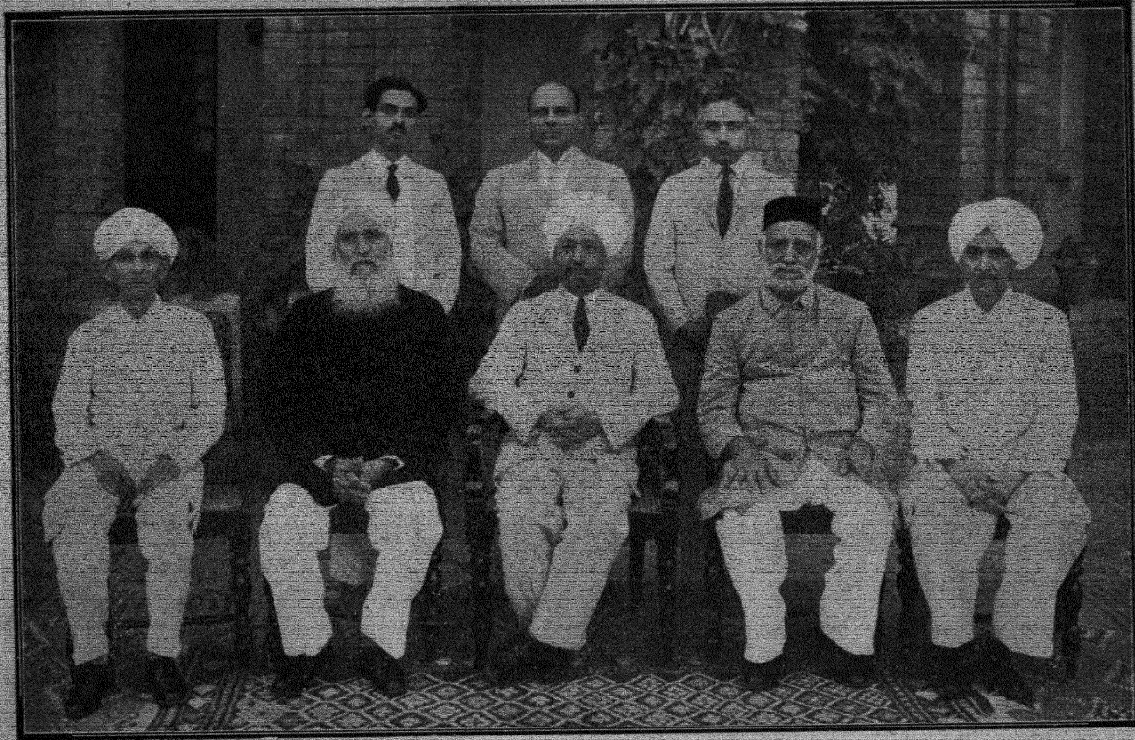
ہمتِ مرداں مددِ خدا

غور فرمائیے کہ جنوری ۱۹۱۷ء میں کچھ عمارات تیار ہونے پر دیال باغ میں اوّل اوّل ایک معمولی اینگلو ورنیکلر مڈل اسکول جاری کیا گیا۔ اور اسی سال ماہ اکتوبر میں مبلغ ۴ ہزار کے



سرن آشرم هسپتال دیال‌باغ جہاں غربا کا علاج مفت کیا جاتا ہے -

Blocks printed at the Dayalbagh Press, Dayalbagh.



بائیں سے دائیں جانب (بیٹھے ہوئے)— مسٹر وی۔ مادھوراؤ نیڈو ایم۔اے۔ مسٹر برجباسی لال بی۔اے۔ایل ایل۔بی۔
مسٹر گورچرنداس مہتہ (رائے صاحب) بی۔اے۔سی۔ای۔ مسٹر نہالچند گدومل بی۔اے۔ایل ایل۔بی۔ مسٹر سندرداس۔
دائیں سے بائیں جانب (کھڑے ہوئے)— مسٹر بولچند ٹیکچند بی۔اے۔ایل ایل۔بی۔ مسٹر مصری لال ایم۔اے۔ایل۔ٹی۔
مسٹر سنت پرشاد مدھوش ایم۔اے۔ (سکریٹری)۔

سرمایہ سے ایک چھوٹا سا کارخانہ قائم ہوا۔ کارخانہ میں صرف چمڑے کے بٹن تیار کئے جاتے تھے۔
خوش قسمتی سے یہ بٹن افسران محکمہ فوج کو پسند آئے اور جلد ہی کارخانہ کو ایک اچھا آرڈر مل گیا کارخانہ ۲۴ گھنٹہ کام کرنے لگا دن رات دماغ سوزی کر کے متعدد نئی کلیں ایجاد کی گئیں۔ شروع میں بٹن بنانے کے لئے نیا چمڑا استعمال کیا جاتا تھا اور چمڑے کا بھاؤ چڑھ جانے سے نہایت قلیل نفع کی گنجائش تھی مگر ماہ جنوری ۱۹۱۸ء میں ایک تو بہت بڑا آرڈر مل گیا۔ ادھر اس کریم کارساز کی رحمت سے اچانک چمڑے کی کترنوں سے جو بازار میں بشرح ۲/ روپیہ فی من دستیاب ہوتی تھیں بٹن بنانے کی ترکیب نکل آئی۔ پھر کیا تھا تین ماہ کے اندر کارخانے کو ڈیڑھ لاکھ روپیہ کا منافع ہو گیا۔ چونکہ ان دنوں پونڈ کی قیمت صرف ۱۰ روپیہ تھی اس لئے نصف رقم فوراً انگلینڈ بھیج کر قریباً ایک لاکھ روپیہ کی مالیتی کلیں خرید لی گئیں اور ۱۹۲۱ء تک یہاں ایک معقول کارخانہ قائم ہو گیا۔ تھوڑے ہی عرصہ میں مالی سہولتیں مہیا ہونے پر منتظمان اطمینان کے ساتھ اپنے سابقہ پروگرام کی تکمیل میں منہمک ہو گئے۔

دیال باغ ذات پات کے جھگڑوں بکھیڑوں سے پاک و آزاد ہے۔ سول میرج ایکٹ کے ماتحت بلا لحاظ ذات آپس میں شادیاں ہوتی ہیں۔ یہاں کی انتظامیہ کونسل رادھا سوامی فرقہ کے ۸ منتخب ممبروں پر مشتمل ہے۔ اس کا سکریٹری دیال باغ ڈسٹرکٹ کے لئے گورنمنٹ کی طرف سے ایکٹ مذکور کے ماتحت شادیوں کے لئے رجسٹرار ہے۔

دیال باغ میں پیشوایان مذہب کی یادگاریں میں سال میں چار بھنڈارے ہوتے ہیں۔ جن میں ہزاروں مرد و زن بلا لحاظ ذات یکجا کھانا کھاتے ہیں۔ رادھا سوامیوں میں ایک قابل تحسین رواج یہ ہے کہ ہفتہ میں ایک دن ہر ست سنگی کسی نہ کسی ست سنگی کو دعوت طعام دیتا ہے جو اس اخوت کو جو رادھا سوامیوں میں فطرتی ہے گہری اور پختہ بنانے میں معاون ہوتی ہے۔ چنانچہ اہالیان دیال باغ میں نہ آپس کا بیر بر و دھ ہے نہ کسی قسم کا لڑائی جھگڑا۔

اہالیان دیال باغ کی آسائش و حفاظت کا انتظام ایک بورڈ کے سپرد ہے جو ۲۰ منتخب و نامزد ممبروں پر مشتمل ہے۔ اس کمیٹی کے ماتحت متعدد محلہ کمیٹیاں ہیں اور کمیٹی میں مختلف شعبہ جات کی پرداخت کے لئے جدا جدا سب کمیٹیاں ہیں اور کوشش یہ کی جاتی ہے کہ دیال باغ کا مستقل باشندہ کسی نہ کسی کمیٹی کا ممبر ضرور بن جائے تاکہ ہر شخص کے دل میں ذمہ داری کا احساس پیدا ہو چنانچہ مشہور برطانوی جرنلسٹ پال برنٹن اپنی تصنیف (A search in secret India.) میں دیال باغ کے باب میں اہالیان دیال باغ کے بارے میں لکھتے ہیں کہ :—

اہالیان دیال باغ کی خودداری اور ذکی و دانشمندانہ عملیت سے میں متاثر ہوا ہوں.....

"یہاں شہری کا وہ ٹائپ موجود ہے جو دنیا کے ہر شہر کے لئے مایۂ ناز ہوگا۔ میں ان اہالیان دیال باغ کو تہ دل سے پسند کرتا ہوں اور اُن کا بیحد مداح ہوں کیونکہ اُن کے اندر وہ نایاب وصف موجود ہے جس کو کیرکٹر کہتے ہیں۔"

اِس نوآبادی کے رُوحِ رواں عرش مکانی سرصاحب جی مہاراج قدس سرہٗ رہے ہیں جن کے بارے میں پال برنٹن اور لینسر ایٹ لارج (Lancer At Large) کے مصنف ایٹس براون (Yeats Brown.) نے لکھا ہے کہ "دنیا میں ایسے لیڈر کی نظیر ماضی و حال میں نہیں ملتی۔ وجہ کچھ ہو مگر یہ امر مسلّمہ ہے کہ مذہب کا تسلط اب انسان کے دل پر قائم نہیں رہا اور مادّیت کی پُرزور لہر دنیا کے ان تمام شعبہ جات زندگی پر چھا گئی ہے جو کسی وقت میں مذہب کے دائرۂ تسلّط میں تھے۔ بھاپ کی طاقت کی Steam power. اختراع اور بعد ازاں بجلی کی طاقت کی ایجاد نے مغربی ذہن کو مشین کی ایجاد کی طرف مبذول کیا اور موخرالذکر بڑی بڑی فیکٹریوں کی نشو ونما اور بڑے پیمانہ پر اشیاء کی پیداوار کا موجب ہوئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کچھ عرصہ میں تمام مغرب میں انڈسٹریز کی بھرمار ہوگئی اور وہ ممالک جہاں کچھ عرصہ سے بجز کوئلہ اور لوہے کے کوئی اور دولت نہ تھی۔ سونے چاندی سے مالا مال ہونے لگے۔ یہ کیفیت دیکھ کر دنیا کے دیگر ممالک بھی مغرب کی پیروی میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی سرگرم کوشش میں منہمک ہوگئے پس اس طریقہ سے انڈسٹری نوع انسان کی بہترین رفیقہ تسلیم کی گئی۔ اتنے بلند مرتبہ پر چڑھائی جا کر انڈسٹری نے انسان کی زندگی کے تمام شعبوں پر اثرانداز ہونا شروع کیا۔ اور اپنے پرستاروں پر اپنی برکتیں نازل کرنی شروع کردیں تعلیم جو ماضی میں پادریوں کے زیرِ اہتمام تھی متنزلزل ہوگئی۔ پادری صاحبان کے تسلّط سے ہٹ کر تعلیمی ادارات سرمایہ داروں کے زیرِ اہتمام آگئے۔ ادبیات و فلسفہ پر علم طبیعات و کیمیا کو فوقیت دی گئی۔ اور قبل الذکر کس مپرسی کی حالت میں رہ گئے۔ اور دُنیا میں سائینس کے ڈگری یافتہ نوجوانوں کی بھرمار ہوگئی۔ سائینس نے تعلیمی ادارات پر تسلّط جما کر مذہب کی خبر لی اور اس کو بدر کرنے میں کامیاب ہوئی اور مسحور دنیا سائینس کی پرستار بن گئی۔ یہ سب کچھ ہوا لیکن ایسا نہیں ہے کہ اہالیان دیال باغ اس رَو میں بہہ گئے ہوں۔ برخلاف اس کے یہاں مذہب، دنیوی تعلیم اور انڈسٹریز دوش بدوش رفاقت اور اشتراک عمل سے کارفرما ہیں۔ رادھاسوامی فرقہ کے ۶۰ فیصدی سے زاید نفوس خواندہ ہیں اور دیال باغ میں لڑکوں کے لیے تحصیل علم لازمی ہے اور فارغ التحصیل ہو کر متعدد نوجوان اپنی خدمات پیش کرتے ہیں۔ اور وہ کارخانہ جات و دیگر ادارات میں لگا دیئے جاتے ہیں۔

علی الصباح دینوی فرائض کی ادائیگی میں منہمک ہونے سے پہلے سب مرد و زن جوان و پیر کو منہ اکٹھا ہو کر کچھ عرصہ مراقبہ میں بیٹھ کر شغل روحانی کرتے ہیں۔ پھر ایک گھنٹہ ست سنگ کرتے ہیں ؎

علی الصباح چو مردم بہ کار و بار روند　　بلاکشان محبّت بکوئے یار روند

کے مسلک پر بہ عشق الہٰی کے بندے کاربند ہو کر زاں بعد اپنے اپنے کاموں پر چلے جاتے ہیں اسی طرح شام کو دن بھر کا کام ختم کر کے جملہ مرد و زن وقت مقررہ پر پھر ست سنگ ہال میں آجاتے ہیں اور دن بھر کے کام کی تکان اور دنیا کے بکھیڑوں سے پاک وصاف ہو کر سب بہ یک زبان و ہمہ تن گوش ہو کر پاک پرورد گار کی حمد کے گیت گاتے ہیں اور سنتے ہیں۔ شام کے ست سنگ میں پیر و مُرشد کا وعظ اور اُپدیش بھی ہوتا ہے۔ زاں بعد گھروں میں جا کر اہل وعیال کے ساتھ ایک میز پر طعام تناول فرماتے ہیں۔ اور اس طرح سیر ہو کر کھلی ہوا میں مرد و زن پیر و جوان اور بچّے سیر کو نکلتے ہیں اس تفریح کے بعد بستر راحت پر استراحت فرمانے کے قبل کچھ عرصہ محبوب حقیقی کے طالب شغل میں بیٹھتے ہیں۔ الغرض دیال باغ ایسے پُرامن لوگوں کی بستی ہے۔ جو دینوی جاہ وحشمت کی پروا نہ کرتے ہوئے کل مالک کی بھجن بندگی اور خلق عام کو اپنا فرض اولین گردانتے ہوئے عوام کو اپنی مثال سے فرض شناسی، مثاہیر پرستی، خود اعتمادی اور روحانی مشاغل کی تعلیم دیتے ہوئے راضی برضا صبر وقناعت سے زندگی بسر کرتے ہیں۔

ہم دست بدعا ہیں۔ کہ ملک ہند کی دوسری مذہبی جماعتیں دیال باغ کے حسن تنظیم واتحاد کی طرف مخاطب ہوں اور اس طرح سرگرم کار ہو کر مفلسی اور ناداری کا قلع قمع کر دیں اور ملک میں از سرِ نو خوشحالی و خدا پرستی کی فضا پیدا کر دیں۔ ع

ایں دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد

زمانہ تیس سال پہلے

"قوم کی حالت پر خیالات"

عنوان بالا پر "زمانہ" بابت اگست ۱۹۱۳ء میں "حق پسند" کے نام سے یہ مضمون شائع ہوا تھا جس میں لائق مضمون نگار نے لکھا تھا کہ:-

ہندوستان میں گذشتہ چند ماہ کے واقعات کی روش سے صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ اہل ملک نے پولیٹکل جنگ و جدوجہد کی ابتدائی منزل میں قدم رکھا ہے۔ مگر افسوس ہے کہ اسی منزل میں جن مشکلات کا سامنا پڑا ہے انہوں نے ہم میں سے بہتیروں کی ہمتیں پسپا کر دی ہیں۔ سالانہ کانفرنسیں اور کانگریس نقلی لڑائیاں تھیں۔ بیس پچیس سال تک ہم نقلی لڑائیاں لڑتے رہے مگر اصل و نقل میں بہت فرق ہے اصلی جدوجہد کے پہلے ہی ہلّہ میں ہماری ساری جماعت منتشر ہو گئی، قومی تحریکوں کی تاریخ میں ایک یا دو ممبروں کی جلاوطنی کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ آزادی ہیرے سے زیادہ انمول اور آبحیات سے زیادہ حیات بخش ہے۔ یہ خیال کرنا کہ اس چشمہ تک ہم بلا قربانیاں کئے پہونچ جائیں گے من کی مٹھائی کھانا ہے۔

دھان کے کھیت

(از جناب فیاض الدین احمد صاحب فیاضؔ، بی۔اے)

یہ دھان کے ننھے پودے ہیں ہریالی کے دَل بادَل ہیں
یا کاہی رنگ کی گوٹ لگی ہے ہلکے دھانی آنچل میں

رُم جھم جو برستا نکلا ہے اِک اَبر کا ٹکڑا کھیتوں پر،
کیا خوب نہا کر نکھرے ہیں فطرت کے حسیں گنگا جل میں

چھوٹی ہیں سنہری کرنیں کچھ، سبزہ کی بلائیں لینے کو
یا پریم کی پینگیں بڑھتی ہیں، دَمَینتی اور راجہ نَل میں

ہے سُرخ زمیں پر ہریالی، ہریالی پر میناکاری
چمکا ہے نصیبہ سبزہ کا، ہے نت نئی رنگت پل پل میں

کھیتوں کے فراز و پستی میں یوں جھوم رہی ہے بادِ سحر
جیسے کوئی مست شراب پیئے، پھرتا ہو بھٹکتا جنگل میں

صبحوں کے سُہانے منظر ہیں، رنگین ہیں نظارے شاموں کے
پھولی ہے شفق، اُٹھتی ہے گھٹا دھانوں کو ڈبونے جل تھل میں

بڑھتی ہوئی شام کی ظلمت میں یوں عکس شفق کا ڈوبا ہے
جس طرح کسی دوشیزہ کی مستی بھری آنکھیں، کاجل میں

برسات کی رُت، ساون کا مہینا، اور جوانی کا موسم
میکہ میں عروسِ فطرت ہے، منگل منتے ہیں جنگل میں

کھیتوں میں پھُوار جو پڑتی ہے ہر بوند اِک موتی جڑتی ہے
اِک گیت ہے ہر اِک جھونکے میں، اِک جھولا ہے ہر کونپل میں

دیہات کے رنگیں پوش یہاں جب کھیت کو نِیندنے[1] آتے ہیں
دھانوں کے ہرے بھرے کھیتوں میں نشو و غنچہ و گُل کھل جاتے ہیں

[1] کھیتوں میں سے خودرو گھاس نکالنا۔

خود رَو پودوں کے ساتھ اُگنا بھاتا نہیں نازک دھانوں کو
یہ غیرت کھلا دیتی ہے اِن ننّھی ننّھی جانوں کو
نیندے جو نہ جائیں کھیت کہیں مٹ جائے یہ سب تکمیل حسیں
محنت کرنی ہی پڑتی ہے دِن دِن بھر کچھ انسانوں کو
دھانوں کی نزاکت کہتی ہے یہ کام ہے صنفِ نازک کا
اِس صنف کے قدموں میں پڑ کر ملتی ہے جوانی دھانوں کو
وہ جو سر کو جھکائے کھیتوں میں دِن دن بھر محنت کرتی ہے
ساون بھادوں کی جھڑیوں میں، سینے میں لئے ارمانوں کو
تھک کر وہ جب اک لمحے کے لئے انگڑائی لیتی اُٹھتی ہے،
آجاتی ہے رونق کھیتوں پر، ملتی ہے طراوت دھانوں کو

سُن منعمِ شیریں کام و دَہن، یہ کاہنی ہے کوہ کنی!
وہ ہاتھ پکا کر پکتے ہیں، تو کھاتا ہے جِن دانوں کو
اِن دھان کے رنگیں کھیتوں میں، ٹپکا ہے پسینہ عورت کا
مِٹّی سے یہ پودے اُبھرے ہیں، مِٹّی میں مِلا کر جانوں کو
سورج نے سراہی کچھ محنت، بادل نے بڑھائی کچھ ہمت
لیکن تری ناشکری فطرت، بھولی سارے احسانوں کو
دہقان کے بچّوں کے مُنہ سے تو نے یہ نوالا چھینا ہے
خوش کیا ہوتا ہے اَے مُنعم تو ارزاں پا کر دھانوں کو
اِن سے ہی حکومت پلتی ہے، خلقت کے یہی اَن داتا ہیں
تَن پوشی کا مقدور نہیں جن بد قسمت انسانوں کو
فیاؔض یہ دھان کے کھیت نہیں، اِک عبرت کا افسانہ ہیں
مظلوم کی سوکھی روٹی ہیں، اور منعم کا پیمانہ ہیں

سینما اور تعلیم

میرزا محمد بشیر ایم۔ اے۔ بی۔ ٹی

سینما کا جادو تمام دنیا پر چل چکا ہے۔ مگر تہذیب حاضر کی اس سوداگری پر بھی علامہ اقبالؔ کا مقولہ صادق آتا ہے کہ ؎

عمل سے زندگی بنتی ہے جنّت بھی جہنم بھی،
یہ خاکی اپنی فطرت سے نہ نوری ہے نہ ناری ہے (اقبالؔ)

واقعی جب انسان ویرانے کو گلزار بنا سکتا ہے تو کوئی سبب نہیں کہ سینما کو بھی جو ایک عام تفریح کا طریقہ ہے انتقال تجربات کا مفید وسیلہ نہ بنایا جائے۔ بہت سے ملکوں نے اس کو تعلیم کی نشر و اشاعت کا ذریعہ بنا کر اس سے روشنی کے فرشتے کا کام لیا۔ جاپان ہی کو دیکھئے کہ اُس نے فلموں کی تیاری میں تعلیمی افادہ کو نظر انداز نہیں کیا۔ فرانس میں ایک تعلیمی ادارہ حکومت کی سرپرستی میں تعلیمی فلم[1] تیار کرتا ہے۔ اس کے پاس فلموں کا ایک ذخیرہ بھی رہتا ہے جسے وہ مختلف مدرسوں کو عاریتاً تقسیم کرتا ہے۔ تعلیمی اعتبار سے یہ فلم نہایت دلچسپ اور مفید ثابت ہوتے ہیں۔

تعلیمی فلموں کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ فلم جو طلبا کی ضروریات کو مدِنظر رکھ کر تیار کئے جائیں اور دوسرے وہ جو عوام کی تعلیم اور اُن کی معلومات میں اضافہ کرنے کی غرض سے بنائے جائیں۔ مدرسوں میں فلم کی تعلیمی اہمیت مسلمہ ہے۔ بہت سے تعلیمی متفکروں کا خیال ہے کہ "بچوں کے وسائل تعلیم میں فلم کا مرتبہ بہت بلند ہے" اور بچوں کو درجہ میں تعلیمی فلموں سے، ہال میں عام دلچسپیوں کے فلموں سے اور پبلک سینما میں خاص خاص فلموں کی نمایش سے معلومات میں اضافہ کیا جا سکتا ہے۔

تدریسِ درس میں فلم کا استعمال سبق میں جان ڈال دیتا ہے۔ یہی نہیں کہ فلم بچوں کی معلومات میں اضافہ کرتا ہے بلکہ وہ علم جو بچوں نے دوسرے ذرائع سے حاصل کیا ہے اس کو ذہن نشین کرا دیتا ہے۔ بچے جو کچھ کتابوں میں پڑھتے ہیں اُس کو پردے پر دیکھتے ہیں۔ اس طرح "شوخیِ تحریر" "پیکرِ تصویر"

---

[1] The Film in National Life.

بن کر ان کے دلوں پر نقش ہو جاتی ہے ۔ برٹرنڈ رسل لکھتا ہے کہ جغرافیہ کی تعلیم "سینما[1] کے ذریعہ سے دینا چاہیئے اور بچوں کو دکھلانا چاہیئے کہ ایک مسافر دورانِ سفر میں کیا کیا دیکھتا ہے" مثلاً معلم درجے میں راس کے متعلق لڑکوں کو سبق دے تو فلم[2] کے ذریعہ ان کو دکھایا جائے کہ ایک جہاز ساحل کے کنارے جارہا ہے ۔ اس طرح ان کو راس. Capes سے خود بخود آگاہی ہو جائے گی ۔ غرض ساری جغرافیہ کی تعلیم سینما سے ہونا چاہیئے ۔ اسی طرح تاریخ کی ابتدائی تعلیم بھی فلم کے ذریعہ دی جاسکتی ہے ۔ بچوں کی دلچسپی کے لئے ملک کے تاریخی مقامات، دلکش نظارے عجائبات وغیرہ کے فلم دکھلائے جائیں ۔ سائنس کے تجربات موجودہ صنعتی طریقوں سے تطبیق کر کے عملی صورت میں پیش کئے جائیں ۔ ہندوستان ایک زراعتی ملک ہے زراعت کے متعلق بھی نئے نئے تجربات اور نت نئی ایجادیں دکھلا کر ان کی دلچسپی اور معلومات میں اضافہ کیا جائے ۔ مطالعہ فطرت کی دلکشی اور ادب کی دلنوازی کو بھی فلم چار چاند لگا دے گا ۔ ہمارے ملک کے ادبی کارنامے اگر ہوشیاری اور سلیقے سے پیش کئے جائیں تو بچوں کے مذاق کی تربیت کا آسان اور مفید ذریعہ ہیں ۔ قوم کے حسن مذاق کی تربیت مدرسے میں ہوتی ہے ۔ لہذا مدرسہ اس وسیلے کو نظر انداز نہیں کر سکتا ۔

مڈل سکس رپورٹ (Middle sex Report.) میں درج ہے کہ فلم دیکھنے سے بچوں میں ذہنی بے عملی پیدا ہو جاتی ہے اور وہ ہر بات کو بغیر کسی چون وچرا کے قبول کر لیتے ہیں ۔ لیکن یہ خیال تجربوں کے بعد غلط ثابت ہوا ہے اور دیکھا گیا ہے کہ بچے بجد غور وخوض سے کام لیتے ہیں ۔ کیونکہ فلم چشم و گوش دونوں کو متوجہ کرتا ہے" ۔ بچے جو کچھ فلم میں دیکھتے ہیں اس کو کتاب یا استاد کے الفاظ میں نہیں بلکہ اپنے لفظوں میں بیان کرتے ہیں اور اس پر اپنی آزادانہ رائے قائم کرتے ہیں ۔ مغربی ممالک میں لوگ بڑے بڑے تجربوں کے بعد اس نتیجے پر پہونچے ہیں کہ "فلم[3] دیکھنے سے بچوں میں اُپج کا مادہ پیدا ہوتا ہے اور ان میں خود کام کرنے کا شوق ترقی کرتا ہے ۔ ان میں ذوقِ مطالعہ اور مختلف موضوع پر گفتگو کرنے اور لکھنے کی قابلیت پیدا ہوتی ہے ۔

یہی نہیں بلکہ دیکھا گیا ہے کہ سست اور کاہل بچوں میں بھی فلم بیداری اور عملی ذوق پیدا کر دیتے ہیں ماہرینِ تعلیم کی رائے ہے کہ "تفریح کے اوقات میں فلم بچوں کو شہری زندگی کے لئے تیار کرتے ہیں اور مہذب

---

1. On Education. P.207.　2. On Education P.198.

3. The Punjab Education Journal.

دلچسپیوں کے شوق کو اُبھارتے ہیں"

اِس میں شک نہیں کہ بہت سے عام فلم ایسے ہوتے ہیں کہ جو بچوں کے اخلاق پر بُرا اثر ڈالتے ہیں۔ مثلاً ایسے فلم جن میں ظلم وستم، رکیک و ذلیل حرکتیں، ڈاکہ زنی، قانون کی حقارت وغیرہ دکھائی جائے لیکن اس کے برخلاف بہادری، جانفشانی اور حقیقی رومانیت کے فلم اُن میں جوش وخروش، بلند ہمتی اور تعلید کی اُمنگ پیدا کرتے ہیں۔ جو معلم اور والدین لڑکوں کو قطعی کسی قسم کے فلم دیکھنے کی اجازت نہیں دیتے وہ اُن پر بڑا ستم کرتے ہیں۔ موقع پاکر جب یہ نظر بند سینما میں جاتے ہیں تو ضرور بُرے اثرات قبول کرتے ہیں۔ اس لئے سرپرستوں کو خود بچوں کو اپنے ساتھ سینما لے جانا چاہیئے اور اُن سے فلم کے متعلق گفتگو کرنا چاہیئے تاکہ وہ اچھے اور بُرے فلموں میں تمیز کر سکیں۔

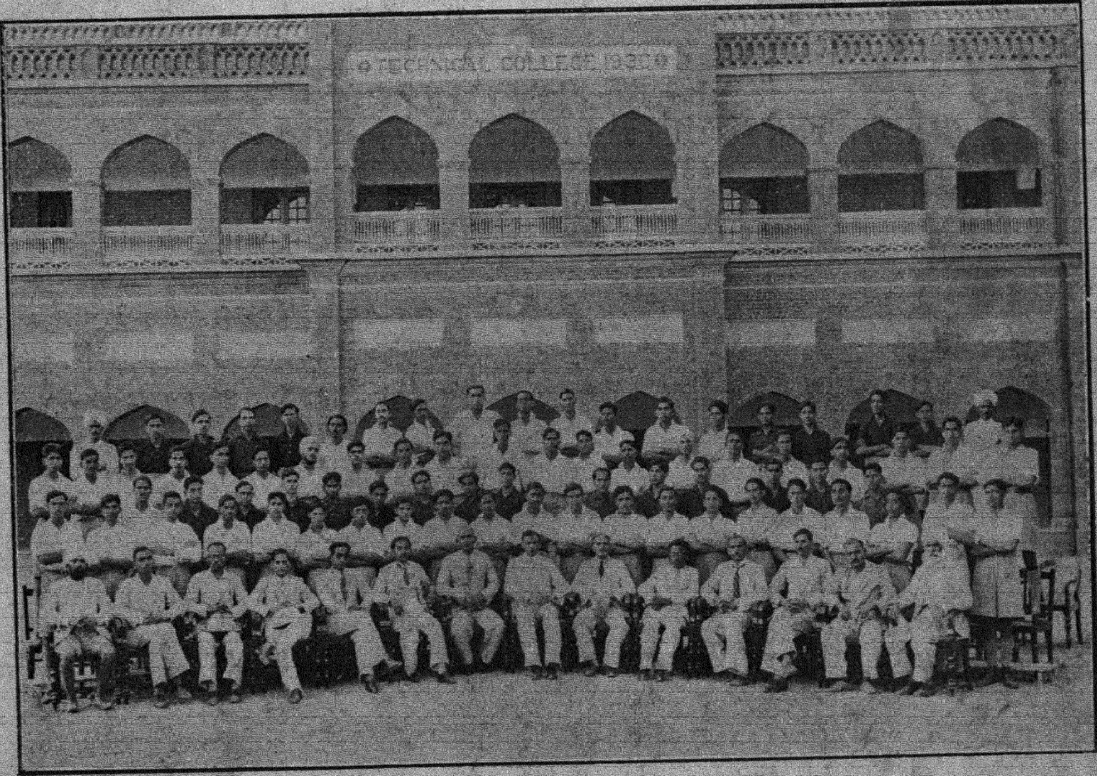
اخلاق کے علاوہ بچوں کی صحت پر بھی بعض صورتوں میں سینما کا اثر بُرا پڑتا ہے۔ مثلاً اگر عمارت میں جگہ کافی نہیں تو خواہ مخواہ تماشائیوں کی جسمانی صحت کو نقصان پہونچے گا یا اگر پردہ آنکھوں کے بہت قریب ہے تو اس سے آنکھوں کے خراب ہونے کا اندیشہ ہے اس لئے۔ فلموں کو مدرسے کے سب سے بڑے ہال میں دکھلانا چاہیئے یا پبلک سینما میں۔ بہرحال حکومت اور رعایا کا فرض ہے کہ اس بات کا خیال رکھیں کہ سینما گاہوں میں ہوا کا کافی انتظام ہو اور حفظانِ صحت کے اصول برتے جائیں اور پردے اور تماشہ بینوں کے درمیان کافی فاصلہ ہو تاکہ آنکھوں پر مضر اثر نہ پڑے۔ اس کا بھی لحاظ رکھنا چاہیئے کہ بچے رات کو زیادہ دیر تک نہ جاگیں کیونکہ یہ بھی صحت کے لئے ضرر رساں ہوگا۔

ہمارے ملک کی بدنصیبی ہے کہ تعلیمی فلموں کے متعلق تحریر اور تقریریں بہت کچھ زبانی جمع خرچ ہوتا ہے لیکن نہ حکومت نے اور نہ فلم کمپنیوں نے اب تک کوئی عملی کارنامہ پیش کیا ہے۔ درحقیقت سب سے پہلے حکومت کو اس جانب قدم اُٹھانا چاہیئے۔ اس کام میں بقول برٹرنڈ رسل شروع شروع اخراجات زیادہ ہوں گے لیکن گورنمنٹ کے لئے یہ کوئی قابل لحاظ بات نہیں ہے۔

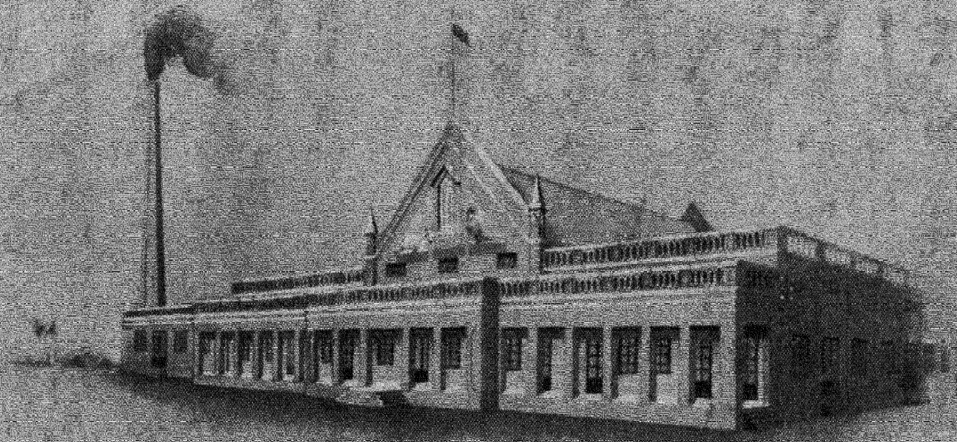
مجلس بین الاقوامی کی "یونین" کے لئے زر کثیر صرف کرکے جو تعلیمی فلم دی[1] ورلڈ اینڈ آفٹر تیار کیا گیا تھا وہ نہایت مفید اور دلچسپ فلم تھا۔ فلم کمپنیوں کا فرض ہے کہ ملک کے اس تعلیمی کام میں حصہ لیں اور معلمین اور ماہرین تعلیم کو بھی مالکان کمپنی کا ہاتھ بٹانا چاہیئے۔ مگر اس کے لئے سب سے پہلے یہ بھی ضروری ہے کہ مدرسین کو اپنی ضرورتوں کا پورا علم ہو۔ اس سلسلے میں ایک مبصر کی رائے یہ ہے کہ "فلم کے متعلق استادوں کی

---

[1] "The World War and After."



تیکنیکل کالج دیال باغ
جو ہندوستان بھر میں اپنے طرز کا واحد صنعتی انسٹی ٹیوشن ہے



R.E.I. Dairy (Dayalbagh)



دیال باغ ڈیری جو بقول مشہور برطانوی جرنلسٹ میجر ایٹس براؤن
ایشیا بھر میں بہترین ڈیری ہے

واقفیت اتنی ہونی چاہیئے کہ وہ اپنے خیالات کو خاموش اور ناطق فلموں میں عملی جامہ پہنا سکیں"

تعلیمی نقطۂ خیال سے ہم خاموش اور ناطق فلم دونوں سے فائدہ اُٹھا سکتے ہیں۔ بولتے ہوئے فلموں کو خاموش فلموں پر یہ فوقیت ہے کہ وہ ایک ہی ساتھ "جنت نگاہ" اور "فردوسِ گوش" بن سکتے ہیں۔ لیکن خاموش فلم کو "بین الاقوامی زبان" کہا جاتا ہے۔ ہندوستان میں جہاں مختلف زبانیں بولی جاتی ہیں۔ یہ فلم خصوصیت سے مفید ثابت ہوں گے۔

تعلیمی اعتبار سے فلم جسقدر مدرسے کے بچوں کے لئے مفید ہے اتنا ہی عوام کے لئے۔ ہندوستان کے دیہات جہاں جہالت کی تاریکیاں چھائی ہوئی ہیں۔ اس مشعل تعلیم کی روشنی میں عوام کے لئے ذہنی ترقی کے راستے نکل آئیں گے۔ فلم کے ذریعے سے ان غریب باشندوں کو اصولِ معاشرت، خوراک وحفظانِ صحت کے متعلق معلومات اور نوشت وخواند کے آسان طریقوں سے آگاہ کیا جاسکتا ہے۔

فلم بالغوں کی تعلیم کا بھی نہایت دلاویز وسیلہ ہے۔ مسٹر ایڈورڈ ٹامسن کا خیال ہے کہ فلم کے سامنے رات کے مدرسے بیکار ہیں کیونکہ "تھکے[۵۱] ماندے فاقہ کش کسان اپنی جھونپڑیوں سے نکل کر پڑھنے کے لئے مدرسوں میں نہیں آئیں گے لیکن ایک فلم دیکھنے کے لئے خوشی خوشی آئیں گے"۔

دیہات، قصبے اور شہروں میں پیشے کی تعلیم کی جانب بھی فلم کے ذریعہ سے رجحان پیدا کیا جاسکتا ہے۔ لوگوں کو زراعت اور صنعت وحرفت کی ترقیاں و ایجادیں اور تفریح کے مفید مشغلے بتلائے جاسکتے ہیں۔

فی زمانہ سینما مزدور سے لیکر وزیر تک سب کی تفریح کا واحد مشغلہ ہے۔ عام فلم کی مقبولیت کی ایک مثال یہ ہے کہ بقولِ لیوکر[۵۲] "صرف مقدس بائبل اور قرآنِ مجید کی اشاعت لاس انجیلیس Los Angles. کے ایک تازہ ترین فلم کی اشاعت سے زیادہ ہے" اب ہندوستان میں بھی فلم کو بہت مقبولیت حاصل ہو رہی ہے لیکن ہم کو یہ کبھی نہ بھولنا چاہیئے کہ فلم محض تجارت نہیں بلکہ ایک قومی تحریک ہے۔ اس لئے ہمیں اپنی قومی اغراض اور ذاتی ضروریات کو اپنے کھیل تماشوں کے فلموں میں بھی مدنظر رکھنا چاہیئے۔ فلم ایسے گرانقدر فنی کارنامے ہوں جو ہم سب میں یگانیت، بلند خیالی اور وسیع النظری پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ ہمارے معاشرت کی اصلاح بھی کر سکیں۔ وہ شعر کی طرح "دل کو بہلانے اور تروتازہ کرنے میں چپکے ہی چپکے مگر نہایت قوت کے ساتھ افلاس کی صورت میں مرہم اور تونگری کی صورت میں تریاق کا کام دے سکیں

۵۱۔ Time and Tide.

۵۲۔ M .Luchaire.

برسات کی بہار

(از جناب طالب چکوالی بی۔اے۔ایل ایل بی)

مزا برسات میں دیتا ہے منظر کوہساروں کا
جہانِ کیف ہوتا ہے ترنم آبشاروں کا

بہار اور تازگی کا دَور دَورہ کوہساروں میں
پہاڑوں میں ہے گھر فطرت کی لاثانی بہاروں کا

پڑا بارش کا چھینٹا رنگِ فطرت اور بھی نکھرا
نظر آنے لگا صحرا میں جلوا گلعذاروں کا

یہ بھر کر موتیوں کا تھال کس نے خاک پر پھینکا
فلک سے کس نے پھینکا توڑ کر خوشہ ستاروں کا!

بہار افزا زمیں ہمپایۂ چرخ منوّر ہے
یہاں ہے فرش پھولوں کا، وہاں تختہ ستاروں کا!

ہوائے دشت میں لہریں مسرت کی مچلتی ہیں
ملا ہے انبساطِ دل کو جھولا شاخساروں کا

بظاہر چارسو چلتا ہے لطف اور حسن کا سکہ
مگر دیکھو نمایندہ ہے لالہ داغداروں کا

بہار آنے کو آتی ہے وطن کے لالہ زاروں میں
خزاں سا رنگ رہتا ہے مگر ان لالہ زاروں کا

نظر آتا ہے یہ کشتی کنارے لگ نہیں سکتی
ڈبوئیگا جنوں طالبؔ "ہماروں" اور "تمھاروں" کا

فطرتِ آزاد

(از پنڈت آنند نراین مُلّا، ایم۔اے۔ایل ایل۔بی)

مسکن ہے خاک میرا، خود خاک سر بسر ہوں
دامِ حیات میں اک مُرغِ شکستہ پر ہوں

پالا ہے مجھکو لیکن تاروں بھرے فلک نے
اِس تیرہ خاکداں میں اِک جلوۂ سحر ہوں

ہوں مشتِ خاک لیکن فردوس در نظر ہوں

فارسی شاعری کی ابتدا

از پروفیسر محمد اسحاق صاحب ایم اے، ڈھاکہ

ساتویں صدی عیسوی کے درمیانی حصے میں عربوں نے ایران کو آماجگاہ عساکر اسلام بنایا، اسوقت ایران کی قومی اور مذہبی زبان فارسی یا پارسی تھی۔ غلبۂ عرب کے ساتھ ساتھ ایران کی کایا پلٹ ہوگئی، اوّل تو وہاں کے لوگوں کے مذہب میں تبدیلی ہوئی، سارا کا سارا ایران آتش پرستی چھوڑ کر اسلام پر ایمان لایا۔ اور مذہبی اور سیاسی وجوہ سے مجبور ہو کر رفتہ رفتہ وہاں کی قومی زبان میں بھی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ ایران والے عربی زبان کی طرف مائل ہوئے۔ البتہ گھریلو معاملات میں وہ پہلوی رسم الخط اور کتابت سے کام لیتے رہے لیکن پہلوی رسم الخط کے مقابلے میں عربی املا بہت سلجھا ہوا اور آسان تھا۔ اس لئے ایرانیوں کا رسم خط بھی بدل گیا۔ اب ہر قسم کی کتابت عربی میں ہونے لگی۔ تقریباً تین سو سال تک یہی حالت رہی۔ یہ اسلامی خلافت کے عروج کا زمانہ تھا اُس کے بعد اسلام کا دور انحطاط شروع ہوا۔ عباسیوں کے زمانہ میں اسلامی ممالک کے دُور دراز حصوں میں چھوٹی چھوٹی خود مختار ریاستیں قایم ہوگئیں چنانچہ ایران میں سنہ ۸۲۰ء میں عبداللہ بن طاہر نیشاپور میں سنہ ۸۶۸ء میں یعقوب بن لیث سجستان میں ۸۱۹ء میں بنی سامان توران میں اور سنہ ۹۶۷ء میں سلاطین غزنویہ غزنہ میں خود مختار بن بیٹھے۔

فارسی شاعری کے آغاز کی نسبت جس قسم کے روایات بیان کئے جاتے ہیں ان کا مطالعہ ناظرین زمانہ کے لئے دلچسپی سے خالی نہوگا۔ اس ضمن میں دولت شاہ سمرقندی اپنی کتاب "تذکرۃ الشعراء" میں رقمطراز ہے کہ "زمانۂ اسلام سے پہلے کی فارسی شاعری علمائے سلف تک نہیں پہونچی اور نہ کسی شاعر کا نام معلوم ہوا لیکن افواہ مشہور ہے کہ زبان فارسی کا پہلا شاعر بہرام گور تھا۔ اس کی ایک محبوبہ دلارام چنگی نامی از حد سلیقہ شعار، ظریف، نکتہ رس اور موزوں طبع تھی۔ اور بہرام اسکو ہمیشہ اپنے ساتھ شکارگاہ میں لے جاتا۔ ایک دن بہرام نے دلارام کے سامنے جنگل میں ایک شیر مارا، اسوقت فخریہ طور پر اس کی زبان سے نکلا کہ "منم آں پیل دماں منم آں شیر یلہ" اور اس نے داد طلب نگاہوں سے دلارام کی طرف دیکھا جس نے دوسرا مصرع

فوراً اس طرح چسپاں کیا۔ "نام بہرام ترا و پدرت بوجبلہ" بہرام کو یہ مصرعہ بہت پسند آیا۔ اُس نے علماء سے بیان کیا۔ نظم کے قانون ایجاد کئے گئے۔ لیکن اس ایک بیت سے آگے نہ چل سکے۔
ابوطاہر خاتونی کہتا ہے کہ عضدالدولہ دیلمی کے عہد میں قصر شیریں جو خانقین کے اطراف میں ہے اب تک بالکل ویران ہوا تھا، اس عمارت کے کتبوں میں ایک کتبہ ذیل کا بھی تھا۔ جو حسب ذیل قدیم فارسی زبان میں تھا:۔

ہژبرا بگیہاں انوشہ بزی ✤ جہاں را بدیدار توشہ بزی

معلوم ہوتا ہے کہ اسلام سے پہلے بھی فارسی شعر کا وجود تھا، لیکن جب کسرائے عجم کا ملک عربوں کے حصے میں آیا تو اسلام کے اثر سے شعر کہنا ممنوع ہوگیا۔ بنی اُمیہ اور خلفائے بنی عباس کے زمانہ میں بھی جب سرزمین ایران کے فرمانروا عرب تھے، شعر انشاء اور جملہ تحریرات و مناشیر عربی زبان میں ہوا کرتے تھے۔ خواجہ نظام الملک نے اپنی کتاب "سیرالملوک" میں لکھا ہے کہ خلفائے راشدین کے زمانہ سے سلطان محمود غزنوی کے عہد تک تمام قانون دفاتر اور مناشیر سلطان کی طرف سے عربی میں لکھے جاتے تھے، فارسی میں مسلوں وغیرہ کا لکھنا معیوب سمجھا جاتا تھا۔ جب عبدالملک ابونصر کندری وزیر الپ ارسلان چقربیگ سلجوقی کا زمانہ آیا جسکی عربی لیاقت بہت معمولی تھی تو اس نے رسم مروجہ کو تبدیل کر کے فارسی میں احکام اور کاغذات لکھنے کا حکم دیا۔ ایک حکایت بھی ہے کہ امیر عبداللہ بن طاہر جو خلفائے بنی عباس کے زمانہ میں خراسان کا گورنر تھا، ایک دن نیشاپور میں بیٹھا ہوا تھا کہ ایک شخص ایک کتاب لایا اور بطور تحفہ اس کے سامنے پیش کی، امیر نے پوچھا کہ یہ کونسی کتاب ہے؟ اُس شخص نے کہا کہ اس کتاب میں وامق و عذرا کی کہانی ہے، جسکو حکمائے نوشیرواں کے حکم سے جمع کیا ہے۔ امیر عبداللہ نے کہا کہ ہم تو قرآن پاک کی تلاوت کرنے والے ہیں۔ ہم کو سوائے قرآن اور شریعت پیغمبر کے اور کوئی چیز درکار نہیں۔ یہ کتاب آتش پرستوں کی تصنیف ہے اور ہمارے لئے مردود ہے، یہ کہکر دریا میں ڈلوا دیا۔ اور حکم دیا کہ آتش پرستوں کی کل کتابیں جلادی جائیں، اس لئے آل سامان کے زمانہ تک کسی قسم کا شعر دیکھنے میں نہیں آتا۔ یا اگر کسی نے کچھ کہا بھی ہو تو اُسکو مدوّن نہیں کیا۔
یعقوب بن لیث صفار کا (جو سب سے پہلے عباسیوں کے عہد میں بغاوت کا علم بلند کر کے خودمختار ہوگیا تھا) ایک بیٹا تھا جسکو وہ بہت چاہتا تھا۔ عید کے دن وہ بچہ چند دوسرے بچوں کیساتھ گولیاں کھیلتا تھا۔ امیر پاس آکر بیٹے کا کھیل دیکھنے لگا، بچے نے گولیاں چلائیں تا اگر۔۔۔ سب کی سب

سوراخ میں آجائیں۔ سات گولیاں تو سوراخ میں آگئیں مگر ایک گولی باہر رہ گئی۔ بچہ بہت مکدر ہوا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ گولی بھی لوٹ کر سوراخ میں آرہی۔ بچہ بہت خوش ہوا، اس حالت میں اس کی زبان سے نکلا:" غلطاں غلطاں ہمی رود تابن گو" یعقوب کو یہ کلام بہت پسند آیا، ارکان دولت سے ذکر کیا، تو بعضوں نے کہا یہ شعر کے اقسام میں سے ہے۔ ابودلف عجلی اور الکعب اس کے تحقیق اور تقطیع میں مشغول ہوئے۔ کلام مذکور ہزج کے اقسام میں نکلا۔ اس پہ ایک اور مصرعہ اور پھر ایک شعر کا اضافہ کرکے اس کا نام دوبیتی رکھا گیا۔ تھوڑے دنوں تک لوگ دوبیتی ہی کہتے رہے۔ یہانتک کہ دوبیتی کا لفظ بھونڈا معلوم ہونے لگا، لوگوں نے کہا اسکو رباعی کہنا چاہیئے۔ اسوقت سے لوگ رباعی کہنے لگے۔

بہرحال سامانیوں کے عہد سے فارسی شاعری کو رونق حاصل ہوئی، رودکی اس فن کا استاد تھا۔ اس سے پہلے کوئی شاعر صاحب دیوان نہیں سنا گیا۔ اس لئے ہمکو استاد رودکی سے ابتدا کرنی چاہیئے۔

کتاب لُباب الالباب کا مصنف عوفی لکھتا ہے کہ" عباس مروزی نے مامون بن ہارون الرشید کے مرو میں داخل ہونے پر ۱۹۳ھ میں ایک قصیدہ پڑھا تھا جس کے چند اشعار یہ ہیں:۔

" ای رسانیدہ بدولت فرق خود تا فرقدین | گسترانیدہ بجود و فضل در عالم بدین
کس بریں منوال پیش از من چنیں شعر نگفت | مر زبانِ پارسی را ہست ایں انواع بین
لیک زاں گفتم من ایں مدحت ترا تا این لغت | گیرد از مدح و ثنائی حضرت تو زیب و زین"

بعض کہتے ہیں کہ حکیم ابو حفص سعدی نے سب سے پہلے یہ شعر کہا:۔

" آہوی کوہی در دشت چگونہ دودا | چوں ندارد یار بے یار چگونہ رودا

یہانتک تو قیاسات ہیں، جس کی واقعیت میں مؤرخین اور اہل الرائے کو اختلاف ہے۔

چہار مقالہ کا مصنف نظامی عروضی سمرقندی لکھتا ہے کہ احمد بن عبداللہ الخجستانی بارھویں صدی عیسوی کے وسط میں حنظلۂ بادغیسی کے مندرجہ ذیل اشعار پڑھتا ہوا اپنی موجودہ کس مپرسی کی حالت سے خراسان کی حکومت کو پہونچا۔

مہتری گر بکام شیر در است | شو خطر کن ز کام شیر بجوی
یا بزرگی و عزّ و نعمت و جاہ | یا چو مردانت مرگ رو یا روی

حنظلۂ بادغیسی کی ایک اور رباعی اس سلسلہ میں قابل غور ہے:۔

"یارم سپند اگرچہ بر آتش ہمی فگند از بہر چشم تا نرسد مر ورا گزند
او را سپند و مجمرہ ناید ہمی بکار با روی ہمچو آتش و با خال چوں سپند"

علاوہ بریں ایک افسانہ باربد کا بھی بتلایا جاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ خسرو پرویز کے پاس جو ملوک ساسانیان کے سلسلے کا ایک رنگیلا بادشاہ تھا (اور جس کا زمانہ ۵۰۹ء سے ۶۲۷ء تک بتایا جاتا ہے) اس بادشاہ کا شبدیز نامی ایک گھوڑا تھا، جو اسے بہت عزیز تھا۔ اس نے قسم کھائی تھی کہ جو شخص اس کے موت کی خبر لائے گا اسے سزائے موت دی جائے گی، اتفاق سے شبدیز مرگیا، لیکن میر آخور کو اتنی جرأت نہ ہوئی کہ وہ اس خبر وحشت اثر کو بادشاہ کے کانوں تک پہونچائے۔ ناچار اس نے باربد سے منت سماجت کر کے کہا کہ کسی طرح وہ اس خبر کو بادشاہ تک پہونچادے۔ باربد نے اس واقعہ کو رنگین الفاظ کا جامہ پہنا کر اپنے سریلے نغموں میں بادشاہ کے گوش گزار کیا۔ خسرو پرویز اصل مضمون کو تاڑ گیا۔ اور فرط غم میں چلا اٹھا کہ "افسوس شبدیز مرگیا"، اب کیا تھا، موقع پا کر باربد نے کہا کہ حضور کے زبان ہی سے پہلے شبدیز کے مرنیکی بات نکلی ہے۔ اس طرح ایک شاعر نے بادشاہ کی قسم کو بے اثر کر دیا۔ اسی طرح کا ایک شاعر رودکی دسویں صدی عیسوی میں ملوک سامان کے دربار میں تھا۔ جس کا حال ہم کو دولت شاہ کی کتاب تذکرۃ الشعراء سے معلوم ہوتا ہے۔ ان دونوں کے نام شریف مجلدی گرگانی نے ایک قطعہ میں یک جا جمع کر دیئے ہیں۔

از آں چندآں نعیم این جہانی کہ ماند از اہل ساسان و اہل سامان
ثنای رودکی ماندست و مدحت نوای باربد ماندست و دستاں

ابن قتیبہ کتاب طبقات الشعراء، طبری تاریخ کبیر، اور ان سب سے زیادہ تفصیل کے ساتھ ابوالفرج اصفہانی کتاب الآغانی میں اس طرح لکھتے ہیں کہ "جب عباد بن زیاد، عبیداللہ بن زیاد کا بھائی یزید بن معاویہ کی خلافت میں سیستان کی گورنری پر جانے لگا تو شاعر بن مفرغ نے بھی اس کے ساتھ سیستان جانے کا قصد ظاہر کیا، روانگی کے وقت عبیداللہ بن زیاد نے ابن مفرغ کو تنہا بلا کر کہا کہ عباد کے ساتھ تمہارا سیستان جانا میں کسی طرح پسند نہیں کرتا، ابن مفرغ نے کہا کیوں؟ امیر نے جواب دیا کہ تم شاعر ہو، میرا بھائی گورنری کو جاتا ہے۔ وہ لڑائی بھڑائی اور خراج کے وصول کرنے میں مشغول ہو جائے گا، تمہاری خاطر خواہ آؤ بھگت اس حالت میں ممکن نہوگی، اور تم اس برتاؤ کو سرد مہری قرار دو گے اور اس کی ہجو کہنے لگو گے۔ ابن مفرغ نے کہا کہ حضور اس کا کوئی

اندیشہ دل میں نہ لائیں، آپ کے بھائی کے بڑے احسان میری گردن پر ہیں، میں احسان فراموش نہیں ہوں، ابن زیاد نے کہا کہ تاہم تم وعدہ کرو کہ اگر میرے بھائی کی طرف سے کسی قسم کی کوتاہی ہوگی تو تم اُسے معاف کر دو گے۔ اور اس کی اطلاع مجھے لکھ بھیجو گے، ابن مفرغ نے وعدہ کیا۔ اور عبیداللہ بن زیاد کو اطمینان دلایا، ابنِ زیاد نے کہا کہ اچھا اب تم جا سکتے ہو۔ لیکن خبردار اپنے قول و قرار کو نہ بھولنا، غرض ابن مفرغ عباد کے ساتھ سیستان گیا۔ ابنِ زیاد کی پیشین گوئیاں سچ ثابت ہوئیں جاتے ہی ابن مفرغ نے عباد کی ہجو لکھنا شروع کر دی اور جب عباد نے اس کے طرف بے اعتنائی ظاہر کی تو اور کھل کھیلا، اور ابن زیاد کو اسکی کوئی اطلاع نہ بھیجی، کہتے ہیں کہ عباد کی داڑھی بہت گھنی تھی، ایک دن ابن مفرغ گھوڑے پر سوار عباد کے ساتھ کہیں جا رہا تھا کہ زور کی ہوا آئی اور عباد کی داڑھی کے بال چاروں طرف بکھر گئے، ابن مفرغ نے ہنسکر اپنے ایک ساتھی سے کہا "لیت اللحیٰ کانت حشیشا فنعلفها خیول المسلمینا" یعنی کاش امیر کی ڈاڑھی کے بال گھاس ہوتے تو ہم مسلمانوں کے گھوڑوں کو کھلاتے، اس شخص نے عباد سے کہدیا جس پر عباد بہت غصہ ہوا۔ لیکن ابن مفرغ سے خفگی کا اظہار نہ کیا۔ دوسرے دن عباد کا گھوڑا دور میں آگے نکل گیا، ابن مفرغ نے کہا "سبق عباد و صلت لحیتہ" یعنی عباد تو آگے نکل گیا، لیکن اس کی ڈاڑھی پیچھے رہ گئی۔ آخر کار ابن مفرغ کی بدگوئیوں سے عاجز آ کر عباد نے لوگوں سے کہا کہ تم ابن مفرغ سے اپنے قرض کا مطالبہ کرو جب ابن مفرغ قرضخواہوں کی رقم ادا نہ کرسکا تو عباد نے اسے قید میں ڈالدیا، اس کے غلاموں اور حبشی لونڈیوں کو بیچ ڈالا، اُس کے بعد اُس کے گھر کا سامان بھی فروخت کر دیا۔ ابن مفرغ ایک عرصہ قید خانہ کی ہوا کھاتا رہا، بالآخر ابن مفرغ قید سے بھاگ کر بصرہ چلا گیا، وہاں سے شام پہونچا، اور اسی طرح ایک شہر سے دوسرے شہر میں بھاگا بھاگا پھرتا، اور آلِ زیاد کی ہجو کہتا رہا، ابنِ زیاد کی ماں سمیّہ کی بدکاری بیان کرتا اور معاویہ کا ابوسفیان کے ساتھ ملالینے کا قصہ سناتا رہا۔ ابن زیاد نے اس کو گرفتار کر کے بصرہ کے قید خانہ میں ڈالدیا۔ اور یزید سے اس کے قتل کی اجازت چاہی، یزید نے لکھا کہ اُسے قتل نہ کرو کیونکہ اس کے قبیلے کے لوگ فوج میں بھرے پڑے ہیں۔ اُن کو معلوم ہو جائے گا تو وہ تمھارے خون کے درپے ہو جائیں گے۔ جب عبیداللہ بن زیاد کو معلوم ہوا تو اس نے ابن مفرغ کو نبیذ پلایا، یہانتک کہ ابن مفرغ مست ہوگیا، اُس کے ساتھ ایک بلی، ایک کتا اور ایک خوک باندھکر بصرہ کے گلی کوچوں میں پھرا دیا، لڑکے اس کے پیچھے بھاگتے اور کہتے کہ "این چیست" ابن مفرغ بھی مزے لے لے کر اس طرح فارسی میں گُن گناتا۔

سُبست بنیذ است

عصارات زبیب است

سُمیّہ رد سبیذ است

یہ واقعہ یزید بن معاویہ کی خلافت کا ہے۔ یزید کی خلافت سنہ ۶۰ ہجری سے سنہ ۶۴ ہجری تک تھی۔ اس بنا پر ہم کہہ سکتے کہ یہ موزوں عبارت اسلام کے بعد قدیم ترین فارسی شعر ہے۔ اسی قسم کی ایک دوسری روایت طبری کے تاریخ کبیر میں سنہ ۱۱۹ ہجری کے ماتحت یوں ہے کہ اس سال میں ابو منذر اسد بن عبداللہ القسری نے ختلان پر چڑھائی کی، خاقان ترک سے اس کی لڑائی ہوئی، خاقان نے اُسے شکست دی، اسد بن عبداللہ پریشانی کیحالت میں ختلان سے بھاگا، اہل خراسان نے ذیل کے موزوں کلمے اس کی مذمت میں تصنیف کئے جنکو گلیوں میں لڑکے گاتے پھرتے تھے!

از ختلان آمدیہ	برو تبساہ آمدیہ
آبار باز آمدیہ	خشک نزار آمدیہ

بہرحال موضوع کی نسبت وثوق کے ساتھ ہی جا سکتا ہے کہ فارسی شاعری کا آغاز ٹھیک اسوقت ہوا جبکہ اسلام کی مرکزی قوت گھٹ گئی۔ سلطنت کا شیرازہ بکھرنے کے ساتھ ساتھ ایران کے مختلف اطراف میں چھوٹی چھوٹی خود مختار ریاستیں قایم ہوگئیں۔

نغمۂ نو

(از پرنسپل رام پرشاد کھوسلہ ناشاد ایم اے)

لاکھ ساماں ہے جہاں میں ایک عُریانی مری　　پردہ پوشِ رازِ دل ہے چاکِ دامانی مری

اضطرابِ قلب میرا ہے نہاں احباب سے　　پردۂ آبِ رواں ہے اشک افشانی مری

بیکسی درباں ہے میری یاس و غم ہیں پاسباں　　شانِ آبادی دکھاتی ہے یہ ویرانی مری

ناز ہے جمعیتِ خاطر پہ تجھ کو کس لئے　　دیکھ اے زاہد کبھی آ کر پریشانی مری

منزلِ مقصود تک لیجائیگی اِک دن مجھے　　خوئے صحرائی مری سیرِ بیابانی مری

بزمِ اربابِ خرد مجھکو حقارت سے نہ دیکھ　　عقدہائے عقل وا کرتی ہے نادانی مری

پردۂ رازِ حقیقت ہے مرا دیوانہ پن　　ڈھانپتی ہے سترِ پنہانی کو عُریانی مری

مذہب و ملّت کے جھگڑوں سے مجھے ناشاد کیا
ہے مساوی کفر میرا اور مسلمانی مری

رباعیات فراق

(از پروفیسر فراق ایم۔ اے)

ہر سمت خوشی کا سماں ہوتا ہے　　عالم ہے کہ بیہوش پڑا سوتا ہے
اے دوست مگر رات کے سنّاٹے میں　　لے لے کے ترا نام کوئی روتا ہے

ہم ہیں کہ ہیں جھیلتے مصیبت بیٹھے　　اور تم ہو کہ ڈھاتے ہو آفت بیٹھے
ہم بیٹھیں اگر سمندِ گردوں نہ اُٹھے　　تم اُٹھو اگر ابھی قیامت بیٹھے

تنقید کتب

مبادی سیاسیات[۱]

اُردو میں ایسی کتابیں بہت کم ہیں جن میں سیاسی مسائل پر روشنی ڈالی گئی ہو۔ اب چونکہ ہماری زندگی کے ہر شعبہ میں سیاسیات نے ممتاز جگہ لیلی ہے۔ ایسی حالت میں اس کی سخت ضرورت تھی کہ اُردو داں طبقہ کو بھی سیاست کے اُصول اور نظریوں سے باخبر کردیا جائے۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ مولوی ہارون خاں صاحب شیرانی صدر شعبۂ تاریخ وسیاسیات جامعہ عثمانیہ حیدرآباد نے اس اہم مسئلے کی طرف توجہ کی اور کتاب زیرنظر تالیف فرمائی جس میں سیاسیات کی ابتدائی باتوں سے بحث کی گئی ہے۔ ہمکولایق مولف سے یہ شکایت ضرور ہے کہ اس کتاب کی زبان عام فہم نہیں ہے۔ اگر فاضل مؤلف تھوڑی سی تکلیف اور گوارا فرماتے تو کتاب کی زبان اس سے زیادہ آسان ہوسکتی تھی۔

مؤلف نے جو اصطلاحیں وضع کی ہیں اُن میں بھی عوام کا چنداں خیال نہیں رکھا گیا ہے۔ ورنہ ایسے الفاظ جو آج زبانوں پر چڑھ گئے ہیں اُن کو "معرب" و "مفرس" کرنے سے کیا فائدہ ہوسکتا ہے۔ مثلاً اسکاٹ لینڈ کو اسکاچستان آئرلینڈ کو آئرستان، پولینڈ کو پولستان، سوئٹزرلینڈ کو سویزاستان، سوشل یا سماجی کو عمرانی، ایجنٹ کو عمیل، میڈرڈ کو مجریط، سوسائٹی کو معاشرہ، نازی کو نانسی، ہالینڈ کو دلندستان وغیرہ سے تبدیل کردینا زبان کی راہ ترقی میں رکاوٹیں پیدا کرنے کے مرادف ہے۔ اسی طرح (Capitalist) کا ترجمہ سرمایہ دار کرنا چاہئے جو رائج ہوچکا ہے۔ مولف نے اس جگہ "اصل دار" کو رائج کرنے کی جو کوشش کی ہے وہ بارآور ثابت نہیں ہوسکتی اسی طرح (Destructive Argument.) کا صحیح ترجمہ "تخریبی دلیل" ہوگا۔ لیکن فاضل مؤلف نے اس کی جگہ پر "انہدامی دلیل" کی نئی ترکیب ایجاد کی ہے۔ (Cooperation) کا ترجمہ "اتحاد عمل" ہونا چاہیے۔ "ہمکاری" "اور تعامل" کی اجنبیت کو زبان اُردو برداشت نہیں کرسکتی۔

بحیثیت مجموعی کتاب تحقیق سے لکھی گئی ہے اور سیاسیات کے تمام ابتدائی مسائل شرح وبسط سے بیان کئے گئے ہیں۔ کتاب کا وہ حصہ خصوصیت سے قابل دید ہے جہاں اس مسئلہ پر گفتگو کی گئی ہے کہ زبان کی یگانگت سیاسی اتحاد کے لئے کہاں تک ضروری ہے۔ آجکل جبکہ ہندی اُردو کا قضیہ ملک میں اہمیت حاصل کرتا جارہا ہے اس

---

[۱] مولفہ ہارون خانصاحب شیرانی۔ ضخامت ۱۹۲ صفحات۔ قیمت عہ ملنے کا پتہ:۔ غلام دستگیر بکڈپو۔ جامعہ عثمانیہ۔ حیدرآباد دکن۔

جزو کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

"جرمنی اور آسٹریا کے باشندے، گو یہ سب کے سب ایک ہی زبان بولتے ہیں، سیاسی اعتبار سے متحد نظر نہیں آتے۔ اُدھر کوہ برانس کے اس پار جاؤ تو دیکھو گے کہ اس بیسویں صدی میں جب ہر طرف قومیت کا ڈنکا بج رہا ہے کس طرح ہسپانوی جو سب کے سب تقریباً ایک ہی قسم کی بولیاں بولتے ہیں، ایک دوسرے کے گلے کاٹ رہے ہیں۔ پھر یہ بھی ممکن ہے کہ دو مختلف النوع زبانیں بولنے والے ایک دوسرے کے ساتھ سیاسی طور پر مدغم ہو جائیں۔ ویلز کی زبان انگریزی سے اتنی ہی مختلف ہوگی جتنی برہمی زبان سے اردو۔ تاہم ویلز و انگلستان کے درمیان سات سو برس سے جو سیاسی یگانگت ہے وہ باعث رشک ہے۔......

ان سب باتوں کو مدنظر رکھ کر ہم کہہ سکتے ہیں کہ سیاسی اتحاد کے لئے لسانی اتحاد لازمی نہیں ہے۔"

بہرکیف کتاب محنت و جانفشانی اور تحقیق و تدقیق سے لکھی گئی ہے اور اردو کے علمی ذخیرے میں ایک گرانقدر اضافہ ہے۔ اس کی ظاہری حیثیت لکھائی اور چھپائی بھی اچھی ہے۔

بیاض سخن[۵]

مؤلف نے یہ کتاب اعلیٰ حضرت شہریار دکن کی سلور جوبلی کے موقع پر بطور یادگار شایع کی ہے۔ اس میں شعرائے ماضی و حال کے مختصر تذکرے اور اُن کی غزلیات کے انتخابات درج ہیں۔ لیکن یہ شعرا کا کوئی تذکرہ نہیں بلکہ صرف بیاض ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ بیاض کا شوق عام تھا لیکن اب نہ کسی کو بیاضیں مرتب کرنے کا شوق ہے اور نہ فرصت۔ لائق مولف نے شعرا کو کئی گروہوں میں تقسیم کیا (۱) موجدین (۲) متقدمین (۳) متوسطین۔ (۴) متاخرین (۵) خواتین (۶) یورپین (۷) اَن پڑھ (۸) ہندی۔ کل ۳۲۰ شعراء کے اشعار کا انتخاب یکجا کیا گیا ہے۔ "موجدین" سے کیا مراد ہے۔ اس کو غالباً لائق مؤلف ہی سمجھ سکیں اگر ان شعراء سے مطلب ہوتا جنھوں نے کوئی مخصوص طرز ایجاد کیا تو یہ حق بجانب ہو سکتا ہے۔ لیکن اگر موجد سے "ہندی شاعری" کی "ایجاد" کرنے والا مراد ہے تو ہمیں مؤلف کی رائے سے اختلاف ہے۔ اس لئے کہ اردو برج بھاشا کی ترقی یافتہ صورت ہے اور اسی طرح اس کی شاعری بھی۔ اس سلسلہ میں ایجاد اور موجد کا سوال پیدا ہی نہیں ہوتا!

اشعار کے انتخاب میں بھی کوئی یکسانیت نہیں ہے اور چند مشہور شعراء کا کوئی تذکرہ بھی نہیں کیا گیا ہے۔ مثلاً علی میاں کامل۔ نوبت رائے نظر۔ آنند نراین مُلّا۔ فراق گورکھپوری۔ اور جگر بریلوی وغیرہ۔ اَن پڑھ شعراء میں بھی چھنگا صاحب حسین۔ ننھو صاحب شفیق اور نانک لکھنوی کے نام رہ گئے ہیں۔ ہمیں اُمید ہے کہ آئندہ اشاعت میں یہ کمی پوری کر دی جائے گی۔ اور اشعار کے انتخاب پر خاص توجہ کی جائے گی۔

---

[۵] مولفہ خواجہ عبدالشکور صاحب شیدا۔ صفحات ۲۴۶ قیمت عہ۔ ملنے کا پتہ جلیل احمد صاحب نعمانی مہتمم کتب خا

اگر فرصت ملے تو جناب شیدا کو اس طرف بھی متوجہ ہونا چاہیئے۔ بعض اشعار بھی غلط درج ہو گئے ہیں مثلاً جگر و موہانی کا یہ شعر ؎

نشیمن پھونکنے والے ہماری زندگی یہ ہے ۔۔۔ کبھی روئے کبھی سجدے کئے خاکِ نشیمن پر

بیاضِ سخن میں اس طرح شایع ہوا ہے کہ ؎

نشیمن پھونکنے والے ہماری زندگی یہ ہے ۔۔۔ کبھی روئے کبھی فریاد کی خاکِ نشیمن پر

بعض جگہ زبان کی بھی غلطیاں ہیں۔ لیکن اِن چند خامیوں کے باوجود یہ بیاض اس قابل ضرور ہے کہ شایقین اسے منگا کر اپنے کتب خانوں میں جگہ دیں۔

دیوانِ بیدار[1]

میر محمد علی عرف میر محمدی بیدار دہلوی، میر اور سودا کے ہمعصر تھے۔ ان کا تذکرہ "نکات الشعراء" "تذکرۂ شعرائے اُردو"، "مخزنِ نکات" "چمنستانِ شعراء"، "شعرالہند" اور "گلِ رعنا" وغیرہ میں موجود ہے۔ لیکن آپکا دیوان کمیاب ہی نہیں بلکہ نایاب تھا۔ جناب جلیل احمد صاحب قدوائی نے دیوان کی اشاعت کی طرف توجہ کر کے اسلاف پرستی کا نمونہ پیش کیا ہے۔ ابتداء میں جناب جلیل صاحب کا ایک قابل قدر مقدمہ ہے اور جگہ جگہ حواشی بھی لکھدئے گئے ہیں۔ قدیم اُردو تذکرہ نویسوں کے یہاں یہ خاص بات پائی جاتی ہے کہ وہ شعراء کے حالات زندگی درج نہیں کرتے بالخصوص بیدار کے حالات زندگی کے متعلق سب خاموش ہیں۔ اسلئے جلیل صاحب کو حالات زندگی کے فراہم کرنے میں بڑی دشواریاں پیش آئی ہیں۔ اور بعض جگہ انتہائی کدو کاوش کے بعد بھی صرف قیاس آرائی سے کام لینا پڑا ہے۔ مُرتّب نے مقدمہ کو حتی الامکان جامع بنانے کی کوشش کی ہے۔ اور دبی زبان سے بیدار کی کمزوریاں بھی گنا دی ہیں۔

بیدار کا کلام دیکھنے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اُن پر درد کا کلام خاص طور سے اثر انداز ہوا تھا۔ رنگِ سخن درد سے بہت کچھ ملتا جلتا ہے۔ انداز بیان لطیف اور زبان صاف ہے۔ تصوّف کے علاوہ جذبات کی سچّی تصویریں اور وارداتِ عشق کے دلکش مرقعے پائے جاتے ہیں۔ لطیف اور نادر تشبیہوں نے بعض جگہ بہت لطف پیدا کر دیا ہے۔ تفنّنِ طبع کے لئے چند شعر ذیل میں درج کئے جاتے ہیں:-

مغتنم جانو ہم سے مخلص کو ۔۔۔ ڈھونڈھیئے گا تو پھر نہ پایئے گا

صبح کو بے نور تجھ بن ہر چراغ لالہ تھا ۔۔۔ جائے بانگِ گل چمن لبریز آہ و نالہ تھا

---

[1] جلیل احمد صاحب قدوائی۔ ایم۔ اے۔ لکچرار مسلم یونیورسٹی علیگڈھ۔ مطبوعہ ہندوستانی اکیڈیمی الہ آباد صفحات ۱۶۷۔ قیمت مجلد دو روپیہ (۲) غیر مجلد ۱۲/۔ ملنے کا پتہ:- کتابستان الہ آباد۔

نہ پہونچے گا مقصد کو کم ہمتی سے
جو سالک طلب کا بہ منزل رہے گا

آپ کی چاہ سے چاہے ہیں مجھے سب ورنہ
کون پھر یاد کرے تم نہ اگر یاد کرو

ہیں گرم گفتگو گل و بلبل چمن کے بیچ
ہو گا خلل صبا جو کوئی بات ہل گیا

بعض جگہ بیدار کے کلام میں ایہام، رعایت لفظی، عامیانہ جذبات اور بے مزہ اشعار کی مثالیں بھی ملتی ہیں مثلاً:-

آہ کیا جانئے کہاں وہ بت خودکام رہا
کہ مجھے رات کو یک دم بھی نہ آرام رہا

نہیں گنجایش مُو اس دہن میں
نہیں جائے سخن کچھ اس سخن میں

حیف اے نور نظر تجھ کو نہ آئی غیرت
اشک آ تیری جگہ دیدۂ گریاں میں رہا

لیکن ان اشعار کو اُس زمانہ کی سوسائٹی کے مذاق کا تابع سمجھنا چاہیئے۔

بحیثیت مجموعی دیوان بیدار اُردو ادب میں ایک قابل قدر اضافہ ہے۔

کسان کے مطالبات[۵]

ہندوستان کی اقتصادی حالت روز بروز ابتر ہوتی جا رہی ہے۔ جس سے ہندوستانی کسان کی مالی حالت ناگفتہ بہ ہو گئی ہے۔ ملک کے طول و عرض میں صدائے احتجاج گونج رہی ہے اور حکومت کو مناسب تدابیر اختیار کرنے کے مشورے دئے جا رہے ہیں۔ کسانوں کی مفلسی کے مسئلہ کی اہمیت ہی اس کتاب کی تصنیف کی محرک ہوئی ہے۔ مصنف کی تحریر کا لہجہ دردآمیز ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ الفاظ دل کی گہرائیوں سے نکل رہے ہیں۔ کسانوں کے تمام مطالبات خلوص سے پیش کئے گئے ہیں۔ اُن میں تصنع اور بناوٹ کا لگاؤ بھی نہیں ہے۔ زبان صاف اور عبارت مُدلّل ہے۔ کہیں کہیں صرفی اور نحوی غلطیاں ہیں۔ جو نظرانداز کی جا سکتی ہیں۔

مصنف کے خیال کے مطابق روٹی اور کپڑے کا جو اہم سوال کسانوں کے سامنے درپیش ہے اس کے حل کرنے کی مختلف تدبیریں ہیں۔ ان میں نو تدبیریں جنھیں اُنھوں نے کسانوں کے مطالبات کے نام سے یاد کیا ہے خاص ہیں۔

"(۱) اجناس کی قیمت مقرر کر دی جائے (۲) ملاوٹ کا انسداد کیا جائے (۳) کسان اپنی اراضی کا مالک ہو (۴) باربرداری کی سہولتیں مہیّا کی جائیں (۵) رشوت ستانی قطعی بند کر دی جائے (۶) کسان کو قرضہ سے نجات دلائی جائے۔ (۷) آبیانہ، ٹیکس، کورٹ فیس وغیرہ میں کمی کی جائے (۸) ابتدائی اور لازمی تعلیم مفت ہونی چاہیئے اور کسان کی صحت اور علاج کا معقول انتظام کیا جائے۔

ان مطالبات کے علاوہ اس بات کی بھی ضرورت ہے کہ ان کے لئے کوئی ضمنی پیشہ ایسا بتایا جائے جس سے

---

۵ مصنفہ چودھری مختار سنگھ صاحب۔ مطبوعہ جامعہ ملیہ پریس دہلی۔ صفحات ۲۱۰۔ قیمت ۱۲ر ملنے کا پتہ:۔ تیج بکڈپو دہلی۔

وہ اس زمانہ میں فائدہ حاصل کر سکیں جب کہ کھیت فصلوں سے خالی ہوتے ہیں، کاشتکاروں کو زراعت کے ترقی یافتہ اصولوں کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیئے۔ ورنہ زمانہ میں صنعت و حرفت کی ترقی کی جو لہر دوڑ رہی ہے وہ ان کسانوں کی بربادی کا مزید سامان پیدا کردے گی۔

ہندوستانی کسانوں کے حالات سے دلچسپی لینے والے اور گرام سدھار کا کام کرنے والے اصحاب کو یہ کتاب ضرور پڑھنا چاہیئے۔

پریم کہانی[1]

زیر نظر کتاب سابق شہنشاہ ایڈورڈ ہشتم اور مسز سمپسن کا افسانۂ حیات ہے۔ امریکہ، یورپ اور دوسرے ممالک کے اخبارات میں دُنیا کی ان مشہور ترین ہستیوں کے بارے میں جو کچھ شائع ہوا ہے وہ اس کتاب میں ترتیب کے ساتھ شائع کر دئے گئے ہیں۔ لیکن ابواب کی تقسیم اور پلاٹ کی ترتیب کسی قدر ناہموار ہے مگر واقعات بیان کرنے میں مصنف نے کافی احتیاط برتی ہے اور وزیر اعظم کو اُن الزامات سے بری الذمہ قرار دیا ہے جو انگلستان میں مختلف اخباروں کی جانب سے اُن پر کئے جاتے ہیں۔ کتاب کے مطالعہ سے شہنشاہ سابق اور اُن کی محبوبہ کی زندگی کے متعلق جو انکشافات ہوتے ہیں اُن سے ان دونوں ہستیوں کے بلند کردار نمایاں ہو جاتے ہیں۔

اس کتاب کی زبان معمولی ہے اور بعض جگہ معمولی غلطیاں بھی رہ گئی ہیں لیکن اس کے باوجود کتاب قابل مطالعہ ضرور ہے۔ کیونکہ یہ "لیلیٰ مجنوں"، "شیریں فرہاد"، "وامق عذرا"، "نل اور دمینتی" کے افسانوں کی زندہ تصدیق ہے۔

سالنامہ انجمن طلبہ قدیم سٹی کالج حیدرآباد[2]

انجمن طلبۂ قدیم سٹی کالج حیدرآباد نے زیر ادارت جناب سید محی الدین قادری صاحب زور ایک ضخیم سالنامہ شائع کیا ہے۔ جس کے بیشتر صفحات میں سٹی کالج سے متعلقہ مضامین درج ہیں۔ مثلاً سٹی کالج کے آغاز۔ ابتدائی دور۔ و مختلف ارتقائی منازل کی یاد وغیرہ۔ اس کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ پورے پرچے میں صرف سٹی کالج کے پُرانے طلبا کے مضامین نظم و نثر شامل کئے گئے ہیں۔ کالج کے متعلق تاریخی مضامین کے علاوہ غیر متعلق حضرات کی دلچسپی کیلئے چند افسانے ڈرامے اور اردو و فارسی نظمیں بھی شامل کر دیگئی ہیں۔ نظموں میں "رود موسیٰ کی طغیانی میں دیکھکر" اور "اے دوست" خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ "پروین" اور "صلائے عام" دلچسپ طبعزاد اصلاحی ڈرامے ہیں۔ ہم اس کی اشاعت پر کارکنان انجمن طلباء قدیم سٹی کالج حیدرآباد کو تہ دل سے مبارکباد دیتے ہیں۔

---

[1] مصنفہ پیارے لال صاحب بھلہ۔ حجم ۱۳۲ صفحات۔ قیمت ۱۲ آنہ۔ ملنے کا پتہ:- آریہ پستک بھنڈار۔ نئی سڑک دہلی۔

[2] سالنامہ کی ضخامت علاوہ تصاویر کے تقریباً دو سو صفحات ہے۔ ملنے کا پتہ:- سٹی کالج بکڈپو حیدرآباد

لطفِ سخن

میر کی مشہور غزل "جان ہے تو جہان ہے پیارے" کی زمین میں ہمارے محب و مکرم حضرت فراق گورکھپوری اور پنڈت آنند نرائن ملا کی دلکش غزلیات زمانہ اپریل ۱۹۴۰ء میں شائع ہو چکی ہیں۔ مگر اس زمین کی دلآویزی نے کئی سخنور احباب کو متوجہ کیا ہے چنانچہ اس ردیف میں بہ تبدیل قافیہ کئی غزلیں موصول ہوئی ہیں جن میں تین منتخب غزلیں ذیل میں ہدیہ ناظرین کیجاتی ہیں۔ تینوں اپنے اپنے رنگ میں خوب ہیں مگر ہمارے محترم دوست حضرت اثر و حضرت فراقی نے قافیہ بھی وہی رکھا ہے جو میر کا تھا۔ زمانہ کے محدود صفحات میں غزلیات کے لئے بہت کم گنجائش رہتی ہے اور اس ردیف پر کافی طبع آزمائی ہو بھی چکی ہے۔ اس لئے دیگر غزلیات نہیں شائع کی جا رہی ہیں۔ ا۔ ز۔

از خان بہادر مرزا جعفر علی خاں صاحب اثر لکھنوی۔ بی۔ اے

رشکِ اُلفت کی جان ہے پیارے
جان ہے تو جہان ہے پیارے

تو حیا، اور حیا مرا ایمان؟
کس لئے بدگمان ہے پیارے

اشک نقش و نگارِ حسرت ہیں
زخمِ دل کا نشان ہے پیارے

عشق کی تو نہ آزمائش کر
عشق خود امتحان ہے پیارے

درد میں ہنس کے بجلیاں بھر دیں
کس قدر مہربان ہے پیارے

دل سے کیوں دُور دُور پھرتا ہے
صاف ستھرا مکان ہے پیارے

دیکھئے جس کو تیرا شیدا ہے
ایک آفت میں جان ہے پیارے؟

ربط ہو جس کو کہنے سُننے سے
عشق کیا داستان ہے پیارے

تجکو اپنی ہی دلبری کی قسم
کچھ ہمارا بھی دھیان ہے پیارے

رُوٹھنا آپ، آپ من جانا
عاشقوں کی یہ شان ہے پیارے

دل جلوں کی ہے خاک بھی برباد
اب تو خاطر نشان ہے پیارے؟

سونی سونی سی دل کی بستی ہے
تو جو نامہربان ہے پیارے

ہوں تو درویش پھر بھی تجھ سے ہوس
مان کا ایک پان ہے پیارے

خواب چین و عرب کے دیکھ چکا
چیت! ہندوستان ہے پیارے

میر صاحب کی ہو غزل جس میں
وہ زمین آسمان ہے پیارے

قولِ اُستادِ آثرؔ کی تضمین ہے ۔۔۔ لاکھ تو خوش بیان ہے پیارے
"گفتگو ریختے میں ہم سے نہ کر ۔۔۔ یہ ہماری زبان ہے پیارے"

از راے سدھ ناتھ بلی صاحب فراقی دریابادی

تم سے کب پیاری جان ہے پیارے ۔۔۔ ایسا ناحق گمان ہے پیارے
اُٹھ سکے گا نہ بارِ غم اس سے ۔۔۔ دل بہت ناتوان ہے پیارے
ایک تیری پھری نگاہ نہیں ۔۔۔ میرا دشمن جہان ہے پیارے
یہ سویدائے دل نہیں ہرگز ۔۔۔ دل جلوں کا نشان ہے پیارے
ہوتے ہیں ساتھ نالہ و فریاد ۔۔۔ عاشقوں کی یہ شان ہے پیارے
کہیں آنا نہ اس کی باتوں میں ۔۔۔ فتنہ گر آسمان ہے پیارے
ہوں کسی حال میں مجھے تیرا ۔۔۔ رہتا ہر وقت دھیان ہے پیارے
تم جو ٹھہرو کہیں ہے عین خوشی ۔۔۔ دل کا حاضر مکان ہے پیارے
کھینچ لیتی ہے دل جو عالم کا ۔۔۔ تیری شیریں زبان ہے پیارے
داد دیتا کہیں جو ہوتا میرؔ ۔۔۔ کتنی سُلجھی زبان ہے پیارے
غم نہیں ہے کوئی فراقیؔ کو ۔۔۔ تو اگر مہربان ہے پیارے

از حضرت شاھدؔ صدیقی اکبرآبادی

زیست اک اضطراب ہے پیارے ۔۔۔ سانس لینا عذاب ہے پیارے
عشق کے درد کو حقیر نہ جان ۔۔۔ خود ترا انتخاب ہے پیارے
خیر ہو تیری بے نیازی کی ۔۔۔ ساری دنیا خراب ہے پیارے
اپنی مخمور زندگی کی قسم ! ۔۔۔ تو مجسّم شراب ہے پیارے
تیری شانِ حجاب کیا کہنا ! ۔۔۔ ہر نظر کامیاب ہے پیارے
عشق کی زندگی خدا رکھے ۔۔۔ موت جس کا شباب ہے پیارے
تو بھی تسکین دے چکا مجھ کو ۔۔۔ پھر بھی اک اضطراب ہے پیارے
کس سے ممکن ہے شکرِ پرسشِ حال ۔۔۔ خامشی ہی جواب ہے پیارے
ہائے وہ بندۂ وفا شاھدؔ ۔۔۔ جس پہ تیرا عتاب ہے پیارے

رفتارِ زمانہ

چین و جاپان

اگر ایشیا و یوروپ کو ایک ہی برّاعظم مان لیا جائے تو اس وسیع حصۂ ارض کے مشرق و مغرب میں دو مجمع الجزایر یعنی جاپان و برطانیہ جغرافیائی اور سیاسی حالات کے اعتبار سے ایک دوسرے سے بہت ملتے جلتے ہیں۔ جاپان میں صنعت و حرفت کی غیر معمولی ترقی سے تجارت میں بیحد اضافہ ہوگیا ہے جس کا نتیجہ دولت کی فراوانی، خوشحالی اور کثرت آبادی ہے۔ چنانچہ جاپان اپنی روز افزوں آبادی کے باعث سخت پریشان ہے۔ اس کے علاوہ اُسے اپنے کارخانوں کے لئے اجناس خام کی بھی ہر وقت فکر رہتی ہے جس کی وجہ سے اُسے دوسرے ملکوں کی طرف دیکھنا پڑتا ہے۔

جاپان کے مشرق میں کناڈا و امریکہ ہیں، مغرب میں چین و روس اور جنوب میں مقبوضات آسٹریلیا ہیں۔ لیکن امریکہ، کناڈا، روس و آسٹریلیا میں جاپانیوں کو گھسنے نہیں دیا جاتا اسلئے جاپانیوں کی نظریں اپنے قریب ترین ملک چین ہی کی طرف اُٹھتی ہیں، جو وسیع، زرخیز اور قدرتی دولت سے مالا مال ہونیکے ساتھ ہی اپنی خانہ جنگیوں کی وجہ کمزور ہے۔

جاپان بھی اپنی امپیریلسٹ اغراض کے لئے عموماً وہی چالیں چلتا ہے جو برطانیہ کی خصوصیات میں داخل ہوچکی ہیں۔ چنانچہ ۱۸۷۵ء سے اس نے چین میں پاؤں پھیلانا شروع کردیا تھا۔ اس بارہ میں جاپان کو سب سے پہلی سیاسی فتح ۱۸۷۶ء میں حاصل ہوئی۔ جب کوریا کو مجبوراً اس کے ساتھ تجارتی معاہدہ کرنا پڑا۔ ۱۸۹۵ء میں جاپان نے چین کو شکست دیکر اس سے جزیرہ فارموسا لیا۔ ۱۹۰۵ء یعنی جنگ روس و جاپان کے بعد سے جاپان کی دست درازیوں میں اور زیادتی ہوگئی۔ چنانچہ اُس وقت سے وہ وقتاً فوقتاً کوئی نہ کوئی چھیڑ اٹھا کر شمالی چین کا کوئی نہ کوئی حصہ دبا لیتا ہے۔ مثلاً ۱۹۱۰ء میں جاپان نے کوریا کا الحاق کیا۔ ۱۹۳۱ء میں مانچوریا لے لیا۔ ۱۹۳۳ء میں جیہول غصب کیا۔ ۱۹۳۵ء مشرقی چاہار اور مشرقی ہوپی چھین لئے، اور ۱۹۳۶ء میں اس نے سنگنائی پر قبضہ جما لیا۔ اور اب مزید علاقہ چھیننے کی فکر کررہا ہے۔

اس کی یہ تمنا ہے کہ دریائے یانگسی کے شمالی کنارہ تک تمام ملک چین پر قبضہ کرلے۔ اس وقت جاپان کا دانت صوبۂ ہوپیائی پر ہے۔ اور چاہتا ہے کہ اس علاقہ سے تمام چینی فوجیں ہٹالی جائیں تاکہ اس کو اطمینان کیساتھ اپنا تسلّط قایم کرنے کا موقعہ ملے۔

صوبۂ ہوپیائی، چین کی کنجی ہے۔ جس میں پی پنگ اور ٹین ٹسین دو بڑے شہر اور تانگو ایک عمدہ بندرگاہ ہے۔ اور تین کروڑ کی آبادی ہے۔ اس کا رقبہ اٹلی کے برابر ہے۔ چین کی اکیاون فیصدی کوئلہ کی کانیں اسی علاقہ

میں ہیں۔ اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ تمام صوبہ میں ریلوے لائنوں کا جال بچھا ہوا ہے۔ اس لئے اگر ہوپیائی پر جاپان کا قبضہ ہو جائے تو وہ آس پاس کے صوبوں پر بڑی آسانی سے قبضہ جمالے گا۔

اس مقصد کے لئے جاپان اپنی ریشہ دوانیوں میں دو سال سے مصروف ہے۔ اس نے کچھ دن ہوئے صوبۂ ہوپیائی کے وطن فروش حکام کو رشوتیں دیکر وہاں تحریک آزادی وخود مختاری پھیلادی۔ اور اس کے بعد نانکن کی مرکزی گورنمنٹ سے گفتگو کرنے کے بجائے اُس نے انھیں غدّار مقامی حکام سے بات چیت شروع کردی ان وطن فروشوں کا سردار چینی جنرل سنگ چیہ یوان ہے جو چینی لشکر ۲۹ کا کمانڈر ہے۔ تین چار مہینے سے جنوبی منچوریا ریلوے کے جاپانی افسران اس امر کی کوشش کر رہے تھے۔ کہ انھیں مشرقی ہوپیائی کے وسط میں ایک ریلوے لائن تعمیر کرنے کی اجازت مل جائے۔ جس کا ایک سرا سانگچاؤ میں اور دوسرا سرا شیہہ کیاچواگ میں ہو۔ چنانچہ یہ تجویز چینی جنرل سانگ نے منظور کرلی۔ لیکن نانکن کی مرکزی گورنمنٹ نے اس درخواست کو مسترد کردیا۔ کیونکہ اس ریلوے کی تعمیر سے ایک تو صوبۂ ہوپیائی دو حصّوں میں تقسیم ہو جاتا۔ دوسرے ریلوے کی حفاظت کے بہانہ سے جاپان کو وہاں اپنی فوجیں رکھنے کا موقع ملتا۔ تیسرے شمالی چین کی تمام ریلوے لائنوں پر جاپان کا قبضہ ہو جاتا۔"

اس وقت چین وجاپان کے درمیان یہی بات بنائے مخاصمت ہے۔

تقریباً دو مہینے ہوئے جب جنرل سنگ کے سازباز کا حال مارشل چیانگ کائی شیک کو معلوم ہوا تو انہوں نے اسے صوبہ ہوپیائی سے تبدیل کرنا چاہا۔ مگر یہ بات جنرل سنگ کو بھی کسی طرح معلوم ہوگئی۔ اور وہ "آرام لینے" کے بہانہ سے دیہات چلا گیا مگر اس کے بعد ہی جنرل سنگ کی فوج جاپانی فوج سے لڑ پڑی۔ جس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ یہ سب جنرل سنگ کی ملی بھگت تھی۔

اس تصادم کے بعد ہی جاپان نے چین کے سامنے مندرجہ ذیل مطالبات پیش کئے:۔

(۱) صوبہ ہوپیائی کے شمالی حصّہ کو صوبہ چاہار کے مشرقی حصّہ سے ملاکر ایک آزاد اور خود مختار ریاست قایم کیجائے جس کا دارالحکومت ٹین ٹسین ہو۔

(۲) تانگکو میں جو ٹین ٹسین کے قریب بندرگاہ ہے، جاپان کا بحری مستقر قایم ہوگا۔

(۳) پی پنگ (سابق پیکن) کے علاقہ سے تمام چینی فوجیں ہٹالی جائیں اور تمام قلعے اور فوجی استحکامات مسمار کردئے جائیں۔ جاپانی مفاد کی حفاظت کے لئے جاپان کا ایک فوجی دستہ تعینات رہے۔

(۴) جاپان کی موجودہ فوجی نقل وحرکت کا خرچہ ہوپیائی کی جدید ریاست سے دلایا جائے۔

(۵) چین کی مرکزی گورنمنٹ جاپان کے خلاف سرگرمیوں سے باز رہے۔

(۶) شمالی چین کے جھگڑے کو مقامی طور پر طے کیا جائے۔

(۷) شمالی چین میں جو فوجیں اور ہوائی جہاز بھیجے گئے۔ ہیں وہ واپس بلا لئے جائیں۔

ان شرطوں سے صاف ظاہر ہے کہ جاپان شمالی چین کو مرکزی حکومت کے اثر سے آزاد کرا کے خود قبضہ کرنا چاہتا ہے۔ اور صوبہ ہوپیائی کی برائے نام آزادی وخودمختاری، بھی اسی قسم کی ہوگی جیسی کہ مانچوکو کی ہے۔ چین کی مرکزی حکومت نے یہ شرطیں نامنظور کردی ہیں۔ اسلئے فریقین میں خونریزی ہورہی ہے۔ جنگی تفصیلات کی یہاں گنجایش نہیں ہے۔ مگر یہ بات قابل ذکر ہے کہ جنگ کا سب سے زیادہ زور چین کے سب سے بڑے اور مشہور بین الاقوامی شہر شنگھائی میں ہے۔ یہاں غیر ملکی طاقتوں کی سب سے بڑی اجارہ داری ہے، جسے جاپان مٹانے پر تلا ہوا ہے، کیونکہ وہ یہ نہیں چاہتا کہ اسکے علاوہ چین میں کسی دوسری طاقت کا عمل دخل ہو۔ امریکہ اور برطانیہ نے فریقین کو بین الاقوامی اجارہ داری کا احترام کرنیکی تاکید کی ہے۔ اور اپنے اپنے نقصانات کا تاوان وصول کرنیکی بھی دھمکی دی ہے۔ لیکن ابھی تک اس تنبیہ کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ چین نے تو برطانوی تجاویز کو قبول کرنا منظور بھی کرلیا ہے۔ لیکن جاپان نے جواب تک نہیں دیا۔

اصل بات یہ ہے کہ جاپان کسی دوسری قوم کو چین میں دیکھنا نہیں چاہتا۔ چنانچہ وزیر اعظم جاپان پرنس کونوے نے صاف کہدیا ہے کہ یہ چین وجاپان کی لڑائی ہے جسے وہ دونوں آپس میں نبٹ لینگے۔ کسی تیسری قوم کو دخل دینے کی ضرورت نہیں۔ اسکے معنی یہ ہیں کہ دوسری قومیں چین کی کوئی مدد نہ کریں۔ بلکہ اسے جاپان کے رحم وکرم پر چھوڑ دیں تاکہ وہ جو چاہے کرے۔ اس سے یہ بھی بخوبی واضح ہوگیا کہ جاپان چین میں برطانیہ، فرانس، امریکہ اور دیگر سلطنتوں کے حقوق تسلیم نہیں کرتا اور اسی وجہ سے اسکے جنگی جہاز شنگھائی پر شدید گولہ باری کرکے اور بم گرا کرا اینٹ سے اینٹ بجارہے ہیں۔

چند سال ہوئے چین کے متعلق نو سلطنتوں کا ایک معاہدہ ہوا تھا، جس پر چین، جاپان، برطانیہ، فرانس، امریکہ، روس، ہالینڈ، اٹلی اور پرتگال نے دستخط کئے تھے۔ اس معاہدہ کی ایک ضروری شرط یہ بھی ہے کہ چین کی آزادی، چین کی حکمرانی اور چین کے حدود کو بحال رکھا جائیگا۔ مگر جاپان نے اس معاہدہ کو ردی کی ٹوکری میں ڈالدیا ہے۔ "جاپان ٹائمس" نے حال میں لکھا ہے کہ جب تک چین کو کافی سزا نہ دیجائے گی، اُس وقت تک جاپان جنگ سے باز نہ آئے گا۔ بہرحال جاپان چین کو مزید طاقت حاصل کرنے سے پہلے ہی مغلوب ومفتوح کرلینا چاہتا ہے۔ جاپان ایسا کیوں کرنا چاہتا ہے؟ اسکی وجہ یہ ہے کہ وہ خوب جانتا ہے کہ اسوقت برطانیہ، فرانس، اٹلی اور پرتگال اسپین کی خانہ جنگی کے سلسلہ میں پھنسے ہوئے ہیں۔ ان میں اس وقت کوئی بھی جاپان سے جنگ کرنے کو تیار نہیں ہے۔ جرمنی اول تو جاپان کا دوست ہے۔ دوسرے اس وقت اسکی طرف ہے .... ۔ جاپان یہ بھی جانتا ہے کہ امریکہ نہ اُس سے لڑ سکتا ہے اور نہ لڑنا چاہتا ہے۔ اب رہ گیا روس کا معاملہ تو دریائے آمور کے واقعہ سے جاپان پر ثابت ہوگیا ہے کہ وہ بھی جنگ سے گریز کرتا ہے۔ اس کے علاوہ بہت سے جرنیلوں کو قتل کرنیکے بعد جنگی نقطۂ نظر سے روس بہت کمزور ہوگیا ہے۔ پھر جاپان کو مشرقی ایشیا کو فتح کرنے کا اس سے بہتر اور کون موقعہ ہوسکتا ہے؟ دوسری طرف چینی جنرل مارشل چیانگ کائی شیک بھی ان تمام بین الاقوامی پیچیدگیوں سے بخوبی واقف ہے اور خوب جانتا ہے کہ اسوقت کوئی دوسری طاقت چین کی مدد نہیں کریگی۔ اسلئے اپنی آزادی کو محفوظ رکھنے کیلئے چین ہی کو جاپان سے ٹکر لینا پڑیگی۔ یہی وجہ ہے کہ اس وقت چین نے بھی جاپان کی دراز دستیوں کی پوری طرح

مزاحمت کرنیکا تہیہ کرلیا ہے۔ اس طرح اسوقت چین کیلئے جنگ کے سوائے اور کوئی چارہ کار نہیں ہے۔ اگر اب بھی چین نے کمزوری دکھائی تو وہ اپنے گلے میں اپنے ہاتھوں ہی پھانسی ڈال لے گا۔

اگرچہ بلحاظ تربیت و تنظیم چین کی فوجیں جاپانیوں کا مقابلہ نہیں کرسکتیں، اور چین کی بحری اور ہوائی طاقت بھی جاپان سے کمزور ہے۔ لیکن اب چین اتنا کمزور نہیں رہا جتنا کہ ۱۹۳۲ء میں تھا۔ اس وقت وہ پانچ لاکھ فوج کیل کانٹے سے درست میدان میں لاسکتا ہے، چینی فوجوں کو جرمن جرنیلوں نے تربیت دی۔ اور ہوائی طاقت بھی بڑھ گئی ہے۔ اور اسے انگریز ہوا بازوں سے ٹریننگ ملی ہے یا نہیں ہے، اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ چین کی چالیس کروڑ کی آبادی جاپان کے خلاف بھری بیٹھی ہے اور اس قومی طاقت کا توپ و تفنگ کے بالمقابل استعمال کام ہے۔ اس وقت تمام دنیا کی ہمدردی چین کیساتھ ہے۔ لیکن اس آڑے وقت میں صرف چین کی ذاتی طاقت، جنگ کی طوالت اور دوسروں کی مالی امداد ہی سے فائدہ پہونچ سکتا ہے۔ ذاتی طاقت سے تو چین اس وقت خوب کام لے رہا ہے۔ اور اگر جنگ نے طول کھینچا اور چین اسی پامردی کے ساتھ لڑتا رہا تو آخر میں فتح اسی کی ہونا چاہیئے۔ کیونکہ جاپان کی مالی و اقتصادی حالت میں طویل جنگ کی صورت میں ایک انقلاب عظیم پیدا ہوجائے گا۔ اور اسکی وہی حالت ہوجائے گی جو گذشتہ جنگ یورپ میں روس و جرمنی کی ہوگئی تھی۔ ہمارا خیال ہے کہ یہ جنگ طول ضرور کھینچیگی۔ بقول ٹائمس آف انڈیا۔ ماہ اگست میں جاپان سے بمبئی کو مال لانے والے بارہ جہازوں میں سے چھ جہاز حکومت نے واپس بلائے ہیں کیونکہ فوج اور سامان جنگ بھیجنے کے لئے جاپان کو اسوقت زیادہ سے زیادہ جہازوں کی ضرورت ہے۔ جنگ میں کامیابی کیلئے روپیہ کی بھی بہت بڑی ضرورت ہے۔ چنانچہ اگر دوسری سلطنتیں چین کو مالی مدد دے سکیں تو وہ عرصہ دراز تک آسانی لڑ سکے گا۔ ہمکو اُمید ہے کہ مالی امداد کی کمی نہ رہے گی۔

جاپان کے غاصبانہ ارادوں اور اس کی روزافزوں طاقت سے دوسری سلطنتیں بھی غافل نہیں ہیں۔ برطانیہ نے سنگاپور اور ہانگ کانگ میں اپنے زبردست بحری مستقر قائم کرلئے ہیں۔ اور چونکہ موجودہ جنگ میں برطانوی مفاد کو کروڑوں پونڈ کا نقصان پہونچ چکا ہے اور آئندہ پہونچنے کا اندیشہ ہے، نیز جاپان کے جنگی طیاروں نے مشین گن سے آتشباری کرکے برطانوی سفیر متعینہ چین کو بھی شدید مجروح کردیا ہے۔ اس لئے انگریزی فوجیں انگلستان اور ہندوستان سے چین کو بھیجی جارہی ہیں۔

امریکہ نے بھی اپنا بحری بیڑہ جس کا تعلق بحرالکاہل سے ہے، بہت طاقتور بنالیا ہے۔ چونکہ بحرالکاہل میں مجمع الجزائر فلپائن پر امریکا قبضہ ہے اور جاپان کی طاقت بڑھ جانے سے فلپائن کو خطرہ لاحق ہونیکا اندیشہ ہے، اسلئے بھی امریکہ خاموش نہ رہ سکے گا۔ روس کو بھی جو چین کا ہمسایہ اور جاپان کا حریف ہے اس جنگ میں کسی نہ کسی طرح سے چین کی امداد کرنا چاہیئے۔ بہرحال اگر اس جنگ نے طوالت اختیار کی تو ایک بین الاقوامی جنگ چھڑ جانیکا پورا اندیشہ ہے۔ آجکل جاپانی حکومت کی باگ فوجی عنصر کے ہاتھ میں ہے۔ لیکن جاپان میں لاکھوں آدمی اشتراکی خیالات سے بھی متاثر ہیں۔ کیا عجب ہے کہ طولانی جنگ ہونے کی صورت میں یہ سیاسی انقلاب برپا کردیں۔

جنگ سے جاپان کی صنعت و حرفت اور تجارت میں بھی ضرور تنزل واقع ہوگا۔ اسوقت بھی کارخانوں کے کاریگر فوج میں بھرتی کئے جارہے ہیں اور اسی وجہ سے ہندوستان سے روئی کا جانا بند ہوگیا ہے۔ اور جاپانی مال کی برآمد میں بھی کمی آرہی ہے۔ دیکھئے یہ صورت حال کبتک قائم رہتی ہے۔ اور اس کا آخری نتیجہ کیا نکلتا ہے۔

دو اندوہناک واقعات

سر راس مسعود مرحوم

حال میں دو موتیں بہت ہی افسوسناک ہوئی ہیں۔ سید راس مسعود اور ڈاکٹر کاشی پرشاد جیسوال کی ناوقت وفات سے ہندوستان کی ادبی و علمی دنیا کو جو نقصانِ عظیم پہونچا ہے۔ اُس کا اندازہ اور اسکی تلافی قطعی ناممکن ہے۔ دونوں موتیں بہت ہی قبل از وقت ہوئیں۔ سر راس مسعود کی عمر صرف ۴۸ سال اور ڈاکٹر جیسوال کا سن ۵۶ سال کا تھا۔ دونوں نے علمی دنیا میں ملک کی بڑی خدمت کی ہے اور دونوں کی یاد عرصۂ دراز تک باقی رہیگی۔ سر راس مسعود بڑے خوش اخلاق۔ نیک نفس۔ آزاد خیال محبِ وطن اور فاضل ادیب تھے۔ آپ سر سید احمد خاں صاحب کے پوتے اور جسٹس محمود مرحوم کے اکلوتے بیٹے تھے علی گڈھ میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد آپ آکسفورڈ یونیورسٹی میں تکمیل تعلیم کے لئے انگلستان گئے تھے۔ جہاں سے ۱۹۱۲ء میں واپسی پر آپ سررشتۂ تعلیم میں داخل ہو گئے اور سب سے پہلے پٹنہ اسکول کے ہیڈ ماسٹر مقرر ہوئے۔ اس کے بعد ۱۹۱۶ء ریونشا کالج کٹک کے پروفیسر ہوگئے۔ آپکو ہمیشہ تمام ملک کے تعلیمی مسائل سے دلچسپی تھی۔ چنانچہ آپ مدراس و کلکتہ یونیورسٹیوں کے فیلو ہونے کے علاوہ مسلم یونیورسٹی اور عثمانیہ یونیورسٹی کورٹ کے بھی رکن تھے۔ ۱۹۳۰ء میں آپ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے پریسیڈنٹ منتخب ہوئے اور تین سال بعد ۱۹۳۳ء میں آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس کی صدارت کیلئے منتخب کئے گئے ۱۹۲۶ء سے ۱۹۲۸ء تک حیدرآباد دکن کے ناظم تعلیمات اور ۱۹۲۹ء سے ۱۹۳۴ء تک علی گڈھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہے۔ آپ کے ہندو مسلم طلباء جب کبھی اپنے تعلیمی زمانہ کا ذکر کرتے ہیں تو آپ کی بزرگانہ محبت و شفقت کا ذکر کئے بغیر نہیں رہتے۔ درحقیقت آپ کو ملک کے نوجوانوں کے ساتھ غیر معمولی دلچسپی تھی۔ اور آپ کو اُن کے دلی جذبات اور ذہنی ضروریات کا پورا احساس تھا۔ آپ قدرتاً ہر مفید تحریک کے حامی ہوجاتے تھے۔ ہندو مسلمانوں میں آپ نے کبھی کسی قسم کی تمیز روا نہیں رکھی۔ آپکو سب کے ساتھ یکساں محبت تھی۔ سب کے ساتھ یکساں حسن سلوک سے پیش آتے تھے۔ ہندو روایات۔ کلچر اور مذہب سب کے لئے آپ کے دل میں بیحد احترام تھا۔ آپ جو کام ہاتھ میں لیتے پوری سرگرمی اور دلی جوش سے انجام دیتے۔ چنانچہ پانچ سال کے اندر آپ نے اپنے وائس چانسلری کے زمانہ میں مسلم یونیورسٹی کے لئے اکتیس لاکھ روپیہ جمع کئے۔ اور اس طرح گورنمنٹ ہند کی مقررہ رقم سے بہت زیادہ فنڈ یونیورسٹی میں جمع کر دیا۔ مگر ۱۹۳۴ء میں بعض وجوہ سے آپ یونیورسٹی سے مستعفی ہو کر بھوپال تشریف لیگئے جہاں نواب صاحب بھوپال کی قدردانی سے آپ آخر دم تک ریاست کے وزیر تعلیم رہے۔

اُردو زبان کے آپ بہت بڑے حامی تھے۔ آپ نے جاپان کے نظام تعلیم پر ایک قابل قدر کتاب لکھی اور "انتخاب زرین" کے نام سے اُردو شاعری کا ایک انتخاب شائع کیا۔ دیوان غالب اور مراثی انیس کے دیدہ زیب ایڈیشن شائع کرائے۔ آپکو اُردو کی بہترین کتابوں کے اعلےٰ ایڈیشن چھپوانے کا بہت بڑا شوق تھا۔ اور خادمان اُردو کے سچے قدردان تھے۔ تین چار سال ہوئے جب آپ کانپور میں ایک مشاعرہ کی صدارت کیلئے تشریف لائے تو راقم الحروف سے ایسی محبت سے پیش آئے گویا برسوں کی پُرانی ملاقات ہے۔ آپ نے علی گڈھ آنے کی بھی دعوت دی تھی اور اُردو کی توسیع و ترقی کے متعلق ایک خاص اسکیم سے جس کا خاکہ اُن سے بیان کیا گیا تھا غیر معمولی دلچسپی ظاہر کی۔ افسوس زندگی نے وفا نہ کی اور نہ آپ اس کی طرف توجہ دے سکے اور نہ راقم ہی پھر اُن کی خدمت میں حاضر ہو سکا۔ کس کو خبر تھی کہ آپ اس قدر قبل از وقت ملک کو داغ مفارقت

دے جائیں گے۔ مگر مشیت ایزدی کے سامنے کیا چارہ ہے۔ خداوند تعالیٰ غریق رحمت کرے۔ ملک کی بدقسمتی ہے کہ ایسی پُرخلوص اور بے لوث ہستیاں اس قدر جلد دنیا سے اُٹھ جاتی ہیں۔

ڈاکٹر کاشی پرشاد جیسوال

ڈاکٹر جیسوال کی شہرت نہ صرف ایک مشہور بیرسٹر اور فاضل قانون دان کی حیثیت سے تھی بلکہ وہ سنسکرت کے بہت بڑے عالم اور ہندوستان قدیم کے مستند مورخ تھے اُن کو قدیم زمانہ کے سکوں کی تحقیقات کا بھی بڑا شوق تھا اور ہندو کی تاریخی حالات کے متعلق اُن کی رائیوں اور تصانیف کی غیر ممالک میں بھی قدر کی جاتی تھی۔ کلکتہ یونیورسٹی کی طرف سے وہ منواور یاگنولک کے دھرم شاستر پر ٹگور لا لکچرر مقرر ہوئے تھے۔ چنانچہ ہندو دھرم شاستر پر اُن کے لکچروں کے مجموعہ کو ملک کے اہل الرائے اصحاب اور یورپ و امریکہ کے یونیورسٹیوں نے بھی قدیم ہندوستان کے آئین و قوانین کی مستند کتاب تسلیم کیا ہے۔

ہندوستان کے قدیم سکوں کے متعلق اُن کی معلومات کا یہ حال تھا کہ جون ۱۹۳۵ء میں انھیں رائل ایشیاٹک سوسائٹی لندن نے اس موضوع پر لکچر دینے کے لئے انگلستان مدعو کیا تھا۔ اس اعزاز کی اہمیت کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ آپ سے پہلے کبھی کسی ہندوستانی کو رائل سوسائٹی کے روبرو لکچر دینے کا اعزاز حاصل نہیں ہوا تھا۔

بہار گورنمنٹ نے آپ سے سنسکرت کے قدیم مخطوطات اور دھرم شاستر کی کتابوں کی مفصل فہرست مرتب کرائی تھی۔ آپ عرصہ تک پٹنہ میوزیم کے پریسیڈنٹ رہے۔۔۔۔ اور پندرہ سال سے زائد تک ..... بہار واڑیسہ ریسرچ سوسائٹی کے جرنل کی ایڈیٹری کے اہم فرائض ادا کئے۔ کئی سال تک آپ پٹنہ یونیورسٹی سنیٹ کے ممبر بھی رہے تھے آپ کی تحقیقات اور عالمانہ تصانیف کی قدردانی میں پچھلے ہی سال پٹنہ یونیورسٹی نے آپ کو "ڈاکٹر آف فلاسفی" کی اعزازی ڈگری عطا کی تھی۔

قانونی قابلیت کے لحاظ سے بھی آپ کا شمار ملک کے بہترین بیرسٹروں میں تھا۔ اور ہائی کورٹ کے جج صاحبان نے بارہا آپ کی قابلیت اور فرض شناسی کی داد دے چکے ہیں۔ ابھی آپ کی صرف چھپن سال کی عمر تھی کہ قضا نے آپ کو بھی ہم سے چھین لیا۔ آپ کی وفات سے ملک کے علمی حلقوں میں جو جگہ خالی ہوگئی ہے اس کا پُر ہونا آسان نہیں ہے۔

وزیرستان

وزیرستان کی مہم جو ایک عرصے سے جاری تھی اور جس پر تلاف جان کے علاوہ ہندوستان کا کروڑاں روپیہ بھی تباہ ہو رہا تھا اب شکر ہے کہ تقریباً ختم ہوگئی ہے۔ اور گورنمنٹ ہند نے شرائط صلح کا بھی اعلان کردیا ہے۔ جو حسب ذیل ہیں:- وزیرستان میں جدید سڑکیں جو زیر تعمیر ہیں، مکمل کی جائیں گی۔ (۲) آئندہ کے لئے بعض قبائلی علاقوں کو "علاقجات محفوظہ" قرار دیا جائے گا۔ جہاں قبائل کے تنازعات کا تصفیہ پولیٹیکل افسران جرگہ کی مدد سے قواعد انسداد جرائم کے مطابق کریں گے۔ عورتوں کے متعلق جو جھگڑے ہوں گے ان کا تصفیہ مروجہ دستور کے مطابق جرگہ کی مدد سے کیا جائے گا۔ (۳) گورنمنٹ ہند کوئی مالگذاری وصول نہ کریگی (۴) سزا کے طور پر دو ہزار رائفلیں اور پچھتر ہزار روپیہ جرمانہ ادا کرنا ہوگا۔ معلوم ہوا کہ قبائل نے اجتک ڈیڑھ سو رائفلیں جمع کردی ہیں۔ سرحد میں دو ہزار سے کہیں زیادہ بندوقیں ہیں۔ تاہم جن شرائط پر صلح ہو رہی ہے غنیمت ہیں۔

علمی خبریں اور نوٹ

ہمارے عنایت فرما حضرت منور لکھنوی ہندو تہذیب و تمدن کی ترجمانی کا حق ادا کرتے رہتے ہیں۔ چنانچہ آپ تلسی داس کی بینے پتر کا۔ والمیکی رامائن اور بھگوت گیتا کے ترجمے کر چکے ہیں۔ ۔ مسٹر داس مرحوم کی مشہور تصنیف ساگر سانگیت کا ترجمہ جو آپ نے کیا تھا عرصہ تک زمانہ میں سلسلہ وار شائع ہو چکا ہے۔ حال ہی میں آپ نے اپنے نامور والد مرحوم حضرت افق لکھنوی کے ترجمہ شریمد بھاگوت کی نظر ثانی کی ہے۔ اور بہت کچھ اضافہ کر کے کتاب کو مشرح اور واضح بنا دیا ہے۔ چنانچہ آجکل یہ کتاب مسرز سنت سنگھ اینڈ سنز لاہور کے اہتمام سے زیر طبع ہے۔

"نسیم عرفاں" کے نام سے بھگوت گیتا کا جو شگفتہ ترجمہ منور صاحب نے اُردو میں کیا ہے۔ اُسے ڈائرکٹر صاحب سررشتہ تعلیم صوبہ متحدہ نے لائبریریوں اور اسکولوں و کالجوں کی انعامی کتابوں کے لئے منظور کر لیا ہے۔ اس قدردانی پر ناظم تعلیم و مترجم دونوں صاحبان مستحق مبارکباد ہیں۔

آجکل مرزا فدا علی صاحب خنجر جنکے افسانے اکثر زمانہ میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ اُردو کے ناخواندہ شاعروں کا تذکرہ لکھ رہے ہیں جن صاحبوں کو اس قسم کے شاعروں کے حالات معلوم ہوں وہ مرزا صاحب سے منیجر نامی پریس لکھنؤ کے معرفت خط و کتابت کریں

موجودہ زمانہ میں ہر ملک میں مادری زبان کے فروغ دینے کی سرگرم کوشش ہو رہی ہے۔ چنانچہ ترکی میں عربی زبان کے تمام الفاظ خارج کر دئے گئے ہیں۔ اب معلوم ہوا ہے کہ افغانستان میں بھی فارسی کے بجائے پشتو زبان کے رواج دینے کی کوشش کیجا رہی ہے۔ افغانستان کی گورنمنٹ رفتہ رفتہ فارسی کے بجائے پشتو کو سرکاری زبان قرار دے رہی ہے۔ اخبارات بھی آہستہ آہستہ پشتو میں منتقل ہو رہے ہیں۔ چنانچہ بعض اخبارات اپنے لیڈنگ آرٹیکل پشتو زبان میں لکھنے لگے ہیں۔ اور افغانستان کے مشہور روزنامہ اخبار "اصلاح" نے یہ انتظام کیا ہے کہ ایک صفحہ پر ایک طرف پشتو زبان میں خبریں درج کرتا ہے اور اس کے مقابل دوسری طرف انہیں کا ترجمہ فارسی میں شائع کر دیتا ہے۔ اس طرح عنقریب ہی پشتو زبان کو افغانستان کی سرکاری و قومی زبان کا مرتبہ ملجائے گا۔

پایہ تخت روس لینن گراڈ میں ایک عجیب و غریب کتاب شائع ہوئی ہے میکسم گورکی کی تحریک پر دنیا کے ایک دن کے مفصل حالات پر ایک ضخیم کتاب شائع ہوئی ہے جس میں "۲۷ ستمبر ۱۹۳۵ء" کے تمام حالات و واقعات گیارہ سو صفحات کی ضخامت میں بیان کئے گئے ہیں اس کتاب کے مختلف حصے دنیا کے منتخب مصنفوں۔ اخبار نویسوں اور ماہران سائینس سے لکھوائے گئے ہیں۔ پہلے ایڈیشن کی بیس ہزار جلدیں چھاپی گئی ہیں۔

اسی طرح دنیا کے مشہور و معروف سوانح نگار لڈوگ (Emil Ludwig.) نے مصر کے دریائے نیل کے

مفصل حالات لکھ کر تصنیف و تالیف کی دنیا میں ایک نئی شاہراہ کھولدی ہے۔ پنولین بسمارک گوئیٹے۔ لکن ہنڈنبرگ کی سوانحعمریاں لکھنے کے بعد آپ کو دنیا کے کسی بڑے دریا کی۔ واخع عمری لکھنے کا نادر خیال پیدا ہوا۔ چنانچہ آپ نے دریائے نیل کو انتخاب کر کے دو جلدوں میں اس کی مکمل تاریخ اس خوبی سے لکھ ڈالی کہ اگر ان کی کوئی اور تصنیف باقی نہ رہے تو یہ نادر کتاب ہی ان کے نام کو ہمیشہ قایم رکھنے کے لئے کافی ہے۔ کیا اچھا ہو کوئی بلند حوصلہ مصنف ہندوستان کے مقدس دریا گنگا کی تاریخ لکھنے پر کمربستہ ہو جائے

قدر دانان اُردو کو یہ سُنکر خوشی ہوگی کہ ہندوستانی سیاحوں سے تبادلہ خیال میں سہولت کے لئے مصر و حجاز میں اُردو کو بھی تعلیمی نصاب میں داخل کر لیا گیا ہے۔

بعض اوقات اُردو کاتب کیسی مضحکہ انگیز غلطیاں کرجاتے ہیں اس کی ایک معمولی مثال یہ ہے کہ زمانہ جولائی صفحہ ۴۰ کے فٹ نوٹ کے دوسطری ایڈیٹوریل نوٹ میں "ذرا سی" ترمیم کے بجائے "ڈرسے" ترمیم لکھ گیا ہے۔ ناظرین زمانہ یہ تصحیح نوٹ فرمالیں۔

زمانہ کے اکثر مضامین اُردو اخبارات و رسائل میں نقل ہوتے رہتے ہیں۔ گو عموماً معاصرین حوالہ دینے کے عادی نہیں ہیں۔ ہم تو اس بے ضابطگی کے یہاں تک عادی ہوگئے ہیں۔ کہ پُرانے مضامین کو نئے مضامین کی حیثیت سے شائع ہوتے ہوئے دیکھ کر بھی خاموش رہتے ہیں مگر ہمارے رفیق حضرت مدہوش کو اس بات کی بجا شکایت ہے کہ اُن کے مضامین "دنیا کا [illegible] ماحول" اور "سرگذشتِ مذہب" جو انھوں نے نہایت عرق ریزی سے خاص طور پر زمانہ کے لئے لکھے تھے۔ ہمعصر تیج دہلی میں بلا حوالہ شائع کئے گئے ہیں۔ ہمارے دوست ہمعصر جامعہ دہلی کے خوش اخلاقی کے قائل ہیں کہ اُس نے ان کا مضمون "سیاسیات عالم" راقم نیز زمانہ کا حوالہ دیکر شائع کیا اور اس کی چند کاپیاں بھی انھیں نذر کیں۔

زمانہ جولائی ۱۹۳۶ء میں پریم چند جی مرحوم کا ایک غیر مطبوعہ افسانہ بڑی تلاش اور کوشش سے شائع کیا گیا تھا۔ مگر ہمعصر ملاپ نے اسے فوراً ہی بلا کسی حوالہ کے شائع کر دیا۔ بعض مضامین حاصل کرنے میں جس قدر کاوش کرنا پڑتی ہے اس سے ہمارے معزز معاصرین ناواقف نہیں ہیں۔ اس لئے انھیں مضامین کی نقل کرتے وقت کم از کم رسالہ اور مضمون نگار کا حوالہ دینا ضروری خیال کرنا چاہیئے۔

ہندی ساہتیہ سمیلن نے پچھلے سال کی بہترین ادبی تصانیف کیلئے بارہ بارہ سو روپیہ کے دو انعامات کا اعلان کیا تھا جو بنارس کے رئیس بابو منگلا پرشاد صاحب مرحوم کے یادگار میں دیے جاتے ہیں۔ دونوں انعامات ہندی کے مشہور شعرا کو ملے ہیں چنانچہ ایک انعام پنڈت اجودھیا سنگھ اوپادھیا کے منظوم تصنیف پریہ پرداس کو دیا گیا ہے۔ اور دوسرا انعام بابو میتھلی شرن گپت کو ان کی نظم "ساکیت" کے صلہ میں ملا ہے۔ سائنس کے متعلق بہترین تصنیف کے لئے بھی ایک منگلا پرشاد انعام دیا جاتا ہے جو بابو رام داس صاحب گوڑ کی تصنیف "وگیان ہستا ملک" کو ملا ہے۔

ہم کو دلی افسوس ہے کہ ایڈیٹر کی کسلمندی مزاج کے باعث پریم چند نمبر کی اشاعت میں اس قدر تاخیر ہوئی ہم اس کے لئے اپنے ناظرین سے خواستگار معافی ہیں۔ اور اُمید کرتے ہیں کہ عنقریب ہی ہم اس فرض سے سُبکدوشی حاصل کرلیں گے۔

دیوان جانی بہاری لال

(از مسٹر سلیم جعفر)

اقلیم ادب میں تین طرح کے کام کرنے والے ہیں، مصنف، مؤلف اور مترجم۔ ان میں سے مصنف کے شہرہ و غلغلہ سے فضا گونجتی رہتی ہے لیکن مؤلف اور مترجم کا شاذ و نادر ہی کوئی نام لیتا ہو تو لیتا ہو ورنہ وہ خاموشی سے اپنا کام کرکے چل بستے ہیں اور زمانہ انھیں ایسا بھلا دیتا ہے کہ کبھی یاد تک نہیں کرتا۔

مصنف کی اتنی قدر صرف اس وجہ سے ہے کہ اسے ایک ایسی صفت کا مالک سمجھا جاتا ہے جو ذاتی ہے یعنی مصنف کی نسبت یہ امر درجۂ یقین کو پہنچا ہوا ہے کہ قدرت نے اس میں قوت تخلیق ودیعت کی ہے۔ وہ کسی کا محتاج نہیں ہے اگر وہ آسمان کے تارے توڑ لاتا ہے تو اپنے پر و بال کی قوت سے۔ اگر وہ تحت الثریٰ کے راز سربستہ سے پردہ اٹھا دیتا ہے تو اپنے بل پر۔ بلاشبہ یہ ایک سبب اس کی فوقیت کا ہے لیکن دنیا اس شخص کو ہیچ و لوچ سمجھتی ہے جس سے اس کو کسی طرح کا فائدہ نہیں پہنچتا۔ انسان کی فطرت میں خود غرضی یا مفاد ذاتی کا مادہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ اگر یہ نہ ہوتو شاید نعوذباللہ اسے روش عبودیت اختیار کرنے میں بھی تامل ہو۔ عیش و عشرت ترک کرنا، لذات دنیا سے دست بردار ہونا، طبیعت پر جبر کرکے کڑیاں جھیلنا۔ ہر وقت ایک وہم و ادراک سے پرے ہستی کی رضا جوئی میں مصروف و مشغول رہنا۔ یہ سب کیوں؟ محض اس لئے کہ مطمح نظر۔ نجات، موکش یا نِروان ہے۔ اگر آیندہ زندگی میں دوزخ و جنت، سورگ اور نرک۔ رنج و راحت کا خیال و تصور نہ ہو تو پھر کسے پڑی ہے کہ نفس امارہ کی رہنمائی سے سرتابی کرکے نفس لوامہ و مطمئنہ کے جال میں اپنے آپ جا پھنسے۔ انکے پھندے وہ پھندے نہیں ہیں جن میں مرغ دل بے دانہ آتا ہو۔ اسی لئے غالب مرحوم نے فرمایا ہے ؎

کیا زہد کو مانوں کہ نہ ہو گرچہ ریائی　　　پاداش عمل کی طمع خام بہت ہے

اگرچہ اس [illegible] دریدہ دہنی کا الزام عائد ہوتا اور مذہب اسے کفر و الحاد بتا دیتا ہے لیکن سچ تو یہ ہے کہ تارک دنیا دور اندیش اور طالب الدنیا کوتاہ اندیش ہے۔ ایک اس دنیا کا عیش فانی چھوڑ کر عالم باقی کی مسرت جاودانی حاصل کرنیکا آرزومند ہے اور دوسرا عیش فانی ہی کو سب کچھ سمجھے ہوئے حیات چند روزہ سے ممتع ہونے پر قانع ہے۔ غرض یہ کہ اہل دنیا کا تعلق صرف انھیں باتوں سے رہتا ہے جن سے انھیں کوئی نفع پہنچتا ہے مصنفوں میں سے بھی ہر مصنف کو نصیب نہیں کہ زمانہ اسکی طرف توجہ کرے۔ وہ انھیں کو بحر فنا میں غرق ہونے سے بچاتا ہے جنھوں نے اسے کسی طرح کا فائدہ پہنچایا ہے۔ آج اگر اردو بولنے والی دنیا۔ مظہر جانجاناں، سودا، میر اور درد کو نہیں بھلا سکتی اور ان کی قدر کرتی ہے تو اس کی وجہ صرف یہی ہے کہ ان بزرگوں نے اس کی زبان کی تعمیر میں ایک مفید و ممتاز کام لیا ہے ورنہ جس زمانہ میں یہ قابل احترام ہستیاں

گزری ہیں اس میں اور بھی سیکڑوں شاعر و ناثر ہوں گے جنھوں نے نظم و نثر لکھی ہوگی اور ممکن ہے کہ زبان کو شستہ و رفتہ بنانے میں ان کا ہاتھ بٹایا ہو۔ اگر ان کا کوئی نام نہیں لیتا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کا کام بلحاظ مقدار و اثر اس قسم کا نہ تھا کہ خراج تحسین و اعتراف حاصل کر سکتا۔ مصنفوں کے علو، مرتبت کا باعث صرف یہی ہے کہ ان میں قوتِ تخلیق ہے جس سے دُنیا کو بخیال خود فائدہ پہنچتا ہے۔ اگر ان میں یہ قوت ہوتی اور ان سے کوئی فائدہ نہ پہنچتا تو اس بیکار چیز کی کوئی قدر نہ کرتا۔

قوتِ تخلیق سے تو مؤلف بھی قطعی عاری نہیں۔ لیکن اس کی تخلیق کا عمل دوسروں کے کاموں کو ایک خاص ترتیب میں رکھنے تک محدود ہے۔ اس کی قوت کا بے بضاعت ہونا اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ کوئی نئی چیز نہیں پیدا کرتا بلکہ جو کچھ پہلے سے موجود ہے اُسے ایک سلیقہ سے پیش کرتا ہے۔ اُس کا رتبہ اس سوداگر سے زیادہ نہیں جو جگہ جگہ سے مال منگا کر اپنی دوکان میں رکھتا اور بیچتا ہے۔ خریداروں کو اس سے آسانی ضرور ہو جاتی ہے لیکن۔ اگر وہ اپنے نفع کی خاطر جگہ جگہ سے مال منگا کر اپنی دوکان نہ سجاتا تو چیزیں پہلے سے موجود تھیں اور ان تک رسائی کا امکان تھا۔ اس لئے گو اس کے فعل سے کسی نہ کسی طرح کا فائدہ ضرور ہوتا ہے۔ لیکن وہ ایسا فائدہ نہیں جو قابل اعتنا ہو۔

مترجم کے ساتھ زمانہ جو برتاؤ کرتا ہے وہ وہی ہے جو مؤلف کے ساتھ کرتا ہے، لیکن یہ اس کی حق ناشناسی ہے۔ وہ مصنف کی محض اس لئے قدر کرتا ہے کہ اس میں قدرت نے قوتِ تخلیق ودیعت کی ہے جس سے اُسے فائدہ پہنچتا ہے۔ مترجم کے کام سے زمانہ کو فائدہ پہنچتا ہے پھر بھی وہ اس کی قدر کرنے کو تیار نہیں۔ وجہ یہ ہے کہ وہ مترجم کو ایک مشاطہ سے زیادہ رتبہ نہیں دیتا جو عروس فکر کا ایک لباس اُتار کر اسے دوسری طرح کے لباس سے آراستہ و پیراستہ کر دیتی ہے۔ وہ اپنی اس رائے کو انتہا درست اور صحیح سمجھتا ہے کہ مترجم اور مصنف کی حدوں کے جو ڈانڈے ملے ہوئے ہیں، اسے نظر ہی نہیں آتے۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ مترجم قوت تخلیق سے کام لیتا اور اس سے اپنی قوم کو فیض پہنچاتا ہے۔ مترجم کی قوتِ تخلیق اس وقت عمل کرتی ہے جب وہ کسی غیر زبان کے مصنف کے مطلب و معانی کو کماحقہ سمجھ کر انھیں اپنی قوت تخلیق کی مدد سے اپنی زبان کے لفظوں میں اس طرح جلوہ گر کرتا ہے کہ جس سے ان سے اجنبیت دور ہو جاتی ہے اور اس کی قوم ان سے اسی طرح فیضیاب ہونے لگتی ہے جس طرح وہ قوم جس سے وہ مطالب و معانی لئے گئے تھے۔ مترجم کے فعل کا محرک خیال نفع رسانی کے سوا کچھ نہیں ہوتا اور نفع رسانی ہی وہ چیز ہے جس پر زمانہ مٹا ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نا قدری کے باوجود دُنیا کبھی مترجم سے خالی نہیں رہی اور جب تک نوع انسان کے آلۂ اظہار خیال میں اختلاف رہے گا۔ اور انسان میں اپنے ابنائے جنس کی کاوشوں اور کوششوں سے تمتع کی خواہش باقی رہے گی۔ اس کی ہستی بھی معدوم نہ ہوگی۔ دُنیا خواہ کھُلے دِل سے اس کے فیض کا اعتراف کرے یا نہ کرے اور اسے وہی رتبہ دے یا نہ دے جو مصنف کو دیتی ہے۔

زمانہ کا زاویہ نظر ہی اس کا جواب وہ ہے کہ جب کوئی نامور مصنف اس دار فانی سے راہیٔ ملک جاودانی ہوتا ہے

تو اس کے ماتم سے فضا گونج اٹھتی ہے لیکن جب کوئی مترجم داعی اجل کو لبیک کہتا ہے تو کوئی دو آنسو بھی نہیں بہاتا۔ چونکہ میرا نقطۂ نظر جداگانہ ہے اس لئے آج میں ایک مترجم کی سوانح عمری ہدیۂ ناظرین کرنے کی جرأت کرتا ہوں۔ یہ مترجم محض ناثر ہی نہیں ہے بلکہ ناظم و شاعر بھی ہے اس سے اس کو فراموش کرنا اور بھی ستم ناروا ہے۔

راضی تخلص۔ بہاری لال نام۔ جانی شاید خاندانی نام ہوگا کیونکہ ان کے والد تنتھی رام کے نام کے ساتھ بھی یہ لفظ لگا ہوا ہے۔ دیوان غالباً اس لئے مشہور تھے کہ ریاست کچھ میں کچھ عرصہ تک دیوان رہے تھے۔ قوم سے ناگر برہمن تھے۔ بزرگ گجرات سے آکر بھرت پور میں آباد ہو گئے تھے۔ بہاری لال یہیں پیدا ہوئے کیونکہ حکیم اصغر علی صاحب ارژنگ راضی پر تقریظ لکھتے ہوئے اُن کا ذکر ان لفظوں میں کرتے ہیں:۔

دیوان جانی بہاری لال صاحب خلف جانی تنتھی رام صاحب ناگر گجراتی نے کہ جن کا بھرت پور زاد بوم ہے"

خود بھی مونیر ولیمز کی قواعد سنسکرت کے ترجمے کے دیباچہ میں کہتے ہیں۔

بھرت پور میرا جنم استھان ہے:۔

سن ولادت صحیح معلوم نہیں لیکن ۱۸۰۷ء سے ۱۸۱۲ء کے درمیان کسی سال میں پیدا ہوئے۔ جس دیباچہ کا ابھی ذکر ہوا ہے اس میں ایک جگہ لکھتے ہیں: "زمان شیب ہے۔ ۷۱ (۷۲ یا ۷۹ ؟) برس کا ہوا" اس عبارت میں ہندسے اچھی طرح نہیں چھپے۔ ۷ کا ہندسہ تو بالکل صاف ہے لیکن دوسرا ہندسہ کچھ ایسا قلم خوردہ ہے کہ اس کو ۱۔ ۲ یا ۹ کی بگڑی ہوئی صورت چاہے جو کچھ مان سکتے ہیں۔ ترجمۂ مونیر ولیمز کی تاریخ طباعت یہ لکھی ہے۔ "یہ کتاب آج سمبت ۱۹۴۲ کے ماہ منگھسر سُدی پنچمی کو شری آبو جی کے پہاڑ پر اپنے چھاپہ خانہ میں اپنے ملک کے طلباء کے فائدہ کے لئے چھپ کر ختم ہوئی" اگر ہندسہ صاف ہوتا تو خود انھیں کی تحریر سے سن ولادت محقق ہو جاتا۔ تحقیق سے معلوم ہوا کہ ۳۰ اپریل ۱۸۹۷ء تک پنشن ملتی رہی۔ اس لئے اسی روز مکروہات دنیا سے کم سے کم تراسی اور زیادہ سے زیادہ نوّے سال کی عمر میں منھ موڑا۔ عمر بھر مجرد رہے اس لئے سلسلۂ اولاد منقطع ہو گیا۔ ۱۸۸۳ء میں ضعف پیری نے باقی ماندہ حیات مستعار کی مدت کے بارہ میں جب شک و شبہ پیدا کر دیا تو جائداد وغیرہ اپنے دو بھتیجوں جانی لکھمی لال ولد چھگن لال اور جانی موتی لال ولد چھنو لال کے نام بذریعہ رجسٹری لکھ دی۔ محلہ ملکا بستی آگرہ میں دو مکان موروثی۔ محلہ ملوانیاں بھرت پور میں ایک باڑہ اور ایک مکان خود کا خرید۔ اور ایک مکان موروثی محلہ ناگر پاڑہ جے پور میں تھے۔ یہ نصفا نصف دیے۔ جنس از قسم پارچہ وغیرہ یا نقد از قسم پرامیسری نوٹ و سکہ بھی انھیں کے نام لکھے۔ جانی لکھمی چند کے ساتھ ان کی بھاوج رہتی تھیں۔ اور جانی موتی لال کے ساتھ ان کی بہن۔ غالباً یہ دونوں بیوہ ہونگی اس لئے دھرم شاستر کو مدنظر رکھ کر انھیں اسی وصیت نامہ کے ذریعہ روٹی کپڑے کا حق دار قرار دیا۔

تعلیم و ملازمت کا جو حال اُنھوں نے خود اپنے ترجموں کے دیباچوں میں لکھا ہے اُس کا خلاصہ یہ ہے۔

سولہ برس کی عمر تک آگرہ۔ چھ ماہ تک اعظم گڑھ۔ تین برس تک بنارس کے چھوٹے اور چار برس تک بڑے مدرسہ میں تعلیم پائی۔ اس کے بعد سلسلہ ملازمت شروع ہوا۔ دو برس تک چرنا و گڑھ کی چھاونی میں۔ سات برس تک باسٹھویں ہندوستانی پیدل میں منشی۔ پانچ برس تک بھرت پور دربار کی طرف سے ایجنٹ گورنر جنرل کی خدمت میں نائب وکیل تین برس تک راجپوتانہ ایجنسی کے منشیوں میں سے ایک منشی۔ تین برس تک والئی کچھ مہاراجہ دھراج مرزا مہاراؤ سری کھنگار جی کے دیوان۔ اس کے بعد ۱۸۹۴ء تک دربار بھرت پور کی طرف سے ایجنٹ گورنر جنرل راجپوتانہ کی خدمت میں وکیل رہے اگرچہ اس بیان سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ تعلیم کہاں تک تھی۔ لیکن تصنیفات و تالیفات سے عیاں ہے کہ وہ عربی۔ فارسی سنسکرت اور انگریزی بخوبی جانتے تھے۔ آخری دور ملازمت میں راجپوتانہ گزٹ کی ایڈیٹری کی خدمت بھی انجام دی ۱۹۲۳ء میں آٹھ ماہ تک مہارانا سری بھوپال سنگھ والئی میواڑ کے اتالیق رہے لیکن مہاراجہ بھرت پور نے واپس بلا لیا۔ مہاراجہ قرولی کے دیوان یعنی باڑولی کے راؤ گلندر بھوپال کو آبو پر بلا کر بغرض حفاظت و تعلیم ان کے پاس رکھا گیا۔ اگست ۱۹۲۴ء میں بوجہ ضعیفی دربار بھرت پور نے پنشن دے کر بھرت پور بلا لیا اور پنج سرداروں میں داخل کیا۔

افسوس ہے کہ وہ سب لوگ اٹھ گئے جنہوں نے مرحوم کو دیکھا تھا اور جس وقت وہ زندہ تھے مجھے ان کے حالات لکھنے کا خیال نہ آیا ورنہ لطائف و ظرائف بھی لکھتا۔ ایک صاحب سے جو عرصہ تک ان کے ماتحت رہ چکے تھے ایک دفعہ کچھ ذکر آ گیا۔ فرمانے لگے طبیعت بہت متحیر واقع ہوئی تھی۔ لیکن خیرات کا یہ طریقہ تھا کہ جو فقیر آ کر سوال کرتا اس سے پہلے اس کا مذہب پوچھتے۔ اگر مسلمان ہوتا تو کہتے کہ برآمدہ میں بیٹھ کر سو دفعہ اللہ اللہ کہو۔ جب وہ کہہ چکتا تو منشی کو حکم دیتے کہ مودی کے نام ایک سیدھے کی چٹھی لکھ دو۔ ہندو ہوتا تو اس سے پوچھتے کہ تم کس دیوی دیوتا کو مانتے ہو۔ جسے وہ بتاتا۔ اس سے سو دفعہ اس کے نام کا وظیفہ پڑھوا کر سیدھے کا حکم دیدیتے۔

علم دوستی کا یہ عالم تھا کہ اوراد و وظائف اور کار سرکار سے جتنا وقت بچتا وہ پڑھنے لکھنے میں صرف کر دیتے۔ نفع رسانی خلق کا ایک بین ثبوت یہی ہے کہ اپنی کتابوں کا حق تالیف و تصنیف محفوظ نہ کرایا بلکہ کتابوں کے آخر میں اشتہار دیدیا کہ جس کا جی چاہے چھاپے اور بیچے مجھے کوئی تعرض نہیں۔

اپنی تصنیفات و تراجم کا حال بھی خود ہی لکھا ہے۔ اردو میں یہ کتابیں ان کے رشحات قلم کا نتیجہ ہیں۔

نظم (۱) گاڈ خدا۔ انگریزی لغات (۲) دستور تحریری (۱۳۰۵ھ) جس میں عربی فارسی۔ اردو ہندی اور انگریزی لفظوں کی املا سے بحث کی ہے اور اصول خوش نویسی بھی بتائے ہیں (۳) تصریف زبان فارسی و انگریزی (۴) شادی نامہ راجپوتانہ کے وکیلوں کا مذاق (۵) نگار راضی (۱۳۲۲ھ)۔ ترجمہ گلستان (۶) دلارام راضی (۱۳۲۸ھ) ترجمہ بوستان (۷) ارژنگ راضی (۱۳۲۹ھ) ترجمہ انوار سہیلی (۸) حسب حال۔ اپنی سرگزشت۔ (۹) دیوان راضی یعنی اپنا کلام۔

نثر (۱) سیاست یونان یعنی سوانح ٹیلی میکس (۲) تاریخ چتوڑ گڑھ (۳) یادگار راضی (۱۳۱۸ھ) قواعد عربی۔

اِن کے علاوہ تحصیل سنسکرت میں آسانی پیدا کرنے کے لئے تین انگریزوں کی سنسکرت کی قواعدوں کا ہندی میں ترجمہ کیا ہے۔

(۱) مسٹر چارلس ولکنسن کر پا رو پی دیوان جانکی بہاری لال کا بھاشا سنسکرت ویاکرن

(۲) مسٹر میکس میولر ایضاً

(۳) مسٹر مونیر ولیمز ایضاً

ان تینوں کے ترجمہ کرنے کی وجہ یہ بتائی ہے کہ اگرچہ مطلب ایک ہی ہے مگر سمجھانے کا ڈھب الگ الگ ہے۔

دستور تحریری۔ لنگار راضی۔ دلارام راضی۔ ارژنگ راضی اور یادگار راضی میرے پاس ہیں سنسکرت قواعدوں میں سے صرف میکس میولر والی میرے پاس نہیں ہے۔ زبان بالعموم صاف وسلیس ہے لیکن اپنے زمانہ کے لحاظ سے اظہار خیالات پر قدرت ہے اور مشق سخن صاف صاف عیاں ہے۔

(۱) انتخاب از دستور تحریری :۔

بعد حمد کاتب بے شل کرتا ہوں بیان۔ قاعدہ، تحریر عربی فارسی اردو زبان ــ ہندی کے حق میں جو نفع فوائد بیشمار۔ لکھنے میں، پڑھنے سے جنکے ہوئے ناداں ہوشیار

یائے مجہول سے پچھلے الف اور ہائے مختفی کی تبدیلی۔

جو مذکر لفظ کے آخر میں ساکن ہووے یا۔ یا الف ہو جیسے بندہ، پردہ، لڑکا چھوکرا ــ جب حروف معنوی یعنی سے، کو، میں، کا، نے، پر۔ ان سب سے پہلے ہی آئیں جو دیں انہیں پر لگا کر تب بدل مجہول یے سے ہو دیں گے وہ۔ یے۔ الف ــ لڑکے کو، بندے سے، ہیں اس کی مثالیں منکشف

(۲) انتخاب از لنگار راضی :۔

ایک ہارون رشید کا لڑکا — آتش قہر سے جو تھا بھڑکا
آکے پیش پدر ہوا مظہر — اپنی مظلومی کا ہوا مخبر

کہ فلانے سپاہی زادہ نے — میری توہین کے ارادہ سے
گالی دی ہے مجھے عبث ماں کی — دیکھئے شوخی اور بے باکی

پوچھا ہارون نے سب وزیروں سے — اور سرداروں سے امیروں سے
کیا سزا ایسے شخص کو دیجے — کیا عوض ایسے شخص سے لیجے

ایک بولا کاٹو تن سے سر — دوسرے نے کہا دہن سے زباں
تیسرے نے کہا مصادرہ لو — تا نہ پھر طاقت مبادرہ ہو

تب کہا اے پسر جو چاہ کرم — رکھتا ہے، تو دکھا نہ راہ عدم
عفو کر پر جو عفو کر نہ سکے — عفو گر [illegible] عفو [illegible] نہ سکے

تو بھی دے اسکو اس قدر گالی — اُس نے دی تجھ کو جس قدر گالی
پر زیادہ نہ کیجو زنہار — یہ ارادہ نہ کیجو زنہار

(۳) انتخاب از دلارام راضی :۔

ایک کس جاتا تھا براہ حجاز — ادا کرتا ہر اک قدم پہ نماز
گرم تھا اس قدر براہ خدا — خار بھی تھا نہ کرتا پا سے جدا

ہوا آخر یہ دل پریشاں خیال — کہ پسند آئی اس کو اپنی چال
اسے ابلیس نے دکھایا یہ چاہ — کہ نہیں اس سے خوب تر کوئی راہ

رحم اس پر جو حق نہ فرماتا — کبر کے مارے وہ مرے جاتا

(۴) انتخاب از ارژنگ راضی :-

جب سنا سنگ پشت نے یہ تمام   تب اسی مہرے کہا یہ کلام
تجھ سا جہاں جہاں پر آتا ہے   لطف یزدان وہاں پر آتا ہے
نہ سعادت ہے کوئی ہم مقدار   تیری صحبت کے فیض سے زنہار
اور ایسی خوشی ہے اور کہاں   جیسی تیری مصاحبت میں عیاں
جیسے اتحاد و اتحاد کی جا   تو مجھے ہے تجھے ہوں میں بھی سوا
تا چراغ حیات ہے قائم   میں ہوں پروانہ کی طرح دائم
تیرے شمع جمال پر مفتوں   جیسے لیلیٰ کے حال پر مجنوں
تیرے خورشید رخ پہ ذرہ وار   جاں نثاری سوا نہیں کچھ کار
گرچہ تو مارے کھینچ کر تلوار   پر نہیں سر پھرانے کا زنہار
اور اس ذکر سے کیا جو بیاں   چند اندازہ مرغلت ہیں عیاں

(۵) انتخاب از یادگار راضی :-

"اہل عرب نے اپنے ملک کی زبان کو ایسی محنت سے آراستگی دی ہے کہ اور ملک والوں پر اس بات میں بزرگی حاصل کی ہے۔ قواعد کے ہر ایک خیال طلب مسئلہ کو خوب تجویز و تحقیق کیا ہے اور اس علم کے استادوں کو علمی نیک نامی میں ایسا نام دیا ہے کہ اور قواعد نویسوں نے اس کی امید ناحق کی ہے"۔

"اور ملکوں کی اکثر زبانوں کی ترکیب ایسی سادہ ہے کہ علم قواعد کی درستی عام سے آزادہ ہے۔ ان کے اصول لڑکپن میں سیکھتے ہیں لیکن پھر ان کو دیکھنے کی ضرورت نہ پڑتی ہے نہ خواہش رکھتے ہیں۔ امتحاناً معلوم ہوا ہے کہ پڑھنے والے اس علم کی تحصیلات معقولیہ کو صحت منطقہ کی مزید بات صرف دریہ رفع کرنے کو حاصل کرتے ہیں"۔

اگرچہ مرحوم کی غزلوں کا دیوان مجھے نہیں ملا مگر مذکورۂ بالا ترجموں میں متعدد قصیدے شامل ہیں۔ ان میں سے ایک قصیدہ کے چند شعر پیش کئے جاتے ہیں۔ انھیں سے اندازہ کر لیجئے۔ شکوہ الفاظ۔ تشبیہ و استعارہ۔ اور اغراق و غلو کے طوفان سے بہر حقیقت و معقولیت پر گفتگو رنگ گھٹائیں چھائی دیکھ کر خوش ہونے والے تو اسے کیا پسند کریں گے کیونکہ اس میں ان کے لئے "وجہ تسلّی" نہیں ہے لیکن وہ اصحاب جو پروفیسر آزاد کی طرح اس ابر سیاہ کو نظرِ حقارت سے دیکھتے ہیں۔ ان کو ضرور داد دینی چاہیئے کہ دورِ اغراق و غلو میں ایک ایسا زبردست عالم و فاضل تھا جو شاہ راہِ عام سے ہٹ کر اور شرائط معقولیت کی پابندی کر کے قصیدے لکھ سکتا تھا۔ اور انھیں صرف درباروں میں پیش کرنے ہی پر قانع نہ تھا بلکہ گم کردگان راہ کے لئے شمع ہدایت بہم پہنچانے کو اپنی تصنیفات کے ساتھ چھپوانے کی ہمت و جرأت کرتا تھا۔

سلہ - ہمارے نازک خیال کسی بادشاہ کے اقبال اور عقل کے لئے اس قدر تعریف پر قناعت نہیں کرتے کہ وہ اقبال میں سکندر یونانی اور عقل میں ارسطوئے ثانی ہے بلکہ بجائے اسکے کہتے ہیں کہ اگر اس کا ہمائے عقل اوج اقبال سے سایہ ڈالے تو ہر شخص کشور دانش و دولت کا سکندر اور ارسطو ہو جائے ..... ایسی باتیں اور ردایاتیں ہیں کہ اگرچہ ہمارے معمولی خیالات ہوں مگر غیر قوم بلکہ ہمارے بھی عام لوگ اس سے بے خبر ہیں۔ اس لئے بے سمجھائے نہ سمجھیں گے۔ اور جب بات کو زبان سے کہہ کر سمجھانے کی نوبت آئی تو لطف زبان کجا اور یہ نہیں تو تاثیر کجا! مزا وہی ہے کہ آدھی بات کہے اور آدھی منہ میں رہے اور سننے والا سمجھ کر اٹھا تا رہا جا اور راگ بوجھا صفحہ ۵۰۰ - آب حیات - طبع ہشتم ۱۹۱۳ء - مطبوعہ رفاہ عام اسٹیم پریس لاہور -

مدح مہاراجہ دھراج مہاراجہ برجیندر سوائی جسونت سنگھ بہادر بہادر جنگ دام اقبالہ

جو بھرت پور کے ہیں فرماں دہ — مجھ سے لاکھوں کرو ستگے ماں دہ — نوجوانی ہی میں بفضل خدا — رکھتے ہیں بیرزنکی سی عقل رسا
آنوکار دیکھتے ہیں نخست — ہوتے ہیں سارے کار نیک و درست — بہترین رائے دیتے ہیں ایسی — چاہیئے وہی وقت پر جیسی
منھ سے اب تک نہیں کیا ہی کلام — جان لیتے ہیں دل کا حال تمام — ہوش مند کی سخن سے پیدا ہے — ہوش مندی کی ہوش افزا ہے

+ + + +

نظر لطف میں وہ نیک اثر — ہے کہ کرتے ہیں جس پر ایک نظر — دیر لگتی نہیں وہ بڑھتا ہے — ہر کسی کی نظر میں چڑھتا ہے
وہ نظر سے جسے گراتے ہیں — اور نہیں رحم سے اُٹھاتے ہیں — رہتا ہے پائمال و سرگشتہ — اپنے طالع کی طرح برگشتہ
سب کی نظروں میں خوار بے توقیر — جہاں جاتا ہے پاتا ہے تحقیر

+ +

دل ہے آئینہ خدا دانی — شاہد حال نور پیشانی — رکھتے ہیں ایسا جاہ روز افزوں — برتری پر ہے طالع گردوں
برتری میں ہے بہتری ایسا — خوش نصیبوں کو ہوتی ہے جیسی

+ +

ایسی پروردگار کے سایہ — خلق کی پرورش کے سرمایہ — قائم اس خلق پر رہیں دایم — دایم اس خلق پر رہیں قائم
بڑھے ہر روز عمر و جاہ و جلال — بعنایات ایزد متعال — اپنے خدام سے رہیں راضی — راضی رام سے رہیں راضی
لطف کا ہے امیدوار مدام — خیر مالک کا خواستگار مدام

× ×

اے جوانی

از مولانا الطاف مشہدی لائل پور

اب کہاں اے دوست وہ ہنستی ہوئی رنگیں بہار — اب کہاں وہ مہکے مہکے لہکے لہکے خلد زار
اب کہاں وہ دیو دارونکے خنک سایۂ نصیب — اب کہاں اُنکو نکی مالا پر ترا ذکر حبیب
اب کہاں خوابونمیں وہ کھوئی ہوئی سی زندگی — نکہتوں کی گود میں سوئی ہوئی سی زندگی
اب کہاں وہ اودی اودی بدلیاں وہ آبشار — اب کہاں وہ دُور تک چھایا ہوا رنگِ خمار
اب کہاں معصوم آنکھوں میں بوقتِ انتظار — گاہ ہلکا سا تبسم گاہ ہلکی سی پھوار
اب کہاں سادہ فضائیں اب کہاں معصوم رُت — آکے اک مدت سے اب کٹتی نہیں مغموم رُت

آہ آلامِ زمانہ نے جوانی چھین لی
چھین لی اے دوست مجھ سے زندگانی چھین لی

تمنائے دلفروشی

(از پروفیسر سنت پرشاد مدہوش، ایم۔اے)

حسن والوں کے لئے دور سے کچھ لایا ہوں
عشق آباد سے مَیں بیچنے دل آیا ہوں

دیکھکر جنسِ گراں میری فرشتے جھجکے
آئے انسان نہ انسان سے انساں ٹھٹکے

آکے پرکھے تو کوئی کاش متاعِ رنگیں
دستِ نازک کو بڑھائے تو کوئی ماہ جبیں

خوب ہی ٹھونک بجا کر اسے دیکھے گاہک
یہ وہ شیشہ ہے کہ پتھر سے لڑائے گاہک

قدر دانوں سے جو چھوٹے تو شگفتہ ہو جائے
حسن کی آنچ لگے اس میں تو کشتہ ہو جائے

اک نگاہِ غلط انداز ہی خوبانِ جہاں
اس تغافل سے ہے شرمندہ مری جنسِ گراں

حسن افسوس کہ ہوتا ہی نہیں ہے عازم
مفت بھی ہاتھ لگاتا نہیں اس کو ظالم

اس تغافل پہ بھی ہم جان دیئے جاتے ہیں
ہوں نہ مقبول مگر سجدے کئے جاتے ہیں

بیچنے لائے تھے دنیا میں دلِ شوق زدہ
اس کو واپس لئے جاتے ہیں مگر افسردہ

قدرداں کوئی نہیں بزمِ سخن میں اپنا
ہم زباں گُل ہی نہیں حیف چمن میں اپنا

رباعیات

از مسٹر محمود اسرائیلی

گر حسن کی تشریح رقم ہو جائے
دوزخ بھی نمونۂ ارم ہو جائے
تخلیق کے پردے سے اٹھادوں جو نقاب
دنیائے جمال اسی میں ضم ہو جائے

جب لہر جوانی کی اتر جائے گی
تب ساحلِ مقصد پہ نظر جائیگی
وقتِ موقع کی راہ تکتے تکتے
محمود یہ زندگی گذر جائے گی

عربوں کی موسم شناسی

حاجی محمد صادق صاحب صادق ایوبی جرنلسٹ

مسلمانانِ عالم میں عرب اپنی خداداد ذہانت و فطانت کے لحاظ سے ممتاز و سربرآوردہ ہیں۔ جزیرۃ العرب ایک ریگستانی اور سنگلاخ ملک ہے جس کو "وادی غیر ذی زرع" یا "وادی بے آب و گیاہ" بھی کہتے ہیں۔ ملک کی اِس طبعی حالت نے عربوں کو حقائق شناس اور صاحبِ نظر بنا دیا ہے۔ نظر و فکر کی یہ رسائی تعلیم و تعلّم، درس و تدریس کی شرمندۂ احسان نہیں، بلکہ روزمرّہ کے کوچ و مقام، سفر و حضر، طبعی اسباب و حوادث، و تجربہ کی رہینِ منّت ہے۔ علم ہیئت و نجوم میں عربوں کو جو شرف و فضیلت حاصل ہے اس کے تذکرہ کی ضرورت نہیں ہے۔ درحقیقت علم النجوم کی مہارت و آگاہی نے ان لوگوں کو حزم و تحدی کے ساتھ قرائن و آثار دیکھ کر موسم اور بارش کے متعلق پیشین گوئیاں کرنے کا خوگر کر دیا ہے۔ قیاس آرائیاں زیادہ تر جاڑے کے موسم میں ہوتی ہیں کیونکہ اس زمانہ میں آثار جانچ کر موسم پلٹنے کا بخوبی حکم لگایا جا سکتا ہے۔ گرمی کے دنوں میں موسمی ہوائیں دیکھ کر موسم کا اندازہ کیا جاتا ہے۔ ستاروں کے اوقات طلوع و غروب اور انواء (نچھتر) و امطارِ کواکب کا علم کام نہیں دیتا کیونکہ ان ایام میں بارش کا بھول کر بھی امکان نہیں ہو سکتا۔ موسم کے متعلق پیشین گوئی و حکم کا معاملہ زیادہ تر ستارہ شناسی اور مور و مار کے ظہور و کثرت پر منحصر ہے:-

ستارہ شناسی

(۱) "جب میزان طلوع ہوتا ہے تو پانی سوتوں میں ٹھنڈا ہو جاتا ہے":

اذا طلع المیزان یبرد الماء فی الکیزان

(امثال مکہ معظمہ)

میزان معدل النہار ہے۔

(۲) "جب میزان غائب ہو تو جو نکال لینا چاہیئے":

اذا غاب المیزان فك الفدان[۱]

---

[۱] المختار من امثال عکا جمعها الاب سلیمان غانم المشرقی۔ بہم مطبوعہ ۱۹۰۶ء ۵۵۶

(۳) اگر عیدلدّ[51] کے دن میزان اور ثریا[52] شمالاً و جنوباً ایک دوسرے کے مقابل میں واقع ہوں تو سرما بین بارش افراط کے ساتھ ہوگی اور اسے "شتا ثراوی" کہیں گے بخلاف اس کے اگر میزان اور ثریا حسب معمول شرقاً و غرباً واقع ہوں تو کوئی غیر معمولی بات ظہور پذیر نہ ہوگی۔ (بویر۔ پی : ۵۶)

(۴) نواحِ شام کے بدّو کہتے ہیں کہ اگر کانون (دسمبر۔ جنوری) کے مہینہ میں سہیل ثرالی پر حملہ کرے اور ثرالی بچ نکلے تو وہ سال اچھا ہوگا۔ حملہ میں ثرالی مجروح ہو جائے تو وہ سال بُرا ہوگا۔ (جوسن مطبوعہ پیرس ۳۳۶)

(۵) "سہیل کے طلوع ہونے پر پوست انجیر موٹا ہو جاتا ہے"

یوم یطلع اسھیل یتخمل قشر التین

سہیل موسم خزاں کا پیامی سمجھا جاتا ہے۔ اس موسم میں پوست انجیر موٹا ہو جاتا ہے

(فلسطین۔ ڈی کنعان ۲۹۷)

(۶) "طلوع سہیل پر گھوڑوں کو چھت کے نیچے لے آؤ"

عند طلوع اسھیل آو الخیل

یعنی موسم سرما کا آغاز سمجھنا چاہیئے۔ (فلسطین۔ ڈی۔ کنعان ۲۹۷)

(۷) "عقرب کے زمانہ میں آسمان کے نیچے رات بسر نہ کی جائے"

فی زمن العقرب تحت السما لا تقرب

عقرب آفتاب کی حدت و تمازت کے خاتمہ کا ایک بدیہی نشان سمجھا جاتا ہے۔ عقرب بارہ آسمانی برجوں میں سے آٹھواں منحوس و نامبارک برج ہے۔ (امثال مکہ معظمہ)

(۸) "حوت کے طلوع پر سردی ختم ہو جاتی ہے"

اذا طلع الحوت ھناک البرد یموت (امثال مکہ معظمہ)

حوت کے طلوع پر شاذ و نادر بارش برستی ہے۔ حوت کا طلوع ۱۴ر اپریل کو ہوتا ہے۔

(۹) "جب سرطان کا ملاپ "نیسمان" سے ہو"

اذا التقی السرطان ھب النیسمان

---

[51] عیدلدّ۔ مغربی کلیساؤں میں ۳ رِ نومبر کو اور مشرقی کلیساؤں میں ۱۶ر نومبر کو منائی جاتی ہے۔

[52] ثریا۔ صحراؤں میں وقتِ سفر دلیل راہ کا کام دیتی ہے۔ مثلاً اہل مکہ کہتے ہیں :۔

حطّ الثریا اما مھا والزم خطا مھا ثریا کو (اونٹ) کا امام کرکے باگ ڈور چھوڑ دو۔

نیسان - نسیم صبح، نسیم شام، نسیم بحری، نسیم بری کو کہتے ہیں۔ سرطان کے طلوع سے موسم گرما کا آغاز ہوتا ہے۔

(امثال مکہ معظمہ)

(۱۰) "اسد کی حرارت بدن کے کپڑے جھلسا دیتی ہے"

حرّ الاسد یکقص الثوب علی الجسد

ان ایام میں آفتاب خط نصف النہار پر پہونچ جاتا ہے۔ (امثال مکہ معظمہ)

(۱۱) "البطین ـــ شہد کی مکھی خاکِ نمناک (کیچڑ) میں رات کاٹ سکتی ہے"

البطین تبات النحلة فی الطین

(الجزائر۔ چینب مطبوعہ پیرس ۲۲۷۱)

البطین ۱۰ مئی کو واقع ہوتا ہے۔ اس زمانہ میں سردی کا نام و نشان تک مٹ جاتا ہے۔ شہد کی مکھی اپنے چھتے سے باہر رات کاٹ سکتی ہے۔

مور و مار

(۱۲) "شارک، مینا والے سال بنجر زمین میں کاشت کرو"

سنة الزرزور الحرث فی البور

(ڈی۔ کنعان ۲۸۷)

"سن زرزور" میں یہ پرند بکثرت پائے جاتے ہیں۔ دہقان اس سال کو سعید سمجھتے ہیں۔

(۱۳) "سن قطا" (جس سال بھٹ تیتر بکثرت پائے جائیں) میں اپنا بچھونا بیچ کر پوشش خرید لو۔

سنة القطا بیع الفرش و اشتری غطا

(فلسطین۔ ڈی کنعان ۲۸۷)

جس سال بھٹ تیتروں کی افراط ہو تو وہ سال قحط لائے گا۔ قحط سالی کے سبب اشیاء سخت گراں اور مہنگی ہوں گی۔ دہقان اپنا اثاث البیت بیچ کر اپنی ضروریات رفع کریں گے۔

(۱۴) "سنة الابور" (جس سال بھڑیں بکثرت پائی جائیں) میں موسم سرما سخت ہوگا"

سنة الابور الشتا قاسی (امثال ملک اسیریہ)

(۱۵) "جب سارسوں کی ڈاریں (لبنان کے اوپر) ربیع میں گزریں تو بارش ہوگی"

متی مرق البجع فی الربیع بدّها تشتی

ربیع میں سارسوں کی ڈاریں مصر سے یورپ کو جاتی ہیں۔ سارسوں کے گزرتے ہی بارش ہو جایا کرتی ہے

(امثال ملک اسیریہ)

جرمنی اور اٹلی میں بھی ستاروں کو بارش کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ (ہی سن سن جلد اذبرگ ۲۴۵)

(۱۶) "کچے ریشم کے لئے اچھی علامت ہے"

الجیمسۃ علامت للقز (امثال ملک اسیریہ) یعنی اس سال ریشم کی صنعت کو خوب فروغ ہوگا

(۱۷) "اگر بارش (جنوری) میں قلت کے ساتھ ہو تو ٹڈی دل کا خوف وخطر ہوتا ہے"

اذا کان الشتا فی کانون قلیل یخاف من الجراد (امثال ملک اسیریہ)

(۱۸) "اگر ربیع میں بارش ہو جائے تو یہ سال حریر (ریشم) کے لئے مفید اور اناج کے لئے غیر مفید ہوگا"

اجا الربیع رطب سنتہ حرایر مش غرایر (امثال ملک اسیریہ)

سال

(۱۹) جس سال پالا عام ہو تو خوب کاشت کرنی چاہیئے"

عام الجلید احرث وزد (الجزائر- جینب ۱۷۱)

برف، اولے، پالے کی کثرت و شدت اچھے سال کا نشان سمجھے جاتے ہیں۔

(۲۰) "سال کو اچھا اور بُرا نہ کہو جب تک فصل دیکھ نہ لو"

لا تحسب سنتک حتی تستغلہا

یہ ہے سچی اور صحیح تعلیم۔

(امثال العوام فی الشہور وفصول العام للشیخ الادیب نطون افندی جمیل صفحہ ۸۶-۷)

(امثال العوام فی مصر والسودان والشام لمؤلفہ نعوم شقیر مطبوعہ قاہرہ صفحہ ۵۴)

زمانہ تیس سال پہلے

منٹو مارلے اصلاحات کے متعلق رائے زنی کرتے ہوئے زمانہ بابت ستمبر ۱۹۰۷ء میں "رفتار زمانہ" کے ذیل میں مندرجہ ذیل نوٹ بھی شایع ہوا تھا:-

مسٹر مارلے نے اپنے آخری بجٹ اسپیچ میں جن اصلاحوں کی تجویز کی تھی وہ اب عملی صورت اختیار کر رہی ہیں اور ان کے مفید ہونے کے متعلق جو شبہات لوگوں کو اس وقت تھے وہ اور بھی راسخ ہو گئے ہیں۔ انڈیا کونسل میں دو ہندوستانی ممبر مقرر ہوئے ہیں ایک صاحب بنگالی ہیں اور دوسرے مسلمان دونوں صاحب لایق اور گورنمنٹ کے ہوا خواہ ہیں مگر یہ تقرر یاں صرف مسٹر مارلے کی مرضی سے ہوئی ہیں ابھی تک پارلیمنٹ سے اس کے متعلق کوئی خاص قاعدہ نہیں پاس ہوا۔ پس ممکن ہے کہ کوئی دوسرا سکریٹری آئے اور ہندوستانیوں کی موجودگی غیر ضروری خیال کرے۔ تاہم ہم مسٹر مارلے کے مشکور ہیں کہ انھوں نے اس قید کو توڑ دیا جو اب تک ہندوستانیوں کے انڈیا ہاؤس میں داخل ہونے کے متعلق تھی۔

نغمہ

از حضرت احسان بن دانش کاندھلوی۔

مرحبا اے مطربِ سرمایہ دارِ بیخودی — تیری چشمِ مست ہے ظرفِ خمارِ بیخودی
زمزمے کی ہر لچک ہے چشمکِ برقِ جمال — لحن کی انگڑائیاں ہیں زندگی کے خدّ و خال
مستیاں اتری ہوئی ہیں دیدۂ بیدار میں — وجد ساماں ہے کوئی ہر تار کی جھنکار میں
ہر رگِ بیتاب میں اک سیل سی آئی ہوئی — مطلعِ دل پر ہے نکہت کی گھٹا چھائی ہوئی
عارضِ فطرت پہ ہے ہلکی صباحت کی نقاب — گونج کا پردہ اُٹھا دے کاش لیلائے رباب

۲

تھاپ سے دُھرپت[1] کی جب ہوتے ہیں نغمے بیقرار — کروٹیں لیتا ہے سینہ میں سرودِ جوئبار
رفتہ رفتہ کھلنے لگتے ہیں رموزِ کائنات — راگنی مشعل دکھاتی ہے سرِ قصرِ حیات
تیرتی ہے بحرِ مستی میں نگاہِ بے قرار — گونجتے ہیں دل کی وادی میں سریلے آبشار
نغمے جب تانوں کے طیاروں میں ہوتے ہیں بلند — پھینکتی ہے رُوح بامِ عشق پر زرّیں کمند

۳

چوٹ کھاتا ہے جونہی مضراب سے بربط کا تار — چونک چونک اُٹھتے ہیں دل کے ولولے بے اختیار
آسمانوں کی بلندی سے یہ آتی ہے صدا — دیکھ اب چلمن اُٹھاتا ہے کوئی آتش نوا
زُلفِ موسیقی بکھرتی ہے ہوا کے دوش پر — خواب کی بدلی مچلتی ہے بساطِ ہوش پر
زمزمے ہر تار سے اُٹھتے ہیں تھرّاتے ہوئے — دل میں آ کر جذب ہو جاتے ہیں بل کھاتے ہوئے
گلشنِ احساس میں رنگینیاں پاتا ہوں میں — حُسن کی گلپوش وادی میں اُتر جاتا ہوں میں
تان کو لیکر جو پنچم میں پہونچ جاتا ہے تو — روح میں بالیدگی کی لہر دوڑاتا ہے تو
ہر طرف ہوتا ہے برپا محشرِ تقریرِ دوست — جھلملاتی ہے نظر کے سامنے تصویرِ دوست

[1] ایک گت کا نام ہے۔

دلپہ چھاجاتا ہے متوالی بہاروں کا سماں — جھومتا ہے سامنے ابرِ شرابِ ارغواں
پھرتی ہے بادِ صبا مستی میں سر دُھنتی ہوئی — رونیوالے عاشقوں کی ہچکیاں سنتی ہوئی
موجزن ہوتا ہے کیفِ بیخودی نزدیک و دُور — ذرّے ذرّے سے اُبل پڑتا ہے دریائے سرور
دل یہ کہتا ہے اسی جنت میں گم ہوجائیے — بر شکالِ نغمۂ پرکیف میں کھو جائیے

مستِ و متوالی فضا میں جھومتا پھرتا ہے حُسن
اشکبار آنکھوں کے آنسو چومتا پھرتا ہے حُسن

کچھ نہیں کہتا

از پنڈت اندرجیت صاحب شرما ماچھروی

انکو یہی شکوہ ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا — مجھکو یہی سودا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا
کچھ شکوۂ بیداد سے مجبور نہیں ہیں — الفت کا تقاضا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا
اُن کو بھی ہے یہ فخر کہ وہ کچھ نہیں سنتے — مجھکو بھی یہ دعوی ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا
کہنے پہ اگر آؤں تو طوفان اٹھادوں — کچھ ایسا ہی منشا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا
جو بات بھی ہے پردہ میں ہے قدر اُسی کی — پردہ ہی تو پردہ ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا
چُپ رہنے میں بھی میری بڑی مصلحتیں ہیں — اک یہ بھی تو ایما ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا
کہنے پہ وہ آتے ہیں تو چپ ہی نہیں ہوتے — یہ اور تماشا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا
کیوں آپ کئے جاتے ہیں غیروں سے شکایت — مجھکو نہیں دیکھا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

کیفیتِ دل ہے مری صورت سے نمایاں
چرچا ہی یہ چرچا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

رباعی

راحت سے یہاں کس کی بسر ہوتی ہے — مر کر کسی صورت سے گزر ہوتی ہے
اطفال کا غم، فکرِ خورش، فکرِ لباس — ختم آہ یونہی شام و سحر ہوتی ہے

فراق دریابادی

سبزۂ پامال

سید علی جواد۔ زیدی صابر

صبحدم جب زندگی مصروفِ خوابِ ناز تھی
فکرِ آزادِ سخنور مائلِ پرواز تھی

ملگجی ساری میں لپٹی تھی حسینِ دلربا
یا دُھندلکے میں ضیا پاش آسماں پر چاند تھا

چال شرمائی ہوئی سی تھی ہوائے نرم کی
جیسے کہدی ہو صبا نے بات کوئی شرم کی

دامنِ وادی میں فطرت کی وہ بزم آرائیاں!
پتیوں پر قطرۂ شبنم کی نرم انگڑائیاں!!

سامنے کچھ دور پر تھا مخزنِ آبِ رواں
جس طرح تاریک شب میں جلوہ گر ہو کہکشاں

شاخیں پھولوں کی لچکتی تھیں کنارِ آبِ جو
نیلی چادر پر ہرے ریشم سے کرتی تھیں رفو

چشمہ بدمستی میں سر پتھر سے ٹکراتا ہوا
جھاڑیوں میں لڑکھڑاتا ٹھوکریں کھاتا ہوا

سخت راہیں جھیلتا، دشواریاں سہتا ہوا
بے تکلف، بے خطر، آٹھوں پہر بہتا ہوا

سینہ تانے، گنگناتا، ناچتا، گاتا ہوا
صورتِ مارِ سیہ سو طرح بل کھاتا ہوا

شاہدِ ساحل کو میٹھی لوریاں دیتا ہوا
مضطرب موجوں کو بڑھکر تھپکیاں دیتا ہوا

جھیل کی آغوش میں جاکر بالآخر رُک گیا
منزلِ مقصود پر آکر مسافر رُک گیا

میں بھی جا پہنچا بنا کر راہبر تخئیل کو
پہلے تھوڑی دیر تک دیکھا کیا اس جھیل کو

خلوتِ فطرت میں برپا اک تلاطم ہو گیا
میری ہستی کھو گئی وسعت میں میں گم ہو گیا

جب نگاہیں جھیل کے پانی میں غوطے کھا چکیں
اور اس جوئے صفا میں دل کو بھی نہلا چکیں

تب ہوئیں سرشارِ ذوقِ دید کی تجدید سے
چار سو دیکھا صفائے قلب کی تائید سے

جھیل کے چاروں طرف سبزہ تھا تا حدِ نگاہ
ختم ہوتی تھی یہاں جوشِ نمو کی شاہراہ

سبزہ کیا ہے؟ کون ہے؟ کس نے بنایا ہے اسے؟
یہ لباسِ دل فریبی کیوں پنھایا ہے اسے

شوخ بھی، ذی روح بھی، وجد آفریں بھی، نرم بھی
منکسر بھی، مست بھی اور غرقِ شرم بھی

نازنیں بھی زندہ دل بھی اور سبک اندام بھی
جلوہ گہ میں دلربا بھی حورِ وش بھی عام بھی

پھول سجدہ کرتے ہیں اتنا بلند اقبال بھی
اور پھر عاشق کے دل کی طرح ہے پامال بھی

تو کہ اک شاعر ہے اور پہلو میں دلِ حساس ہے
پھر بھی تجھ میں وحشیانہ ظلم کی بو باس ہے

اُف! یہ تو کیا کر رہا ہے؟ سنگدل، غفلت شعار
اُسکی اس نازک سی صنعت پر ترے پیرن کا بار!

بے محابا خون ایسے بے زبان معصوم کا!
صبر کیوں لیتا ہے اے ظالم کسی مظلوم کا!

اے درندوں کے مصاحب، وحشیوں کے دوستدار!
مادرِ گیتی کا دل اس ظلم سے ہے بے قرار

روند ڈالا تو نے سبزہ کو ارے او بدنفس!
خواب آزادی کے اور یہ بربریت کا قفس!

ایسے مظلوموں کی حالت پر ترس کھاتا نہیں
تو ہے شاعر، اب مجھے اس کا یقیں آتا نہیں

تبرّکاتِ شادؔ ۵؎

حضرت شاد عظیم آبادی

اداوں میں کرامت، ناز میں اعجاز ساقی کا
نہ بھولے گا ہمیں اے میکشو انداز ساقی کا

تھکے وہ لب مذمت جس سے نکلے ساغرِ مے کی
خدا رسوا کرے اُس کو جو ہو غمّاز ساقی کا

کسی دن میکشوں کا مسندِ عز و شرف ہوگا
یہی عرشِ معظم فرشِ پا انداز ساقی کا

بجز پیرِ مغاں کے کس نے کی تعظیم ساقی کی
وہی کچھ جانتا تھا میکشو اعزاز ساقی کا

ہلانا جام کو پھر ڈھالنا ساتھ اک تبسم کے
مرے سر پر، مری آنکھوں پہ رندو ناز ساقی کا

میں ہی چھکونگا کہ دن پی کے اُس خمِ معلّیٰ میں
میں ہی ہوں بلبلِ خوش لہجۂ شیراز ساقی کا

سُبو ہو، جام ہو، مینا ہو سب مُنہ تکنے والے ہیں
بھری محفل میں آخر کون ہے جاں باز ساقی کا

خُموں پر خُم لنڈھانے کی اجازت کس نے دی آخر
بجا پیرِ مغاں کی ذات پر ہے ناز ساقی کا

ملائک سے بھی اُس کی منزلت اے شاد برتر ہے
خوشا وہ مست جو دل سے رہا دمساز ساقی کا

۵؎ ہم ان تبرکات کیلئے مکرمی سید نقی احمد صاحب ارشاد نبیرہ حضرت شاد مرحوم کے مرہون منت ہیں۔ ا۔ ز

بزمِ ساقی

(از منشی گنگا دھر ناتھ فرحت کانپوری۔ بی۔اے۔ ایل ایل بی)

نیم شب تھی، صاف مطلع، چاندنی چھٹکی ہوئی — ماہِ عالم تاب گویا اک مجسّم سادگی
میکدے میں شورِ ہاؤ ہو درِ میخانہ باز — رند و موسیقی و نغمہ، جام و مے، ساقی و ساز
حُسنِ ساقی، جلوہ آگیں، لطفِ ساقی بیکراں — بادۂ خوش رنگ و رجامِ شبابِ قدسیاں
میری توبہ کانپ اٹھی

آج ساقی نے لٹا دی سب نے جی بھر بھر کے پی — بزم میں سب کو ملی گویا بہشتِ زندگی
جسکو دیکھو مست تھا، مدہوش تھا، بے ہوش تھا — یعنی میخانے میں دورِ بادۂ سرجوش تھا
مطربِ خوش پوش کا وہ جلوۂ محفل فروز — وہ مٹھاس آواز کی وہ نغمہ ہائے دل فروز
شیخ کے اُڑ جائیں ہوش

ابر بھی فرحت محیطِ عالمِ ایجاد تھا — ذرّہ ذرّہ دہر کا شاداب تھا، آباد تھا
ہاں یہ دن مخصوص تھا پینے پلانے کے لئے — بغض دھونے کے لئے، کینہ مٹانے کیلئے
یک بیک بجلی سی چمکی اور چمک کر رہ گئی — نازنینِ چرخ جیسے کچھ جھجک کر رہ گئی
آرزو تھرّا گئی

بے تکلف قہقہے تھے، پُر تکلف گفتگو — پَے بہ پَے دورِ شراب و صف بہ صف جام و سبو
بادۂ خوش رنگ و گلگوں ہر طرف چھلکی ہوئی — چاندنی بزمِ طرب کی جا بجا سمٹی ہوئی
موجِ رنگ و بو نے لی تھیں سیکڑوں ہی کروٹیں — پڑ گئی تھیں فرشِ نسرین رنگ پر کچھ سلوٹیں
تھا عجب جوش و خروش

ارتعاشِ سازو نغمہ، اہتمامِ رنگ و بو | کیفِ حسن و جوشِ نوشانوش و شورِ ہاؤ ہو
حسنِ ساقی، لحنِ مطرب، رقصِ پیہم، دورِ جام | اہلِ دل، اہلِ نظر، کیفِ شرابِ لالہ فام
بزمِ مے، شمع و شراب و جام و مینا، سازِ چنگ | عقل ناقص، فہم ساکت، وہم بجیں، ہوش دنگ
یعنی جوشِ انبساط

جذباتِ اثر

(از خان بہادر مرزا جعفر علی خانصاحب اثر لکھنوی)

بد بلا ہے، کبھی نہ چاہ کرو | آپڑی ہے؟ تو پھر نباہ کرو
منع ہے اُن کو پیار سے تکنا | بیکسانہ ہی اک نگاہ کرو
اور صورت نہیں حضوری کی | شوقِ تعزیر میں گناہ کرو
یونہی شاید خدا بھی مل جائے | کسی کافر کے دل میں راہ کرو
شان قائم رہے محبت کی | آہ جب آئے لب پہ، واہ کرو
عہدِ مہر و وفا نہ کرنا تھا | قصد جب تھا، ہمیں تباہ کرو
سُن تو لو حالِ دُکھ بھرے دل کا | نہ کرو پھر یقین، خواہ کرو
وہ ستمگر خبر نہیں ہوتا | لاکھ تڑپو کہ آہ، آہ کرو
عشق کو دُھن کہ خود بنو مجرم | دل بضد، اُن کو عذرخواہ کرو
گھٹ نہ جائے گی شانِ محبوبی | لطف ہم پر بھی گاہ گاہ کرو
یہ کہاں کی ہے رسم و راہ بھلا | چاہنے والے کو تباہ کرو
لوٹتے یوں نہیں لٹیرے بھی | کچھ تو غمزدوں کو انتباہ کرو
تم تو منھ کو چھپاؤ بالوں میں | مجھے تاکیدِ سیرِ ماہ کرو!
عشق کیا کم ہے بہرِ رسوائی | کہ بھرو ٹھنڈی سانس، آہ کرو
لطف کی، قہر کی، ملامت کی | اس طرف کوئی تو نگاہ کرو

کوئی غفلت کی انتہا ہے، اثر
اُٹھو کچھ فکرِ زادِ راہ کرو

گلشن تھا باغ باغ شگفتہ چمن چمن دریائے رنگ و بو لبِ دریا تھا موجزن
کرتے تھے خوش جمال ریاضِ جناں کی سیر
پھر پھر گئی نگاہ میں سرو رواں کی سیر

بلبل کی چھیڑ چھاڑ گلوں کے وہ رنگ ڈھنگ پردہ سے تھی حیا کے نمایاں نئی اُمنگ
دوشیزۂ حیات ہوئی وقفِ عار و ننگ حورا جل تھی ساتھ مگر زندگی سے تنگ
لرزاں برنگ شعلہ و غلطاں بحالِ زار
آئینہ رو کے ساتھ مگر صورت غبار

صورت بنی بگڑ کے عجب رشک ماہ کی جب ہو سکا نہ ضبط تو چپکے سے آہ کی
دیکھا زمیں کی سمت فلک پر نگاہ کی نکلی نہ کوئی راہ کسی ڈھب نباہ کی
ٹھٹکی ہوا سے سایہ صفت ڈھل کے رہ گئی
کانٹے اُلجھ پڑے تو چھری چل کے رہ گئی

اُڑتا تھا رنگِ روئے پری صورتِ شرار وحشت سے تار تار ہوا دامنِ قرار
بیٹھی اُٹھی، چلی، رکی سنبھلی ہزار بار کوشش تھی سب فضول نہ تھا دلپہ اختیار
تھے چشم نرگسی میں جو آنسو بھرے ہوئے
زخم دلِ حیات دوبارہ ہرے ہوئے

بولی تمہاری خو ہمیں آتی نہیں پسند دم بند آنکھ بند ہے چپ ہو زباں ہے بند
تم اہلِ کار ہو گر ہم بھی ہیں کاربند ہم سے تمہیں بناؤ تو پہنچی کبھی ۔۔ گزند
مانا کہ کچھ خیال تمہارا بُرا نہیں
اپنوں سے یہ حجاب تو ہرگز روا نہیں

تم نے تو آجتک کبھی پردا نہیں کیا وہ کونسا ہے راز جو افشا نہیں کیا
اب جو چرائی آنکھ تو اچھا نہیں کیا کچھ ہم نے تم سے شکوۂ بیجا ۔۔۔ نہیں کیا؟
چتون یہ کہہ رہی ہے لگاوٹ کے طور ہیں
بدلا ہوا ہے رنگ بھی تیور بھی اور ہیں

کیا ہو گیا تمہیں جو یہ صورت بنائی ہے ہم بھی گر چھپاؤ گی تب تو بُرائی ہے
کس کی خرابی خیر سے جی میں سمائی ہے بولو ذرا تو، کچھ تو کہو کس کی آتی ہے

میں کیا مجال بات تمہاری جو ٹالدوں
بھارت کا لال بھی ہو تو قدموں پہ ڈالدوں

ہم نے بھی تم سے نام کو پردا کبھی کیا ٹالی کبھی ہے بات بہانہ کبھی کیا؟
چاہا جو تم نے اس کے سوا کیا کبھی کیا تم سے تمہارے جور کا شکوا کبھی کیا؟

محتاجِ لب نہ تم ہو نہ محروم گوش ہو
پھر کیا سبب ہے کس لئے آخر خموش ہو؟

رو کر کہا اجل نے کہ اس پیار کے نثار احساں تمہارے نقش ہیں دل پر مرے ہزار
چرکوں سے میرے تم ہو یقیناً جگر فگار میں نے تمہارے "لال" اڑائے ہیں بیشمار

اب جس پہ ہے نگاہ وہ بھارت کا لال ہے
تم سے چھٹے تو جینا تمہارا محال ہے

پنہاں کسی صدف میں بھی ایسا گہر نہیں تارے ہیں بے شمار مگر دو قمر نہیں
اب تک تو کوئی دوسرا آیا نظر نہیں یہ آج تک کی بات ہے کل کی خبر نہیں

دنیا سے آج اسکو اٹھانے کا حکم ہے
اس گل کو باغِ خلد میں لانیکا حکم ہے

تم سے سوا تو کوئی بھی پیارا نہیں مجھے صدمے اُٹھاؤ تم یہ گوارا نہیں مجھے
اتنا بھی کیا خیال تمہارا نہیں مجھے پر انحرافِ حکم کا یارا نہیں مجھے

ایسے گہر ہزار ہیں تم پر فدا کروں
لیکن نہو رضائے الٰہی تو کیا کروں

سچ ہے تمہارے رنج سے میں مرنہ جاؤنگی کس دل سے برقرار کی صورت مٹاؤنگی
دنیا سے آہ برق کو کیوں کر اٹھاؤنگی؟ بیتاب کو بتاؤ تو کیا منھ دکھاؤنگی؟

اپنا جہاں نہ بس ہو وہاں کوئی کیا کرے
آئی کسی کی مجھکو اٹھالے خدا کرے

لکنت ہوئی زباں کو تو آنسو ہوئے رواں چھایا فلک پہ آہِ شرر بار کا دھواں
ہوش و حواس کا نہ رہا نام کو نشاں اٹکی گلے میں سانس تو سوکھی لبوں پہ جان

چھٹنے لگیں ہوائیاں منھ زرد ہوگیا
دوشیزۂ حیات کا دم سرد ہوگیا

لوٹی فلک پہ درد سے ہو ہو کے بیقرار
کھل کر وبالِ دوش ہوئی زلفِ مشکبار
رو رو کے زار زار یہ کہتی تھی بار بار
لٹتی ہے کوئی دم میں میرے باغ کی بہار

گریوں ہوا تو مادرِ گیتی تباہ ہے
نورِ نظر نہیں ہے تو دنیا سیاہ ہے

دم پر بنی ہے شکوۂ تقدیر کیا کروں
سوجھے اگر نہ خاک تو تدبیر کیا کروں
حکم قضا پہ جادوئے تسخیر کیا کروں
بہر خدا بتا بُت بے پیر کیا کروں

صورت کوئی نباہ کی اے رشکِ ماہ ہو
اب عنقریب ہے کہ مرا گھر تباہ ہو

مولا چراغ برق نہ برقِ بلا بجھائے
داغی ہو کور چشم کوئی آنکھ اگر ملائے
اس گل سے پہلے گلشنِ ہستی کو موت آئے
دشمن کو بھی خدا نہ کبھی یہ گھڑی دکھائے

آئی یہ سن کے کہتی ہوئی ایک مہ لقا
عنقا نشاں تھا اس کا مگر نام تھا بقا

جاتا ہے بزمِ دہر سے ہر صاحب کمال
لیکن نہیں کمال کو اندیشۂ زوال
ثانی نہیں ہے برق کا کوئی تو کیا ملال
کرتے نہیں سخی کبھی سائل کا رد سوال

یہ بھی خبر ہے کچھ کہ پیام اجل ہے کیا
بے کیف زندگی ہو تو اسکا بدل ہے کیا؟

بجھ بجھ کے کائنات میں روشن ہوئے چراغ
چھلکی وہیں شراب جہاں بھر گیا ایاغ
کیا کیا ہوائے گل نے دیئے بلبلوں کو داغ
بوئے فرش گل سے اڑ گئی اللہ رے دماغ

غنچوں کا رنگ اور ہوا کا چلن ہے اور
موسم بہار کا تو کبھی ہے خزاں کا دور

تڑپا رہا ہے برق کا مدت سے انتظار
اردو کے شاعروں میں جو ہے وجہ افتخار
کہنے کو ایک گل ہے مگر باغ کی بہار
آدم کا نورِ عین ہے میرے گلے کا ہار

خاطر نشیں بقا کی جو ایک بات تھی
مجبورِ احترامِ اجل کو حیات تھی

آتے ہیں برق خلد میں روشن ہو شمع طور | تارے فلک سے توڑ کے لائے ہر ایک حور
غلماں کوئی رہے بھی تو پاس آ دبے دور | آنکھیں ہوں فرش راہ رواں ہو خوشی سے نور

سب پاؤں چومنے کو چلو سر کے بل چلیں
پیچھے رہیں نہ اوروں سے پہلے نکل چلیں

یوم فراق برق تھا اک یوم یادگار | دنیائے صبر و ضبط میں پھیلا تھا انتشار
لرزش ہوئی زمین کو تھرا اٹھا غبار | ذروں کو تپ چڑھی وہ کہ اڑنے لگے شرار

بنیادِ بامِ عرش بریں تک ہلا گیا
آیا وہ زلزلہ کہ قیامت ہی ڈھا گیا

گل ہو گئے چراغ کچھ ایسی ہوا چلی | پھولوں کی سمت دیکھ کے بیکل تھی ہر کلی
ساعت مقررہ کسی عنوان نہ جب ٹلی | جو موت تھی حیات کی آغوش میں پلی

بجلی گرا کے برق سے ہمدوش ہو گئی
ماتم میں بزم ہند سیہ پوش ہو گئی

جذباتِ سرمد

مترجمہ سید مقبول حسین بی۔ اے ایل ایل بی

گہ سرو گہے سنبل و گہ یاسمنی | گہ کوہ و بیابانی و گاہے چمنی
گہ نورِ چراغی و گہے بوئے گلی | گہ در چمن و گاہ در انجمنی

کبھو چندن کبھو تلسی کندن | کبھو پربت پھلواری اور بن
دیا جھلک کبھو باس پھول کی | بن بستی سب تیرے درپن!

علمی خبریں اور نوٹ

پریم چند صاحب کے آخری ناول "گئودان" کے اُردو ترجمہ کے لئے عرصہ ہوا "زمانہ" میں ایک نوٹ شائع ہوا تھا، جس کے جواب میں کئی قابل و مشہور احباب نے مستعدی و کشادہ دلی کے ساتھ اس ادبی خدمت کو انجام دینے کی خواہش ظاہر کی۔ اِن معززین میں قابلیت کے لحاظ سے ایک سے ایک بڑھکر تھے، مگر آخر قرعۂ فال مکرمی سحر ہنگامی کے نام پڑا۔ اس قسم کی خدمت خود منشی پریم چند صاحب اپنی حیات میں اُن سے لے چکے تھے "چوگان ہستی" کا اُردو ترجمہ سحر صاحب ہی نے ہندی سے کیا تھا۔ گئودان کا اُردو ترجمہ اب عنقریب مکمل ہوکر جامعہ ملیہ دہلی کے اہتمام سے شائع ہوگا۔

اسی اثنا میں منشی پریم چند کے تیرہ چھوٹے افسانوں کا ایک اور مجموعہ "واردات" کے نام سے جامعہ ملیہ پریس سے شائع ہوا ہے۔ یہ قصے جن میں موجودہ ہندی معاشرت اور سماج کی تصویریں ہیں مختلف رسالوں میں منتشر تھے! اب انھیں اہلکارانِ مکتبہ نے کتابی صورت میں یکجا کردیا ہے۔ مگر کتاب کا نام خود منشی صاحب کا تجویز کردہ ہے۔ قیمت ایک روپیہ مقرر کی گئی ہے۔

سحر ہنگامی صاحب نے رباعیات عمر خیام کا ہندی میں ترجمہ کیا ہے جو غیر معمولی اہتمام سے انڈین پریس الہ آباد میں باتصویر چھپ رہا ہے۔

ہندستانی اکیڈمی صوبۂ متحدہ نے سنہ ۳۵-۱۹۳۴ء کی بہترین اُردو تصنیف کے لئے پانچسو روپیہ انعام دینے کا اعلان کیا تھا۔ چنانچہ سید سلیمان صاحب ندوی کی مشہور تصنیف "خیام" اس انعام کی مستحق قرار دی گئی ہے جس پر ہم مولانا موصوف کو مبارکباد دیتے ہیں۔

اکیڈمی نے "انقلاب روس" کی تصنیف کے صلہ میں پنڈت کشن پرشاد صاحب کول ممبر انجمن خادمان ہند لکھنؤ کو ساڑھے سات سو روپیہ پیش کئے ہیں۔ "زمانہ" میں اس قابل قدر کتاب کا مفصل ریویو شائع ہوچکا ہے۔

مولانا اصغر کی وفات حسرت آیات سے ہندستانی اکیڈمی میں اُردو اسکالر کی جو جگہ خالی ہوگئی تھی اس پر دارالمصنفین اعظم گڈھ کے رکن مولانا سعید انصاری کی تقرری ہوئی ہے۔ مولانا موصوف زمانہ کے پُرانے مضمون نگاروں میں

ہم کو امید ہے کہ وہ اکیڈیمی کے لئے دیگر اصحاب کی بہ نسبت زیادہ مفید ثابت ہوں گے۔

برما ریسرچ سوسائٹی کی فرمایش پر لندن یونیورسٹی کے برہمی زبان کے لکچرار مسٹر سٹوورٹ برمی زبان کی ایک نئی لغت تیار کر رہے ہیں۔

سال مختتمہ مارچ ۱۹۳۶ء میں صوبہ متحدہ آگرہ واودھ میں کل تین ہزار چار سو پچیس کتابیں شائع ہوئیں جن میں ہندی مطبوعات کی تعداد دو ہزار ایک سو انتالیس (۲۱۳۹) تھی، اور اردو کتابوں کی تعداد صرف دو سو اکیاون (۲۵۱)۔ تین سو ستاون (۳۵۷) انگریزی کتابیں، اور ایک سو تینتالیس (۱۴۳) سنسکرت کتابیں طبع ہوئیں۔ اس طرح اردو مطبوعات کی تعداد انگریزی کتابوں سے بھی کم رہی جو قدر دانِ اردو کے لئے ایک شرمناک وعبرت انگیز واقعہ ہے۔ منظوم مطبوعات کی تعداد ایک ثلث سے زائد تھی، بقیہ میں ۵۱ کتابیں زبان کے متعلق ۳۶۵ کتابیں مذہبی، اور ۱۶۱ تاریخ اور جغرافیہ سے متعلق اور ۲۷ فلسفیانہ کتابیں تھیں۔ سیاسی مطبوعات کی تعداد صرف ۴۴ تھی، آرٹ کے متعلق اڑتیس کتابیں شائع ہوئیں۔ مذہبی کتابوں میں اکثر شیعہ سنیوں کے باہمی مباحثوں کے متعلق ہیں جین مت کی توضیح وتشریح میں بھی کئی کتابیں پہلی دفعہ شائع ہوئیں، اب تک جین دھرم کی مقدس کتابیں عوام کی نظروں سے پوشیدہ تھیں مگر زمانہ کی ضروریات نے جینیوں کو بھی اپنے جواہر پاروں کو عوام کے نذر کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔ اردو کتابوں میں سب سے زیادہ قابلِ ذکر معین الشعرا ہے جس میں الفاظ کے معنی، ان کے تذکیر و تانیث کی تشریح اور ان کے اعداد از روے جمل اور اساتذہ کے سندی اشعار دیئے گئے ہیں۔

۳۵-۱۹۳۴ء میں صوبہ متحدہ میں اخباروں اور رسالوں کی تعداد چھ سو چورانوے (۶۹۴) تھی جو ۳۶-۱۹۳۵ء میں بڑھکر سات سو بہتر (۷۷۲) ہوگئی۔ ان میں صرف پچیس اخبار روزانہ تھے۔ کثرت مطبوعات کے لحاظ سے الہ آباد کا نمبر اول ہے، اس کے بعد آگرہ، بنارس اور لکھنؤ ہیں۔ رسم الخط کے لحاظ سے دو سو ننانوے اخبارات اردو رسم الخط میں اور دو سو اکیانوے اخبارات ناگری حروف میں شائع ہوتے ہیں۔ چوراسی پرچے انگریزی میں، تین رومن اردو میں اور اتنالیس انگریزی۔ اردو۔ ہندی میں شائع ہوتے ہیں۔ مگر اکثر پرچوں کی اشاعت بہت کم ہے حتی کہ صرف چار انگریزی، گیارہ اردو اور سترہ ہندی پرچے ایسے ہیں جن کی اشاعت دو ہزار سے زائد ہے، باقی کی دو ہزار بھی نہیں ہے۔

الہ آباد لائبریری غالباً صوبہ کی سب سے بڑی لائبریری ہے۔ سال مختتمہ مارچ ۱۹۳۶ء کی رپورٹ سے معلوم

ہوتا ہے کہ اس کے ممبروں نے پچھلے سال میں دو ہزار ڈیڑھ سو ہندی کتابیں اور نو سو تینتیس اُردو کتابیں مستعار لے کر پڑھیں۔ بنگالی کتابوں کی تعداد ایک ہزار چوالیس تھی۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ الہ آباد میں قدردانوں کے لحاظ سے بنگلہ زبان کے شائقین کتب کی تعداد اُردو سے زائد ہے۔

انجمن اُردو کی شاخ بہار نے اپنے صوبہ میں اُردو ہندی کا مسئلہ طے کرنے کی غرض سے مرکزی انجمن ترقی اُردو کا ایک جلسہ بانکی پور پٹنہ میں طلب کیا تھا چنانچہ گذشتہ ۲۸ اگست کو یہ جلسہ مولانا سید سلیمان ندوی صاحب کے زیر صدارت منعقد ہوا، اور اس میں قاضی عبدالودود صاحب بیرسٹر پٹنہ کی تحریک پر بہار میں اُردو ہندی کے مسئلہ کے مختلف پہلوؤں پر غور کیا گیا اور اتفاق رائے سے طے ہوا کہ ہندستانی ملک کی وہ زبان ہے جو ہندو مسلمانوں کے میل ملاپ سے بنی ہے اور جس کو شمالی ہند کے باشندے عام طور پر بولتے ہیں، اور جو ہندستان کے دوسرے حصوں میں بھی سمجھی جاتی ہے اور عربی، فارسی اور سنسکرت کے نامانوس لفظوں سے خالی ہے اور فارسی یا ناگری حروف میں لکھی جاتی ہے۔

اسی کے ساتھ یہ بھی طے پایا کہ اسکولوں کے ابتدائی چار جماعتوں کی کتابیں ایسی عام فہم اور آسان ہندستانی زبان میں لکھی جائیں جسے رسم الخط کے اختلاف کے باوجود ہندی اُردو جاننے والے یکساں طور سے سمجھ سکیں، اور ثانوی جماعتوں میں اُردو پڑھنے والوں کو ہندی اور ہندی پڑھنے والوں کو اُردو سیکھنا لازمی قرار دیا جائے۔

سہ پہر کے اجلاس میں بابو راجیندر پرشاد صاحب سابق صدر کانگریس اور بابو بلدیو سہائے صاحب ایڈوکیٹ جنرل بہار بھی تشریف لائے اور باہمی تبادلۂ خیالات کے بعد مولوی عبدالحق صاحب سکریٹری انجمن ترقی اُردو اور بابو راجیندر پرشاد صاحب کے دستخطوں سے ایک مشترکہ اعلان شائع ہوا جس کا ضروری اقتباس درج ذیل ہے:-

"ہمیں اتفاق ہے کہ ہندستانی زبان ہندستان کی مشترک زبان ہونی چاہیئے، اور اُردو و ناگری دونوں رسم الخط میں لکھی جانی چاہیئے، اور دونوں رسم الخط تمام سرکاری اور تعلیمی مقاصد کے لئے تسلیم کر لینے چاہیئے۔

ہندستانی زبان سے مراد وہ زبان ہے جس میں زیادہ سے زیادہ اجزا اس زبان کے لئے جائیں جو شمالی ہند میں عام طور پر بولی جاتی ہے، اس میں الفاظ کے انتخاب کا معیار یہ ہونا چاہیئے کہ ان کا عام بول چال میں کس حد تک رواج ہے۔ اسی کے ساتھ ہندی اور اُردو دونوں کو بحیثیت ادبی زبانوں کے پوری پوری ترقی کا موقعہ دینا چاہیئے۔

یہ بھی تجویز ہے کہ ہندی اُردو ادیبوں کی اعانت سے ہندستانی زبان کے بنیادی الفاظ کا ایک لغت تیار کیا جائے اور علمی اصطلاحات کے انتخاب کے لئے ایک چھوٹی سی کمیٹی بنادی جائے جس میں اُردو، ہندی دونوں کے با اثر ارکان شریک ہوں اور جو دونوں زبانوں کو ایک دوسرے کے قریب لانے اور ہندستانی زبان کو ترقی دینے کے قائل ہوں تاکہ دونوں زبانوں کے بولنے کے تعلقات خوشگوار رہیں۔"

اس اعلان کا عام طور پر خیر مقدم کیا گیا ہے۔ ہم اس متفقہ تجویز پر اظہار مسرت کرتے ہیں۔

بحکم جناب پنڈت سرِیش چندر چترویدی صاحب بہادر سول جج اٹاوہ

سمن بنام قائم مقام قانونی مدعا علیہ متوفی

نمبر ۱۳۱ ہہ ۷ ۱۹۳۶ء (آرڈر ۲۲ - قاعدہ ۴)

بعدالت سول ججی اٹاوہ ضلع مین پوری

مدعیان:

۱- جھبو لال
۲- مہادیو پرشاد
۳- کالکا پرشاد
۴- سیتارام
پسران گردھاری لال اقوام مہاجان ساکنان بازار شیو گنج مندرجہ موضع بریاری مئو پرگنہ بدھونہ ضلع اٹاوہ ڈاکخانہ سہائل

۵- اوسری لال
۶- رام رتن
پسران بلدیو پرشاد ....

۷- پرکاش نراین نابالغ عمر ۱۶ سال
۸- چھوٹے لال نابالغ عمر ۱۲ سال
۹- بابو رام نابالغ عمر ۳ سال
پسران کالکا پرشاد بولایت اوسری لال

۱۰- منشی دھر ولد گیادین ....

(نمبر ۵ تا ۱۰) اقوام برہمن ساکنان موضع موبانہ پرگنہ و ضلع کانپور

بنام

۱- گوپی چندر پسر و وارث قابض جائداد مصری لال رسپانڈنٹ متوفی قوم برہمن ساکن موضع کمسوآباد پرگنہ و ضلع کانپور

۲- بابو رام عرف لڈکو پسر و وارث قابض جائداد مرلی دھر رسپانڈنٹ متوفی قوم برہمن ساکن موضع گلو اپور پرگنہ ڈیراپور ضلع ڈیراپو۔ ڈاک خانہ ڈیراپور

۳- پراگ دت
۴- ہزاری لال
پسران بنے بنیر گان وارثان قابضان جائداد مرلی دھر رسپانڈنٹ متوفی ساکن موضع کمسوآباد پرگنہ ڈیراپور ضلع کانپور

ہرگاہ سہوندو وغیرہ مدعی اپیلانٹ نے ایک نالش اس عدالت میں بتاریخ ۳۰ جولائی ۱۹۳۶ء بنام رسپانڈنٹان مدعا علیہ کے رجوع کی تھی جو بعد کو مصری لال و مرلی دھر رسپانڈنٹ وغیرہ فوت ہوگیا اور ہرگاہ مدعی مذکور نے ایک درخواست اس عدالت میں گذرانی ہے جس میں وہ لکھتا ہے

زمانہ

نمبر۴ | اکتوبر ۱۹۳۷ء | جلد ۶۹

ہماری قومی زبان[1]

مسٹر رائی دیال جین بی۔ اے (آنرز) بی۔ ٹی

ہندوستان کی مختلف تحریکوں سے ہماری بیداری کا اظہار ہو رہا ہے۔ اور اُس کا ایک جزو قومی زبان کی تشکیل ہے۔ گو عرصہ سے مختلف دیسی زبانیں اپنے اپنے طور پر ترقی کر رہی ہیں۔ مگر گذشتہ چند سال وطنی جذبات کی روز افزوں ترقی سے قومی زبان کا سوال بھی زور کے ساتھ سامنے آگیا ہے۔ ملک کے بڑے بڑے قومی رہنما اور انجمنیں اس پر غور کر رہی ہیں۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ مسئلہ مستقبل میں بحث مباحثہ کے میدان سے نکل کر ایک فیصلہ شدہ شکل اختیار کر لیگا۔

درحقیقت ملک کی یہ انتہا درجہ کی بدقسمتی ہے کہ یہاں ہر ایک ملکی تحریک کسی نہ کسی وقت فرقہ وارانہ شکل اختیار کر لیتی ہے۔ خواہ اسمیں سیاسی حقوق کا سوال ہو یا مالی بہبودی کا۔ مزدوروں کی اصلاح کا معاملہ ہو یا مستورات کی بھلائی کا۔ زبان کا مسئلہ ہو یا تعلیم کا۔ اس کے وجوہ ہماری ذاتی خودغرضیاں۔ باہمی بے اعتمادی۔ فرقہ وارانہ زاویۂ نگاہ زمانہ دراز کی غلامی۔ قومی احساس کا فقدان ہیں۔ قومی زبان کے معاملہ کو بھی بدقسمتی سے فرقہ وارانہ نظر ہی سے دیکھا جا رہا ہے۔ چنانچہ اس سوال کے جلد حل ہونے کی بھی یہی وجہ ہے۔ اگر اس سوال کو ملکی نقطۂ نگاہ سے دیکھا جائے اور باہمی مفاد اور لین دین (Give and Take) کی نگاہ سے حل کیا جائے تو اُس کے فیصلہ میں زیادہ دقت پیش نہ آئے۔

آجکل اس مسئلہ پر ہندی اُردو۔ انگریزی اخباروں و رسالوں میں خوب بحث ہو رہی ہے۔

---

[1] یہ مضمون شروع جون ۱۹۳۷ء میں ہمارے پاس اشاعت کیلئے آگیا تھا اسلیئے اسکو یہ پنڈت جواہر لال نہرو صاحب کے مضمون کے اشاعت سے پہلے چھپ جانا چاہیے تھا۔ اس تاخیر کے لیئے ہم مضمون نگار سے عذر خواہ ہیں (ایڈیٹر)

میرے سامنے اسوقت اپریل اور مئی کا ہندی رسالہ سرسوتی اس سال کے ہمایوں کے کئی نمبر۔ اپریل کا ہنس اور ۱۹ مئی کا روزانہ اخبار ٹریبون ہیں اور ان سب میں ہندی۔ اُردو۔ ہندستانی کے متعلق مختلف خیالات ظاہر کئے گئے ہیں۔ صرف ہنس میں اس موضوع پر تین مضامین ہیں اور رسالہ کا پانچواں صفحہ اس مباحثہ پر وقف کر دیا گیا ہے۔ زمانہ میں بھی اس بارے میں متعدد مضامین لکھے جا چکے ہیں بعض اصحاب اسکو ایک نیا قضیہ سمجھ رہے ہیں اور اسے زبان کا جھگڑا کہتے ہیں۔ مگر میں اسکو قومی تندرستی کا نشان، ملکی بہبودی کے سوالات سے دلچسپی کا ثبوت سمجھتا ہوں اور خیال کرتا ہوں کہ جس قوم کے اہلِ خیال اور بیدار مغز اصحاب اپنے قومی مسائل کو سلجھانیکی کوشش میں مختلف زاویۂ نگاہ کو پیش کرنے میں مصروف ہوں وہ قوم ایک روز ترقی کے بلند معیار پر ضرور پہونچیگی اور بالآخر اپنی مشکلات کا حل دریافت کرلیگی۔ لیکن اس کے لئے ہمیں اپنے توازن دماغ کو قائم اور اپنے خیالات کو درست رکھنا پڑیگا۔ اور اس بات کا بھی خیال رکھنا ہوگا کہ دیدہ و دانستہ یا انجان طور پر بغرض کسیطرح کوئی ایسی بات ہماری زبان و قلم سے نہ نکل جائے جس سے یہ پیچیدہ مسئلہ اور زیادہ پیچیدہ بن جائے اور باہمی تعلقات میں مزید کشیدگی پیدا ہوجائے

جس اہم مسئلہ کو سلجھانے کے لئے مہاتما گاندھی، پنڈت جواہر لال نہرو، کاکا کالیلکر، مولوی عبدالحق جیسے بزرگ اور ہندی ساہتیہ سمیلن۔ بھارتیہ ساہتیہ پریشد۔ انجمن ترقی اُردو جیسی سبھا میں مصروف کار ہوں۔ اسکے متعلق مجھ جیسے ناچیز شخص کا کچھ لکھنا ایک حیرت انگیز جرأت ہے۔ لیکن اس کے متعلق میں نے بھی کچھ غور و خوض کیا ہے۔ اسلئے اپنے ناچیز خیالات کا اظہار ضروری سمجھتا ہوں۔

مجھے دونوں زبانوں سے دلچسپی ہے۔ ہندی اور اُردو کو میں بول چال کے لحاظ سے ایک ہی مانتا ہوں مگر لکھتے وقت یہ دو زبانیں علیحدہ بن جاتی ہیں۔ یہ امر واقعہ ایک تلخ حقیقت ہے۔

بڑھتی ہوئی قومی تحریک۔ عوام سے بڑھے افراد و اسطہ۔ کونسلوں۔ کانفرنسوں۔ وسیع ذرائع آمد و رفت۔ تجارت افواج اور سرکاری دفاتر کی موجودگی میں قومی اتحاد اور باہمی کاروبار کے لئے ایک مشترکہ قومی زبان کی ضرورت کا احساس لازمی تھا۔ چنانچہ جب سے ملکی رہنما مختلف اطراف ملک کا دورہ کرنے اور عوام سے ملنے جلنے لگے ہیں اُسوقت سے وہ اس بات کی سخت کوشش کر رہے ہیں کہ ملک میں ایک ایسی زبان کی داغ بیل پڑ جائے جو بلوچستان سے لیکر برما یا آسام تک اور کشمیر سے لیکر راس کماری تک عام طور پر سمجھی جا سکے اور جو صرف چند ہزار اعلےٰ تعلیم یافتہ اصحاب کی زبان نہ ہو بلکہ عوام کی زبان ہو۔ یہ رتبہ انگریزی زبان کو حاصل نہیں ہوسکتا۔ گو اب سے چالیس پچاس سال پہلے وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ اصحاب کو ایک مشترکہ پلیٹ فارم پر لانے میں کامیاب ہوگئی تھی۔ عوام کی زبان تو وہ ہوگی جسے جو پشاور۔ مدراس۔ ناگپور۔ کلکتہ کراچی اور اُس کے آس پاس کے علاقوں میں ہزارہا اشخاص کے مجمع میں مہاتما گاندھی۔ مسٹر ستیہ مورتی مسٹر جناح اور ہندوستانی وزراء بولیں۔ اور حاضرین انکا مطلب بخوبی سمجھ لیں

ایسا کرنے میں بولنے والے کو عوام کے نزدیک آنے کے لیئے بڑے بڑے مشکل الفاظ کو چھوڑنا پڑے گا اور عوام کو بھی ان کی زبان سمجھنے کیلئے کچھ کوشش کرنی ہوگی۔ اس زبان کو ہر ایک مذہب کا بنگالی پشاور میں مدراسی کشمیر میں اور پشاوری دکن میں بول کر یا لکھ کر اپنا کام آسانی سے چلا سکے گا۔ ہندوستانی کانفرنسوں۔ تجارتی منڈیوں۔ ریڈیو۔ اخبارات اور سینما کی بھی یہی زبان ہوگی۔ اور یہی قومی زبان قرار دی جائے گی۔

عوام کی باہمی کاروباری زبان کی بنیاد ہندی اور اُردو کی شکل میں اب سے چار پانچ سو سال ہوئے پڑ گئی تھی اور یہ دونوں زبانیں ہندوستان کے ایک بڑے حصّہ میں کام آرہی ہیں۔ اپنے اپنے علاقوں میں ہندو اور مسلمان دونوں انھیں برابر استعمال کر رہے ہیں۔ اور آئندہ بھی کریں گے۔ ان زبانوں پر ہندو اور مسلمان کے لیبل لگانا یعنی ہندی کو ہندوؤں کی اور اُردو کو مسلمانوں کی زبان کہنا سخت غلطی ہے جس کا نتیجہ اس کے سوائے اور کچھ نہیں ہو سکتا کہ اس مسئلہ کو فرقہ وارانہ رنگ دے کر ناقابل حل بنا دیا جائے۔ تاریخ اور ہندو مسلمان اہل قلم کی ہندی اُردو تحریریں اور تصنیفیں اس بات کی گواہ ہیں کہ دونوں زبانوں کی ترقی میں دونوں اہل مذہب کا ہاتھ رہا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ ہندی کے لکھنے والے زیادہ تر ہندو اور اُردو کے لکھنے والے زیادہ تر مسلمان رہے ہوں۔ اسوقت بھی صوبجات متوسط۔ ریاستہائے راجپوتانہ صوبہ بہار صوبجات آگرہ و اودھ کے بیشتر حصہ میں مسلمان ہندی میں لکھتے ہیں اور اُردو کو جانتے بھی نہیں۔ بنگال میں مسلمان بنگالی اور گجرات میں گجراتی پڑھتے ہیں دکن کے مسلمان دکن کی دراوڑی زبانیں بولتے ہیں۔ کشمیر پنجاب۔ صوبہ سرحد اور دلّی کے آس پاس کے ہندو اکثر اُردو ہی بولتے اور اُردو ہی لکھتے ہیں۔ اور بہت سے ہندو نہ ہندی جانتے ہیں نہ اُردو۔ وہ اپنی صوبجاتی زبانیں بولتے ہیں اور لکھے پڑھے آدمی انھیں لکھتے پڑھتے ہیں

ہندی اُردو کے علاوہ دیگر صوبجاتی زبانیں مثلاً بنگالی۔ گجراتی۔ سندھی۔ پنجابی۔ مرہٹی اور کنڑی وغیرہ بھی اپنے اپنے علاقوں میں خوب ترقی کر رہی ہیں۔ مگر ان میں سے کسی زبان کے حمایتی نہ اپنی زبان کو تمام ہندوستان کی زبان بنانے کا دعوٰے کرتے ہیں اور نہ اسکی کوئی کوشش ہی کر رہے ہیں۔ اسلئے فی الحال ان زبانوں کا زیر بحث سوال سے براہ راست کوئی تعلق نہیں ہے۔ گو بلا واسطہ جیسا کہ آگے بیان کیا جائیگا ان کا بھی قومی زبان کے سوال سے کچھ تعلق ضرور ہے۔

بہرحال قومی زبان کے سوال کو مندرجہ ذیل حصّوں میں تقسیم کر کے ان پر بحث کرنا زیادہ اچھا ہوگا:۔

۱۔ بول چال کی زبان

۲۔ تحریر کی زبان

۳۔ ذریعہ تعلیم

بول چال کی زبان تقریباً ہر ایک ہندوستانی کی مقرر ہے۔ اور سوائے اُن صوبوں کے جن کی زبانیں ہندی اور اُردو سے مختلف ہیں ہم آپس میں بخوبی بات چیت کر سکتے ہیں۔ یہ دوسری بات ہو کہ ملک کے شمال مغربی حصّہ کے

شہری علاقوں میں بول چال کی زبان میں فارسی اور عربی کے الفاظ زیادہ ہوتے ہیں اور صوبہ بہار متوسط۔ بہار و صوبجات متحدہ آگرہ و اودھ کے شہروں میں سنسکرت کے الفاظ زیادہ ہوں مگر تمام شمالی ہند کے دیہاتی علاقوں میں ہندو مسلمان قریب قریب ایک ہی زبان بولتے ہیں اور جوں جوں تعلیم پھیلیگی اور باہمی تعلق بڑھے گا ہم بول چال کی زبان میں ایک دوسرے کے زیادہ قریب ہوتے جائیں گے۔ صوبجاتی زبان اور لب و لہجہ میں البتہ فرق ہوگا۔ خواہ ملک کی قومی زبان کچھ ہی ہو مگر بول چال کے لحاظ سے ہر ایک آدمی وہی زبان بولے گا جو اس نے ماں کی گود میں سیکھی ہے۔ کیا آپ نے دیکھا یوپی کو بنگالی میں۔ دو مرہٹوں کو مرہٹی میں اور دو پنجابیوں کو پنجابی میں گفتگو کرتے نہیں سنا پنجاب کے وہ مسلمان بھی جو اردو کے زبردست حامی ہیں اپنے گھروں میں اور بے تکلف دوستوں میں بلا روک ٹوک اور قدرتی طور پر پنجابی زبان ہی میں گفتگو کرتے ہیں۔

حال ہی کا ذکر ہے کہ سندھ کی صوبجاتی اسمبلی میں انگریزی زبان کے استعمال کا قاعدہ جاری ہوتے ہوئے بھی کئی ممبر اور صدر اسمبلی سندھی زبان میں بات چیت کرتے دیکھے گئے۔ اگر یہ معلوم ہو جائے کہ صدر اور ان ممبران کے مذاہب کیا تھے تو اس بات کا اور زیادہ پتہ لگ جائے گا کہ زبان کا سوال بھی درحقیقت مذہب کا سوال ہے۔ خیر حقیقت امر یہ ہے کہ ان اصحاب نے ایک غیر قدرتی حالت پر قدرتی حالت کو بناوٹ پر اصلیت کو اور غیر مادری زبان پر مادری زبان کو ترجیح دی۔ اور انہوں نے جو کچھ کیا وہ واجب تھا خواہ مروجہ آئین و قوانین کچھ ہی ہوں اس پر بھی ہر ایک ہندوستانی کو یہ خیال پیش نظر رکھنا ہوگا کہ وہ صوبجاتی زبان کو جانتے ہوئے بھی تمام ملک کی قومی زبان کے کافی الفاظ سے بھی واقفیت حاصل کرے تاکہ وہ ہندوستان کا باشندہ سمجھا جا سکے اور اپنے ملک کی زبان سے ناواقف نہ رہے۔ اور ایک مفید شہری بن سکے۔

مشترکہ زبان کے معاملہ میں دکن کا معاملہ کچھ مختلف ہے کیونکہ دکن کی زبانیں دراوڑی زبانوں سے تعلق رکھتی ہیں مگر چونکہ ان کی زبان میں سنسکرت الفاظ کی کافی تعداد ہوتی ہے یا وہ سنسکرت بخوبی جانتے ہیں اسلئے دیوناگری حروف کے ذریعہ وہ آسانی سے شمالی ہند کے لوگوں کے نزدیک آ سکتے ہیں۔ اور اسی خیال کے زیر اثر دکن میں ہندی زبان کا پرچار کیا جا رہا ہے۔ اور اسی وجہ سے اس کام میں وہاں کافی کامیابی ہو رہی ہے۔

اس بول چال کی عام زبان کو آپ ہندی۔ اردو یا ہندوستانی کچھ ہی کہیں۔ مگر ملک کے نقطۂ خیال سے اس کو ہندی یا ہندوستانی کہنا زیادہ بجا ہوگا۔

پس اس سلسلہ میں آئندہ کے لئے ایسا انتظام ضرور کرنا ہوگا کہ ہمارے ہر ایک اہل ملک کو اس قومی زبان سے کافی واقفیت حاصل ہو۔ تاکہ وہ پبلک کاموں میں قومی زبان کے نہ جاننے کا عذر پیش نہ کر سکے۔ تھوڑی سی کوشش سے دوسری زبان کی حیثیت سے ریڈیو اور باہمی تعلق سے یہ ضرورت آسانی سے پوری کی جا سکتی ہے۔

تحریر کی زبان کا سوال بول چال کی زبان سے پیچیدہ ہے۔ اس وقت بھی شاید ایک بنگالی اور ایک

پنجابی آپس میں بات چیت کرکے اپنا مطلب نکال سکتا ہے۔ مگر تحریری زبان سے وہ ایک دوسرے سے کوسوں دُور ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اُن کے لکھنے کا طریقہ (رسم الخط) مختلف ہے۔ اگر زبان کا سوال صرف بول چال ہی کا سوال ہوتا تو یہ دقت کچھ معنی نہ رکھتی۔ مگر زبان کا تحریری پہلو زبانی پہلو سے کہیں زیادہ اہم ہے اور اسکو نظر انداز کرنا قومی خودکشی کے بمنزلہ ہے۔ اس لئے اس کا حل بھی ہمیں جلد یا دیر میں کرنا ہی ہوگا۔ میری رائے میں تو یہ فیصلہ جتنا جلد ہو سکے بہتر ہوگا۔ کیونکہ ہندوستان کو اپنے لٹریچر اور تعلیم میں آئندہ چند ہی سال میں حیرت انگیز ترقی کرنا ہے اسلئے اس تحریری پہلو کو بھی ہمیں ملکی مفاد کے خیال سے جلد ہی حل کر لینا چاہیئے۔

خوش قسمت ہے وہ ملک جسکی بول چال کی زبان اور رسم الخط ایک ہو۔ مگر ایسے ملک دُنیا میں بہت کم ہیں ہندوستان ایک بہت بڑا ملک ہے۔ اس لئے اس میں کئی قسم کے حروف رائج ہیں۔

میں آپ کے سامنے دو تین ملکوں کے زبان کے معاملے کو پیش کرکے یہ بتانا چاہتا ہوں کہ کس طرح ان ملکوں نے اپنے رسم الخط کی دقتوں کو ایک۔ ایک کرکے حل کر لیا۔

ابھی حال میں ایک بنگالی نوجوان مسٹر کے۔ سی۔ بنرجی نے بڑی مشکلات کا سامنا کرتے ہوئے ایشیا کے مشرقی ممالک کا سفر پیدل اور سائیکل پر کیا ہے۔ اُنھوں نے اس سفر کا حال ایک کتاب (My Travels in the East.) نامی میں شائع کیا ہے۔ یہ کتاب جہاں مختلف لحاظ سے قابل دید ہے وہاں زبان کے معاملہ میں بھی ہماری رہنمائی کر سکتی ہے۔ ہمکو اس سفرنامہ سے بہت سی مفید نصیحتیں ملتی ہیں۔ مسٹر بنرجی چین منچوریا۔ کوریا اور جاپان کے حال میں علیحدہ علیحدہ تحریر کرتے ہیں:[1]۔

(۱) "اس نیم برِ اعظم (چین) میں پندرہ مختلف بولیاں بولی جاتی ہیں۔ لیکن سب باشندگان چین ایک ہی حروف لکھتے ہیں ان کی بولیاں ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔ چنانچہ ایک صوبہ کا آدمی کسی دوسرے صوبہ کے رہنے والے دوست سے اپنی بولی میں گفتگو کرتا ہے، تو وہ دوست بالکل نہیں سمجھ سکتا۔ لیکن جب وہ اُسی دوست کو کوئی خط لکھتا ہے تو وہ دوست سمجھ لیتا ہے، کیونکہ ملک کے تمام حصوں کے باشندے ایک ہی رسم الخط استعمال کرتے ہیں۔" (صفحہ ۱۰۱)

(ب) "منچوریا کے لوگ بھی مختلف زبانیں بولتے ہیں اور ایک دوسرے کی بات نہیں سمجھ سکتے۔ لیکن جب لکھتے ہیں تو ہر شخص خواہ وہ شمال کا باشندہ ہو یا جنوب کا، مشرق کا رہنے والا ہو یا مغرب کا، ایک دوسرے کی بات سمجھ لیتا ہے، کیونکہ جب وہ لکھتے ہیں تو ایک ہی رسم الخط استعمال کرتے ہیں جس کے لفظوں کے معنی یکساں ہیں گو مختلف علاقوں میں ان کا تلفظ دوسرا ہو۔" (صفحہ ۱۱۷)

---

[1] یہاں پر لائق مضمون نگار نے انگریزی اصل عبارت نقل کی تھی مگر ہم اس کا ترجمہ اپنے الفاظ میں ہدیۂ ناظرین کر رہے ہیں۔ ا۔ ز

(ج) "اہل کوریا جو بولی بولتے ہیں، اُسے "یورال آلٹائیق" کہتے ہیں۔ جو جاپانی زبان سے ملتی جلتی ہے۔ لیکن دونوں کے مشترک الفاظ بہت کم ہیں۔ چنانچہ اہل کوریا گفتگو کرتے ہیں، تو چینی اور جاپانی لوگ اُن کی بات نہیں سمجھتے لیکن جب وہ لکھتے ہیں تو سمجھ لیتے ہیں، کیونکہ وہ چینی حروف میں لکھتے ہیں"۔ (صفحہ ۱۲۵)

(د) جاپان کے باشندے جاپانی زبان بولتے ہیں، لیکن چینی حروف لکھتے ہیں۔ جب کوئی جاپانی کسی چینی دوست سے بات چیت کرتا ہے تو وہ دوست اس کا مطلب نہیں سمجھ سکتا۔ لیکن جب وہ لکھتا ہے تو دوست بخوبی سمجھ لیتا ہے"۔ (صفحہ ۱۸۹)

اوپر کے اقتباسات پورے پورے نقل کر دئے گئے ہیں۔ تاکہ ہم ہندوستانی سمجھ سکیں کہ ایک مشترکہ رسم الخط کسقدر ضروری ہے اور اُس کا نہ ہونا ہمارے لئے کتنا نقصان دہ ہو رہا ہے۔ ان اقتباسات کا یہی مطلب ہے کہ چین۔ منچوریا۔ کوریا اور جاپان کے مختلف حصوں کی بول چال کی زبان مختلف ہے۔ اور وہ آپس کی گفتگو کو بہت کم سمجھ سکتے ہیں مگر وہ ایک مشترکہ رسم الخط استعمال کرتے ہیں اسلئے وہ تحریری زبان سے ایک دوسرے کے مطلب کو سمجھ لیتے ہیں۔ اگر ہمارے ملک میں ایک مشترکہ رسم الخط رائج ہو جائے تو یہاں بھی ایک اخبار اور ایک کتاب لاکھوں کی تعداد میں شائع ہو سکتی ہے کیونکہ اُسکی بکری کا دائرہ بہت وسیع ہو جائے گا۔ اور مختلف حصوں کے اہل قلم کی اعلیٰ تصانیف ملک کے ہر حصہ میں سمجھی جا سکیں گی۔

قومی تحریک چند ہی سال میں کہیں سے کہیں پہونچ سکتی ہے۔ ابھی ہر ایک بنگالی۔ گجراتی۔ مرہٹی۔ اُردو اور ہندی مصنف کی دنیا الگ الگ ہے۔ ہر ایک کے پڑھنے والے محدود ہیں۔ اور اُسکی تصنیفات دوسروں کے لئے بے فائدہ ہیں۔ یہ کتنی بدقسمتی ہے کہ ٹیگور۔ بنکم چندر۔ سرت چندر۔ وغیرہ جیسے بنگالی۔ خواجہ حالی آزاد۔ اقبال۔ جیسے اُردو اہل قلم۔ اور دیگر گجراتی و مرہٹی مصنفوں کی کتابیں اور اُن کے اعلیٰ خیالات صرف ایک محدود طبقہ کے کام آسکتی ہیں۔ اسبات سے کون انکار کر سکتا ہے کہ اگر تمام ملک میں ایک ہی قسم کا رسم الخط استعمال کیا جائے تو اُن کی تحریروں سے تمام ہندوستانی یکساں مستفید ہو سکتے ہیں۔ کاش ایک رسم الخط یا کم از کم ایک مشترکہ رسم الخط کی ضرورت کو ہم جلد سمجھ لیں اور باہمی ضد چھوڑ کر سیاسی نقطۂ نگاہ سے اس مسئلہ کو حل کر لیں۔

ہندوستان میں اسوقت بہت سے رسم الخط جاری ہیں۔ ان حروف کو (۱) دیوناگری حروف (۲) دیوناگری حروف سے ملتے جلتے۔ بنگالی۔ گجراتی۔ مرہٹی اور گورمکھی حروف (۳) فارسی حروف (۴) دراوڑی زبانوں کے حروف (۵) رومن حروف میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ مگر قومی رسم الخط بننے کے لئے مقابلہ صرف دیوناگری فارسی اور رومن حروف میں ہے۔

ان تینوں قسم کے حروف میں سے قومی رسم الخط وہی بننا چاہیئے اور وہی بن سکے گا جو قومی رسم الخط کی بنیادی ضرورتوں کو پورا کر سکے گا۔ میرے خیال میں دیوناگری حروف اس کے لئے زیادہ مفید ہیں جس کے چند وجوہ درج ہیں:-

۱- ہندوستان کی تعلیم یافتہ آبادی کا کثیر حصہ اسوقت دیوناگری حروف کو استعمال کرتا ہے۔ اور جوں جوں تعلیم پھیلیگی دیوناگری حروف استعمال کرنے والوں کی تعداد زیادہ ہوتی جائے گی۔

۲- دیوناگری حروف کے ذریعہ کام چلاؤ لکھنا پڑھنا پانچ چھ مہینے میں آسانی سے آسکتا ہے۔ اور اس کے ذریعہ سے ہندوستان کے بالغ طبقہ کے مرد عورتوں۔ مزدوروں اور پسماندہ قوموں کو بہت جلد تعلیم یافتہ بنایا جا سکتا ہے۔ اور پرائمری تعلیم کے بعد املا کی غلطی کا بھی زیادہ امکان نہیں ہے۔

۳- ہندی حروف پریس اور ٹائپ کی ضروریات کو پورا کرتے ہیں اور جو کمی ہے وہ جلد دور ہوسکتی ہے۔ پریس اور ٹائپ کی آسانی کا مسئلہ نہایت اہم ہے۔ ورنہ کثیر تعداد میں سستی اور باتصویر کتابیں نکالنا اور خط و کتابت کرنی بڑی دقت کی ہوگی۔

۴- بنگلی۔ گجراتی۔ مرہٹی۔ گرمکھی وغیرہ حروف ہندی حروف سے بہت کچھ ملتے جلتے ہیں۔ بلکہ انکی تبدیل شدہ شکلیں ہیں جو کثیر التعداد اہلِ ملک ان حروف کو استعمال کرتے ہیں وہ آسانی سے ہندی حروف کو سیکھ سکتے ہیں اور اسطرح ملک کے مختلف حصوں کے لوگ جلد ایکدوسرے کے قریب آسکتے ہیں

۵- دکن کی کثیر آبادی دراوڑی زبانوں کے جاننے کے باوجود سنسکرت جانتی ہے۔ اسلئے وہ آسانی سے دیوناگری حروف سیکھ سکتی ہے۔

۶- اُردو میں بھی کثیر تعداد الفاظ ہندی سنسکرت کے ہیں جو بآسانی ہندی حروف میں لکھے جا سکتے ہیں۔

۷- نئے الفاظ آسانی سے بنائے جا سکتے ہیں۔

۹- ہندوستان کے پیدا شدہ مذاہب کی زبانیں سنسکرت۔ پراکرت اور پالی ہیں اور یہاں کے سنتوں اور سادھوؤں کی زبان بھی ہندی ہے۔ ان مذاہب کے پیرو اپنے لٹریچر کو بڑی سرعت سے ہندی میں تبدیل کر رہے ہیں اسلئے وہ تمام لٹریچر ہندوستان کے ہر فرد بشر کو ان حروف میں مل سکتا ہے۔ اسطرح ہندی رسم الخط رائج ہونے سے ہندوستانی قدیم تہذیب قدیم ہند کی تاریخ اور ہندو بدھ اور جین علم ادب علوم فنون کے مطالعہ میں مدد مل سکتی ہے۔

فارسی رسم الخط کو شمالی ہند کے بہت بڑے حصہ میں ہندو اور مسلمان استعمال کرتے ہیں۔ اور آئندہ بھی استعمال کرتے رہیں گے۔ اسکی بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ جلد اور کم جگہ میں لکھا جا سکتا ہے۔ اور شارٹ ہینڈ کا کام دے سکتا ہے۔ مگر یہ نہ پریس اور ٹائپ کی بڑھتی ہوئی ضرورت کو پورا کر سکتا ہے اور نہ اسکو جلد درست لکھنا آسکتا ہے۔ اس کے ذریعہ سے بنگالی۔ گجراتی۔ مرہٹی وغیرہ زبانوں کے لکھنے والوں کے قریب آنا بھی ممکن نہیں ہے۔ بعض اصحاب کا خیال ہے کہ فارسی رسم الخط کے ذریعہ ہم کو وسطی ایشیا۔ فارس اور مصر سے قربت حاصل ہوسکتی ہے۔ مگر یہ دلیل زیادہ

وزنداں نہیں ہے دوسرے اس سے ہماری قومی یک جہتی کا سوال حل نہیں ہوتا۔ وسطی ایشیا۔ ایران اور مصر سے تعلقات رکھنے کے لئے یہاں ہر زمانے میں کروڑوں آدمی فارسی رسم الخط لکھنے والے مل سکیں گے۔ اسلئے میرے خیال میں فارسی رسم الخط میں ایسی کوئی خوبی نہیں ہے جس کی بنا پر اُسے قومی رسم الخط کی حیثیت سے ہندی رسم الخط پر سبقت دی جا سکے۔

ہندی حروف کو قومی رسم الخط تسلیم کرنے سے صوبجاتی زبانوں اور فارسی رسم الخط کو کوئی نقصان نہ پہونچے گا۔ اور نہ مسلم تہذیب ہی خطرہ میں پڑیگی۔ ہندو مسلم تہذیبیں بہت مضبوط بنیادوں پر قائم ہیں۔ رسم الخط پر انکا انحصار نہیں ہے۔ اگر ترکی تہذیب رومن حروف اور جاپانی تہذیب چینی رسم الخط اختیار کرنے سے نہیں مٹ سکی تو پھر ناگری حروف کے اپنانے سے مسلم تہذیب کیسے مٹ جائیگی ؟۔ علاوہ بریں اُردو داں ہندو و مسلمانوں سے فارسی رسم الخط چھوڑنے کو کوئی نہیں کہتا۔ صرف اسبات کی ضرورت ہے کہ ہر ایک ہندوستانی اپنے صوبجاتی یا مروجہ رسم الخط کیساتھ ناگری حروف بھی سیکھ لے۔

ہندوستان میں رومن حروف کے حامیوں کی تعداد نفی کے برابر ہے۔ اور اسکے جو حامی نظر بھی آتے ہیں وہ شکست یافتہ ذہنیت کے آدمی ہیں۔ جو فارسی اور ہندی رسم الخط کے جھگڑے کے فرقہ وارانہ رنگ سے تنگ آکر رومن حروف کی حمایت کرنے لگے ہیں یا تاکہ رومن حروف میں بہت سی خوبیاں ہیں مگر وہ ہندوستان کی ضرورت کو پورا نہیں کر سکتے اور اسی لئے ہندوستان کا قومی رسم الخط نہیں بن سکتے۔

بھارتیہ ساہتیہ پریشد کا یہ فیصلہ کہ ہندوستان کی زبان ہندی ہندوستانی ہوگی جس میں مہاتما گاندھی اور اُن کے ہمخیال سیاسی لیڈروں کا بڑا ہاتھ ہے، بلاشبہ درست ہے۔ کیونکہ ہندی ہندوستانی سے بول چال کی زبان اور رسم الخط دونوں کا فیصلہ کرنا مقصود تھا۔ قومی زبان کو ہندوستانی کہنے کے لئے تو سب متفق تھے۔ مگر رسم الخط پر اختلاف تھا جس کے دور کرنیکی اشد ضرورت تھی چنانچہ ہندی لفظ لگا دینے سے یہ طے کیا گیا ہے۔ کہ ہندوستانی زبان عوام ملک کے استعمال کیلئے ہندی حروف میں لکھی جائے۔ مولوی عبدالحق صاحب سکریٹری انجمن ترقی اُردو۔ مسٹر بشیر احمد صاحب ایڈیٹر ہمایوں اور سید ابوالقاسم صاحب اور بہت سے مسلمان علماء، اس فیصلہ کو اُردو کیلئے مضر اور مسلمانوں کے خلاف سمجھتے ہیں۔ باہمی بداعتمادی اور فرقہ وارانہ فضا کی حالت میں ہندی ہندوستانی کی تحریک کو شک کی نظروں سے دیکھنا تعجب انگیز نہیں ہے۔ مگر بنیادی حقوق کے متعلق کراچی کانگریس والے رزدیوشن کی دفعہ تین (جو زبان اور اقلیتوں کے مذہب۔ تہذیب اور زبان کی حفاظت کے متعلق ہے) کی روشنی اور مہاتما گاندھی اور پنڈت جواہرلال کے بیانات کی موجودگی میں کوئی شک باقی نہ رہنا چاہئیے۔ مشرقی ایشیائی ممالک کی مثالوں اور اسلامی ملک ترکی کی مثال کی موجودگی سے ان اصحاب کو ہمت ہونا چاہیئے اور انہیں قومی اور ملکی مفاد کی نظر سے ناگری حروف کی حمایت کرنا چاہیئے۔

ہندی ہندوستانی کے بڑھتے ہوئے پرچار سے صرف اُردو داں اصحاب ہی کو تشکک اور ڈر نہیں ہے اور زبانوں کے حامیوں کو بھی فکر ہو گئی ہے۔ ابھی حال میں اندھرا یونیورسٹی کے طلباء کے سامنے تقریر کرتے ہوئے ایک پروفیسر صاحب

نے کہا تھا کہ دکن میں ہندی کے بڑھتے ہوئے رواج کو دیکھتے ہوئے خوف ہوتا ہے کہ کہیں اندھرا دیس کے طالبعلم مرد اور عورتیں اپنی زبان کی طرف سے بے پرواہ نہ ہو جائیں۔ اسلئے لکچرار صاحب نے اپنی زبان کی طرف زیادہ توجہ دینے پر زور دیا۔ حال ہی میں مشہور عالم سنسکرت ڈاکٹر گنگا ناتھ جھا سابق وائس چانسلر الہ آباد یونیورسٹی نے ہندی کے مقابلہ میں اپنی دیسی زبان میتھلی کی حمایت کی ہے۔ اسلئے ہندی ہندوستانی کی مخالفت کوئی غیر متوقع بات نہیں ہے۔ مگر کون سا سوال ہے جسپر یہاں اختلاف نہیں کیا جاتا اور جس کے متعلق کسی کو شک نہیں ہو سکتا۔ جوں جوں اس رسم الخط کے سوال پر قومی مفاد اور اصولوں کی بنا پر غور کیا جائے گا۔ لوگ اس فیصلہ کی خوبیوں کے قائل ہو کر نہ صرف اسکی مخالفت چھوڑ دیں گے بلکہ اسکی حمایت کرنے لگیں گے۔

موجودہ ہندی اُردو کے درمیان ایک بڑی خلیج پیدا ہو گئی ہے جس کے باعث ہمارے مشکل پسند اہل قلم ہیں جو آسان الفاظ کی جگہ فارسی عربی اور سنسکرت کے بھاری بھرکم اور غیر مانوس الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ اس سے جہاں دونوں زبانوں کی تحریر میں فرق بڑھتے جاتے ہیں۔ وہاں بول چال کی زبان بھی تحریری زبان سے بہت پیچھے ہوتی جاتی ہے۔ جس لفظ کو ایک معمولی گریجویٹ نہ سمجھ سکے اُس کے استعمال سے کیا فائدہ ہے۔ جو صاحب ملکی ادب کو ایک زندہ شے بنانا چاہتے ہیں اور عوام کے لئے مفید لٹریچر بہم پہونچانا چاہتے ہیں انکو اپنی تحریروں میں مشکل الفاظ استعمال نہ کرنا چاہیئے۔ یہ ضرور ہے کہ جیسے جیسے ملک کی تعلیمی حالت بہتر ہوتی جائیگی اور ملک میں مطالعہ کا رواج بڑھتا جائیگا۔ عوام کی سمجھ بھی بڑھتی جائیگی تب شاید مشکل الفاظ کے استعمال کے کچھ معنی سمجھ میں آسکیں مگر اسوقت بھی آسان زبان ہی اعلیٰ خیال کی جائے گی۔

بعض صاحب کا خیال ہے کہ جو ہندوستانی زبان تمام ملک میں بولی جائے وہ ایسی ہو کہ فارسی اور ناگری حروف میں لکھی جاسکے۔ ہندوستانی اکیڈیمی صوبہ متحدہ اسی بات کی کوشش کر رہی ہے اور یہ کوشش مفید ہے کیونکہ اس سے دونوں زبانیں ایکدوسرے کے زیادہ نزدیک آجائیں گی اور الفاظ کا ذخیرہ بھی بڑھ جائے گا۔ مگر ہندوستانی اکیڈیمی کو ایسی کتابیں ان عالموں سے لکھوانی چاہیئے جو دونوں زبانیں جانتے ہوں تاکہ وہ ایسی زبان لکھیں جسے ہندی اور اُردو داں صاحب بہ آسانی سمجھ سکیں۔ مگر یہ کام بہت مشکل ہے۔ اگر میں اسی مضمون کو ہندی حروف میں لکھوں تو مجھے اسکے بہت سے الفاظ بدلنے پڑیں گے۔ اسی لئے بعض عالموں کا خیال ہے کہ یہ کوشش فائدہ پہونچانے کے بجائے زبان کو خراب کر دیگی۔ نہ ہندی ہندی رہیگی اور نہ اُردو اُردو۔ لیکن اگر کچھ صاحب صدق دلی سے ملکی مفاد کیلئے یہ کوشش کریں تو انہیں بطور تجربہ ایسا کرنے دینا چاہیئے۔

ذریعہ تعلیم کے بارے میں یہاں زیادہ لکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ ایک بہت پیچیدہ اور بحث طلب مسئلہ ہے۔ آئندہ یہ کس طرح حل ہوگا؟ اس کے بارے میں ہم کچھ زیادہ نہیں کہہ سکتے ہیں۔ اسوقت اسبارے میں بھی کچھ نہیں کہا جاسکتا

کہ مختلف زبانوں کو صوبوں کی زبانوں میں کس طرح ٹھیک بٹھایا جائے گا۔ تاہم قومی زبان اور سیاسی حیثیت سے اتنا کہا جا سکتا ہے کہ ہر ایک صوبے کی تعلیم مادری زبان میں ہوگی۔ رسم الخط کا فیصلہ ہر صوبے کے باشندوں کی زبان کے مطابق ہوگا۔ مگر ہر ایک صوبے میں ہندی حروف اور ہندوستانی زبان سکھانے کا انتظام کیا جائیگا تاکہ ہر ایک ہندوستانی ملک کے ہر حصہ میں کام کر سکے اور بلحاظ زبان پکا شہری بن سکے۔ صوبہ کی اقلیتوں کو جہاں صوبے کی زبان سیکھنی ہوگی وہاں اُنکی زبان میں اُنھیں تعلیم دینے کا بھی مناسب انتظام کرنا ہوگا۔ مگر سائینس وغیرہ علوم کے متعلق ہمیں ایسی اصطلاحات بنانا پڑیں گی جو تمام ملک میں رائج ہو سکیں۔ اس کام کو ہندی اُردو کی انجمنیں جداگانہ طور پر انجام نہیں دے سکتی ہیں۔ اسلئے بہتر ہے کہ انٹر یونیورسٹی بورڈ اسکو اپنے ذمہ لے ورنہ تعلیم میں وہ دقت پیدا ہو جائیگی جسکو دور کرنا بہت مشکل ہو جائیگا۔

بہرحال تعلیم میں ہمکو اپنا زاویۂ نگاہ ملکی بنانا ہوگا اور صوبجاتی نقطۂ خیال[۱] سے بچنا ہوگا جس کے پیدا ہونے کا موجودہ حکومت صوبجاتی خود اختیاری[۲] میں بہت زیادہ ڈر ہو گیا ہے۔

راقم نے قومی زبان کے متعلق ملکی مفاد کو صدق دلی سے سامنے رکھتے ہوئے یہ خیالات ظاہر کئے ہیں اسیوجہ سے یہ مضمون سب سے پہلے اُردو میں لکھا گیا ہے۔ ان خیالات پر اہل الرائے اور اہل دماغ اصحاب غور فرمائیں۔

مجھے اُمید ہے کہ فرقہ وارانہ خیالات صوبجاتی ذہنیت۔ باہمی بداعتمادی سے بالا ہو کر غور کرنے پر سب اصحاب ان خیالات سے متفق ہونگے۔ اَصل (درحقیقت) ہندی ہندوستانی" زبان کا پرچار کرنا بلا تفریق مذہب و ملت ہر ہندوستانی کا فرض ہونا چاہیئے۔ اسکولوں۔ انفرادی اور مجموعی کوششوں۔ تقریروں۔ اخبارات۔ سینما اور ریڈیو سے اسکی اشاعت ہونا چاہیئے۔ اس کے پرچار میں ہمیں بہت سی اصلی اور خیالی دقتوں کا سامنا کرنا پڑیگا۔ مگر اُن دقتوں کو رفع کرنا اور انہیں راستے سے ہٹانا ہر ایک ہندوستانی کا کام ہے۔ ہمکو مصمم اور صبر و تحمل اور ہمت و استقلال کیساتھ مخالفین کو اپنا ہم خیال بنانا چاہیئے۔ پُرانے خیالات کے لوگ خواہ وہ کتنے ہی تعلیم یافتہ کیوں نہ ہوں ملک کی نئی ضروریات اور قوم کے نئے نقطۂ نگاہ کو شاید ہی سمجھ سکیں۔ مگر نوجوانوں کو آگے آنا اور ہندی ہندوستانی کو اپنانا چاہیئے۔ اس سے نہ اُردو کو نقصان پہونچے گا اور نہ دکن کی زبانوں کو نہ دکن کے ہندوؤں کو اور نہ شمالی ہند کے مسلمانوں کو۔ اگر ہم دانشمندی سے اسوقت اس فیصلہ کو نہ اپنائینگے تو ہندوستانی قوم کی تعمیر میں دیر لگیگی اور ملک کی تعلیمی ترقی کی رفتار بہت سُست رہیگی۔ جس کے لئے آئندہ نسلیں ہمکو ذمہ دار بلکہ قصوروار سمجھیں گی۔



---

۱ Provincial outlook ۲ Provincial Attonomy

ساون

مسٹر محمود اسرائیلی

وہ نغمے بلبلوں کے کوک کوئل کی گھٹاؤں میں — پپیہوں کے ترانے بزمِ قدرت کی فضاؤں میں
چمن سازی کے وہ ساماں موروں کی قباؤں میں
کبھی ہندوستاں میں بھی طرب انگیز تھا ساون — سرور افزا و نکہت بیز و گوہر ریز تھا ساون

وہ رم جھم ہلکی بوندوں کی وہ رونق مہ جبینوں کی — چمک اٹھتی نہ کیوں قسمت گلستاں کے حسینوں کی
کہ مہریں ٹوٹتی تھیں حسنِ قدرت کے دفینوں کی
کبھی ہندوستاں میں بھی طرب انگیز تھا ساون — سرور افزا و نکہت بیز و گوہر ریز تھا ساون

تھی اودی ساڑھیوں سے بیل بوٹوں کی جھلک پیدا — ہو جیسے ابر کے دامن میں بجلی کی چمک پیدا
ہوا کرتی تھی اس موسم میں گلشن سے فلک پیدا
کبھی ہندوستاں میں بھی طرب انگیز تھا ساون — سرور افزا و نکہت بیز و گوہر ریز تھا ساون

حسینانِ وطن ہنستے تھے آکر سبزہ زاروں میں — کھلاتے تھے شگوفے نت نئے اپنے اشاروں میں
بہار اک اور آجاتی تھی باغوں کی بہاروں میں
کبھی ہندوستاں میں بھی طرب انگیز تھا ساون — سرور افزا و نکہت بیز و گوہر ریز تھا ساون

پری رو جھولتے ایسے نظر آتے تھے جھولوں میں — اُڑیں اندر کی پریاں بیٹھ کر جیسے بگولوں میں
صبا کا تیز جھونکا جس طرح چل جائے پھولوں میں
کبھی ہندوستاں میں بھی طرب انگیز تھا ساون — سرور افزا و نکہت بیز و گوہر ریز تھا ساون

تعلیم کا دورِ جدید

از ڈاکٹر ایم حفیظ سید ایم اے، پی، ایچ ڈی، ڈی لٹ

میں نے اسوقت تعلیم جدید، کو اپنا موضوع بنایا ہے لیکن مجھے اس کا اندازہ نہیں کہ یہ فقرہ کس حد تک موزوں ہے۔ دنیا میں کوئی چیز نئی نہیں۔ ہم کسی چیز کے متعلق یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ بالکل نئی ہے۔ اسلئے کہ ہمارے دورِ زندگی سے پہلے بھی وہ چیز موجود تھی۔ سیاحوں کی دنیا میں یہ آسان ہے کہ وہ آج بھی ہمارے سامنے ایک نئی سرزمین کا نقشہ پیش کردیں۔ سائنس کی سرزمین میں بھی ممکن ہے کہ آج کوئی گلیلیو، نیوٹن، مارکونی، یا آئن سٹائن پیدا ہوجائے۔ اور ہمارے موجودہ علم کو نئی جلا دیکر اس کی تاریکیوں میں اس سے زیادہ روشنیاں پیدا کردے۔ دخانی مشینوں کی ایجاد، چھاپے خانوں کی صنعت کا علم، لاسلکی کے سحرکار مظاہرے، سب اسلئے وجود میں آئے کہ ہماری سماجی زندگی میں کوئی نیا انقلاب پیدا کریں۔ ایسی صنعتیں، ایسی ایجادیں، ایسے اختراعات، ہماری دنیا میں ایک نئی تبدیلی پیدا کردیتے ہیں۔ ہماری زندگی کی شاہراہیں دوسری منزلوں کی طرف بڑھنے لگتی ہیں۔ یہ منزلیں کسی بلند مقصد کی طرف لیجاتی ہیں یا نہیں اسمیں اب بھی شبہ ہے۔ بہر حال ہماری زندگی کے ہر شعبہ میں تبدیلی، بلندی اور زوال کا گذر ہے۔ ہماری زندگی کے ہر پہلو پر تاریکی اور روشنی کی جھلک پڑتی اور غائب ہوتی رہتی ہے۔ لیکن اخلاقی دنیا میں ایجاد قریب قریب ناممکن ہے۔ اگر ہماری نظریں کسی حقیقی ترقی کی تلاش میں ہیں۔ تو انہیں ناکام لوٹنا پڑے گا۔ کوئی نئی حقیقت اُن کے جلووں میں اضافہ نہ کرسکیگی۔ ہم زیادہ سے زیادہ یہ کرسکتے ہیں کہ اب سے مدتوں پہلے کے قایم کئے ہوئے اصولوں کو زیادہ بہتر طریقے سے سمجھکر اپنی نئی زندگی کے مطابق اُنپر عمل پیرا ہوسکیں۔ ایک اسکول میں پڑھنے والا ابتدائی طالب علم سائنس کے جدید انکشافات کی بدولت علم کے جن گراں بہا خزانوں پر قابض ہے، وہ ارسطو کے لئے بھی حیرت انگیز ہیں۔ لیکن ہم میں سے بہت کم لوگ اپنے آپکو روحانی بلندیوں میں ابن ادہم، یا بایزید کا ہمسر ٹھہرا سکتے ہیں۔ اسی لئے ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ وہ مقاصد جنکی تلقین ہم جدید سمجھ کر کر رہے ہیں وہی ہیں جو اب سے صدیوں پہلے مختلف ملکوں کے معلمین قایم کرچکے تھے۔

پھر ہم کس لحاظ سے "جدید علم" کے فقرے کو بامعنی کہہ سکتے ہیں۔ اس کا موزوں جواب شاید یہ سمجھا جائے کہ، گو ہمارے تعلیمی مقاصد تو بالکل وہی ہیں جو سابق معلمین کے تھے، لیکن جس نقطۂ نظر سے آج تعلیم کو دیکھا جاتا، اور جن مختلف طریقوں سے اسپر عمل پیرا ہونے کی کوشش کی جاتی ہے۔ وہ متقدمین کی روش سے بالکل جداگانہ ہے۔ اسلئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ تعلیمی دنیا میں ہم بالکل ایک نئی راہ روش پر چل رہے ہیں" اب تک ہم جن مقاصد کو اپنا سمجھ چکے ہیں۔ ان کی

طرف بہت کم لوگوں نے توجہ کی ہے۔ لیکن اب رفتہ رفتہ اُن کا اثر دلوں پر بیٹھا جاتا ہے، اور اُن کی تکمیل کی کوشش صرف مخصوص اداروں ہی میں نہیں ہو رہی ہے، بلکہ عوام الناس بھی انھیں جگہ دے رہے ہیں۔

اوپر کی سطروں میں "رفتہ رفتہ" کا لفظ قصداً استعمال کیا ہے۔ کیونکہ اب تک ہم اپنی جد و جہد میں پوری طرح پر فتحیاب نہیں ہوئے ہیں اور ایسا سمجھنا ایک مہلک غلطی ہوگی۔ میرا تو یہ خیال ہے کہ اس جنگ میں پوری طرح فتحیاب ہونا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ اسلئے کہ مذہب کی طرح تعلیم میں بھی علم اور عمل کو یکساں بنانا نہایت دشوار ہے۔ ہم کانفرنسوں میں شریک ہوتے ہیں۔ اور ہم میں سے ہر ایک کے کان اتحادِ مقاصد اور اشتراکِ عمل کے نغموں سے مسحور ہو جاتے ہیں۔ تھوڑی دیر کے لئے یہ موسیقی ہمیں لوریاں دیکر فریب کی دنیا میں لیجاتی ہے۔ لیکن جلسہ ختم ہونے کے بعد ہی نہ وہ سرور و سوز باقی رہتا ہے اور نہ وہ جوش و خروش بلکہ گھر تک پہونچتے پہونچتے ہمارے جذباتِ عمل سرد پڑ جاتے ہیں اور ہماری دلچسپیاں تقسیم ہو جاتی ہیں۔ اور لوگ اپنی اپنی دنیا کے جال میں پھنس کر اسطرف نظر بھی نہیں اُٹھاتے۔

پروفیسر کوئیک نے سچ کہا ہے کہ ہمارے تعلیمی اصول نے جو بادی النظر میں اسقدر کم اثر کیا ہے اسکی وجہ صرف یہ ہے کہ پڑھانے والوں کی بڑی تعداد اُن سے اسی طرح ناواقف ہے جیسے "کینٹ" اور "ہیگل" کے نظریوں سے"۔ اسکی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ آخر پڑھانے والے بھی انسان ہی ہیں! قایم کی ہوئی روایتوں اور دنیا کے مقررہ چکر کا ان پر بھی زبردست قبضہ رہتا ہے۔ رُوح نفس کے خلاف بغاوت کرتی ہے اور نفس روح پر قابض ہونا چاہتا ہے۔ محض ہماری مجبوریاں جو کچھ ہم کرنا چاہتے ہیں۔ ہمیں نہیں کرنے دیتیں۔

بہرحال اسکی ضرورت نہیں کہ ہم کسی جدید طریقۂ تعلیم کے موجد کہلائیں ضرورت صرف اس بات کی ہے۔ کہ ہم اپنی موجودہ ضروریات کا پورا پورا لحاظ رکھتے ہوئے، ان باتوں پر عمل کریں جو اسوقت کیلئے سب سے زیادہ موزوں ہیں اُنہیں کو ہمیں اپنا ایمان جاننا چاہیئے اور تا حدِ امکان ہمکو ان باتوں پر اپنے تعلیمی اداروں میں عمل کرنا چاہیئے"۔

"تعلیم جدید" سے ہمارا کیا مطلب ہے؟ آخر قدیم اور جدید تعلیم میں کیا فرق ہے؟ اس کا جواب بالکل آسان ہے۔ قدیم تعلیم گوشمالی کی حامی تھی۔ پڑھانے والا ایک محکوم جماعت کا حاکم بنکر تحکمانہ لوازمات کیساتھ طالب علموں کے سامنے آتا تھا۔ اُس کا فرض تھا کہ اپنے علم کو اپنے شاگردوں کے دلوں میں اُتار دے طالب علم کا فرض تھا کہ وہ اس علم کو اپنی ہستی کا ایک جزو بنا لے۔ اگر اُس نے آسانی سے اِس اثر کو قبول کر لیا تو اُسکی خوش نصیبی ہے۔ لیکن اگر اسمیں اسکی صلاحیت نہیں تو یہ کام جبراً ہوتا تھا۔

یہاں پر یاد رہنا چاہیئے کہ تعلیم کے صحیح مفہوم میں تربیت بھی شامل ہے تعلیم کی اصلی غرض یہی ہے کہ طالب علم میں فطرت نے جو ملکات ودیعت کئے ہیں اُن کو باحسن وجوہ تربیت دیکر اُبھارا اور بروئے کار لایا جائے۔ قدیم طریقۂ تعلیم میں ایسی سختیاں جائز سمجھی جاتی تھیں جنھیں آجکل کوئی شخص گوارا نہ کرے گا۔

Quick.

میٹورن کارڈیر[۱] نے ۱۵۰۱ء میں پیرس میں لکھا تھا کہ روزانہ کی زدوکوب نیک دل بچوں کو تعلیم سے اتنا متنفر بنا دیتی ہے کہ وہ اسکول کی تعلیم سے اس طرح ڈرتے ہیں جیسے کوئی پاگل کتے یا کالے سانپ سے ڈرے۔ نکلس اڈال[۲] سولھویں صدی کے شروع میں ایٹن اسکول کا ہیڈ ماسٹر تھا، اپنے زمانے کا بہترین معلم سمجھا جاتا تھا۔ مگر وہ مارنے پیٹنے میں بھی سب سے زیادہ مشاق تھا۔ ایک شریف خاندان کا لڑکا سر طامس مور کے زمانہ کے متعلق لکھتا ہے کہ کوئی دن ایسا نہ جاتا تھا کہ اُس پر ایک یا دو بید نہ پڑتے ہوں۔ جس سے اُسکا سر دو تین جگہ ضرور پھٹ جاتا تھا۔ آج کل کے زمانہ میں اس قسم کے معلم کو بہت جلد عدالتی چارہ جوئی کا مستحق سمجھا جائے گا۔ تاہم آج بھی بہت سے ایسے پڑھانے والے ہیں جنکی سختیاں اُن قدیم معلموں سے شاید برائے نام ہی کم ہوں۔

میں نے اکثر اسکولوں میں دیکھا ہے کہ معصوم بچوں پر بھی بید کی کارفرمائی جائز رکھی جاتی ہے۔ مجھے ایک واقعہ یاد ہے کہ ایک معلم نے اپنے درجہ کے پچیس لڑکوں میں سے تئیس کو درجہ کے باہر نکال کر بید کی سزا دی۔ قصور صرف یہ تھا کہ اُن میں سے ہر ایک نے اُس روز کی املا میں پانچ، یا پانچ سے زیادہ غلطیاں کی تھیں۔ لیکن ان باتوں کے باوجود تعلیم نے انگلستان وغیرہ میں بہت اُمید افزا اور نمایاں ترقی کی ہے۔

سر رابرٹ بلیر[۳] نے انگلستان کے محکمہ تعلیم کی اعلیٰ افسری سے الگ ہوتے وقت کہا تھا کہ اب لڑکوں کے دلوں میں تعلیم کی طرف سے نفرت کے بجائے اُسکی محبت پیدا ہو رہی ہے۔ گو یہ بات انگلستان کے متعلق کہی گئی تھی۔ لیکن میرے نزدیک اسکا اطلاق دنیا کے تمام ملکوں پر ہو سکتا ہے۔

اسی موقعہ پر اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ہم قدیم معلمین کے قایم کئے ہوئے اصول پر عمل پیرا ہیں۔ کومینس[۴] ایک جگہ لکھتا ہے:-

"اگر پڑھانے والے نرم مزاج اور محبت کرنے والے ہوں اور اپنے شاگردوں کو اپنی سختی سے دور بھگانے کی کوشش نہ کریں تو آسانی سے اُن کے دلوں پر قبضہ کیا جا سکتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ لڑکے گھروں پر رہنے کے بجائے، اسکول جانا زیادہ پسند کریں گے۔"

اچھے اصول کو بھی کبھی کبھی برُے معنی پہنائے جا سکتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ بعض لوگ قدیم طریقۂ تعلیم کو اس لئے پسند کرتے ہیں کہ اُسمیں طلبا کو مصائبِ زمانہ برداشت کرنیکی صلاحیت تھی۔ اور موجودہ طریقِ تعلیم طالب علم کی زندگی کو بے حد آرام طلب اور آسانی پسند بنا دیتا ہے جس کی وجہ سے ہمارے نوجوان آئندہ زندگی میں تلخیٔ روزگار کو آسانی سے

۱۔ Maturin Cordier.　۲۔ Nicholas Uddal.

۳۔ Sir Robert Blair.　۴۔ Comenius.

گوارا نہیں کر سکتے۔

اسمیں شک نہیں کہ بہت سے معلمین اس خیال کے حامی ہیں، لیکن پرانے زمانے کے معلم اسباق کی کوشش کرتے تھے کہ طلباء اپنی دقتوں کو خود اپنی کوشش سے حل کریں۔ اس لئے وہ انھیں جفاکش اور قاعدوں کا پابند دیکھنا چاہتے تھے۔ موجودہ دور کے پڑھانے والے اسباق پر توجہ نہیں دیتے کہ حکومت کے نظام کی طرح مدرسوں میں بھی کچھ نہ کچھ سختی ضروری ہو۔ اسلئے کہ آزادی کی تمیز بھی اصول کی پابندی کے بغیر ہو نہیں سکتی۔

دوسرے موجودہ زمانہ کے معلم زیادہ کام کرنے، زیادہ بولنے اور اپنے طلباء سے یہ کہنے کے عادی ہیں کہ وہ ہر چیز خود بخود معلوم کریں۔ ایسے معلم یا تو تعلیم کے صحیح اصول سے ناواقف ہیں، یا انھیں جانتے ہوئے بھی اُن پر عمل کرنا نہیں چاہتے۔ موجودہ تعلیم اس بات پر حد سے زیادہ زور دیتی ہو کہ بچوں میں جدت اور ذمہ داری کے جذبات پیدا کئے جائیں۔ معلم کا کام ہو کہ وہ اسباق کا لحاظ رکھے کہ لڑکوں میں وہ تمام قوتیں ترقی کریں جو انھیں فطرت کی طرف سے ملی ہیں۔

اگر مجھ سے اس فرض کو صرف ایک فقرہ میں ادا کرنیکی فرمایش کیجائے تو میں بے حد دشواری کیساتھ صرف یہ کہونگا کہ جس حقیقت کی پاسبانی کے لئے ہم میدانِ عمل میں آئے ہیں وہ اپنی ذات کی ترقی ہے۔ مگر یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ اور نہ یہ کسی نئی حقیقت کا انکشاف ہو۔ افلاطون بھی اسباق کی تعلیم دیتا تھا کہ "تعلیم کا بلند ترین مقصد یہی ہو کہ ہم خدا سے اتنے مماثل ہوجائیں جتنا کہ انسانی طاقت کے اختیار میں ہو"۔ رسکن نے ایک جگہ کہا ہو کہ "یہ ہماری عقل کا فتور ہو کہ ہم سائنس اور تعلیم کو یکساں جانتے ہیں تعلیم کے یہ معنی نہیں کہ ہم کسی شخص کو ایسی چیز بتا دیں جو اُسے معلوم نہیں۔ بلکہ اس کا صحیح مقصد یہ ہو کہ ہم انسان کو ایسا بنا دیں جیسا وہ نہیں تھا"

ہم جانتے ہیں کہ یہ کوئی نئی چیز نہیں۔ ہم اس سے بالکل بے بہرہ نہیں تھے۔ لیکن ہمارا ایمان ہو کہ اب اس مقصد کی تکمیل ہورہی ہے۔ اسکی تکمیل ہمارے علمی اداروں کو مکمل بنا دیگی۔ اور اس کے بعد ہمارے نظام معاشرت میں ایک پسندیدہ انقلاب ہوجائے گا۔

اس موقع پر دو ضروری باتیں اور بھی قابلِ ذکر ہیں۔ اوّل یہ کہ ناقابل معلم ہمیشہ اپنی آزادی کے سلب ہونے کا شاکی رہتا ہو۔ اور جو معلم حقیقی معنوں میں قابل ہو وہ اپنے کام کی مصروفیت کو اتنا اہم جانتا ہو کہ اُسے اسکا موقع ہی نہیں ملتا کہ وہ لوگوں کے آگے اپنی قید کا دُکھڑا روئے یا لوگوں سے یہ کہتا پھرے کہ اگر میں پابند نہ رکھا جاتا تو اس سے بہتر کام کر سکتا۔ دوسرے وہ ہیڈ ماسٹر جو آزادی کے گیت گاتے اور تلخ کامی کیساتھ اپنی محکوم زندگی پر لعنت ملامت کرتے ہیں میرے نزدیک آزادی کے صحیح مفہوم سے نابلد ہیں۔ اسی لئے اپنے اداروں میں ایک نئی قسم کی آزادی پر عمل کرنا چاہتے ہیں جس کا اثر اُن کے ماتحتوں اور طلباء پر پڑتا ہو۔ میرا خیال ہے کہ اگر آزادی ایک شخص کے لئے اچھی ہے تو دوسرے کیلئے بھی پسندیدہ ہو۔ بغیر اس کے دُنیا کا کوئی کام ممکن نہیں۔ اسلئے یہ ضروری ہو کہ آزادی

کی جو حدیں ہیڈ ماسٹر اپنے لئے جائز سمجھیں وہی اپنے ماتحتوں اور لڑکوں کے لئے بھی روا رکھیں۔

اسکول کے معمولی انتظاموں سے قطع نظر کرکے عملی تفصیل میں یکسانیت کوئی پسندیدہ چیز نہیں۔ خواہ وہ آسانی سے حاصل ہوسکے۔ لیکن عملی آزادی کا لازمی جزو ذمہ داری بھی ہے۔

تعلیم میں اُس نئی آزادی کے فوائد پر جس قدر ممکن ہو زور دینا چاہیئے۔ اس ملک کی تعلیمی زندگی میں ابتدا ہی سے (ان پابندیوں سے قطع نظر کرکے جو امتحان اور اُس کے لوازمات نے ضروری بنا رکھی ہیں) معلمین کو مکمل آزادی حاصل ہے کہ وہ اپنے مقصد کے حصول کی زیادہ سے زیادہ کوشش کریں مگر اس مقصد کا صرف یہ کام ہے کہ وہ طالب علموں کو علمی خزانوں سے مالا مال کردیں۔ بلکہ مقصد یہ ہے کہ انکی روحانی ترقی کی ذمہ داری کیجائے۔ اور انہیں ایسا بنا دیا جائے کہ وہ شغل و بیکاری دونوں حالتوں میں یکساں طور پر ستھری، مسرت افزا، اور بلند پایہ زندگی بسر کرسکیں۔

کیا یہ ممکن ہے کہ ہم ایسے فقروں کے معنی اور مفہوم کو صحیح طور پر سمجھ سکیں جیسے کہ "اپنی ذات کی ترقی" یا "اپنی شخصیت کا نمو" یہ بھی غور طلب امر ہے کہ ہم تعلیم کے ذریعہ کس قسم کا شخصی نمونہ پیش کرنا چاہیئے ہیں؟ ہماری زندگی دو حصّوں میں تقسیم کیجا سکتی ہے پہلا حصہ علم یا خیال کا ہے جس میں حسیاتِ جمالی اور تخیلاتِ روحانی شامل ہیں۔ دوسرے کا تعلق عمل یا قوت ارادی[3] سے ہے۔ علم کا تعلق دماغ کے ان دونوں حصّوں سے ہے۔ ان دونوں کو ہم دو اور حصّوں میں تقسیم کرسکتے ہیں علم کا تعلق حُسن اور صداقت سے ہے۔ اور قوّت ارادی کا تعلق اقتصادی اور اخلاقی اعمال سے۔ انسانی دماغ کے ان ہی چار اجزا سے معلم کا خاص تعلق ہے۔ حُسن، صداقت، مفاد، اور نیکی۔ پروفیسر وھائٹ ہیڈ[2] نے ایک دوسرے طریقہ سے اسی خیال کی ترجمانی کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ "حیاتِ انسانی چار بڑے اجزا سے متعلق ہے۔ فن۔ سائینس۔ عمل۔ اور مذہب۔"

ان چار میں سے پہلے کو حُسن سے لگاؤ ہے، جیسا کہ گروس[1] نے کہا ہے "فن ہماری تخیلی زندگی کی جڑ ہے۔ اُس کا پھول نہیں" حُسن کی محبت ہماری زندگی کے رشتہ کے ساتھ منسلک ہے۔ اور اس کا اظہار کئی طریقہ پر ہوتا ہے۔ اس کی روحانی غذا کبھی حسین جسم، کبھی متنوع رنگ، اور کبھی دلکش آواز سے حاصل ہوتی ہے۔ حُسن کا بیجا استعمال بھی ہوسکتا ہے۔ اسکی مدد سے ہم غیر ضروری اور تعیش افزا سامانوں کو بھی فراہم کرلیتے ہیں۔ لیکن یہ اس کے مقصد کی تکمیل نہیں ہے۔

تخئیل کی دنیا میں سائینس دوسری ہمدم ہے۔ دماغ جسطرح حُسن پر شیدا ہوتا ہے، اُسی طرح علم کا بھی بھوکا ہے۔ اپنے گرد و پیش کا علم، اپنی ذات کا علم، اور اُس دُنیا کا علم جس کا وہ ایک جزو ہے۔ ہم ان سب چیزوں کی حقیقت جاننا چاہیئے ہیں جو ہمیں گھیرے ہوئے ہیں۔ اُن کی داستان، اُن کے افسانے، اور اُن لوگوں کی دلچسپ سرگذشت جو ہم سے پہلے اس دُنیا میں آئے۔

قوّتِ ارادی، کی دُنیا میں محدود ہو کر انسان اپنی اقتصادی دلچسپیوں کا مرکز تلاش کیا کرتا ہے۔ حیات میں

---

[1] Groce. [2] Whitehead [3] Will.

آزادی حاصل کرنے کیلئے ہم میں روزی کمانے کی صلاحیت ہونا ضروری ہے۔ ہمیں دنیا میں کوئی رتبہ حاصل کرنا چاہیئے۔ اور یہی جذبہ اس کائنات پر حکومت کرنے والے چار جذبات میں سے تیسرا ہے۔

چوتھا ہم نوا، اس اقتصادی زندگی کے حدود سے بلند رہنا چاہتا ہے۔ انسان محسوس کرتا ہے کہ وہ صرف ایک واحد انسان ہی نہیں ہے اس لئے اُس کے مشاغل صرف اُسکی ذات تک محدود نہ رہنا چاہیئے۔ درحقیقت وہ ایک بہت بڑی جماعت کا فرد ہے جس کی بھلائی اور بُرائی کا تعلق براہ راست اُسکی ذات سے ہے۔ وہ جہاں اقتصادیات سے تعلق رکھتا ہے وہیں اخلاق سے بھی۔ اسکی دلچسپیاں مادی اور روحانی دونوں ہیں وہ اپنے آپ سے صرف یہی سوال نہیں کرتا کہ "مجھے اپنی روزی کمانے کے لئے کیا کرنا چاہیئے؟ بلکہ یہ بھی کہ مجھے کیا کرنا چاہیئے؟" وہ تنہا اپنی ہی خدمت نہیں کرنا چاہتا بلکہ اپنے سے زیادہ اپنے ہمسایہ اور اُس سے بھی بڑھکر اپنے ملک کی اور اپنے ملک سے بھی زیادہ عالم انسانوں کی، اور ان سب سے زائد خدا کی خدمت و طاعت کا متمنی ہے۔

جذباتِ بیتاب

(از حضرت بیتاب بریلوی)

میں صدائے سازِ شکستہ ہوں میں فغانِ بلبلِ زار ہوں　جو پڑا رہے پسِ کارواں میں وہ ایک مشتِ غبار ہوں

میں غبارِ خاطرِ دہر ہوں میں چمن میں صورتِ خار ہوں　نہ خزاں کے جور سے آشنا نہ رہینِ لطفِ بہار ہوں

میں نمودِ برق و شرار ہوں میں شکستِ رنگِ بہار ہوں　نہ تو مجھکو داغِ کفن لگا نہ میں زیر بارِ مزار ہوں

میرا حال غم سے تباہ ہے شب و روز نالہ و آہ ہے　جسے سانس لینا گناہ ہے وہ شکارِ لیل و نہار ہوں

یہ ہے نازِ حسن کی منصفی یا نیازِ عشق کی دلگی　وہ جو میرے دل کا قرار ہے میں اسی کے دل کا غبار ہوں

میں قتیلِ غمزۂ ناز ہوں میں حریفِ عشوہ طراز ہوں　جو چمن کہ نذرِ خزاں ہوا میں اسی کی فصلِ بہار ہوں

نہ پسندِ خاطرِ گلستاں نہ مدارِ زینتِ آشیاں　جسے خود نمو نے مٹا دیا وہ اسیرِ دامِ بہار ہوں

جو بدل گئی وہ نسیم ہوں جو نکل گئی وہ شمیم ہوں　جو دیارِ عشق میں لٹ گیا اسی دل کا صبر و قرار ہوں

یونہی بیخودی میں کہا تھا کچھ وہ ہیں سربپا تو گیا کہا؟

نہ کہوں تو انکا گلہ سنوں جو کہوں تو قابلِ دار ہوں

پپیہا اور بیوہ

از مسٹر جگدیش سہائے سکسینہ بی۔اے۔ایل۔ایل بی

تیرگی ارض و سما پر چھائی ہے ۔۔۔ آہ میں ہوں اور شبِ تنہائی ہے
ساری دنیا محوِ خوابِ ناز ہے ۔۔۔ مضطرب لیکن دلِ سودائی ہے
میرے سر پر ظلمتِ شامِ الم ۔۔۔ اک بلائے ناگہانی لائی ہے
شب کی خاموشی میں کیوں کرتا ہے شور ۔۔۔ اے پپیہے تو بھی کیا سودائی ہے
ہے کمالِ عاشقی ضبطِ فغاں ۔۔۔ آہ و زاری باعثِ رسوائی ہے
نالہ و فریاد سے زیرِ فلک ۔۔۔ کب کسی کی آرزو بر آئی ہے
تو بھی ظالم کہہ رہا ہے "پی کہاں" ۔۔۔ آگ تو نے اور بھی بھڑکائی ہے

یہ صدا پھر دل کو تڑپانے لگی
یادِ یارِ مہرباں آنے لگی

جس کی الفت پر بھروسا تھا مجھے ۔۔۔ چل بسا وہ چھوڑ کر تنہا مجھے
خالقِ کون و مکاں نے دہر میں ۔۔۔ بہرِ رنج و غم کیا پیدا مجھے
میری قسمت سے نہیں تاریک تر ۔۔۔ کیا ڈرائے گی شبِ یلدا مجھے
کشتۂ نیرنگیٔ ایام ہوا ۔۔۔ پیار کرے اے غمِ دنیا مجھے
تو بھی ہوتا ہے شریکِ رنج و غم ۔۔۔ اے پپیہے دیکھ کر تنہا مجھے
گرچہ تو میری طرح مہجور ہے ۔۔۔ تیری ہمدردی سے ہے شکوا مجھے
تو نے اے مرہم نہ زخمِ جگر ۔۔۔ شعلۂ آواز سے پھونکا مجھے

شکوہ سنجِ پرسشِ غمخوار ہوں
اپنے ہمدردوں سے میں بیزار ہوں

دستگیرِ بیکساں کوئی نہ ہو ۔۔۔ آہ مجھ پر مہرباں کوئی نہ ہو
صدمۂ جانکاہ میں غم کے سوا ۔۔۔ چارہ سازِ خستگاں کوئی نہ ہو

قلبِ سوزاں کے علاوہ دہر میں دل جلوں کا رازداں کوئی نہ ہو
گوشۂ تنہائی میں جز خامشی آہ میرا ہمزباں کوئی نہ ہو
ساتھ میرے کلبۂ تاریک میں اب نوا سنجِ فغاں کوئی نہ ہو
اے خدائے دو جہاں میرے سوا "پی" کے غم میں نوحہ خواں کوئی نہ ہو

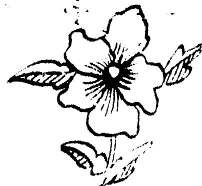
جوشِشِ الفت کا تقاضا ہے یہی
ایک بیوہ کی تمنا ہے یہی

اضطرابِ صابر

(مسٹر اے۔ بی۔ خلیس صابر بی۔ اے اکبرآبادی)

انھیں پیمانوں میں ہے عشرتِ میخانہ برسوں سے مری نظروں کی سرخی ہے ترا افسانہ برسوں سے
محبت ہے حریف جلوۂ جانانہ برسوں سے چلا آتا ہے بے تکمیل اک افسانہ برسوں سے
بہت دن عاشقی میں خاک اڑائی تیرے کوچے کی اب اپنی خاک اڑاتا ہے دلِ دیوانہ برسوں سے
کھلانا ہے کوئی گل یا ابھی ہیں گردشیں باقی طوافِ شمع کیوں خاکستر پروانہ برسوں سے
مری دیوانگی کی عاقبت اندیشیاں توبہ! اب اپنے مدعا سے بھی ہوں میں بیگانہ برسوں سے
دلِ پُر آرزو کی تشنہ کامی کیا قیامت ہے خدا جانے ہے کس گردشِ ہیئت پیمانہ برسوں سے
ملائے جا رہا ہے وہم سے ادراک کی سرحد ہمارا نام لے کر دلِ دیوانہ برسوں سے
یہ معراجِ جنوں ہے یا حدِ احساسِ خودداری پڑا ہے اپنے سجدے میں ترا دیوانہ برسوں سے

انھیں یہ بھی نہیں معلوم صابر نام ہے کس کا
لبِ دنیا پہ گو صابر کا ہے افسانہ برسوں سے



تان سین

از مسٹر جگیشور ناتھ بیتاب بریلوی بی۔اے۔ایل ایل بی

تقریباً تین سو پینسٹھ برس پہلے کی بات ہے۔ جب ریاست گوالیار کے بیہٹ نامی گاؤں میں کانیہ کبج برہمن مکرند پانڈے کے یہاں تر لوچن پانڈے عرف تان سین کی ولادت ہوئی۔ گوالیار کے دریا دل مہاراجہ رام نرنجن جی نے انھیں تر لوچن پانڈے کو تان سین کے لقب سے سرفراز کیا اور تب سے دنیا انھیں اسی نام سے پکارتی چلی آتی ہے۔ بہت کم لوگ ایسے ہونگے جنھیں انکا اصلی نام معلوم ہو اور جو انکی زندگی کے حالات سے کم و بیش واقف ہوں۔

تان سین فی الواقع اسم بامسمی تھے۔ بچپن ہی سے انکا گلا نہایت سُریلا تھا۔ ان کی آواز میں سوز تھا، درد تھا، مٹھاس بھی، جادو تھا۔ غرض فیاض ازل نے بڑی فراخدلی سے وہ تمام خوبیاں، وہ سارے جوہر انکی ذات میں ودیعت کر دئے تھے جو ایک راگی کو کامیاب بنانے کے لئے ضروری ہیں۔ بہت تھوڑی عمر سے تان سین دیوی کے بھگت ہو گئے تھے۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ابھی تنھے تر لوچن کے مندر جانے کا وقت بھی نہ ہوا تھا کہ بڑے زور سے بارش ہونے لگی۔ چاروں طرف سے بادلوں کا ہجوم سمٹ سمٹ کر اُمنڈ آیا اور چشم زدن میں گھٹا ٹوپ تاریکی مسلط ہو گئی۔ پوجا کا وقت آگیا۔ دیر بھی ہو گئی۔ پجاری اپنے معبود کی بارگاہ میں سرِ نیاز خم کرنے کے لئے سیماب وار تڑپنے لگا۔ وہ اُٹھا اور دو چار قدم اِدھر اُدھر ٹہل کر پھر اپنی جگہ پر جا بیٹھا۔ اس نے دعائیں کیں۔ اپنے معصوم ہاتھ آسمان کی طرف بلند کئے۔ کنول کے پھولوں سے زیادہ خوبصورت آنکھوں میں آنسو بھر کر منتیں مانگیں لیکن بھگت کی گریہ زاری پر بادلوں کو مطلق ترس نہ آیا وہ برابر اسیطرح آنسو بہاتے رہے۔ اور پانی ایک لمحہ کے لئے بھی نہ تھما! اس کی تمام کوششیں رائگاں ہوئیں۔

مایوسی — حوصلہ شکن مایوسی بھی کبھی کبھی ٹوٹی ہوئی اُمیدوں کی دستگیر بن جاتی ہے۔ آخر مجبور جہالِ عاشق سے رہا نہ گیا۔ اور وہ فراق و انتظار کی تاب نہ لا کر دیوانہ وار گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ اس کے دل سے لگی تھی۔ اس کا عشق صادق تھا پھر اسے موسلا دھار بارش کا کیا ڈر؟ یہ دل کی آگ تھی جسے پانی کا سیلاب بھی بجھا نہ سکتا تھا بہت رات گئے تر لوچن دیوی کے مندر میں داخل ہوا۔ اس کے کپڑے پانی میں تر تھے اسکی آنکھیں عرقِ انفعال میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ اور اس کا سر دیوی کے مرمریں قدموں میں لوٹ رہا تھا۔

وہ روتا رہا — گھنٹوں روتا رہا۔ یہانتک کہ پتھر کا دل بھی پسیج اٹھا۔ یکایک پتھر کے مجسمہ میں جان سی پڑ گئی اور ایک لطیف سی جنبش کے ساتھ دیوی نے رونما ہو کر بھولے پجاری کے سر پر مسکراہٹ کا نور برسانا شروع کر دیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے سارا مندر جگمگا اٹھا۔ تان سین کی آنکھیں کھل گئیں اور اُس نے دیوی کو بکمال لطف و کرم خود سے ہمکلام ہوتے دیکھا۔ وہ سراپا شوق بناگوش دل سے سنتا رہا۔ ارشاد ہوا: "تمہاری ریاضت مقبول ہوئی۔ جاؤ برندابن باسی ہریداس سوامی سے کسب فن کرو میاں غوث محمد گوالیاری سے بھی مل کر دیکھو۔ جاؤ ہم نے تمہیں امر کیا — سنگیت ودیا (موسیقی) میں کوئی تمہارا ثانی نہ ہوگا۔ یہی ہمارا بردان ہے۔

تان سین نے سر تسلیم خم کیا اور ہاتھ جوڑ کر رخصت ہوئے۔ اس کے بعد انکی باقاعدہ تعلیم شروع ہوئی اور برسوں ریاض ہوتا رہا۔ گوالیار کے مہاراجہ مان سنگھ تومر نے اپنی ریاست میں موسیقی کا ایک اسکول قائم کیا تھا۔ تان سین کی ابتدائی مشق یہیں سے شروع ہوئی تھی اس کے بعد انھوں نے ہریداس سوامی اور میاں غوث محمد گوالیاری سے سبق لینا شروع کیا۔ تان سین کے علاوہ ہریداس سوامی کے اور بھی بہت سے شاگرد تھے جنھیں سے حسب ذیل سات نے اچھی شہرت حاصل کر کے اُستاد کا نام روشن کیا ہے۔ (۱) بیجو باورا (۲) رامداس (۳) سوم (सोम) (۴) سوکا سین (सोकासेन) (۵) گوپال (۶) مدن اور (۷) دواکر

اولاً تان سین شیر خاں کے لڑکے دولت خاں کے یہاں رہے۔ اس کے بعد وہاں سے ریوان نریش مہاراج رام سنگھ کے پاس چلے آئے۔ وہاں سے اکبر کے طلب کرنے پر دہلی گئے۔ آخری ایام میں گوالیار میں گوشہ نشین رہے۔ اور یہیں وفات پائی۔ موت کے وقت اُن کی عمر کا اُنسٹھواں سال تھا۔ انکی پیدائش ۱۵۳۰ء کی مانی جاتی ہے۔ اس طرح سے سنہ وفات ۱۵۸۹ء قرار پاتا ہے۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ تان سین مسلمان تھے یا انھوں نے بعد میں اسلام قبول کر لیا تھا۔ لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔ اس غلط فہمی کی صریح وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ اکبر تان سین کو اعزازاً میاں یا مرزا کہہ کر مخاطب کرتا تھا۔ لیکن بات یہ تھی کہ تان سین اپنے فن میں یکتائے روزگار تھے۔ ان کے کمال سے تو انحراف کرنے کی کوئی صورت نہ تھی۔

تاریخ بتا رہی ہے کہ تان سین دہلی آکر بھی ہمیشہ یاد وطن میں مغموم رہا کرتے تھے اکبر کی بڑی سے بڑی عنایات اور بیشمار داد و دہش اُن کے دل کو رام نہ کر سکیں۔ پھر وہ کونسی وجہ تھی جس نے تان سین کو تبدیل مذہب پر مجبور کیا؟ معترضین نہ تو اس سوال کا کوئی معقول جواب دیتے ہیں اور نہ ہی یہ بتانے کی زحمت گوارا کرتے ہیں کہ اگر تان سین پیدائش ہی سے مسلمان تھا تو اس کا اصلی نام، اس کا حسب و نسب اور اس کا مزار کیا اور کہاں ہے؟ ظاہر ہے کہ جب تک ان تمام باتوں کا کوئی مستند جواب نہ ہو تب تک اس دعوی بے دلیل کو ہرگز قبول نہیں کیا جا سکتا۔

تان سین کے ہمعصروں میں بڑے بڑے نامی لوگ شامل تھے۔ خود ان کے ہم سبق اور گرو بھائی بھی اعلیٰ پایہ کے راگی تھے۔ لیکن ان کے سامنے کسی کا چراغ نہ جلتا تھا۔ ہر یداس کے شاگردوں میں تان سین کے بعد بیجو باورا کا نمبر تھا۔ دونوں ایک ہی ڈالی کے پھول تھے۔ لیکن ان کی رنگ و بو میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ جہاں بیجو اور دیگر اساتذۂ فن تقلید و تکسیب کے قائل تھے۔ وہاں تان سین میں ایجاد واختراع کا مادّہ بھی تھا۔ اس اُپج کی بدولت وہ اپنے حریفوں سے ہمیشہ بازی لے جایا کرتے تھے۔ ان کا غیر معمولی کمالِ فن دیکھ کر ان کے حریفوں نے بھی اُن کے سامنے زانو ٹیک دیئے تھے۔ اور وہ رشک وحسد کی بجائے خلوصِ دل سے ان کی قدر و منزلت کرنے لگے تھے۔

جس دن ہندوستان کے بادشاہ اکبر اور موسیقی کے بادشاہ تان سین کی پہلی ملاقات ہوئی تھی اُسی دن اکبر نے دو لاکھ روپیہ تان سین کی نذر کئے تھے۔ اور انھیں اپنا اُستاد بنالیا تھا۔ تان سین ۱۵۶۲ء میں اکبر کے دربار میں داخل ہوئے تھے۔ مغل دربار کے ۹ نورتنوں میں انکا بھی شمار ہوتا تھا۔

اکبر کے دربار میں کل ۳۶ گوّیے ملازم تھے جنمیں تان سین کے علاوہ باز بہادر بھی بہت مشہور ہوا ہے۔ اکبر کو گانے بجانے کا بہت شوق تھا۔ انھیں اس فن کی گہری معلومات تھی۔ چنانچہ اُمّی ہونے کے باوجود اسی واقفیت کی طفیل میں وہ شعر بھی کہنے لگے تھے۔ وہ گانا بھی جانتے تھے اور نقارہ (نکاڑا) بجانے میں تو اپنا ثانی نہ رکھتے تھے۔

بدقسمتی سے دنیا تان سین کو صرف موسیقی کے بے عدیل استاد ہی کی حیثیت سے جانتی ہے۔ ان کے دوسرے کمالات سے وہ ہنوز واقف نہیں ہے۔ ان کی زندگی کے بہت سے روشن پہلوؤں پر بے توجہی کا پردہ پڑا ہوا ہے۔ دراصل گانے بجانے کے علاوہ ان میں اور بھی بہت سی خوبیاں تھیں۔ وہ ہندی زبان کے زبردست شاعر بھی تھے۔ اور ہندی علم العروض پر کامل عبور رکھتے تھے۔ سنسکرت کے بڑے بڑے عالموں میں انکا شمار ہوتا تھا۔ اُنھوں نے ہندی نظم میں کالیداس کے "میگھ دوت کا جواب" "بارہ ماسہ" کے عنوان سے تصنیف کیا تھا۔ ہندی ادب میں یہ ایک اعلیٰ پایہ کی چیز سمجھی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی کتنی ہی بیش قیمت تصانیف ان کے نام سے منسوب تھیں لیکن افسوس کہ زمانہ کے ہاتھوں یہ گرانقدر ذخیرۂ شعر و ادب تلف ہوکر نابود ہوچکا ہے۔

تان سین نے اپنی غیر معمولی ذکاوت اور خداداد قابلیت سے بہت سے راگوں کی شیلی (طرز) میں قابلِ قدر ترمیمات کی ہیں۔ جو ان کے عہد ہی میں مقبول ہوکر رائج ہوچکی ہیں اور آج بھی انکا سکہ چل رہا ہے۔ جس وقت ترمیم و تنسیخ کے دشوار گذار مراحل طے کر رہے تھے۔ اس وقت بعض پُرانی لکیر کے فقیروں نے ان کی مخالفت میں ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا تھا۔ لیکن اُنھوں نے ان کی بے سُری الاپ کی مطلق پرواہ

نہ کرکے اپنا کام برابر جاری رکھا۔ اور پسندِ عام کا خلعت حاصل کیا۔ ان کے مخالفین ایڑی چوٹی کا زور لگاتے رہے لیکن ان کی صدائے احتجاج نقار خانے میں طوطی کی آواز بازگشت کی طرح صدا بصحرا سے زیادہ وقیع ثابت نہ ہوئی۔ تان سین معترضین کو قدیم شاستروں کا حوالہ دیکر لاجواب کردیا کرتے تھے۔ یہ ان کے تبحر علمی کی ایک ادنیٰ مثال ہے۔ سارنگدیو نے اپنی مشہور کتاب سنگیت رتناکر میں ایک سنسکرت اشلوک نقل کیا ہو جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر شاستروں کے بتائے ہوئے اُصولوں پر عمل پیرا ہوکر کسی راگ کی تشکیل کرنا مشکل معلوم ہو تو اس میں مناسب تبدیلیاں کرلینے کا حق اساتذہ کو حاصل ہے وہ اشلوک یہ ہے ؎

यस्माल्लक्ष्य प्रधानानि शास्त्रण्येतानि मन्यते
یسماتکشیہ پردھانانی شاستریہ تانی منیتے

तस्माल्लक्ष्य बिरुद्धं यत्तच्छास्त्रं नायमन्यथा
تسماتکشیہ وِرُدھم یتچّھاستر نائیہ منیتھا

تان سین کی تصانیف میں شری گنیش استوتر (श्रीगणेशस्तोत्र) ایک مشہور کتاب ہے۔ سورداس جی بڑے مشہور بھگت اور ہندی کے شاعر ہوئے ہیں۔ تان سین سے ان کے تعلقات بڑے گہرے اور وسیع تھے۔ اُنھوں نے اپنی اس کتاب میں ان کو مخاطب کرتے ہوئے یہ دوہا لکھا تھا ؎

किधौं सूर को सर लग्यो किधौं सूर की पीर
کندھوں سور کو سر لگیو کندھوں سور کی پیر

किधौं सूर को पद लग्यो तन मन धुनत सरीर
کندھون سور کو پد لگیو تن من دُھنت سریر

سورداس جی نے اس کے جواب میں کہا ہے ؎

विधना यह जिय जानि के सेसहिं दिये न कान
ودھنا یہ جیئے جانی کے سیسہی دیئے نہ کان

धरा मेरु सब डोलते तानसेन की तान
دھرا میرو سب ڈولتے تان سین کی تان

سورداس جی جیسے تارک الدنیا اور خدا رسیدہ بزرگ نے جس کی تعریف کی بادشاہ اکبر جیسے تاجدار نے جس کو اپنا استاد بنایا۔ ابو الفضل جیسے مؤرخ نے جس کے لئے لکھا کہ گذشتہ ہزار ہا سال سے تان سین جیسا ماہر موسیقی ہندوستان میں پیدا نہیں ہوا۔ اسمتھ جیسے انگریز سیاح نے جس کے حضور میں

خراجِ عقیدت پیش کیا اس کے کمال کا بیان کرنا تو کیا اندازہ لگانا بھی مشکل ہے۔

تان سین اکبر کے نوکر تھے۔ لیکن ان کا دل کسی کا غلام نہیں تھا۔ ان کا جسم مایا کے سنہرے جال میں مقید تھا لیکن اُن کی رُوح آزاد تھی۔ طبیعت میں ایک فطری شاعر کی طرح جولانی تھی، استغنا و بے نیازی تھی، خودداری تھی اور پندار کا کبھی نہ اترنے والا نشہ تھا۔ وہ بولتے تو ان کے منہ سے پھول جھڑتے، وہ گاتے تو ان کے گلے سے اَمرت برستا۔ وہ اپنی سریلی تانوں سے جادو جگایا کرتے تھے۔ وہ خود اپنی لے (۴۶۸) میں ڈوب کر دنیا پر چھا جاتے اور کائنات کا ذرّہ ذرّہ مست ہو کر انکا ہم آہنگ ہو جاتا۔

ایک دن شام کے وقت وہ جمنا کے کنارے بیٹھے ہوئے راگ الاپ رہے تھے۔ فضا پر ایک جادوئی کیفیت طاری تھی۔ دنیا سرشار ہو کر جھوم رہی تھی۔ ان کے نغموں کی شراب سے مست ہو کر ہرن چرنا بھول گئے تھے۔ طائرانِ خوش الحان بیخود ہو کر خاک میں لوٹ رہے تھے۔ ہوا سے باتیں کرنے والی سیماب پیکر موجیں منجمد ہو کر رہ گئی تھیں۔ ایک عجیب سماں بندھ گیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کہیں پردۂ غیب میں گوپیوں کے پیارے کرشن کی بنسی بج رہی ہے اور اس کی رسیلی آواز جمنا کے کنارے گونج گونج کر روٹھی رادھا کو منا رہی ہے۔

دوسرے روز جب تان سین دربار میں حاضر ہوئے تو اکبر نے ان سے شکایت کی کہ آپ دربار میں کبھی اتنا اچھا نہیں گاتے جتنا کہ تنہائی میں گایا کرتے ہیں۔ تان سین نے مسکراتے ہوئے جواب دیا، "دربار میں آپ کا فرمان میرا گلا پکڑ لیتا ہے۔ درباریوں کی پسند میرے پر پرواز کتر دیتی ہے۔ سازندے اپنی خود نمائی کی مضراب سے میری رُوح کو زخمی کرتے رہتے ہیں۔ اور میں اپنی تنخواہ حلال کرتا رہتا ہوں۔ حقِ نمک ادا کرنے کے لئے گایا جا سکتا ہے مگر سماں نہیں باندھا جا سکتا۔ جمنا کے کنارے پر ایک دوسرا ہی عالم ہوتا ہے۔ وہاں میری روح کھلی ہوئی فضا میں پرواز کرتی ہے۔ وہاں حکم دینے والا کوئی نہیں ہوتا۔ دل میں ایک اُمنگ اُٹھتی ہے ـــ گلے سے آواز پیدا ہوتی ہے اور فطرت میری لے میں ڈوب جاتی۔ ہوا کے سرد سرد جھونکے لہروں کا ستار بجانے لگتے ہیں۔ چرند و پرند اپنی محبت کا نذرانہ پیش کرتے ہیں۔ وہاں کی ہر شے میری ہاں میں ہاں ملانے لگتی ہے۔ یہ بات آپ کے دربار میں میسر نہیں۔ تان سین کی اس خود سری پر اکبر کو غصہ نہیں آیا۔ بلکہ وہ اُلٹا بہت خوش ہوا۔

تان سین کی وفات کے بعد گوالیار میں ان کے پھولوں پر ایک ذیشان عمارت ان کی یادگار میں تعمیر کی گئی ہے۔ یہ عمارت شاہ محمد غوث کی چھتری کے پاس ہے۔ اس میں سولہ ستون ہیں۔ اس عمارت کے قریب ہی املی کا ایک درخت لگا ہوا ہے۔ کہتے ہیں اس درخت کو تان سین نے اپنے ہاتھ سے لگایا تھا۔ لیکن یہ صحیح نہیں ہے۔ تان سین کا لگایا ہوا درخت کسی مست ہاتھی نے اکھاڑ کر پھینک دیا تھا۔ ہاں موجودہ درخت اسی کے بیج کی پیداوار ہے۔ اب بھی بڑے بڑے گوّیے

اس درخت کی پتیاں چبا کر اپنا گلا صاف کرتے ہیں۔ طالب علم ان پتیوں کی برکت سے اپنا حافظہ تیز کرتے ہیں آج بھی بڑے بڑے نامی راگی تان سین کو فخر کے ساتھ اپنا استاد تسلیم کرتے ہیں۔ اور گوالیار کی طرف سر جھکا کر گانا شروع کرتے ہیں۔

تیس سال پہلے کا زمانہ

اردو اخبارات کی حالت

زمانہ بابت اکتوبر و نومبر ۱۹۰۶ء میں ایک نامور مدیر ملک نے زاویہ نشین کے نام سے اس وقت کے اردو اخبارات کی حالت پر ایک پُر مغز مضمون لکھا تھا جس کا آخری حصہ ذیل میں ہدیہ ناظرین ہے:۔

فی الحال اُردو اخباروں کی عام حالت بچوں کی سی ہے۔ جو ایک چمکتی ہوئی چیز کو دیکھ کر اسکی طرف لپکتے ہیں مگر وہ اس کی اندرونی حالت معلوم کرنیکی کوشش نہیں کرتے۔ اکثر اردو اخبارات دوسری زبان کے اخباروں یا خاص خاص لوگوں کو اپنا رہنما بنائے ہوئے ہیں اور آنکھ بند کر کے انکی رایوں پر چلتے ہیں اور اسکی وجہ سے کوئی عام رائے قائم نہیں ہونے پاتی۔ اس مضمون کی تحریر کا مقصد یہ نہیں کہ میں اُردو اخبارات کی قدر نہیں کرتا یا اس ترقی سے واقف نہیں ہوں جو چند سچے کام کرنیوالوں کی کوشش سے اسے حاصل ہوئی ہے بلکہ میں سمجھتا ہوں کہ گذشتہ چند سال میں اس نے جو ترقی کی ہے وہ آئندہ ترقی کی اُمید دلاتا ہے۔ میرے نزدیک اُردو زبان کے اخباروں کے لئے ہندوستان میں بہت بڑا میدان ہے لیکن اس مقصد کیلئے جہاں اس امر کی ضرورت ہے کہ پبلک سرپرستی کرے وہاں اسبات کی بھی حاجت ہے کہ اُردو اخبار نویسوں میں ایک ایسا گروہ پیدا ہو جائے جو محض جادوگر کی چھڑی کے اشارے نہ بولے بلکہ اپنی ضمیر سے مدد لے۔ جب تک آزاد اخبار نویس پیدا نہ ہوں گے اسوقت تک عام رائے میں پختگی نہ آئیگی اور جب تک عام رائے پختہ نہ ہوگی اس وقت کوئی مسئلہ خاطر خواہ طریقہ سے حل نہیں ہو سکتا ہے۔

ہمارے معاصرین اپنی اپنی جگہ پر غور فرمائیں کہ تیس سال کے عرصے میں اُردو اخبارات نے کیا ترقی کی اور "زاویہ نشین" کے خیالات سے اس وقت ہم کیا فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ ا۔ ز

چتوڑ

از عزیز احمد غلش بی۔اے

دل میں ہے "چتوڑ" کی مستی بھری بستی کی یاد
جیسے وقتِ مرگ اک جاتی ہوئی ہستی کی یاد

آہ اے چتوڑ تو قلبِ حزیں میں بس گیا
جس طرح مفلس کے گھر میں ٹمٹماتا ہے دیا

تیرے گلشن میں دلِ وحشی کا دامن پھنس گیا
بے بسی پر اس کی تیرا غنچہ غنچہ ہنس گیا

پدمنی نے جل کے تیرا نام روشن کر دیا
میرے حسنِ آرزو نے تجھکو دلہن کر دیا

تیرے گھر میں شانتی ہے تیرے بن میں شانتی
تیرے تن میں شانتی ہے تیرے من میں شانتی

ذرہ ذرہ میں، فضا میں، رنگ و بو میں شانتی
آرزو میں فکر و غم میں، جستجو میں شانتی

تیرا ذرہ ذرہ حسنِ آرزو کی جان ہے
تیرا گوشہ گوشہ ذوقِ جستجو کی جان ہے

چشمۂ شیریں، سہاناپن، ہری مخمل سی گھاس
جیسے بیٹھی ہو کسی جنگل میں اک دیوی اداس

وہ فرازِ کوہ وہ پھولوں بھری وادی تیری
دلفریبی، دلربائی، اور آبادی تیری

ہائے وہ محبوبیاں، معصومیاں، لیلائیاں
ہائے وہ ہر ہر قدم پر تیری الفت زائیاں

گو تیری عظمت تیری شانِ حکومت مٹ گئی
ناز تھا جس پر تجھے وہ جاہ و حشمت مٹ گئی

اک حسینِ زخم خوردہ کی طرح برباد ہے
ایک مہجورِ محبت کی طرح ناشاد ہے

تیرے نظارے میں لیکن سرخوشی آباد ہے
تیری بربادی میں جانِ دلکشی آباد ہے

چشمِ رنگیں رو رہے تو کچھ دلنشیں ہوتی ہے وہ
جسقدر مغموم ہو اتنی حسین ہوتی ہے وہ

کچھ نہیں ہے تجھ میں لیکن ہائے پھر اک بات ہے
جو میرے دل کے لئے سرمایۂ لذات ہے

قلب روتا ہے جب اس فقرہ کو دہراتا ہوں میں
"اجنبی آیا تھا میں اور اجنبی جاتا ہوں میں"

کاش پھر وہ حسن کی بہکی ہوئی باتیں ملیں
چاندنی کے روپ میں ڈوبی ہوئی راتیں ملیں

پھر ادائیں سادگی سے دیں نظر کو دعوتیں
پھر نگاہیں مسکرا کر مجھکو پردیسی کہیں

بادۂ شبانہ

طرزِ قدیم کی دو غزلیں

از حضرت فراق گورکھپوری ایم اے

سلسلہ اُس نگہِ مست سے بندھ کر چھوٹا — درد اٹھا، ہوش اڑے، ہاتھ سے ساغر چھوٹا

اب وہ شوریدہ سروں کی نہیں شوریدہ سری — آج اُن سے تری دیوار چھٹی، در چھوٹا

تو رگِ جاں سے بھی نزدیک ہے لیکن اکثر — سوچتا ہوں میں یہی مجھ سے تو کیوں کر چھوٹا

رند ہوں گے کہیں ساقی نہ یہ مستی نہ یہ بزم — تیرے رہتے ہوئے ہاتھوں سے جو ساغر چھوٹا

دل کے عقدے وہ کھلیں گے کہ بس اس عارض پر — کہیں بل کھا کے جو گیسوئے معنبر چھوٹا

بےخودی میں نگہِ ناز کی تھی چارہ گری — ہوش آنے کی تھی بس دیر کہ نشتر چھوٹا

اُس کے کھنچنے کا یہ انداز نیا ہے ورنہ — دامنِ یار چھٹا پہلے بھی اکثر چھوٹا

کچھ اُجالا نظر آتا ہے سیہ خانۂ عشق — آج بیمارِ غمِ ہجر سے بستر چھوٹا

زندگی تیرے گنہگاروں کے کیا کام آتی — داغ بھی ہستیِ ناکام کا مٹ کر چھوٹا

میں نے دیکھا ہے فراقِ وطنِ آوارہ کو
دور ہر ایک سے، وحشت زدہ، دلبر چھوٹا

۲

ض دستِ کرمِ ساقیٔ دلبر سے اٹھا — شعلہ سا دیکھ وہ کچھ کسوتِ ساغر سے اٹھا

کے جب ناز سے انگڑائی وہ بستر سے اٹھا — فتنۂ صبحِ قیامت بھی برابر سے اٹھا

ب اپنا ہے ابھی اے نگہِ یار مجھے — یہ حجابات بھی جلتے ہوئے نشتر سے اٹھا

وریدہ سری، داغِ جنوں نقشِ وفا — تیری دیوار سے اٹھا نہ ترے در سے اٹھا

ال پہ نگاہِ غلط انداز پڑی — پردہ سا حسنِ رخِ آئینہ پرور سے اٹھا

ئے دلِ مجروح پہ گلکاری ہے — جانے یہ نقش بھی اندر سے کہ باہر سے اٹھا

کیف آور تو نہ اس درجہ تھے اُمڈے ہوئے اشک / کون متوالی گھٹا بن کے سمندر سے اُٹھا

ہجر میں ہوش تو کیا کھوئے ہوئے سے ہیں سبھی / درد بھی آج تو کھاتا ہوا چکر سے اُٹھا

دردِ آغوشِ محبت بھی ترے اٹھتے ہی / اُسی انداز، اُسی ناز، اُسی تیور سے اُٹھا

جنھیں چونکا نہ سکیں صورِ قیامت کی صدائیں / کشتۂ غم ہیں انھیں پاؤں کی ٹھوکر سے اُٹھا

نہ تو پرستش کی شکایت نہ عنایت میں کمی / جو اُٹھا بزم سے وہ اپنے مقدر سے اُٹھا

کر دیا گردشِ دوراں کے حوالے کیا جلد / چار دن نازِ جفا بھی نہ ستمگر سے اُٹھا

جان ہے سادگیٔ عشق کی شوخی اس کی / لذتِ لطفِ نہاں جو سراسر سے اُٹھا

سرفروشانِ سیہ بخت کی قسمت چمکی / شعلہ سا سُنتے ہیں کچھ سینۂ خنجر سے اُٹھا

مستی و ہوش تو ساقی فقط افسانے نہیں / یہ حجابات بھی اب بادہ و ساغر سے اُٹھا

اک ذرا عشق سبک روح گراں بار سہی / آج کچھ نازِ حیا شوخیٔ دلبر سے اُٹھا

سربسر برقِ فنا عشق کی ہستی تھی فراقؔ
آنکھ پڑتے ہی وصال دامنِ محشر سے اُٹھا

یادِ جوانی

از حضرت الطاف مشہدی

ہماری نگاہوں میں ہو گر جوانی / بدل ڈالیں خوابوں سے دنیائے فانی

زباں تھک گئی تو محبت کا قصہ / سُنانا پڑا آنسوؤں کی زبانی

نہ مینا نہ پیشِ نظر ہے نہ وہ ہیں / لئے جا رہی ہے کدھر عمرِ فانی

فرشتوں کی فطرت سے پاکیزہ تر ہے / تبسم کسی کا، ہماری جوانی

لئے اُس نے دامن میں موتی سمجھ کر / مزا لے گئی آنسوؤں کی روانی

وہ جب یاد آتے ہیں لیتا ہوں کروٹ / شبِ ہجر میٹھا سا دردِ نہانی

میں روتا ہوں الطافؔ راتوں کو اُٹھ کر
ستاتی ہے جب مجھ کو یادِ جوانی

مزدوروں کے فلاح وبہبود کے لیے دس ہزار کی رقم علیحدہ کردی ہے۔ اس طرح اونھوں نے سب ضروری کاموں کے لیے کچھ نہ کچھ رقم ضرور نکال دی ہے۔ اور جہانتک ممکن ہو سکا موجودہ انتظامات میں کوئی انقلابی رد وبدل نہیں کیا۔ صرف تفریحات پر ٹیکس لگایا اور سرکاری ملازمان کے سفر خرچ میں معمولی سی تخفیف کرکے کئی لاکھ روپیہ کی بچت کرلی۔

بہار کی آمدنی کا اندازہ پانچ کروڑ چھ لاکھ کیا گیا ہے۔ عارضی گورنمنٹ نے چار کروڑ ترانوے لاکھ چھہتر ہزار کا خرچ تجویز کیا تھا۔ کانگریسی وزارت نے منظور شدہ اسکیموں پر ایک کروڑ چھہتر لاکھ۔ پبلک ورکس پر ڈیڑھ کروڑ، نئے آئینی انتظامات پر تین لاکھ۔ گورنر اور وزرا کے اختیاری منظوری کے اخراجات پر سوا کروڑ۔ ڈسٹرکٹ بورڈوں کی امداد کیلئے تیس ہزار۔ زراعت صنعت اور مویشیوں کے علاج وغیرہ کے لیے ایک لاکھ اور ترہت کے سیلاب کی امداد کے لیے پچیس ہزار خرچ کرنا منظور کیے ہیں۔

وزارت نے فی الحال غیر عدالتی اسٹامپ کی شرح بڑھادی ہے اور تفریحات پر بھی ٹیکس لگا دیا ہے۔ اس سے اسکو چار پانچ لاکھ روپیہ کی آمدنی ہوجائے گی۔ زمینداروں کی آمدنی پر بھی ٹیکس لگانے کی تجویز ہے اور اس سے چالیس لاکھ روپیہ ملنے کی امید ہے۔ لیکن ابھی تک اسپر عملدرآمد نہیں ہوا ہے۔ لیکن اس آمدنی کے بغیر کسانوں کی کوئی حاجت روائی نہ ہوسکے گی۔ اور بھی صوبے کے ترقی کے لیے کئی ضروری کام ہیں۔ مگر ابھی وزارا ان کی طرف مخاطب نہیں ہوسکے ہیں۔

نئے صوبہ اُڑیسہ کی آمدنی کا تخمینہ ایک کروڑ اٹھاسی لاکھ اور خرچ کا تخمینہ ایک کروڑ چوراسی لاکھ گیارہ ہزار کیا گیا ہے۔ تعلیم پر بیالیس ہزار۔ حفظان صحت پر ستر ہزار۔ طبی محکمہ پر بیالیس ہزار۔ کوآپریٹیو سوسائٹی کے لیے سینتیس ہزار۔ صنعت وحرفت پر چھہتر ہزار۔ سول کاموں پر چھ لاکھ نوّے ہزار۔ زراعت پر ۵۶ ہزار۔ مویشیوں کے علاج پر ۲۵ ہزار۔ پولیس پر ایک لاکھ چھیاسی ہزار۔ جیل پر ستترہ ہزار۔ عدالت پر پچانوے ہزار۔ عام حکومت پر دو لاکھ ستر ہزار۔

صوبہ متوسط میں اس سال کی آمدنی کا تخمینہ چار کروڑ چوہتر لاکھ اسی ہزار اور خرچ کا اندازہ چار کروڑ ۷۰ لاکھ ۱۵ ہزار کیا گیا ہے۔ اس طرح ۷۰ لاکھ کی بچت کا تخمینہ ہے۔ کانگریسی وزارت نے اپنے پہلے بجٹ میں نئے اخراجات کے لیے اٹھارہ لاکھ ۱۲ ہزار روپیہ کی رقم مہیا کی ہے۔ لیکن اس میں صرف سات لاکھ ۱۳ ہزار کی رقم ہی نئی کہی جاسکتی ہے۔ اسمیں سے سترہ ہزار روپیہ جبری تعلیم کے رائج کرنے کی غرض سے لوکل بورڈوں کو دیا جائیگا۔ کچھ روپیہ جنگلی علاقوں کی تعلیم کے لیے علیحدہ کیا گیا ہے۔ کچھ روپیہ دوا علاج وغیرہ کی سہولتیں بہم پہنچانے میں صرف ہوگا۔ بعض علاقوں میں پرانی اسکیم کو ترقی دینے کی طرف بھی گورنمنٹ کوشش کرے گی۔ پٹواریوں میں امداد باہمی کی اسکیم رائج کرنے کیلیے

تیس ہزار روپیہ تجویز کیا گیا ہے۔

صوبہ سرحد میں بھی کانگریس وزارت قایم ہوتے ہی سیاسی قیدیوں کے رہائی کی کوشش شروع ہوگئی ہے اور وزرا نے صرف قلیل تنخواہوں پر کام کرنے پر آمادگی ظاہر کی ہے۔ چنانچہ صدر کونسل نے بھی اپنی تنخواہ میں تخفیف منظور کرلی ہے۔ نئی وزارت کے اثر سے ممبروں کے سفر خرچ اور روزانہ الاؤنس میں بھی بہت کمی ہوگئی ہے اور وزرا نے رفاہ عام کے کئی اور کاموں کی طرف توجہ دینا شروع کیا ہے۔

غرض اس محدود وقت میں بھی ہر صوبہ میں کانگریسی وزرا نے ملکی نظم و نسق میں رفاہ عام کا جدید خیال پیش نظر رکھا ہے۔ جس سے عوام ملک میں نئی زندگی کے آثار پیدا ہوگئے ہیں اور ملک حکومت خود اختیاری کے قریب تر ہوگیا ہے۔ اس میں شک نہیں ہے کہ اس وقت کانگریسی وزرا کے راہ میں کئی اہم خطرات بھی درپیش ہوگئے ہیں۔ مگر ان کا ہم آیندہ ذکر کریں گے۔

التماس ضروری

اس سال زمانہ کی اشاعت کا سلسلہ ابھی تک درست نہیں ہوسکا۔ ہم یہاں پر اپنی مشکلات کے ذکر سے ناظرین کو بے لطف نہیں کرنا چاہتے ہیں۔ یوں بھی عذر گناہ بدتر از گناہ کی مثل صادق آنیکا خوف ہے، مگر ہم کوشش کر رہے ہیں کہ اگلے سال کے آغاز تک اس سال کے بقیہ نمبر شایع ہوکر ناظرین کی خدمت میں پہونچ جائیں۔

پریم چند نمبر کی تاخیر اشاعت بھی ناقابل معافی ہے، اگرچہ یہ نمبر بھی اس سال کے خاتمے تک ناظرین کی خدمت میں پہونچ جائیگا۔ مگر کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ معزز ناظرین اس نمبر کو بذریعہ رجسٹری طلب فرمادیں۔ گو اس میں چار آنہ کے ٹکٹ زیادہ بھیجنا ہوں گے۔ مگر اس نمبر کا پہونچنا یقینی ہوجائیگا اسلیئے ہماری استدعا ہے کہ سب صاحبان چار چار آنہ کے ٹکٹ بھیجدیں تاکہ یہ ضخیم نمبر جو واقعی اُردو رسالوں کی تاریخ میں ایک خاص نمبر ہوگا۔ ہمارے قدردانوں کے پاس صحیح وسلامت پہونچ جائے۔ چونکہ بعد میں اس پرچہ کی کاپیاں مشکل سے دستیاب ہوسکینگی اسلیئے یہ احتیاط بھی ضروری ہے۔

"مینجر زمانہ"

رفتار زمانہ



کانگریسی وزارتوں کے کارنامے ملک کے سامنے آگئے ہیں۔ صوبہ سرحد میں بھی ڈاکٹر خاں صاحب کی رہنمائی میں کانگریس وزارت ہونے سے اب ہندوستان کے گیارہ میں سے سات صوبوں میں کانگریس پارٹی کی حکومت قائم ہوگئی ہے اور گو موجودہ آئین کے ماتحت ملکی انتظام میں کوئی انقلاب عظیم ناممکن ہے۔ تاہم نئی گورنمنٹیں ہر جگہ عوام کی ترقی کی کوشش اور ملک کے اصلی مسائل حل کرنے کی فکریں کررہی ہیں اور جب سے کانگریس نے حکومت کی ذمہ داری اپنے سر لی ہے۔ سوراج کی ہلکی سی جھلک ضرور دکھائی دینے لگی ہے۔ کانگریسی وزرا ہر جگہ نئی روایتیں قائم کررہے ہیں ہر خاص و عام کی ان تک رسائی ہے۔ حکام ضلع کو بھی اب عام خدمات کا زیادہ لحاظ رکھنا پڑتا ہے۔ اور شہر اور اضلاع دونوں میں عوام کے منتخب نمایندوں کی حیثیت میں نمایاں فرق آگیا ہے۔ پہلے کے بہ نسبت موجودہ وزرا عوام سے کہیں زیادہ رابطہ اتحاد قایم رکھنے کے درپے ہیں قانونی اسمبلیوں میں صوبہ کی دیسی زبانوں کو جسقدر دخل ہوگیا ہے۔ شائد ہمارے آئین سازوں کو خواب میں بھی خیال نہ ہوا ہوگا۔ صوبہ متحدہ میں کانگریس کا پہلا بجٹ ہندوستان جدید کی تاریخ میں پہلی مرتبہ اردو و ہندی میں شایع ہوا۔ صاحب وزیر اعظم نے اپنی اہم تقریریں ہندوستانی زبان میں کی ہیں۔ اور آنریبل بابو پرشوتم داس ٹنڈن صدر اسمبلی نے ہندوستانی زبانیں تقریر کرنیکی تمام ممکن سہولتیں دے رکھی ہیں جس سے صوبے کی زبانوں کے لیے آیندہ ترقی کی شاہراہ کھل گئی ہے۔ بہت سی دوسری باتوں میں عام جذبات کا پورا لحاظ ہو رہا ہے۔ اکثر قانونی اسمبلیوں کی کارروائی قومی گیت سے شروع ہوتی ہے۔ صوبہ متحدہ میں ہر جمعہ کے دن اسمبلی کی کارروائی نماز کے وقت سوا گھنٹہ کو ملتوی کردی جاتی ہے۔ دیہات کی فلاح و بہبود کی اسکیمیں بھی تیار ہورہی ہیں۔ صوبہ متحدہ میں کوشش ہے کہ گاؤں میں پنچایتیں قایم ہوں۔ ایک چوپال لوگوں کی نشست برخاست کیلئے بنا دی جائے۔ معمولی ابتدائی تعلیم کا انتظام کردیا جائے۔ کچھ دوائیں مہیا ہوجائیں اور ریڈیو لگا دیا جائے۔ اس کے لیے حکومت سات آٹھ سو نئے کارکن مقرر کررہی ہے اور اس محکمہ کا افسر اعلیٰ مسٹر سری کرشن دت پالیوال کو مقرر کیا ہے۔ جنکو دیہات کے مسائل سے ایک عرصہ سے خاص دلچسپی ہے۔ کانگریسی وزارتوں نے ترک منشیات کی جدوجہد بھی باقاعدہ شروع کردی ہے۔ مدراس میں کئی اضلاع میں اسکا امتحان ہو رہا ہے۔ دوسرے صوبوں میں بھی اس تحریک کا آغاز کرنے

کی تیاریاں ہو رہی ہیں ۔

اس راستہ میں گورنمنٹ کو طرح طرح کی مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا ۔ اور سرکاری محاصل میں بھی بہت بڑی تخفیف ہو جائے گی ۔ مگر مہاتما گاندھی کی زیر ہدایت کانگریس نے ترک منشیات کو اپنے اصلاحی پروگرام کا ضروری جزو بنا لیا ہے اور مدراس گورنمنٹ نے اولوالعزمی کے ساتھ یہ تحریک شروع کر دی ہے ۔ اس کے افسر اعلیٰ ایک انگریز سویلین مسٹر رابرٹس مقرر کیے گئے جو خود بھی شراب وغیرہ سب قسم کی منشیات سے سخت پرہیز کرتے ہیں ۔ سلیم وغیرہ اضلاع میں جہاں یہ تحریک شروع کی گئی ۔ اس بات کی پوری احتیاط کر لی گئی ہے کہ وہاں کے سرکاری افسران صرف وہی لوگ ہوں جنھیں عملی حیثیت میں اس تحریک سے دلی ہمدردی ہے ۔ ہز ایکسلنسی گورنر مدراس نے بھی اس تحریک سے ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے ۔ عام ہدایت کر دی ہے کہ سرکاری دعوتوں اور پارٹیوں وغیرہ میں ان کو اور ان کے عملہ کو شراب نہ پیش کی جائے ۔

کانگریس گورنمنٹوں نے سیاسی قیدیوں کے معاملہ میں بھی غیر معمولی جرأت سے کام لیا ہے صوبہ متحدہ بہار ۔ مدراس ۔ بمبئی وغیرہ ساتوں صوبوں کے سیاسی قیدی رہا کر دیے گئے ہیں ۔ حد یہ کہ سازش کاکوری کے قیدی تک اب جیل میں نہیں ہیں ۔ اور انڈمان سے بھی بہت سے قیدی بلائے گیے ہیں اور اکثروں کی سزائیں معاف کر دی گئی ہیں ۔ حال میں مہاتما گاندھی کی پُرزور سفارش پر گورنمنٹ بنگال نے بھی گیارہ سو سیاسی نظربندوں کو رہا کیا ہے جس سے تمام صوبے میں ایک اطمینان کی لہر پھیل گئی ۔

کانگریسی وزرا نے اخبارات کی ضبط و جمع شدہ ضمانتیں بھی واپس کر دی ہیں اور پریس کی آزادی کے اصول کو تسلیم کر کے اخبارات کی سیاہ فہرست یک قلم منسوخ کر دی ہے ۔ احاطہ بمبئی میں سول نافرمانی کے سلسلے میں بعض کسانوں کی زمینیں ضبط کر لی گئی تھیں اور بعض معمولی داموں پر نیلام کر دی گئی تھیں ۔ اب کانگریسی حکومت نے ضبط شدہ اراضی سے ساڑھے سات سو ایکڑ اراضی تو واپس کر دی اور افسران ضلع سے نیلام شدہ زمینوں کی تحقیقات کرنیکا حکم دیا ہے ۔ پھر کانگریس کمیٹی کا چالیس ہزار ضبط شدہ روپیہ بھی واپس کر دیا گیا ہے ۔

صوبہ متحدہ ۔ صوبہ متوسط و بہار ۔ وغیرہ میں میونسپلٹی و ڈسٹرکٹ بورڈوں کے جن ماسٹروں کو سول نافرمانی کی علت میں ملازمت سے برخاست کر دیا گیا تھا ۔ انھیں اب دوبارہ ملازمت دی جا رہی ہے ۔

کانگریس نے مزدوروں اور کاشتکاروں کے فلاح وبہبود کا بھی وعدہ کیا تھا اور گو اسمیں وزراء کو سخت دشواریوں کا سامنا ہورہا ہے۔ لیکن وہ حتی المقدور ان کے حقوق اور ضروریات کا لحاظ کررہے ہیں۔ بہار اور صوبہ متحدہ دونوں جگہ زمینداروں پر ٹیکس لگانے کا خیال ہے۔ کاشتکاروں کا بار ہلکا کرنے کے متعلق اسمبلی کی کمیٹیاں مقرر کردی گئی ہیں اور گو زمیندار صاحبان انتہائی مخالفت کی دھمکی دے رہے ہیں۔ لیکن وزراء اہل ملک کے ساتھ اپنا فرض ادا کرنا چاہتے ہیں۔ بالآخر وہ کہاں تک اپنی کوششوں میں کامیاب ہوں گے یہ آیندہ دیکھنے کی بات ہے۔

کارخانوں کے مزدوروں کی حالت دیہات کے کاشتکاروں کے مقابلے میں پہلے ہی سے کہیں بہتر تھی۔ تاہم ان کے آرام وآسایش کے لیے ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے۔ چنانچہ شروع دن سے کانگریسی وزراء کوشش کررہے ہیں کہ جس طرح سے ہوسکے انکی شکایات رفع کی جائیں اور ہمارے کارخانہ دار مزدور پیشہ جماعت کو مزید مراعات دیں۔ لیکن مزدوروں کے ایک طبقہ نے آئے دن کی ہڑتالوں اور مظاہروں سے نہ صرف کارخانہ داران ہی کا ناطقہ بند کررکھا ہے۔ بلکہ لیڈران ملک کو بھی پریشان کررہے ہیں۔ مزدوروں کے حد اعتدال سے متجاوز ہونے سے نقصان اور بدامنی دونوں کا اندیشہ ہورہا ہے۔ اسی لیے مہاتما گاندھی اور پنڈت جواہر لال دونوں نے مزدوروں سے صبر و تحمل سے کام لینے کی ہدایت کی ہے

کانگریسی گورنمنٹوں کو عوام کے فوائد کا کتنا خیال ہے۔ اسکا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ صوبوں کے ششماہی بجٹ بناتے وقت اونھوں نے رفاہ عام کی مدّوں پر روپیہ خرچ کرنیکا پورا خیال رکھا ہے۔ حالانکہ اس وقت قریب قریب ہر صوبے میں مالی عسارہ تھا اور عارضی وزارتوں نے بہت سے اخراجات پہلے ہی سے طے کردیے تھے۔

احاطہ مدراس میں ۳۸-۱۹۳۷ء کا مالی سال ایک کروڑ ۳۹ لاکھ کی بچت سے شروع ہوا۔ چنانچہ کانگریسی وزارت نے اس رقم سے ضلع سیلم پور میں بندش شراب کے اخراجات ادا کیئے۔ اور پچھتر لاکھ روپیہ کسانوں کی امداد کے لیے دیا۔

غرض پچھلے سال کے بجٹ کی رقم کو اپنی حالت پر قایم رکھتے ہوئے بھی اصلاح وترقی کے شعبوں کے اخراجات بڑھادیے گئے ہیں۔ مثلاً آبپاشی پر ساڑھے پانچ لاکھ روپیہ کا خرچ بڑھادیا ہے۔ حفظان صحت پر ۹ ½ لاکھ روپیہ زیادہ خرچ کرنے کا بندوبست کیا ہے۔ زراعت پر پونے دولاکھ۔ مویشیوں کے علاج پر پون لاکھ۔ کوآپریٹو سوسائیٹیوں کی امداد کے لیے سوا دولاکھ۔ صنعت وحرفت کی ترقی کے لیے قریب پانچ لاکھ۔ طبی محکمہ پر ۴ ½ لاکھ کے اخراجات میں اضافہ کردیا ہے۔

یہ بھی کوشش کی گئی ہے کہ نئے اسکیموں کے لیے جو رقمیں علیحدہ کی جائیں وہ سب سرکاری ملازمان ہی کے تنخواہ وغیرہ میں نہ صرف ہوجائیں۔ ایسلیے گورنمنٹ نے چھ فیصدی سرکاری افسروں سے اور ۹۲ ۲/ فیصدی ترقی کے کاموں میں صرف کرنے کا بندوبست کیا ہے

صوبہ بمبئی میں عارضی گورنمنٹ نے اس سال ۳۸-۱۹۳۷ء کے بجٹ میں ۱۷ لاکھ ۶۷ ہزار کے گھاٹے کا اندازہ لگایا تھا۔ اس نقصان کو پورا کرنے اور مزید اصلاحات کو جاری کرنے کے لیے وزارت نے پچھلے سال کی بچت

مبلغ چالیس لاکھ سے لی ہے اور تقریباً دس لاکھ کی اخراجات میں کفایت کی ہے - وزرا نے خود بھی بہت کم تنخواہیں لی ہیں اور ممبروں کو بھی کم الاؤنس دیا ہے - اور دیگر سرکاری افسروں کے بھتے میں بھی ۲ ½ فیصدی کی کمی کر دی ہے بہر حال اصلاح و ترقی کے لیے گورنمنٹ نے دو لاکھ روپیہ بندش شراب کی تجاویز شروع کرنے کے لیے منظور کیا ہے پانچ لاکھ روپیہ چراگاہوں کا محصول منسوخ کرنے کیلئے رکھا گیا ہے - پانچ لاکھ روپیہ معافی لگان کیلئے علیحدہ کر دیا گیا ہے نئی اسکیموں کے سلسلے میں دس لاکھ روپیہ دیہاتوں میں پانی مہیا کرنے پر صرف ہوگا - ڈیڑھ لاکھ روپیہ گھریلو صنعتوں کو امداد دینے میں خرچ کیا جائیگا - ۳ ½ لاکھ روپیہ دیہاتوں کی سڑکیں بنانے میں صرف ہوگا -

صوبہ متحدہ آگرہ و اودھ پر مانٹیگو چمسفورڈ کی اصلاحات سے لیکر آجتک خرچ کا بار بڑھ رہا ہے - چنانچہ اب اس کا قرضہ پندرہ کروڑ سے بڑھکر ۴۳ کروڑ ہو گیا ہے - نواب چھتاری کی وزارت کے تخمینہ کے روسے اس سال اکتالیس لاکھ کے گھاٹے کا اندازہ کیا گیا تھا - مگر آنریبل مسٹر پنتھ نے اپنی قابلیت سے کانٹ چھانٹ اور مناسب کفایت کر کے اس حساب کے روسے صرف نو لاکھ روپیہ کا خسارہ باقی رکھا ہے - بلکہ نظم و نسق - عدالت - پولیس اور وزراء کی تنخواہ و سفر خرچ کی مزید کاٹ چھانٹ سے صوبے کو گھاٹے سے بچا کر الٹے ۴ ½ لاکھ کی بچت بھی نکال لی - مگر چونکہ نئے اسکیموں کے سلسلے میں سترہ لاکھ کے نئے اخراجات تجویز کیئے گئے ہیں - اسلیے سال رواں میں اب صرف ۱۲ ½ لاکھ روپیہ کی کمی باقی رہیگی - آپ نے تعمیری کاموں پر تینتیس لاکھ کا مزید خرچ طے کیا ہے اور عدالت پولیس اور نظم و نسق کے دیگر اخراجات میں بارہ لاکھ روپیہ کی تخفیف کی ہے - تعمیری کاموں کے سلسلہ میں دس لاکھ روپیہ دیہات سدھار اسکیموں میں صرف ہوگا - بیس ہزار روپیہ سے دیہاتی کتبخانے قایم کیے جائیں گے - بیس ہزار روپیہ سے شہروں میں خالص دودھ بہم پہونچانے کی اسکیموں کی مدد کی جائیگی - بارہ ہزار روپیہ خالص گھی کے اسکیم پر صرف ہوگا - تین لاکھ روپیہ سے کسانوں کو اچھے بیج بہم پہونچائیں گے اور دو لاکھ روپیہ کی اچھی کھاد بہم پہونچائے گی - دو ہزار پھلوں کی کاشت کو ترقی دینے کے لیے - دو ہزار آلو کے متعلق تحقیقات کے لیے - تینتیس ہزار بیلوں کی نسل میں ترقی کرنے پر صرف ہوگا - اکتیس ہزار روپیہ سے ٹیوب ویل بنائے جائیں گے - کھادی کی ترقی کے واسطے دس ہزار اور دیسی کرگھوں کی صنعت کو ترقی دینے کے واسطے سوا لاکھ روپیہ منظور کیا گیا ہے - اڑتیس ہزار روپیہ گڑ بنانے کے طریقوں کو ترقی دینے کے واسطے دیا گیا ہے - ملیریا کے تدارک کے لیے اسی ہزار روپیہ اور دیہاتی علاقوں کی طبی امداد کے لیے ۱ ½ لاکھ روپیہ اور نوجوانوں کو صنعتی کاموں میں مدد دینے کے واسطے ایک لاکھ روپیہ منظور کیا گیا ہے نئے بازار قایم کرنے کے لیے پچیس ہزار روپیہ کانگریسی وزارت سے تجویز ہوا ہے -

سرکاری عمال کی رشوت ستانی بند کرنے پر بھی بہت زور دیا گیا ہے - اور مسٹر بھلا سپرنٹنڈنٹ پولیس کو اس کار خاص پر تعینات کر دیا ہے - آپ کی امداد کے لیے تین چار پر جوش ماتحت بھی دیے ہیں - غرض وزارت نے اس کام کے لیے بھی دس ہزار کی رقم معین کی ہے -

زمانہ

جلد ۶۹ — نومبر ۱۹۳۷ء — نمبر ۵

شاعری اور تنقید جدید

از مسٹر رمیش نراین ماتھر ایم۔ اے آگرہ

"شاعری اور تنقید سے عوام الناس کو کوئی تعلق نہیں ہوتا ہے۔ یہ صرف بیکاروں کا مشغلہ ہے جو اپنے خلوت خانہ میں لکھتے اور پڑھتے رہے"۔ یہ انگریزی کے مشہور شاعر پوپ کا نظریہ ہے جس نے سنہ ۱۷۱۶ء میں شاعری و تنقید کے متعلق اظہار خیالات کرتے ہوئے اس بات کو محسوس کر لیا تھا کہ شاعری و تنقید کا ذوق معدودے چند تعلیم یافتہ مگر بیکار لوگوں کی مختصر جماعت تک محدود رہتا ہے۔

آج بھی لوگوں کا بالکل یہی خیال ہے۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ لوگ شاعری کے اصلی مقصد و ماہیت کو غلط سمجھے ہوئے ہیں اور یہ نہیں جانتے کہ اسکی حقیقت کیا ہے اور یہ ہمارے لئے کیا کر سکتی ہے۔ ہر چند نقادوں نے سمجھانے کی کوششیں کیں لیکن لفاظی سے مطلب خبط ہو گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں کا تنقید دلوں سے اعتقاد ہو گیا کہ شاعری مصنوعی لطافت و دلآویزی کا دوسرا نام ہے اور وہ محض متابعت فن اور تضیع اوقات کے سوا اور کوئی چیز نہیں ہے۔ اس میں پاک و لطیف جذبات کا بالکل فقدان نظر آتا ہے۔ اور تصنع و تکلف۔ دور از کار تشبیہات و مرصع سازی کے سوائے زندگی سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ آتش کا شعر اس خیال پر صادق آتا ہے ؎

کھینچ دیتا ہے شبیہ شیر کا خاکہ خیال — عقل رنگین کام اس پر کرتی ہے پرداز کا

بندش الفاظ جڑنے سے نگوں کے کم نہیں — شاعری بھی کام ہے آتش مرصع ساز کا

بہت سے لوگوں کے نزدیک حکمت و شاعری میں فرق یہ ہے کہ حکمت میں امر حقیقی کا انکشاف ہوتا ہے اور اس کے برعکس شاعری میں خیالی نکات سے بحث ہوتی ہے حکمت اُن امور پر دلالت کرتی ہے جو زندگی کے لئے مفید و کارآمد ہیں۔ شاعری کا وہم و قیاس سے تعلق ہوتا ہے اور وہ لوگوں کو خیالی پلاؤ پکانے کے علاوہ اور کسی بات میں مدد نہیں دے سکتی۔

عملی زندگی میں شاعری کی تائید میں کچھ کہنا فضول ہے۔ اکثر پوچھا جاتا ہے کہ شاعری سے کیا فائدہ پہونچ سکتا ہے لیکن جب اس بارے میں لوگوں کی غلط فہمیاں دور ہو جائیں گی تو کسی عذر خواہ کی ضرورت ہی محسوس نہ ہوگی واقعی جب یہ بات منکشف ہو جائے گی کہ بہترین شاعری کیا چیز ہے اور وہ کیا کر سکتی ہے تو اس بات کی کوئی ضرورت نہ ہوگی کہ اس کے فائدے بیان کئے جائیں یا حکمت کے اوپر اس کی فوقیت دکھائی جائے۔

یہ بات بغیر کسی پس و پیش کے کہی جاسکتی ہے۔ کہ ہر شخص کو شاعری سے دلچسپی نہیں ہوسکتی لیکن یہ بھی ضرور ہے کہ ہم صحیح تنقید سے شاعری کے حدود کو وسعت دے سکتے ہیں۔ جس سے لوگوں کی کثیر تعداد مستفید ہو سکتی ہے۔ جب افلاطون نے شعراء کے خلاف اپنا مشہور الزام عاید کر کے انھیں اپنی مخصوص جمہوریت میں داخل ہونے سے محروم کیا تھا تو اس نے کوئی ایسا فیصلہ نہیں کیا تھا جس کے خلاف کوئی اپیل ہی نہ ہو سکے اگر شاعری کی طرف سے کوئی منصفانہ دلیل پیش کی جاتی تو اس کا خوشی سے استقبال کیا جاتا خود افلاطون کے الفاظ یہ ہیں:۔

> "شاعری کی تائید کرنے والوں میں بہت سے ایسے اصحاب ہیں جو گو خود شاعر نہیں ہیں لیکن شاعری کے شیدائی ہیں ان کو اجازت دی جاتی ہے کہ وہ شاعری کی وکالت میں جو چاہیں نثر میں کہیں۔ انھیں اس بات کے ثابت کرنے کی بھی قطعی اجازت ہے کہ شاعری فی نفسہٖ خوشگوار ہی نہیں بلکہ امور سلطنت اور انسانی ضروریات کے لئے بھی مفید ہے۔ اگر یہ مسئلہ طے ہو جائے تو ہم کو دوچند فائدہ ہوگا۔ کیونکہ شاعری مفید اور خوشگوار دونوں ہو جائیگی"

موجودہ زمانہ کے نقاد کو بھی یہ مرحلہ طے کرنا ہے اور اس کو بھی یہ بات ثابت کرنا ہے کہ شاعری زندگی کے لئے فرحت افزا ہی نہیں بلکہ مفید بھی ہے۔

شاعری کو جذبات ہی سے تعلق ہے اور اس لئے تاثر اس کا ضروری عنصر ہے۔ شاعری ہر قسم کے جذبات کو برانگیختہ کرتی ہے۔ اور صرف محسوسات ہی کی تصویر نہیں کھینچتی بلکہ جذبات اور احساسات کو بھی پیش نظر کرتی ہے۔ شاعری سے ہمارے اعتقاد کی یہی وجہ ہے کہ دنیا کی شاعری میں بڑے بڑے حکما و عقلا نے اپنے پاکیزہ خیالات کا اظہار کیا ہے۔ شعر شاعر اور اس کے ماحول کی صحیح ترجمانی ہے۔

روسی لوگوں نے شاعری میں اخلاقی پہلو کو بڑی اہمیت دی تھی کیونکہ انکو یقین واثق تھا کہ شاعری میں

یہ ہو ہر ہے کہ انسان کو شایستگی اور درستی اخلاق کو طرف راغب کر کے نیک امور کی تعلیم دیتی ہے۔ ان لوگوں نے شاعری ہی پر صیغۂ تعلیم قایم کیا۔ ان کے یہاں تعلیم کا مقصد شعرا کے کلام کا مطالعہ تھا شعرا انسان کو شجاع خطیب اور قابل قدر مدبّر بناتے تھے۔

ہوریس کا قول ہے کہ شاعر بچے کی نامکمل اور رکلنت کرنے والی زبان کو سنوارتا ہے۔ اور اس کے کانوں کو فضول لغویات سے بچاتا اور زندگی کے ان قانون سے واقف کرتا ہے جس کی شیرینی خود اسکو اپنی طرف راغب کرتی ہے۔ اس کے دل کو نئے سانچے میں ڈالتا ہے اور ناپاک خیالات بغض وحسد وغیرہ کو جلاوطن کرتا ہے۔ شاعر بچے کے سامنے بزرگ ہستیوں کی اعلیٰ مثالیں پیش کرتا ہے جس سے اسے عبرت ہوتی ہے۔"

رومان کے بعد جب ہم یورپ کے نشاۃ الثانیہ کے دور کی طرف نظر اٹھاتے ہیں تو ہم کو یہ دیکھکر حیرت ہوتی ہے کہ اس دور کے شعرا زمانہ سلف کے اخلاقی نقطۂ نظر سے بہت متاثر ہوئے۔ اس نئے دور میں لوگوں کا خیال انسان کو بہتر بنانا ہے اور لوگوں کا ذہن بہتری کی طرف منتقل کرنے کے لئے شاعری سے قوی تر اور کوئی شے انھیں نظر نہیں آتی اس خیال کی جھلک ہم کو اس دور کی ادبیات میں نظر آتی ہے غالباً اسی خیال سے متاثر ہو کر سڈنی اور بن جانسن نے خیالات ظاہر کئے ہیں۔ اور اسی مطمع نظر سے جس میں تعصب کی بھی جھلک ہے ملٹن نے وعظ کہا ہے۔ اگرچہ اٹھارہویں صدی کے شعرا کا رجحان طبع اور اس کا نقطۂ نظر مختلف تھا۔ ان کے اوپر مادیت کی حکومت غالب تھی تاہم وہ شاعری کا اہم ترین مقصد اخلاقی تعلیم ہی سمجھتے تھے۔ اور ان کا یہی عقیدہ تھا کہ دنیا کا اہم ترین مسئلہ خود انسان کا مطالعہ ہے۔

یہی عقیدہ انیسویں صدی کے رومانٹک (Romantic) شعرا کو بھی ورثہ میں ملا۔ ہم بائرن کو کبھی ناصح خیال نہیں کرتے لیکن عجب بات ہے کہ وہ بھی یہی کہتا ہے کہ

"بہترین شاعری اخلاقی ہے کیونکہ اخلاقی امور سب اشیا پر بالاتر ہیں۔"

اس سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ شاعری و اخلاق میں ایک گہرا تعلق ہے اور وہ لوگ جو ان دونوں میں ایک حد فاصل قایم کرنا چاہتے ہیں سراسر غلطی پر ہیں۔ شاعری اخلاقی ترقی کے لئے نہایت ضروری ہے کیونکہ اس کو زندگی سے وابستگی ہے۔ شاعر زندگی کے مختلف شعبوں پر جن کی تہ میں جذبات ہوتے ہیں بہ حیثیت انسان نظر ڈالکر اور اپنے ماحول کا ایک صحیح نقشہ کھینچ دیتا ہے۔

شاعری ایک فن لطیف ہے اور قدرت کے مشاہدات پر مبنی ہوتی ہے۔ وہ زندگی کے تمام راز ہمارے سامنے کھول کر رکھدیتی ہے۔ اس لئے وہ شاعری جو زندگی سے تعلق نہ رکھتی ہو یا اپنے ماحول کو نظرانداز کرتی ہو شاعری نہیں تک بندی ہے۔

اسکی تائید میں کہ فن لطیف اور شاعری حیات انسانی کی تفسیر ہے" شاعری میں ڈرامہ فن مصوری اور معماری کے شہ پارے پیش کئے جاسکتے ہیں جن سے اس دعویٰ کی پوری تصدیق ہو جائے گی۔

آپ کسی ملک کی شاعری یا فن لطیف کا کوئی شہورد در لے لیجئے۔ آپکو واضح ہو جائے گا کہ شاعر کا مقصد اپنے ماحول کی صحیح ترجمانی کرنا ہوتا ہے۔ ہر فن لطیف شمع حیات کا کام دیتا ہے۔ فن نقاشی یا شاعری میں جو چیز بظاہر حُسن ہے وہ بذات خود بے ہستی و مہمل شے ہے اور اگر وہ کسی خیال، دلی آرزو یا دماغی کیفیت کا اظہار نہیں کرتے زندگی کے مسائل پر روشنی نہیں ڈالتے تو سمجھ لیجئے اس میں کوئی خوبی نہیں ہے

قدیم یونان اور قدیم ہند میں فن نقاشی کا کوئی شہ کار نہیں جو اُس زمانہ کے لوگوں کے عقائد اور دلی جذبات اور احساسات کا اظہار نہ کرتا ہو۔ اسی طرح قدیم ہندوستان یا قدیم یونان کا کوئی ڈرامہ یا شاعرانہ کلام ایسا نہیں ہے جو اس دور کی طرز زندگی اور سوسائٹی کی حالت کا بعینہ نقشہ نہ کھینچتا ہو۔

آپ مہابھارت کو لیں۔ یا کالی داس کے کسی ڈرامے کو دیکھیں۔ یا کوئی یونانی ٹریجڈی ملاحظہ کریں شیکسپیر کے ڈرامے پڑھیں یا مغل سلطنت کی مصوری۔ یا گپت عہد کی بہترین نقاشی یا شمالی ہند کے بادشاہوں کے قدیم علم موسیقی کے بارہ میں بحث کریں۔ یہ سب اپنے اپنے وقت کی زندگی کے منظہر ہیں۔ اس لئے میں اس مضمون کو اس جملہ پر ختم کرتا ہوں کہ "شاعری زندگی کا آئینہ ہے" یہی وجہ ہے کہ اُن لوگوں کو جو خیالی دنیا میں رہتے ہیں واقعی دنیا سے ترک تعلق کئے ہوئے ہیں شاعری سے ہرگز کوئی دلچسپی نہ ہوگی لیکن ان لوگوں کے لئے جو جذبات رکھتے ہیں جسمانی روحانی اور دماغی حیثیت سے زندگی کا لطف اٹھانا چاہتے ہیں شاعری ہمیشہ مفید و دلکش ہوگی واقعی زندگی سے تعلق نہ رکھنے والی شاعری اپنی دلچسپی کے باوجود کبھی دیر تک قایم نہ رہ سکیگی۔ اصلی شاعری وہی ہے جو چشمہ حیات سے سیراب ہو۔

رباعیاتِ جگر

از حضرت جگر بریلوی بی۔ اے

ہر سانس پہ آہ غم سے ٹوٹا کیا دل
رونے سے نہ ضبط سے ہوا کچھ حاصل
ہستی سے مراد ہے کشاکش یعنی
جینا مشکل ہے مرنا اُس سے مشکل

۲

آئی نہ ہوائے زلیست اُف راس مجھے
پھر بھی رہی ساری عمر اک آس مجھے
دل ٹوٹ گیا ہے اب نسیم سحری
باقی نہیں زندگی کا احساس مجھے

میکشی حرام ہے!

از حضرت بیتاب بریلوی بی۔اے۔ایل ایل۔بی

۱

ابر بادہ بار ہے مست خود بہار ہے
روح بے قرار ہے کس کا انتظار ہے؟
سر سے مے اتار کر
صدقۂ بہار کر

۲

مے نہیں کہ جم نہیں میں کسی سے کم نہیں
کچھ کسی کا غم نہیں مے ہے کوئی سم نہیں
چیز کچھ بُری نہیں
کیوں کہوں کہ پی نہیں ؟

۳

جام لا حجاب کا کام کیا
غم نہ ثواب کا کام ہے
فکر کیوں فضول
پی تو سب وصول

۴

چھوڑ ذکر ناتمام
پی پلا ہو شاد کام
بندگی کا
آج کل

۵

فکرِ کیف و کم غلط ہستی و عدم غلط
غم غلط الم غلط آپ کی قسم غلط
دل لگی سے کیا حصول؟
تیرے منہ میں خاک دھول

۶

پی رہا ہے ماہتاب بے حجاب بے حساب
ہاں ذرا الٹ نقاب پھر ہو دورِ آفتاب
ہے قسم شباب کی
مستیٔ شراب کی

۷

شغل تو برا نہیں دل لگی کی جا نہیں
وہم کی دوا نہیں تجھ سے کچھ چھپا نہیں
مست بادہ نوش ہے
اور ابھی تو ہوش ہے

۸

ـرخِ چنبری شانِ حسنِ دلبری
ہے مے بھری یا ہے شیشہ میں پری
کیا ہے کام حور سے؟
ے سلام دور سے!

۹

ـٹا سر پہ چھا گئی گھٹا
ـا دل گھٹا گئی گھٹا
ـنے جھوم کر
ـا کا چوم کر

(۱۰)

زیست بے ثبات ہے — میکشی حیات ہے
کیا مزے کی رات ہے — بھول دے تو بات ہے
سن چکا تو چرخ پیر
یوں ہوا ہے حرف گیر

(۱۱)

آدمی بشر نہیں — گر خدا کا ڈر نہیں
آج کی خبر نہیں — کل پہ بھی نظر نہیں
کیا ہوا تجھے بشر؟
الامان — الحذر!

(۱۲)

ہے ترا خیال خام — لے نہ میکشی کا نام
چھوڑ شیشہ توڑ جام — تر نہ کر دہان و کام
ملک ابھی غلام ہے
میکشی حرام ہے

اشارۂ مشیّت

خدا گواہ کہ منشا ہے یہ مشیت کا — کہ ہر نظام کے ہمراہ ابتری بھی رہے
موحدوں کو رہے اختیارِ بت شکنی — برہمنوں کے لئے اذنِ آذری بھی رہے
طلسم کوثر و تسنیم بھی نہ ہو باطل — شرابِ ناب کی فسونگری بھی رہے
حدیثِ طاعت و آیاتِ حق کے دوش بدوش — زمیں پہ کفر و بغاوت کی شاعری بھی رہے
شعارِ عجز و سرِ انکسار کے ہمراہ — سرشتِ حضرتِ انساں میں خود سری بھی رہے
مذاقِ بندگی ذوقِ سجدہ کے باوصف — مزاجِ آدمِ خاکی میں داوری بھی رہے
غرضکہ حکم مشیّت یہ ہے کہ دنیا میں
پیمبری بھی رہے اور کافری بھی رہے

حفیظ جالندھری

زیکوسلافیکیہ اور اُسکا بانی

THOMAS GARRIGUE MASARYK.

طامس گاریگ میزاریک

جب مشیئت ایزدی کو منظور ہوتا ہے کہ کسی مُلک یا قوم پر رحمتوں کی بارش ہو تو مدتوں پہلے اِس کے سامان اکٹھے ہونے لگتے ہیں۔ اور تمام انتظامات پورے ہونے پر اچانک ایک ایسا انقلاب عظیم واقع ہوتا ہے کہ دُنیا کی آنکھیں کھُلی رہجاتی ہیں۔ قدرت کو پولینڈ، روس، زیکوسلافیکیہ کو جور واستبداد سے پاک اور آزاد وخودمختار کرنا منظور تھا۔ اِس لئے دیگر تحریکات کے ساتھ وہاں پلوڈسکی، لینن اور میزاریک جیسے الوالعزم جاں نثار قوم بھی پیدا ہوگئے۔ جنھوں نے غیروں کی حکومت کا جوا اپنی گردن سے اُتار کر اپنی قوم اور اپنے مُلک کا تمام نظم ونسق اِسطرح سنبھال لیا گویا سالہا سال سے ایسا ہی چلا آتا تھا۔

یہاں پر ہم اس بے نظیر ہستی کی یاد تازہ کرتے ہیں۔ جس نے ۷ مارچ سنہ ۱۸۵۰ء کو مُلک موریویہ میں ایک کوچوان کے گھر جنم لیا۔ اور طامس گاریگ میزاریک کے نام سے موسوم ہوا۔ یہ کس مپرسی کی حالت میں پیدا ہونے والا بچہ اپنی خداداد ذہنی و دماغی قابلیتوں کی بدولت اپنی زندگی میں وطن کو آزاد کرکے، خود اُس کا پہلا پریسیڈنٹ بنا اور دُنیا سے چلتے چلتے اپنا تاجِ اقبال دوسرے کے سر پر رکھ گیا۔

جیساکہ اوپر ذکر ہوچکا ہے میزاریک ایک غریب والدین کا بچہ تھا۔ بڑا ہوکر گھر کی مدد معاش کے لئے لوہار کا کام سیکھ لیا اور برسوں ماں باپ کی خدمت کرتا رہا۔ اور اسی کے ساتھ ساتھ اُس نے اپنی تعلیم کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ اور محنت شاقہ کرکے وائنا اور لائیپزگ کی یونیورسٹیوں سے دستارِ فضیلت حاصل کرلی۔ جس کے بعد لوہاری کے پیشے سے اُس کی طبیعت خودبخود نفور ہوگئی۔ اور اُس نے مدرسی اختیار کی اور اس کے ساتھ مطالعہ کا سلسلہ بھی برابر جاری رکھا۔ حتیٰ کہ اس کے علم وفضل کی اِس قدر شہرت ہوئی کہ وہ انتیس سال کی عمر میں پریگ یونیورسٹی میں فلاسفی کا پروفیسر مقرر ہوگیا۔

اس کے بعد اس نے سیاسی میدان میں قدم رکھا۔ اور اسقدر ہر دلعزیزی حاصل کی۔ کہ پبلک پر اُس کی اصابت رائے کا سکہ جم گیا۔ چنانچہ ۱۸۹۱ء میں وہ آسٹریا کی پارلیمنٹ کا ممبر منتخب ہو گیا۔ اور ڈیڑھ سال تک اس کے فرائض انجام دیئے، اس کے بعد وہ ۱۹۰۷ء میں پھر ممبر منتخب ہوا چونکہ وہ فطرتاً آزاد اور صلح پسند واقع ہوا تھا۔ اس لئے جسطرح اُسے آسٹریا پر جرمنی کی دست درازی گوارا نہ تھی اسیطرح یہ بھی پسند نہ کرتا تھا کہ آسٹریا جزیرہ نمائے بلقان میں غاصبانہ پیشقدمی کرے تاہم ۱۹۰۸ء میں آسٹریا نے ٹرکی کے دو صوبے بوسنہ اور ہرزیگووینہ دبا لئے تھے۔

۱۹۱۴ء میں جنگ عظیم چھڑ گئی۔ جسمیں آسٹریا نے جرمنی کا ساتھ دیا۔ اور سرویہ پر حملہ کر دیا اُدھر اتحادیوں نے آسٹریا کے مختلف صوبوں میں مختلف قوموں کو بغاوت پر آمادہ کر دیا۔ انھیں دنوں میزاریک لندن کے کنگس کالج میں لکچرار تھا۔ مگر طلباء کو اپنے علم وفضل سے فائدہ پہونچانیکے ساتھ ساتھ وہ اپنے ملک میں تحریک آزادی کی بُنیاد ڈالنے کی بھی فکر کر رہا تھا۔ بہرحال اُس کی کوششوں کا یہ نتیجہ نکلا کہ آسٹریا کی زیک اور سلافی رعایا باغی ہو گئی، اور اُس نے چار لشکر بھرتی کرکے اتحادیوں کی طرف سے جنگ کی۔

میزاریک کے سوانح حیات پر روشنی ڈالنے سے پہلے یہاں پر جمہوریہ زیکوسلافیکیہ کا ایک مختصر بیان بھی بے موقعہ نہ ہوگا۔ زیکوسلافیکیہ وسطی یوروپ کی ایک جمہوری ریاست جنگ عظیم کے بعد ۱۹۱۸ء میں قایم ہوئی۔ اسمیں بوہیمیہ، موریویہ، سلیشیہ، سلافیکیہ اور روتھینیہ کے ملک شامل ہیں جو جنگ سے پہلے آسٹریا یا ہنگری کا جزو تھے۔ کل ریاست کا رقبہ چون ہزار دوسو سات مربع میل اور آبادی ایک کروڑ سینتالیس لاکھ، چھبیس ہزار ایکسو اٹھاون ہے۔ جسمیں تہتر لاکھ پینتالیس ہزار ایک سو سینتس زیکوسلاف، تیس لاکھ اٹھاسی ہزار پانسو تین جرمن، ایک لاکھ انیس ہزار چارسو انہتر ہنگاری، اسی ہزار ایک سو بیاسی پول اور چار لاکھ اٹھاون ہزار چورانوے روسی ہیں۔ ریاست کا دارالحکومت شہر پریگ ہے۔

۱۹۲۰ء کے آئین کی رو سے زیکوسلافیکیہ ایک ڈیماکریٹک جمہوریہ ہے۔ جس پر ایک پریسیڈنٹ حکومت کرتا ہے۔ جس کا انتخاب سات سال کے لئے ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ ڈیڑھ سو ممبروں کی ایک سینیٹ ہے جو ہر آٹھویں سال انتخاب کیجاتی ہے۔ اس کے بعد تین سو ممبروں کا ایک ایوان ہے جسمیں قوم کے نمائندہ ہوتے ہیں اور جن کا الکشن ہر چھٹے سال ہوتا ہے۔ رعایا کو تقریر، تحریر کی کامل آزادی حاصل ہے۔ سرکاری مذہب رومن کیتھولک عیسائی ہے۔ لیکن

قلیل تعداد میں پروٹسٹنٹ اور دیگر کلیساؤں کے پیرو بھی ہیں۔ چھ اور چودہ برس کے درمیان کی عمر والے بچوں کو جبریہ تعلیم دیجاتی ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ بجز سلافیکیہ کے جہاں اب بھی خال خال لوگ ناخواندہ پائے جاتے ہیں۔ عموماً ملک بھر میں ایک شخص بھی ناخواندہ نہیں رہا۔ اعلیٰ تعلیم کی یہ کیفیت ہے کہ اتنے چھوٹے سے ملک میں چار یونیورسٹیاں ہیں۔ شہر پراگ میں دو یونیورسٹیاں ہیں، جنمیں ایک یونیورسٹی تو براعظم یوروپ کی سب سے پرانی یونیورسٹی ہے کیونکہ یہ ۱۳۴۸ء میں قائم ہوئی تھی۔ اس سے زیادہ قدیم یونیورسٹی صرف انگلستان کی یونیورسٹیاں ہیں، کیونکہ آکسفورڈ یونیورسٹی ۱۲۵۳ء میں اور کیمبرج یونیورسٹی ۱۲۸۴ء میں قائم ہوئی تھیں۔ یونیورسٹیوں کے علاوہ ملک میں دو ٹکنیکل اسکول بھی ہیں جہاں نوجوانوں کو صنعت و حرفت سکھائی جاتی ہے۔

بوہیمیہ کے میدانی ملک کے علاوہ کوہستانی علاقہ بھی ہے۔ جسمیں جگہ جگہ سرسبز و شاداب وادیوں کی کثرت ہے۔ بڑے بڑے دریا ڈانیوب، وسچولا، آڈر اور ایلبہ ہیں۔ زراعت بہت کچھ نشوونما و ترقی یافتہ ہے۔ مختلف قسم کے میوے اور اناج پیدا ہوتے ہیں۔ ایک ثلث رقبہ جنگلات ہے۔ شکر کی پیداوار سب سے زیادہ ہے جو چقندر سے بنائی جاتی ہے۔ اسی وجہ سے تقریباً پانچ لاکھ ایکڑ اراضی میں چقندر کی کاشت ہوتی ہے۔ چقندر کے بعد "ہاپ" (Hops.) کا نمبر ہے۔ جو بیر شراب بنانے میں کام آتا ہے "پلسنر بیر" جو بہت مشہور ہے وہ اسی ملک میں بمقام پلسن بنائی جاتی ہے۔ صنعت و حرفت کی طرف بھی کافی توجہ ہے۔ چنانچہ ۱۹۳۰ء میں ملک کے اندر بارہ ہزار تینتیس کارخانے تھے۔ رسلسلہ آمد و رفت بھی کافی ترقی یافتہ ہے۔ نو ہزار میل ریلوے لائینیں اور پچاس ہزار میل سڑکیں ہیں۔ دریائے ڈانیوب اور آڈر میں کشتیوں کے ذریعہ سے بھی مال کی آمد و رفت ہوتی ہے۔ سکہ کا نام "کورونا" یا کراؤن ہے۔

زیک قوم زیادہ تر بوہیمیہ میں آباد ہے۔ جہاں وہ مشرق کی طرف سے ہجرت کرکے آئے تھے۔ اُن کی بولی بھی بہت پرانی اور ترقی یافتہ ہے۔ اُن کے ابجد میں بیالیس حروف مختلف آوازوں کے لئے ہوتے ہیں۔

۱۹۱۸ء میں جنگ عظیم کے بعد ملک کو آزادی نصیب ہوئی اور زیکوسلافیکیہ کے نام سے ایک ڈیموکریٹک جمہوریت قائم کی گئی۔ جس کا پہلا پریسیڈنٹ میزاریک منتخب ہوا۔ ۱۹۲۷ء میں بھی ملک نے اُسی کو پریسیڈنٹ منتخب کیا۔ لیکن آپ کی عمر اسی سال کی ہوگئی تھی۔ اس لئے جب پیرانہ سالی کیوجہ سے صدارت کا کام بوجہ احسن نہ ہوسکا تو آپ نے ۱۹۳۵ء میں استعفا

دیدیا۔ اور آپ کی جگہ ڈاکٹر بینیس (Benes) پریسیڈنٹ منتخب ہوئے۔ میزاریک نے ۱۴ ستمبر ۱۹۳۷ء کو ستاسی سال کی عمر میں انتقال کیا۔

ترکوں نے مصطفیٰ کمال پاشا کو "اتاترک" یعنی "قوم کا باپ" خطاب دیا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ یوروپ میں کوئی شخص اپنی قومی خدمت اور عمر کی بزرگی کے لحاظ سے میزاریک سے زیادہ اس معزز خطاب کا مستحق نہیں ہے۔ یورپ والے ڈاکٹر میزاریک کو "پیر بزرگ" یعنی گرانڈ اولڈمین آف یوروپ" کہا کرتے تھے۔ اور واقعی جنگ عظیم کے بعد کے یوروپین مدبروں میں میزاریک سب سے بڑا، سب سے دانشمند اور سب سے اچھا آدمی تھا۔ زیکوسلانیکیہ کی خوش نصیبی سے قدرت نے میزاریک کو اچھی خاصی طویل عمر عطا کی، تقریباً سترہ برس تک اس کی عنانِ حکومت میزاریک ہی کے ہاتھوں میں رہی۔ میزاریک کو اپنا دست راست بھی ایک بیظیر شخص ڈاکٹر بینیس مل گیا تھا۔ جو پہلے میزاریک کا وزیر اعظم اور اُس کے بعد اُس کا جانشین ہوا۔ میزاریک نے جسقدر خدمت اپنے ملک کی اِس قلیل مدّت میں کی ہے، اتنی شاید ہی کسی قومی لیڈر نے کی ہو۔

پریگ کے میوزیم میں ڈاکٹر میزاریک کیلئے ایک خاص شعبہ مقرر کیا گیا ہے جسمیں ڈاکٹر میزاریک کے متعلق تمام قوموں کے اخباروں اور مصنفوں کی تحریریں رکھی گئی ہیں۔ اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ مادرِ گیتی ایسے جان نثار اور دانشمند لوگ شاذ و نادر ہی پیدا کرتی ہے۔ اِن اقتباسات میں سے چند کا خلاصہ نذر ناظرین کیا جاتا ہے۔ جس سے ناظرین کو ڈاکٹر میزاریک کی صحیح قدر و قیمت کا اندازہ ہوسکیگا۔

مسٹر وکہم اسٹیڈ[1] نے اپنی مشہور کتاب "گذشتہ تیس سال"[2] میں میزاریک کی نسبت لکھا ہے کہ موراویہ کا یہ سلافی پریگ کی زیک یونیورسٹی کا محترم ترین فلاسفر ہے۔ سیاسی عقیدہ کے لحاظ سے لبرل اور ڈیموکریٹ ہے، وہ طبعاً چپ چاپ واقع ہوا ہے اور خود کو بہت کچھ لئے دیئے رہتا ہے مزاج میں انکسار ہے، ظاہر و باطن ایک ہے، تمام زندگی ایمانداری و دیانتداری سے بسر کی"۔

امیل لڈویگ[3] مشہور سوانح نگار نے اپنی کتاب "یوروپ کے لیڈر" میں لکھا ہے کہ:-

"میزاریک مذہبی آدمی ہے۔ لیکن کسی بات پر فوراً ہی ایمان نہیں لے آتا۔ کیونکہ اس کی طبیعت نکتہ چین واقع ہوئی ہے۔ اور وہ کسی روایتی بات کو چھان بین کئے بغیر کبھی قبول نہیں کرتا۔ وہ خدا اور قانون پر کامل ایمان رکھتا ہے"۔

---

1. Wickham Steed. 2. Through Thirty Years. 3. Emil Ludwig.

میزاریک خود ایک زبردست فلسفی اور حکیم افلاطون یونانی کا پیرو تھا۔ اُسکی طبیعت اعتدال پسند واقع ہوئی تھی۔ اور وہ کسی پارٹی کی بیجا طرفداری یا اس کی ذلت آمیز خوشامد نہیں کرتا تھا۔ وہ ایک صاحب شعور اور نہایت جری آدمی تھا۔ اُس کی بعض باتیں معمّہ معلوم ہوتی تھیں۔ مثلاً جب وہ آزادی زیکوسلافیکیہ کی تحریک میں شریک ہوا تو اُس پارٹی میں شامل ہوا، جو مرضی عوام کی مخالف تھی۔

میزاریک کو پروپیگنڈا میں بھی کمال حاصل تھا۔ چنانچہ اُس نے پروپیگنڈا کے مندرجہ ذیل اصول قائم کئے تھے:۔

۱۔ آسٹریا کے جرمن باشندوں کے خلاف کوئی بہتان نہ تراشو۔

۲۔ دشمن کو کبھی حقیر و بیچارہ نہ سمجھو۔

۳۔ واقعات کو کبھی توڑ مروڑ کر یا مبالغہ کے ساتھ نہ بیان کرو۔

۴۔ ایسا وعدہ نہ کرو جو پورا نہ ہو سکے۔

۵۔ اتحادی مدبرین کے سامنے منت وسماجت کرنے نہ جاؤ۔

۶۔ ذاتی غرض اور اپنی شخصیت کو پس پُشت ڈال کر دلائل سے کام لو۔

۷۔ بارِ شاطر بنو نہ کہ بارِ خاطر۔

۸۔ اپنی قوم کے سوا کسی دوسرے سے روپیہ نہ لو، خواہ وہ کتنی دریا دلی سے دے

۹۔ مبالغہ سے کبھی کام نہ لو۔

۱۰۔ جن لوگوں کو ہم سے براہِ راست تعلق نہیں ہے اُن کو بھی اپنے حامی بنانیکی کوشش کرو۔

میزاریک کے عادات وخصائل پر بحث کرتے ہوئے، مسٹر ایمل لڈویگ لکھتے ہیں کہ وہ سادگی کا مجسمہ تھا۔ اور ایسا قدرتی چشمہ تھا جس پر دوہری محرابیں ہوں۔ چشمہ خود مستور ہے لیکن اس تک پہونچنے کے ہر طرف دروازے کھلے ہوئے ہیں۔ جو شخص وہاں رہتا ہے، اُس کے سامنے ہر طرف کا میدان کھلا ہوا ہے اور وہ اس چشمہ کی حفاظت کرتا ہے، وہ چشمہ کیا ہے؟ وہ میزاریک کا مذہب ہے یعنی وہ رشتہ جو انسان کو خدا، قدرت اور کارکنانِ قضا و قدر سے وابستہ کرتا ہے۔ وہ جبر کا معتقد ہے لیکن اختیار کا قائل ہے۔ اور اسی جذبۂ عظیم سے اس کے خیالات، کردار اور ہمدردی کی نشوونما ہوئی ہے۔

میزاریک کے نزدیک ڈیموکریسی کے عملی معنی اپنے ہمسایہ سے محبت کرنا تھے، مگر اُسے اُمرا

کے طبقے سے بھی عناد نہ تھا۔ اُس کے نزدیک امارت ایک امر قدرتی ہے ۔ وہ سوشلزم کا بھی قائل تھا مگر کیسی سوشلزم؟ اس کا جواب وہ خود دیتا ہے کہ "میرے نزدیک سوشلزم بنی نوع اِنسان سے محبت کرنا ہے، اِس لئے میری رائے میں سوشلزم کا یہ مقصد ہونا چاہیئے کہ اس سے کام لے کر انسان کی حالت بہتر بنائی جائے"۔

میزاریک کی سب سے بڑی خصوصیت اس کی انسانی حمیت تھی لیکن حمیت ہمیشہ واقعات سے متوازن ہوتی تھی۔ اور کبھی معقولیت کے خلاف نہ ہوتی تھی۔ حب جاہ اور نخوت ان دونوں جذبات سے وہ ہمیشہ دور رہتا تھا۔ کیونکہ وہ خوب جانتا تھا کہ ان دونوں کی بدولت بہت سے آدمیوں کی زندگیاں تباہ ہو گئی ہیں۔

جذباتِ نشتر

(از حضرت نشتر سندیلوی ضلع ہردوئی)

نشتر نہ کر اس کا غم کیا تیرا فسانا ہے | مُنھ اپنا۔ زبان اپنی۔ دُنیا ہے زمانا ہے
دِل ہے تو محبت کا ہر ناز اُٹھانا ہے | سو بار جو وہ روٹھیں سو بار منانا ہے
آغازِ محبّت کا انجام دکھانا ہے | اک بار ہمیں اُن کے پھر سامنے جانا ہے
بے سُود محبت میں سمجھانا بُجھانا ہے | دِل ایک ہی کافر ہے مانے گا نہ مانا ہے
مشتاقِ نظر دِل تھا آنکھیں وہ چراتے کیا | کیوں تیر ہو ترکش میں جب دِل پہ نشانا ہے
کہتی ہے یہ ہر گُل کی مُرجھائی ہوئی صورت | جس خاک سے اُبھرے ہیں اُس خاک میں جانا ہے
روئی ہوئی آنکھوں سے عالم پہ نظر کرنا | برسے ہوئے بادل سے بجلی کا گرانا ہے
ہے وقت بہت نازک اے موت نہ کر جلدی | اُلجھے ہوئے دامن کو کانٹوں سے چھڑانا ہے

رونا ہے جو اے نشتر دِل کھول کے اب رولے
سوتی ہوئی دُنیا ہے غفلت میں زمانا ہے

ہندوستان

ایک مصری کی نظر میں

از حضرت مولانا خیر بہوروی صاحب ایڈیٹر "حکمت" گورکھپور

"تاج ہوٹل" بمبئی میں ایک مصری نوجوان
خندہ زن تھا تجھ پر اے "پیر کہن ہندوستان"!

کہہ رہا تھا ملک کیا ہے جاہلوں کا ہے مزار
بے حسوں، فرقہ پرستوں، مفلسوں کا تاجدار

ہے جہاں "تاج غلامی" باعثِ صد افتخار
ہے جہاں فرزانگی دیوانگی سے ہمکنار

ہے تعصب جس جگہ "ہندو" "مسلماں" کا شعار
ہے جہاں فرقہ پرستی کی "خزاں" پرور "بہار"

"چائے" بھی ہندو جہاں "پانی" بھی ہندو ہے جہاں
ہندو و مسلم جہاں کے ہیں زمین و آسماں

خون پانی سے بھی سستا ہے جہاں مزدور کا
نام بھی لیتا نہیں کوئی جہاں مجبور کا

مانگتی ہیں بھیک سڑکوں پر جہاں کی لڑکیاں
جس چمن میں پھول کھاتے ہیں "خزاں" کی جھڑکیاں

بھوک سے بیتاب ہو کر قوم کے بچے جہاں
موت کی آغوش میں لیتے ہیں اکثر ہچکیاں

کوئی قانون اور نہ آئینِ حکومت ہے جہاں
ہے اگر کچھ تو فرنگی حکمرانوں کی زبان

طفلِ آزادی کے ڈر سے بھاگتے ہیں نوجوان
زینتِ سرمایہ داری ہے جہاں خونِ کسان

کوئی لیتا ہے اگر بھولے سے آزادی کا نام
صبح سے پہلے ہی آجاتی ہے اس کے غم کی شام

کبتک اے ہندوستاں؟ اے مالکِ گنگ و جمن؟
"دیوتاؤں کے چمن"؟ اے بوستانِ علم و فن

کبتک اے ارجن کے مسکن؟ اے مرے پیارے وطن؟
ہم یہ غیروں کے سنیں گے طعنہ ہائے دلشکن؟

آج وہ ہنستے ہیں تجھ پر تھے جو کل تک خود غلام
شرم سے تاریخ بھی لیتی نہیں تھی جن کے نام

تیری غیرت کیا ہوئی؟ تیری حمیت کیا ہوئی؟
تیری عزت کیا ہوئی؟ تیری شرافت کیا ہوئی؟

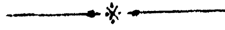
تیری جرات کیا ہوئی؟ تیری شجاعت کیا ہوئی؟ تیری "قوت" کیا ہوئی؟ تیری "حکمت" کیا ہوئی؟
تیرا "اکبر" کیا ہوا؟ اور تیرا رانا کیا ہوا؟ تیرے فرزندوں کا وہ اگلا زمانہ کیا ہوا؟
کیوں تیری "غیرت" میں جوشِ انقلاب آتا نہیں؟
"خونِ بجلی" بن کے رگ رگ میں سماجاتا نہیں؟
تجھکو "ارجن" کی قسم! ارجن کے بانوں کی قسم!! اونچی اونچی چوٹیوں والے پہاڑوں کی قسم!
"ابھمنو" کی قسم! اس کی جوانی کی قسم!! تجھکو گنگا کی قسم، اس کی روانی کی قسم!
انقلابی کروٹیں لے خواب سے بیدار ہو!
سرفروشی، جاں نثاری کے لئے تیار ہو!
تیرے فرزندوں کا خونِ گرم وسوز اضطراب
لے چکا ہے کروٹیں اب چاہتا ہے انقلاب

جوانی

از مسٹر مصطفےٰ حسین ناظر رامپوری

ہیں کتنے جوانی کے یہ دلچسپ نظارے پیغام جنوں دیتے ہیں ہنستے ہوئے تارے
بیٹھا ہوں لئے سینے میں جذبات کا محشر ہر صبح نظر آتا ہے فردوس کا منظر
انجام سے غافل ہوں میں انجام سے غافل
سنتا ہوں میں تاروں سے محبت کے فسانے کس طرح ہیں پرکیف جوانی کے ترانے
گویا کہ ہیں مسحور یہ دریا کے کنارے ہیں چاند کے کس درجہ دل آویز اشارے
اب مجھکو خبر کچھ نہیں آلام جہاں کی
اک سکر سا برساتی ہیں گھنگھور گھٹائیں معمور نظر آتی ہیں نزہت سے فضائیں
کہتا ہے ہر اک ذرہ محبت کی کہانی ہر چیز میں نغمہ ہے ہر اک شے میں جوانی
اک خواب سی ہے شورشِ ہنگامۂ ہستی
ہر چیز سے ہے رنگ جوانی کا نمایاں پانی کی روانی میں ہے اک کیف پرافشاں
جو نقش نظر آتا ہے ہوتا ہے گہر بار جو منظر ہستی ہے جوانی سے ہے سرشار
اللہ رے جوانی کا یہ رنگ طرب انگیز

سر راس مسعود مرحوم



از مولانا نظامی بدایونی ایڈیٹر ذوالقرنین بدایوں

۳۰ جولائی ۱۹۳۶ء کو جب ہندوستان کے اس نامور سپوت نے ہمیشہ کے لئے بزم ہستی کو الوداع کہا آج کئی مہینے ہو چکے ہیں اس دوران میں اس حادثہ جانکاہ پر ملک کے اخبارات و رسایل نے اپنے اپنے طریقے پر نظم اور نثر میں اظہار غم و افسوس کیا اور مرحوم کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر نظر ڈالی۔ میں نے بھی ۸ اگست کے ذوالقرنین میں اس واقعہ پر اپنے جذبات غم کا اظہار کر کے اپنے صحافتی فرض سے سبکدوشی حاصل کی تھی۔ ستمبر کے آخری ہفتے میں کانپور جانے کا اتفاق ہوا اور محترم دوست منشی دیانراین نگم ایڈیٹر زمانہ سے ملاقات ہوئی۔ موصوف نے فرمایش کی کہ زمانہ کے لئے میں راس مسعود مرحوم کے متعلق ایک مضمون لکھوں جسمیں خصوصیت سے اُردو ادب کے ساتھ انکی دلچسپیوں کا ذکر ہو۔ میرے دوست کی یہ فرمایش غالباً میرے ان تعلقات کی بنا پر تھی جو اُردو ادب کے ذوق کے سلسلہ میں میرے اور مرحوم کے درمیان عرصے سے قایم تھے۔ اسلئے مجھے کچھ عذر کرتے نہ بن پڑا اور میں نے زمانہ کی اس ادبی خدمت کا وعدہ کر لیا۔

میں اس مضمون میں مرحوم کے سوانح تفصیلی طور پر لکھنے کی ضرورت نہیں سمجھتا لیکن سب سے پہلے یہ ضرور بتانا چاہتا ہوں کہ انکے اسم گرامی کی (جو انگریزی اور اسلامی لفظوں کا مجموعہ ہے) وجہ تسمیہ کیا تھی۔ آج سے ۴۴ برس پہلے جب میں سب سے پہلی مرتبہ آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس میں جو ۱۸۹۳ء میں بمقام علی گڑھ منعقد ہوا تھا شریک ہوا تو اس معمہ کا حل مجھے معلوم ہوا تھا اسی موقع پر سید راس مسعود مرحوم کی تقریب بسم اللہ خوانی بھی تھی۔ اسوقت انکی عمر چار برس سے کچھ ماہ زائد تھی مجھے کل کی سی بات معلوم ہوتی ہے کہ مرحوم اپنے دادا کے دوست راجہ جیکشن داس مرادآبادی آنجہانی کی گود میں بیٹھے تھے۔ اسوقت سید مرحوم نے ایک تقریر میں اپنے پیارے پوتے کے نام کی تصریح میں فرمایا کہ "سید محمود اور مسٹر راس (یہ انگریز بیرسٹر تھے اور زمانہ قیام انگلستان سے سید محمود سے انکی دوستی ہو گئی تھی) سے نہایت دوستی اور عزیزانہ محبت ہے۔ جب سید مسعود پیدا ہوا تو مسٹر راس اور انکی میم صاحبہ نے انگریزی رسم کے موافق جو دلی محبت پر دلالت کرتی ہے اپنا نام اس مولود مسعود کو دیا اور ہم نے نہایت خوشی سے ان کا نام اس کے نام کیساتھ شامل کیا اور اسی سبب سے اس کا نام سید راس مسعود قرار پایا"۔

سید راس مسعود کا نام اسدرجہ مقبول ہوا کہ لفظ راس کی انگریزیت جاتی رہی اور لوگ اسکو راست کا

مخفف سمجھ کر نام کا فارسی جزو سمجھنے لگے۔ مرحوم اپنے اُردو دستخطوں میں بھی راس کے تس کو اس شکل سے (راس مسعود)
مسعود میں شامل کر لیتے تھے اور اس طرح ہر وقت اپنے باپ کے محترم دوست کی یگانگت کی یاد تازہ رکھتے تھے سنہ ۱۸۹۸ء میں
سرسید مرحوم نے جب سفر آخرت اختیار کیا تو راس مسعود مرحوم کی عمر تقریباً دس برس کی تھی سنہ ۱۹۰۷ء میں اُن کے
والد ماجد کا سایہ بھی سر سے اُٹھ گیا۔ ابتدائی تعلیم انٹرنس تک علی گڑھ کالج میں حاصل کر کے ولایت گئے اور آکسفوڈ
یونیورسٹی سے بی۔ اے آنرز کا امتحان پاس کیا اور بیرسٹری کی سند حاصل کی۔ ہندوستان میں بھی آپ کی
تعلیم و تربیت مسٹر ماریسن کے گھر میں ہوئی تھی۔ اسلئے ان کی معاشرت اور روزانہ زندگی بالکل انگریزی تھی لیکن
دل میں وہ اپنے ملک اور قوم کا درد رکھتے تھے۔ مشرقی روایات بالخصوص ہندوستانی زبان کو بہت عزیز رکھتے تھے
جس کا عملی ثبوت اُنھوں نے حیدرآباد پہونچکر جامعۂ عثمانیہ کے نظام میں اُردو کو ذریعۂ تعلیم قرار دینے کی اسکیم
مرتب کرنے کے وقت دیا۔ اُردو ادب سے ان کے ذوق کا پتہ اسوقت چلا جبکہ ولایت سے آئے ہوئے انھیں
ایک سال گزرا تھا اور دلی میں ایک یوروپین دوست اُن کے مہمان تھے جن کو دینے کے لئے سب سے
بڑے شاعر مرزا غالبؔ کے دیوان کے بہترین نسخے کی تلاش ہوئی۔ جس کے لئے انھوں نے دلی جیسے شہر کے
کتب فروشوں کی دکانیں چھان ڈالیں لیکن کوئی نسخہ اچھے کاغذ اور خوشنما چھپائی کا نہ ملا۔ بالآخر انھوں نے
منشی رحمت اللہ رعدؔ مرحوم مالک نامی پریس کانپور کو جن کے پریس سے مسدس حالی۔ دیوان حافظ مثنوی مولانا روم
جیسی مشہور کتابوں کے خاص اڈیشن شایع ہو چکے تھے لکھا کہ وہ دیوان غالبؔ کا صحیح نسخہ بہم پہونچا کر ایک خاص
اڈیشن چھاپیں۔ منشی صاحب مرحوم نے یہ خدمت نظامی پریس بدایوں کو تفویض کی اور میں نے جنوری سنہ ۱۹۱۵ء
میں مسعود مرحوم کی خواہش کے مطابق دیوان غالب کا صحیح نسخہ چند پُرانے نسخوں کو پیش نظر رکھکر ترتیب دیا جس کا
خوشنما اڈیشن ۱۷/۸ × ۲۷ کی تقطیع پر شایع ہوا۔ اس سے پہلے دیوان اور اردو کی اکثر کتابیں ۲۰/۸ × ۲۶
سائز میں طبع ہوتی تھیں۔ دیوان غالب کے اس اڈیشن کی یہ جدید تقطیع بعد میں ایسی مقبول ہوئی کہ ڈاکٹر
سر اقبال کی بانگِ درا اور دیگر شعرا کی تصانیف اسی تقطیع پر شائع ہوئیں۔ دیوان غالب کا یہ اڈیشن حامل شرح
نہ تھا لیکن اشارات املائی سے مزین ہونے کے سبب مشکل اشعار کے معنی خود بخود سمجھ میں آجاتے تھے۔ میری
اس سعی کو مرحوم نے پسند کیا اور عام تعلیم یافتہ طبقے میں بھی اسکو پسند کیا گیا اور ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ دیوان غالب
کی ترتیب طباعت کی اس خدمت نے مرحوم کے دل میں میری ایسی جگہ پیدا کر دی کہ جب وہ پٹنہ اور
کٹک سے علیگڑھ تشریف لاتے تو مجھے ضرور یاد فرماتے۔ سنہ ۱۹۱۶ء میں وہ ریونشا کالج کٹک کی پروفیسری سے
سرکار نظام کی نظامت تعلیم کے عہدہ پر حیدرآباد گئے۔ سنہ ۱۹۲۸ء تک وہاں رہے۔ اس بارہ سال کے
عرصے میں اُن کا یہ معمول رہا کہ وہ سال میں ایک مرتبہ مجھے حیدرآباد بلاتے اور کئی کئی ہفتے مہمان رکھتے۔

سرکاری کام سے جو وقت بچتا شعر و سخن کی دلچسپیوں میں صرف ہوتا۔ بلامبالغہ اکثر اُردو اساتذہ
کے چوٹی کے اشعار اُن کو برزبان تھے۔ مثنوی زہر عشق کا وہ حصہ جس میں دنیا کی بے ثباتی کا نقشہ
کھینچا گیا ہے اکثر پڑھتے۔ مسدس حالی کے خاص خاص بند تو اس لہجے میں پڑھتے تھے کہ سننے والے
کا دل بھر آتا تھا برسبیل تذکرہ میں نے ایک ملاقات میں کہا کہ آپ کو جو کلام یاد ہے اس سے ظاہر ہوتا
ہے کہ آپ کا انتخاب اعلیٰ درجہ کا انتخاب ہے اگر اس کو قلمبند کرلیا جائے تو اُردو اشعار کا ایک اچھا
مجموعہ تیار ہو جائے۔ پہلے تو اس درخواست کو منکسر ٹال دیا بعدہٗ میرے اصرار پر راضی ہو گئے۔ اور
فرمایا کہ مستند اساتذہ کے دیوان جمع کرو تاکہ ان کا انتخاب کرسکوں۔ چنانچہ کتب خانہ آصفیہ سے دیوان
منگوائے جاتے تھے اور جس غزل کو فرماتے میں انکو سناتا وہ اشعار منتخب کرکے ان پر نشان بنوا دیتے
تھے۔ اس طرح ایک مہینے کے اندر ایک مجموعہ تیار ہوگیا۔ جس کو انتخاب زرین کے نام سے نظامی پریس
نے اگست ۱۹۲۱ء میں میں نے چھاپا۔ اس کے بعد سے اب تک اس کے تین ایڈیشن چھپ چکے ہیں
سب سے آخری ایڈیشن مرحوم کے انتقال سے چند روز قبل تیار ہو گیا تھا۔ یکم اگست کو اس کا پیکٹ ان کے
پاس بھیجنے کا ارادہ تھا کہ ان کے انتقال کی خبر آگئی!

انتخاب زرین کے علاوہ سر سیّد کے خطوط جمع کرنے کا خیال بھی سب سے پہلے انھیں کو پیدا ہوا جس نے
۱۹۲۲ء میں عملی صورت اختیار کی اس مجموعہ خطوط کا مقدمہ مولوی عبداللہ جان مرحوم نے جو سر سیّد کے
دوستوں میں اس وقت باقی تھے لکھا تھا۔ مولوی صاحب مرحوم نے اپنے مقدمے میں بالکل صحیح فرمایا ہے
کہ اگر سر سیّد کا یہ رشید پوتہ ان کے مکتوبات کی فراہمی کا انتظام اپنے ذمہ نہ لیتا تو دنیا اس بڑے شخص کی
خاص صنفِ تحریر کے افادہ سے ہمیشہ کے لئے محروم رہ جاتی۔

اُردو ادب کی جو خدمت راس مسعود کے ہاتھوں انجام پذیر ہوئی یہیں تک محدود نہ تھی۔ میر درد
کے جواہر ریزے جو ان کے مختصر دیوان میں ملتے ہیں انھیں کی تحریک سے نواب صدر یار جنگ کے عالمانہ
مقدمے کے ساتھ نظامی پریس کے ذریعہ سے اُردو ادب کے شائقین کے ہاتھوں تک پہونچے۔ میر انیس کے
کلام کی تدوین و تصحیح انھیں کی ارشاد کی تعمیل میں مولانا علی حیدر طباطبائی نے کی جسکو نظامی پریس بدایوں
نے تین جلدوں میں نہایت اہتمام سے چھاپا۔ اُردو ادب کی خدمت کا یہ سلسلہ اور شعر و سخن کیساتھ انکا ذوق
و شوق حیدر آباد کے زمانۂ قیام میں برابر جاری رہا۔ اسی دوران میں گارسن دتاسی مشہور فرانسیسی مستشرق کے
خطبات کا فرانسیسی زبان سے اُردو میں ترجمہ کیا لیکن اپنی مصروفیت کی وجہ سے اس کو پورا نہ کرسکے اور اس کی
تکمیل و اشاعت انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد نے کی۔ اسیطرح آپ انجمن ترقی اُردو کو اپنی قابلیت اور علم و فضل

سے ہمیشہ فائدہ پہونچاتے رہے۔ اس کے صدر رہے۔ جب وہاں کے کام سے سبکدوش ہوکر سید مسعود نے رحمت اللہ کمیشن کے فیصلے کے بعد اکتوبر ۱۹۲۹ء میں مسلم یونیورسٹی علیگڑھ کے انتظام کا بار اپنے کندھوں پر لیا۔ تو وہاں کے حالات کی نزاکت نے ان کو ہمہ تن یونیورسٹی کی کھوئی ہوئی شہرت کو واپس لانے کی تدابیر میں ایسا منہمک کیا کہ ان کو اپنی تندرستی کی بھی خبر نہ رہی۔ لیکن اس عدیم الفرصتی کے زمانہ میں بھی انھیں اُردو ادب کا ذوق باقی رہا۔ ان کے عہد وایس چانسلری میں انجمن حدیقۃ الشعرا کے جو مشاعرے یونیورسٹی میں ہوئے ان میں شرکت فرماتے تھے۔ مارچ ۱۹۳۱ء میں جو مشاعرہ ہوا تھا اس میں بحیثیت صدر آپنے فرمایا کہ آئندہ مشاعرہ انشاءاللہ اس پیمانہ پر منعقد ہوگا جو شاہی مشاعروں کے بعد خود ہی اپنی مثال ہو۔ یہ مشاعرہ کرسیوں کی بجائے فرش پر ہوگا جیمیں سب شعرا اور حاضرین دیسی وضع میں شریک ہونگے اور اس کے ساتھ مزاحاً فرمایا کہ سوائے میرے (حالانکہ ایسے ادبی جلسوں میں وہ ہمیشہ ہندوستانی وضع میں شریک ہوتے تھے) وایس چانسلری علی گڑھ ہی کے زمانے میں آپ نے کانپور کی طرف سے حلیم مسلم ہائی اسکول میں منعقد ہوا تھا۔

مسلم یونیورسٹی کی محبت آپ کے قلب میں ایسی جاگزیں تھی کہ وہ اسمیں کسی قسم کا نقص دیکھنا گوارا نہیں کرسکتے تھے۔ جس وقت انھوں نے اس کا جائزہ لیا تو اسکی مالی حالت خراب تھی اور یونیورسٹی اپنی تعلیمی ساکھ بھی کھو چکی تھی۔ آپنے اپنی پہلی تقریر میں جو جائزہ لینے کے دوسرے ہی دن طالبعلموں سے مخاطب ہوکر کی تھی فرمایا تھا۔

> "یہ زمانہ جد وجہد اور مقابلے کا زمانہ ہے۔ صرف وہی قوم زندہ رہ سکتی ہے جو سب سے زیادہ متحدہ طاقت اور سعی سے کام لیگی۔ لازم ہے کہ ہماری یونیورسٹی اپنے ملک کے سامنے اتحاد کی ایک عظیم الشان مثال پیش کرے۔ ہمیں چاہیئے کہ کم از کم یونیورسٹی کی چار دیواری کے اندر تو ان اختلافات اور منافرت کے جذبات کو فنا کردیں جو ہماری مادر درسگاہ کو شدید نقصان پہونچا رہے ہیں۔ یاد رکھنا چاہیئے کہ نفرت اور عدم رواداری کی بنیاد پر کوئی پائیدار عمارت نہیں رہ سکتی۔ ایک لحاظ سے ایک حقیقی یونیورسٹی مختصر ہونی چاہیے لیکن دوسرے لحاظ سے اسے فیلفس ہال بننا چاہیئے جو سب کے ساتھ بحیثیت طالبعلم یا بحیثیت ملازمین اس میں آئیں بلا لحاظ قوم ونسل مذہب محبت کرے۔ اگر خدا نخواستہ ہم اپنی یونیورسٹی کو ایسا بنانے میں کامیاب نہ ہوئے تو ہمارا کوئی حق نہیں کہ ہندوستان کے قابل احترام فرزند کی حیثیت سے زندہ رہیں۔ اور اس ہولناک انجام کی ذمہ داری ہمارے اوپر عاید ہوگی۔ میری آرزو ہے کہ ہم اپنے آپ کو ایک بلند ترین۔ مہذب ترین اور اعلیٰ ترین تعلیمیافتہ اصحاب کی ایک ایسی متحدہ فوج بنائیں جسے ہمارا ملک ان تمام خرابیوں کے دور کرنے میں استعمال کرے جسکی وجہ سے وہ دنیا کے سامنے موجب ملامت بنا ہوا ہے اور یہ مقصد اسی وقت حاصل ہو سکتا ہے جب ہم ان تمام قوتوں کو جو خدا نے ہمیں

دی ہیں کامل طور پر استعمال کریں۔ میں چاہتا ہوں کہ اس یونیورسٹی کے نوجوان طلبہ تمام دنیا میں بہترین انسان بن جائیں۔ اور کام میں۔ کھیلوں میں۔ اخلاق میں۔ راستبازی میں سب میں بہترین کہلائیں"

اس تقریر میں اگرچہ سب کچھ مسلم یونیورسٹی کے متعلق کہا گیا ہے اور اسی کے فرزندوں کو مخاطب کیا گیا ہے لیکن غور سے دیکھا جائے تو اس کے الفاظ میں انکے سیاسی عقیدے کی بھی جھلک نظر آتی ہے۔ وہ نوجوان طلبہ کو زیادہ متحد زیادہ جفاکش اور ملک کا خدمتگزار اور زیادہ زندہ دل دیکھنا چاہتے تھے۔ یہ کیوں۔ صرف اسلئے کہ وہ سمجھتے تھے کہ ہندوستان کی سیاسی ترقی کا راز نوجوانوں کی قوت بازو میں پوشیدہ ہے۔ وہ نوجوانوں کو سیاسی اور ملکی ترقی کے میدان سے علیحدہ رکھنے کے مخالف تھے۔ انھوں نے اسی تقریر میں فرمایا تھا "مجھے ہمیشہ ان لوگوں کے حالات پر افسوس رہا ہے جو نوجوان طلبہ کو آئندہ توقعات کے خوابوں سے روکتے ہیں۔ یہ لوگ نہیں جانتے کہ ان خوابوں کو حصول ترقی کے میدان میں کسقدر اہمیت حاصل ہے"۔ اپنے اسی خیال کی بنا پر وہ طالبعلموں کو ہندوستان کے کسی سیاسی لیڈر کی تقریریں سننے اور خیالات معلوم کرنے سے روکنا نہیں چاہتے تھے۔ ان کے عہد وایس چانسلری میں یونیورسٹی میں مہاتما گاندھی بھی آئے۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے بھی تقریر کی۔ انکی اس تمنا کا کہ مسلم یونیورسٹی کے طلبہ وسیع الخیال اور دوسری قوموں کے ساتھ رواداری برتنے والے ہوں اچھا اثر پڑا۔ اور طلبہ کی قابلیت کے لحاظ سے یونیورسٹی کا جو معیار گر گیا تھا واپس آ گیا۔ مالی حالت کی ترقی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ آپکو اس مختصر عہد میں چالیس لاکھ روپیہ چندہ ملا جسمیں سے دس لاکھ کی رقم حیدرآباد کے ایک چکر میں حاصل ہوئی تھی۔ ہمیں یاد ہے کہ آج سے تقریباً چالیس برس قبل مسٹر بیک نے جو علیگڑھ کالج کے پہلے پرنسپل تھے سرسید کے انتقال کے بعد کالج کو یونیورسٹی بنانے کی تمنا کا اظہار کرتے ہوئے یہ فرمایا تھا کہ میں تمام دنیا کا چکر لگاؤنگا اور اس درسگاہ کیلئے دس لاکھ روپیہ جمع کرونگا۔ لیکن انکی زندگی میں انکا یہ خواب پورا نہ ہوا۔ سر راس مسعود نے تمام دنیا میں پھر کر نہیں۔ تمام ملک سے نہیں بلکہ صرف دکن کے ایک سفر میں دس لاکھ کی رقم فراہم کر کے دکھا دی۔

نہایت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ مرحوم اپنی محبوب ترین یونیورسٹی کی وایس چانسلری کی پہلی پنج سالہ ٹرم بھی پوری نہ کر سکے اور قبل از وقت اس منصب سے دستکش ہو کر بھوپال چلے گئے۔ اسلئے ان کی بہت سی اسکیمیں جو اس یونیورسٹی کو ایک نمونہ کی یونیورسٹی بنانے کیلئے ان کے پیش نظر تھیں نا تمام رہ گئیں۔ انھیں یونیورسٹی سے قبل از وقت کیوں علیحدہ ہونا پڑا۔ یہ ایک ایسا سوال ہے جس کا مفصل جواب ہم اس مضمون میں دے کر علی گڑھ کی مختلف پارٹیوں کے اختلافات کی یاد کو تازہ کرنا نہیں چاہتے اور نہایت افسوس کیساتھ صرف یہ کہکر اس مضمون کو ختم کرتے ہیں کہ مرحوم کی یہ آرزو کہ کم از کم یونیورسٹی کی چار دیواری کے اندر تو ان اختلافات اور منافرت کے جذبات کو جو اسکو شدید نقصان پہونچا رہے ہیں فنا کر دیا جائے" پوری نہ ہوئی۔ بعض محبان علی گڑھ اور بزرگان قوم کی یہ تمنا تھی کہ اگر تب انکو پھر علیگڑھ لایا جائے تاکہ یونیورسٹی کو بام عروج پر پہونچانے کی اسکیمیں جو ان کے پیش نظر تھیں پوری ہو سکیں لیکن افسوس کہ فرشتہ اجل نے اسقدر عجلت کی اور مرحوم کو اسقدر جلد دنیا سے رخصت ہونا پڑا کہ ملک و قوم کی وہ توقعات جو ان کی ذات سے وابستہ تھیں خاک میں ملکر رہ گئیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

جذباتِ حافظ شیرازیؒ

[لسان الغیب حافظ شیرازیؒ کے کلام کی روحانیت و دلکشی فارسی شاعری کیلئے مایۂ ناز ہے۔ اور فارسی زبان میں جو گھلاوٹ ہے اس سے اس کا ترجمہ اور بھی مشکل ہو جاتا ہے لیکن ہمارے دوست سید مقبول حسین صاحب بی۔ اے نے لسان الغیب کے اشعار کا جس خوش اسلوبی و کامیابی سے ٹھیٹھ ہندوستانی میں ترجمہ کیا ہے اس پر بے اختیار مبارکباد دینے کو جی چاہتا ہے۔ ناظرین بھی اشعار ذیل سے لطف اندوز ہوں اور مقبول صاحب کے زور قلم کی داد دیں۔ ا-ز]

سالہا دل طلبِ جامِ جم از ما می کرد　　آنچہ خود داشت زبیگانہ تمنا می کرد

یہ دل آتم گیان کا پیاسا جل مانگے بھٹکے جیون سے
آپ ہی ساگر، آپ سمندر، پانی مانگے پیاسے من سے

گوہرے کز صدفِ کون و مکان بیرون بود　　طلب از گمشدگانِ لبِ دریا می کرد

موتی جو سنسار کی سیپی سے باہر تھا اور باہر ہے
یہ اچرج (تعجب) تو دیکھو یہ من مانگے بھولے بھٹکے جن (شخص) سے

مشکل خویش بر پیرِ مغان بُردم دوش　　کاو بتائید نظر حلِ معما می کرد

بات کٹھن جو آن پڑی تھی پریم رشی سے کل جا پوچھی
ایشور کی کرپا سے اس نے دوبدھا (شک) دور کیا نینن سے

بیدلی در ہمہ احوال خدا با او بود　　او نمی دیدش و از دور خدا را می کرد

وہ پریمی ــــ ہر حال میں واکے ایشور اپنی کرپا راکھے
بن دیکھے، بن جانے بوجھے، بھانپ لیا ہر کی سمرن سے

دیدمش خرم و خنداں قدحِ بادہ بدست　　و اندراں آئینہ صد گونہ تماشا می کرد

لئے پیالہ پریم کے رس کا ہاتھ میں اپنے مسکرا دیے تھا
وہ پیالہ تھا جیون درپن (آئینہ) دیکھ پڑے دو جگ درپن سے

گفتم "این جامِ جہاں بیں بتو کے داد حکیم؟"　　گفت "آن روز کہ ایں گنبدِ مینا می کرد"

پوچھا کیسے اور کب پایا گیانی گیان کے اس درپن کو؟
بولا جب سنسار بنا اور ملی آتما اس جیون سے

آن ہمہ شعبدہ با عقل کہ می کرد آنجا سامری پیش عصا و ید بیضا می کرد

سمجھ بوجھ اور ودّیا بدھی تھاہ پریم کی کیسے پاویں
دیا دکھاویں سورج کو اور پانی لاویں ریت کی بن سے

گفت آن یار کزو گشت سر دار بلند جرمش آن بود کہ اسرار ہویدا می کرد

وہ جن سے بچن جو بولا، سولی چڑھ کے بھید کو کھولا
چوک ہوئی بس اتنی پریمی جیبھ نہ روکی سچ بولن سے

فیض روح القدس ار باز مدد فرماید دیگراں ہم بکنند آنچہ مسیحا می کرد

اس ایشور کی کرپا ہو تو شرتی گیان ملے پھر سب کو
جیون آواگون سے چھوٹے آنکھ لڑے سکھی دیوتن سے

گفتمش سلسلۂ زلف بتاں از پی چیست گفت حافظ گلۂ از شب یلدا می کرد

وا کے لٹے کیس کوئی کیا جانے جو پوچھے تو کہئے
جیسے کالی ناگن حافظ آوے کالی رات میں بن سے

جذباتِ جوہر

(از حضرت جوہر حسنی بی اے کانپوری)

کسی کو راز ہستی کب یہاں معلوم ہوتا ہے
جسے دیکھو وہ گم کردہ نشاں معلوم ہوتا ہے

ہقدر بھی مجھے کچھ سرگراں معلوم ہوتا ہے
کہ ہر ذرہ زمیں کا آسماں معلوم ہوتا ہے

مبارک وسعتِ کون و مکاں میں جلوہ آرائی
جہاں میں دیکھتا ہوں تو وہاں معلوم ہوتا ہے

مرے اشکِ ندامت سے لکھی ہے داستاں میری
کہ ہر قطرہ صدائے کارواں معلوم ہوتا ہے

یہ کس نے خرمنِ دل میں لگا دی آگ جلووں سے
کہ ہر ذرّہ یہاں آتش بجاں معلوم ہوتا ہے

حرم یا دیر میں جس کی تجھے ہے جستجو جوہر
وہ تیرے خانۂ دل میں نہاں معلوم ہوتا ہے

پچھلے سو (۱۰۰) سال کے

صوبۂ بہار کے ہندو شعراء

(سنہ ۱۲۰۰ھ لغایۃ سنہ ۱۳۰۰ھ)

از سید رضا قاسم صاحب مختار۔ ناظم انجمن ترقی اُردو چپلا حسین آباد (بہار)

فنا کے بعد بھی اہلِ کمال زندہ ہیں
نہ ہے وہ کام کہ جس سے جہاں میں نام رہے

دلی اور لکھنؤ کے بعد صوبۂ بہار نے اُردو زبان کی جو خدمت کی ہے وہ ماہرین تاریخ ادب پر خوب روشن ہے۔ یہاں بھی ہر مقام پر دن رات مشاعروں کی کثرت اور شعر و سخن کا مشغلہ رہتا تھا۔ ہر جگہ یہی باتیں تھیں۔ مسلمان ہوں یا ہندو ہر سر میں یہی سودا تھا۔

قدردانی کا یہ عالم تھا کہ دلی اور لکھنؤ کے نامی شعراء وطن چھوڑ چھوڑ کر یہاں آ بسے تھے اور مسلمان اور ہندو سب ایک ہی رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ بچہ بچہ اس کا دلدادہ اور شیدائی تھا اور زبانِ اُردو پال پوس کر بڑھائی جا رہی تھی اور دونوں قومیں اُس کو بنا سنوار رہی تھیں۔

چنانچہ ذیل کی سطروں میں اُن میں سے بعض مشہور ہندو شعرائے بہار کے مختصر حالات مع نمونۂ کلام درج کئے جاتے ہیں۔ یقین ہے کہ ناظرین اِن شعراء کے کلام کی پاکیزگی، زبان کی صفائی اور الفاظ کی بندش ملاحظہ فرما کر اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ بہار کے ہندوں کو اُردو زبان سے کسقدر قدیمی ربط و مناسبت حاصل تھی۔

۱۔ **عاشق** تخلص، اسم گرامی مہاراجہ کلیان سنگھ بہادر خلف الرشید ممتاز الملک مہاراجہ شتاب رائے متوطن عظیم آباد۔ آپ نے ۷۳ سال کی عمر میں ۱۲۰۷ھ میں انتقال کیا۔ نمونۂ کلام یہ ہے ؎

مچایا ہے جگر نے حشر کا سا شور پہلو میں   مگر دیکھا ہے یہ حالِ دلِ رنجور پہلو میں

۲۔ **موزوں**۔ تخلص، اسم گرامی مہاراجہ رام نرائن خلف دیوان رنگ لال، نواب میر جعفر کے نائب اور حاکم صوبۂ بہار تھے۔ نمونۂ کلام حسب ذیل ہے۔

ابر تو خود ہی خجالت سے ہے پانی پانی   کب مقابل ہو مرے دیدۂ خونبار کے ساتھ

۳۔ شوق۔ تخلص، اسم گرامی منشی شیو گوپال عرف کا کاجی عظیم آبادی، تجارت اور مہاجنی کرتے تھے ؎

دامن کو تیرے خوں نہ رہے بن بھرے ہوئے　　چھوٹے نہ اپنا عشق تو قاتل مرے ہوئے

۴۔ گریاں۔ تخلص، اسم گرامی راجہ بھوانی سنگھ بہادر عرف راجہ کنور خلف راجہ شتاب رائے۔ نمونہ کلام ؎

دل ہی نہیں ملے ہے ملے کیا نشانِ داغ　　مدت سے ڈھونڈتا ہوں کروں کیا بیانِ داغ

۵۔ اُلفت۔ تخلص، اسم گرامی منشی منگل سین متوطن عظیم آباد۔ شاگرد جرات دہلوی۔ نمونہ کلام ؎

ہر قدم پر یاں تلک آنے میں سو سو ناز ہیں　　کیوں کہ گھر جانے لگے شام و سحر دو چار کے

۶۔ الفتی۔ تخلص، اسم گرامی راجہ پیارے لال، اصل باشندے مقام سکندرہ آگرہ کے تھے مگر ترک وطن کر کے عظیم آباد چلے آئے تھے اور یہیں سکونت پذیر ہو گئے اور یہیں ۱۲۵۴ھ میں انتقال کیا۔ نمونہ کلام ؎

خاکساری سے مثالِ کفشِ پا　　جس جگہ بیٹھے وہیں کے ہو گئے

۷۔ بیتاب۔ تخلص، اسم گرامی منشی سنتوکھ رائے باشندہ عظیم آباد۔ قائم سے شرف تلمذ تھا۔ نمونہ کلام

نہ رہے باغِ جہاں میں کبھی آرام سے ہم　　پھنس گئے قیدِ قفس میں جو چھٹے دام سے ہم

۸۔ راجہ۔ تخلص الملقب بہ راجہ بہادر خلف مہاراجہ شتاب رائے ناظم بہار۔ ذیل میں آپ کا ایک مطلع ملاحظہ ہو، کلام میں کتنا زور ہے ؎

یہ زخم دل ہمارے مرہم تلک نہ پہنچے　　دم ہم تلک نہ پہونچا، ہم دم تلک نہ پہنچے

۹۔ دل۔ تخلص، اسم گرامی منشی بینی پرشاد، پٹنہ میں آپ کا گھر محلہ دیوان میں تھا اور مہاراجہ شتاب رائے کے گھرانے سے توسل تھا۔ آپکے کلام میں تصوف کا رنگ بہت گہرا تھا۔ بطور نمونہ ایک شعر ملاحظہ ہو ؎

پردہ اُٹھا کے تونے، ادھر کو گذر کیا　　عالم کے دل میں تیری محبت نے گھر کیا

۱۰۔ مسکین۔ تخلص، اسم گرامی لالہ بخت مل، متوطن عظیم آباد (پٹنہ) ۔ نمونہ کلام ؎

روئے زمین پر جتنے بے یاد حق ہیں پھرتے　　وے آدمی نہیں ہیں، ماٹی کی مورتیں ہیں

۱۱۔ ہیدار۔ تخلص، اسم گرامی منشی بساون لال، تلمیذ مرزا جان جاناں مظہر۔ آپ ایک مدت تک پٹنہ میں رہے اور وہیں انتقال کیا۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو ؎

مرے لخت جگر یوں آنسوں کیساتھ جاتے ہیں　　کہ جوں پھولوں کی پنکھڑی لیکے پانی میں بہاتے ہیں

۱۲۔ اُلفت۔ تخلص، اسم گرامی لالہ اننت رام، متوطن عظیم آباد (پٹنہ) ؎

کچھ غم نہیں فراق کے روزِ سیاہ کا　　ہے دل میں عشق ایک بتِ رشک ماہ کا

۱۳۔ نائب۔ تخلص، اسم گرامی منشی بھگوان دین ولد منشی منگل دین، باشندہ اررِیا ضلع پورنیا۔

آپ بابو کانجی لال صبا فیروز آبادی کے شاگرد تھے۔ نمونۂ کلام مندرجہ ذیل ہے ؎

ڈھونڈتا ہوں انھیں جولے تابؔ خانۂ دِل میں وہ نکلتے ہیں نو نو

۱۴۔ بسملؔ۔ تخلص، اسم گرامی منشی منّو لال، متوطن عظیم آباد (پٹنہ) ؎

دیکھا کبھی نہ بھر نظر اس خوف سے انھیں دھبّہ لگے نہ گورے بدن پر نگاہ کا

۱۵۔ حامدؔ۔ تخلص، اسم گرامی منشی گھمنڈی لال، باشندہ ضلع مونگیر ؎

نامۂ شوق رقم کرتا ہوں اُس کو حامدؔ کیوں نہ دودِ دلِ مشتاق کبوتر بن جائے

۱۶۔ حشمتیؔ۔ تخلص، اسم گرامی لالہ ماتا دین، عظیم آباد کے رہنے والے، منصفی کے عہدے پر فائز تھے۔ وزیر علی عبرتیؔ سے شرف تلمذ تھا۔ نمونہ کلام ؎

دیکھیں گے حُسن حور تو پھسلے گا دِل ضرور جنّت میں بھی یقین ہے نہ آرام پائے دِل

۱۷۔ خفیؔ۔ تخلص، اصل نام معلوم نہ ہو سکا۔ مشہور بنام راجہ بابو تھے۔ آپکا وطن عظیم آباد (پٹنہ) تھا

دیکھ سنبل کو چمن میں یاد آئے اُس کے بال حاصل اس گلگشت سے آخر پریشانی ہوئی

۱۸۔ رحمتیؔ۔ تخلص، اسم گرامی کنور سکھراج بہادر عظیم آبادی۔ آپ کے والد ہیرالال المتخلص بہ ضمیرؔ درسیات فارسی و عربی میں فارغ التحصیل تھے اور علم ہیئت، ہندسہ و اقلیدس وغیرہ میں کافی دخل رکھتے تھے۔ راجہ پیارے لال المتخلص بہ الفتیؔ، رحمتیؔ کے دادا تھے۔ چنانچہ یہ مشغلہ اس خاندان میں کئی پشتوں سے جاری تھا۔ رحمتیؔ کے کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو ؎

جب سلسلہ جنباں یہ تیری زلفِ رسا ہو عاشق ترا کس طرح نہ زنجیر بہ پا ہو

۱۹۔ شادؔ۔ تخلص، اسم گرامی دُرگا پرشاد رائے عظیم آبادی۔ آپ مہاراجہ رام نرائن موزوںؔ کے خاندان میں تھے۔ نمونۂ کلام یہ ہے ؎

دن کو جو شغل گریہ ہے تو شب کو آہ کا پوچھو نہ حال کچھ میرے حالِ تباہ کا

۲۰۔ شائقؔ۔ تخلص، اسم گرامی منشی للتا پرشاد، اصلی وطن فرخ آباد تھا مگر عظیم آباد میں توطن اختیار کر لیا تھا ؎

کان اُنکے بھر گئے ہیں رقیبوں کی بات سے سُنتے نہیں وہ حال کسی دادخواہ کا

۲۱۔ شورشؔ۔ تخلص، اسم گرامی منشی مکند لال، متوطن عظیم آباد محلہ دیوان، فارسی اور اُردو دونوں زبانوں میں مشق سخن فرماتے تھے۔ آپ زیادہ تر مثنوی کہتے تھے۔ انکی اُردو کی مثنوی کا ایک شعر یہ ہے

کبھی میرا پٹنہ بہشت بریں تھا جواب اس کا دُنیا کے اندر نہیں تھا

۲۲- شمس- تخلص، اسم گرامی منشی پریشر سنہا، متوطن عظیم آباد (پٹنہ) ہے۔

ہاں یہ مانا کہ جو نکلے بھی تو مر کر نکلے　　پر یہ حسرت ہے کہ اُس کوچہ سے کیونکر نکلے

۲۳- عاجز- تخلص، اسم گرامی لالہ کملا پرشاد، متوطن عظیم آباد ہے۔

برگشتگیٔ بخت کا اپنے یہ ہے اثر　　پھر نا مری طرف سے تمہاری نگاہ کا

۲۴- فدوی- تخلص، اسم گرامی لالہ سیوک رام، آپ پٹنہ کی عدالت دیوانی میں وکالت کرتے تھے۔

جی کو نہ چین ہووے نہ آرام پائے دل　　پھر کس اُمید پر کوئی تم سے لگائے دل

۲۵- قاصر- تخلص، اسم گرامی لالہ جگت بہاری لال، باشندہ کوچہ جوالال شہر پٹنہ۔ سید فرزند احمد صفیر بلگرامی سے شرف تلمذ تھا۔

ہوتے ہیں وصل یار کے ساماں نئے نئے　　پھر دل میں جمع ہوتے ہیں ارماں نئے نئے

۲۶- گیسو- تخلص، اسم گرامی لالہ نند کشور سنگھ، متوطن عظیم آباد (پٹنہ) ہے۔

گیسو نہ فکر کیجئے عقبیٰ کی دل میں آپ　　دھو دیں گے رو کے اشک سے دفتر گناہ کا

۲۷- مشہور- تخلص، اسم گرامی لچھمی پرشاد، متوطن عظیم آباد- آپ کا پیشہ طبابت تھا۔

اب دلمیں بغض بیٹھ گیا ذکر اُٹھ گیا　　اُلفت کا دوستی کا محبت کا چاہ کا

۲۸- رقیم- تخلص، اسم گرامی منشی گرسہائے لال خلف منشی نور نرائن لال ساکن ندرہ ضلع گیا، ناسخ کے شاگردوں میں تھے۔ اُردو کے علاوہ فارسی وعربی میں بھی کافی دستگاہ رکھتے تھے- آپ کا اُردو کا کلام دستیاب نہ ہوسکا- اِس لئے نمونہ پیش کرنے سے قاصر ہوں۔

غزل

(مرزا وزیر علی صاحب شمشیر لکھنوی)

دل لرز اُٹھتا ہے رنگِ بزم امکاں دیکھکر　　دوستوں کو نوحہ گر دشمن کو خنداں دیکھکر

سیکڑوں شکوے بھرے ہیں دل میں لیکن کیا کروں　　محو ہوجاتے ہیں وہ سب روئے جاناں دیکھکر

جب گھٹا چھائی، ہوا سنکی توبہ پھر توبہ کہاں　　خوش ہوا ساقی ہجوم مے گساراں دیکھکر

آہ اے شمشیر اُچھ لطف نظر بازی نہ پوچھ
عید ہوجاتی ہے انکا روئے تاباں دیکھ کر

مشاہدات و محسوسات

(از حضرت نجم آفندی اکبرآبادی)

(۱)

افسانۂ بیدار دلی چھوڑ گئے　　آوازۂ درد پروری چھوڑ گئے
دل والوں پہ کچھ اجل کا قابو نہ چلا　　مرنے کو چلے تو زندگی چھوڑ گئے

(۲)

میعاد کی تکمیل بہر طور کرو　　ہاں فلسفۂ حیات پر غور کرو
ہم جاتے ہیں پھر کھلے گا بابِ زنداں　　کچھ دن ابھی انتظار تم اور کرو

(۳)

مرکز سے نظامِ ہوش ہٹ جائیگا　　ہر سلسلۂ خیال کٹ جائے گا
ہاتھوں کی لکیروں پہ کہاں جاتا ہے　　پردہ اُٹھا تو دل اُلٹ جائے گا

(۴)

زاہد کو ہے جام کی نہ مینا کی خبر　　کیا جانے غریب روزِ فردا کی خبر
تم تو آئے ہو ایسے گھبرائے ہوئے　　جیسے لائے ہو ختمِ دنیا کی خبر

پہلا افسانہ

(از چوہدری فدا محمد صاحب سکریٹری انجمن ترقی اُردو گوجرانوالہ)

وہ شاعر تھا۔ ایک جذبات کی دُنیا کا مالک۔

خیالات کی رو سمندر کے تھپیڑوں کی طرح اسے تنکا سمجھکر اس سے کھیل رہی تھی۔ اُسکا درد مند دل آج بہت بیتاب تھا۔ وہ چاہتا تھا۔ کہ جی بھر کے روئے۔ تاکہ دل ہلکا ہو جاوے مگر آنکھوں میں آنسو نہ آتے تھے! آنسو۔ وہ شباب میں ایک دراز گیسو حسینہ سے محبت کر کے ختم کر چکا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بیتابی کے سوائے اُس کے پاس دل کے بہلانے کیلئے

ایک برگ خزان کی طرح جسے موسمی ہوائیں نہال چمن سے اُتار کر دُور لق و دق ریگستانی خشک ٹیلوں پر پھینک دیں۔ اور وہ خشک ذروں میں مل جائے۔ وہ بھی اپنی زندگی کے واقعات بھول رہا تھا۔

ایک دن اُس نے چاہا۔ کہ وہ اپنی ناکام محبت کا افسانہ لکھے۔ اسے اپنی قلم کی روانی اور خیالات کی شگفتگی پر ناز تھا۔ چنانچہ اُس نے قلم اور دوات سنبھال لی۔ اور اپنے کاغذات کے بوسیدہ پلندوں کو نکالکر اُنہیں سے اپنے افسانہ کیلئے مضامین کی تلاش کرنے لگا۔

"محبت" اُس نے کہا۔ "مجھے محبت کے لفظ سے اپنی پُردرد کہانی نہ شروع کرنی چاہیئے کیونکہ اُسے یقین تھا کہ اگر اس موضوع پر پہلے ہی قلم اُٹھی۔ تو وہ اپنے افسانے کی تکمیل میں قاصر رہے گا۔ وہ تمام عمر محبت کا پُجاری بنا رہا۔ اُس نے ایک مستِ شباب دوشیزہ کی ناقابلِ اعتبار مسکراہٹوں پر اپنا دل نثار کر دیا تھا وہ تمام عمر اس سے محبت کرتا رہا۔ مگر اس نے اسکے معصوم دل سے بیوفائی کی اور اسے کبر دینداری کی نظر کر دیا۔ وہ پُرانے کاغذات اور محبت بھرے خطوط دیکھتا جاتا تھا۔ اور ساتھ ہی اپنے گذشتہ زندگی کے واقعات بھی پردۂ فلم کی طرح اُسکی آنکھوں کے سامنے گذر رہے تھے۔ اچانک اُسے ابتدائے محبت کی داستان کا ورق ملا۔ اُس نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ اور قلم کو ہاتھ سے رکھدیا۔ اب وہ اسی داستان میں محو ہو گیا۔

"وہ اتنی حسین ہے۔ کہ قلم سے اُسکی نزاکتِ حُسن بیان نہیں ہو سکتی ہے۔"

جب میں نے اُس کے حُسنِ دلفریب کا نظارہ دیکھا۔ جب اُس کے کوثرِ حُسن سے ایک ساغر پیا۔

تو میرا معصوم دل لرز اُٹھا۔ میں کانپ گیا۔ ارمانوں کے سمندر میں تلاطم مچ گیا۔ میں اُسے بیحد چاہتا ہوں مگر وہ مجھے نہیں جانتی ۔۔۔۔ شاید جانتی ہو ۔۔۔۔ مگر وہ مجھ سے کبھی ہمکلام نہیں ہوئی۔ اُس نے اپنا حسین چہرہ مجھے کبھی نہیں دکھایا۔ کبھی مجھے ہمدردانہ نظروں سے نہیں دیکھا۔ اور میرے دل مجروح کا مداوا نہیں کیا۔

مگر میں اُسے محبت کرتا ہوں۔ میں نے اُسے ایک نظر دیکھ لیا ہے۔ صرف ایک نظر جو محبت کا گہرا نقش چھوڑ گئی ہے۔

میری آنکھوں میں اُس کے دیکھنے کی خواہش روز بروز بڑھتی جاتی ہے۔ اب ان میں اتنی کشش اور اثر پیدا ہو گیا ہے۔ کہ اُسے ضرور ہی اپنی طرف متوجہ کر سکیں۔ اور میں اسی اُمید پر جیتا ہوں کہ اب جب اُسے دیکھوں گا۔ تو نگاہ کا اثر ضرور اُس کے دل کو موم کی طرح پگھلا دے گا۔ اس لئے میں خوش ہوں۔ اُس سے محبت کئے جاتا ہوں اور اپنی سوکھی ہوئی آنکھوں میں جذب کی مقناطیسی قوت جمع کرتا ہوں۔

وہ اپنی تحریر پڑھ رہا تھا۔ اور اُس کے چہرے پر کبھی مُسکراہٹ پیدا ہوتی تھی اور کبھی غم واندوہ کی لہر دوڑ جاتی تھی۔ جو تبسم کو دُور کر کے فکر والم کے خط وخال نمایاں کر دیتی تھی۔

اُسکا دل جذباتِ محبت سے معمور ہو گیا۔ تخیل نے پھر اسے اسی دُنیا میں پہنچا دیا۔ جہاں سے وہ بھاگ رہا تھا۔

کسم کی تصویر اُس کی آنکھوں کے سامنے آگئی۔ وہی چہرہ۔ وہی آنکھیں۔ وہی بال اور وہی قد۔ گلاب، نرگس، سنبل اور سرو کو شرما دینے والا مجسمہ حُسن۔ اُس کی آنکھیں پھر حُسن کے دلفریب باغ کی رنگینیوں سے شادکام نظر آنے لگیں۔

وہ اسے کسقدر پیار کرتا تھا۔ بے حد۔ وہ تمام عمر پروانہ وار اُس کی شمع حُسن پر تصدق ہوتا رہا اسے یاد آیا جب وہ ایک سہانی صبح کو سیر کے بہانے اُس کے باغ میں گیا۔ اُس دن کا سماں نہایت دلفریب تھا۔ صبح کا وقت اور پھولوں کا موسم۔ بادِ بہار پھولوں کی نکہت سے لدکر گرانباری محسوس کر رہی تھی۔ وہ ہر بوٹے سے کبھی اُلجھتی اور کبھی مچلتی۔ اسی طرح باغ میں عنبر بکھیر بکھیر اور خوشبوئیں بانٹ بانٹ کر سب کی نظروں کا مرکز بنی ہوئی تھی۔

طائر گا رہے تھے۔ خوش الحان نغمے جو محبت کو تخلیق کر رہے تھے۔ کسم حُسن کی مجسم تصویر بنی سروہائے بلند کے جھرمٹ میں دُنیا ومافیہا سے غافل کھڑی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ دبے پاؤں آرہا تھا۔ یکلخت وہ ٹھٹھک گیا اور سوچا کہ واپس جاؤں مگر دل نے ہمت بندھائی، ارادہ نے کہا کب تک زبانِ طلب خاموش رہے گی۔ دل اسکی والہانہ اداؤں پر نثار ہو رہا تھا۔

کسم تاڑ گئی کہ کون آرہا ہے مگر وہ اپنی دھن میں مست کھڑی رہی۔ وہ آگے بڑھتا گیا۔ یہاں تک کہ بالکل اُس کے قریب پہونچ گیا۔ کسم نے اُسے ایک انداز دلربائی سے دیکھا۔

"ہاں آپ" کسم نے کہا۔ اُس نے بے اختیار ہوکر کسم کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور پھر اسی سراسیمگی کی حالت میں چھوڑ دیا

کچھ دیر دونوں خاموش کھڑے رہے۔ پھر شاعر نے پُرفضا موسم کی دلفریبیوں سے متاثر و مجبور ہوکر اسے اپنی محبت کا پیام دیا۔

"کتنا خوبصورت منظر ہے۔ کسم اس وقت کی ہوا مجھے بیخود بنا رہی ہے۔ سُنتی ہو یہ فضا کیا چاہتی ہے۔ گلاب کے پھُول کھل کھل کر ساغر بن گئے ہیں اور بلند سرو دعوت شادکامی دے رہے ہیں۔ تمہارے قدموں میں سبزہ لوٹ رہا ہے۔"

کسم نے اُس کے الفاظ سے متاثر ہوکر اپنے پاؤں کو دیکھا ——— سچ مچ سبزے نے اس کے پاؤں پر شبنمی موتی بکھیر دیئے تھے۔

وہ ایک اندازِ بیخودی سے شرما گئی اور کہا۔ "میں ان بے جان چیزوں کی زبان نہیں سمجھتی۔ مجھے معلوم نہیں یہ فضا کیا چاہتی ہے۔"

پھر اُس نے خوبصورت الفاظ کا ایک جال بچھایا۔ اور اس میں کسم کی محبت کو گرفتار کرلیا۔

یہ تھے اوائل محبت کے واقعات جنہوں نے اُسے اسکی زندگی کے چند خوشگوار لمحوں کی یاد دلادی، اور وہ اُنمیں محو ہوگیا۔ اب اس کا دل عہد ماضی کی یاد سے زخمی ہونے لگا۔ اور اس کے دل کی بیقراریاں اُٹھ اُٹھکر اس کے بیخود افکار کو منتشر کرنے لگیں، وہ بھول گیا۔ کہ وہ اسوقت کہاں ہے۔ صرف اسی قتالہ کی پیاری صورت اُس کی آنکھوں کے سامنے تھی۔ وہ عالم خیال میں اس کے دراز بالوں سے جو اس کی کمر تک ہزاروں فتنوں کو اُٹھائے ہوئے سانپوں کی طرح بل کھا رہے تھے کھیلنے لگا ——— کیا وہ پھر اُس سے محبت کرنے لگا۔ ہاں واقعی ——— وہ پھر اُسے عالم خیال میں اپنے قریب لے آیا۔ اور اصنامِ خیالی کی پرستش میں مصروف ہوگیا۔

شباب میں اس کی نشاط ریز جوانی کا رس اُسکی آنکھوں سے ٹپکتا تھا۔ اور اس کے جذبات نے حُسن کی فضا میں پرورش پائی تھی۔ اسے اپنی قابل رشک صحت پر بھی بجا ناز تھا۔ اُس کا عنفوان شباب صبح لطیف کی پیاری ہوا تھا۔ جو سبک خرامی سے چل چل کر اس کے بحر حیات میں خوشنما تھر تھریاں پیدا کررہی تھی۔ اور جب شباب اپنے شباب پر پہنچا۔ تو اُس کے تلاطم نے اس کی کشتی حیات کو اس جزیرہ پر پہنچا دیا جہاں حُسن کی پرستش ہوتی تھی۔ جہاں کُسم حکمراں تھی۔

اور کسم ـــ ایک لطیف گلدستہ شباب۔ جسکی معطر خوشبوئیں اس کی مشام روح کیلئے پیام حیات ثابت ہوئیں۔ ایک دلفریب سین، جو اپنی خوشنما اور جاذب نظر خوبصورتیوں سے تماشائیوں کو محو حیرت بنا دے اور ان دونوں کا ملاپ حسن اور عشق کا ملاپ تھا۔ نغمے اور رقص کا اتحاد اور روح اور اطمینان کا اتصال تھا۔ وہیں باغ سرو کے درمیان جب کسم نے اپنی بڑی بڑی آنکھیں اٹھاکر پیار اور محبت کی نظروں سے اُس سے کہا۔ "پیارے کیا یہ مہر و التفات اِس ناچیز پر ہمیشہ یوں ہی رہے گا اور اُس نے محبت کی اس شراب کے نشہ سے سرشار ہو کر جو اس کی صراحی دہن سے ٹپک کر کانوں کے رستہ اس کے روح کو پیام زندگی پہنچا رہی تھی، اس کی آنکھوں کا ایک بوسہ لیا۔ وہ اسے محبت کا دائمی اقرار سمجھتا تھا۔

مگر دُنیا ـــ او بیوفا دُنیا تو نے کس کس کو اپنے دام فریب میں پھانس کر اسے برباد نہ کیا۔ تیری محبت کا نام لیوا ہمیشہ تیری غداریوں پر ماتم کرتا ہوا تجھ سے رخصت ہوا۔ بھلا کسم اور غریب شاعر کے معصوم دلوں نے تیرا کیا بگاڑا تھا۔ جنہیں تو نے محبت کا واسطہ دیکر باہم ملایا اور آخر میں اُن کے جام حیات میں آنکھوں کے سامنے زہر تلخ ٹپکا دیا۔ تو ایک طلسم فریب ہے۔ رنگین اور خوشنما مگر عارضی اور جلد مٹ جانیوالا۔ ایک سراب ہے، جسے چشم نابینا بوستان طرب سمجھتی ہے۔

تمہارے باغ میں پھول اِس لئے کھلتے ہیں۔ کہ وہ چٹک کر ایک جلوہ فریب بنیں۔ بادِ صبح اِس جلوہ کو تر و تازہ رکھنے کیلئے اس پر شبنم چھڑکتی ہے۔ اور تیری بلبلیں اس کی رونق کو برقرار رکھنے کیلئے نغمے گاتی ہیں۔ صرف اس لئے کہ تیرے مکر و فریب کا سکہ جما رہے۔ غریب شاعر جس نے کسم کے جان بخش حیات لبوں سے اپنی محبت کا اقرار سُنا تھا۔ ایک بار اِنھیں سے اپنی ناکامی کے فقرے سُنے۔ وہی آنکھیں جنھوں نے اُسے پریم کا امرت پلایا تھا۔ اسے اب نفرت آمیز حقارت سے دیکھا۔

وہ شروع شروع میں اُسے مذاق سمجھا۔ مگر جب اُسے یقین ہوا کہ کسم نے کسی اور نوجوان کو اُسکی دولت اور حسن پر فریفتہ ہو کر اپنا دل دیدیا ہے۔ اور اس کی محبت کے عہد و پیمان کو بیرحمی سے ٹھکرا دیا ہے تو وہ اپنا کلیجہ پکڑ کر رہ گیا۔ مگر کسی طرح اُس کی محبت اس کے دل سے کم نہ ہوئی۔ وہ ٹھکرائے جانے کے باوجود اس سے محبت کرتا رہا۔ اگرچہ اب عالم خیال میں کسم کی بجائے اس کا تصور ہی ہوتا تھا۔

کسم کی بیوفائی کی یاد نے اسے آج پھر بے چین کر دیا۔ شاعر نے ضبط کرنا چاہا مگر نہ کر سکا۔ وہ چاہتا تھا کہ ہمیشہ اپنی محبت کے عہدِ اوّلین کی خوشگوار یاد ہی کو تازہ رکھے مگر کسم کی فریب کاریاں ـــ وہ کانپ اٹھا۔ اور جذبات کی شدت کا مقابلہ نہ کر سکا۔ اُس کی آنکھوں سے گرم گرم آنسو اُتر کر صفحات قرطاس پر گرنے لگے اور یہی اُس کے پہلے افسانے کے عنوان بنگئے!

اک جلوۂ محبوبی

از جناب نکہت شاہجہان پوری

جب سے مری آنکھوں میں اک جلوہ تاباں ہے — ہر موج نگہ اپنی فردوس بداماں ہے
اک عالم حیرت میں یہ دیدۂ حیراں ہے — ظلمت کی فضاؤں میں اک مہر درخشاں ہے
خوشبوئیں مہکتی ہیں کس شان و لطافت سے — محبوبۂ فطرت خود سرمست و خراماں ہے
کاشانۂ دل میں ہے اک شمع طرب روشن — جو دل کی تمنا ہے پروانۂ رقصاں ہے
گلشن ہو کہ صحرا ہو ویرانہ کہ آبادی — اک حسن دل آرا سے رشک چمنستاں ہے
جس سمت نظر ڈالو عشرت کی گھٹائیں ہیں — اور حد سماعت تک نغموں کا نیستاں ہے
مضراب تنفس کی اللہ طرب انگیزی — روحوں کا ترنم ہے یا نعرۂ مستاں ہے
رہ رہ کے ابھرتی ہے رک رک کے مچلتی ہے — ڈوبی ہوئی نشہ میں ہستی کی رگ جاں ہے
اک نور کا دریا ہے مواج نگاہوں میں — آئینۂ فطرت پر عکس رخ جاناں ہے
جذبوں کا تلاطم ہے یا عشق کا عالم ہے — یا حسن کی دنیا میں طوفان بہاراں ہے
اللہ یہ سرمستی اللہ یہ مدہوشی — میخانۂ جاں گویا عشرتگہ جاناں ہے
کوئی گہر افشاں ہے کچھ پھول برستے ہیں — اور جلوہ گہ ہستی اک گلشن خنداں ہے
حرماں ہے نہ مایوسی غم ہے نہ پریشانی — جو غم ہے سرور آگیں جو درد ہے درماں ہے
ہر چیز میں اک جذبہ ہر جذبے میں رنگینی — واللہ یہ دنیا بھی کیا عالم امکاں ہے

نکہت کو مبارک ہو یہ جلوۂ محبوبی
معمورۂ دنیا بھی جنت کا پرستاں ہے

نا عاقبت اندیش کلی

آئی ہے صبا چمن میں گانے کے لئے — گانے کو نہیں خون رلانے کے لئے
فریاد! کہ نا عاقبت اندیش کلی — پر تول رہی ہے مسکرانے کے لئے

گم گشتہ گوہر

(ڈاکٹر ربندر ناتھ ٹیگور کا ایک افسانہ)

میری کشتی نے اشنان گھاٹ کی ٹوٹی پھوٹی سیڑھیوں کے قریب لنگر ڈالا۔ سورج غروب ہو چکا تھا۔ ملاح تختۂ کشتی پر ہی نماز مغرب ادا کرنے لگا۔ ہر رکوع و سجود کے بعد اُسکی سیاہ شبیہہ شفق آلود آسمان پر زیر آب کھنچ جاتی تھی۔

دریا کے کنارے ایک قدیم، بوسیدہ عمارت کھڑی تھی، جس کا چھجہ اس قدر جھکا ہوا تھا کہ اس کے گر پڑنے کا ہر گھڑی قوی اندیشہ تھا۔ اُسکے دروازوں اور کھڑکیوں کے کواڑ شکست و ریخت سے قطعی ناکارہ ہو چکے تھے۔ ہر طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ اس پُر سکوت فضا میں اچانک ایک انسانی آواز میرے کان پڑی، اور میں کانپ اُٹھا۔

"آپ کہاں سے آرہے ہیں؟"

میں نے سر پھیر کر دیکھا تو ایک زرد رو، لاغر اور ضعیف آدمی کی شکل نظر پڑی جس کے پنجر لگے ہوئے تھے۔ بدقسمتی کے آثار سراپا سے ہویدا تھے۔ وہ مجھ سے دو چار سیڑھیاں اوپر کھڑا تھا۔ سلک کا میلا چکٹ کوٹ اور اُس کے نیچے ایک میلی کچیلی دھوتی پہنے ہوئے تھا۔ اس کا نحیف بدن، اُترا ہوا چہرہ اور لڑکھڑانے والے قدم پتہ دیتے تھے کہ اس فاقہ زدہ کو تازہ ہوا سے زیادہ خوراک کی ضرورت تھی۔

"میں رانچی سے آیا ہوں۔"

یہ سُن کر وہ میرے برابر اُسی سیڑھی پر آبیٹھا۔

"اور آپ کا مشغلہ"

"میں تجارت کرتا ہوں۔"

"کاہے کی"

"عمارتی لکڑی، ریشم کے کوئے، اور ترپھلا"

"آپ کا نام"

ایک لمحہ سوچنے کے بعد میں نے اُسے ایک فرضی نام بتا دیا لیکن وہ اب بھی متجسسانہ نظروں سے

مجھے دیکھ رہا تھا۔

"لیکن آپ کا یہاں کیسے آنا ہوا؟"

"محض تفریحاً یا تبدیل آب وہوا کے لئے"

"تبدیل آب وہوا! یہ بھی خوب کہی۔ میں چھ سال سے تقریباً ہر روز یہاں کی تازہ ہوا پیٹ بھر کر کھا رہا ہوں اور ساتھ ہی پندرہ گرین کونین، لیکن اثرے نہ وارد۔ کوئی فائدہ معلوم نہیں ہوتا"

"لیکن رانچی اور یہاں کی آب وہوا میں تو زمین آسمان کا فرق ہے۔"

"اس میں تو کوئی شک نہیں لیکن آپ یہاں ٹھہرے کہاں ہیں؟ کیا اسی مکان میں؟"

غالباً اس شخص کو یہ شبہہ ہوا کہ مجھے اس گھر کے دفینہ کا کہیں سے سراغ لگ گیا ہے۔ اور میں اس میں اقامت کی غرض سے نہیں بلکہ اُس دفینہ پر قبضہ جمانے آیا ہوں۔ مکان کی بھلائی بُرائی کے متعلق ایک حرف کہے بغیر اُس نے اس کے مکین کی پندرہ سالہ ایک لمبی سرگذشت بیان کرنی شروع کر دی۔

اس کی گنجی کھوپڑی میں گہری اور چمکدار سیاہ آنکھیں مجھے کالج کے 'قدیم ملّاح' کی یاد دلا رہی تھیں یہ ایک مقامی اسکول میں مدرس تھا۔

ملّاح نے نماز سے فراغت پاکر روٹی پکانی شروع کر دی، شفق کی سُرخی پر غالب آنیوالی سیاہی میں یہ کھنڈر عمارت ایک عجیب بھیانک منظر پیش کر رہی تھی۔ اسکول ماسٹر نے کہا:۔

"میرے اس گاؤں میں آنے سے تقریباً دس سال پیشتر ایک شخص پھنی بھوشن سہائے اس مکان میں رہا کرتا تھا۔ اس کا چچا درگا موہن لاولد مر گیا۔ جسکی کل جائداد اور وسیع کاروبار کا واحد وارث یہی قرار پایا۔"

انگریزی تعلیم اور نئی تہذیب کا بھوت اس پر سوار تھا۔ کالج میں کئی سال تعلیم پا چکا تھا وہ انگریزوں کی کوٹھیوں میں جوتہ پہنے پھرا کرتا تھا۔ اور بڑے صاحب لوگوں کے ساتھ فراٹے سے انگریزی بولتا تھا۔ یہ تو کہنے کی ضرورت نہیں کہ یہ لوگ اس کے ساتھ کوئی تجارتی مراعات برتنے کے روادار نہ تھے۔ وہ بخوبی جانتے تھے کہ پھنی بھوشن آخر جدید بنگال کی ہوا میں ہی سانس لے رہا ہے۔

اس کے علاوہ ایک بلا اور اُسکے سر پر سوار تھی۔ یعنی اسکی بیوی نہایت ہی حسین تھی، یہ خوبصورت بلا اور انگریزی تعلیم دونوں اُس کے پیچھے ایسی پڑی تھیں کہ توبہ ہی بھلی۔ اخراجات حد سے بڑھے

ہوتے تھے - ذرا پنڈا گرم ہوا اور جھٹ گورنمنٹ ڈاکٹر کھٹ کھٹ کرتے آن براجے -

شادی غالباً آپ کی بھی ہو چکی ہے - آپ کو بھی یقیناً یہ تجربہ ہو گیا ہو گا کہ عورت ہمیشہ سخت گیر خاوند کو پسند کرتی ہے - وہ بدقسمت شخص جو اپنی بیوی کی محبت سے محروم ہو - یہ نہ سمجھ بیٹھئے کہ وہ دولت سے مالامال نہیں یا حسن کی نعمت سے بے بہرہ ہے - نہیں یقین مانئیے وہ اپنی حد سے نرم خوئی اور محبت کے باعث اس بدقسمتی میں مبتلا ہے -

میں نے اس معاملہ پر خوب غور کیا ہے - اور اسی فیصلہ پر پہنچا ہوں، اور یہ ہے بھی ٹھیک - پوچھئے - کیوں ؟ لیجئے اس سوال کا مدلل اور مفصل جواب یہ ہے:-

یہ تو آپ ضرور مانینگے کہ کوئی شخص اسوقت تک حقیقی مسرت حاصل نہیں کر سکتا، جبتک کہ اسے اپنے طبعی رجحانات اور فطری قابلیتوں کے اظہار کے لئے ایک وسیع میدان عمل میسر نہ ہو - ہرن کو آپ نے دیکھا ہے وہ اپنے سینگوں کو سخت درخت سے گھس کر لطف اندوز ہوتا ہے - نرم و نازک کیلہ کے تنے سے نہیں - ابتدائے آفرینش سے صنف نازک اس "وحشی اور متلون مزاج" مرد کو رام کرنے کے لئے مخصوص انداز سیکھتی چلی آرہی ہے - اگر اسے پہلے سے ہی رام شدہ خاوند ملجائے تو اس کے یہ حسین ہتھیار جو اسکی ماؤں اور دادیوں سے ورثہ میں ملے ہیں اور عرصہ دراز سے متواتر چلتے رہنے کی بنا پر حد درجہ موثر بھی ہیں، نہ صرف بیکار رہتے ہیں بلکہ عورت کو بار گراں معلوم ہونے لگتے ہیں -

عورت اپنے دلکش حسن کے زور سے مرد کی محبت اور اطاعت حاصل کرنا چاہتی ہے - لیکن جو خاوند خود بخود ہی مطیع و منقاد ہو جائے وہ واقعی بدبخت ہے اور اس سے زیادہ اس کی بیوی -

تہذیب حاضرہ نے ایک خداداد نعمت یعنی مرد کی "شاندار بربریت" اس سے چھین لی ہے مرد نے اپنی کمزوری سے عورت کے ازدواجی بندھنوں کو بہت بڑی حد تک ڈھیلا کر دیا ہے -

ہمارا بدقسمت پھنی بھوشن بھی اس نئی تہذیب کے رندہ کا چھیلا ہوا تھا - اور یہی وجہ تھی کہ نہ وہ اپنے تجارتی کاروبار میں کامیاب تھا اور نہ اپنی گرہستی زندگی سے شادکام، اگر ایک طرف وہ اپنی تجارت میں منافع سے بے بہرہ تھا، تو دوسری طرف اپنی بیوی کی محبت کے شوہری حق سے محروم،

پھنی بھوشن کی بیوی منی ملکہ کو محبت اور اطاعت بے مانگے ملی تھی - اسکو دلفریب اور گراں بہا ساڑھیوں کے لئے منت و الحاح کیا معنی خاوند سے سوال کرنے کی بھی ضرورت نہ

ہوتی تھی۔ مرصع طلائی زیورات کے لئے اُسے بھٹکنا نہ پڑتا تھا۔ اس لئے اُس کی نسوانی فطرت کو کارفرمائی اور محبوبانہ انداز سے اپنے پرستار کے جذبات محبت میں ہیجان انگیزی کی نوبت نہ آئی تھی۔ اُسکے کان "لو" "قبول کرو" کے خوش آیند الفاظ سے آشنا تھے، لیکن اس کے لب "لاؤ" اور "دو" سے قطعی ناآشنا تھے اُس کا سادہ لوح خاوند اس خیال باطل میں مگن تھا کہ "دیئے جانا" اور "کسی معاوضہ کی توقع نہ رکھنا" اکارت نہیں جاسکتا۔ وہ اسی غلط فہمی میں ٹامک ٹوئیاں مار رہا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اُسکی بیوی اُسے ایک ایسی کل سمجھنے لگی جو بغیر چلائے چلتی تھی اور خود بخود بلا زحمتِ طلب اعلیٰ سے اعلےٰ ساڑھیاں اور گرانبہا زیورات بنا بنا کر اُس کے قدموں پر ڈالتی رہتی تھی۔ اُس کے پرزے اسقدر مضبوط اور دیرپا تھے کہ کبھی کبھی اُن کو تیل دینے کی بھی ضرورت نہ تھی

پھنی بھوشن کا مولد اور مسکن قرب وجوار کا ایک گاؤں تھا لیکن اُس کے چچا کے تجارتی کاروبار کا مرکز بھی شہر تھا، اس وجہ سے اُس کی عمر کا بیشتر حصہ یہیں گذرا تھا۔ گو ماں مرچکی تھی، لیکن خالائیں۔ ممانیاں وغیرہ خدا کے فضل سے موجود تھیں۔ لیکن وہ شادی کے فوراً ہی بعد منی ملکہ کو اپنے ساتھ لے آیا تھا۔ اُس نے شادی اپنے آرام کی خاطر کی تھی نہ کہ اپنے رشتہ داروں کی خدمت کے لئے۔

بیوی اور دیگر مقبوضات میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ بیوی کو حاصل کرلینا اور پھر اُس کی نگہداشت کرنا اُس کو اپنا بنانے کے لئے کافی نہیں ہوا کرتا۔

منی ملکہ سوسائٹی کی دلدادہ نہ تھی۔ اس لئے فضول خرچ بھی نہ تھی۔ بلکہ اس کے برعکس بڑی جزورس اور محتاط تھی۔ جو تحفہ پھنی بھوشن اس کو ایک مرتبہ لا دیتا تھا۔ پھر کیا مجال کہ اس کو ہوا بھی لگ جائے وہ بہ حفاظت تمام رکھ دیا جاتا تھا۔ کبھی ایسا نہیں دیکھا گیا کہ کسی پڑوسن کو اسنے کھانے پر بلایا ہو۔ وہ تحفہ تحائف لینے دینے کی بھی قائل نہ تھی۔

سب سے زیادہ حیرت انگیز یہ بات تھی کہ چوبیس سال کی عمر میں بھی منی ملکہ ایک چودہ سالہ نوخیز دوشیزہ معلوم ہوتی تھی۔ ایسا دکھائی دیتا تھا کہ اُس کے حسن کی بہار نہ صرف قائم بلکہ دائم رہنے والی ہے۔ منی ملکہ کے پہلو میں دل نہ تھا۔ برف کا ٹکڑا تھا جس کو محبت کی ذرا سی حرارت بھی نہ پہنچی تھی۔ وہ پگھلتا کیوں؟ اُسکی جوانی ڈھلتی کس طرح؟

جو درخت پتوں سے زیادہ لدا ہوا ہوتا ہے اکثر ثمر سے بے بہرہ رہتا ہے۔ ملکہ کا نہال حسن بھی بے ثمر تھا۔ وہ اولاد سے بے بہرہ تھی۔ رکھ رکھاؤ اور ذاتی نگہداشت کرتی بھی تو کاہے کی

اُسکی توجہ تمام تر اُس کے زیورات پر ہی مرکوز تھی۔ اولاد ہوتی تو موسم بہار کی میٹھی میٹھی دھوپ کی طرح اُسکے برفانی دل کو پگھلاتی اور وہ خوشگوار پانی اسکی ازدواجی زندگی کے پژمردہ نہال کو سرسبز و شاداب کرتا۔

منی ملکہ گھر کے کام کاج اور محنت مشقت سے بھی نہ کتراتی تھی جو کام وہ خود کر سکتی تھی اُسکی اُجرت ادا کرنا اُسے شاق گذرتا تھا۔ دوسروں کی تکلیف کا نہ اُسے احساس تھا اور نہ اعزہ و اقربا کی فکر اُس کو اپنے کام سے کام تھا۔ اس پُرسکون زندگی کی وجہ سے وہ تندرست اور فارغ البال تھی۔ نہ کبھی مغموم ہوتی تھی نہ رنجور۔

اکثر خاوند تو اسے غنیمت کیا معنی، خوش قسمتی سمجھیں گے کیونکہ جو بیوی ہر وقت مطالبات لیکر خاوند کی چھاتی پر چڑھی رہے وہ تمام گھرانہ کے لئے ایک بیماری ثابت ہوتی ہے۔

کم از کم میری تو یہی رائے ہے کہ حد سے بڑھی ہوئی محبت بیوی کے لئے شاید قابل رشک بات ہو۔ لیکن خاوند کے واسطے تو ایک مصیبت سے کم نہیں۔ ذرا خیال تو فرمایئے کہ کیا آدمی کا یہ کام ہے کہ وہ ہر گھڑی یہ تولتا ناپتا پھرے کہ اس کی بیوی اسے کتنا چاہتی ہے۔ میرا خیال تو یہ ہے کہ گرہستی کی زندگی اسوقت خوب گذرتی ہے جب خاوند اپنے کام سے کام رکھے اور بیوی اپنے سے ؎

بہشت آنجا کہ آزارے نباشد
کسے را باکسے کارے نباشد

واردات حُسن و عشق مرد کی فہم و فراست سے بالاتر ہیں لیکن عورت مرد کی محبت کے نشیب و فراز اور کمی زیادتی کو نہایت گہری نظر سے دیکھتی رہتی ہے۔ وہ الفاظ سے لہجہ کو اور کنایہ سے مطلب کو جھٹ علیحدہ کر لیتی ہے۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ زندگی کے کاروبار میں عورت کی پونجی لے دے کر صرف مرد کی محبت ہے۔ یہی اسکی زندگی کا واحد سہارا ہے۔ اگر وہ مرد کے رجحانات کی ہواؤں کے رُخ اپنی کشتیٔ حیات کے بادبان کو لگانے میں کامیاب ہو جائے تو یقیناً اسکی کشتی ساحل مقصود تک پہنچ جاتی ہے۔ اسی واسطے مقیاس المحبت آدمی کے دل میں نہیں بلکہ عورت کے دل میں لگا یا گیا ہے۔

احسن الخالقین نے مرد اور عورت کی فطرتوں میں نمایاں امتیاز رکھا ہے لیکن فرنگی تہذیب اس مابہ الامتیاز کو بالکل مٹا دینے پر تُلی ہوئی ہے۔ عورت مرد بنی جا رہی ہے اور مرد عورت۔ عورت مردانہ کیرکٹر کو سرمایۂ حیات اور مرد نسوانی کردار کو مایۂ لطف زندگی سمجھنے لگے ہیں۔ اس لئے

محال ہوگیا ہے کہ شادی کے وقت کوئی یہ کہہ سکے کہ دلہن عورت ہے یا عورت نما مرد۔ ایسے ہی عورت اندازہ نہیں لگا سکتی کہ جس کے پلّے وہ بندھ رہی ہے وہ مرد ہے یا مرد نما عورت۔ اس لئے کہ فرق صرف دل کا ہے۔ کیا معلوم کہ مرد کے پہلو میں نسوانی دل ہے یا مردانہ!

میں بہت دیر سے آپکی سمع خراشی کر رہا ہوں لیکن ایک حد تک قابل معافی بھی ہوں۔ میں اہل و عیال سے دور جلا وطنی کی زندگی بسر کر رہا ہوں۔ میری مثال اُس تماشائی کی سی ہے جو دور سے گھریلو زندگی کا تماشا دیکھ رہا ہو۔ اور بجائے اس کے کہ اُسکے فوائد سے متمتع ہو محض اسکے متعلق سوچ سکتا ہو۔ اسی لئے ازدواجی تعلقات پر میرے خیالات نہایت گہرے ہیں۔ میں اپنے شاگردوں سے تو یہ خیالات بیان نہیں کر سکتا اسی وجہ سے آپ سے بیان کر کے اپنے دل کو ہلکا کر رہا ہوں۔ آپ فرصت میں ان پر غور کریں۔

مختصر یہ کہ اگرچہ خانگی زندگی میں بظاہر کوئی شکایت بھنی بھوشن کو نہ تھی۔ وقت پر کھانا مل جاتا تھا۔ گھر کا انتظام اچھا چل رہا تھا لیکن پھر بھی ایک قسم کی بے چینی اور بے اطمینانی اس کے دل میں جاگزیں تھی اور وہ نہیں سمجھ سکتا تھا کہ وہ ہے کیا؟ اُس کی مثال اُس بچہ کی سی تھی کہ رو رہا ہے لیکن نہیں جانتا کہ اس کے دل میں کوئی خواہش ہے لیکن اس کے اظہار کا یارا نہیں ؎

می گریم واز گریہ چو طفلم خبرے نیست
در دل ہوسے ہست ندانم کہ کدام است

اپنی رفیق حیات کے دل کے خلائے محبّت کو وہ سُنہری اور مرصّع زیورات اور اسی قسم کے دیگر تحائف سے بھر دینا چاہتا تھا۔

اس کا چچا درگا موہن اور قسم کا آدمی تھا، وہ اپنی بیوی کی محبّت کو گراں قیمت پر خریدنے کا روادار نہ تھا۔ اور نہ وہ تقاضائے محبت میں تنک مزاج تھا۔ لیکن پھر بھی اپنی رفیقۂ حیات کی محبّت سے پوری طرح بہرہ در تھا۔

جس طرح ایک کامیاب تاجر کو قدرے بے لحاظ ہونا ضروری ہے بالکل اُسی طرح کامیاب شوہر بننے کے واسطے مرد کو قدرے درشت طبع بن جانا چاہئے۔ نہایت وثوق کے ساتھ میں آپ کو یہ نصیحت کرتا ہوں۔

عین اسوقت گیدڑوں کی چیخ پُکار قریب کے جنگل سے سُنائی دی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یا تو وہ اس اسکول ماسٹر کے فلسفۂ ازدواج پر حقارت آمیز ہنسی ہنس رہے ہیں، یا بھنی بھوشن کی متعرب زدگی پر کھلکھلا کر ہنس پڑے ہیں۔ بہر حال بھنی بھوشن کے بیان کی روانی کو چند منٹ

کے لئے اس چیخ پکار نے روک دیا۔ لیکن بہت جلد یہ چیخ پکار تھم گئی، اور پہلے سے بھی گہری تاریکی اور سکوت فضا پر مسلط ہو گیا تو اسکول ماسٹر نے پھر اپنی داستان چھیڑی۔

ناگہاں بھنی بھوشن کے وسیع تجارتی کاروبار میں عبرتناک تنزل رونما ہوا۔ یہ کیوں ہوا، اسکا جواب میری سمجھ سے بالاتر ہے۔ مختصر یہ کہ ایسا تپڑ الٹا کہ بازار میں ساکھ قایم رکھنا مشکل ہو گیا۔ اگر کسی طرح چند دن کے واسطے وہ ایک بہت بڑی رقم حاصل کر کے منڈیوں میں پھیلا سکتا تو ممکن تھا کہ کساد بازاری کے طوفان سے بچ نکلتا۔ لیکن اتنی بڑی رقم کا فوری انتظام خالہ جی کا گھر نہ تھا۔ اگر مقامی ساہوکاروں سے قرض مانگتا تو طرح طرح کی افواہیں پھیل جاتیں اور اس کی ساکھ کو ناقابل تلافی نقصان پہنچتا۔ اگر بیرونجات سے قرض کی سلسلہ جنبانی کرتا تو رقعہ پرچہ کے بغیر ممکن نہ تھا اور اس سے اسکی شہرت کو بڑا صدمہ پہنچنے کا اندیشہ تھا۔ صرف ایک طریقہ تھا، اور وہ یہ کہ زیورات پر روپیہ حاصل کر لیا جائے۔

بھنی بھوشن منی ملکہ کے پاس گیا۔ لیکن وہ ایسا خاوند نہ تھا کہ بیوی سے صاف صاف اور بزور کہہ سکتا۔ بدقسمتی سے اُسے اپنی بیوی سے اسی قدر گہری محبت تھی جیسی کہ ناول کے کسی ہیرو کو ہیروئن سے،

سورج کی کشش زمین پر بہت زیادہ ہے، لیکن کچھ زیادہ موثر نہیں۔ یہی حال بھنی بھوشن کے عشق کا تھا۔ اس عشق کے باوجود منی ملکہ کے دل پر کوئی اثر نہ تھا۔

لیکن مرتا کیا نہیں کرتا۔ مالی مشکلات کا تذکرہ۔ پرونوٹ۔ تمسک ملے۔ قرضہ۔ کساد بازاری کے حالات لرزتی ہوئی زبان سے غیر مربوط الفاظ میں بھنی بھوشن نے بیان کئے۔ جھوٹی عزت کے غلط خیال اور جذبات کے ہیجان میں معمولی سا معاملہ پیچیدہ بن گیا۔ مبہم الفاظ میں معاملہ کی نزاکت بیان کرکے ڈرتے ڈرتے بدقسمت بھوشن نے کہا۔

"تمہارے زیورات......."

منی ملکہ نے نہ 'ہاں' کہا نہ 'نہیں'۔ اُس کے چہرہ سے بھی کچھ پتہ نہ چل سکتا تھا۔ اُس پر سکوت طاری تھا۔ بھوشن کو سخت صدمہ ہوا لیکن اس نے ظاہر نہ ہونے دیا۔ اُس میں مردانہ درشتی نہ تھی جس چیز کا وہ بزور مطالبہ کر سکتا تھا اُس کے انکار پر اُس نے کسی قسم کے رنج کا بھی اظہار نہ کیا۔ وہ اس خیال کا آدمی تھا کہ محبت کی دنیا میں طاقت اور زبردستی کا گذر نہیں۔ بیوی کی رضامندی کے بغیر وہ زیور کو چھونا بھی حرام سمجھتا تھا۔ اس لئے مایوس ہوکر روپیہ کی فراہمی کے واسطے اور وسائل کی فکر میں کلکتہ چلا گیا۔

بیوی اپنے خاوند کو عموماً خوب جانتی ہے۔ اُس کے رگ پٹھے سے بخوبی واقف ہوتی ہے۔ خاوند اپنی بیوی کے کردار کا اتنا گہرا مطالعہ نہیں کر سکتا لیکن خاوند کچھ گہرا آدمی ہو تو اُس کے کردار کے بعض پہلو عورت کی متجسسانہ نگاہوں سے مخفی بھی رہ جاتے ہیں۔ بہر حال یہ یقینی ہے کہ منی ملکہ نے پھنی بھوشن کو اچھی طرح نہیں سمجھا۔ ایک مغربیت زدہ آدمی کی شخصیت جاہل عورت کی روایتی ناقص العقلی کے پیش نظر اکثر اُسکی سمجھ بوجھ سے بالاتر ہوتی ہے۔ وہ خود عورت کی طرح ایک پُراسرار ہستی بن کر رہ جاتا ہے۔ اور اسی وجہ سے مرد کی ان تین عام قسموں میں سے کسی فہرست میں بھی اُس کو وثوق سے شامل نہیں کیا جا سکتا۔

(۱) احمق (۲) اندھا (۳) وحشی

منی ملکہ نے اپنے مُشیر اعلیٰ مادھو شودان کو بُلایا۔ یہ دور کے رشتہ سے اس کا چچیرا بھائی تھا۔ اور پھنی بھوشن کے تجارتی عملہ میں ایک اسامی پر تعینات تھا۔ قابلیت کی بنا پر نہیں بلکہ محض رشتہ داری کے زور پر وہ اس اسامی پر قابض تھا۔ حُسن کارکردگی کی وجہ سے نہیں بلکہ رشتہ داری کی دھونس میں تنخواہ سے بھی زیادہ رقم لے اُڑتا تھا۔ منی نے تمام رام کہانی کہہ سُنائی اور آخر میں پوچھا کہ میں کیا کروں نیک صلاح دو۔

مادھو نے نہایت عقلمندانہ اور دور اندیشانہ انداز سے سر ہلایا۔ میرا تو ماتھا ٹھنکتا ہے۔ اس معاملہ میں خیریت معلوم نہیں ہوتی۔

دینوی عقل کے ماروں کو ہر کام میں اندیشہ ہی رہا کرتا ہے۔ اُن کو کسی معاملہ میں خیر نہیں دکھائی دیا کرتی۔

"پھنی بھوشن کو روپیہ تو ملنے سے رہا۔ آخر میں تمہیں زیور سے ہی ہاتھ دھونے پڑینگے۔"

دینوی معاملات اور مرد کے متعلق جو منی ملکہ کے ذاتی خیالات تھے اُن کی روشنی میں مادھو کے اخذ کردہ نتیجہ کا پہلا حصہ اغلب اور دوسرا یقینی معلوم ہوتا تھا۔ اطمینان اُس کے دل سے جاتا رہا۔ اولاد اُسکے تھی نہیں۔ باقی رہا خاوند وہ کسی شمار قطار میں نہ تھا۔ اس لئے اُس کی تمام تر توجہ زیورات پر مرکوز تھی۔ اُنہیں سے دلبستگی تھی۔ یہی اُس کو بمنزلہ اولاد کے عزیز تھے۔ جس طرح ماں اپنی اولاد کو اللہ آمین کرکے پالتی ہے۔ ہر بُری نظر سے بچاتی ہے۔ اسی طرح منی ملکہ بھی اپنے زیورات کی کامل توجہ اور پوری احتیاط سے نگہداشت کرتی تھی۔ اولاد کو ماں سے چھین لیجئے۔ پھر دیکھئے ممتا کی ماری ماں کا کیا حال ہوتا ہے۔ یہی حال منی ملکہ کا تھا۔ اسے یہ خیال کہ کل اُس کا تمام زیور اُسکے خاوند کے خیالی

منصوبوں کے سر صدقہ ہو جائیگا۔

" تو پھر مجھے کیا کرنا چاہیئے ؟"

" فوراً میکے چلی جاؤ۔ اور سارا زیور وہاں چھوڑ آؤ" چلتے پُرزے مادھو نے کہا۔ اس صورت میں اس کی ہانڈی کو بھی بگھار لگتا تھا۔ اگر سارا نہیں تو کوئی نہ کوئی زیور اُس کے ہتّے بھی چڑھنے کی اُمّید تھی۔ منّی ملکہ فوراً رضا مند ہوگئی۔ بڑھتی ہوئی تاریکی سے اسکول ماسٹر پر بھی سکوت طاری ہوگیا۔ لیکن چند لمحوں کے بعد اُس نے پھر سلسلۂ بیان چھیڑا

"جھٹ پٹے کے وقت جبکہ جولائی کی گھٹائیں آسمان پر ڈیرہ جمائے ہوئے تھیں۔ بارش موسلا دھار پڑ رہی تھی۔ ایک کشتی نے رہتی سیڑھیوں پر لنگر ڈالا۔ اگلی صبح کو گھٹا ٹوپ اندھیرے میں منّی ملکہ آئی، اور ایک موٹی چادر میں سر سے پاؤں تک لپٹی ہوئی کشتی پر سوار ہوگئی۔ مادھو جو رات سے اسی کشتی میں سویا ہوا تھا۔ اُسکی آہٹ سے بیدار ہوگیا۔

" زیور کا صندوقچہ مجھے دیدو تاکہ حفاظت سے رکھ لوں"

" ابھی ٹھہرو۔ جلدی کیا ہے۔ چلو تو ہی آگے دیکھا جائے گا"

کشتی کا لنگر اُٹھا اور وہ متلاطم دریا کی موجوں سے دست و گریباں ہونے لگی۔ منّی ملکہ نے سارا زیور ایک ایک کرکے پہن لیا تھا۔ صندوقچہ میں بند کرکے لے جانا اُسے غیر محفوظ معلوم ہوا۔ مادھو ہکّا بکّا رہ گیا جب اُس نے دیکھا کہ منّی کے پاس صندوقچہ نہیں ہے۔ اس کو وہم و گمان بھی نہ تھا کہ اُس نے زیور کو اپنی جان سے لگا رکھا ہے۔

گو منّی ملکہ نے بھوشن کو نہ سمجھا تھا۔ لیکن مادھو کے کردار کا نہایت صحیح اندازہ لگایا تھا۔

روانگی سے پہلے مادھو نے بھوشن کے ایک معتمد علیہ منیم کو لکھ بھیجا تھا کہ "میں مالکہ کے ساتھ اُسکو میکے پہنچانے جا رہا ہوں۔ یہ منیم جہاندیدہ اور مُعمّر آدمی تھا اور بھی بھوشن کے باپ کے زمانہ سے اسی کے ساتھ تھا۔ اس کو اس روانگی سے سخت قلق اور اندیشہ ہوا۔ اُس نے اپنے آقا کو فوراً لکھا۔ وفاداری اور خیر خواہی نے اُسے جرأت دلائی اور اُس نے خط میں اپنے آقا کو خوب کھری کھری سُنائی۔ خاوند کی غیرت اور دوراندیشی دونوں کے یہ منافی ہے کہ بیوی کو اس قدر مطلق العنان چھوڑ دیا جائے۔ منّی ملکہ کے دلی اندیشہ کو بھی بھوشن سمجھ گیا اُسے بیحد رنج ہوا۔ وہ اس معاملہ میں حرف شکایت زبان پر بھی نہ لایا تھا۔ ذلّت اور پریشانی اُٹھائی لیکن اُس نے منّی ملکہ پر کوئی دباؤ ڈالنا گوارا نہ کیا۔ لیکن پھر بھی اسقدر بدگمانی "سالہا سال سے وہ میری خلوت و جلوت کی رفیق ہے۔ تعجب ہے کہ اُس نے مجھے اب تک ذرا بھی نہ سمجھا"۔

اس موقعہ پر کوئی اور ہوتا تو غیظ و غضب میں نہیں معلوم کیا کر گذرتا۔ لیکن بھنی بھوشن خاموش تھا اور اپنے رنج کے اظہار سے بھی منی ملکہ کو رنجیدہ کرنا گوارا نہ کرتا تھا۔

مرد کو چاہیئے کہ وہ جنگل کی آگ کی طرح ذرا ذرا سی بات پر بھڑک جائے۔ جس طرح عورت جولائی کے ابر گریاں کی طرح بات بات پر فوراً آنسوؤں کی جھڑی لگا دیا کرتی ہے۔ لیکن اب وہ اگلے سے دن کہاں۔

بھنی بھوشن نے منی ملکہ کو اسکی غیر حاضری میں بلا اطلاع روانگی کے متعلق کوئی تہدیدی خط نہ لکھا۔ بلکہ یہ تہیہ کر لیا کہ مرتے دم تک اُسکے زیور کا نام بھی زبان پر نہ لاؤنگا۔ روپیہ کی فراہمی میں بھنی بھوشن کامیاب ہو گیا اُسکی تجارتی راہیں کھل گئیں۔ دس دن کے بعد وہ اپنے گھر کو واپس چلا۔ اس وثوق کے ساتھ کہ زیورات میکے میں چھوڑ کر منی ملکہ گھر واپس آگئی ہوگی۔

"دس روز پہلے کا حقیر اور ناکام سوالی جب مستانہ شان سے گھر میں قدم رکھیگا اور بیوی کی نظر اُس کے کامیابی سے دمکتے ہوئے چہرہ پر پڑے گی، تو وہ اپنے انکار پر ضرور خجل ہوگی۔ اپنی نادانی پر پشیمانی کا اظہار کریگی"۔ ان خیالات میں مگن بھنی بھوشن سونے کے کمرہ پر پہنچا۔ لیکن دروازہ مقفل تھا۔ قفل تڑوا کر اندر داخل ہوا تو تجوری کے کواڑ کھلے پڑے تھے۔

صدمہ سے لڑکھڑا گیا۔ "وفا" اور "محبت" اُسوقت اُسکے نزدیک بے معنی اور مہمل الفاظ تھے۔ طلائی پنجرہ جسکی ہر ایک سنہری تیلی کو اُسنے اپنی جان اور آن کی قیمت ادا کر کے حاصل کیا تھا، ٹوٹ چکا تھا اور خالی پڑا تھا۔ اب وہ دیوالیہ تھا۔ اور رسوائے گہر ہائے اشک اور لعل گوں لخت ہائے دل کے اُسکے پلے کچھ نہ تھا۔

منی ملکہ کو بلانے کا خیال بھی اُس کے دل میں نہ آیا۔ اُس نے یہ فیصلہ کر لیا کہ وہ جب چاہے آئے۔ آئے یا نہ آئے۔ لیکن بوڑھا منیم اس فیصلہ کے خلاف تھا۔ وہ اصرار کر رہا تھا، کہ کم از کم اُسکی خبر ضرور منگانی چاہیئے اتنے توقف کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ اُس کے اصرار سے مجبور ہو کر منی ملکہ کے میکے کو آدمی بھیجا گیا۔ لیکن وہ یہ روح فرسا خبر لایا کہ نہ یہاں منی ملکہ آئی ہے۔ نہ مادھو۔

یہ سنا تو پاؤں تلے کی زمین نکل گئی۔ دریا کے پار آدمی دوڑائے گئے۔ تلاش اور جستجو کا کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ ہوا۔ پوچھ گچھ میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی۔ مادھو کی تلاش میں پولیس نے زمین آسمان ایک کر دیا لیکن پتہ نہ چلنا تھا، نہ چلا۔ یہ بھی معلوم نہ ہو سکا کہ کشتی کس طرف کو گئی اور کون کشتی بان تھا۔ انتہائی مایوسی میں بھنی بھوشن کلیجہ مسوس کر بیٹھ رہا۔

جنم اشٹمی کی شام تھی۔ بارش ہو رہی تھی۔ بھنی بھوشن خوابگاہ میں اکیلا تھا۔ گاؤں میں ایک متنفس بھی باقی نہ تھا جنم اشٹمی کے میلہ نے گاؤں کا گاؤں سُونا کر دیا تھا۔ میلہ کی چہل پہل اور مہا بھارت کے ناٹک

کے شوق نے بچہ سے لیکر بوڑھے تک کو باہر کھینچ بلایا تھا۔ خوابگاہ کی کھڑکی کا ایک کواڑ بند تھا۔ پھنی بھوشن دنیا و ما فیہا سے بے خبر بیٹھا تھا۔

شام کا جھٹ پٹا رات کی گہری تاریکی میں تبدیل ہو گیا لیکن اس مہیب تاریکی موسلا دھار بارش، اور سرد ہوا کا اس کو احساس بھی نہ تھا۔ دور کے گانے کی دلکش آواز سے اُسکی سماعت بالکل بے خبر تھی۔ دیوار پر سرسوتی اور لکشمی کی تصویریں آویزاں تھیں۔ مسہری کے برابر ایک کھونٹی پر ایک خوشرنگ اور دلکش ساڑھی لٹکی ہوئی تھی۔ سرہانے چھوٹی سی میز پر پان کا بیڑا خود منی ملکہ کے ہاتھ کا بنا ہوا رکھا رکھا سوکھ چکا تھا متفرق اشیا نہایت سلیقہ سے اپنی اپنی جگہ رکھی ہوئی تھیں۔ ایک طاق میں منی ملکہ کا پسندیدہ نائٹ لیمپ رکھا تھا جسکو وہ اپنے ہاتھ سے روشن کیا کرتی تھی، اور جو اُسکی آخری رخصت کی یاد دلا رہا تھا۔ منی کی یاد میں ان تمام اشیا کی خاموش گریہ وزاری اس کمرہ کو ایک حسرتناک ماتمکدہ بنائے ہوئے تھی۔ پھنی بھوشن کا دل بے اختیار کہہ رہا تھا "پیاری منی آؤ۔ اور اپنے جانفزا حُسن سے اِن سب میں جان ڈال دو"

کہیں آدھی رات کے قریب جاکر بوندوں کی تڑتڑ تھمی، لیکن پھنی بھوشن اسی طرح محو خیال بیٹھا تھا۔

شبِ دیجور کی لامحدود تاریک فضا پر موت کی قلمرو کا سکہ چل رہا تھا۔ بھوشن کی غمزدہ روح کی لجاجت آمیز آواز اتنی دردناک تھی کہ اگر موت کی نیند سونے والی منی ملکہ بھی سُن پائے تو ایک مرتبہ آنکھیں کھول دے۔ اور اپنے طلائی زیورات پہنے ہوئے اس فضائے تاریک میں ایسی نمودار ہو جیسے کسوٹی کے سخت پتھر پر خفیف سی سُنہری دھاری۔

اچانک پھنی بھوشن کے کان میں قدموں کی سی آہٹ سنائی دی۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دریا کے کنارہ سے اُس کے گھر کی طرف آرہی ہے۔ دریا کی تاریک موجیں، شب کی تاریکی میں معلوم نہ ہوتی تھیں۔ اُمید کی خوشی نے اُسے زندہ کر دیا۔ اُسکی آنکھیں روشن ہو گئیں۔ اُس نے پردۂ تاریکی کو چاک کرنا چاہا مگر بے سود۔ جتنا زیادہ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتا تھا تاریکی کے پردے زیادہ گہرے ہوتے جاتے تھے، اور یہ معلوم ہوتا تھا کہ قدرت اس مہیب تاریکی میں انسانی مداخلت کے خلاف احتجاج کر رہی ہے۔

آواز قریب سے قریب تر آگئی۔ وہ سیڑھیوں پر چڑھی اور سامنے کے دروازہ پر آکر ٹھہر گئی جو مقفل تھا۔ دربان بھی سو گیا ہوا تھا۔ دروازہ پر ہلکی سی دستک سنائی دی۔ ایسی کہ کوئی زیور ڈالا

زنانہ ہاتھ دروازہ کھٹکھٹا رہا ہے۔ پھنی بھوشن ضبط نہ کر سکا، زینہ سے اُتر کر برآمدہ سے ہوتا ہوا دروازہ پر پہنچا۔ قفل باہر سے لگا ہوا تھا۔ انتہائی طاقت سے اُس نے دروازہ ہلایا۔ شور سے اُس کا طلسمِ خیال ٹوٹا تو وہاں کچھ نہ تھا۔

وہ پسینہ میں شرابور تھا۔ ہاتھ پاؤں سرد پڑ گئے تھے۔ اس کا دل ٹمٹماتے ہوئے چراغ کی آخری روشنی کی طرح جل بجھنے کو تیار تھا۔ بارش کی تڑ تڑ کی آواز کے سوا کچھ سُنائی نہ دیتا تھا۔

پھنی بھوشن کو یہ "حقیقت" ہرگز فراموش نہ ہوتی تھی۔ اُسے افسوس تھا کہ اسکی ناکام تمنائیں پوری ہوتے ہوتے رہ گئیں۔

اگلی شب کو پھر ناٹک ہونے والا تھا۔ نوکر نے اجازت چاہی تو پھنی بھوشن نے اُسے تاکید کردی کہ باہر کا دروازہ کُھلا رہے۔

"یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ بھانت بھانت کے آدمی باہر سے میلہ میں آئے ہوئے ہیں واردات کا اندیشہ ہے۔" نوکر نے کہا۔

"نہیں۔ تم دروازہ ضرور کُھلا رکھو۔"

"تو پھر میں میلہ نہ جاؤں گا۔"

"نہیں تم ضرور جاؤ۔"

نوکر حیران تھا کہ آخر اس کا کیا مطلب ہوسکتا ہے۔

جب زمانہ پر افسونِ شب طاری ہوا، تو پھنی بھوشن پھر اُس کھڑکی میں آ بیٹھا۔ آسمان پر نہایت گہرا ابر چھایا تھا۔ گھنگھور گھٹا تُلی کھڑی تھی کہ جل تھل کردے۔ ہر طرف سکوت کا عالم تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ساری فضا عالمِ خاموشی میں کسی خوشگوار صدا کے لئے گوش برآواز ہے۔ مینڈکوں کی مسلسل ٹر ٹر، اور دیہاتی سوانگیوں کی تھرتھرائی ہوئی آواز بھی اس سکوت میں مُخل نہ معلوم ہوتی تھی۔

آدھی رات کے قریب پھر تمام شور سکوتِ شام میں سونے لگے اور رات نے اپنے سیاہ کپڑوں پر ایک اور سیاہ غول پہن لیا۔ گذشتہ شب کی طرح پھنی بھوشن کو پھر وہی آواز سُنائی دی۔ اُس نے دریا کی طرف نظر اُٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ مبادا کہ کوئی بے اختیارانہ حرکت قبل از وقت اُسکی آرزوؤں کا خون کردے۔ وہ بے حس و حرکت بیٹھا رہا۔ گویا کسی نے لکڑی کا بت بنا کر سرِ شب سے کُرسی پر چپکا دیا ہے۔

قدموں کی وہی آواز اشنان گھاٹ کی سیڑھیوں کی طرف سے آکر صدر دروازہ میں داخل

ہوئی ۔ پیچدار زینہ کی سیڑھیوں پر چڑھکر اندرونی کمرہ کی طرف بڑھی ۔ موجوں کے تلاطم میں آپ نے کشتی کو دیکھا ہوگا ۔ اسی طرح پھنی بھوشن کا دل بلیوں اچھلنے لگا ۔ دم گھٹنے لگا ۔ برآمدہ سے گذر کر خوابگاہ کی طرف آئی اور عین دروازہ پر آکر ٹھہر گئی ۔ اب صرف دروازہ میں داخل ہونا باقی تھا ۔

پھنی بھوشن کی تمنائیں مچل اٹھیں ، دامنِ ضبط ہاتھ سے جاتا رہا ۔ وہ بے اختیار کرسی سے اچھل پڑا ایک دردناک چیخ "منی" اس کے دل سے نکلی لیکن افسوس کہ اس کے بعد مینڈھکوں کی ٹرٹر اور بارش کی بڑی بڑی بوندوں کی پٹ پٹ کے سوا اور کچھ نہ تھا ۔

اگلے دن میلہ بچھڑنے لگا ۔ دوکانیں اٹھنے لگیں ۔ لوگ اپنے اپنے گھروں کو واپس ہوئے پھنی نے دن میں برت کیا اور حکم دیدیا کہ رات کو گھر میں کوئی متنفس باقی نہ رہے ۔ نوکروں کو یہ خیال تھا کہ آقا آج کسی خاص منتر کا جاپ کرینگے ۔

آج شام کو کہیں کہیں آسمان کی ٹکڑیوں پر مطلع صاف معلوم ہوتا تھا ۔ بارش سے دھلی ہوئی فضا میں ستارے چمکنے لگے تھے ۔ پورن ماشی کا چاند بھی نمودار تھا ۔ میلہ کے تماشائی اپنی تکان اتار رہے تھے اور خواب غفلت میں پڑے سوتے تھے ۔ دریا پر کوئی کشتی دکھائی نہ دیتی تھی ۔

پھنی اسی کرسی پر کھڑکی میں آبیٹھا اور تکیہ سے سر لگا کر آسمان کی طرف دیکھنے لگا ۔ اسکو وہ زمانہ یاد آیا کہ جب وہ کالج میں ، زیر تعلیم تھا ، شب کو صحن کالج کے لان پر لیٹ کر ، اپنے بازو پر سر رکھ کر اور جھلملاتے ستاروں کو دیکھکر منی ملکہ کے حسین تصور میں کھو جایا کرتا تھا ۔ ان دنوں کی عارضی جدائی ، ملاقات کی امیدوں کو اپنے آغوش میں لئے بڑی خوش آیند معلوم ہوا کرتی تھی لیکن وہ سب کچھ اب "خواب" معلوم ہوتا تھا ۔

ستارے آسمان سے اوجھل ہونے لگے ۔ تاریکی نے دائیں بائیں اوپر نیچے سب طرف سے پردے ڈالنے شروع کئے ، اور یہ پردے آنکھ کے پپوٹوں کی طرح مل گئے ۔ دنیا محو خواب ہوگئی ۔

لیکن آج پھنی بھوشن پر ایک خاص کیفیت طاری تھی ۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ اس کی امیدیں برآنے کا وقت قریب آگیا ہے ۔

گذشتہ راتوں کی طرح آہٹ پھر اشنان گھاٹ کی سیڑھیوں پر چڑھنے لگی ۔ پھنی نے آنکھیں بند کرلیں ، اور خیالات میں مستغرق ہوگیا ۔ کھلے دروازہ سے داخل ہو کر تمام مکان میں ہوتی ہوئی خوابگاہ کے دروازہ پر آکر ٹھہر گئی ۔ پھنی بھوشن کے بدن پر لرزہ طاری ہوگیا ۔ لیکن

آج وہ تہیہ کر چکا تھا کہ اخیر تک آنکھیں نہ کھولوں گا۔ آواز کمرہ میں داخل ہوئی۔ کھونٹی پر کی ساڑھی طاق کے لیمپ۔ کھلے ہوئے پاندان۔ دیگر متفرق اشیا کے پاس تھوڑی تھوڑی دیر ٹھہری اور آخر میں بھوشن کی کرسی کی طرف بڑھی۔

اب تو بھوشن نے آنکھیں کھول دیں۔ ہلکی ہلکی چاندنی کھڑکی سے آرہی تھی۔ اُسکی نظروں کے سامنے ایک ڈھانچہ۔ ایک پنجر کھڑا تھا۔ اُسکی انگلیوں کی ہر ہر پور پر چھلا تھا۔ کلائیوں میں کڑے، گلے میں مالا۔ غرضیکہ ہر ہر جوڑ مرصع کار زیورات سے دمک رہا تھا۔ تمام زیور ڈھیلے ہونیکی وجہ سے نکلے پڑتے تھے۔ آنکھیں ویسی ہی بڑی بڑی اور روشن مگر جذبۂ محبت سے عاری تھیں۔ اٹھارہ سال قبل شادی کی رات کو شہنائیوں کی سریلی صداؤں میں انہی موہنی آنکھوں سے منی ملکہ نے پھنی بھوشن کو پہلی مرتبہ دیکھا تھا آج بھی آنکھیں برسات کی بھیگی چاندنی میں اُسکے چہرہ پر جمی ہوئی تھیں۔

پنجر نے داہنے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ پھنی بھوشن خود بخود چل پڑنے والی کل کی طرح اُٹھا اور پنجر کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔ ہر قدم پر اُس کی ہڈیاں چٹخ رہی تھیں۔ زیور بج رہے تھے۔ وہ برآمدہ سے گذرے سیڑھیوں سے نیچے اُترے اور اُسی راستہ پر ہو لیے جو اشنان گھاٹ کو جاتا تھا۔ تاریکی میں جگنو کبھی کبھی چمک اُٹھتے تھے مدھم چاندنی درختوں کے گنجان پتوں سے نکلنے کے لیے کشمکش کر رہی تھی۔ یہ دونوں لب دریا پہنچے۔ پنجر نے سیڑھیوں سے اُترنا شروع کیا۔ سطح آب پر چاندنی کا عکس دریا کی لہروں سے کھیل رہا تھا۔ پنجر دریا میں کود پڑا۔ اُسکے پیچھے پیچھے پھنی بھوشن کا قدم بھی دریا میں گیا۔ اُسکا طلسم خیال ٹوٹا تو وہاں کوئی نہ تھا۔ صرف درختوں کی ایک لمبی قطار پاسبانی کر رہی تھی۔ پھنی کے بدن پر لرزہ طاری تھا۔ پھنی اچھا تیراک تھا۔ لیکن اُسکے ہاتھ پاؤں بس میں نہ تھے۔ اگلے لمحہ میں وہ اجل کے اتھاہ دریا کی تہ میں جا چکا تھا"

اس دردناک انجام پر اسکول ماسٹر نے داستان کو ختم کیا۔ اس کے اختتام پر ہمیں پھر ایک مرتبہ مہیب خاموش فضا کا احساس ہوا۔ ہوا بھی خاموش تھی اندھیرے میں میرے چہرہ سے بھی میرے خیالات کا مطالعہ وہ نہ کر سکتا تھا۔ "کیا آپ اسکو افسانہ سمجھتے ہیں" اُس نے مشتبہ انداز میں پوچھا:۔

" اور آپ " میں نے جواب میں دریافت کیا'

"نہیں۔ میں تو اسے حقیقت نہیں سمجھتا۔ اول تو اس وجہ سے کہ قدرت ناول نگاری اور فسانہ نویسی سے بالاتر ہے"

"اور دوسری وجہ یہ ہے کہ میں ہی پھنی بھوشن ہوں" میں نے قطع کلام کرکے کہا۔ اسکول ماسٹر کچھ زیادہ پریشان نہ تھا

"لیکن آپکی بیوی کا نام" اُس نے پوچھا

" نرپتیا کالی"

(مترجمہ سید اشفاق حسین ایم اے)

جشنِ چراغاں

از حضرت فطرت واسطی

آج دیوالی کی شب ہے، رنگِ شب صد رنگ ہے
چشم خیرہ ہوش حیراں، شادمانی دنگ ہے

لالہ زاروں سے سوا خوشرنگ دیوالی کی رات
دیدنی ہے آج قندیلوں کی سڑکوں پر برات

جلوہ ہائے حسن کیف و رنگ یکساں لئے
قمقمے، فانوس، برقی روشنی، شمعیں، دئے

مہر و مہ باہم حریفِ ارتقائے روشنی
شب کو نکلی دھوپ گویا دن کو چھٹکی چاندنی

ہر طرف قطروں کے جھونوں میں شعاعوں کا ہجوم
جیسے کاشی میں اتر آئے ہوں ماہ و نجوم

آج چھایا ہے زمیں پر حسنِ پروینِ فلک
آج ہر گھر میں اتر آئی ہے تزئینِ فلک

دیکھکر جوشِ چراغاں مانتا ہے ہار چاند
آجکی شب حسنِ کاشی میں لگے ہیں چار چاند

ہر طرف گانا بجانا اور دوالی کی رسوم
ہر طرف جلووں کی بارش ہر طرف نغموں کی دھوم



ایک تنقیدی بحث

مرزا داغ دہلوی اور حضرت بیخود موہانی کا ایک ایک شعر

(از سید مسعود حسن رضوی ادیب ایم۔ اے صدر شعبۂ فارسی و اُردو لکھنؤ یونیورسٹی)

[راقم حروف نے اپنی کتاب "ہماری شاعری" میں مرزا داغ دہلوی کا ایک شعر پیش کر کے دکھایا ہے کہ اس میں معشوق سے وعدہ خلافیوں کی شکایت نرم لہجے میں کی گئی ہے۔ حضرت بیخود موہانی نے اپنے مختصر رسالے "جوہر آئینہ" میں اس رائے سے اختلاف کیا ہے اور لہجے کی سختی دُور کرنے کی غرض سے اُس شعر کے الفاظ بدل کر ایک نیا شعر تیار کیا ہے۔ اس مضمون میں ان دونوں شعروں کے متعلق موصوف کی رایوں پر ایک تنقیدی نظر ڈالی گئی ہے۔ ادیب]

جو تمہاری طرح تم سے کوئی جھوٹے وعدے کرتا
تمھیں منصفی سے کہدو تمھیں اعتبار ہوتا

مرزا داغ کے مندرجہ عنوان شعر کے متعلق "ہماری شاعری" میں لکھا گیا ہے:۔

"اس شعر میں عاشق معشوق سے وعدہ خلافی کی شکایت کرتا ہے۔ اس کے لئے ایسے ہی نرم الفاظ مناسب تھے کہ محبوب کے نازک دل پر گراں نہ ہوں اور جو اثر مطلوب ہے وہی پیدا ہو۔ لیکن اگر کوئی فوجی افسر اپنے ماتحت سپاہیوں سے عدولِ حکم پر بازپرس کرنے میں اسی طرح کے لفظ استعمال کیا کرے تو جو اثر ہوگا وہ ظاہر ہے۔"

معترض کا ارشاد ہے:۔

۱۔ "اگر نرم الفاظ یہی ہیں تو سخت الفاظ کیسے ہوتے ہیں۔"

۲۔ "دو مصرعوں میں اتنی نرمیاں موجود ہیں۔ تم جھوٹے[۱] ہو۔ تم نامنصف[۲] ہو۔ تم اعتبار[۳] کے قابل نہیں۔"

معترض کا پہلا قول ایک دعویٰ ہے اور دوسرا اُس دعوے کی دلیل ہے جس کو شعر خود باطل کر رہا ہے۔ اسلئے کہ جن تین جملوں سے کلام کی سختی پر استدلال کیا گیا ہے اُن میں سے ایک بھی شعر میں موجود نہیں ہے۔

معترض کا طرز استدلال صاف ظاہر کر رہا ہے کہ وہ موضوعِ بحث ہی کو نہیں سمجھ سکے۔ شاعر نے اپنا مفہوم جن الفاظ میں ادا کیا ہے وہی الفاظ یہاں زیر بحث ہیں۔ شعر کا مفہوم اپنے الفاظ میں بیان کر کے

شاعر کے الفاظ سے بحث کرنا صریح مغالطہ ہے۔ اگر مفہوم میں کوئی فرق نہ ہو تو بھی الفاظ کی تبدیلی سے سخت کلام نرم اور نرم کلام سخت ہو سکتا ہے۔ 'تشریف رکھیئے' اور 'نوش فرمائیے' کا مفہوم وہی ہے جو 'بیٹھ جاؤ'، اور 'نگل لے' کا ہے۔ لیکن۔ ان دوسرے جملوں کی سختی پر نظر کرکے پہلے جملوں کو سخت نہیں کہا جا سکتا۔ شاعر کے الفاظ ہی کا بدلنا جائز نہ تھا۔ اُس پر طرّہ یہ ہے کہ معترض صاحب نے شاعر کا مفہوم بھی بدل دیا ہے۔

شاعر کہتا ہے :-

"جو تمہاری طرح تم سے کوئی جھوٹے وعدے کرتا"

اگر کوئی اس قول کی جگہ یہ جملہ استعمال کرے کہ

'تمہارے وعدے جھوٹے ہوتے ہیں'

تو مفہوم وہی رہے گا مگر کلام نسبتاً سخت ہو جائے گا۔ اس لئے کہ اصل قول سے جو نتیجہ نکالا جا سکتا ہے وہ اس جملہ میں صاف صاف ظاہر کر دیا گیا ہے۔ معترض نے اصل فقرے کی جگہ یہ جملہ استعمال کیا ہے کہ "تم جھوٹے ہو"۔ ظاہر ہے کہ یہ جملہ "تمہارے وعدے جھوٹے ہوتے ہیں" سے بھی کہیں زیادہ سخت ہے۔ اس جملہ میں کذب کی نسبت معشوق سے بالواسطہ تھی' اسمیں بلاواسطہ ہے۔ وہاں صرف وعدے جھوٹے تھے' یہاں ہر بات جھوٹی ہے۔ اور یہ قائل کا مقصود نہیں ہے۔

شعر میں ایک جملہ ہے "تمھیں منصفی سے کہدو"۔ معترض صاحب اس جملہ کو 'تم نامنصف ہو' کے ہم معنی قرار دیتے ہیں۔ مگر اس جملہ کے معنی صاف ہیں کہ فیصلہ تمھیں پر چھوڑا جاتا ہے' انصاف تمہارے ہی ہاتھ ہے۔ یعنی مخاطب سے انصاف کی توقع کی گئی ہے۔ وہ منصف قرار دیا گیا ہے نہ کہ 'نامنصف'!

شاعر کہتا ہے :-

"جو تم سے کوئی جھوٹے وعدے کرتا (تو) تمہیں اعتبار ہوتا"؟

معترض صاحب اس مفہوم کو یوں ادا کرتے ہیں کہ "تم اعتبار کے قابل نہیں"۔ عاشق معشوق کے وعدوں کو ناقابل اعتبار کہنا چاہتا ہے۔ مگر صریحاً نہیں کہتا۔ بلکہ اُسی سے پوچھتا ہے کہ کیا تم کو ایسے وعدوں کا اعتبار ہوتا۔ کہاں یہ نرم طرز ادا کہاں "تم اعتبار کے قابل نہیں" کا ڈھیلا ! کہاں کنایتہً کسی کے صرف وعدوں کو ناقابل اعتبار کہنا کہاں صراحتہً خود اُس کو ہر اعتبار سے بے اعتبار ٹھہرانا !!

شاعر نے جس مطلب کو نرم لہجے میں ادا کیا تھا حضرت معترض نے اُس کو سخت الفاظ میں پیش کیا ہے اور اِس طرح ناظرین کو مغالطے میں ڈال کر شعر کو سوقیانہ اور مثال کو بے محل ثابت کرنے کی کوشش کی ہے!

'فاضل ناقد کو اس شعر میں تمہاری طرح اور تم سے پر بھی اعتراض ہے۔

ارشاد ہوتا ہے :-

۱- مصرع اول "جو تمہاری طرح" سے شروع ہوتا ہے یعنی اشارے کنائے سے کام نہیں لیا جاتا۔ ادائے مطلب کے لئے کسی اور واقعے یا فرضی قصے کی ضرورت نہیں سمجھی جاتی بلکہ معشوق خود ہی مثال میں پیش کیا جاتا ہے"۔ (ص)

۲- "تم سے۔ دیکھئے ضمیر کس قدر نزاکت اور نرمی کا پہلو لئے ہوئے ہے"۔ (ص)

یہ اعتراض فطرت ناشناسی پر مبنی ہے۔ اس شعر کا انداز صاف بتاتا ہے کہ عاشق اور معشوق کے درمیان سے بیگانگی اور تکلف کے پردے اُٹھ چکے ہیں اور عاشق کو معشوق کی وعدہ خلافیوں کی شکایت کرنے کا حق حاصل ہو چکا ہے۔ ایسے محل پر بلا تصنع گفتگو کرنا فرضی قصے گڑھنے سے کہیں زیادہ موثر ہوتا ہے اور "تم" کے لفظ سے "آپ" اور "جناب" سے کہیں زیادہ محبت کا اظہار ہوتا ہے۔

مختصر یہ کہ ان تمام مغالطوں کے بعد بھی ذوق سلیم کو اس شعر کو سخت بات نرم لہجے میں کہنے کی ایک اچھی مثال ماننا پڑے گا۔

اب ذرا اُس شعر پر بھی ایک نظر ڈالنا چاہیئے، جو معترض صاحب نے اِس کے جواب میں کہا ہے۔ اور جس کے ایک ایک لفظ کی مدح سرائی کی ہے۔ فرماتے ہیں :-

مری جاں یونہیں جو تم سے کوئی ایسے وعدے کرتا
تمہیں اپنے دل میں سوچو تمہیں کیا خیال ہوتا

شعر "مری جاں" سے شروع ہوتا ہے اور اس خطاب میں بڑی بڑی خوبیاں بیان کی گئی ہیں۔ لیکن رمز شناسانِ ادب کو اسی طرزِ تخاطب سے یہ معلوم ہونے لگتا ہے کہ خطاب کرنے والے کو خود کوئی شکایت نہیں۔ بلکہ مخاطب کے وعدوں سے کسی اور کو تکلیف پہنچی ہے اور یہ حضرت ناصحانہ انداز سے اُس کو سمجھا رہے ہیں کہ "مری جان" ذرا سوچو تو کہ اگر کوئی تم سے ایسے ہی وعدے کرتا تو تمہارے دل پر کیا گزرتی۔ فطرت کا تقاضا یہ تھا کہ یہاں ایسا طرز بیان اختیار کیا جاتا کہ معشوق کی پیہم وعدہ خلافیوں سے عاشق کو جو تکلیف پہنچی تھی وہ مترشح ہوتی۔ مگر حضرت معترض اس میں قاصر رہے۔

"یونہیں" کے لفظ کے متعلق ارشاد ہوتا ہے کہ یہ "تمہاری طرح" کا قائم مقام ہے اور اتنے زائد معنی بھی رکھتا ہے۔ کہ

"اس وقت بھی معشوق نے کوئی ایسی بات کہی ہے جس پر یونہیں کہا گیا ہے"۔ (ص)

اس لفظ کے جو معنی اور جو فائدے مصنف شعر نے بتائے ہیں وہ سب "ایسے" کے لفظ سے بھی

حاصل ہوتے ہیں۔ اگر "یو نہیں" کو نکال کر مصرع یوں بنا لیں

"مری جان تم سے کوئی اگر ایسے وعدے کرتا"

تو بھی مطلب میں کوئی کمی نہ ہوگی۔ پس ظاہر ہے کہ "ایسے" کی موجودگی میں "یونہیں" حشو محض ہے۔
ہاں اگر مصنف شعر کی توضیح سے قطع نظر کریں تو "یونہیں" اسی طرح کے معنے دیگا، اور طرز و انداز کی
طرف اشارہ کرے گا۔ اس معنی میں یہ لفظ حشو نہ ٹھہرے گا۔

"کوئی ایسے وعدے کرتا" اس فقرے کی تعریف و تحسین میں مبالغے کی انتہا کر دی ہے۔ فرماتے ہیں:-

"ایسے وعدے" سے زیادہ بلیغ مہذب اور آمادۂ رحم کرنے والے لفظ غالباً اس محل کے لئے
خلق ہی نہیں ہوئے۔" (صفحہ ۹)

اس جملے میں "اس محل" سے مراد ہے نازک مزاج معشوق سے جھوٹے وعدوں کی شکایت کرنے
کا موقع۔ یہ بات غور کے قابل ہے کہ "ایسے وعدے" کے معنی صرف جھوٹے وعدے کیونکر ہو سکتے ہیں۔
اس فقرے سے جھوٹے وعدے، سچے وعدے، مایوس کن وعدے، امید افزا وعدے، مبہم وعدے، مہمل وعدے
اور نہ معلوم کیسے کیسے وعدے مراد لیے جا سکتے ہیں۔ شعر میں کوئی لفظ ایسا نہیں ہے جو سامع کو
"ایسے وعدے" سے جھوٹے وعدے، سمجھنے پر مجبور کرے۔ اس مبہم فقرے کی خرابیاں آگے چل کر اور
بھی واضح ہوں گی۔

"تمھیں اپنے دل میں سوچو" مصنفِ شعر کے خیال میں اس ٹکڑے سے یہ معنی نکلتے ہیں:-

"تمہارے ایسے وعدے خدا نکردہ میرا دل دکھانے یا مجھے محروم رکھنے کے لئے نہیں ہیں۔ نہ اس وجہ
سے ہیں کہ تم خوئے انصاف نہیں رکھتے۔ بلکہ تمہارا یہ برتاؤ بے خیالی اور متوجہ نہ ہونے کی وجہ سے ہے۔" (صفحہ ۹)

ممکن ہے کہ مصنف شعر نے اپنے دل میں یہی سوچا ہو مگر الفاظ شعر یہ مفہوم ادا کرنے سے قاصر ہیں۔
حقیقت تو یہ ہے کہ اس فقرے سے مراد قائل کے بالکل خلاف یہ مطلب نکل رہا ہے کہ ایک مرتبہ وعدہ خلافی ہو،
دو مرتبہ ہو، تین مرتبہ ہو، تو اسے بے خیالی اور بے توجہی پر محمول کریں۔ لیکن ان متواتر وعدہ خلافیوں سے
حسن ظن کی گنجایش ہی نہیں رہی۔ اس جملے میں ایک نقص اور بھی ہے جس عاشق کا پیمانۂ صبر لبریز
ہو چکا ہو اور وہ شکایت کرنے پر آمادہ ہو گیا ہو، اس کو اس سے کیا اطمینان ہوگا کہ معشوق اپنے
دل میں سوچے اور سوچ کر چپ ہو رہے۔ اس خاموشی سے اس کی شکایت میں کمی تو نہ ہوگی البتہ
یہ نئی شکایت اور پیدا ہو جائے گی۔ کہ

یاں لب پہ لاکھ لاکھ سخن اضطراب میں — واں ایک خاموشی تری سب کے جواب میں

پیچ ہے فطرت شناسی ہر شخص کا حصہ نہیں ہے۔

"تمہیں کیا خیال ہوتا" معترض صاحب اِس فقرے کی دل آویزی پر بھی وجد کرتے ہیں۔ اور اس کا مطلب یہ بتاتے ہیں:-

"تم کو خود ایسے وعدوں پر اعتبار نہ آتا" (صفحہ ۹)

مگر جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے ایسے وعدے، کا مبہم فقرہ ذہن سامع کو احتمالات کی بھول بھلیاں میں پھنساتا ہے۔ اس کے بعد یہ دوسرا فقرہ تمہیں کیا خیال ہوتا، پہلے سے بھی زیادہ مبہم ہے۔

اگر داغ کا شعر تھوڑی دیر کے لئے اپنے ذہن سے نکال ڈالئے تو یہ حقیقت کھل جائے کہ نہ ایسے وعدے کے معنی ہیں جھوٹے وعدے، نہ تمہیں کیا خیال ہوتا، کا مطلب ہے "تم کو خود اعتبار نہ آتا۔ بلکہ اِن دونوں فقرے کا ابہام ناگفتہ بہ باتوں کی طرف اشارہ کرکے شعر کو دائرۂ تہذیب سے خارج کئے دیتا ہے۔

ایسے وعدے، اور کیا خیال ہوتا، اِن دونوں فقروں کو ابہام کے الزام سے بچانے کے لئے معترض صاحب فرماتے ہیں:-

۱۔ (معشوق) خوب جانتا ہے کہ وہ کیسے وعدے کرتا ہے، جھوٹے یا سچّے" (صفحہ)

۲۔ "وہ خوب جانتا ہے کہ اِس عبارت کا مفہوم کیا ہے" (صفحہ ۹)

یہ بھی ایک مغالطہ ہے۔ عاشق و معشوق تو ایک دوسرے کے اشارے کنائے بھی سمجھ لیتے ہونگے۔ مگر یہاں تو شعر کا مفہوم اُس کو سمجھنا ہے جو نہ عاشق ہے نہ معشوق یعنی جو متکلم اور مخاطب کے علاوہ ایک شخص غیر ہے۔ آخر وہ ان مبہم فقروں کا مفہوم کیونکر معین کرے؟

معترض صاحب اپنے اور مرزا داغ کے شعر میں یہ فرق بتاتے ہیں:-

"یہاں یہ باتیں پیار اور محبت کی ہیں اور وہاں شکایت تھی" (صفحہ)

اس قول سے ظاہر ہے کہ اگر معترض کا شعر تمام نقائص سے پاک بھی فرض کر لیا جائے تو بھی وہ داغ کے شعر کی جگہ نہیں لے سکتا۔ یہ تو اُس وقت ممکن تھا جب اِس شعر میں بھی وہی شکایت ہوتی مگر لہجہ داغ کے شعر سے زیادہ نرم ہوتا۔

آخر میں معترض نے دفع دخل کے لئے لکھا ہے کہ مرزا داغ کے شعر کے خلاف جو کچھ کہا گیا ہے وہ حقیقت میں "ہماری شاعری" کے مصنف کے خلاف کہا گیا ہے۔ اسلئے کہ اُس نے معشوق کو نازک مزاج لکھدیا ہے۔ ورنہ چونکہ اِس شعر میں مخاطب ایک عصمت فروش شاہد بازاری ہے اس لئے یہ طرز کلام برمحل ہے۔

"اگر مرزائے مرحوم (داغ) کا دعویٰ ہوتا کہ یہ شعر نازک دل نازک مزاج معشوق سے وعدہ خلافیوں کی شکایت کے محل پر کہا گیا ہے تو بے شک اُن کی خدمت میں بھی وہی عرض کیا جاتا جو "ہماری شاعری" کے مولف کی خدمت عالی میں عرض کیا گیا۔" (صفحہ)

ممکن ہے کہ معترض صاحب نے کسی مخصوص عمل کے ذریعے مرزا داغ کا دلی منشا دریافت کر لیا ہو۔ ورنہ شعر کے الفاظ سے تو یہی مترشح ہوتا ہے کہ معشوق بڑا نازک مزاج ہے۔ جھوٹے وعدے کرتا ہے اور اعتبار نہ کرو تو بگڑتا ہے۔ اسی نازک مزاجی کے خیال سے عاشق صاف صاف نہیں کہہ سکتا کہ تمہارے وعدے اعتبار کے قابل نہیں۔ بلکہ خود معشوق کو حکم بنا کر اُسی سے پوچھتا ہے کہ اگر میری جگہ تم ہوتے تو کیا ایسے وعدوں پر اعتبار کرتے۔



زمانہ تیس سال پہلے

تیس سال ہوئے زمانہ بابت نومبر ۱۹۳۳ء میں مولانا اشہری مرحوم کا ایک مضمون "ہماری بیماریاں اور علاج" کے عنوان سے شائع ہوا تھا جس میں صاحب مرحوم نے تمام ہندوستان اور ہندوستانیوں کے امراض کی کیفیت بیان کرتے ہوئے لکھا تھا کہ

(۱) تقسیم بنگالہ نے اس کے دل میں غیر متوقع بیماریوں کی راہ نکالی اور مشرقی بنگال نے ان بیماریوں کو مزمن کرنے کی بنیاد ڈالی ہے۔

(۲) جنوبی ہندوستان کے شریف اور بہادر مرہٹے اپنے فخر شرافت اور تنفر کی بیماریوں میں مبتلا ہو رہے ہیں۔

(۳) آریہ فرقہ جس نے جدید رفارم کی عملی کوشش شروع کی تھی وہ زیادہ تر زبان کی بیماریوں میں پھنس رہا ہے۔

(۴) پنجاب پالیٹکس کی ہوازدگی میں آیا ہوا معلوم ہوتا ہے۔

(۵) ممالک متحدہ کو اندرونی بے چینیاں ستا رہی ہیں۔ دل میں درد ہے مگر آہ و فریاد کے نالے بلند نہیں ہوتے۔

(۶) ایک بہت بڑی بیماری جس نے قریب قریب ہر حصہ ملک میں اپنا اثر پھیلا رکھا ہے اپنے آپ کو بھولنا ہے۔

تنقید کتب

اسلامی طب[1]

کہتے ہیں کہ انسان کے عالم وجود میں آنے کے بعد دو علم دنیا میں پیدا ہوئے۔ ایک علم المذاہب، دوسرا علم طب لیکن ابھی تک یہ امر تصفیہ طلب ہے کہ ان دونوں میں اولیت کا شرف کس علم کو حاصل ہے۔ لیکن جب یہ دیکھا جاتا ہے کہ انسان کی سب سے پہلی ضرورت اپنے جسم کو صحیح و تندرست رکھنا ہے، تو گمان غالب ہوتا ہے کہ پہلے علم طب ہی پیدا ہوا تھا۔ البتہ علم المذاہب کو طب پر یہ فوقیت ضرور حاصل ہے، کہ وہ الہامی ہے اور طب تجرباتی علم ہے۔

عرب جو اسلام کا گہوارہ ہے، زیادہ تر ریگستان ہے، جہاں زندگی بڑی سختی سے بسر ہوتی ہے۔ اس لئے عرب اوّل تو بہت کم بیمار ہوتے تھے، اور اگر بدقسمتی سے کوئی بیمار بھی ہو جاتا تھا، تو اسکا کوئی باقاعدہ علاج نہ ہوتا تھا۔ اور جسطرح ہندوستان کے دور افتادہ دیہات میں درختوں کی پتیوں یا جھاڑ پھونک سے علاج کر لیتے ہیں، اسیطرح عرب بھی کر لیتے تھے۔ لیکن یہ بات حضری عربوں میں نہ تھی۔ شہروں کے عرب قافلے بنا کر تجارت کی غرض سے عموماً مصر و شام کو جایا کرتے تھے اور کبھی کبھی عراق و ایران میں بھی جاتے تھے۔ اور اسطرح وہ علم طب میں رومیوں اور ایرانیوں کی صحبت سے بہرہ اندوز ہو جاتے تھے۔

عہد اسلام میں سب سے پہلا عرب طبیب حارث ابن کلدہ گذرا ہے جس کا قبیلہ ثقیف سے تعلق تھا۔ اور طائف میں رہتا تھا۔ جب خلافت کے بعد امارت قایم ہوگئی اور ملک شام میں بنی امیہ کا دور دورہ ہوا تو عرب لوگ بھی علم طب کی باقاعدہ تحصیل کرنے لگے۔ چنانچہ امیر معاویہؓ کے دربار میں ایک عیسائی طبیب ابن آثال نامی تھا جس نے امیر موصوف کے حکم سے طب یونانی کی کتابوں کا عربی زبان میں ترجمہ کیا۔ اسیطرح عہد اموریہ میں ایک عیسائی طبیب استفانوس (غالبًا Stephens) نامی گذرا ہے جسے کشتہ جات کا ماہر سمجھا جاتا ہے، اور جس نے سب سے پہلے علم کیمسٹری کی کتابوں کا عربی زبان میں ترجمہ کیا۔ ولید بن عبد الملک اموی نے ۸۸ھ ہجری میں سب سے پہلا اسلامی شفاخانہ قایم کیا اور اسی کے عہد میں یہودی و عیسائی علماء و فضلاء سے طب یونانی کی بہت سی کتابوں کا ترجمہ کرایا گیا۔ اس کے بعد نصف صدی کے اندر اندر اسلامی دنیا میں بہت سے شفاخانے قایم ہو گئے جن میں سب سے زیادہ مشہور حکیم جرجیس یونانی

---

[1] ضخامت $\frac{22 \times 18}{8}$ سائز کے ۲۰۷ صفحے۔ قیمت ایکروپیہ۔ ملنے کا پتہ:۔ سن برج ہاؤس، عابد بلڈنگ مصطفیٰ بازار، حیدرآباد دکن۔

(George.) کا شفاخانہ تھا۔ اس حکیم نے سریانی زبان میں ایک قرابادین لکھی جس کا عربی زبان میں حنین ابن اسحق نے ترجمہ کیا۔ یہی حکیم جرجیس یونانی عہد عباسیہ میں خلیفہ منصور کا معالج تھا۔ خلیفہ منصور نے بھی اس سے یونانی طب کی بعض کتابوں کا ترجمہ کرایا۔ غرض یہ شخص یونانی، سریانی، عربی و فارسی زبانیں خوب روانی کیساتھ بولتا تھا۔

خلیفہ ہارون رشید عباسی کے عہد میں طب یونانی کی بہت بڑی سرپرستی ہوئی۔ اور خاندان برمک نے تو اپنے دربار میں ہندوستان سے مشہور و معروف وید بھی بلاکر ملازم رکھے تھے۔ جنھوں نے طب یونانی میں معتدبہ اضافہ کیا۔ چنانچہ طب یونانی میں بہت سی ہندی دواؤں کے نام معرب صورت میں موجود ہیں۔ مثلاً تمر ہندی (املی) قسط ہندی (کٹکی　　) عود ہندی، سا ذج ہندی (سا ذہ - تیز پات) زنبق (چنپا) فلفل (پیپل) خولنجان (کولیجن) سرشف (سرسوں) صندل (چندن) نارجیل (ناریل) وغیرہ۔ خلافت عباسیہ کے زمانہ میں ایورویدہ اور سنسکرت کی بہت سی کتابیں عربی میں ترجمہ ہوئیں۔ حاصل کلام یہ کہ جس چیز کو ہم زمانہ طب یونانی یا "طب اسلامی" کہتے ہیں، وہ ایک معجون مرکب چیز ہے۔ اور جس صورت میں وہ اسوقت موجود ہے وہ ضرور "اسلامی" ہے۔

مولانا قاضی معین الدین صاحب، رہبر فاروقی، منشی فاضل حیدرآباد دکن نے کتاب زیر نظر میں "اسلامی طب" کی تمام مختصر تاریخ ایک جگہ جمع کردی ہے۔ جو اُردو لٹریچر میں ایک قابل قدر اضافہ ہے۔ پوری کتاب تین حصوں میں تقسیم ہے۔ پہلے حصہ میں ان سرپرستیوں کا مختصر ذکر ہے جو شاہان اسلام کے زمانہ میں طب یونانی کو حاصل تھیں۔ دوسرے حصہ میں سلمان سلاطین ہند کی سرپرستیوں کا حال ہے۔ اور تیسرے حصہ میں ملک دکن کے اندر طب یونانی کی ترقیوں کا بیان درج ہے۔ تینوں حصے اپنے اپنے طور پر مکمل اور دلچسپ ہیں۔

طرز بیان اور زبان کے لحاظ سے کتاب عام فہم ہے۔ مگر بعض بعض الفاظ غلطی میں استعمال ہوگئے ہیں۔ مثلاً دیباچہ کے صفحہ (ھ) کی سطر ۱۰ میں لکھا ہے:- "جو سارے زمانہ کو اعجوبہ میں ڈال دے"۔ یہاں "اعجوبہ" معنی "تعجب" یا "حیرت" استعمال کیا گیا ہے۔ جو غلط ہے۔ کیونکہ "اعجوبہ" کے معنی "عجیب چیز" ہیں۔

اسیطرح بعض نام بھی غلط لکھے گئے ہیں۔ مثلاً صفحہ ۳ پر ہندی طب یا ایوروید کے موجد کا نام "دھن نتری" لکھا گیا ہے، اصلی نام "دھنونتری" ہے۔

بعض ناموں کا املا رواج عامہ سے مختلف لکھا گیا ہے۔ مثلاً مشہور یونانی حکیم "افلاطون" کا نام "افلاطن" لکھا گیا ہے۔ معلوم نہیں کہ لائق مصنف نے اسمیں کیا خوبی سمجھی۔

بہرحال یہ خامیاں ایسی نہیں ہیں جو اصل کتاب پر اثر انداز ہوں۔ کیونکہ آئندہ ایڈیشن میں ان کا نہایت آسانی سے خیال رکھا جا سکتا ہے۔ کتابت، لکھائی، چھپائی اچھی ہے، مگر کاغذ معمولی ہے۔

قانون بین الممالک کے اصول اور نظریں

اگرچہ ہندوستانی زبان میں بہت سے علوم و فنون کی کتابیں ہیں اور دوسری زبانوں سے بھی ترجمہ ہو رہی ہیں۔ لیکن ابھی تک اُردو میں ایسی کتاب نہ تھی جسمیں بین الاقوامی قوانین پر بحث کی گئی ہو۔ شکر ہی کہ ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب ایم اے۔ ایل ایل بی، ڈی فل، ڈی لٹ لکچرار قانون بین الممالک جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن نے اس زبردست کمی کو بوجہ احسن پورا کر دیا ہی۔ کتاب زیر نظر ہندوستانی زبان کی اس بڑی کمی کو پورا کرتی ہی۔

اس میں فاضل مصنف نے بین الاقوامی قانون کی تاریخ، اس کے مقاصد، اس کے اصول اور اس کے نظائر پر سیر حاصل بحث کی ہی، اور پوری کتاب کو تین حصوں (۱) مصالحانہ تعلقات (۲) مخاصمانہ تعلقات اور (۳) غیر جانبداری، میں تقسیم کر کے، بین الاقوامی قانون کے تمام ضروری جزئیات پر معقول روشنی ڈالی ہی۔ آجکل جبکہ مشرق و مغرب میں جنگ و جدال کی گھنگھور گھٹائیں چھائی ہوئی ہیں۔ اور یورپ میں "عدم مداخلت" کا مسئلہ چھڑا ہوا ہی، اس کتاب کا مطالعہ بہت مفید ہوگا۔

اس کتاب کا پہلا باب جسمیں تاریخی امور پر روشنی ڈالی گئی ہے، بہت قابل قدر ہے اور وسیع مطالعہ کے بعد لکھا گیا ہی۔ ہمیں صرف اسقدر افسوس ہے کہ اس مفید اور قابل قدر کتاب کی زبان عام فہم نہیں ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہی کہ لائق مصنف نے اس کی زبان کو خواہ مخواہ ادق بنانے کی کوشش کی ہی جس کی وجہ سے اس کتاب کے "ہندوستانی" ڈانڈے عرب و عجم سے جا ملے ہیں۔

ہندوستانی زبان یا اُردو کو ہر دلعزیز و عام فہم بنانے کیلئے ضروری ہی کہ ہماری کتابیں ایسی صاف سلیس و سادہ زبان میں لکھی جائیں جو عربی، فارسی اور سنسکرت کے ثقیل و غیر مانوس الفاظ سے پاک ہو۔ اور جسے ہندوستان بھر میں بولا اور سمجھا جا سکے۔ ہمیں افسوس ہی کہ اس کتاب کی زبان اس معیار پر پوری نہیں اترتی۔ مثلاً فاضل مصنف نے تصفیہ کے بجائے تسویہ، مصالحانہ کی جگہ مسالمانہ لکھا ہی اور بین العائلات[1]۔ اعذار و انذار۔ تعبد۔ مستامن۔ تحکیم جیسے نامانوس الفاظ استعمال کئے ہیں۔

بعض لفظوں کا املا بھی مروجہ املا سے مختلف لکھا گیا ہی۔ مثلاً (۱) علاحدگی (۲) دعوا (دعویٰ) (۳) ارسطو طالیس۔

بعض ترکیبیں غلط استعمال کی گئی ہیں مثلاً (۱) "جو آپ پر وحی کے ذریعہ وقتاً فوقتاً الہام ہوا تھا" اس میں

---

[1] ایران میں خانہ بدوش اور صحرا نشین قبائل کو "ایلیات" کہتے ہیں۔ فاضل مصنف کا مطلب شاید انھیں "ایلیات" سے ہو۔ "عائلات" بھی ہو سکتا ہی۔ کیونکہ عائلہ کے معنی خاندان ہیں۔

وحی کے بعد الہام کا لانا غلط ہے "نازل" چاہیئے۔ (۲) آپس میں برت میں آئیں" چار لفظوں کے جملہ میں "میں میں" کی تکرار نا مناسب ہے۔ راقم کا مدعا "آپس میں برتے جاتے ہیں" لکھنے سے بخوبی روشن ہو جاتا۔

بعض انگریزی الفاظ کا ترجمہ بھی قابل ذکر ہے۔ مثلاً (۱) Ideal کا ترجمہ "مطلح" کچھ اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ "آدرش" زیادہ صحیح گو اُردو میں کسی قدر غیر مانوس ہے۔ (۲) ANARCHY. کا ترجمہ "نراجی" بہت اچھا کیا گیا ہے۔

فاضل مصنف نے بعض جگہ جدت طرازی سے بھی کام لیا ہے۔ مثلاً (America India) کا ترجمہ امریکن ہندی ہے۔ لیکن فاضل مصنف نے صنعت ایجاز یعنی اختصار سے کام لیتے ہوئے "امریکن" کا پاؤں اور "ہندی" کا سر اڑا دیا اور اسطرح ایک نیا لفظ "امرندی" بنا لیا ہے۔ مگر دیکھنے کی بات یہ ہے کہ اس ایجاد کو قبول عام کی سند بھی ملتی ہے یا نہیں۔

کتاب کے شروع میں الفاظ کے تلفظ کو آسان بنانے کے لئے املا اور اعراب کے طریقوں پر بھی مفید بحث کی گئی ہے۔ اور آخر میں انڈکس بھی شامل کر دیا گیا ہے۔

کاغذ، لکھائی، چھپائی، سب اچھی ہے۔

ہر مشکل کا حل[1]

انگلستان کے نفسیاتی رسالہ "سائنس آف تھاٹ ریویو" کے ایڈیٹر مسٹر ہنری طامس ہیملن نے روحانیات کے موضوع پر ایک چھوٹی سی مگر قابل قدر کتاب "ہیلنگ دی ہارڈ ٹائمز کانشنس" کے نام سے لکھی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کی تمام مشکلات کی جڑ اسکی خدا ناشناسی ہے۔ جب انسان خدا شناس اور حق آشنا ہو جاتا ہے تو فطرت اسے نفس مطمئن ودیعت فرما دیتی ہے۔ پھر اسے کوئی ضرورت کوئی احتیاج اور کوئی مشکل مصیبت نہیں معلوم ہوتی۔ اس سبق آموز کتاب کو سردار بھگت رام شرما بی۔ اے ریٹائرڈ چیف انسپکٹر مدارس ریاست پٹیالہ نے اُردو کا جامہ پہنا کر اس کا نام "ہر مشکل کا حل" رکھا ہے۔ اس کتاب میں جو اصول درج ہیں اگر ان پر انسان عمل کرے تو واقعی دین و دنیا دونوں میں فائدہ اُٹھا سکتا ہے۔

فاضل مترجم نے حتی الامکان سلیس لٹریری زبان میں ترجمہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور ہمیں یہ دیکھکر خوشی ہوئی کہ انھیں بڑی حد تک کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ لیکن بعض الفاظ کا ترجمہ نظر ثانی کے قابل ہے۔ مثلاً "مادی آگہی" "یزدانی بھلا معروفانہ" "ثبتانانہ" "تنگی بہر سانی" وغیرہ۔ ہمکو اُمید ہے کہ لائق مترجم کو دوسرے ایڈیشن میں اس کا پورا موقعہ ملیگا۔

لکھائی، چھپائی، کاغذ اچھا ہے۔

---

[1] ضخامت چھوٹی تقطیع کے ۱۱۰ صفحات۔ قیمت بارہ آنہ۔ ملنے کا پتہ:۔ نرتشی اینڈ سنز پبلشرز لاہور

سنتیج

یہ امر مسلّمہ ہے کہ بچے قوم کا بہترین سرمایہ ہوتے ہیں۔ انھیں کی تعلیم و تربیت اور عمدہ کردار پر قوم کے عروج و زوال ضعف و طاقت اور شہرت و عظمت کا انحصار ہوتا ہے۔ اور یہ امر مسلّمہ ہے کہ بچوں کی تعلیم و تربیت ماں کی گود ہی سے شروع ہوتی ہے۔ چنانچہ جو عادتیں، بُری یا بھلی، بچپن میں پڑ جاتی ہیں وہ عمر بھر قایم رہتی ہیں، اسلئے بچوں کی آئندہ زندگی کے لئے ضروری ہے کہ شروع ہی سے انکا اٹھان پسندیدہ ہو۔

سردار بھگت رام شرما بی۔ اے۔ ریٹائرڈ چیف انسپکٹر مدارس ریاست پٹیالہ ہمارے مبارکباد کے مستحق ہیں کہ آپنے مسٹر کرسچن ڈی لارسن کی کتاب "کنسٹرکٹو چائلڈ ٹریننگ" کا ترجمہ کر کے اُردو خواں جماعت پر بڑا احسان کیا ہے۔ اس کتاب میں جو اصول درج کئے گئے ہیں۔ اگر واقعی ان کے مطابق بچوں کی تعلیم و تربیت عمل میں لائی جائے تو ملک کے لئے از حد مفید ہوگا اور آنیوالی نسل ہندوستان کے لئے قابل فخر ہو گی۔ جن لوگوں کو والدین ہونے کا اعزاز حاصل ہے، وہ اس کتاب کا ضرور مطالعہ فرمائیں۔

تیج کرشن نمبر ۱۹۳۷ء

جنم اشٹمی کی مبارک تقریب پر اکثر ملکی اخبار "کرشن نمبر" شائع کرتے ہیں چنانچہ اس سال بھی کئی کرشن نمبر ہمارے دفتر میں موصول ہوئے۔ لیکن جو شان اور جامعیت "روزنامہ تیج" دہلی کے کرشن نمبر میں ہے وہ کسی میں نہیں۔ اس نمبر میں نظم و نثر کے ۱۴۳ مختلف مضامین ہیں، جو دنیا کے مشہور اہل قلم، مفکرین، شعرائے کرام اور ماہرین تعلیم و روحانیات کے زور طبع کا نتیجہ ہیں۔ یوں تو سبھی مضامین پُر لطف اور قابل دید ہیں لیکن ان میں پنڈت برجموہن دتاتریہ صاحب کیفی، مسٹر جواہن بالڈون امریکہ، مسٹر جارج آرنڈیل، شری یت سوبھاش چندر بوس، مولانا ظفر علی خاں، مولانا سیماب اکبر آبادی، مسٹر بھولا بھائی ڈیسائی، حضرت منور لکھنوی، آنربل سر سکندر حیات خاں، منشی تلوک چند محروم، مسٹر سی ایف اینڈریوز، مہاراجہ سر کشن پرشاد، مسٹر فرانسیس یونورٹ ہامر، جاپانی پروفیسر ٹکاسو، مسز ایلن ولکنسن ممبر پارلیمنٹ، پروفیسر کیتھ حضرت جوش ملیح آبادی، مسٹر لانسبری، سر فرانسس ینگ ہسبنڈ، جناب احسن ماہروی، پال ڈی میکنٹ گورنر انڈیانا، پروفیسر گوبند بہاری لال امریکہ وغیرہ وغیرہ کے مضامین خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اس نمبر میں پانچ رنگی تصویریں بھی دی گئی ہیں جو سب نظر فریب اور خوبصورت ہیں۔ انھیں علیحدہ کر کے کمروں میں آویزاں کیا جا سکتا ہے ٹائیٹل پر ایک دلکش دریائی منظر دکھایا گیا ہے۔ غرض بہ حیثیت مجموعی یہ نمبر دیکھنے اور رکھنے کے قابل ہے۔

لکھائی، چھپائی دیدہ زیب۔ کاغذ نفیس، ضخامت بڑے سائز ۱۶۴ صفحات۔

ا۵ قیمت بارہ آنہ۔ ملنے کا پتہ:۔ آرمی پریس دیال باغ۔ آگرہ

۵۲ قیمت چھ آنہ۔ جو اس پرچہ کے محاسن ظاہری و معنوی کے نزدیک کچھ بھی نہیں ہے۔

رفتار زمانہ

مُسلم لیگ کی نزاع

اس طرف کچھ دنوں سے کانگریس اور مُسلم لیگ کے باہمی اختلافات سے ملک کی پبلک لائف میں غیر معمولی پیچیدگی پیدا ہوگئی ہے۔ پچھلے انتخابات اسمبلی میں اس اختلاف نے چنداں نمایاں صورت اختیار نہ کی تھی۔ اور عارضی وزارتوں کے کے زمانہ میں بھی دونوں جماعتوں کے لیڈران کی رہنمائی میں کوئی بین فرق ظاہر نہ ہوا تھا۔ لیکن کانگریسی وزارتوں کے قائم ہوتے ہی بعض لیڈران لیگ کانگریسی وزارت میں شامل نہ کئے گئے تو کانگریس سے قدرتاً مایوسی ہوئی۔ دوسری طرف کانگریس نے عوام سے تعلق پیدا کرنے کی جو پالیسی اختیار کی ہے اور بعض سرگرم مسلم حامیاں کانگریس نے جس طرح اس پر عملدرآمد کی کوشش شروع کر دی ہے۔ اس سے پُرانے پُرانے مسلم رہنماؤں میں ایک ہلچل سی برپا ہوگئی ہے۔ اس پر طرہ یہ ہوا کہ پنڈت جواہر لال نہرو نے زور وشور سے یہ کہنا شروع کر دیا ہے کہ سیاسی جدوجہد میں مذہب کو کوئی دخل نہ ہونا چاہیئے۔ اس کے ساتھ ان کا یہ دعویٰ کہ ملک میں گورنمنٹ کے علاوہ دوسری پارٹی صرف کانگریس ہی کی ہے قدرتاً مسٹر جناح صدر مسلم لیگ کو بہت ناگوار معلوم ہوا۔ چنانچہ مسٹر ممدوح نے اس دعویٰ کو اپنے لیڈری کی توہین اور مسلم لیگ اور مسلمانوں کی جداگانہ حیثیت کی صریح تردید قرار دیا مگر صدر کانگریس اپنی رائے اور رویہ پر قائم رہے۔ اور ان دونوں عظیم الشان لیڈروں کے درمیان کشیدگی بڑھتی گئی۔ چنانچہ گذشتہ اکتوبر میں لکھنؤ میں مسلم لیگ کا جو شاندار اجلاس ہوا، اُسمیں اس اختلاف بلکہ عناد کا بدترین مظاہرہ دیکھنے میں آیا۔ مسٹر جناح جیسے قابل لیڈر سے ہم کو توقع تھی کہ اس مشکل وقت میں وہ مُسلمانوں کو کوئی شاہراہ عمل بتلائیں گے، جو ملک اور فرقہ دونوں کے لئے مُفید ہوگی۔ مگر سارا زور کانگریس کی مخالفت پر صرف کیا گیا۔ اور سب مقرروں نے اسی بات کے ظاہر کرنے کی کوشش کی کہ کانگریس ہندو جماعت ہے، اور ہندو مسلمانوں کی تہذیب و شائستگی کو مٹانے کے درپے ہیں۔ اور ہر جگہ مسلمانوں کی حق تلفی ہو رہی ہے۔ بات یہ ہے بقول ہمعصر "سند" مُسلم لیگ میں وہی لوگ شریک ہیں جو یا تو امیر ہیں یا متوسط طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان لوگوں کو خصوصاً مقتدر مُسلم لیڈروں کو یہ خیال ہوگیا ہے کہ اگر عام مسلمان کانگریس کے زیر اثر آجائیں گے تو برٹش گورنمنٹ تمام لیڈروں اور مقتدر لوگوں کو پس پُشت ڈال کر اُنکی ذاتی پوزیشن اور مفاد کو ہی نظر انداز کر دے گی۔ بہر حال یہ بھلا دینا بہت آسان ہے کہ اِسوقت ملک کو جو سیاسی حقوق ملے ہیں وہ کانگریس ہی کے جدوجہد کا نتیجہ ہیں۔ اور عوام کے فلاح و بہبود کے لئے کانگریس جو کچھ بھی کرے گی اُس سے ناممکن ہے، کہ مسلمانوں کو بھی فائدہ نہ پہونچے۔ مگر عوام کو بدظن کرنا آسان ہے۔ چنانچہ مسٹر جناح کے ایڈریس کا شروع سے آخر تک

یہی لب لباب ہے کہ کانگریس مسلمانوں کو ہر ممکن نقصان پہونچانے پر تُلی ہوئی ہے، اور تہذیب، زبان اور مذہب سب کچھ خطرے میں ہے۔ اِس دعوے کے استدلال کے لئے نئے نئے دلائل اختراع ہو رہے ہیں، مثلاً بندےماترم گیت اور قومی جھنڈے وغیرہ پر نئے نئے اعتراضات ہو رہے ہیں۔ ہندی اُردو کے جھگڑے پر بھی زور دیا گیا ہے۔ حالانکہ قومی گیت عرصہ تیس سال سے رائج ہے اور بقول صدر کانگریس یہ کوئی کانگریس کا منظور شدہ گیت نہیں ہے۔ اور قومی جھنڈے میں سبز رنگ اسلامی جذبات کے احترام کے غرض سے شامل کیا گیا ہے۔

کانگریس اِس بات کا بھی بار بار اعلان کر چکی ہے کہ وہ ہندوستانی زبان کی حامی ہے اور ہندی اُردو دونوں رسم الخط کو یکساں تسلیم کرتی ہے۔ صوبہ متحدہ کی کانگریس گورنمنٹ نے تین ہی چار ماہ کے اندر قانون ساز کونسلوں میں ہندوستانی زبان کو جو درجہ دیدیا ہے وہ مُلک کی تاریخ میں اُس سے پہلے اسے کبھی نصیب نہ ہوا تھا۔ اور ملک میں پہلی دفعہ امسال سرکاری بجٹ اور اسمبلی کا پروگرام اور روئداد اُردو ہندی دونوں میں شائع ہوئی۔

بات یہ ہے کہ ابتک کسی فریق کو جب کبھی عوام کے جذبات پر مشتعل کرنا ہوتا تھا تو گاؤکشی اور مسجد کے سامنے باجہ کا سوال فرقہ بندی کا کام دیتا تھا۔ مگر اب یہ نسخہ پُرانا ہو چکا ہے اِس لئے متوسط طبقے کو بدظن کرنے کے لئے نئی باتیں گڑھنے کی ضرورت پڑ رہی ہے۔

اِس وقت برٹش گورنمنٹ اور گورنران صوبہ سے بھی خفگی ہے کہ اُنھوں نے کانگریسی وزارتوں کو مُسلم لیگ کے نمایندوں کو وزارت میں شامل کرنے پر کیوں نہیں مجبور کیا۔ حالانکہ مسٹر جناح خوب جانتے ہیں کہ موجودہ اصلاحات کا مقصد و منشا یہی ہے کہ ملک میں سیاسی پارٹیاں قائم ہوں۔ جنہیں مختلف مذاہب کے پیرو پولٹیکل معاملات کو مُلکی نقطہ خیال سے جانچنے کے عادی ہوں۔

آخر شروع اپریل ۱۹۳۷ء میں مسٹر جناح نے بھی مسلم لیگ کے لیڈروں کو عارضی وزارتوں میں شامل ہونے سے باز رکھا تھا۔ لیکن اب جبکہ کانگریسی وزراء نے اپنی وزارتوں میں صرف کانگریسی خیال کے مسلمان مدبروں ہی کو شامل کرنا مناسب سمجھا تو مسٹر جناح کو اصولاً اِسمیں کیا اعتراض ہو سکتا ہے؟ کیا پنجاب میں یونینسٹ پارٹی کے لیڈر سر سکندر حیات اور بنگال میں پرجا پارٹی کے رہنما مسٹر فضل الحق نے بھی اپنی وزارت کے ہندو اراکین کے انتخاب میں اسی اصول کو مدنظر نہیں رکھا؟ کیا وہ اپنے موجودہ ہندو مہا سبھائیوں کو برخاست کرکے صرف ان صاحبوں کو اپنی وزارت کا رکن بنانے پر رضامند ہونگے، جن کو پنجاب و بنگال اسمبلی کے ہندو ممبران انتخاب کریں؟ اگر یہ دونوں وزیراعظم ایسا نہیں کر سکتے تو کانگریس سے آئینی اصول کی خلاف ورزی کی کیوں اُمید رکھی جاتی ہے۔ اور ایسا مطالبہ کیوں کیا جاتا ہے۔ جس کو اصولاً کوئی سیاسی پارٹی منظور نہیں کر سکتی؟

اگر کانگریس مسلمانوں کے حقوق یا اُن کی تہذیب و شائستگی کو پامال کرنے پر تُلی ہوتی تو کم سے کم صوبہ سرحدی

میں اُسے اِسقدر عروج و مقبولیت حاصل نہ ہوتی۔ پھر کیا واقعی ہندوستان کے سات آٹھ کروڑ مسلمان ایسا نرم نوالہ ہیں جنکو ملک کیا دُنیا کی کوئی طاقت بھی آسانی سے مٹا سکتی ہے؟

آخر اِس بُزدلی کیا وجہ ہے کہ مسلمانوں کی سب سے بڑی سیاسی جماعت قدم قدم پر "اسلام خطرہ میں" کا وحشت انگیز و مایوسی خیز نعرہ بلند کر رہی ہے۔ کانگریس گورنمنٹ نے اِس اثناء میں کون سی بات ایسی کی ہے جس سے مسلمانوں کو نقصان پہونچنے کا اندیشہ ہو سکتا ہے؟ کیا عوام کی ترقی کے پروگرام میں مسلم عوام کو کوئی فائدہ نہ پہونچیگا؟ کیا ہندوستانی زبان میں تقریر کرنے اور کاروائیاں قلمبند کرنے سے اُردو کو نفع نہ ہوگا؟ کیا کسانوں کی فلاح و بہبود کی اسکیم سے مسلمانوں کی مالی حالت بھی درست نہ ہوگی؟ کیا عام تعلیم کی اسکیم رائج ہونے سے مسلمانوں بچے بھی تعلیم نہ پائیں گے؟

اِسوقت کانگریسی گورنمنٹ کا سب بڑا اور اہم پروگرام ترک مُنشیات ہے۔ گو ہم کو اس کی فوری کامیابی میں شک ہے لیکن یہ امر مُسلمہ ہے کہ شراب کی جسقدر مخالفت اسلام نے کی ہے دُنیا کے کسی دوسرے مذہب نے نہیں کی، پھر کیا دیندار مُسلمانوں کے لئے یہ انتہائی خوشی کا موقع نہیں ہے کہ مُلک کی تاریخ میں پہلی مرتبہ کانگریس شراب خواری کے خلاف جد وجہد کیلئے متحد ہو رہی ہے۔ اور اپنے اصلاحی جوش میں کروڑوں روپیہ کی آمدنی کا نقصان برداشت کرنے کو بھی تیار ہے۔

یہ بھی عجیب لطف کی بات ہے کہ مسلم لیگ کیطرح ہندو مہا سبھا بھی کانگریس سے خائف ہے۔ بہر حال کانگریس پر اِسوقت وہی مثال صادق آرہی ہے کہ "تو کہے گبر مجھے گبر مسلمان مجھکو"۔

کھدر اور ہاتھ کے بُنے ہوئے کپڑوں کی جو قدر دانی کانگریس نے کی ہے اِس سے بھی مُسلمانوں کو کافی فائدہ پہونچا ہے۔ چنانچہ اس وقت کانگریس نے اِس تحریک کے بدولت ۹۳ ہزار مسلمانوں کے معاش کا بندوبست کر رکھا ہے۔

یہ بھی اچنبھے کی بات ہے کہ ایک طرف مسٹر جناح اپنی صدارتی تقریر میں کانگریس کے آزادی کامل والے ریزولیوشن کا مضحکہ اُڑاتے ہیں، دوسری طرف لیگ اِسی کو اپنا معیار قرار دیتی ہے۔ معلوم نہیں کہ اِس ریزولیوشن کے متعلق مسٹر جناح کیا رویہ اختیار کریں گے۔ اصولاً وہ اُسے منظور نہیں کر سکتے ہیں لیکن اگر وہ اور اُن کے ساتھی واقعی اس کے حامی ہو گئے ہیں تو ہم کہیں گے کہ اُن کے اور کانگریس کے مطالبے میں کوئی فرق ہی نہیں رہا۔

لیگ نے عوام میں کام کرنے کا بھی جو پروگرام طے کیا ہے وہ کانگریس کے پروگرام کی نقل ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ کانگریس کی اس سے زیادہ اور کیا تعریف ہو سکتی ہے۔ اسکی مخالف جماعتیں بھی اس کے بتلائے ہوئے راستے پر چلنے کا ارادہ کریں۔ اگر واقعی لیگ نے اِس پروگرام پر عملدرآمد کیا تو ہم کہیں گے کہ کانگریس کا منشا پورا ہو گیا اور اُس کے خیالات رنگ لائے بغیر نہ رہے۔

ہم کو دلی افسوس ہے کہ اس دفعہ مسلم لیگ کے پلیٹ فارم پر بعض بہت ہی غیر ذمہ دارانہ تقریریں ہوئی ہیں۔ مسٹر فضل الحق نے اپنے سر پر بنگال کی وزارت کا جو بوجھ اُٹھایا ہے، معلوم ہوتا ہے اس سے انھیں بہت سرگرانی ہوگئی ہے ورنہ وہ ایسی ناعاقبت اندیشی کی تقریر نہ کرتے کہ اگر دوسرے صوبوں میں مسلمانوں کیساتھ کوئی زیادتی ہوئی تو میں اُس کا جواب بنگال میں دونگا۔

آنریبل مسٹر پنتھ وزیراعظم صوبہ متحدہ نے اِس کے متعلق خوب کہا ہے کہ دوسرے صوبوں میں کچھ ہی کیوں نہ ہو، اپنے صوبے میں مَیں ہندو مسلمان دونوں کا خیرخواہ ہوں اور کسی پر کوئی زیادتی برداشت نہیں کرسکتا۔ ہم کو افسوس ہے کہ مسٹر فضل الحق نے فوری جوش میں آکر اپنی پوزیشن کو اِسقدر بھلا دیا اور اپنی زبان سے ایسا کلمہ نکال بیٹھے۔ جس کیلئے اُنھیں پشیمانی اُٹھانا پڑیگی۔

بہرکیف سر سکندر حیات ہوں یا مسٹر فضل الحق یا کوئی اور صاحب یہ ناممکن ہے کہ ایک ہی وقت میں وہ لیگ کے بھی حامی ہوں اور مشترکہ سیاسی پارٹیوں کے لیڈر بھی بنے رہیں۔ جلد یا دیر میں یہ دورنگی مہنگی ثابت ہوگی۔

مسلم لیگ کا کانگریس پر یہ بھی الزام ہے کہ وہ مسلمانوں میں نفاق پھیلا رہی ہے لیکن مسلم لیگ نے جو رویّہ اختیار کیا ہے اُس کی مخالفت خود مسلمانوں کی کئی با اثر جماعتیں کررہی ہیں۔ احرار پارٹی۔ شیعہ کانفرنس اور مومن کانفرنس کانگریس کا ساتھ دے رہی ہیں۔ بہرحال یہ وقت ہے کہ یکجہتی و یگانگت پر زور دیا جائے نہ کہ باہمی مخالفت بڑھائی جائے۔ ہماری اب بھی یہی آرزو ہے کہ مقتدر مسلم لیڈران وقت کی نزاکت کا احساس کرکے کانگریس سے سمجھوتہ کرکے رفاہ عام کے کاموں میں اتفاق و یکجہتی سے کام کرنے کی ابتدا کریں۔ کانگریس کو بھی ہم یہی رائے دیں گے کہ وہ رفاہ عام کا خیال رکھتے ہوئے اور عوام کے ساتھ تعلق پیدا کرتے ہوئے بھی خواص سے بے پرواہ نہ ہوں، اور جہانتک ممکن ہو سب کی دلجوئی کرکے عوام کو باہمی کشمکش کے نرغے سے بچائیں۔

اِسمیں کوئی شک نہیں کہ عوام بیدار ہورہے اور مسلمانوں میں بھی ضروریات کا احساس ہورہا ہے۔ مسلم لیگ میں آزادئ کامل کا ریزولیوشن پاس ہونا صاف ظاہر کرتا ہے کہ لوگ پرانے لیڈروں کے اختیار و اقتدار سے باہر ہورہے ہیں۔ اِس اثنا میں مسلمانوں کے چار ضمنی انتخابات اسمبلی ہوئے ہیں، جن میں صرف ایک حلقے میں کانگریس کو فتح حاصل ہوئی ہے لیکن کانگریسی امیدواروں کو مجموعی حیثیت سے جسقدر ووٹ ملے ہیں، وہ آیندہ کے لئے بہت حوصلہ افزا ہیں۔

نوٹس

پریم چند نمبر زمانہ جلد شائع ہونے والا ہے جو صاحب حفاظت کے خیال سے اُسے بذریعہ رجسٹری منگوانا چاہیں وہ براہِ کرم چار آنے کے ٹکٹ ڈاک مینجر زمانہ کے پاس بھیجدیں۔

زمانہ

جلد ۶۹ | دسمبر ۱۹۳۷ء | نمبر ۶

نقشِ عبرت

از حضرت جگر مراد آبادی

کل شبِ مہتاب میں اِک بلبلِ آتش نوا
بن رہا تھا مرکزِ فکر و نظر میرے لئے
ناگہاں لب ہائے برگ گل سے آئی یہ صدا
نالہ کرتا ہے عبث اے بے خبر میرے لئے
میں بھی ہوں تیری طرح خونیں جگر خونیں کفن
تو نہ اپنی جان کھو اے مشتِ پر میرے لئے
بس یہ سننا تھا کہ پائے گُل پہ گر کر مر مٹا
بن گیا اک نقشِ عبرت عمر بھر میرے لئے

اشعار

نگاہِ کرم کی ضرورت نہیں ہے — کہ اب مجھ میں تابِ محبت نہیں ہے
مجھے بھی ہے احساس اپنی خودی کا — اگر تجھکو میری ضرورت نہیں ہے

بیگم شمرو

(مسٹر پیارے لال شاکر میرٹھی)

بیگم شمرو کے نام کے ساتھ ایک پُرشکوہ داستان وابستہ ہے۔ اُس کو دُنیا سے رخصت ہوئے ایک صدی گذر چکی ہے، لیکن اُس کے کارنامے ابھی تک بدستور زندہ ہیں، اور رہتی دُنیا تک زندہ رہینگے۔

میرٹھ سے تیئس میل جانب شمال مغرب کوتانہ نامی ایک قصبہ میں غالباً ۱۷۴۶ء میں بیگم شمرو ایک ذی مرتبہ شخص لطیف علیخان کے یہاں پیدا ہوئی۔ اُس کے اجداد عرب سے ہجرت کرکے ہندوستان آئے، اور پھرتے پھراتے کوتانہ میں آبسے۔ ایک ہی دو پُشتوں میں اُن کی قومیت ہندوستانی تہذیب و معاشرت کے سانچے میں ڈھل گئی۔ اور چونکہ رشتہ داریاں بھی ہندوستانی شرفا کے یہاں ہوئیں اس لئے رفتہ رفتہ اُن کی زبان بھی فارسی ہوگئی۔

بیگم شمرو ابھی چھ سال ہی کی تھی کہ اُس کے والد کا انتقال ہوگیا۔ اُس کے بڑے بھائی نے جو پہلی بیوی سے تھا۔ اُسے اور اُس کی والدہ کو بہت پریشان کیا۔ جس سے تنگ آکر وہ دونوں دہلی چلی گئیں، بیگم شمرو بلا کی حسین اور فطرت کی بہترین صناعی کا دلکش نمونہ تھی۔ قد پستہ، بدن گداز، بڑی بڑی سیاہ اور چنچل آنکھیں، خدوخال نازک و لطیف، طبیعت کی بہت دلیر اور مستقل مزاج تھی۔ کسی بڑے سے بڑے خطرہ کو خطرہ نہ سمجھتی تھی۔ وہ اُنیس بیس برس کی تھی کہ اُس پر رینہارڈ نامی ایک خوبصورت جرمن نوجوان کی نظر پڑ گئی، اور تھوڑے ہی عرصہ میں دونوں رشتہ مناکحت میں منسلک ہوگئے۔

والٹر رینہارڈ ایک قسمت آزما سپاہی کی حیثیت سے ہندوستان آکر فرانسیسی فوج میں بھرتی ہوگیا تھا۔ مئی ۱۷۵۷ء میں جب کلائیو نے چندر نگر کی فرانسیسی آبادی پر خلاف معاہدہ اچانک حملہ کرکے قبضہ کرلیا۔ تو فرانسیسی فوج کے ایک مختصر دستہ نے انگریزوں کی اطاعت قبول نہ کی۔ رینہارڈ بھی اسی جماعت میں شامل تھا۔ یہ مختصر جمعیت لا کی سرکردگی میں مرشدآباد پہنچی اور نواب بنگال کے ہاں ملازم ہوگئی۔ ۱۷۶۰ء میں جب اُن کا بہادر سرپرست گرفتار ہوگیا تو رینہارڈ نے پٹنہ جاکر خواجہ گریگوری خان[1] کی

[1] خواجہ گریگوری خان یا گرگین خان مشہور آرمینی مدبر اور تاجر خواجہ پطرس کا بھائی اور میر قاسم کی افواج کا (اگلے صفحہ پر)

ماتحتی میں ایک فوجی عہدہ قبول کرلیا۔ رفتہ رفتہ کچھ ایسے انقلابات رونما ہوئے کہ میر قاسم کا ستارہ چمکا جسے انگریزوں نے بنگال کا نواب بنادیا۔ میر قاسم کے عروج کے ساتھ رینہارڈ کا ستارہ بھی چمک اُٹھا۔

رینہارڈ فوجی آدمی تھا جسے زیادہ تر گھر سے باہر رہنا پڑتا تھا۔ اُس کی اِس معاشرت نے اُس کے رنگ پر بھی اثر ڈالا۔ پھر اُس کی طبیعت میں افسردگی کا مادہ بہت زیادہ تھا۔ ان وجوہ کے باعث اُس کے یوروپین رفقاء اُسے سومبر کہنے لگے۔ یہی سومبر ہندوستانیوں کی زبان پر آکر شمرو بن گیا۔ اور وہ اسی مہمل لقب سے یاد کیا جانے لگا۔

شمرو ہندوستانی افواج کو قواعدِ جنگ سکھاتا تھا۔ ایک پورا بریگیڈ اُس کے کمان میں تھا۔ جب نواب بنگال اور انگریزوں میں اختلاف ہوگیا اور مقابلہ تک نوبت آگئی تو شمرو اپنی فوج لے کر انگریزوں کے مقابلہ پر ڈٹ گیا۔ یہ ۲؍اگست ۱۷۶۳ء کی مشہور لڑائی کا ذکر ہے۔ یہ لڑائی اگرچہ صرف چار ہی گھنٹے جاری رہی، لیکن انگریزوں کا بہت نقصان ہوا۔ اُن کی یوروپین بٹالین ۸۴؁ قریب قریب تہس نہس ہوگئی، نیز دو توپیں بھی چھن گئیں۔ میر قاسم انگریزوں کی بدعہدی پر بہت بگڑا ہوا تھا۔ اُس نے حکم دیا کہ تمام یوروپین قیدی پٹنہ پہنچائے جائیں۔ کہا جاتا ہے کہ میر قاسم نے اِن قیدیوں کو پٹنہ میں موت کے گھاٹ اُتار دیا اور اس ظالمانہ خدمت کو شمرو نے انجام دیا۔

اسی زمانہ میں برطانی فوج جو پٹنہ میں مقیم تھی، وہ اسیٹ انڈیا کمپنی کے رویّہ سے ناخوش و غیر مطمئن ہوکر مخالفت پر آمادہ ہوگئی۔ اسمیں ہندوستانی فوج بھی شامل تھی اور یوروپین فوج بھی، ۱۱؍فروری ۱۷۶۵ء

(پچھلے صفحہ کا بقیہ) سپہ سالار اور وزیر جنگ تھا۔ اُس کی ماتحتی میں میر قاسم کی فوج کی کایا پلٹ ہوئی تھی۔ اپنی قابلیتوں کے باعث جوانی ہی میں اُس نے تمام منزلیں طے کرلی تھیں۔ میر قاسم کی فوج کے ایک اور عہدہ دار غلام حسین کو اُس سے پُرخاش تھی، گرگوری خان کی ترقیاں اُس سے نہ دیکھی گئیں۔ وہ مختلف طریق پر اُس کے خلاف میر قاسم کے کان بھرتا رہا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ میر قاسم صرف گرگوری خان ہی سے نہیں بلکہ اپنے تمام فوجی افسروں سے بدظن ہوگیا۔ اُس کو یقین دِلایا گیا تھا کہ گرگوری خان کی انگریزوں سے سازباز ہے۔ لہذا میر قاسم نے ایک حبشی سپاہی کو اُس کے قتل پر مامور کردیا۔ حالانکہ وہ اپنے آقا کا دلی خیرخواہ اور وفادار تھا۔ چنانچہ ایک اور آرمینی طامس خواجہ مل اس کی تائید کرتا ہے، وہ لکھتا ہے:۔ "انگریزوں نے خفیہ طور پر اُس کو پیغام بھیجا کہ نواب کو قید کردے تو اس کو معقول معاوضہ و انعام دیا جائیگا۔ مگر اُس نے صاف جواب دیا کہ یہ نمکحرامی مجھ سے نہ ہوگی"۔ میر قاسم کے پاس گرگوری خان اور تقی خان یہی دو قابلِ اعتماد آدمی تھے، اور جب اپنی حماقت سے اُس نے اِن دونوں کو کھو دیا تو اُس کے پاس اب اور کیا رہ گیا تھا۔ تھوڑے ہی دنوں میں انگریز بنگال پر مسلّط ہوگئے۔

کا ذکر ہے کہ یوروپین بٹالین نے مسلح ہوکر توپ خانہ پر قبضہ کرلیا اور پھر بنارس کی طرف چلدی۔ اِس فوج کو شمرو نے واپسی کی ترغیب دی۔ انگریزی سپاہیوں نے شمرو کی صلاح مان لی اور باقیوں نے اپنا کوچ جاری رکھا۔ انگریزی سپاہیوں کو شمرو کی سفارش پر میر قاسم نے اپنی فوج میں ملازم رکھ لیا۔ شمرو کا یہ وہ سخت ترین گناہ تھا جس نے انگریزوں کو ہمیشہ بے چین رکھا۔ اور جب کبھی کسی دیسی ریاست سے کمپنی کا کوئی معاہدہ ہوا تو اُسمیں شمرو کی گرفتاری کی شرط بھی درج ہوتی رہی۔

۲۳ اکتوبر ۱۷۶۴ء کو بکسر کی لڑائی نے بنگال کا تختہ اُلٹ دیا۔ نواب بنگال کو زوال ہوا۔ بنگال پر انگریز مسلط ہوگئے اور اسی کے بعد سے شمرو کو عروج ہونے لگا۔

بکسر کی شکست کے بعد شمرو نے اپنی فوج کی حفاظت میں نواب بنگال کو الہ آباد پہنچایا۔ جہاں اُسوقت شاہ عالم بادشاہ اور وزیر اودھ مقیم تھے۔ ابھی شرائط صلح مرتب ہوہی رہی تھیں کہ شمرو نے بندیلکھنڈ کی سرکش ریاستوں کو دبانا اور اُن سے خراج وصول کرنا شروع کردیا۔ شاہ عالم اور وزیر اودھ نے انگریزوں سے بطور خود معاملات طے کرلئے اور نواب بنگال کو اس کی قسمت پر چھوڑ دیا۔ نواب روہیلکھنڈ کی طرف بھاگ گیا۔ شمرو نے بھی اُدھر کا رُخ کیا۔ اُس کی فوج کے یوروپین سپاہیوں کو جب اُن کی بقایا تنخواہ مل گئی تو اُنھیں گویا از سر نو جان پڑگئی۔ اب انھیں یہ فکر دامنگیر ہوئی کہ کسی طرح دیسی ریاستوں کو کمپنی کے پنجۂ استبداد سے محفوظ رکھا جائے۔ شمرو نے بھرت پور کا رُخ کیا۔ مغل سلطنت کی حالت ڈانواڈول تھی۔ بنگال اور دکن ہاتھ سے نکل چکے تھے۔ ادھر شمالی ہندوستان میں مرہٹوں، جاٹوں، روہیلوں اور سکھوں نے سر اُٹھا رکھا تھا۔ شمرو نے اِس موقع سے فائدہ اٹھانا چاہا۔ اُس نے بطور خود ایک فوج مرتب کی، جو چار پیادہ پلٹنوں، ایک رسالہ اور چھ توپوں پر مشتمل تھی۔ اِس فوج کو اُس نے یوروپین طرز پر قواعد سکھائی۔ شمرو کی فوج کے تمام افسر وعہدیدار یوروپین تھے۔ اب جس رئیس کو اُس کی خدمات کی ضرورت ہوتی وہ بمعاوضہ زر کثیر اپنی فوج لے کر پہنچتا۔ روپیہ کمانے کی یہ انوکھی اور عجیب ترکیب شمرو کی ایجاد تھی۔ ہندوستان کی تاریخ میں اس قسم کی اور مثال نظر نہیں آتی۔ فوج مرتب کرنے کے سات آٹھ برس بعد تک شمرو جے پور کا ملازم رہا یا بھرت پور کا۔ اور انھیں دونوں کے زمانۂ ملازمت میں اُس کی فوج نے بڑے بڑے معرکے سر کئے۔

شاہ عالم بہت عرصہ تک اپنے پایۂ تخت سے غیر حاضر رہا۔ اُس کی غیر حاضری میں نجیب الدولہ (نواب سہارنپور) نے دہلی اور اُس کے ملحقات کا نہایت عمدگی اور خوبی سے انتظام کیا۔ اُس کی وفات پر اُس کا بیٹا ضابطہ خاں اُس کا جانشین ہوا۔ لیکن دسمبر ۱۷۷۲ء میں جب شاہ عالم دہلی واپس آیا تو اُس نے

قلمدانِ وزارت نجف خاں نامی ایک ایرانی امیر کو تفویض کر دیا۔ نجف خاں نے شاہ عالم کے ساتھ سفر کی صعوبتیں برداشت کی تھیں اور اُس کے دُکھ درد میں برابر شریک رہا تھا۔ ضابطہ خاں نے شاہ عالم کے اس رویہ کو اپنی اہانت تصور کیا اور کھلی بغاوت پر آمادہ ہو گیا۔ نجف خاں سے شمرو کے حالات چھپے نہ تھے۔ وہ خوب جانتا تھا کہ اُس کی فوج نے کیسے کیسے معرکے سر کئے ہیں۔ لہذا اُس نے فوراً شمرو کو طلب کر کے ضابطہ خاں کی سرکوبی کے لئے روانہ کیا۔

شمرو نے پہنچتے ہی غوث گڈھ کے مضبوط قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ اسمیں شک نہیں کہ ضابطہ خاں نے بڑی بہادری سے مقابلہ کیا لیکن شمرو کی فوج کے سامنے اُس کی ایک پیش نہ گئی۔ چند ہمراہیوں کو لے کر وہ اودھ کی طرف فرار ہو گیا۔ اُس کے متعلقین نیز اُس کا خزانہ شمرو کے ہاتھ آئے۔ اس کامیابی سے نجف خاں کی باچھیں کھل گئیں۔ اُس نے شاہ عالم کو مشورہ دیا کہ شمرو کی فوج کو باقاعدہ ملازم رکھ لیا جائے۔ شاہ عالم نے اس تجویز کو منظور کیا، اور چھ لاکھ روپیہ سالانہ آمدنی کی جاگیر فوجی مصارف کیلئے شمرو کو عطا فرمائی۔ شمرو نے سردھنہ[1] کو اپنا صدر مقام قرار دیا جو اُس کی جاگیر کے عین وسط میں واقع تھا۔ یہ جاگیر ۱۷۷۴ء میں عطا ہوئی تھی۔ جاگیر کا عرض گنگا سے جمنا تک اور طول مظفر نگر سے نواح علیگڈھ تک تھا۔

ڈیڑھ دو برس کے بعد نجف خاں کو خیال ہوا کہ شمرو کی فوج کی مدد سے اُن صوبوں کو دوبارہ کیوں نہ حاصل کیا جائے جو ہاتھ سے نکل چکے ہیں۔ سب سے پہلے شمرو کو راجہ بھرت پور کے مقابلہ پر جانا پڑا جس کا وہ مدتوں ملازم رہ چکا تھا۔ سخت اور خونریز جنگ کے بعد راجہ بھرت پور کو اطاعت قبول کرنا پڑی۔ یہ لڑائی ۱۷۷۵ء میں بسانہ میں ہوئی تھی، جو دہلی کے جنوب میں ساٹھ میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔

اس کے بعد نجف خاں نے آگرہ کو مرہٹوں کی دستبرد سے محفوظ رکھنے کیلئے شمرو کو دوسری بار آگرہ کا سول و ملٹری گورنر مقرر کیا۔ وہ اپنے فرائض کو نہایت عمدگی سے انجام دے رہا تھا کہ ۴ مئی ۱۷۷۸ء کو اُس نے داعیِ اجل کو لبیک کہا۔

بیگم شمرو ہر اہم کام میں اپنے شوہر کا ہاتھ بٹاتی تھی، اور ہر سفر اور مہم میں اُس کے ساتھ رہتی تھی لہذا شمرو کی وفات کے بعد اُس کی فوج کے یوروپین افسروں اور دیسی سپاہیوں نے شاہ عالم سے درخواست کی کہ شمرو کی بیوہ کو فوج کا سردار تسلیم کیا جائے۔ چونکہ شاہ عالم کو ذاتی طور پر بیگم شمرو کی خداداد ذہانت و قابلیت کا علم تھا، اس درخواست کو منظور فرما کر فرمان جاری کر دیا، اور وہ بدستور سردھنہ کی جاگیر پر قابض رہی۔

بیگم شمرو کے بطن سے کوئی اولاد نہیں ہوئی، لیکن پہلی بیوی سے ایک لڑکا تھا جس کا نام ظفریاب خاں تھا

[1] ضلع میرٹھ میں سردھنہ ایک مشہور تحصیل ہے۔ جو میرٹھ چھاونی سے ۱۳ میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔

شمرو کی پہلی بیوی بھی مسلمان تھی، جو بعد کو مرضِ دیوانگی میں مبتلا ہوگئی اور زندگی بھر اسی حالت میں رہی اور ۱۸۳۸ء میں بمقام سردھنہ اُس نے انتقال کیا۔ شمرو کی وفات کے وقت ظفریاب خاں نابالغ تھا۔ اِسلئے بیگم شمرو جاگیر کی وارث ہوئی۔

شمرو کی وفات کے تین برس بعد بیگم شمرو نے آگرہ میں ۷ مئی ۱۷۸۱ء کو مسیحی مذہب اختیار کرلیا۔ اور اُس کا نام جوآنا رکھا گیا۔ اسی موقع پر ظفریاب خاں بھی والٹر بیلطھزر رینہارڈ کے نام سے مسیحی گلہ میں شریک کیا گیا۔

۱۷۸۷ء کے موسم برشگال کے خاتمہ پر ضابطہ خاں کے بیٹے غلام قادر نے سر اُٹھایا، اور بڑھتے بڑھتے دہلی تک آن پہنچا۔ اُسکی خواہش تھی کہ اپنے باپ کی کھوئی ہوئی عزت اپنے زور بازو سے دوبارہ حاصل کرے، جب وہ اپنی کوششوں میں کامیاب نہ ہوسکا تو علمِ بغاوت بلند کردیا۔ اُس زمانہ میں سندھیا حقیقی معنوں میں دہلی پر قابض تھا۔ غلام قادر مرہٹوں کی مورچہ بندی توڑ کر قلعہ پر قابض ہوگیا۔ اور شاہ عالم کو قید کرلیا۔ بیگم شمرو اُس وقت پانی پت میں سکھوں کا مقابلہ کررہی تھی۔ اُس نے شاہ عالم کی اِس دُرگت کی کیفیت سُنی تو فوراً دہلی پہنچی اور قلعہ کے لاہوری دروازے کے سامنے ڈیرے ڈال دیے۔ غلام قادر نے اُس کو سلطنت مُغلیہ کو دو برابر حصوں میں تقسیم کرنے کی ترغیب دی، لیکن بیگم شمرو نے اِس پیشکش کو ٹھکرادیا۔ قلعہ کے سامنے اپنی توپیں جمادیں اور غلام قادر کی گولہ باری کا جواب دینے لگی، غلام قادر سمجھ گیا۔ کہ بیگم شمرو سے مقابلہ کرنا آسان نہیں ہے، اُس کو بھاگتے ہی بن پڑی۔ اس طرح بیگم شمرو کی بروقت امداد سے شاہ عالم کی جان بچی۔ شہنشاہ نے اُس کی اِن جانفروشانہ خدمات کے صلہ میں اُس کو "زیب النساء" کا لقب عطا کیا۔

۱۷۸۸ء میں نجف قلی خان نے سر اُٹھایا، کیونکہ اُسکی جاگیر کا کچھ حصہ ضبط کرلیا گیا تھا۔ اُس کی سرکوبی کو شاہ عالم بہ نفس نفیس گوکل گڈھ متصل ریواڑی گیا۔ بیگم شمرو بھی مع فوج ساتھ تھی۔ جو تین پلٹن اور ایک توپ خانہ پر مشتمل تھی۔ ۵ اپریل کو علی الصبح نجف قلی خان کی سپاہ نے شاہی کیمپ پر زبردست گولہ باری شروع کردی۔ یہ حملہ اچانک ہوا تھا، شاہی کیمپ میں کھلبلی پڑ گئی۔ اندیشہ تھا کہ شاہ عالم کہیں مع خاندان قتل یا قید نہ ہوجائے۔ بیگم شمرو نے یہ کیفیت دیکھی تو سب سے پہلے شاہی خیموں کی طرف بڑھی، اور بادشاہ اور اُس کے متعلقین کو بحفاظت اپنے کیمپ میں پہنچایا۔ اس دوران میں اُس کی فوج نے جارج طامس کی زیر کمان آگے بڑھکر ایسا شدید حملہ کیا کہ نجف قلی خاں کی سپاہ کے چھکے چھوٹ گئے۔ اسی اثناء میں شاہی فوج بھی آگئی، اور دونوں نے ملکر باغی فوج کو پسپا کرکے قلعہ پر قبضہ کرلیا۔ ہر شخص

نے دل سے اعتراف کیا کہ اگر بیگم شمرو اس درجہ ہوشمندی اور بہادری سے کام نہ لیتی تو شاہ عالم کا زندہ رہنا ناممکن تھا۔ شاہی دربار منعقد ہوا۔ اور شاہ عالم نے بیگم شمرو کی خدمات جلیلہ کا اعتراف کر کے اُس کو خلعتِ فاخرہ سے ممتاز کیا اور پرگنہ بادشہ پور (جو دہلی کے جنوب میں جمنا کے کنارے واقع ہے) بطور انعام مرحمت فرمایا۔ اس موقع پر بیگم شمرو نے نجف قلی خاں کی سفارش کی جو منظور ہوئی۔ اُس کی خطائیں معاف کر دی گئیں اور اُس کو از سر نو مقربانِ شاہی میں شامل کر لیا گیا۔

بیگم شمرو بہت جاہ وجلال اور رعب وداب کی مستقل مزاج اور بہادر عورت تھی۔ سنہ ۱۷۹۰ء کا ذکر ہے کہ بیگم شمرو امیر الامراء کی افواج کے ساتھ متھرا میں مقیم تھی۔ ایک دن اُسکو خبر ملی کہ اُسکی دو لونڈیوں نے اُس کے آگرہ والے خس پوش مکانات میں آگ لگادی ہے۔ بیگم کی تمام قیمتی اشیاء، اُس کے خاص افسروں کی بیویاں، بیوائیں اور بچے بھی اُنھیں مکانات میں تھے۔ بہت سی جائداد آگ کی نذر ہوگئی اور اگر جلد سے جلد آگ فرو نہ کر دی جاتی تو بہت سی جانیں بھی آگ کی نذر ہو جاتیں۔

دونوں لونڈیاں آگرہ سے گرفتار ہو کر بیگم شمرو کے روبرو متھرا کے شاہی کیمپ میں لائی گئیں بیگم شمرو نے معاملہ کی تحقیقات اپنے یوروپین اور مسیحی افسروں کے سپرد کی۔ لونڈیوں پر جرم ثابت ہوا بیگم شمرو نے حکم دیا کہ دونوں کے کوڑے لگائے جائیں اور بعد ازاں دونوں کو زندہ دفن کر دیا جائے۔ بیگم شمرو کا یہ فعل بظاہر بڑا ظالمانہ معلوم ہوتا ہے لیکن لونڈیوں کے جرم کے مقابلہ اُن کی سزا کو زیادہ سنگین اور ظالمانہ نہیں کہا جا سکتا۔

اپریل سنہ ۱۷۹۱ء میں انوپ شہر کے کمان افسر کرنل اسٹوآرٹ کو ایک سکھ سردار بھنگا سنگھ نے قید کر لیا۔ میجر پامر نے بیگم شمرو کو اس معاملہ کی اطلاع دیکر امداد چاہی۔ بیگم شمرو نے پندرہ ہزار زرِ فدیہ دیکر ۲۴ اکتوبر سنہ ۱۷۹۱ء کو کرنل اسٹوآرٹ کو رہا کرا دیا۔ سکھوں نے کرنل اسٹوارٹ کو دہلی بھیجدیا۔ بیگم شمرو اپنے چار انگریز افسروں اور ایک دستہ فوج کو لے کر دس میل تک پیشوائی کو گئی اور کرنل اسٹوارٹ کو اپنے ساتھ لے آئی۔ گورنر جنرل نے بیگم شمرو کے اس ہمدردانہ رویہ کی اپنی کونسل میں بڑی داد دی اور اُس پندرہ ہزار کی رقم کی واپسی کے علاوہ ایک مناسب تحفہ بھی اُس کو پیش کیا۔

سنہ ۱۷۹۲ء سے بیگم شمرو کی زندگی کا نیا باب شروع ہوتا ہے۔ سنہ ۱۷۷۸ء میں جب بہادر شمرو نے انتقال کیا تو اُس کے ماتحتوں نے بیگم شمرو کو کامل طور پر اپنا سردار تسلیم کر لیا تھا۔ لیکن اس جماعت میں کچھ سرکش اور مفسد لوگ بھی تھے۔ باہمی رنجش، حسد، رقابت وغیرہ کے مکروہ جذبات نے اُنکی آنکھوں پر پردے ڈال رکھے تھے۔ آئے دن ایک نہ ایک نیا قضیہ پیدا ہوتا تھا۔ بیگم شمرو اِن گتھوں کو

سُلجھانے کی لاکھ کوشش کرتی، مگر حالات بد سے بدتر ہوتے گئے۔ بالآخر بیگم شمرو کو مشورہ دیا گیا کہ اگر وہ دوسری شادی کرلے گی تو اپنے جدید شوہر کی مدد سے ان مشکلات پر غالب آسکیگی۔ اس وقت اس کی عُمر کم وبیش پینتالیس[۴۵] برس کی تھی۔

جارج طامس کا ذکر کیا جاچکا ہے۔ اس نے ۱۷۸۷ء میں بیگم شمرو کی ملازمت اختیار کی، ہر موقع پر اُس نے اپنی ہمت وجوانمردی کے جوہر دکھائے تھے، اور بیگم شمرو کے مشیروں پر بھی اُس کا خاصا اثر تھا اُس نے بیگم شمرو سے شادی کرنے کی خواہش کی۔ لیکن بیگم شمرو اپنے ایک فرانسیسی افسر لے وَیشو کی طرف مائل تھی۔ لے وَیشو عالی خاندان ہونیکے علاوہ تعلیم یافتہ اور نیک اطوار شخص تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں افسروں میں نوک جھوک ہونے لگی، اور اسی طرح فوج میں بھی دو[۲] گروہ ہوگئے، مجبوراً جارج طامس اپنی خدمات سے مستعفی ہوکر دہلی چلا گیا۔ ۱۷۹۳ء میں بیگم شمرو نے لی وَیشو سے شادی کرلی، جو نامبارک ثابت ہوئی کیونکہ فوج کے افسروں اور سپاہیوں نے اِس شادی کو اپنے مرحوم سردار کی ذلت واہانت تصور کیا انھیں اندیشہ لاحق ہوگیا کہ وہ جاگیر جو اُن کے گذارے کیلئے عطا ہوئی تھی، اب ایک اجنبی کے ہاتھ میں چلی جائے گی۔

لی وَیشو بلا کا ضدّی اور متکبّر تھا۔ اور اُس کی انھیں عادتوں کی وجہ سے دیگر فوجی افسر اُس سے کبیدہ تھے۔ رفتہ رفتہ تمام فوج باغی ہوگئی۔ بیگم شمرو اور اُس کے شوہر کے لئے یہ صورتِ حالات ناقابل برداشت تھی۔ بیگم نے سوچا کہ ریاست کو مندرجہ ذیل شرائط پر سیندھیا کے سُپرد کردیا جائے تو بہتر ہوگا:۔

۱۔ بیگم شمرو کو ذاتی سامان وجائداد لے جانے کی اجازت دی جائے۔

۲۔ جاگیر کی آمدنی بدستور افواج سردھنہ کے مصارف کی کفیل ہوگی۔

۳۔ ظفریاب خاں کو دو[۲] ہزار روپیہ ماہانہ وظیفہ تاحیات دیا جائے گا۔

ادہر لی وَیشو نے سر جان شور گورنر جنرل سے درخواست کی کہ اُس کو چندر نگر پہنچا دیا جائے لیکن اِس سے قبل کہ کوئی تصفیہ ہوتا یا کم ازکم جواب ہی موصول ہوتا۔ سپاہیوں کو اِس خط وکتابت اور اُسکے اغراض کا علم ہوگیا۔ اب کیا تھا، فوج کھلم کھلا بغاوت پر آمادہ ہوگئی۔ جارج طامس کا یار غار لیگوئس باغیوں کا سرغنہ بن گیا۔ فوج نے شمرو کے فرزند ظفریاب خاں کو دہلی سے طلب کیا۔ لی وَیشو کو فوج کی اس کارروائی کا علم ہوا تو وہ اور بیگم راتوں رات نکل بھاگے۔ لیکن سردھنہ سے تین[۳] ہی میل پہنچے تھے۔ کہ فوجی دستہ نے جالیا۔ بیگم شمرو ایک پالکی میں سوار تھی اور لی وَیشو گھوڑے پر۔ فوجی دستہ نے الگ الگ دونوں کو اپنے نرغہ میں لے لیا، جس کے باعث دونوں ایک دوسرے سے جُدا ہوگئے۔ ایک طرف بندوق چلی اور چند نفوس زخمی بھی ہوئے۔ بیگم شمرو نے بندوق کی آواز سُنی تو معاً خیال ہوا کہ اُس کے شوہر کو

تو باغیوں نے قتل کر دیا، اور اب اُن کے ہاتھوں اُس کا بھی یہی حشر ہونے والا ہے۔ بیگم نے اپنے سینے میں خنجر بھونک لیا۔ بیگم شمرو کے ہمراہ متعدد ماما ئیں تھیں۔ اُنھوں نے یہ کیفیت دیکھی تو ایک دم چیخنے چلانے لگیں۔ لی وئیشو کسی قدر فاصلہ پر تھا۔ اُس نے دریافت کیا کہ کیا معاملہ ہے؟ جواب ملا کہ بیگم نے اپنے تئیں قتل کر ڈالا۔ دوسری بار اُس نے پھر وہی سوال کیا اور وہی جواب پایا۔ ایک خادمہ نے پالکی کا پردہ اٹھا کر بیگم شمرو کی نقاب دکھائی جو خون میں تر تھی۔ یہ دیکھتے ہی لی وئیشو نے اپنی جیب سے پستول نکالا۔ اور اُس کی نال اپنے مُنھ میں دے کر لبلبی دبا دی۔ اُس کا دماغ پاش پاش ہو گیا۔

بیگم شمرو نے خود اپنے ہاتھ سے اپنے سینے میں خنجر مارا تھا۔ لیکن ہاتھ کچھ اوچھا پڑا تھا، اور اب اُسمیں اتنی سکت نہ تھی کہ دوسرا وار کر کے اپنا کام تمام کرتی۔ فوجی دستہ نے پہلے تو لی وئیشو کی لاش کی ہر طرح ذلت و توہین کی۔ بعد ازاں بیگم شمرو کو ساتھ لے کر سردھنہ کا رُخ کیا۔ سردھنہ پہنچکر بیگم کو ایک توپ سے باندھ دیا گیا۔ کئی روز وہ اسی حالت میں رہی۔ آخر کار سیلیور نامی ایک فوجی افسر کی سفارش پر اُس کو توپ کے نیچے سے نکالکر نظر بند کر دیا گیا۔

اِس دوران میں شمرو کا بیٹا ظفریاب خان جس کو شاہ عالم نے نواب مظفر الدولہ کا خطاب دیا تھا۔ دہلی سے آگیا اور سردھنہ کی حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی۔ یہ اکتوبر ۱۷۹۵ء کے واقعات ہیں۔

خوش قسمتی سے بیگم شمرو کو دو ایک ایسے ہمدرد مل گئے جن کے ذریعہ سے اُس نے سیندھیا کو، دہلی کے مرہٹہ گورنر کو، اور جارج طامس کو اپنے حالات سے آگاہ کر کے امداد کی درخواست کی، جارج طامس کو اُس نے بڑے خلوص سے تحریر کیا کہ مجھے اِس مصیبت سے بچاؤ، ورنہ میں زہر کھا کر مر جاؤں گی۔ اگرچہ یہ آگ ایک حد تک جارج طامس ہی کی لگائی ہوئی تھی، تاہم بیگم شمرو کی بے بسی و بیکسی نے اُس کے رحم و ہمدردی کے جذبات کو اُبھارا، اور وہ گورنر دہلی کے زیر ہدایت اپنے بہادر ساتھیوں کو ساتھ لے کر فوراً سردھنہ کی طرف روانہ ہو گیا۔

دوسری طرف باغی سپاہ کو ظفریاب خاں کی طرف سے مایوسی ہوئی۔ وہ بڑی کمزور طبیعت کا انسان نکلا۔ فہم و ادراک سے کام نہ لے سکتا تھا۔ سیلیور اور دیگر فوجی افسر جنھوں نے بغاوت میں کسی قسم کا حصّہ نہ لیا تھا اپنے ساتھیوں کو سمجھا بجھا کر صحیح راستہ پر لے آئے۔ اسی اثنا میں خبر پہنچی کہ جارج طامس کھا تولی تک آپہنچا ہے۔ اِس خبر کے مشہور ہوتے ہی فوج کا بیشتر حصہ بیگم شمرو کی حمایت پر کمر بستہ ہو گیا۔ جارج طامس نے آتے ہی اپنی اولوالعزمانہ کارروائیوں سے باغی سپاہ کو ہموار کر لیا اور ظفریاب خاں کو گرفتار کر کے دہلی روانہ کر دیا جہاں بیگم شمرو کے ایک مکان میں اُسے نظر بند کر دیا گیا۔

بیگم شمرو کو از سرِ نو مسند نشین کیا گیا۔ باغی سپاہ جو قبل ازیں بیگم شمرو کے خون کی پیاسی تھی، اب اطاعت و وفاداری کا حلف اُٹھا رہی تھی اور اپنے کئے پر پشیمان و سرنگوں بیگم کے سامنے کھڑی تھی اُن تیس[1] یوروپین افسروں سے جنکی ریشہ دوانیوں سے یہ خرابیاں پیدا ہوئی تھیں ایک حلف اطاعت بھی تحریر کرایا گیا۔ اِس موقع پر سیندھیا کی طرف سے بھی ایک افسر موجود تھا۔ جس کو بیگم شمرو نے ڈیڑھ لاکھ روپیہ بطور جرمانہ ادا کیا۔ بالآخر بیگم شمرو نے نہایت قوت و اقتدار سے حکومت کا دور شروع کردیا، اور پھر فوج سے اُس کو کسی قسم کی مشکلات پیش نہ آئیں۔ سیلیور کو اُس نے اپنی فوج کا کمان افسر مقرر کیا۔ اور جارج طامس[1] کی ایک فرانسیسی نژاد خاتون سے جو اُس کے دربار میں ایک معزز خدمت پر مامور تھی، شادی کردی اور اپنی جانب سے کافی جہیز دیا۔

بیگم شمرو اپنی دوبارہ مسند نشینی کے وقت سے موت تک پھر کسی نسوانی کمزوری کا شکار نہیں ہوئی۔ نہ اُس کے اقتدار کو کسی قسم کا ضعف پہنچ سکا۔ اُس نے اپنی تمام تر توجہ مُلکی و خانگی انتظامات پر مرکوز رکھی۔

سنہ ۱۸۰۰ء میں بیگم شمرو آگرہ گئی تاکہ سیندھیا کی توجہ و نوازش کا زبانی شکریہ ادا کرے۔ اُس زمانہ میں سیندھیا کا ستارہ اوج پر تھا۔ وہ گویا تمام ہندوستان کے سیاہ و سفید کا مالک تھا۔ سیندھیا نے بیگم شمرو کا پُرتپاک خیر مقدم کیا اور اُس کی خداداد قابلیتوں کا اعتراف کرکے اُسے مغربی سرحد کے تحفظ کی خدمت تفویض کی۔ مغربی سرحد پر سکھوں کی جانب سے آئے دِن یورش ہوا کرتی تھی۔

سنہ ۱۸۰۲ء میں انگریزوں نے مرہٹوں کے خلاف اعلانِ جنگ کردیا۔ اِسموقع پر بیگم شمرو نے

---

[1] اِس زمانہ میں جارج طامس گورنر دہلی کا ملازم تھا۔ وہ بڑا جری اور بہادر شخص تھا۔ ہندوستان میں ابتداً کئی سال تک اُس نے پرتگیزوں کی ملازمت کی بعد ازاں دہلی آکر بیگم شمرو کی فوج میں ملازم ہوگیا۔ سرد مہر سے مستعفی ہوکر پھر دہلی گیا، اور گورنر دہلی نے اُسے ملازم رکھ لیا۔ جب گورنر دہلی سے بگاڑ ہوگیا تو اُس نے بھی شمرو کے طریق کار سے کام لینا چاہا۔ اُس نے تہیہ کرلیا کہ اپنی تلوار کے زور سے اپنے لئے جگہ بنائیگا چنانچہ ۱۷۹۸ء میں اُس نے پہلے تو قصبہ ہانسی پر قبضہ کیا، بعد ازاں رفتہ رفتہ علاقہ ہریانہ اور چند دیگر اضلاع کا مالک ہوگیا۔ ہانسی میں اُس نے اپنی ٹکسال بنائی اور اپنے علاقہ میں اپنا سکہ جاری کیا۔ اسلحہ سازی کا کارخانہ قائم کیا اور اسی قسم کے دیگر کام جاری کئے۔ اُسکی فوجی جمعیت چھ ہزار پیادہ، دو ہزار گھوڑا سوار اور پچاس توپوں پر مشتمل تھی۔ سکھوں میں پٹیالہ اور جیند اور راجپوتوں میں جے پور، جودھپور اور بیکانیر نیز مرہٹوں سے اُس کا ہمیشہ مقابلہ ہوتا رہا۔ آخرکار مرہٹوں نے اُسے پست کردیا۔ اِدھر ہمراہیوں نے بھی اُسکا ساتھ چھوڑ دیا۔ بد دل ہوکر وطن (آئرلینڈ) کی واپسی کا ارادہ کیا۔ اپنے بیوی بچوں کو بیگم شمرو کی حفاظت و سرپرستی میں چھوڑکر یوروپ کیلئے روانہ ہوا تھا کہ راستے میں اُسے موت نے آدبایا۔ ۲۲ اگست ۱۸۰۲ء کو بعمر ۴۶ سال بہرام پور میں اُسکا انتقال ہوگیا۔

سینڈھیا کی بڑی مدد کی۔ اُس نے اپنی چھ میں سے پانچ پلٹنیں اور پندرہ توپیں سیلیور کے زیر کمان دکن روانہ کیں۔ ۲۳ ستمبر ۱۸۰۳ء کی لڑائی میں اُسکی فوج نے نمایاں حصہ لیا۔ سینڈھیا کی فوج میں صرف بیگم شمرو کی سپاہ صحیح سلامت واپس آئی، حالانکہ ایک سے زیادہ بار انگریزی توپخانہ نے اُس پر گولہ باری کی تھی۔

۱۸۰۴ء میں جب اُس کی سپاہ دکن کی مہم سے واپس آگئی تو بیگم شمرو نے دیکھا کہ ایسٹ انڈیا کمپنی تمام ہندوستان کو اپنے قبضہ میں کرنا چاہتی ہے، لہٰذا اُس نے انگریزوں سے معاہدہ کیا۔ شرائط معاہدہ میں ایک شرط یہ بھی تھی کہ بیگم شمرو کی زندگی میں اُس کی جاگیر کا انگریزی علاقہ سے الحاق نہ ہوگا۔ بلکہ وہ بدستور اُس پر قابض رہیگی۔ بیگم شمرو نے اسی کو غنیمت سمجھا اور انگریزوں کی رفاقت کا دم بھرنے لگی۔

لیکن ایک بار لارڈ ویلزلی نے بیگم شمرو پر ناجائز دباؤ ڈالا اور اُس کو مجبور کیا کہ اپنی جاگیر انگریزوں کے حوالے کردے۔ اسی دوران میں لارڈ کارنوالس بحیثیت گورنر جنرل دوبارہ ہندستان آیا۔ اُس نے آتے ہی لارڈ ویلزلی کی کارروائیوں کو منسوخ کردیا، اور بیگم شمرو کا اقتدار بدستور قائم و برقرار رہا۔ لارڈ کارنوالس نے بیگم شمرو کے نام ۱۶ اگست ۱۸۰۵ء کو ایک خط بھی تحریر کیا تھا جس کا خلاصہ حسب ذیل ہے :-

"...... یہ معلوم کرکے مجھے مسرت ہوئی کہ جب سے آپ نے انگریزوں کی اطاعت و وفاداری کا حلف اُٹھایا ہے۔ آپ نے نہایت خوبی سے اپنے فرائض انجام دئے ہیں۔ جس کامیابی کے ساتھ آپ نے مسٹر گتھری[1] کلکٹر سہارنپور کو سکھوں کی قید سے چھڑایا اور پھر سردھنہ میں اُس کے ساتھ بہترین سلوک کیا، اُس کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ آپ کے اس رویہ سے بہت متاثر ہوا ہوں۔ حتی الامکان میں آپ کے آرام و اطمینان کا خیال رکھونگا۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ سابق گورنر جنرل نے آپ کی جاگیر کے الحاق کے احکام صادر کئے تھے لیکن چونکہ مجھے وفاداری پر کامل اعتماد ہے، اس لئے میں آپ کا قبضہ بحال رکھتا ہوں۔ جو مراعات و حقوق آپ کو حاصل تھے وہ بدستور قائم رہیں گے ......"

یہ خط مسٹر گتھری نے کر آیا تھا۔ اُس کو ایسٹ انڈیا کمپنی نے اس خدمت پر مامور کیا تھا کہ سردھنہ جاکر بیگم شمرو سے تجدید معاہدہ کرے۔ بدیں خیال کہ بیگم شمرو کی وفات کے بعد اُس کے ورثا کہیں جاگیر کے

---

[1] اکتوبر ۱۸۰۳ء میں جب سکھوں نے سہارنپور پر قبضہ کرلیا تو وہاں کے کلکٹر مسٹر جی، ڈی گتھری کو شیر سنگھ نے قید کرلیا تھا۔

دعویدار نہ بن بیٹھیں، معاہدہ میں ایک شق یہ بھی تھی کہ:-

"دوآبہ کے وہ مقامات جن پر زیب النساء کی جائداد مشتمل ہے، جب تک وہ زندہ رہے وہی اُن پر قابض رہے گی"۔

دوآبہ میں اُس کی جاگیر مظفر نگر سے علیگڈھ تک پھیلی ہوئی تھی۔ کرنال، بوڈھانہ، برناوہ، بڑوت، کوتانہ، ٹپل اور جیور کے پرگنے اِس رقبہ میں شامل تھے۔ اِن کے علاوہ سردھنہ خاص پرگنہ تھا جو بیگم شمرو کا صدر مقام تھا۔ تجدید معاہدہ کے بعد بیگم شمرو کی سپاہ کا صرف یہی کام رہ گیا۔ کہ اپنے علاقہ میں امن قائم رکھے۔ صرف ایکمرتبہ ۱۸۲۶ء میں اُسے اپنے علاقہ سے باہر جانا پڑا۔ جب لارڈ کمبر مسر نے بھرت پور پر چڑھائی کی تھی۔ اِس محاصرہ کی نسبت میجر آرچر نے جو لارڈ کمبر مسر کا اے، ڈی، سی تھا، اپنی کتاب میں لکھا ہے:-

۱۸۲۶ء میں جب فوج بھرت پور کے سامنے پہنچی تو کمانڈر انچیف نے حکم دیا کہ چونکہ دیسی ریاستیں ہماری مطیع ہیں، اِس لئے اُن کے حکمرانوں یا ان کی افواج کو اِس محاصرہ میں شریک نہ کیا جائے۔ اِس حکم کو بیگم شمرو نے اپنی تذلیل تصور کرکے اُس پر اعتراض کیا۔ اُس سے کہا گیا کہ متھرا ایسا نامی اور متبرک شہر تمہارے لئے چھوڑ دیا جائیگا، مگر وہ اپنی ضد پر اڑی رہی، وہ یہ سب فضول ہے، اُس نے کہا اگر میں بھرت پور نہ جاؤنگی تو سارا ہندوستان یہی کہیگا کہ بڑھاپے نے مجھے ڈرپوک اور بزدل بنا دیا ہے"۔

بالآخر بیگم شمرو بھی اپنی فوج کے ساتھ محاصرہ میں شریک ہوئی، اور برطانی حکومت نے اُسکی فوری امداد اور بہترین خدمات کا شکریہ ادا، اور فوجی کیمپ میں اُس کے طویل قیام کو سراہا۔

شمرو کا بیٹا ظفریاب خاں (نواب مظفر الدولہ) جو ۱۷۹۵ء میں گرفتار کرکے دہلی بھیجدیا گیا تھا ۱۸۰۳ء کے شروع میں بعارضہ ہیضہ انتقال کر گیا۔ اُس کی لاش آگرہ پہنچا کر اُس کے باپ کے پہلو میں دفن کی گئی۔ ظفریاب خاں کی شادی کپتان لے فیورسے کی بیٹی جولیانہ اینی سے ہوئی تھی، جس کے بطن سے ایک لڑکا اور ایک لڑکی پیدا ہوئی۔ لڑکا تو اپنے باپ کی زندگی ہی میں (۳۰ اکتوبر ۱۸۰۲ء) اِس دُنیا سے سدھار گیا۔ لڑکی جو اپنی والدہ کی ہمنام تھی، ۱۹ نومبر ۱۷۸۹ء کو پیدا ہوئی اور ۸ اکتوبر ۱۸۰۶ء کو کرنل ڈائس کو بیاہی گئی۔ کرنل ڈائس بیگم شمرو کی فوج کا افسر اعلیٰ تھا۔ اِن کے ہاں کئی اولادیں ہوئیں، لیکن بچپن ہی ہی میں مر گئیں۔ ۱۳ جون ۱۸۲۰ء کو جب کرنل ڈائس کی اہلیہ نے انتقال کیا تو ایک بیٹا اور دو بیٹیاں اپنی یادگار چھوڑیں۔ بیگم شمرو نے اُنھیں اپنی اولاد کی طرح پال پوس کر بڑا کیا۔ لڑکیاں جوان ہو گئیں تو ۱۸۳۱ء میں اُن کی شادی کر دی گئی۔ کرنل ڈائس کے بیٹے کا نام ڈیوڈ آکٹرلونی ڈائس تھا۔

وہ ۱۸ اردسمبر ۱۸۰۸ء کو پیدا ہوا تھا۔ یہ لڑکا والٹر رینہارڈ سومبر کا پڑپوتا تھا۔ اسی کو بیگم سمرو نے اپنا متبنیٰ کر کے اپنا وارث قرار دیا۔

جب بیگم سمرو نے مسیحی مذہب اختیار کر لیا تو مذہبی کاموں میں بھی اُس کو دلچسپی پیدا ہوگئی۔ اُس کی نیک طبعی اور ہمدردی آمیز برتاؤ کی وجہ سے بہت سے ہندوستانی مسیحی سردھنہ اور اُس کے قرب وجوار میں آباد ہوگئے۔ رفتہ رفتہ اُن کی تعداد ڈیڑھ ہزار تک پہنچ گئی۔ مگر عبادت کیلئے کوئی مخصوص جگہ نہ تھی بیگم سمرو کے محل ہی کے ایک کمرہ میں دُعا بندگی ہوتی تھی۔ بیگم سمرو کو چونکہ اپنی فوجی مصروفیات کیوجہ سے کبھی کبھی مہینوں سردھنہ سے باہر رہنا پڑتا تھا۔ اِس لئے اُسے موقع نہ مل سکا کہ وہ گرجہ کی طرف متوجہ ہوتی۔ بالآخر اُس نے گرجہ کی تعمیر کا تہیہ کیا۔ اُس کے ملازمین میں میجر ریگھیلنی نامی ایک اطالوی افسر بھی تھا۔ یہ خدمت بیگم سمرو نے اسی کو تفویض کی۔ سنہ ۱۸۲۰ء میں گرجہ کا سنگِ بُنیاد رکھا گیا اور سنہ ۱۸۲۲ء میں بن کر تیار ہوا[1]۔ اُس زمانہ میں سردھنہ کے گرجہ سے زیادہ خوبصورت اور شاندار کوئی اور گرجہ ہندوستان میں نہ تھا۔ اُس کی تیاری پر چار لاکھ روپیہ صرف ہوا تھا۔ اُس زمانہ کے لحاظ سے جبکہ مزدوری بھی سستی تھی اور سامان بھی، چار لاکھ روپیہ بہت ہوتا ہے۔ پھر اس عالیشان گرجہ کے شایانِ شان اُس کو آراستہ بھی کیا۔

گرجہ کی تعمیر کے بعد بیگم سمرو نے اپنے لئے ایک عالیشان محل سردھنہ میں تعمیر کرایا اور ایک دہلی میں۔ دہلی کا محل اُتنا وسیع اور شاندار تو نہ تھا، لیکن تھا خوشنما۔ اِن کے علاوہ میرٹھ میں بھی ایک بہت وسیع مکان تعمیر کرایا۔ میرٹھ میں برطانی سپاہ کیلئے ایک چھوٹا سا گرجہ بھی تعمیر کرایا تھا۔ بیگم سمرو نے متعدد پُل بھی تعمیر کرائے اور رفاہِ عام کے دیگر کاموں میں بھی کافی حصہ لیا۔

بیگم سمرو کو اپنی حکومت کے ابتدائی زمانہ میں اپنی فوج کے ساتھ اِدھر اُدھر بہت جانا پڑا، لیکن اُس نے ہندوستانی معاشرت کو ہمیشہ ملحوظ رکھا۔ نہ اُس نے اپنا لباس تبدیل کیا نہ کھانا۔ وہ کسی کے سامنے نہیں ہوتی تھی۔ جب کسی سے مُلاقات کرتی یا اپنی جاگیر کے متعلق رپورٹیں سُنتی یا احکام صادر کرتی تو ہمیشہ پسِ پردہ بیٹھتی تھی۔ تاہم اُس نے اپنے مرحوم شوہر کے اصول کو قائم رکھا۔ وہ اپنے اعلیٰ درجہ کے یورپین فوجی افسروں کو بدستور اپنے دسترخوان پر مدعو کرتی رہی۔ جب اُسکی عمر زیادہ ہوگئی تو اُس نے انگریز افسروں سے بھی میل جول

---

[1] گرجہ کے صدر دروازے کے اوپر ایک پتھر پر لاطینی عبارت کے علاوہ یہ فارسی قطعہ کندہ ہے:۔

بامدادِ خدا فضلِ مسیحا ۔۔۔ بسالِ ہژدہ صد عشرین اثنا
بدل زیب النساء عمدۃ الراکین ۔۔۔ بنا فرمود عالیشان کلیسا

بڑھالیا۔ خاص خاص تقریبوں پر اُنھیں اپنے ہاں سردہنہ یا دہلی میں مدعو کرتی اور گورنر جنرل یا سپہ سالارِ ہند کی دعوت پر خود بھی اُن کے ہاں جاتی۔

بیگم سمرو یورپین خواتین پر بہت زیادہ مہربان تھی۔ جو یورپین خاتون اُس کی خدمت میں باریاب ہوتی تھی، اُس کو کچھ نہ کچھ تحفہ ضرور دیتی تھی۔ کشمیر کے دوشالے، ریشم کے تھان اور جڑاؤ زیورات وغیرہ اُس کے پاس کافی تعداد میں موجود رہتے تھے، اور اُنھیں میں سے کوئی نہ کوئی چیز وہ ہر یورپین خاتون کو دیتی تھی۔

لارڈ بنٹنگ گورنر جنرل ہند جب ہندوستان سے روانہ ہوا تو چلتے وقت بیگم سمرو کے نام ایک خط لکھا۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ لارڈ بنٹنگ کس درجہ بیگم سمرو کی عزت و قابلیت کا معترف تھا:۔

بخدمت ہزہائی نس بیگم سمرو

میری معزز مہربان!

میں ہندوستان سے عزت و اکرام کے اُن جذبات کے بغیر رخصت نہیں ہوسکتا۔ جو یور ہائینس کی خداداد قابلیت اور طرزِ عمل نے میرے دل پر نقش کردیئے ہیں۔ آپ کی نیک مزاجی اور غربا پروری کے بے نظیر صفات نے ہزاروں لوگوں کو آپ کا گرویدۂ احسان کرلیا ہے۔ مجھے خُدا کی ذات سے اُمید ہے کہ آپ سالہا سال تک یتیموں اور بیواؤں کی سرپرستی کے لئے زندہ رہینگی۔ میں کل صبح جہاز پر سوار ہوکر انگلستان روانہ ہوجاؤں گا۔ میں آپ کیلئے اور ہر اُس شخص کے لئے دُعا کرتا رہوں گا جو باشندگانِ ہند کی بہتری میں کوشاں ہے۔

کلکتہ　　آپ کا دِلی دوست

۱۷ مارچ ۱۸۳۵ء　　ایم۔ ڈبلیو بنٹنگ

آخرکار بیگم سمرو کے سفرِ آخرت کا دن بھی آپہنچا۔ مختصر علالت کے بعد ۲۷ جنوری ۱۸۳۶ء بروز بدھ صبح کے ساڑھے چھ بجے یہ نامور خاتون نوّے سال کی عمر میں اس دُنیا سے رحلت کرگئی۔ آخیر وقت تک وہ اپنے ہوش و حواس میں تھی۔ حتّیٰ کہ بعض مذہبی رسوم میں بھی اُس نے حصّہ لیا۔ بیگم سمرو کی وفات سے سردہنہ والوں کو جو صدمہ ہوا۔ اُس کی کیفیت اخبار "میرٹھ آبزرور" کے مندرجہ ذیل اقتباس سے واضح ہوسکتی ہے:۔

.... محل کے باہر سڑکوں پر ایک بہت بڑی بھیڑ اکٹھا تھی۔ ہرطرف یاس و غم کے بادل چھائے تھے۔ ہر شخص غم سے نڈھال نظر آتا تھا۔ جہاں دو چار آدمی یکجا ہوتے وہیں اپنے اِس بھاری نقصان کا تذکرہ کرتے۔ اُن کے بشرہ سے اُن کے غم کا اظہار ہورہا تھا۔ رات بھر یہی کیفیت رہی

ملک کے عام دستور کے مطابق تمام متعلقین نے فاقہ کیا۔ نہ کسی نے کھانا کھایا نہ آرام کیا۔
سب لوگ جاگتے رہے۔ ہر گھر میں صف ماتم بچھی ہوئی تھی......."

رات کے نو بجے سے دوسری صبح کے آٹھ بجے تک بیگم شمرو کی لاش اُس کے محل کے وسیع ہال میں رکھی گئی۔ تاکہ لوگ آخری بار اُس کی صورت دیکھ سکیں، بعد ازاں سپرد خاک کی گئی۔

تجہیز و تکفین کی رسوم ادا ہوتے ہی مسٹر آر۔ این ہملٹن، مجسٹریٹ میرٹھ نے بیگم شمرو کے ورثار و متعلقین کی موجودگی میں بیگم شمرو کی جاگیر کے الحاق کا اعلان کیا' اور تمام حاضرین کو جتا دیا کہ آیندہ یہاں بھی اُسی ضابطہ و قانون کا نفاذ ہوگا۔ جو علاقۂ انگریزی میں رائج ہے۔ اعلان کے موقع پر میرٹھ ڈویژن کا کمشنر (جے، آر ہچنسن) بھی موجود تھا۔

بیگم شمرو بڑی رحمدل، ہمدرد' اور نیک طبع تھی۔ وہ پستہ قامت تو تھی۔ لیکن ارادہ کی مضبوط اور طبیعت کی دلیر تھی۔ جس وقت وہ میدانِ کارزار میں ہوتی تھی تو بڑی پُرجوش اور جنگجو نظر آتی تھی۔ اُس کا حملہ دہشتناک ہوتا تھا۔ اُس کی قوتِ فیصلہ اتنی زبردست تھی۔ کہ ہر معاملہ کے نتائج و عواقب پر اُس کی نظر پہنچ جاتی تھی۔ اُس کے علاقہ میں ہر طرف امن و امان تھا۔ کوئی کسی پر جور و جبر نہ کر سکتا تھا۔ ہر طرف خوشحالی نظر آتی تھی۔ تجارت و زراعت میں نمایاں ترقی تھی۔ خشک سالی کے دِنوں میں مزارعین کو وہ نقدی اور غلّہ تقسیم کرتی تھی۔ تمام علاقہ زیر کاشت اور سرسبز تھا۔ اُس کی رعایا خوش اور مطمئن تھی۔ جب اُس کا انتقال ہوا تو اُس کے علاقہ کے ہر گوشے سے لوگ سردھنہ آئے اور آخری رسوم میں شریک ہوئے۔

میجر آرچر نے ۱۸۲۸ء میں سردھنہ کی سیر کی تھی۔ وہ اپنی کتاب میں لکھتا ہے:۔

"...... اُس کے علاقہ کے کھیت سرسبز اور لہلہاتے ہوئے نظر آئے، اور دیہات کی آبادی کمپنی کے علاقہ کے مقابلہ میں زیادہ خوشحال اور بشاش دکھائی دی۔ وہ ان کی حفاظت و دستگیری کا بہت خیال رکھتی ہے......"

انگریزوں سے بیگم شمرو کا جو معاہدہ ہوا تھا۔ اُس کے رُو سے وہ ایک بڑی فوج[1] رکھنے پر مجبور تھی

---

[1] بیگم شمرو کی وفات کے وقت اُس کی فوج کا شمار حسب ذیل تھا۔

چھ پیادہ پلٹنیں (۲۹۴۶)' توپ خانہ (۱۰۰۰)' رسالہ (۲۴۵)' باڈی گارڈ (۲۶۶)۔ علاوہ ازیں ایک اسلحہ خانہ اور ایک توپیں ڈھالنے کا کارخانہ بھی تھا۔

اُس کو اجازت نہ تھی کہ اپنے فوجی مصارف میں کسی قسم کی تخفیف کرے۔ جاگیر سردھنہ نیز دیگر اراضیات جو مختلف مواقع پر اُس کو دی گئیں، اُن کی مجموعی آمدنی بہت کم "کافی سے زیادہ" ہوتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اُس کے انتقال کے بعد جب اُس کی جاگیر کا علاقہ انگریزی سے الحاق ہوگیا تو جو زر نقد اُس نے چھوڑا یا وصیت کی وہ نصف کروڑ سے زیادہ نہ تھا۔

بیگم شمرو کے مال و دولت کا بیشتر حصہ اُس کے متبنیٰ اور وارث ڈیوڈ آکٹرلونی ڈائس سومبر کو ورثہ میں پہنچا۔ اپنی وفات سے قبل بیگم نے ہدایت کی تھی کہ ڈاکٹر طامس ڈریور کو جو اُس کا معالج تھا بیس ہزار روپیہ دیدیا جائے۔ نیز اپنی زندگی ہی میں ڈیڑھ لاکھ روپیہ اُس نے پاپائے روم کو خیراتی کاموں کے لئے (جنوری ۱۸۳۴ء) میں بھیجا تھا۔ وصیت کے مطابق مندرجہ ذیل رقوم تقسیم کی گئیں:

(۱) کرنل کلیمنٹ براؤن	۷۰ ہزار روپیہ	(۷) میجر ریگھیلنی کے پانچ بچے	۲۵ ہزار روپیہ
(۲) جان طامس (فرزند جارج طامس)	۱۸ " "	(۸) ابوالحسن بیگ (ایک فوجی عہدیدار)	۲ " "
(۳) " کی بیوی	۷ " "	(۹) کلکتہ، بمبئی، مدراس کی کیتھلک مشن	ایک لاکھ "
(۴) " " والدہ	۷ " "	(۱۰) آگرہ کیتھلک مشن	۳۰ ہزار "
(۵) میجر ریگھیلنی	۹ " "	(۱۱) میرٹھ "	۱۲ " "
(۶) " کی بیوی	۱۱ " "	(۱۲) آرچ بشپ کنٹربری (خیراتی کاموں کیلئے)	۵۰ " "

(۱۳) بشپ کلکتہ (غریبوں کی امداد اور دیوانی کے قیدیوں کی رہائی کے لئے) ۵۰ ہزار روپیہ

اِن کے علاوہ بیگم شمرو نے سردھنہ کے مختلف اداروں[۱] کے لئے بھی معقول رقمیں وصیت کیں، اور جاگیر و محلات کے تمام ملازمین کو ایک ایک ماہ کی تنخواہ وصیت کی۔ ڈائس سومبر کی دو بہنوں کے لئے ایک لاکھ ۲۰ ہزار روپیہ کا ٹرسٹ مقرر کیا۔

بیگم شمرو کا محل اب سردھنہ مشن کے قبضہ میں ہے۔ بعض لوگوں کو یہ غلط فہمی ہے کہ محل مذکور مرحومہ نے سردھنہ مشن کو وصیت کیا تھا۔ امر واقع یہ ہے کہ ۱۸۹۷ء میں جب یہ محل نیلام ہوا تو آگرہ کے آرچ بشپ نے اس کو ۲۵ ہزار روپیہ میں خرید لیا تھا۔ محل کے کمرۂ دربار کی دیواروں پر ۲۵ نہایت نفیس و نادر تصاویر (پینٹنگ) آویزاں تھیں، جن کو محل کے نیلام ہونے سے ایک سال قبل لیڈی فارسٹر (بیوہ ڈائس سومبر) کے ایجنٹ نے اُتار لیا تھا۔ تصاویر کا بیشتر حصہ مقامی حکومت نے خرید لیا تھا۔ جو اب الہ آباد کے گورنمنٹ ہاؤس کے ایک کمرہ کی زینت ہیں۔

---

[۱] بیگم شمرو کی وفات کیوقت سردھنہ میں متعدد مذہبی ادارے تھے۔ مثلاً بیوہ خانہ، کالج، مدرسہ آلہیات وغیرہ۔

بیگم شمرو کی وفات کے چند سال بعد ڈائس سومبر انگلستان چلا گیا۔ جانیسے قبل اُس نے اپنی دونوں بہنوں سے دو دو لاکھ میں سمجھوتہ کر لیا۔ انگلستان پہنچکر اُس نے ۲۶ ستمبر ۱۸۴۰ء کو آنریبل میری این جروس کے ساتھ شادی کر لی۔ اُس کے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ یکم جولائی ۱۸۵۱ء کو اُس نے لندن میں انتقال کیا' اور اگست ۱۸۶۷ء میں اُس کی لاش سردہنہ لائی گئی اور بیگم شمرو کے پہلو میں دفن ہوئی۔ ڈائس سومبر کے ساتھ شمرو کا رہا سہا نام بھی مٹ گیا۔

۱۸۳۹ء میں ڈائس سومبر روما میں تھا۔ وہاں اُس نے بیگم شمرو کی سہ سالہ برسی منائی۔ اِس تقریب کے لئے سین کارلو کا عظیم الشان گرجہ انتخاب کیا گیا تھا۔ اسی موقعہ پر اُس نے ایک اطالوی بُت تراش سے بیگم شمرو کا مجسمہ بھی بنوایا تھا جو گیارہ قدِ آدم مجسموں کا مجموعہ ہے۔ یعنی بیگم شمرو چبوترہ پر ایک کرسی پر متمکن ہے' اور زیرین چبوترے پر اُس کے اِدھر اُدھر خاص لوگ کھڑے ہیں۔ مثلاً بیگم شمرو کے داہنے جانب ڈائس سومبر' اور بائیں جانب دیوان رائے سنگھ۔ پُشت کی جانب جولیس سیزر[1] اور عنایت اللہ (اُس کا اوّل اے۔ڈی۔سی) وغیرہ۔ یہ مجسمہ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔

یہ ہے مختصر سرگذشت اُس بیگم شمرو کی جو کسی وقت غربت و فلاکت کا شکار تھی' اور جب خدا نے اس کی بے بسی اور بیکسی پر رحم فرمایا تو ایک حکمران کی حیثیت سے دُنیا میں اپنا نام روشن کیا یہ دُرست ہے کہ اُس کی شوکت و عظمت اُسی کے ساتھ ختم ہو گئی' لیکن وہ اپنی کمائی سے رفاہ عام کے کاموں کو مدد دیکر تاریخ میں ہمیشہ کیلئے اپنا نام زندہ چھوڑ گئی۔ یہی وہ زندگی ہے جس کی شاعر نے تلقین کی ہے ؎

اِس طرح جی کہ بعد مرنے کے　　یاد کوئی تو گاہ گاہ کرے

فطرت انسانی

انسان کا دل لاکھ کے مانند ہے۔ اُس کے نشانات مٹانا یوں تو ناممکن ہے مگر اُسے گرم کرکے ہم اُس کی جگہ نئے نشانات مرتسم کر سکتے ہیں۔

(خواب و خیال)

پریم چند

---

[1] جولیس سیزر سردہنہ کا پہلا اور آخری بشپ تھا۔ بیگم شمرو نے بڑی کوشش سے سردہنہ کے گرجہ کو کیتھیڈرل کے درجہ پر پہنچایا اور بشپ کے تقرر کی پاپائے روم سے منظوری حاصل کی۔ بیگم شمرو کی وفات کے بعد سردہنہ پھر آگرہ کے بشپ کا ماتحت کیا گیا۔

معصومیت

(ایک بچہ کو دیکھ کر)

از حضرت احسان دانش کاندھلوی

یہ جگر پارہ یہ جانِ زندگی طفلِ حسیں — یہ تو سب مانا کہ دنیا سے ابھی واقف نہیں
شمع پر جھکتا نہیں یہ بے سبب پروانہ وار — اس کا دل شاید مرے دل کی طرح ہے بیقرار
مجھ پہ ہوتا ہے عجب اس کے تبسم کا اثر — دیکھتا ہوں روح میں لہر مسرت جلوہ گر
مسکرا کر جب یہ سینے سے لپٹتا ہے کبھی — دل کے دامن پر مچلتی ہے شعاعِ زندگی
یہ ذرا سی جان اور بیگانۂ پرخاش و کیں — فتنہ آبادِ جہاں میں بے نیازِ کفر و دیں
مرکزِ چشمِ تمنا شاہدِ بزمِ نگاہ — پیکر نور و ضیا۔ ناواقفِ ذوقِ گناہ
فطرتِ بیرنگ میں اک جوششِ رنگِ نمود — بحر میں ہستی کے طغیانِ دل آرا کا ورود
اسکی ماں جب گیت گا گا کر جھلاتی ہے اسے — رحمتِ حق تھپکیاں دیکر سلاتی ہے اسے

۲

اپنی طفلی کا زمانہ مجھکو یوں آتا ہے یاد — جس طرح یادِ وطن میں غرق کوئی نامراد
یا چمن میں کیف برساتی ہوئی بادِ نسیم — روح کی وسعت پہ لہراتی ہوئی موجِ شمیم
مست ساون کی پھواروں میں گلوں کی انجمن — سبزہ زاروں میں ہوا سے پیچ و خم کھاتے شکن
صبح صادق کے دھندلکے میں پرے کونے کے پاس — کروٹیں لیتی ہوئی شاخوں سے کلیوں کا نکاس
تشنگی میں میکشوں کو مژدۂ مینائے مے — چاندنی راتوں میں لہراتی ہوئی بنسی کی لے
مینھ برس کر رات کو چھٹ جائیں بادل جس گھڑی — لہلہاتے مرغزاروں پر روپہلی چاندنی
یا گجر دم سرد جھونکوں کا خرام تازہ کار — سبزۂ شاداب پر شبنم کی بوندیں بیقرار

ذہن میں ایامِ طفلی کو جو دہراتا ہوں میں
بیخودی کے خوشنما میداں میں کھو جاتا ہوں میں

ابتذالِ غزل اور اُردو شعراء

(از منشی دیبی پرشاد سریواستو منشی کامل)

محققین اور ادیبوں نے مضمون و معنی کے لحاظ سے شاعری کی تقسیم مختلف اصناف میں کی ہے۔ جنمیں ایک غزل بھی ہے جو فی زمانہ سب سے زیادہ متداول اور عام صنف ہے۔ لیکن وہ جسقدر متداول اور عام ہے اُسی قدر لوگ اسکی حقیقت سے بیگانہ اور اصلیت سے نا آشنا ہیں۔ غزل کو صرف قوتِ منفعلہ یعنی شیفتگی، فریفتگی، بیخودی، مدہوشی، شوق، حسرت و یاس، رنج و غم، درد و الم اور سوز و گداز وغیرہ کا مجموعہ ہونا چاہیئے۔ اِسمیں ان جذبات، احساسات اور حالات کا ذکر ہونا چاہیئے جو عشاق پر عام طور سے طاری ہوتے ہوں۔ اِس کے الفاظ شیرین، نرم، خوشگوار اور واضح ہونا چاہئیں۔ یہانتک کہ اگر معشوق کے نام میں بھی ثقل ہو تو غزل کی لطافت اُن کو برداشت نہیں کر سکتی۔ طرزِ ادا اور اسلوبِ بیان طرب انگیز، مسرت خیز، مستانہ اور شوخ ہونا چاہئے۔ عاشق کو غیور ہونا اور معشوق کے ادب و احترام کا کافی لحاظ رکھنا چاہیئے۔ عربی شعرائے نے سرمستی، بادہ نوشی اور نغمہ و سرود کو بھی غزل میں شامل کر لیا تھا اور فارسی و اُردو غزل گوئی نے بھی اُن کو اپنا جُزو لاینفک بنا لیا لیکن اِسی کے ساتھ فارسی شاعری نے صوفیانہ خیالات اور فلسفیانہ مسائل کو بھی غزل میں داخل کر لیا۔ اُردو شاعری چونکہ ہمیشہ سے فارسی شاعری کی خوشہ چین رہی ہے اِس لئے اُردو شاعری بھی اِن سے خالی نہیں۔ تاہم اِن خیالات اور اِن مسائل کو مجاز، استعارہ و کنایہ کے پردہ میں اِسطرح ادا کرنا چاہیئے کہ غزل کی لطافت میں کوئی فرق نہ آنے پائے۔ وہ عشق مجازی سے بالکل بے ربط نہ ہونے پائیں۔ یہی نکتہ ہے، جسکو مرزا غالب نے ظاہر کیا ہے ؎

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو　　بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

خواجہ حافظ کا پورا دیوان شراب و کباب، جام و ساغر سے بھرا پڑا ہے۔ خواجہ میر دردؔ نے بھی یہی روش اختیار کی تھی۔ لیکن یہ سب حضرات دائرہ غزل گوئی سے باہر نہیں گئے۔ اِس بنا پر ؎

آپ ہی میں اسکو پاوے کچھ نہ پاوے آپکو　　کوئی اور اس سے نہیں نزدیک تر راہِ حصول

غزل کی عام روش سے میل نہیں کھاتا۔

اِس طرف سے بے توجہی کا یہ نتیجہ ہوا کہ اقلیم سخن کے بادشاہوں میں معدودے چند ایسے ہیں جن کے کلام

میں صوفیانہ خیالات کے ساتھ ساتھ شانِ تغزل بھی باقی رہی۔ اس قسم کے اخلاقی اشعار ؎

انکو کیا کہتے ہیں جو خونِ بشر کرتے ہیں — قابلِ لعن ہیں جو قطعِ شجر کرتے ہیں (ناسخ)

چھپ کے گو خلق سے ہو مرتکب فسق و فجور — عالم الغیب سے حالت تیری مستور نہیں (رند)

غزل کیا نفسِ شاعری سے ہی تعلق نہیں رکھتے۔

حالت عامۃ الورود عشاق کو پیش آنیوالے حالات و واردات کا موثر اظہار ایک غزل گو شاعر کا قابلِ تحسین و داد کارنامہ ہے اسکی بہترین مثال غالب کا یہ شعر ہے ؎

وہ آئیں گھر ہیں ہمارے خدا کی قدرت ہے — کبھی ہم اُن کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

حضرت جلال کے مندرجہ ذیل اشعار کسقدر موثر ہیں اور واقعات کی کیسی سچی تصویر کھینچتے ہیں ؎

خط کسی کا جب سو آیا ہے ہجوم شغل میں — گاہ پڑھنے کو اُٹھایا گاہ پڑھکر رکھدیا

دل سے لبوں تلک آنیکو تھی اپنی سرد آہ — اُنکی ذرا سی گرم نگاہی میں رہ گئی

لیکن فارسی شاعری کی تقلید نے اُردو شاعری میں جس قسم کے مبالغہ آمیز مضامین پیدا کردیئے ہین ان کا عام طور پر پیش آنا تو ایک طرف، وقوع بھی تقریباً محال ہو گیا ہے۔ مثلاً ایران میں ترک بچے جو قدرتی طور پر شہسوار، تیرانداز اور سفاک و خونریز ہوتے تھے ابتدا ہی سے معشوق بن گئے تھے۔ اس لئے شہسواری تیراندازی اور سفاکی بھی معشوق کے محاسن میں داخل ہو گئی تھی لیکن یہ اوصاف اوّل تو سرے ہی سے شانِ محبوبیت کے منافی تھے اور اُردو شاعری میں آکر واقعیت سے بھی دور ہو گئے۔ اس لئے ہمارے شعراء کا فرض تھا کہ وہ ان سے بالکل دست بردار ہو جاتے یا اُن کو نہایت معتدل طریقہ سے استعمال کرتے۔ لیکن اساتذہ لکھنؤ نے اُن کو نامناسب طور پر استعمال کر کے معشوق کو درحقیقت قصاب، سپاہی، پھکینت اور غارتگر بنا دیا۔ مثلاً ؎

پیغام وصل پر وہ مری بوٹیاں اڑائیں — دانتوں سے دیں جواب زبانِ سوال کا (صبا)

رنگینی سے خالی نہیں قاتل کی پھکینتی — رومال ہے تلوار کا اک ہار گلے میں (ناسخ)

لوٹ لینے میں نقد دل اُن کو — بددوں کی طرح حجاب نہیں (خلیل)

غمِ ہجر میں عاشق کیلئے خونِ جگر پینے کو اور لختِ دل کھانے کو ملتا ہے ایسی حالت میں عشاق کی کمزوری و ناتوانی قابلِ رحم ہوتی ہے۔ اُردو شعراء کیلئے یہ مضمون نہایت متداول ہے اور ہمارے شعرائے اس میں عجیب عجیب نکتہ آفرینیاں کی ہین۔ اس مضمون کے ادا کرنیکا معتدل اور ممکن الوقوع طریقہ یہ ہے ؎

ساری رگیں ہوئی ہین تنِ زار پر نمود — ناطاقتی نے جسم کو مسطر بنادیا (رند)

اِس سے بھی زیادہ پُر اثر اور محرک جذبہ یہ طریقہ ادا ہے۔ ناسخ ؎

ضعف سے جنبش نہیں بہرِ اشارت ہاتھ میں وہ چلے جاتے ہیں اور میں بلا سکتا نہیں

لیکن شعرائے مضمون آفرینی کی دھن میں اِس مضمون کو مبالغہ آمیز طریقہ سے ادا کیا ہے کہ ناممکن الوقوع ہونیکے ساتھ مکروہ بھی ہوگیا ہے۔ مثلاً ؎

مرگئے ایسے ہو کے لاغر ہم سوئی لایا ہے گورکن اپنا (ناسخ)

اور اِس سے بھی زیادہ۔ ناسخ ؎

لاغر ہیں ہم ایسے کہ نگل جائے جو چیونٹی اٹکے نہ ہمارا بدنِ زار گلے میں

عاشقانہ جذب و کشش کا مضمون بھی ایک متداول مضمون ہے اور اِسمیں شعراء نے خوب مبالغے کئے ہیں۔ اِس کا خوشگوار طریقہ صرف یہ ہے۔ صبا ؎

اے صبا جذب پہ جس دن دلِ ناشاد آیا اپنی آغوش میں اُڑ کر وہ پریزاد آیا

اگرچہ معشوق کا آغوش میں اُڑ کر آنا ناممکن ہے تاہم پریزاد کے لفظ نے اس کو ایک حد تک ممکن بنا دیا ہے۔ ناسخ نے حسب عادت اِس مضمون کو اور زیادہ مبالغہ آمیز بنانا چاہا لیکن طرزِ ادا نے سخت بدنمائی پیدا کردی ؎

جذب میرا لے اڑا جورات کو تیرا پلنگ لے پریرو صاف اورنگِ سلیمان ہوگیا

معشوق کی کمر کی نزاکت بھی شعراء کا عام مضمون ہے لیکن شعرائے اِسمیں مبالغہ پیدا کر کے اس کو نہایت مکروہ اور بدنما کردیا۔ خلیل ؎

اُس بت رشکِ سلیمان کی کمر سایۂ مژگانِ چشم مور ہے

معشوق کے جسمانی اوصاف کی تعریف غزل کی حقیقت سے خارج ہے۔ اِس لئے جو شعراء اِس قسم کے مضامین سے غزل میں کام لیتے ہیں۔ وہ بہترین غزل گو شاعر تسلیم نہیں کئے جا سکتے۔ غزل کے بہترین مضامین تو وہی ہیں جو عموماً عشاق کو پیش آتے رہتے ہیں۔ اِس کے بعد صرف وہ مضامین ہیں جو گوارا، پسندیدہ اور ممکن الوقوع ہوں۔ انتہائی مبالغہ ممکن ہے قصیدہ کے لئے موزوں ہو، لیکن غزل کے لئے وہ نہایت خشک و بے مزہ ہے۔ شعرائے دہلی میں جو لوگ اصولِ تغزل سے واقف تھے وہ اِس حقیقت کو جانتے تھے چنانچہ نواب مصطفیٰ خان شیفتہ فرماتے ہیں ؎

یہ بات تو غلط ہے کہ دیوانِ شیفتہ ہے نسخۂ معارف و مجموعۂ کمال
لیکن مبالغہ ہے تو البتہ اِس میں کم ہاں ذکرِ خدّ و خال اگر ہے تو خال خال

قدماء کی روش بھی اِس اصول کے مطابق ہے۔ شیخ ناسخ کے زمانہ سے اِسمیں مبالغہ شروع ہو کر متاخرین اساتذۂ لکھنؤ کے دور تک کم و بیش قائم رہا۔ لیکن بعد میں اِن لوگوں نے بھی اِس غلطی سے واقف ہو کر اساتذۂ دہلی کی روش اختیار کر لی۔ شعرائے دورِ جدید اِس غیر مطبوع طریقہ سے علٰحدہ ہیں۔

معشوق کے جسمانی اوصاف شعرائے متقدمین میں اِس قسم کے اوصاف غزل میں بہت کم داخل ہوئے۔ مصحفی اور انشاء کے دور میں میر حسن نے مثنوی کا ایک بہترین نمونہ قائم کیا۔ جسمیں باغ و بہار، بزم و انجمن اور خدم و حشم کے ساتھ زنانہ آرایش کے تمام ساز و سامان کو نمایاں کیا۔ اسی زمانہ میں ریختی کی بھی ایجاد ہوئی اور سید انشاء و رنگین نے اس کو انگیا۔ کرتی اور دوپٹے کے گوٹے پٹھوں سے خوب آراستہ کیا۔ اِس لئے اس دور میں اِن لوگوں کا کلام فی الجملہ اس قسم کے مضامین سے آشنا ہوا۔ اس کے بعد مرثیہ کی بھی ترقی ہوئی۔ اِسمیں سطحی شاعری کے تمام مظاہر اور بھی نمایاں ہو گئے۔ اِس لئے شعرائے لکھنؤ کے کلام پر اِن سب کا مجموعی اثر نہایت شدت کیساتھ پڑا۔ اور اُن کی شاعری معشوق کے ظاہری آب و رنگ کی بہترین نمایش گاہ بنگئی۔ ناسخ اور تلامذہ ناسخ نے اپنی مضمون آفرینی اور استدلال سے اِسقدر خشک و بے مزہ کر دیا کہ جذبات کی تحریک تو الگ، خود اِن چیزوں کی خوبیوں کا پُر لطف احساس بھی مفقود ہو گیا، یا بمشکل ہوتا ہے۔ مثلاً ناسخ فرماتے ہیں ؎

لال جوڑا جو ہی برسات میں تو نے پہنا تجھکو خورشید فلک کے میں برابر سمجھا
پڑ گیا عکس زرِ گل جو تنِ عریاں پر تجھکو میں پہنے ہوئے خلعت پُر زر سمجھا

کمر تیری ہے وہ جس نے کمر توڑی ہے چیتوں کی تیری آنکھوں کے آگے لے ہری آہو چکارا ہے

وہ صرف اِنھیں چیزوں پر قناعت نہیں کرتے بلکہ معشوق کی ہر چیز، یہانتک کہ اُس کے باورچی خانہ کی تعریف و توصیف بھی اُن کے نزدیک حدودِ غزل گوئی میں شامل ہیں۔ ناسخ ؎

ہے سحابِ گوہر افشاں اس کے مطبخ کا دھواں عود ہے ہیزم نہیں یا قوت ہے انگر نہیں

اِس قسم کی خارجی اشیاء کا ذکر اس وقت اور بھی ناگوار ہو جاتا ہے جب اِن اعضاء و جوارح کا نام لیا جاتا ہے جن کا تذکرہ تہذیب و متانت کے خلاف خیال کیا جاتا ہے۔ قارئین کرام معاف فرمائیں۔ ابتذال کی مثالیں مجبوراً دی جاتی ہیں۔ نمونتاً چند اشعار درج ذیل ہیں ؎

ہوں میں عاشق انارِ پستاں کا ہوں نہ تربت پہ جز انار درخت ناسخ
روشنی دونوں کچوں کی شمع ساں محبوس ہے جو کٹوری تیری انگیا کی ہے وہ فانوس ہے ”
صندل سی وہ کلائیاں اپنے گلے میں ہوں ہتھ پھیریاں نصیب ہوں چندن سی ران پر صبا

روپ پر ہے یار کا باغِ جوانی دیکھئے — کیا شگوفہ لائے سینہ کا اُبھار اب کی برس — صبا
کسی کی محرمِ آبِ رواں کی یاد آئی — حباب کے جو برابر کبھی حباب آیا — آتش

بعد میں یہ رنگ اور بھی متبذل ہوگیا۔ مثلاً ؎

تو نے جو رقص میں بدن اپنا چُرا لیا — سب ناچ دیکھتے ہیں تیری پیشواز کا — منیر
گنڈا نظر گذر کا بنھائے گی آپ کو — قدنا پتی ہے زلفِ رسا سر سے پاؤں تک — امیر
دیکھے جو آئینہ بھی شباب اِس جمیل کا — دِل میں چُبھے اُبھار مہاسوں کی کیل کا — جلال

لیکن بعد کو یہ لوگ شعرائے دلّی کے رنگ میں کہنے پر مجبور ہوئے۔ دورِ جدید میں اس قسم کے اشعار باعثِ ننگ و عار خیال کئے جاتے ہیں۔

نرم و شیریں الفاظ لفظ و معنی میں باہم طبعی مناسبت ہوتی ہے۔ اِس لئے غزل میں عجز و خاکساری، رنج و غم، سوز و گداز، رندی و سرمستی اور عیش و طرب کے جو جذبات ظاہر کئے جاتے ہیں اُنکا قدرتی نتیجہ یہ ہونا چاہیئے کہ جن الفاظ میں یہ جذبات ظاہر کئے جائیں، وہ نرم، رقیق، لطیف، پُر درد، شیریں اور مستانہ ہوں۔ قدماء کے دور تک غزل کے الفاظ اِن اوصاف سے معرّا ہے۔ مثلاً ؎

یہ ترک ہو کے خشن کج اگر کلاہ کریں — تو بوالہوس نہ کبھو چشم کو سیاہ کریں — میر
میں تو قائم کہے تھا تجھسے کج — دِل نازک ہے یہ زجاج نہیں — قائم

مصحفی اور جرأت نے الفاظ کی شیرینی و لطافت سے متاثر ہو کر غزل میں سلیس، شیریں و نرم الفاظ داخل کئے۔ اِس کے بعد حضرت آتش۔ مصحفی اور جرأت کے نقشِ قدم پر گامزن ہوئے۔ حضرت آتش کی غزل گوئی اسی سبب سے اصولِ تغزل کے مطابق نظر آتی ہے۔ برعکس اس کے حضرت ناسخ نے غزلگوئی کو ہر قسم کے نامانوس، ثقیل اور بیگانہ الفاظ کا مجموعہ بنا دیا۔ آپ کا کلام اِن نقائص کے ساتھ ساتھ متبذل مضامین کا خاکہ پیش کرتا ہے ؎

تیرے تلوے اور رونگے مُنہ سے سوا شفاف ہیں — آئینہ بھی اُنکے آگے صاف جھانواں ہوگیا
ہے طلب سے اِسقدر نفرت کہ رہتا ہے خیال — آنہ جائے لفظ لب پر بابِ استفعال کا

ناسخ و آتش کے تلامذہ نے بے شبہ الفاظ کی روانی اور برجستگی پر زیادہ توجہ کی۔ اور توسیع زبان کیلئے زیادہ تر اُردو زبان کے ہی الفاظ استعمال کئے لیکن وہ اِس دھن میں اس نکتہ کو بھول گئے کہ ثقالت اور غرابت صرف عربی، ترکی اور فارسی ہی الفاظ کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ بعض اُردو الفاظ بھی اِن اوصاف کے ساتھ متصف ہو سکتے ہیں۔ مثلاً

بوسے کے مانگنے پر نہ یوں منہ تھوتھائیے　　یہ ناز جا کے اور سے اے نازنین رہے　　صبا

آتا ہے نام آوری کو کہن پہ رشک　　اس منڈچپے نے پھوڑ کے سر کیا نمود کی　　رند

اکثر شعرائے دور جدید ایسے ثقیل وغریب الفاظ ومضامین سے محترز رہتے ہیں۔

نواب مرزا داغ دہلوی نے بازاری حسن وعشق کو بہت زیادہ ترقی دی اور میرے نزدیک ہزاروں خوبیوں کے ساتھ اُن کی غزل گوئی کا یہی سب سے بڑا عیب ہے۔ یہ صحیح ہے کہ انسان عشق میں از خود رفتہ ہو جاتا ہے۔ اُسے کچھ خیال نہیں رہتا مگر بازاری عشق میں انسان متانت سے گذر کر اکثر ذلیل حرکات کا عادی ہو جاتا ہے مثلاً ؎

بغل میں بیٹھئے دل کی طرح سے بہر خدا　　میں پاؤں پڑتا ہوں کھینچئے نہ درد سر کی طرح　　خلیق

کشتۂ بدمزگیٔ بت سفاک ہوں میں　　ہڈیوں کو مری کتا بھی نہیں کھاتا ہے　　〃

ہاتھ باندھے ہوئے کہتا ہوں کرو عفو قصور　　پاؤں بھی کہیئے تو مشفق یہ گنہگار پڑے　　رند

لیکن شعرائے دلی میں حضرت غالب نے بالکل معجزانہ طور پر ایک ہی شعر میں معشوق کے علو مرتبت کے ساتھ اپنے فخر وغرور کا بھی اظہار کیا ہے اور اس طرح کیا ہے کہ عاشقانہ عجز ونیاز کی شان بھی قائم رکھی ہے ؎

عشق نے غالب نکما کر دیا　　ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

معشوق کی خوبیوں میں ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ غیور ہو، حیادار ہو، اُسمیں عزت وخودداری ہو مگر اردو شعرائنے اس کے خلاف متبذل خیالات ظاہر کئے، مثلاً سودا ؎

افسوس! تم اوروں سے ملو رات کو تنہا　　ہم دن کو ترستے ہیں ملاقات کو تنہا

جرأت۔ انشاء۔ ناسخ۔ رند۔ ریاض وغیرہ شعرا نے اس سے دو قدم آگے بڑھکر معشوق کو شاہد بازاری، ذلیل اور ہرجائی بنا دیا ؎

چھینٹے غیروں سے جو کل آپ لڑے پانی کے　　پڑ گئے سیکڑوں بس ہم پہ گھڑے پانی کے　　جرأت

کچھ اشارہ جو کیا ہم نے ملاقات کیوقت　　ٹال کر کہنے لگے دن ہے ابھی رات کیوقت　　انشاء

راہرو کیوں نہ کہیں جان چلی، جان چلی　　یوں جو بازار میں تن تن کے وہ مغرور چلے　　ناسخ

کیونکر نبھیگی ہم سے ملاقات آپ کی　　واللہ کیا ذلیل ہے اوقات آپ کی　　رند

ہرجائی پن کی آپ کے کچھ انتہا نہیں　　کٹتا ہے دن کہیں تو کہیں رات آپ کی　　〃

خدا کی شان یہ کوٹھوں کے بیٹھنے والے　　ہماری آہ کو اب نارسا سمجھتے ہیں　　ریاض

حضرت داغ نے ابتذال کی حد کر دی ؎

حضرت یوسفؑ کے بکنے پر عبث ہے اعتراض　　اک مٹھائی ہم سمجھتے ہیں تمہیں بازار کی

بے غیرتی کا ایک مضمون باقی رہ گیا تھا یعنی کسی اور پر معشوق کے عاشق ہونے کی حسرت کرنا۔ سودا نے اس مضمون پر ایک مکمل قطعہ ہی لکھ ڈالا جس کا مطلع ہے ؎

توجسے چاہے' وہ یارب تجھسے ہو بیباک تر ملنے میں ہر نیک دبد کے تجھسے ہو چالاک تر

معشوق کے ادب و احترام کا کیا ذکر شعرائے لکھنؤ نے معشوق کے خط و خال وغیرہ کے متعلق جو جدت آفرینیاں کی ہیں وہ معشوق کے بالکل شایان شان نہیں۔ مثلاً رند ؎

دولتِ حسن جب لٹا بیٹھے مُہراب کو ٹکوں پہ ہونے لگی

الغرض اکثر شعرائے اُردو کا کلام ایک حد تک ابتذال سے پُر ہے۔ مقام مسرت ہے کہ شعرائے دورِ جدید نے اِن بدنمائیوں کی طرف اپنی توجہ مبذول نہیں کی۔

زمانہ تیس ۳۰ سال پہلے

دسمبر ۱۹۱۸ء کے زمانہ میں آریہ سماج اور پالیٹکس کے عنوان سے ایک نہایت اہم مضمون شائع ہوا تھا۔ یہ مضمون لالہ لاجپت رائے کا لکھا ہوا تھا۔ جو ۹ر نومبر ۱۹۱۸ء کو جلاوطنی سے رہا ہو کر مانڈلے سے واپس آگئے تھے۔ اِن دِنوں گورنمنٹ آریہ سماج سے بہت مشکوک ہو رہی تھی۔ اور بعض لیڈران آریہ سماج سرکاری عتاب کے خوف سے مرعوب سے ہو رہے تھے۔ لالہ لاجپت رائے صاحب نے "معزت رائے" کے نام سے زمانہ میں ایک پُر جوش مضمون کے دوران میں رہنمایانِ سماج سے اپیل کی تھی کہ وہ تھوڑے سے نقصان کے اندیشہ سے آریہ سماج کا اصلی مقصد نہ نوت ہونے دیں آپ نے اپنے مضمون کے دوران میں یہ لکھا تھا کہ :-

"سب سے بڑا احسان جو آریہ سماج نے ہندوں پر کیا ہے وہ یہ ہے کہ اُسنے ہندوں کو مایوسی اور بیچارگی کے بستر سے اُٹھا کر خودداری اور خود اعتمادی کے پاؤں پر کھڑا کیا ...... ہندوں کو بتایا کہ محض کوں بھاؤں سے گذارہ نہیں چل سکتا۔ اور اپنی قومی و مذہبی ہستی اور اپنی سلف رسپکیٹ قائم رکھنے کے لئے مخالف اسباب اور مخالف طاقتوں کے ساتھ کسی قدر واجبی سختی سے کام لینا بھی ضروری ہے۔ دُنیا میں جو شخص ہمیشہ اپنے بچاؤ کی تدابیر میں مصروف رہتا ہے اور اپنے مخالف اسباب پر حملہ کرنا نہیں جانتا۔ وہ دُنیا کی لڑائی میں کبھی کامیابی کی اُمید نہیں کر سکتا۔ آریہ سماج نے جن اصولوں کا وعظ کیا۔ اُن کو عملی طور پر نباہ کر دکھا بھی دیا۔ ہندوازم کی تاریخ میں پہلی دفعہ اُس نے مغربی طریقے پر ایک ایسے چرچ آرگنیزیشن کی بُنیاد ڈالی، جس نے کامیابی سے مسیحی آرگنیزیشن کا مقابلہ کیا ...... آریہ سماج نے ہندوں کو یہ عملی سبق بھی سکھایا کہ قومی بہبودی اور فلاح کے لئے ہمیشہ ہم کو گورنمنٹ ہی کا دست نگر نہ رہنا چاہیئے ...... چنانچہ جو تحریکیں پہلے بلا امداد سرکاری چلانی ناممکن تھیں اُن کو آریہ سماج نے ہاتھ میں لیا اور کامیابی سے چلایا۔"

تُلسی

از پرنسپل رام پرشاد گھوشلہ ناشاد ایم۔اے

برگہائے گُل سے بھی خوشتر ہیں تیری پتّیاں / وہ کہاں پھولوں میں جو تجھ میں بھری ہیں خوبیاں

اضطرابِ قلبِ مضطر کے لئے تو ہے دوا / دل جلوں کے سوزِ دل کو تجھ سے ملتی ہے شفا

تیری خوشبو سے مہکتا تھا کبھی یہ گلستاں / تیرے دھانی روپ سے سرسبز تھا ہندوستاں

اُگ رہی تو بن میں تھی صحرا میں تھی گلشن میں تھی / پھولتی تو بام پر تھی در پہ تھی آنگن میں تھی

تجھ سے چرنامرت بنتا تھا جو پینے کے لئے / آبِ حیواں کا اثر رکھتا تھا جینے کے لئے

صبح اٹھکر لوگ تجھ کو جل چڑھاتے تھے کبھی / تیرے آگے شام کو دیپک جلاتے تھے کبھی

اک زمانہ تھا کہ تجھ سے کوئی گھر خالی نہ تھا / تیری الفت سے کوئی فردِ بشر خالی نہ تھا

ایک دن وہ تھا ہر اک دل میں تیری توقیر تھی / تو کبھی دنیا میں محبوبِ جوان و پیر تھی

دیوتا بھی اُن دنوں سر پر بٹھاتے تھے تجھے / زینتِ سر کے لئے افسر بناتے تھے تجھے

سہمی مرجھائی ہوئی۔ تو کیوں کھڑی حیرت میں ہے / کسکو ہے معلوم جو لکھا تری قسمت میں ہے

کیوں ہے کملائی ہوئی تو کس لئے غمناک ہے / کیوں کلیجہ پھٹ رہا ہے دل ترا کیوں چاک ہے

کیا تجھے ہے فکر بھارت ورش کے انجام کی / یا ستاتی یاد ہے گذرے ہوئے ایّام کی

یہ چمن بادِ بہاری سے ہرا تھا جن دنوں / ہند کا دامن مرادوں سے بھرا تھا جن دنوں

کوئی دن میں تو پھر اے تلسی ہری ہو جائیگی / آفت بادِ حوادث سے بری ہو جائیگی

پھر بہار آئیگی اُجڑے گلستاں میں ایکدن / پھر مہک پھیلیگی تیری دو جہاں میں ایکدن

پھر کھلیگا ایک دن غنچہ دلِ ناشاد کا
پھر بدل جائے گا رنگ اِس گلشنِ برباد کا

ترکہ

مشہور افسانہ نگار منشی پریم چند کی دھرم پتنی شریمتی شیورانی دیوی کی لکھی ہوئی ہندی کہانی

"رامدین بڑا شوقین ہے۔ کشتی لڑنا اور بانسری بجانا ہی اس کے دو شغل ہیں۔ اسے بالکل نہیں سوجھتا کہ اُسکا بڑا بھائی رامجس کتنی محنت سے گھر کا کام کرتا ہے۔"

ایک دن اس کی ماں گلابی نے اس کی خبر لی۔

کیوں رامو تم کب تک کام سے اتنا جی چراتے رہو گے؟ تمہارے باپ کے انتقال کو پانچ سال گذر گئے اس وقت سے رامجس اپنی جان کھپا رہا ہے اور تم کو جیسے کوئی غم ہی نہیں ہے۔

باہر سے رامجس دودھ کا برتن لئے آرہا تھا۔ ماں سے پوچھا۔

کیا ہے اماں کس پر خفا ہو رہی ہو؟

گلابی نے کہا: "کچھ نہیں بیٹا۔ یہی رامو کو سمجھا رہی ہوں کہ بیٹھے بیٹھے کھاتے ہو، تم کو بھی کچھ کرنا چاہیئے"

رامجس محبت کے انداز سے بولا۔ "کھیلنے کھانے دو اماں ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے بڑا ہو کر خود ذمہ داری کا احساس کرے گا۔"

"میرے نزدیک تم بھی تو لڑکے ہو۔ تمہارے باپ زندہ ہوتے تو کیا تم نہ کھیلتے؟"

"لیکن اب تو میں والد کی جگہ پر ہوں۔"

"اس سے تو وہ اور شیر ہو جائے گا۔"

گرہستی کے چرخے میں پڑ کر سبھی تن آسانی بھول جاتے ہیں اماں جی۔"

رامجس جب چلا گیا تو رامدین ماں سے ہنس کر بولا۔ "بھائی سب جانتے ہیں۔ صرف نہیں کو میرے کام کی پڑی رہتی ہے"

گلابی جھڑک کر بولی۔ "کیا وہ میری اولاد نہیں ہے؟ بے چارہ گھل کے کانٹا ہو گیا ہے۔ نہ جانے بھگوان تم کو کب عقل دے گا۔"

رامدین ہنسا۔ "بھگوان عقل نہ دیں یہی بہتر ہے۔"

"تو بے شرم ہے"

"تمہاری بلا سے" یہ کہتا ہوا وہ باہر چلا گیا۔

۲

ایک سال کا عرصہ گذر گیا۔ دو نئے واقعات پیش آئے۔ رامجس کے لڑکا پیدا ہوا مگر ماتاجی پوتا کھلانے کا ارمان لے کر راہیِ ملکِ عدم ہوگئی۔

کریا کرم سے فارغ ہو کر ایک دن رامجس نے بھائی سے کہا کہ "اب تو گھر کا کچھ کام دیکھو۔ بہت دنوں تک کھیلے کھائے۔ اب بیٹھے کام نہیں چلے گا"۔

رام دین منہ بنا کر بولا۔ "میں اس سے زیادہ کام نہیں کر سکتا"۔

رامجس نے ہنس کر کہا۔ "تم کس کام کے نزدیک جاتے ہو کہ اب اس سے زیادہ نہیں کر سکتے"؟

رامجس کی بیوی کوٹھری سے نکل کر بولی۔ "تمہیں نے تو گمراہ کیا ہے۔ اب کیا کہتے ہو پہلے تو بچہ سمجھتے تھے اب کیا بڈھا ہو گیا ہے"؟

"تم سے کون رائے لیتا ہے"؟

اُسی دن سے رام دین بھائی سے کبیدہ خاطر رہنے لگا۔ دھرمی بھی کچھ نہ بولتی۔ رام دین جب چوکے میں آتا تو آہستہ سے تھالی اس کے سامنے رکھدیتی۔ وہ جانتی تھی کہ اگر میں ذرا بھی بولی تو رامجس جان ہی سے مار ڈالے گا۔ جب کئی مہینے اسی طرح گذر گئے اور رام دین اپنی ضد پر اٹل رہا تو رامجس کو خیال ہوا کہ اسکی شادی کر دی جائے۔ ازدواجی زنجیر کی گرفت میں آکر ساری مشیخت بھول جائے گا۔ چنانچہ ایک دن رام دین کے سامنے یہ تجویز پیش کی۔

رام دین بے اعتنائی سے بولا۔ "ابھی میری شادی کی کیا جلدی ہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ میں اس مرض میں مبتلا ہی نہیں ہونا چاہتا"۔

رامجس متحیر ہوا۔ مگر پھر سمجھا شاید فکر کے مارے انکار کر رہا ہے دوبارہ سمجھانے لگا۔ "اگر شادی نہ ہوگی تو برادری والوں کی انگلیاں اُٹھیں گی۔ تنہا عورت خانہ داری کا کل انتظام کیسے سنبھال سکتی ہے۔ ماں کی موجودگی میں بہت کچھ مدد ملتی تھی۔ اب اکیلی دھرمی بچہ سنبھالے کہ گھر کے دھندے دیکھے"۔

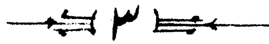
مگر رام دین پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا۔ جواب دیا کہ "اگر تمہاری خواہش ہو تو ایک اور شادی کر لو مگر میں اس کے قریب نہ جاؤں گا"۔

"تم جبراً یا قہراً شادی کرنی ہی پڑے گی"۔

"میں نہیں چاہتا کہ خانہ جنگی ہو۔ تم اب بال بچہ والے ہوئے کیا معلوم نبھے یا نہ نبھے"۔

"تو میں تم کو بے دست و پا تو نہیں کر رہا ہوں بھئی نہ نبھے تو اپنا حصہ لے کر علیحدہ کما کھالینا۔ ادیر کیا کرو گے"۔

"مجھکو کیا غرض پڑی ہے کہ خواہ مخواہ دنیا بھر کی فکر اپنے سر مول لوں۔ میں اسطرح بہت اچھا ہوں۔"
"تو یہ کیوں نہیں کہتے کہ آرام طلب ہو۔ بے تکی بات کیوں کرتے ہو۔ اس طرح کام کتنے دنوں چلے گا۔"
"گرہستی کا کیا میں نے ٹھیکہ لیا ہے چلے یا بھاڑ میں جائے۔ اگر میرا رہنا دوبھر ہو گیا ہے تو میں کہیں چلا جاتا ہوں"
رامجس نے دیکھا کہ نیکی کا بدلا بدی مل رہا ہے۔ بھائی جنگ پر آمادہ ہے۔ وہ ہنی اٹھا کر بھینس دوہنے چلا گیا
رام دین بھی لنگوٹ اٹھا کر اکھاڑے کی طرف چلدیا۔
گھر میں ایک ہی بھینس تھی اور کئی روز سے رام دین سارا دودھ چٹ کر جاتا تھا۔ رامجس کے واسطے چلو بھر بھی نہ بچتا۔ اس نے اپنے لڑکے کے واسطے ایک بکری پال رکھی تھی لیکن اتفاق سے آج بکری کا دودھ بھی بلی پی گئی۔ دھرمی نے بھینس کا آدھا دودھ انڈیل کر اپنے بچے کو دیدیا۔
رام دین نے اکھاڑے سے واپس ہو کر آدھا دودھ پایا تو جھلا کر لوٹے کو زمین پر پھینکدیا۔ دھرمی نے زمین پر پھیلے ہوئے دودھ پر حسرت کی نظر ڈالتے ہوئے کہا۔
"آج اگر بچہ تھوڑا سا دودھ پی گیا تو کیا اس کی جان لوگے؟ ایک دن کم ہی دودھ پی لیتے تو کیا دبلے ہو جاتے رام رام سارا دودھ مٹی میں ملا دیا۔"
رام دین غصہ میں مبہوت ہو گیا تھا۔ "تم سمجھتی ہو کہ میرا آدمی گھر کا مالک ہے۔ میں جو چاہوں کر لوں گی۔ مگر یہ اندھیر نہ ہونے پائے گا۔ رام دین کسی کی دھونس سہنے والا نہیں۔"
دھرمی نے بھی گرم ہو کر کہا۔ "تو کیا تمہاری خاطر بچے کو مار ڈالوں۔"
"بس اب خاموش رہو۔ تم رام دین کو بچہ خیال کرتی ہو لیکن میرے بھی دو آنکھیں ہیں۔ میں ساری رنگت دیکھ رہا ہوں میں کوئی دودھ پیتا بچہ نہیں ہوں۔ آج بھائی آئیں تو میں سارا جھگڑا چکا دوں گا۔"



رات کو جب رامجس آیا تو دونوں بھائیوں میں گفتگو چھڑ گئی۔
"بھائی اب آپ کے ساتھ میری گذر اوقات نہیں ہو سکتی۔"
"تو جیسی تمہاری مرضی ہو کرو۔ میں بھی تم سے عاجز آگیا ہوں۔"
"میں تمہارا اور تمہاری بیوی کا غلام نہیں ہوں۔"
"تو کون کہتا ہے کہ تم غلام ہو بھئی۔ جو صورت تم کو پسند ہو وہی اختیار کرو۔ مجھکو کوئی عذر نہیں ہے۔"
"میرا حصہ تقسیم کر دو بس اور میں کچھ نہیں چاہتا۔"
رامجس ہنسکر بولا۔ "میں کچھ نہ کہوں گا۔ جو تمہارے ایمان میں آوے خود لے لو اور جو چاہو مجھے دیدو۔"

"تم چاہتے ہو کہ میں گھر چھوڑ کر نکل جاؤں"

"ہرگز نہیں۔ اگر میں ایسا خیال کرتا تو تم اب تک یہاں موجود نہ ہوتے۔ میں نے تم کو کبھی غیر نہیں سمجھا۔ میرے لئے تم رام اوتار (بیٹا) اور تو دونوں برابر ہو میں دونوں کو ایک نگاہ سے دیکھتا ہوں"

"یہ سب آپ کی چالیں ہیں۔ میں بھی اب بچہ نہیں ہوں"

"تو یہی فیصلہ ہے"

"ہاں"

"اچھی بات ہے تم اس مکان میں رہو۔ میں پرانے مکان میں چلا جاتا ہوں"

رام دین بیباکانہ ہنس کر بولا" اب تک تو عورتوں ہی کا مکر و فریب سننے میں آتا تھا۔ اب معلوم ہوا کہ تم بھی اس علم میں پکّے ہو"

جب سینہ کینے سے بھرا ہو تو میل اور محبت اس میں کہاں جگہ پا سکتے ہیں۔

لیکن جب رامجس نے مکان خالی کرنے کا تذکرہ دھرمی سے کیا تو اس نے صاف انکار کر دیا۔

"کیا یہ میرا گھر نہیں ہے کہ نکلکر باہر چلی جاؤں۔ ہمیں جان کھپاتے ہیں، کام کرتے ہیں اور ہمیں مکان سے علیحدہ ہو جائیں۔ غیر ممکن ہے"

رامجس نے ضد کیا۔ "تمہیں میری موت منظور ہے یا کہ جینے دو گی۔ میں اس مکان میں اب نہیں رہ سکتا"

دھرمی کی زبان بند ہو گئی۔ جی میں شوہر کے تساہل پر غصّہ آیا اور اتنی بات منہ سے نکل ہی گئی"

"مجھکو بہت سمجھاتے تھے اب بھائی سے بات کرتے کیوں تھرّاتے ہو"

رامجس نے خشم آلود آنکھیں دکھا کر کہا" کیا فضول بکتی ہو۔ جو کچھ کہتا ہوں سنو"

دھرمی خاموش ہو گئی۔

رامجس اسی روز مکان چھوڑ کر علیحدہ ہو گیا۔ پرانے کھنڈر میں جہاں گائے بیل باندھے جاتے تھے رہنے لگا۔ رام دین کی کج خلقی سے اس کو اتنا رنج ہوا کہ کھیتی باڑی گائے بیل سب کچھ چھوڑ دیا۔ زندگی میں جس چیز کو وہ برحق سمجھتا تھا وہی چھوٹ گئی تو کھیتی باڑی۔ برتن بھانڈے میں کیا رکھا ہے۔ جب الشفو رہی میں شبہ ہو گیا تو اینٹ پتھر پر اعتقاد کیسا۔ بھائی اس کے لئے مونس حیات تھا۔ دونوں ایک ہی باپ سے پیدا۔ ایک ہی ماں کے دودھ سے پلے ایک ہی آغوش میں کھیلے۔ جب سے بڑا ہوا تو اس کے ہر خواب میں رام دین موجود تھا۔ کبھی یہ بات ذہن میں نہ آتی کہ کسی بات پر دونوں کے درمیان تفریق ہو سکتی ہے۔ بیوی آئی لیکن وہ غیر قبیلہ کی لڑکی تھی۔ لڑکا پیدا ہوا۔ لیکن اسکے

ساتھ محض ذاتی رشتے کی محبت تھی جو ایک نرم و نازک جڑ کی طرح ابھی زمین کی گہرائی تک نہ پہنچی تھی۔ لیکن رام دین کی محبت ہر ہر موئے جسم سے ظاہر اور ہر نفس میں پیوست تھی۔ وہ اسے اپنی جان سے عزیز تر سمجھتا تھا۔ اس نے اپنا سارا مال و متاع اسی بھائی کو بخش دیا اور خود مزدوری کرنے لگا۔



رامجس علی الصباح اٹھکر چار میل کے فاصلہ پر شہر چلا جاتا۔ رات کو نو بجے واپس آتا۔ یہی مزدوری اس کی معاش کا سہارا تھی۔ لیکن کبھی کبھی اس کو محض راستہ ناپ کر واپس آنا پڑتا تھا جس روز کوئی کام نہ ملتا۔ گھر میں فاقہ ہوتا۔ اس دوڑ دھوپ اور سخت محنت کا نتیجہ یہ ہوا کہ سال بھر بھی نہ گذرا تھا کہ اس کو ہلکا ہلکا بخار رہنے لگا۔ لیکن اس نے دھرمی سے اپنی حالت چھپائی اور برابر کام کرتا رہا۔ کمزوری روز بروز بڑھتی گئی اور بہت جلد تکان کا احساس ہونے لگا۔ اور چلتے وقت آنکھوں کے سامنے تتلیاں اڑنے لگتی تھیں۔ لیکن کسی سے کچھ کہنے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ ایک دفعہ وہ کام پر جانے لگا تو دھرمی نے اس کا لاغر جسم دیکھکر پوچھا۔

"آخر تم کو کیا ہو گیا ہے"

رامجس نے بات ٹال دی۔ "کچھ نہیں اچھا تو ہوں"

"پسلیاں باہر نکل پڑی ہیں۔ ایک ایک گن لیجئے مگر پھر بھی تم یہی کہتے ہو کہ کچھ نہیں ہوا۔ تم کیا کر کے رہو گے۔ کیا جان گنوا کر کام کرو گے" چلو بھر دودھ پا جاتے تھے وہ بھی اب نہیں ملتا۔ بھائی توانا ہوتا جاتا ہے۔ تمہاری یہ حالت ہو رہی ہے۔

"تیری آنکھوں میں تو بس رام دین کھٹکتا رہتا ہے"

"تم کو نہ مردم شناسی آئی ہے نہ آئے گی۔ بھائی کی وجہ سے فقیر ہو گئے اور وہ بات بھی نہیں پوچھتا مزے سے کھاتا اور مونچھوں پر تاؤ دیتا ہے۔ انسان ہوتا تو انسانیت کا برتاؤ کرتا"

"کیا فضول بکتی ہو۔ تم سمجھتی ہو کہ میں اور وہ دو ہیں۔ میں تو بالکل ایک ہی سمجھتا ہوں۔ پچھلے جنم میں میں رام دین کا قرضدار رہا ہوں گا۔ وہی قرض ادا کر دیا"

رام اوتار باہر سے آکر کھانا مانگنے لگا۔

دھرمی نے کہا۔ "کٹوردان میں روٹی ہے نکال کر کھا لو"

"میں تو دودھ روٹی کھاؤں گا"

"دودھ کہاں ہے بیٹا دودھ تو خواب و خیال ہو گیا"

اس کے آگے وہ کچھ نہ کہہ سکی۔ آنکھیں ڈبڈبا آئیں جس گھر کو اس نے اپنے بال بچوں کے واسطے مر کھپ کر درست کیا تھا دوسرے کا ہو گیا۔ جھاڑ پونچھ کر بھی ہاتھ کالے کے کالے رہ گئے۔

رام اوتار ماں کی اشک آلودہ آنکھیں دیکھ کر بغیر ضد کئے باہر چلا گیا۔

پانچ سال کا بچہ تھا مگر بھولا نہیں بلکہ بہت سمجھدار تھا۔

یہ مفلسی کا دوراندیش تحفہ ہے۔

دھرمی کو بیٹے کا بغیر کھائے باہر چلا جانا بہت شاق گذرا راجس سے بولی

"یہ ہے تمہاری سدھوائی کا نتیجہ۔ سادھو تو اس شخص کو ہونا چاہیئے جس کے نام پر کوئی رونے والا نہ ہو۔ بال بچوں کے ہوتے سادھو بن جانا ظلم ہے۔"

راجس نے ترش روئی سے کہا۔ "اچھا اب چپ رہو۔"

"چپ تو ہوں۔ اور کیا کر رہی ہوں۔"

دھرمی خون کا گھونٹ پیکر چلی گئی۔ رامو بھی کام پر چلا گیا۔

(۵)

رام دین غیر شادی شدہ ہے۔ اس لئے اسے کوئی فکر نہیں۔ کاشت وغیرہ مزدوروں سے کراتا ہے اس کو پیداوار میں نفع و نقصان کی مطلق پرواہ نہیں ہے۔ کیونکہ جب ضرورت ہوتی ہے تو کچھ نہ کچھ جائداد فروخت کر ڈالتا ہے۔ باغ بک گئے۔ جانور بک گئے۔ رفتہ رفتہ کھیتوں پر بھی زوال آ گیا۔ مگر رام دین وہی رنگ رلیاں منا رہا ہے۔

ایک دن راجس دھرمی سے پوشیدہ بھائی کے پاس گیا اور بولا۔

"کیوں رامو! کیا گھر خاک میں ملا کر چھوڑو گے۔"

رام دین نے بے غیرتی سے جواب دیا۔ "میرا گھر ہے میں جو چاہوں کروں۔ تم سے کیا غرض۔"

راجس بھرائی ہوئی آواز سے بولا۔ "تم سمجھتے ہو کہ مجھے کوئی غرض نہیں۔ مگر میں اب بھی تم کو اپنا سمجھتا ہوں۔ تمہاری خوشی میں میری خوشی ہے اور تمہاری تکلیف سے مجھے بھی تکلیف ہوگی۔ ابھی تو میں موجود ہوں مگر ایک دن آنیوالا ہے جب تم کو سمجھانے والا بھی کوئی نہ رہے گا۔ میں تم سے کچھ مانگنے نہیں آیا ہوں۔ ایشور مجھکو پیٹ بھر روٹی دیتا ہے۔ لیکن اس گھر کو میں نے اپنے خون سے بنایا ہے۔ اس کو تباہ ہوتے دیکھ کر میرا سینہ پھٹا جاتا ہے۔ باپ کے بعد گھر کی کیا حالت تھی۔ یہ تم سے چھپی ہوئی بات نہیں ہے۔ میں نے سب کچھ تم کو دیدیا تاکہ تم خوش و خرم رہو۔ اسلئے نہیں کہ تمام گھر بار خاک میں ملا کر محتاج ہو جاؤ۔"

رام دین نے جہالت کا جواب دیا۔ "مجھکو کیا کرنا ہے جب تک جائداد ہے چین کی بنسی بجا رہا ہوں ہونے پر دیکھا جائے گا۔"

رامجس نے دیکھا کہ اس کے سمجھانے کا کوئی اثر نہیں ہے۔ گھر واپس آیا لیکن بیحد رنجیدہ تھا۔

دھرمی نے پوچھا۔ "کہاں گئے تھے۔ طبیعت علیل ہے اور ٹھنڈی ہوا میں گھوم رہے ہو۔ سنتی ہوں لالہ جو اب کھیتوں پر ہاتھ صاف کر رہے ہیں۔ مجھ سے تو یہ بے انصافی نہ دیکھی جائے گی۔ باغ وغیرہ فروخت کر دیا ہم خاموش رہے۔ مگر کھیت نہ بیچنے دونگی۔ ان کے آگے پیچھے کوئی نہیں ہے مگر ہمارے تو بھگوان کا دیا لڑکا ہے۔ اس کو بھی کچھ چاہیئے یا نہیں۔"

رامجس آسمان کی طرف دیکھکر بولا۔ "بیچ ڈالے یا آگ لگا دے۔ مجھکو کیا کرنا ہے۔ جو جیسا کرے گا ویسا نتیجہ پائے گا۔ رام نے اجودھیا کا تخت چھوڑا جس کا جی چاہے لے۔"

دھرمی تیز ہو کر بولی۔ "سادھو بنکر بھکارن تو بنا دیا۔ اب کیا کرنے پر تُلے ہو اب بھی تم کو شرم نہیں آتی۔"

"شرم کس بات کی ہے۔ کوئی چوری تو کی نہیں۔ جو میرا فرض تھا ادا کر دیا۔ تم کو معلوم ہونا چاہیئے کہ جو شخص خود غرض ہوتا ہے ہمیشہ اُس کی ذلت ہوتی ہے۔"

"تم سمجھتے ہو کہ چند لوگوں کی شاباش سے دیوتا بن جاؤ گے۔"

"میں اپنا دھرم نہ چھوڑوں گا۔ چاہے شاباشی ملے یا نہ ملے۔"

دھرمی کے غصہ کا شعلہ بھڑک اُٹھا۔ "زیادہ ڈینگ نہ مارو تمہاری تو وہی حالت ہے کہ دال گر گئی تو کہنے لگے کہ مجھے روکھی روٹی ہی پسند ہے۔ جو اپنے بچوں کے منہ کا لقمہ چھینکر کتے کو کھلا دے اُس کو میں سخی نہ کہوں گی۔ یہ تو مہا پاپ ہے۔"

"کیا بکتی ہو۔ میں نے زمین وجائداد بھائی کو دیدی تو کیا ہوا تم کو گلے سے لگائے ہوں۔ اور جب تک جان میں جان باقی رہے گی لگائے رہوں گا۔ ہاں۔ مرنے کے بعد کیا ہوگا یہ نہیں جانتا۔"

دھرمی پھر بھی خاموش نہ ہوئی۔ "تمہارے گلے لگانے سے مجھکو کیا آرام ملا؟ گلے لگنے سے پیٹ تو نہیں بھرتا۔ تمہارے مرنے پر وہی ہوگا جو اب ہو رہا ہے۔ تمہارے اس اندیشہ سے کیا واسطہ؟ جب تم کو اپنے بال بچوں کی پرواہ نہیں ہے تو انھیں بھی تمہاری پرواہ نہ ہوگی جو اُن کے سر پڑے گی بھگت لیں گے۔"

رامجس نے پھر آسمان کی طرف دیکھا۔ دھرمی کی زبان سے ایسے کڑوے بول سننے کا کبھی اسے گمان بھی نہ ہوا تھا۔ بیشک اس نے بھائی کو سب مال دھن دیدیا تھا۔ لیکن بیوی بچے کے واسطے بھی تو دن رات مر رہا تھا۔ پھر بھی ان کا منہ سیدھا نہیں ہے۔ اس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں اور بولا:-

"تو پھر میری زندگی اجیرن ہے۔"

دھرمی کو اب اس پر رحم آیا۔ بولی۔" میں نے یہ بات تمہاری دل شکنی کے واسطے نہیں کہی ہے بلکہ دنیا کی بات کہہ رہی ہوں۔ سوچو جب تم غیر کو بیوی اور بچے سے زیادہ پیار کرو گے تو تم کیسے اُمید کرتے ہو کہ وہ تمہارا ہی راگ گائیں گے۔ اگر تمہارا یہ خیال ہے تو یہ تمہاری غلط فہمی ہے۔"

راجیس محبت میں ڈوب کر بولا۔" میں جانتا ہوں دھرمی۔ لیکن اپنا دھرم یہ بھی تو نہیں ہے کہ گھر لٹا کر گھر والوں کو بے پناہ کر دوں۔"

"تو کیا کام کے پیچھے جان دینا چاہتے ہو۔ ذرا آئینہ میں صورت دیکھو۔"

"میرا جسم ہی تم لوگوں کے کام آجائے اور کیا چاہیئے۔"

"عمر بھر کی کمائی کا نقصان دو چار برس میں پورا نہیں ہو سکتا جسم ایشور کی امانت ہے اسکو ضائع کرنا پاپ ہے۔"

"پاپ ہو یا پُن تمہارے ساتھ میں نے جو بے انصافی کی ہے اس کی تلافی ضروری ہے۔"

"جو شدنی تھی ہو گئی۔ اب پچھتانے سے کچھ ہاتھ نہ آئے گا جتنا جس کی قسمت میں ہوتا ہے وہ ضرور ملتا ہے۔ دنیا میں لاکھوں بندے ایسے ہیں جنھیں پیڑ کا سایہ بھی میسر نہیں ہے۔ ہمارے تو ایشور کا دیا ہوا گھر بھی ہے۔ چار دن میں لڑکا بھی چار پیسے کمانے کے قابل ہو جائے گا۔ پھر سب تکلیف دور ہو جائیگی۔"

راجیس پر پیسے کمانے کا خبط سوار تھا۔ مزدوری کرنے جاتا تو دوپہر کی چھٹی میں بھی کچھ نہ کچھ کام کر کے دو چار پیسے زائد پیدا کر لیتا۔ یہ خبط اتنا بڑھ گیا تھا کہ کبھی پیسے دھیلے کا اپنے واسطے چبینا بھی نہ لیتا۔ گھر سے گڑ کا ڈلا کھا کر جاتا اور رات کو نو بجے واپس ہو کر روٹی کھاتا۔ دھرمی سمجھاتی۔ روتی۔ اور کام پر جانے سے روکتی لیکن راجیس کچھ نہ سنتا تھا۔ روز بروز لاغر ہوتا جاتا تھا۔

ماگھ کا مہینہ تھا۔ کئی دن سے ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ رات کو پالا پڑتا اور سویرے کھیتوں پر روئی کے گالے جیسے لپٹے ہوئے نظر آتے گھر سے باہر منہ نکالنا دشوار تھا۔ لیکن راجیس منہ اندھیرے کام پر نکل جاتا۔ بدن پر محض ایک گاڑھے کا شلوکہ اور پُرانا کمبل ہوتا۔ ہوا سیدھی ہڈیوں میں سرایت کرتی جاتی۔ پیر ٹھٹھر کر رہ جاتے۔ ایک کنکری بھی نیچے آجاتی تو کانٹے کی طرح چبھنے لگتی۔ ایک دن گھر آیا تو وہ کھانس رہا تھا۔ سینہ میں درد محسوس ہو رہا تھا۔ دھرمی نے آگ سے سینکنا شروع کیا۔ لیکن رات بھر میں کھانسی بڑھ گئی۔ دوسرے دن نمونیا ہو گیا اور تیسرے دن راجیس دنیاوی مہر و محبت کی بندشیں توڑ کر ملک عدم کو راہی ہوا۔

رام دین بھنگ پی کر لیٹا ہوا تھا۔ ارتھی اٹھانے بھی نہیں آیا سارے گاؤں میں اسکی مذمت ہوئی لیکن منھ پر کوئی کچھ نہ کہہ سکا۔ کیونکہ وہ سب پر حاوی تھا۔

باب ۶

کئی سال گذر گئے دھرمی اور رام اوتار دونوں مزدوری کر کے اپنا گذر اوقات کرتے تھے۔ عورت ذات گاؤں سے باہر جاتے ڈرتی تھی کہ کہیں بدنامی نہ ہو جائے۔ رام اوتار۔ اب تیرہ سال کا ہو چکا تھا لیکن دھرمی اُسے کہیں نہیں جانے دیتی تھی۔ وہ فاقہ کرتی پھٹے پُرانے کپڑے پہنتی لیکن لڑکے کو جان سے زیادہ سمجھتی۔ اور کہیں نظر سے باہر نہ جانے دیتی۔ ادھر رام دین کھیت رہن کر کے گل چھرے اڑاتا اور بھول کر بھی ان کی طرف رُخ نہ کرتا تھا۔

جاڑوں میں مٹر خوب پھلی ہوئی تھی سب لڑکے اپنے اپنے کھیتوں سے مٹر کی پھلیاں توڑ کر جیبیں بھر لاتے اور اُچھل کود کر خوب کھاتے۔ رام اوتار کس کے کھیت میں جاتا ؟۔

ایک دن اس کا جی نہ مانا۔ چپکے سے رام دین کے کھیت میں چلا گیا اور دونوں جیبیں پھلیوں سے بھر لایا۔

" اگر رام دین خفا ہوگا تو کہدونگا کیا کھیت تمہارے باپ کا ہے ؟ جیسے تم حقہ دار ویسے ہی میں بھی حقہ دار ہوں "

اتفاقاً رام دین اسی وقت آپہونچا۔ رام اوتار چوروں کی طرح چھپنے کا موقع تلاش کرنے لگا ساری ہیکڑی بھول گیا۔ رام دین نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور گھسیٹتا ہوا دھرمی کے پاس لاکر بولا

" آج تو میں چھوڑ دیتا ہوں لیکن پھر کھیت کے قریب گیا تو دانت توڑ دونگا "

دھرمی نے ساری پھلیاں لڑکے کے جیب سے نکال کر رام دین کے سامنے رکھدیں اور بولی۔

" اب اس کو اپنے کھیت میں دیکھنا تو زمین کھود کر دفن کر دینا کمبخت مجھ سے کہتا تو کسی سے مانگ دیتی۔ اپنی پھلیاں لیتے جاؤ "

رام دین نے دو تین ڈانٹ جمائی اور پھلیاں وہیں چھوڑ کر چلا گیا۔ اسی وقت رام اوتار دلیا میں پھلیاں لیکر نکلا اور رام دین کے دروازے لیجا کر اس کی گائے کے سامنے ڈالدیں۔ اور گھر آکر رونا اور چچا کو کوسنا شروع کیا۔

" کھیت ان کے باپ کا ہے۔ بڑے آئے دھناسیٹھ بن کے۔ آج خاموش رہ گیا۔ ورنہ اتنے پتھر مارتا کہ سر چور ہو جاتا۔ بے ایمان۔ لٹیرا کہیں کا "

دھرمی تیز نگاہوں سے دیکھکر بولی۔ " واہ رے چھوکرے چھوٹا منہ اور بڑی بات ! اس کے

باپ کا نہیں ہے تو کیا تیرے باپ کا ہے؟ مرحوم کے نام پر دھبہ لگتا ہے۔ تیرے باپ کو بھائی کا کتنا خیال تھا کہ جس روز اس نے اپنا حصہ طلب کیا اسی روز سب کا سب اٹھا کر دیدیا اور مرتے مرگیا لیکن ایک دھیلے کا روادار نہ ہوا۔ تو اُسی باپ کا بیٹا ہے ایسی باتیں منہ سے نکالتے ہوئے تجھے شرم نہیں آتی۔ تیرے باپ نے روپیہ پیسہ نہیں چھوڑا جگہ جائداد نہیں چھوڑی۔ مگر نام تو چھوڑ گیا ہے جس کو گاؤں والے اب بھی سراہتے ہیں۔ تو دیوتا کا بیٹا ہے تجھے دیوتا بننا چاہیئے اور کچھ نہیں۔ اگر دوسرا راستہ اختیار کرتا ہے اور ان کی بدنامی کا باعث ہوتا ہے۔ تو پہلے مجھکو مار ڈال پھر جو جی چاہے کرنا"

یہ کہہ کر وہ کوٹھری میں جا بیٹھی اور رونے لگی۔ اپنے شوہر کا فطری حُسن اخلاق وہ اُس کے مرنے کے بعد سمجھ سکی۔ اسکی زندگی میں وہ اخوت کی عظمت جو اس کے دل میں تھی نہ سمجھ سکی تھی۔ اب وہ خیال کرکے روتی تھی کہ اس نے اپنے شوہر کو کوس کوس کر اس پر کس قدر ظلم کیا۔ اگر اس نے رام جس کو نہ ستایا ہوتا تو وہ کیوں اتنی کڑی محنت کرتا اور اسقدر رنجیدہ ہو کر دنیا کو خیرباد کہہ دیتا۔ اس روز سے اسکی نگاہ میں شوہر انسانیت اور حُسن اخلاق کے لحاظ سے فرشتہ معلوم ہونے لگا۔ ایک دن جس کام کی وہ برائی کرتے تھکتی نہ تھی آج اسی کام کی اس طرح تعریف کر رہی ہے گویا شوہر پرستی کا مذہبی حق ادا کر رہی ہے اور آج اس کی اولاد ہی وجہ ننگ و ناموس ہو رہی ہے۔

رام اوتار رو رہا تھا۔ اسلئے کہ اس نے اپنی ماں کو صدمہ پہونچایا تھا۔ اسکی زندگی میں مہر مادری ہی ایک لطیف شے تھی وہ دیکھتا تھا کہ کس مصیبت سے ماں اس کی پرورش کر رہی ہے خود نہیں کھاتی لیکن اس کو کھلاتی ہے۔ خود رات رات بھر گیہوں پیستی ہے لیکن اسکو کوئی بڑا کام نہیں کرنے دیتی۔ مصیبت کی خراد پر اسکی طفلانہ عقل تیز ہو چکی تھی۔ وہ سمجھتا تھا کہ اگر چچا نے کل مال متاع پر دخل نہ کر لیا ہوتا تو کیوں اس کی ماں کو اتنی سخت محنت کرنی پڑتی اور باپ کیوں اتنا جلد مرجاتا۔ اس کی نگاہوں میں رام دین اس کا دشمن تھا اُسے کسی طرح بھی بدلا لینا اس کا منصبی فرض تھا۔

لیکن ماں کی محبت آمیز جھڑکیوں نے اسے دکھا دیا کہ وہ کتنا ذلیل طبیعت اور حریص ہے۔ وہ ایک دیوتا باپ کا بیٹا ہو کر اتنا خود غرض اور ضدی کیوں ہے۔

روتے روتے اسکی ہچکیاں بندھ گئیں۔ تھوڑی دیر بعد اس نے آکر ماں کے قدموں پر سر رکھدیا اور التجا کی

"امّاں مجھکو معاف کردو۔"

ماں نے لڑکے کو سینے سے لگا لیا اور سسکتی ہوئی بولی۔

"معاف کرتی ہوں بیٹا! بس یہی میری خواہش ہے کہ تو اپنے باپ جیسا بن۔ انہوں نے جس طرح اپنی زندگی بسر کی ہے اسی طرح تو بھی اپنی زندگی بسر کرے۔"

"یہی ان کا ترکہ ہے اور یہی تجھے لینا چاہیئے۔"

مترجمہ رفیق احمد عاجز

نذرِ عقیدت

بخدمت حضرت جوش ملیح آبادی

از شیخ محمد یوسف ظفر بی اے

جوش۔ اے نطقِ حقیقت۔ اے کلیمِ رنگ و بو
جوش۔ اے ہمرازِ فطرت اے ندیمِ رنگ و بو

اے کہ تو ہے عینِ فطرت۔ رازدارِ کائنات
اے کہ تو ہے واقفِ سرِّ بہارِ کائنات

وا ہوئے عقدے معارف کے تری تخئیل سے
بزمِ عالم ہوگئی روشن تری قندیل سے

فکر تیرا دامنِ یزداں کو ہے پکڑے ہوئے
سلسلۂ تخئیل کا کونین کو جکڑے ہوئے

ہے ستاروں سے اُدھر تیرا جہانِ رنگ و بو
جس جگہ ملتا نہیں کوئی نشانِ آرزو

جس جگہ فکرِ معیشت۔ سوزِ ہستی کچھ نہیں
جس جگہ سرمایہ داری، زرپرستی کچھ نہیں

جس جگہ ساغر چھلکتے ہیں بھری برسات میں
رقص کرتی ہیں جہاں پریاں سہانی رات میں

جس جگہ مذہب فقط انسانیت کا نام ہے
جس جگہ دنیائے دل ناواقفِ آلام ہے

جس جگہ لفظوں میں کفناتے نہیں تعلیم کو
دخل جس جا پر نہیں سود و زیاں کے بیم کو

جس جگہ پر موت سے ڈرتے نہیں ہیں نوجواں
جس جگہ مرتے ہیں۔ پر مرتے نہیں ہیں نوجواں

جس جگہ زر سے خریدا جا نہیں سکتا ضمیر
جس جگہ اُٹھتا نہیں خونِ شہیداں کا خمیر

تو نے دنیائے تخئیل شعر میں آباد کی
تو نے ڈھیلی کیں گرفتیں جور و استبداد کی

تو نے وہ پھونکا ہے شعروں پر فسونِ انقلاب
ہے ٹپکتا تیرے ہر مصرع سے خونِ انقلاب

آرہا ہے وقت وہ جب تجھ کو پہچانیں گے سب
اپنے بیگانے تجھے جب رہنما جانیں گے سب

اے علمبردارِ حریت وہ دن بھی آئے گا
جب ترے ہاتھوں میں پرچم ہند کا لہرائے گا

ہند جب آزاد ہوگا تیرے نفخِ صور سے
جب عصا لیکر کلیم اُترے گا کوہِ طور سے

صبر کر اے جوش اے ملکِ سخن کے تاجور
دادگر ہوگا کسی دن یہ بتِ بیدادگر

ہیرا

از مرزا فدا علی خنجر لکھنوی

جے رام نے بجھتی ہوئی چلم کی راکھ جھاڑ کے کوئلے سُلگاتے ہوئے کہا۔ "وہی مثل ہے کہ زبردست مارے اور رونے نہ دے! گھر میں عورت بیمار پڑی تھی، دوا دارو کیواسطے چھدام نہیں تھی، اُس پر ٹھاکر کا آدمی آکر بیگار میں پکڑلے گیا، بہت رویا گڑگڑایا مگر کون سُنتا ہے؟ دن بھر بیل کی طرح کام کروایا اوپر سے چار باتین سُنائیں عورت کی طبیعت دن بدن بگڑتی جاتی ہے۔ بھیّا! سمجھ میں نہیں آتا کیا کریں کیا نہ کریں؟ آیا تو بڑی آس لگا کے تھا۔"

ہیرا اُس کی باتین بڑی ہمدردی سے سُن رہا تھا اور اُن باتوں کا مطلب بھی سمجھ چکا تھا، اُس نے ٹھنڈی سانس بھر کے جواب دیا۔ بھیّا! جھوٹ نہ سمجھنا، پتّو کی ماں کے کڑے گرو کر کے لگان ادا کیا، وہ بھی پورا نہ پڑا، ابھی ساہوکار کا پچھلا حساب باقی ہے، فصل کا حال تمہیں معلوم ہی ہے۔ پتّو کی طبیعت بھی اچھی نہیں ہے۔ اگر میرے پاس کچھ ہوتا تو تمھیں خالی ہاتھ نہ پھیرتا۔"

ہیرا کا جملہ پورا نہ ہونے پایا تھا کہ زمیندار کا آدمی بلائے ناگہانی کی طرح دروازے پر نازل ہوا۔ ہیرا کو ایسا محسوس ہوا جیسے موت کا دیوتا جم آج اُس کی روح قبض کرنے آیا ہے! وہ اُس کی پیشوائی کیلئے اُٹھنا ہی چاہتا تھا کہ اُس نے گرج کر کہا۔ "ابے او ہیرا! مالک کے گھر ابھی تک دودھ نہیں پہنچا! تم لوگ سیدھے برتاؤ سے نہیں مانتے۔ جلد جا کر دودھ دے آؤ۔ اور ہاں، گھر کا نکلا ہوا جتنا گھی ہو وہ بھی لیتے جانا۔ آج مالک کے یہاں مہمان آئے ہوئے ہیں۔"

اِتنا کہکر وہ واپس جانے کو تھا کہ ہیرا نے دانت نکال اور منھ سکوڑ کر کہا۔ "بھیّا! جب سے بڑی بھینس کا پڑوا مرا ہے جبھی سے وہ ٹھیک سے دودھ نہیں دیتی ہے، چھوٹی بھینس گابھن ہے۔ اِس سے اُسکا دودھ بالکل ٹوٹ گیا ہے، کبھی مشکل سے پاؤ آدھ پاؤ دے دیتی ہے، کبھی وہ بھی نہیں دیتی۔ یہ بات مالک کے کان میں ضرور ڈال دینا۔"

زمیندار کے آدمی نے گرج کے جواب دیا۔ "نواب صاحب کا بچّہ بنا ہے! کیوں بے! کیا ہم تیرے باپ کے نوکر ہیں خود جا کے کہہ آتا؟ یہاں سے بیٹھے ہوئے حیلے حوالے بتا رہا ہے۔"

ہیرا گڑگڑا کے بولا۔ "نہیں بھیّا! اِسمیں ذرا بھی جھوٹ نہیں ہے۔ یقین نہ ہو تو جے رام سے پوچھ لو۔"

لیکن غیظ و غضب میں بھرا ہوا وہ آدمی کسی طرح مزید بات چیت کیلئے نہ رُکا۔ دیکھتے ہی دیکھتے یہ جا وہ جا آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔

ہیرا پریشانی کے عالم میں سر پکڑ کے بیٹھ گیا۔ اُس کے دل میں فکروں کا شدید طوفان برپا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے کوئی بار بار اُس کے کانوں میں کہہ رہا ہے کہ عنقریب کوئی سخت مصیبت نازل ہونیوالی ہے، ہوشیار ہو جاؤ۔

جے رام بھی اپنا مطلب نکلتے نہ دیکھکر اُٹھ کھڑا ہوا۔ چلتے وقت ہیرا سے بولا۔ "نہ جانا ہوں ہیرا بھیا! پھر ساہوکار کا دروازہ کھٹکھٹانا پڑے گا۔ یہ بھی قسمت کی بات ہے بھیا! اچھا! رام رام۔"

ہیرا نے جواب میں صرف ایک ٹھنڈی سانس لی اور پتّو کی ماں کو آواز دیتا ہوا گھر کے اندر چلا گیا۔

(۲)

ٹھاکر جسونت سنگھ اپنی زمینداری کے ایک گاؤں میں رہتے تھے۔ شہر میں کبھی کبھی تفریحاً چلے جاتے تھے، عیاش منش آدمی تھے، لیکن بڑے سخت گیر تھے۔ اکثر اپنی تعریف میں کہا کرتے تھے کہ "بالو سے تیل نکالنا میں ہی جانتا ہوں۔" اور واقعہ بھی یہی تھا کہ ٹھاکر جسونت سنگھ کا آدمی جس دروازے پر جاکر کھڑا ہو جاتا۔ وہاں سے لگان وصول کئے بغیر نہ ٹلتا۔ چاہے آسامی کو اپنی گرہستی ہی کیوں نہ بیچنا پڑے۔ بڑے پوجا پاٹ اور دیوی دیوتا ماننے کے بعد ڈھلتی عمر میں ایک بچے کا مُنھ دیکھنا نصیب ہوا تھا اور اُس کا سن ڈھائی تین سال کا ہوگا۔ بڑے لاڈ پیار سے اُسکی پرورش ہو رہی تھی۔ خود ٹھاکر صاحب بھی اُسے کبھی کڑی نظر سے نہ دیکھتے تھے۔

ہیرا بھی اُسی گاؤں میں رہتا تھا، کچھ روز پہلے ہیرا کے پاس گائے بھینسوں کی کمی نہ تھی، کھیتی باڑی بھی بہت اچھی تھی، آرام سے زندگی کے دن گذرتے تھے۔ لیکن دو برس کا زمانہ ہوا جب اس گاؤں میں سیلاب آیا، پالا پڑا اور وبا پھیلی۔ اُس وقت سے اُس کی حالت کچھ ایسی بگڑ گئی کہ ابھی تک سُدھر نہ سکی۔ وبا میں چودہ دن کے اندر اُس کے دو تین جانوروں کے علاوہ کل باڑہ ختم ہو گیا۔ دوسرے سال بھی فصل اچھی نہیں ہوئی۔ اِس لئے لگان ادا کرنے کیلئے اُسے ایک بھینس فروخت کرنا پڑی، اب اُس کے پاس صرف دو بھینسیں اور ایک گائے رہ گئی تھی۔ ساہوکار کا قرض، اگر کبھی نہ جلنیوالے بڑھاپے کیطرح دن دونا رات چوگنا بڑھتا ہی جاتا تھا۔ اِس سال کسی نہ کسی طرح لگان تو ادا ہو گیا، لیکن ساہوکار کا مطالبہ اور روٹیوں کی فکر اُس کو گھُلائے ڈالتی تھی۔

اُس کے پانچ بچّے ہوئے تھے لیکن اُن میں سے صرف ایک بچّہ چار پانچ سال کی عمر کا زندہ تھا، ہیرا اُس بچے کو پیار سے پتّو کہا کرتا تھا۔ ہیرا اور اس کی عورت لچھمی دونوں اُسے ہر وقت سینے سے لگائے رہتے تھے اور ہر وقت ایشور پر نظر رکھتے ہوئے بڑی منّت و آرزو سے پال پوس رہے تھے۔ اُن کی ساری محبت، ساری اُمیدیں محض اِسی بچے سے وابستہ تھیں۔ پتّو ہی اُنکی زندگی کا سہارا تھا۔

آج تقریباً چار پانچ دن سے پتّو کو زور شور سے بخار آرہا تھا۔ ہیرا اپنے مکان کے کچے صحن میں ٹوٹی ہوئی کھٹیا پر مغموم بیٹھا ہوا تھا تھوڑے فاصلے پر سامنے اُس کی بیوی بخار کی شدت سے بیہوش پتّو کے اُلجھے ہوئے بالوں

میں ہاتھ کی اُنگلیوں سے نہایت نرمی سے کنگھی کر رہی تھی۔ اُس کا مرجھایا چہرہ اور نمناک آنکھیں قلبی تفکر کی غمازی کر رہی تھیں۔

اُس نے ہیرا کی طرف مخاطب ہو کر کہا۔ "رمیا کی ماں کہتی تھی کہ اِس کو کسی کی نظر لگ گئی ہے۔ رمّال کو بُلا کر جھڑوا لو۔"

ہیرا کی بھویں کھنچ گئیں، ذرا خشک اور سخت لہجہ میں بولا۔ "تم احمقوں کے دماغ میں نظر لگ جانے کا خیال بہت جلدی سما جاتا ہے۔ اُس روز شہر جاتے وقت کتنا سمجھایا گیا تھا کہ پانی برسنے کو ہے۔ بچّے کی دیکھ بھال رکھنا، لیکن کون سُنتا ہے؟ پانی میں خوب بھیگا ہوگا۔ چُن چُن کے اُولے کھائے ہوں گے جس سے سردی لگ گئی، اور بخار ہو گیا۔ بچے کے ساتھ احتیاط تو برتی نہیں جاتی اور جب کچھ ہو جاتا ہے تو کہا جاتا ہے کہ نظر لگ گئی ہے، جھاڑ پھونک والے کو بلاؤ۔"

لچھمی لاجواب ہو گئی۔ کہتی تو کیا کہتی؟ دِل ہی دِل میں اپنی غلطی قبول کر رہی تھی۔ حقیقت میں اُس روز اور بچّوں کے ساتھ پُتّو نے بھی اُولوں کی خوب لوٹ مچائی تھی۔ منع کرنے پر بھی نہ مانا۔ وہ تھوڑی دیر خاموش رہکر بولی۔ "تمہارا کہنا ٹھیک ہی ہے لیکن کسی کا علاج تو ہونا چاہیئے۔ پانچ روز سے دانہ بھی اُڑ کر مُنھ میں نہیں پڑا ہے۔ کمزوری کی وجہ سے آنکھیں تک نہیں کھولی جاتیں ——"

اِتنا کہتے کہتے اُس کا گلا روندھ گیا، اور وہ چپ ہو گئی۔

ہیرا کے کلیجے میں پنکھے لگے تھے۔ مثل مشہور ہے کہ دودھ کا جلا چھاچھ کو پھونک پھونک کے پیتا ہے۔ لیکن بظاہر تسلی دیتے ہوئے بولا۔ "تم تو بیکار گھبراتی ہو، سردی سے بخار آ گیا ہے، جلد اُتر جائے گا، میں آج روپیہ کا انتظام کر کے کل ہی وید کے یہاں جاؤں گا۔ اُن کی دوا سے دو چار دِن میں طبیعت ٹھیک ہو جائے گی۔"

لچھمی نے ساری کے آنچل سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ "تمہاری رائے ہو تو چاچی کے پاس چلی جاؤں؟ اُن کے گاؤں والے ڈاکٹر بہت ہوشیار ہیں۔ روگیوں کو دوا بھی مُفت دیتے ہیں، پار سال مجھے انھیں کی دوا سے آرام ہوا تھا۔"

ہیرا نے رُک رُک کر جواب دیا۔ "تمہارا یہ کہنا تو ٹھیک ہے، لیکن اِتنے بخار میں پُتّو کو کیسے لے جاؤ گی؟ میں بھی تمہارے ساتھ نہ جا سکوں گا۔ ٹھاکر نے بُلایا ہے۔"

لچھمی "تنّو کی ماں اپنی گاڑی میں نہر جا رہی ہیں، میں بھی اُنھیں کے ساتھ چلی جاؤں گی، تم شام تک چھٹی کر کے چلے آنا۔"

ہیرا کچھ جواب دینا چاہتا تھا کہ باہر سے کسی نے پُکارا، وہ آواز سُنکر سہم گیا اور یہ کہتا ہوا اُٹھ کھڑا ہوا۔ "معلوم ہوتا ہے، پھر ٹھاکر کا آدمی آیا ہے۔"

باہر جاکر دیکھنے پر اُس کے قیاس کی تصدیق ہوگئی۔ زمیندار کا درشت مزاج آدمی بھویں سکوڑے کھڑا تھا۔ ہیرا کو دیکھتے ہی انگارے کی طرح لال ہو کر بولا "دو کتنی دفعہ بلانے کو آچکا ہوں مگر تم چلنے کا نام ہی نہیں لیتے، مالک نے حکم دیا ہے کہ جس طرح ہو سکے اپنے ساتھ لے آؤ۔ بولو چلتے ہو یا نہیں؟"

ہیرا۔ "بھیا! میں تو آہی رہا تھا لیکن منّو کی طبیعت ٹھیک نہ ہونے سے ذرا دیر ہوگئی، تھوڑا دم لو مرزئی پہن لوں ابھی چلتا ہوں۔ دیر نہیں ہوگی"۔

وہ اندر جاکر مرزئی پہننے لگا۔ ایک آستین پہن چکا تھا اور دوسری پہن رہا تھا کہ لچھمی نے وہاں آکر کہا "معلوم نہیں تم ٹھاکر کے یہاں سے کب لوٹو؟ بچے کی جو حالت ہے دیکھ ہی رہے ہو، کہو تو میں چلی جاؤں، تم اُن کے گھر سے سیدھے دھین چلے آنا"۔

ہیرا جلدی میں "اچھی بات ہے" کہکر اور لٹھیا اُٹھا کر ٹھاکر کی حویلی کی طرف چل کھڑا ہوا۔

(۳)

گھر سے نکلتے ہی اُسے ایک اور آدمی ٹھاکر کے مکان کی طرف جاتا دکھائی دیا۔ یہ اُس کا پُرانا دشمن گوپی اہیر تھا۔ وہ سر پر مٹی کی بڑی سی ہنڈیا رکھے اور ہاتھ میں بالٹی لٹکائے جا رہا تھا۔ ہیرا سے اور اُس سے عرصہ سے عداوت چلی آرہی تھی۔

اِس عداوت کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ جس زمانے میں ہیرا کا وقت اچھا تھا۔ گوپی اہیر کی مالی حالت خراب تھی۔ ایکدفعہ وہ ہیرا کے سامنے لگان نہ ادا کر سکنے کی بدولت، زمیندار کے آدمی کے ہاتھوں پٹا تھا۔ اُس پر ہیرا کچھ مُسکرا دیا اور کوئی چبھتا ہوا فقرہ بھی کس دیا۔ اُسی دن سے گوپی اور ہیرا میں دلی رنجش ہوگئی۔ اور گوپی اُسکا جانی دشمن بن گیا۔ یہانتک کہ ایک مرتبہ اُس نے آدھی رات کیوقت ہیرا کی لہلہاتی ہوئی پکی فصل میں آگ لگادی لیکن ہیرا نے فوراً ہی دیکھ لیا۔ اِس سے اُس کا زیادہ نقصان نہیں ہونے پایا۔ اُس کے بعد ایکدفعہ گوپی نے اپنے سارے جانور ہیرا کا کھیت چرنے کو چھوڑ دئے لیکن ہیرا اپنی ابتر حالت دیکھکر ان باتوں کو شربت کے گھونٹ کیطرح پی کر خاموش ہو جاتا تھا

اِن دنوں تو گوپی کی کایا ہی پلٹ گئی تھی۔ زمیندار نے اُسے کافی سے زیادہ مُنھ لگا رکھا تھا اور کئی دفعہ وہ ٹھاکر کے یہاں ہیرا کو زک بھی دے چکا تھا۔ آج اُسی پُرانے دشمن کو نذرانہ لے جاتے اور اپنے آپ کو خالی ہاتھ جاتے دیکھکر ہیرا کے کلیجے پر سانپ لوٹ گیا۔

ٹھاکر جسونت سنگھ گھنی نیم کے سایہ میں اپنے چبوترہ پر بیٹھے حقہ گڑگڑا رہے تھے۔ پاس ہی دو چار آسامی ہاتھ باندھے کھڑے تھے۔ نو وارد مہمان بھی برابر کرسیوں پر فروکش تھے۔

گوپی نے سامنے پہنچتے ہی ہنڈیا اور بالٹی ٹھاکر کے پاؤں کے پاس رکھدی اور مودبانہ انداز سے بولا۔ "گھر میں جو کچھ موجود تھا سب لے آیا ہوں مالک! آپ کا آدمی ذرا دیر سے پہنچا، نہیں تو آج کا دودھ شہر نہ بھیجتا۔

ٹھاکر اپنے آدمی کو دونوں چیزیں اندر بھیجنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "کچھ حرج نہیں ہے"! اس کے بعد اُنکی نگاہ ہیرا سے دوچار ہوئی، معلوم ہوا کسی نے سوتے سے جگا دیا۔ یا تو آرام کرسی پر دراز تھے یا سنبھلکر اُٹھ بیٹھے اور کہنے لگے۔ "کیوں بے ہیرا! کتنی دفعہ آدمی جا چکا ہے، دودھ دینا الگ رہا، ایک بار آنا بھی مشکل ہے۔ ایسا مزاج آسمان پر چڑھ گیا ہے"!

ہیرا نے ہاتھ جوڑکر اپنی مصیبت کی داستان کہہ سنائی۔ اُس کی دُکھ بھری کہانی کی کوئی سنوائی نہ ہوئی۔ اور ٹھاکر نے تنک کر کہا "تم لوگ ایسے حیلے بہانے کہاں سے سیکھ لیتے ہو؟ ہم تم سے کوئی خیرات نہیں مانگتے۔ خیال تھا کہ جب دام ہی دینا ہیں تو اپنے ہی آدمی کو کیوں نہ دیئے جائیں؟ لیکن تم لوگ یہ سمجھتے ہو کہ ہم کو لوٹا جا رہا ہے"۔

ہیرا کو اُن کے اِس جھوٹ پر بڑا تعجب ہوا مگر وہ سمجھ گیا کہ مہمانوں کی موجودگی نے ٹھاکر کو اس دروغ بافی پر مجبور کیا ہے۔ وہ سر جھکائے چپ چاپ کھڑا رہا۔ کچھ دیر بعد ٹھاکر اپنے مہمانوں کے ساتھ اُٹھ کھڑے ہوئے۔ چلتے وقت ہیرا سے کہتے گئے "سُنتا ہے بے؟ ہم کھانا کھانے جا رہے ہیں، جب تک واپس نہ آئیں یہیں بیٹھے رہنا! پرسوں مُنّو بھیا کی سالگرہ ہے، تھوڑا سا کام تجھے بھی کرنا ہوگا، وہ کام ابھی آکر سمجھا دوں گا"۔

"لیکن سرکار"! ہیرا نے عذرخواہی کیواسطے مُنہ کھولا ہی تھا کہ ٹھاکر مہمانوں کو لئے ہوئے گھر کے اندر چلے گئے۔

(۴)

جیٹھ کی چلچلاتی دوپہر آگ کے شعلے برسا رہی تھی۔ ٹھاکر کی حویلی کے سامنے والی زمین کو ہیرا پھاوڑے سے کھود رہا تھا۔ اسکی حالت قابلِ رحم تھی بدن سے پسینے کے تڑاڑے بہ رہے تھے۔ آنکھوں سے آنسوؤں کی گنگا رواں تھی آج اُس کی بیوی کو میکے گئے دوسرا دن تھا۔ رہ رہ کر بائیں آنکھ پھڑک رہی تھی۔ مُنّو کی علالت کی فکر نے اُسے بےچین کر رکھا تھا۔ ٹھاکر کے سامنے اُس نے کتنی عاجزی کی، کتنا رویا گڑگڑایا! لیکن ٹھاکر نے اُس کی باتوں کو کام نہ کرنے کا بہانہ سمجھا۔ اُن کے بچے کی تیسری سالگرہ تھی۔ یہ تقریب دھوم دھام اور شوکت و احتشام سے منانے کا ارادہ تھا اسی لئے ہیرا بھی بیگار میں پکڑا گیا تھا۔

اِس وقت اور سب مزدور دوپہر کی چھٹی میں گئے تھے۔ بعض کنویں کی جگت، یا گھنیری چھاؤں میں آرام کر رہے تھے۔ لیکن ہیرا پورے انہماک کے ساتھ کام میں جٹا ہوا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ جسقدر جلد ہو سکے کام پورا ہو جائے لیکن زمین بہت ناہموار اور سخت تھی تاہم وہ مُنّو کے پاس جلد پہنچنے کی دُھن میں اُسے ہموار کر لایا تھا۔

بھوکا پیاسا ہیرا کسی قسم کے آرام کے بغیر اپنے کام میں مشغول تھا۔ شاید یہ فطری محبت و پدری شفقت کا کرشمہ تھا۔

"ہیرا بھیا!" دور سے اُس کو کسی نے آواز دی، اُس نے چونک کر سر اُٹھایا تو پاؤں کے نیچے سے زمین نکل گئی! اُس کی سسرال کا ایک آدمی سامنے سے آتا ہوا دِکھائی دیا۔

اُس نے وہیں سے چلاکر پوچھا "کہو کنھیا دادا! بچہ تو اچھا ہے؟"

کنھیا نے قریب آکر سنجیدہ لہجہ میں جواب دیا۔ "بھیا! جتنا جلد ہو سکے چلے چلو، بٹیا بہت گھبرا رہی ہیں۔ بچہ کی حالت اِس سے آگے کچھ نہ کہہ سکا، آواز گلوگیر ہوگئی، اور وہ چپ ہوگیا۔ لیکن جتنا اُس نے کہا تھا۔ ہیرا کیواسطے وہی کافی سے زیادہ تھا۔ اُس سے کام پر ٹھہرا نہ گیا۔ بھاگتا ہوا ٹھاکر کے بیٹھکے میں پہنچا۔

"مالک!" اُس نے رو رو کے کہا "بچے کی حالت اچھی نہیں ہے، کنھیا بُلانے آیا ہے۔ اب تو چھٹی مل جانا چاہیئے!"

مگر واہ رے دِل کی سختی! سوال کیا گیا۔ "کام ختم ہوا یا نہیں؟"

ہیرا نے لجاجت سے عرض کی: "تھوڑا سا کام رہ گیا ہے سرکار! وہ کوئی اور کرے گا"

"نہیں، نہیں، کام ختم ہونے ہی پر چھٹی ملے گی۔ تم لوگ بہت جلد گھبرا جاتے ہو۔ جاؤ اپنا کام ختم کرو۔ اس کے پہلے چھٹی نہیں مل سکتی"

ٹھاکر نے مُنھ سے دھوئیں کے لچھے اُڑاتے ہوئے اپنا قطعی فیصلہ سُنا دیا۔

ہیرا کے کلیجے میں آگ لگی ہوئی تھی۔ اُس نے بیٹھکے سے باہر نکل کے دیکھا کہ کنھیا اُمید وبیم کی حالت میں کھڑا جواب کا انتظار کر رہا ہے۔

وہ فکر وتشویش میں مبتلا تھا اور اُس کی حالت دیوانوں کی سی ہو رہی تھی۔ آن کی آن سوچکر اُس نے درخت کی ٹہنی میں لٹکی ہوئی مرزئی اُتار کر پہننا شروع کی۔

"کیا ٹھاکر نے چھٹی دیدی بھیا؟" کنھیا نے دریافت کیا۔

"نہیں چھٹی تو نہیں ملی لیکن میں اب یہاں نہیں رکوں گا کنھیا دادا! اور کیا ہوگا؟ زیادہ سے زیادہ جان لے لیں گے"

ہیرا نے جواب دیا اور اپنی لٹھیا اُٹھا کر جتنا تیز چلنا ممکن تھا سسرال کی طرف چل کھڑا ہوا۔ اگر اُس کے بازوں میں پَر ہوتے تو اُڑ کر بچے کے پاس پہنچنے کی کوشش کرتا۔ اُسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اُسکا ایک ایک پاؤں من من بھر کا ہو رہا ہے۔

(۵)

چار دن گذر گئے، شام ہو رہی تھی، دن بھر کے تھکے ماندے طیور شور مچاتے، اپنے بچوں کے پاس جا رہے تھے ہیرا اپنی بیوی کو ساتھ لئے گاؤں جانے والی سُنسان سڑک پر چلا جا رہا تھا۔ لیکن اُس کے ساتھ بچہ نہیں تھا۔

کیونکہ وہ عالم بالا میں منتقل ہو جانیوالے بھائی بہنوں کے پاس پہنچ چکا تھا - ماں باپ کو اسی طرح تڑپا تڑپا کر جیسے اُس سے پہلے چاروں بھائی بہن گئے تھے -

دونوں میاں بیوی صبر و سکوں سے راستہ طے کر رہے تھے۔ اُنکی صورتیں کملائی ہوئی تھیں آنکھوں میں آنسو تو نہیں تھے مگر پپوٹے سوجے ہوتے تھے - راستہ تاریک ہو چلا تھا - اُسیطرح جیسے اُن کی زندگی کی شاہراہ دھندلی ہو گئی تھی - اب اُن کا گاؤں کم و بیش ایک فرلانگ رہ گیا تھا - دفعتہً دونوں نے دیکھا کہ گاؤں طرف سے آگ کے شعلے بلند ہو رہے ہیں -

ہیرا کچھ چونک سا پڑا، دونوں نے تیزی سے قدم بڑھانا شروع کیے "آگ لگ گئی! ٹھاکر کی حویلی میں آگ لگ گئی!!" کی عبرتناک آوازوں نے دونوں کو اور بھی بدحواس بنا دیا -

لچھمی نے طنزیہ لہجہ میں کہا "کیا بھگوان اب الٹی گنگا بہانے لگے ہیں؟ شاید غریبوں کے ساتھ ساتھ بے قصور امیروں کو بھی ستانے کی ٹھانی ہے "

ہیرا نے اُس کے جملے کا کوئی جواب نہ دیا - سامنے سے ایک اجنبی کو آتے دیکھکر پوچھا "کیا ہوا بھیا؟" -

اجنبی نے جواب دیا "ارے بھائی! کچھ نہ پوچھو کرنی کا پھل مل رہا ہے - زمیندار کے مکان میں آگ لگ گئی ہے - سب لوگ تو صحیح سلامت باہر نکل آئے ہیں لیکن ٹھاکر کا بچہ اندر ہی رہ گیا ہے ٹھکرائن باہر پتھروں سے سر ٹکرا رہی ہیں لیکن ٹھاکر کی ٹھکرائی اب بھی نہیں جاتی - نوکروں کو ڈانٹ ڈپٹ رہے ہیں اور انعام بول رہے ہیں - مطلب یہ ہے کہ کوئی لالچ میں جاکر، بچہ کو باہر نکال لائے - مگر بھیا! کسکو اپنی جان بھاری ہے - اس گاؤں میں کوئی گوپی اہیر رہتا ہے، وہ زمیندار سے کہہ رہا تھا - کہ "یہ آگ کسی ہیرے نے لگائی ہے" آگ لگانے والے کا نام بھی بتا رہا تھا - اور کہتا تھا کہ اُس کا لڑکا مر گیا ہے، آپ نے اُسے گھر جانے سے روکا تھا اسی عداوت سے اُس نے آگ لگا دی" بھیا! ایسی بھیانک آگ لگی ہے کہ دیکھا نہیں جاتا"

اجنبی نہ جانے اور کیا کیا بیان کرنے کو تھا - لیکن ہیرا نے اُس کی کسی بات پر دھیان نہیں دیا - بلکہ تیزی سے آگے کی طرف بڑھا - اجنبی نے اپنی راہ لی - لچھمی نے دوڑ کر میاں کا ہاتھ پکڑا اور ذرا تیز ہو کر بولی "کہاں جاتے ہو؟"

"میرا ہاتھ چھوڑ دو، ارے سُنتی نہیں! ٹھکرائن کیسا بلک بلک کر رو رہی ہے؟ مجھے چھوڑ دو ان کے بچے کو آگ سے نکال لاؤں" ہیرا نے سخت اضطراب کے لہجے میں کہا -

لچھمی مضبوطی سے ہاتھ پکڑتے ہوئے بولی "کیا دیوانے ہو گئے ہو؟ سُنا نہیں؟ سارے گاؤں میں مشہور ہو گیا ہے کہ تمہیں نے آگ لگائی ہے! اب تمہیں اُن کے بچے کو نکالنے جاؤ گے - بھوگنے دو کرنی پھل -

اسی کی بدولت تم مُنّو کی زندگی میں اُسے دیکھنے نہیں پائے ——"

یہ کہتے کہتے لچھمی کے رنج وغم کا چشمہ اُس آنکھوں سے پھوٹ نکلا۔

ہیرا کچھ ٹھٹھک کر رہ گیا۔ سوچا —"ٹھیک تو کہتی ہے"۔ اتنے میں اُس نے سُنا۔ ٹھکرائن چیخ چیخ کر بین کر رہی تھیں "میرا ننھا پیارا لال"! ایسا معلوم ہوا جیسے کسی نے اُس کے سینے پر گھونسہ مار دیا۔ بالکل اسی طرح لچھمی نے بھی بین کیئے تھے اسی طرح وہ بھی رو ئی تھی۔ اُس نے ایک جھٹکا دے کر اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔ ٹھکرائن کی دردناک فریادیں اُسے دیوانہ بنا رہی تھیں۔

لچھمی نے جب اسے بھڑکتے ہوئے لال لال شعلوں میں گھستے دیکھا تو بے اختیاری کے عالم میں چیخ اُٹھی۔

——(۶)——

سارے گاؤں والوں نے تعجب کی نگاہوں سے دیکھا کہ ہیرا! —— وہی ہیرا! جس پر آگ لگانے کا الزام لگایا جا رہا تھا کمال سوختگی حالت میں لڑکھڑاتا ہوا، بیہوش کیلاش سنگھ کو سینے سے لگائے آگ کے شعلوں سے نکل رہا ہے گویا خجالت کے مارے پانی پانی ہو گیا۔ مُنھ چھپانے کو جگہ تلاش کرنے لگا۔ ٹھاکر بھی اپنا گذشتہ برتاؤ یاد کر کے کانپ اُٹھے، گنہگاروں کی طرح سر جھکا لیا۔ ہیرا ٹھاکر کے پاس پہنچکر بولا "مالک! لیجئے، بچہ کو آنچ نہیں لگنے پائی۔"

ٹھکرائن، ماما کے جوش میں لپکی اور بچے کو ہیرا کی گود سے لیکر کلیجے سے چمٹا لیا۔ بے انتہا خوشی اور ماما کے جوش نے آواز گلوگیر دی، وہ روہانسی آواز میں بولی "ہیرا! تم آدمی نہیں دیوتا ہو"!

ٹھاکر نے بھی گردن اُٹھائی اور آنکھ میں آنسو بھر کے بچے کو گلے لگا لیا۔ اُنھوں نے دیکھا کہ ہیرا کا سارا جسم جل جھنکر آبلہ سا ہو رہا ہے۔ وہ انتہائے شکر گذاری میں بولے "ہیرا! تم نے میری آنکھیں کھول دیں، تمہارا یہ احسان کبھی نہ بھولونگا، تم اِس خدمت کے صلے میں مجھ سے جو چاہے مانگ لو"۔ اُن کے اِس قول پر ہیرا خدا رسیدوں کی سی بے نیازانہ ہنسی ہنسا —— وہی ہنسی! جو دُنیا کو چھوڑ دینے والے دُنیا سازوں کی باتوں پر ہنسا کرتے ہیں۔ پھر ایک گہری سانس لیکر جواب دیا "یہ سب کچھ آپ ہی کا دیا ہوا ہے سرکار! پھر سنجیدگی و متانت سے کہا۔ "ہم غریبوں کے پہلو میں بھی دل ہوتا ہے مالک اور اُس دل میں دکھ سکھ قبول کرنیکی صلاحیت بھی ہوتی ہے۔ بالکل اُسی طرح جیسے امیروں کے دل میں شادی و غم قبول کرنے کی طاقت ہوتی ہے۔ بس اتنی ہی عرض ہے کہ ہم لوگوں کے ساتھ رعایت کا برتاؤ کیا کیجئے۔

جواب کا انتظار کیئے بغیر پاس کھڑی ہوئی سسک کر روتی لچھمی سے کہا۔ "چل ری! گھر چل"!

ہیرا کچھ لنگڑاتا ہوا آگے آگے اور لچھمی سر جھکائے پیچھے پیچھے چلی جا رہی تھی۔ صرف ٹھاکر ہی کو نہیں بلکہ سارے گاؤں والوں کو ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ جیسے کوئی دیوی دیوتا کبھی نہ بھولنے والی خیرات دیکر اپنے لوک کو واپس جا رہے ہیں۔

——

مشاھدات

(از حضرت الطاف مشہدی)

اونگھتا ہے جب شہِ خاور شفق کی گود میں — سینۂ دریا پہ یوں ہوتا ہے گلشن کا گماں
جیسے آئینے پہ کرتا ہے عروسِ نو کا عکس — صبحدم گلرنگ جلووں سے حسیں گلکاریاں

(۲)

سایہ افگن ہے فضا پر آج دیوالی کی شب — جگمگاتے ہیں در و دیوار پر زرّیں چراغ
رات کے پچھلے پہر جیسے وطن کی یاد سے — مسکراتے ہیں کسی مہجور کے سینے کے داغ

(۳)

گا رہی ہے ایک ٹیلے پر کوئی آتش نوا — پڑ رہی ہیں نرمیوں سے یوں ہوا میں سلوٹیں
بسترِ ناکامِ اُلفت کو وفورِ درد سے — جس طرح کر دیں شکن آلود شب کو کروٹیں

(۴)

جا رہا ہوں سوئے میخانہ گھٹائیں دیکھ کر — آ رہی ہے کان میں ساغر کھنکنے کی صدا
صبحدم لارنس[1] میں جیسے نظر کو بھانپ کر — دعوتِ نظارہ دیتی ہے حسینوں کی ادا

[1] لارنس گارڈن

راحتِ عارضی

(از پرنسپل رام پرشاد کھوسلہ ناشاد ایم-اے)

آ کے دُنیا میں عدم سے کیسے مستانے ہوئے — بادۂ ہستی کا پینا تھا کہ دیوانے ہوئے
اک نشستِ محفلِ راحت میں اٹے کتنے خُم — اک شبِ عشرت میں خالی کتنے پیمانے ہوئے
محفلِ عیش و طرب سے کتنے نکلے ہوشیار — اور ہوئے بدمست کتنے، کتنے دیوانے ہوئے
حُسنِ دُنیا کی جھلک سے ہو گئے ہم خیرہ چشم — شمعِ ہستی پر فدا ہونے کو پروانے ہوئے
شمعِ محفل کی جہاں میں زندگی ہے ایک رات — خاک جل بھُن کر سحر تک کتنے پروانے ہوئے
نام دُنیا میں کیا کتنوں نے گھر کو پھونک کر — بہرِ شہرت خاک جل کر کتنے کاشانے ہوئے

کیا نہ تھی معلوم دُنیا کی حقیقت آپ کو
حضرتِ ناشاد کیوں اپنے سے بیگانے ہوئے

تنقید کتب

معاہدۂ عمرانی

یہ کتاب نامور فرانسیسی فلسفی موسیٹو[1] روسو کی مشہور سیاسی تصنیف (Le Contract Social) کا اردو ترجمہ ہے۔ جسمیں اُسنے یہ نظریہ پیش کیا تھا کہ آزادی، مساوات اور حکومتِ جمہور انسان کا فطری حق ہے۔ روسو کو اپنے زمانہ کی پبلک کا ترجمان سمجھا جاتا تھا، کیونکہ جو بات لوگوں کے دِلوں میں تھی، اسی کا اظہار روسو کی زبان سے ہوتا تھا۔ چنانچہ روسو نے اس بات کی تلقین کی کہ حکومت کی ساری طاقت کا منبع عوام ہیں اور انہیں کے رضامندی سے اُسے تمام اختیارات حاصل ہوتے ہیں۔ اِس طرح اس فرانسیسی فلسفی نے آنیوالے عظیم الشان انقلابِ فرانس کی بُنیاد ڈالی۔ کیونکہ حقوقِ انسانی کی اسی تخئیل کے بدولت جو روسو نے اپنی قوم میں پیدا کی۔ اہلِ فرانس نے اپنے ملک کے نظامِ ملوکیت و جاگیرداری کا قلع قمع کیا۔

قاعدہ کی بات ہے کہ جس ماحول میں اِنسان کی پرورش ہوتی ہے، اُس کا اِس اِنسان کے مزاج اور ذہنیت پر بہت کافی اثر پڑتا ہے۔ ابھی روسو کی عمر دس برس کی تھی کہ کسی تنازعہ کی وجہ سے اُس کے باپ کو جنیوا سے ہجرت کرنا پڑا۔ اور روسو کو مجبوراً ایک رشتہ دار کے ٹکڑوں پر زندگی بسر کرنا پڑی۔ یہ شخص پادری تھا، چونکہ روسو کی اُفتادِ طبیعت بچپن سے آزادی پسند، آزاد خیال اور سیاحانہ واقع ہوئی تھی۔ اس لئے ذرا ذرا سی بات پر پادری صاحب جو سزا دیتے تھے، اُس کا اثر اس کے حساس دِل پر یہ پڑا کہ اُسکا مزاج بہت چڑچڑا ہو گیا۔ اور عہدہ دار، ذی حیثیت اور زبردست لوگوں کے خلاف اُس کے دِل میں سخت نفرت اور حقارت پیدا ہو گئی گیارہ برس کی عمر میں روسو نے ایک وکیل کے دفتر میں کام کرنا شروع کیا۔ مگر وکیل نے اُسے کند ذہن اور ناکارہ سمجھکر نکال دیا۔ اسی طرح اس سے ایک نقاش نے بدسلوکی کی۔ اِس طرح جنیوا سے بھاگ کر وہ سیوائے پہونچا، اور ایک متمول خاتون کے زیرِ سایہ رہنے لگا۔ مگر یہاں بھی وہ زیادہ دِن نہ ٹھہرا اور تیورین چلا گیا۔ جہاں اُس کے دِن بڑی مصیبت میں گذرے۔ حتیٰ کہ وہ چوری کرنے پر بھی مجبور ہوا۔

اس طرح روسو جمکر کسی ایک جگہ بھی نہ رہ سکا۔ اور وہ اِدھر اُدھر لڑھکتا رہا۔ بالآخر اُس کی ملاقات ڈاکٹر مسانن

---

[1] M. Jean Jacques Rousseau

سے ہوگئی۔ جو ایک جید عالم اور فلسفہ دیکارٹ کا معتقد تھا۔ اسی ڈاکٹر کی توجہات سے روسو نے فلسفہ اور علوم فطریہ کا مطالعہ شروع کیا اور مشہور فرانسیسی ادیب، مورخ اور فلسفی والٹیر کی تصانیف کا بھی مطالعہ کیا۔ انگریز فلسفی لاک اور نیوٹن کی تصانیف بھی پڑھیں۔

کچھ دنوں بعد روسو کو پیرس جانے کا اتفاق ہوا جہاں ادبی حلقوں کے مشہور مشہور لوگوں سے اسکی شناسائی ہوگئی اور انھیں احباب کی کوششوں سے وہ فرانسیسی سفیر متعینہ وینس کے ہاں سکریٹری مقرر ہوگیا۔ وینس میں مشہور اور قدیم جمہوریت تھی۔ یہاں رہ کر روسو کی ذہنیت اور خیالات میں انقلاب عظیم ہوگیا۔ تاریخ اور قانون دستوری سے اُسے زبردست دلچسپی پیدا ہوگئی، اور یہیں اُسے "دستور" پر کتاب لکھنے کا خیال پیدا ہوا۔

روسو نے سیاسیات پر کئی کتابیں لکھیں۔ مگر "معاہدۂ عمرانی" فلسفۂ سیاسیات پر اس کی آخری کتاب ہے، اس فلسفہ کی بُنیاد اِس نظریہ پر ہے کہ فطری اِنسان اور تمدنی انسان دو مختلف مخلوق ہیں۔ فطری انسان ہر طرح آزاد ہوتا ہے لیکن تمدنی اِنسان قیود کا پابند ہوتا ہے۔ اور جوں جوں تمدن میں ترقی ہوتی جاتی ہے، یہ قیود رسم و رواج یا قانون کی صورت اختیار کرلیتے ہیں۔ روسو کی رائے میں سب سے بڑا تمدنی مسئلہ یہ ہے کہ اجتماعِ انسانی کی کوئی ایسی شکل تلاش کی جائے جسمیں قوتِ اجتماعی کے ذریعہ ہر شریک کی جان و مال کی حفاظت ہوسکے اور ہر شخص "کل" میں شریک رہتے ہوئے بھی صرف اپنی تابعداری کرے اور اسکی وہ آزادی بدستور قائم رہے جو اسے پہلے حاصل تھی۔ اس کی رائے کے موجب اِس مسئلہ کا حل صرف "معاہدۂ عمرانی" ہے۔

اِس "معاہدۂ عمرانی" کا بُنیادی اصول یہ ہے کہ حاکم و محکوم ایک ہیں۔ یعنی عوام کی حکومت قائم ہو۔ سب لوگ اپنے اوپر برابر فرائض عائد کریں اور ہر فرد جماعت سے صرف اِس چیز کا مطالبہ کرے جو وہ خود دینے کو تیار ہو۔ اِس صورت میں ہر فرد بشر اپنے عمل میں مجموعی فلاح و بہبود کو مدنظر رکھے گا۔ اور اسی اصول میں مساوات شخصی اور مساوات قانونی کا بھی راز پنہاں ہے۔ غرض معاہدۂ عمرانی تمام شہریوں کے فرائض و حقوق یکساں مقرر کرتا ہے۔

اِس کتاب میں اسی معاہدہ کی تفصیلات پر بحث کی گئی ہے۔ اور ابتدائی سوسائٹی سے لیکر حد درجہ ترقی یافتہ ریاست تک پہونچنے میں جو مدارج طے کرنا پڑتے ہیں۔ ان سب پر اس کتاب میں سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ آجکل ہندوستان میں سیاسیات کا بہت زور شور ہے۔ اِس لئے اِس کتاب کا مطالعہ کرنا ہر شخص کے لئے مناسب و ضروری ہے۔ بلکہ یہ کتاب دراصل پرائیویٹ اور پبلک کتبخانوں میں رکھے جانے کے قابل ہے۔ فاضل مترجم نے جگہ جگہ مُفید حاشیے بھی درج کئے ہیں۔

کتاب کے آخر میں ایک فہرست اصطلاحات بھی مع ترجمہ درج کی گئی ہے۔ ترجمہ میں عربی زبان سے زیادہ مدد لی گئی ہے۔ اور بعض اصطلاحات کے ترجمہ سے ہمیں اتفاق نہیں ہے۔ مثلاً (Censor ; Censorship) کا

ترجمہ نظارت و ناظر کیا گیا ہے حالانکہ اُسکا ترجمہ محتسب یا احتساب عام طور پر رائج ہے۔

"Circulation of Money" کا ترجمہ "گردش زر" اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ گردش کے بجائے "چلن" اچھا ہوگا۔

"Commission" کا ترجمہ "ماموریہ" فضول ہے، کیونکہ پبلک کمیشن ہی لکھتی اور بولتی ہے۔

"Political Right" کا ترجمہ "قانون سیاسی" نہیں بلکہ "سیاسی حق" ہونا چاہئے۔

"Prince" کا ترجمہ ہندوستان میں "سلطان" کوئی نہیں کرتا۔ اِس لفظ کا عام ترجمہ شہزادہ، راجکمار یا والی ریاست ہیں، جیسا موقعہ ہو۔

بہرحال کتاب نہایت اچھی ہے۔ لکھائی، چھپائی، کاغذ سب عمدہ، حجم چھوٹی تقطیع کے ۲۰۰ صفحات۔ انگریزی وضع کی خوبصورت جلد۔ قیمت دو روپیہ ؏ مار ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی۔

مقالات حالی حصہ دوم | یہ کتاب خواجہ الطاف حسین حالی مرحوم کے بارہ لکچروں اور تقریروں کا مجموعہ ہے۔ جسمیں خواجہ صاحب کی ستائیس ۲۷ تقریظیں بھی شامل کردی گئی ہیں جو اُنھوں نے مختلف کتابوں پر لکھی تھیں۔ خواجہ حالی کی تحریر اور تقریر دونوں میں زبان کی سلاست اور الفاظ کی روانی قابل داد ہے۔ اور اُن کی کوئی تحریر یا تقریر ایسی نہیں جو پُرمعنی و سبق آموز نہ ہو۔ خواجہ صاحب کی تقریریں تو ہزاروں آدمیوں نے سُنی اور پڑھی ہوں گی۔ لیکن اُن کی تقریظیں بہت کم حضرات نے دیکھی ہوں گی۔ تقریظ اور تنقید میں بہت بڑا فرق ہے۔ تنقید میں تصنیف کے محاسن و معائب دونوں باتوں پر نظر ڈالی جاتی ہے لیکن تقریظ میں صرف محاسن کتاب ہوتے ہیں۔ تقریظیں زیادہ تر مقفّیٰ و مسجّع ہوتی ہیں۔ اور تنقیدیں محض سادہ۔ لیکن خواجہ صاحب کی تقریظوں میں یہ خوبی ہے کہ اُن کی زبان سادہ ہونے کیساتھ بھی فاضلانہ و عالمانہ ہے۔ اور قافیہ بندی کے دُھن میں معانی کو قربان نہیں کیا گیا۔ اور کتاب کے معائب سے بھی چشم پوشی نہیں کی گئی۔ مثلاً کتاب "معلم الشطرنج" کی تقریظ میں لکھتے ہیں :۔

"اس کتاب میں ایک بات کی کسر معلوم ہوتی ہے۔ یعنی جبکہ اسمیں بہت سے یوروپین شاطروں کے کمالِ شطرنج بازی کا ذکر جا بجا کیا گیا ہے۔ تو مقتضائے مقام یہ تھا کہ ہندوستان کے نہایت نامور اور باکمال شاطروں کا بھی کسی قدر تذکرہ کیا جاتا۔ خصوصاً انیسویں صدی کے مشہور شاطر مثل کرامت علی خان، مرزا رحیم الدین حیا و امام علی خان وغیرہم اس بات کے مستحق ضرور تھے کہ جو کتاب ہندوستان کی زبان میں ایک ہندوستان ہی کے ایجاد کئے ہوئے کھیل پر لکھی جائے اُسمیں اُن کی خاص خاص بازیوں اور نقشوں کا ذکر کیا جائے۔"

فرہنگ آصفیہ، معلم الشطرنج، تصانیف نواب عزیز یار جنگ بہادر اور دیوان دلگیر میرٹھی پر جو تقریظیں لکھی گئی ہیں

وہ خاص طور پر پڑھنے کے قابل ہیں۔

لکھائی چھپائی، کاغذ سب نفیس۔ ضخامت ۲۰×۲۶ سوا سو صفحات۔ قیمت مجلد دو روپیہ ۲؍ ۔ غیر مجلد ڈیڑھ روپیہ ۱۸؍۔ ملنے کا پتہ :- انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد۔ دکن۔

گلِ صد برگ یہ کانپور کے نوجوان شاعر نواب ساجد حسین خان عیاں حیدری کے سو منتخب اشعار کا دلفریب مجموعہ ہے۔ شروع میں مولانا شارق ایلیانی کا لکھا ہوا ایک مختصر سا مقدمہ، اُس کے بعد مسٹر بھگوتی سہائے ہنکاری ایڈوکیٹ کی لکھی ہوئی ایک تقریظ اور اُس کے بعد جناب جگر صاحب مراد آبادی کے تحریر کردہ "اشارات" ہیں۔ جنہیں عیاں صاحب کی شخصیت سے تعارف کرایا گیا ہے اور اُن کی شاعری پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

عیاں صاحب کے کلام میں بلاغت کے ساتھ ساتھ شگفتگی بھی پائی جاتی ہے۔ چند اشعار نمونتاً ملاحظہ ہوں

یہ کون جلوہ نما تھا، خبر نہیں لیکن — سرور سجدہ میں ابتک ہے گم جبینِ نیاز

کرلیتے ہم بھی نکہتِ گل کو سلامِ شوق — لیکن قفس سے ہو کے نہ بادِ صبا گئی

عاشقِ غم نصیب کو، جلوۂ گل سے کیا غرض — تم جو نہ ہو نظر نواز صبحِ بہار آئے کیوں؟

حسن کا طرزِ دلبری، عشق کی زندگی سہی — موت جسے حیات ہو، وہ ترے ناز اُٹھائے کیوں

مستِ مئے خیال کو صدمۂ ہجرِ یار کیا — جسکی خزاں ہو خود بہار، اس کے لئے بہار کیا

جلوۂ یار ہر طرف مست کُن نگاہ ہے — گلشنِ روزگار میں پھول کہاں کے، خار کیا

جلوۂ روئے یار ہے، قید نظارہ سے بری — دیدۂ انتظار خو، حاصلِ انتظار کیا

ہجومِ شوق میں اکثر یہ منظر باز ہوتا ہے — مرے انداز سے پیدا ترا انداز ہوتا ہے

ہماری شوخیٔ ذوقِ جنوں کی داد تو دینا — پلٹ آتے ہیں منزل کا جہاں آغاز ہوتا ہے

پہونچتا کون ہے اُس بارگاہِ خاص تک لیکن — وہ اک نالہ جو ہمرنگِ شکستِ ساز ہوتا ہے

اُمید ہے کہ عیاں صاحب مضامین کی پیچیدگیوں میں پڑکر زبان کی سلاست کو قربان نہ ہونے دیں گے

لکھائی چھپائی معمولی، کاغذ عمدہ۔ جیبی تقطیع کے ۴۸ صفحات حجم۔ قیمت درج نہیں ہے۔ ملنے کا پتہ:- نمبر ۱۵/۱۹ پٹکاپور کانپور

ذوق کے سو شعر خاقانیٔ ہند شیخ ابراہیم ذوق کا دیوان پنجاب یونیورسٹی کے ایف۔ اے کورس میں شامل ہے۔ محمد عبداللہ صاحب کامل ایم۔ اے نے دیوانِ ذوق سے سو اشعار منتخب کرکے شائع کئے ہیں۔ اور شروع میں ایک چھوٹا سا مقدمہ بھی درج کردیا ہے۔ جسمیں ذوق کے سوانح حیات اور اُن کے کلام کی خصوصیات پر روشنی ڈالی ہے۔ یہ مقدمہ طلباء کے لئے مفید ہے۔ یہ مجموعہ

جیبی تقطیع کے دو جزو پر شائع ہوا کیا ہے اور مرتب صاحب سے گورنمنٹ کالج لائل پور کے پتہ سے مل سکتا ہے۔

گلدستہ اکبر ذوق کی طرح کامل صاحب نے خان بہادر سید اکبر حسین اکبر الہ آبادی کے کلام کا ایک مختصر انتخاب بھی شائع کیا ہے۔ شروع میں مولانا محمد حمیدالدین صاحب ایم۔ اے کا لکھا ہوا ایک مفصل مقدمہ ہے۔ جسمیں اکبر کی سوانحمری اور اُن کے کلام پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ یہی مقدمہ اِس رسالہ کی جان اور قابل داد ہے۔ اکبر کا کلام داد و تحسین سے مستغنی ہے اِس لئے اس کے متعلق کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ لکھائی، چھپائی، کاغذ اچھا۔ حجم جیبی تقطیع کے ۵۰ صفحے۔ مرتب صاحب سے طلب کیا جائے۔

آہ کے سو شعر یہ سید محمد صفدر صاحب آہ سیتاپوری کے ۱۰۰ منتخب شعروں کا مجموعہ پنڈت برج بہادر ایم۔ اے نے ایک بلیغ مقدمہ کے ساتھ مرتب کیا ہے۔ شروع میں مولانا صفی لکھنوی، پروفیسر اشفاق حسین پرنسپل کالج اجمیر، خان بہادر مرزا جعفر علی خان اثر لکھنوی، پروفیسر سید مسعود حسن صاحب رضوی ایم۔ اے لکھنؤ یونیورسٹی وغیرہ کی تحریروں کے عکس بھی دئے گئے ہیں۔ ان تحریروں میں آہ صاحب کے کلام کی تعریف کی گئی ہے۔ چند اشعار نمونتاً ملاحظہ ہوں:۔

جس کو سجدے کا رہے ہوش وہ دیوانہ نہیں ۔۔۔ بیخودی وصف ضروری ہے، محبت کے لئے

ہے جوہر صد سجدہ، ہر لغزش مستانہ ۔۔۔ کیا پوچھتا ہے زاہد رندوں کی عبادت کو

بیخودی میں کوئی سجدہ جو ادا ہو جائے ۔۔۔ بس وہ کافی ہے گناہوں کی تلافی کے لئے

اِس مجموعے میں آہ صاحب کا فوٹو بھی لگایا گیا ہے۔ مگر اس کی لکھائی، چھپائی وغیرہ میں ترقی کی بہت گنجائش ہے۔ قیمت چار آنہ۔ ملنے کا پتہ:۔ جعفری بکڈپو سیتاپور

اچھے گیت

جب سے ملک میں یہ تحریک پیدا ہوئی ہے کہ ہندوستانی زبان کو عربی، فارسی اور سنسکرت کے ثقیل اور غیر مانوس الفاظ سے پاک کر کے ایک سلیس اور عام فہم زبان کی بنیاد ڈالی جائے۔ جو تمام ہندوستان کی مشترکہ زبان تسلیم کر لی جائے۔ اُس وقت سے اکثر اہلِ قلم اس طرف متوجہ ہو گئے ہیں چونکہ موجودہ نسل جو زبان بولتی ہے۔ اس کا صاف ہونا کسیقدر دشوار ہے۔ اسلئے یہ کوشش کی جا رہی ہے کہ آئندہ آنے والی نسلوں یعنی بچوں کے لئے ابھی سے عام فہم ہندوستانی میں سہل کتابیں تصنیف کی جائیں۔ اسی سلسلہ کی ایک کوشش مندرجہ عنوان کتاب بھی ہے جس میں میاں عبدالمجید بھٹی صاحب ایڈیٹر رسالہ "ہونہار" لاہور نے بچوں کے لئے مختلف قسم کے انیس گیت تصنیف کر کے ایک مختصر مجموعہ کی صورت میں شائع کر دیا ہے۔ لیکن جو فاضل مصنف کا مقصد

ہے وہ ہمارے خیال میں پورا نہیں ہوا۔ کیونکہ گیتوں کی زبان میں اگرچہ عربی و فارسی کے الفاظ کم ہیں مگر ہندی کے الفاظ زیادہ حاوی ہیں۔ بہرحال گیت دلچسپ ہیں۔

لکھائی چھپائی کاغذ سب اچھا چھوٹا سائز ضخامت ۵۹ صفحات قیمت ۴ر ملنے کا پتہ:۔ ہونہار بکڈپو ریلوے روڈ لاہور۔

تب تم اچھی بچی ہو

اس ڈیڑھ جز کے رسالہ کے مصنف بھی میاں عبدالمجید بھٹی صاحب ایڈیٹر "ہونہار" لاہور ہیں۔ یہ ایک مسلسل اور اخلاق آموز نظم ہے۔ جو ننھی بچیوں کے لئے لکھی گئی ہے۔ جس میں کورس یا ترجیع "تب تم اچھی بچی ہو" رکھا گیا ہے۔

قیمت دو آنہ۔ ملنے کا پتہ:۔ ہونہار بکڈپو ریلوے روڈ لاہور۔

ملاپ کرشن نمبر ۱۹۳۷ء

پنجاب کے اُردو اخباروں میں معزز ہمعصر روزنامہ "ملاپ لاہور" کو خاص درجہ مقبولیت حاصل ہے۔ اس کے اولوالعزم کارکن ہر ہفتہ اس کا ایک دلچسپ و دلکش سنڈے نمبر شائع کیا کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ وقتاً فوقتاً مختلف قسم کے خاص نمبر علیحدہ نکلتے رہتے ہیں۔ مثلاً کبھی افسانہ نمبر شائع کیا جاتا ہے۔ کبھی بہار نمبر وغیرہ وغیرہ۔ ہمعصر موصوف ہر سال کرشن نمبر بھی غیر معمولی اہتمام کیساتھ شائع کیا کرتا ہے۔ چنانچہ اس سال کرشن جی کی سالگرہ کے موقعہ پر جو نمبر شائع ہوا ہے وہ بھی بڑے سائز کے ۱۳۲ صفحات پر نہایت آب و تاب کے ساتھ چھاپا گیا ہے اس میں ستّر کے قریب بلند پایہ مضامین نظم و نثر اور متعدد دلچسپ افسانے مشہور اہل قلم کے لکھے ہوئے درج ہیں۔ آٹھ سہ رنگی تصویریں اور نو دلچسپ کارٹون بھی شامل ہیں۔ غرض یہ نمبر بہت سی دلچسپیوں کا مخزن ہے۔ قیمت صرف چار آنہ جو اس دلچسپ مجموعہ کیلئے کسیطرح زیادہ نہیں کہی جا سکتی ہے۔

رسالہ چاند کا "سماج نمبر"

ہندی کے مشہور ہندی رسالہ چاند نے اپنی سولہویں سالگرہ کے موقع پر نومبر ۱۹۳۷ء کا پرچہ "سماج نمبر" کے نام سے شائع کیا ہے جسمیں معاشرت و تمدن کے متعلق چھوٹے بڑے ترپن مضامین نظم و نثر ہیں۔ شری گوپال سرن سنگھ، آرسی پرشاد سریواستو، مسٹر رام بابو سکسینہ، شری جنیندر کمار، رسشب داس جین وغیرہ کے مضامین خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ اس نمبر میں ہندی کی مشہور افسانہ نگار شریمتی شیورانی دیوی کا ایک افسانہ "بلیدان" بھی شائع ہوا ہے۔ روزمرہ زندگی کے کارٹون پیش کرنے میں چاند ہندی کے دوسرے رسالوں سے پیش پیش رہتا ہے چنانچہ اس نمبر میں بھی تیئس ۲۳ کارٹون اور تین رنگین تصویریں شامل ہیں۔ اس رسالہ کا حجم ۱۶۰ صفحات ہے۔ قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول۔ چاند کے خریداروں کیلئے یہ نمبر مفت ہے۔ ملنے کا پتہ:۔ منیجر چاند الہ آباد

رفتارِ زمانہ

بین الاقوامی سیاسیات پر ایک سرسری نظر

۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم کی تباہ کاریوں کو دیکھتے ہوئے عام خیال یہ تھا کہ اب دُنیا عرصۂ دراز تک جنگ سے گریز کرے گی۔ لیکن اکثر ناظرین یہ سُنکر حیران ہونگے کہ ۱۹۱۸ء سے ابتک دُنیا کے مختلف حصوں میں چھوٹی بڑی ۲۴ جنگیں ہو چکی ہیں۔ اور اسپین و چین میں تو اسوقت بھی بڑی خونریز جنگ ہو رہی ہے - یہ کشت و خون یا آئندہ جو لڑائیاں ہونیوالی ہیں وہ سب بالواسطہ یا بلاواسطہ ۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم کا نتیجہ ہیں

بات یہ ہے کہ جنگِ عظیم میں جب جرمنی اور اس کے حلیفوں کو شکست ہوئی تو فتحمند اتحادی اندھا دھند مالِ غنیمت کی تقسیم پر ٹوٹ پڑے۔ ٹرکی اور جرمنی کے مقبوضات کے حصّے بخرے کرئیے گئے۔ جرمنی، روس اور آسٹریا کے حصّے چھین کر آزاد و خودمختار پولینڈ بنا دیا گیا۔ جرمنی اور آسٹریا کے مشرقی حصّوں کی قطع و برید کرکے ایک نئی جمہوری سلطنت زیکوسلاویکیا کے نام سے قائم کر دیگئی۔ مانٹی ہنگرو، آسٹریا اور ہنگری کے بہت سے علاقے چھین کر سربیا سے ملحق کر دئے گئے اور اس وسیع و جدید سلطنت کا نام یگوسلافیہ رکھا گیا۔ بیسا ربیہ کا علاقہ چھین کر رومانیہ کو دیدیا گیا۔ ایشیا میں عراق و فلسطین پر انگریزوں نے قبضہ کر لیا۔ مُلک شام فرانس نے دبا لیا۔ اور جرمنی کے تمام جزیرے جو بحرالکاہل میں خط استوا سے اوپر تھے اور جنکی تعداد ڈیڑھ ہزار کے قریب ہے، جاپان کو دیدئے گئے۔ اور خطِ استوا کے جنوب میں جو جرمن جزیرے تھے وہ آسٹریلیا و نیوزی لینڈ کے ماتحت کر دئے گئے۔ لیکن اٹلی کو کچھ نہ دیا گیا۔ جو اِس بے انصافی اور خود غرضی پر اتحادیوں سے ہمیشہ ناراض رہا۔

اِس تقسیم کے بعد یوروپ کی بڑی سلطنتوں میں دُو فریق ہوگئے یعنی ایک طرف برطانیہ اور فرانس اور دوسری طرف وہ سلطنتیں جنھیں یا تو کچھ نہیں دیا گیا یا جن کے پاس کچھ نہیں چھوڑا گیا تھا۔ مثلاً اٹلی اور جرمنی۔ اُدھر امریکہ نے جاپانیوں کا اپنے ملک میں آنا بند کر دیا۔ جس کی روز افزوں آبادی اور صنعت و حرفت کی ضرورتیں پوری کرنے کیلئے چھوٹے چھوٹے جزیرے جنہیں زیادہ تر ویران ہیں، کسی طرح کافی نہیں ہو سکتے تھے۔ اِسطرح جاپان بھی اٹلی و جرمنی کے حلیفوں میں داخل ہو گیا۔ اور یہ سب سلطنتیں اندر ہی اندر اپنی جنگی طاقت بڑھانے میں مصروف ہوگئیں بالآخر جرمنی نے رفتہ رفتہ اپنی قوت بڑھاکر اپنے علاقے روہر اور وادی رائن آزاد کرالئے اور عہدنامہ وارسائی کو جس نے جرمنی کو تباہ و ذلیل کر دیا تھا، پھاڑ کر ردی کی ٹوکری میں پھینک دیا۔ جاپان نے شمالی چین پر حملہ کرکے منچوریا، جیہول اور چاہار کے صوبے دبا لئے۔ اِس کے بعد اٹلی کا نمبر آیا۔ چالیس برس سے اس کا دانت مُلک حبش پر تھا۔ چنانچہ اُس نے

اطالوی سمالی لینڈ اور حبش کی سرحد پر بمقام الوال بخود بخود جھگڑا اٹھا کر ملک حبش پر حملہ کردیا۔

اٹلی کے حبش پر حملہ کرنے کیوقت بعض بین الاقوامی پیچیدگیاں پیدا ہوئیں۔ ایک تو یہ کہ حبش خود لیگ اقوام کا ممبر تھا۔ جس پر اٹلی کو لیگ کا ممبر ہوتے ہوئے حملہ نہ کرنا چاہیئے تھا۔ اور حملہ ہونیکی صورت میں لیگ کو حبش کی حمایت میں اٹلی کی مزاحمت کرنا چاہیئے تھی لیکن لیگ اقوام کی طاقت برطانیہ، فرانس، اٹلی و جرمنی کی مجموعی طاقت سے ذرہ بھر زیادہ نہیں ہے۔ دوسری چھوٹی چھوٹی سلطنتیں انھیں سلطنتوں کے اشارہ پر کام کرتی ہیں۔ اٹلی نے در پردہ فرانس اور جرمنی کو ملالیا تھا۔ برطانیہ نے حبش کے حملہ کے سلسلہ میں اٹلی کی غرور مخالفت کی لیکن فرانس وغیرہ دوسری سلطنتوں نے اُس کا ساتھ نہیں دیا۔ اسطرح لیگ اقوام کے چونتیس ممبروں کی زبانی مخالفت کے باوجود اٹلی نے حبش کو بزور شمشیر فتح کرلیا۔ مگر حبش کے فتح و الحاق کے بعد بین الاقوامی تعلقات میں ایک نئی پیچیدگی یہ پیدا ہوگئی کہ جرمنی لیگ سے علیحدہ ہوگیا۔ برطانیہ اور اٹلی کے درمیان ناچاقی پیدا ہوگئی جس کا سلسلہ ابتک قائم ہے اور اِس کا نتیجہ آئندہ بُرا نکلنے کا اندیشہ ہے۔

حبش فتح کرنے کے بعد اٹلی کو سب سے پہلے یہ فکر دامنگیر ہوئی کہ اگر وہ اپنی جدید فتوحات سے فائدہ اُٹھانا چاہتا ہے تو اُسے اپنے لئے حبش کا راستہ اُسی طرح محفوظ کرلینا چاہیئے جیسے کہ بحیرۂ روم میں برطانیہ نے ہندوستان کا اور فرانس نے شمالی افریقہ کا راستہ محفوظ کر رکھا ہے۔ اسوقت بحیرۂ روم میں برطانیہ کے تین بحری مستقر ہیں۔ جبرالٹر، مالٹا، اور اسکندریہ۔ انھیں سے اگر جبرالٹر اور اسکندریہ کا اثر زائل کردیا جائے تو مالٹا کا اثر خود بخود زائل ہوجاتا ہے چنانچہ اٹلی نے ایسا ہی کیا ہے اور اٹلی کی خوش قسمتی سے واقعات نے بھی اُس کے ساتھ موافقت کی ہے کیونکہ اٹلی بحیرۂ روم پر قبضہ جمانے کی فکر ہی میں تھا کہ اسپین میں خانہ جنگی شروع ہوگئی۔ اٹلی کو جبرالٹر کا توڑ کرنیکا اس سے اچھا موقعہ نہیں مل سکتا تھا۔ چنانچہ اُس نے اِس خداداد موقعہ سے فوراً فائدہ اٹھایا اور جرمنی کے ساتھ ملکر باغیوں سے بعض خاص عائد حاصل کرکے باغی جنرل فرانکو کو مدد دینا شروع کردیا۔ سامانِ جنگ، رسد اور نقد کے علاوہ اٹلی اور جرمنی نے اپنے ہزاروں باقاعدہ سپاہی "والنٹیر" بنا کر اسپین میں اُتار دئے۔ جس کا معاوضہ یہ ملا کہ اٹلی کو شمالی افریقہ کی ہسپانوی بندرگاہ سیوٹا میں جو جبرالٹر کے عین مقابل ہے قلعہ بندی اور توپیں نصب کرنیکا موقعہ ملگیا۔ دوسری طرف اُسے جزائر بلیارتیق میں بحری مستقر قائم کرنے کی اجازت مل گئی۔ جبرالٹر کے دونوں طرف دو زبردست بحری مستقر قائم کرکے اٹلی نے جبرالٹر کی تمام اہمیت خاک میں ملادی۔ اسکندریہ کے مقابلہ میں بھی اٹلی نے اُن بارہ جزیروں میں جو ساحل ایشیائے کوچک کے سامنے ہیں اور جنھیں اُس نے جنگ طرابلس میں ترکوں سے فتح کیا تھا۔ ایک نہایت زبردست بحری مستقر قائم کرلیا۔ بحیرۂ روم کے مشرق اور مغرب دونوں حصوں کی اِس طرح ناکہ بندی ہوجانیسے برطانوی اقتدار کو بہت صدمہ پہونچا ہے۔ اور اگرچہ بظاہر اٹلی اور برطانیہ میں کوئی جنگ نہیں ہے لیکن دونوں کی حالت اسوقت دشمنوں کی سی ہورہی ہے برطانوی بحری حلقوں میں بحیرۂ روم میں اٹلی کے بڑھتے ہوئے اقتدار پر تشویش کا اظہار کیا جارہا ہے۔ اور برطانیہ کی اِس قوت

یہ کوشش ہورہی ہے کہ اگر کسی وقت جنگ چھڑ جائے اور بحیرۂ روم کا راستہ مخدوش ہو جائے تو برطانیہ کیلئے جنوبی افریقہ کے گرد ہوکر جانے والے مشرقی راستہ کو ابھی سے محفوظ کرلیا جائے۔ چنانچہ اُس کے متعلق تیاریاں شروع ہو گئی ہیں۔

اٹلی کا حبش پر قبضہ کرنا خالی از علت نہیں تھا۔ مسولینی دُنیا میں مقدس سلطنت روما کو از سرِ نو قائم کرنے کی کوشش میں ہے۔ چنانچہ اِس کیلئے اُسے بیحد فوج اور سامانِ جنگ کی ضرورت ہے۔ اور یہ دونوں چیزیں اُسے حبش میں مل سکتی ہیں۔ کیونکہ حبش کی سرزمین ہر قسم کی قدرتی دولت سے مالامال ہے اور حبش سے دس لاکھ حبشیوں کی فوج بہت آسانی سے فراہم کیجا سکتی ہے۔ اٹلی اِس فوج سے مصر، سوڈان اور کینیا کو تہ و بالا کرسکتا ہے اور اسکی امداد سے یورپ میں بھی جنگ کرسکتا ہے۔

لیکن جب تک اِس کا قبضہ و تسلط بحیرۂ روم پر نہ ہو یہ عظیم الشان لشکر اُس کے کام نہیں آسکتا۔ اور چونکہ بحیرۂ روم ہی برطانیہ کے مشرقی مقبوضات میں آنے کا قریب ترین راستہ ہے۔ اِسلئے وہ اس پر کسی دوسری سلطنت کا اقتدار گوارا نہیں کرسکتا۔ ادھر اٹلی کا یہ خیال ہو رہا ہے کہ اگر جنگ عظیم میں ترک اپنی توپوں سے دردانیال کا راستہ بند کرسکتے تھے تو وہ بھی جنگ کی صورت میں جبرالٹر کا راستہ بند کرسکتا ہے۔

غرض حبش اور اسپین کے متعلق فرانس اور برطانیہ کی کمزور پالسی کا یہ نتیجہ نکلا کہ فسطائی سلطنتوں یعنی جرمنی اٹلی اور جاپان کے دلوں سے فرانس و برطانیہ کا خوف بہت کم ہوگیا اور تھوڑا سا خوف جو رہ گیا ہے اُس کے توڑ کیلئے جرمنی، اٹلی اور جاپان نے آپسمیں ایک معاہدہ کرلیا ہے۔ جس کے بعد موسولینی نے بانگ دہل یہ اعلان کیا کہ اسوقت فسطائی سلطنتوں کے پاس بیس کروڑ آبادی اور بیس لاکھ ٹن بحری بیڑے ہیں۔ حالانکہ حساب لگاکر دیکھا جائے تو امریکہ و برطانیہ کے تیس لاکھ ٹن بحری بیڑوں کے مقابلہ میں جرمنی، اٹلی اور جاپان کے بیڑوں کی کوئی حقیقت نہیں ہے ویسے بھی اٹلی لاکھ کوشش کرے، بحری طاقت میں وہ امریکہ و برطانیہ سے بازی نہیں لے جا سکتا۔

حبش اور اسپین میں اٹلی و جرمنی کی برطانیہ و فرانس سے کشیدگی دیکھکر جاپان کو بھی اطمینان ہوگیا کہ انہیں سے کوئی طاقت چین کی مدد کرنے کو نہیں آسکتی۔ لہٰذا اُس نے بلاوجہ اور بغیر اعلانِ جنگ چین پر حملہ کردیا۔ اور چونکہ چین کو کسی دوسری سلطنت سے کوئی مدد نہیں ملی، اِس لئے پانچ ہی چھ ماہ کے عرصہ میں جاپان نے چین کا بہت حصہ فتح کرلیا ہے۔

چین پر جاپان کے حملے کے دو مقصد ہیں اول یہ کہ چین پر جاپان اپنی بالادستی قائم کرنا چاہتا ہے۔ دوسرے اُسے چین سے تمام دوسری سلطنتوں کا اثر و اقتدار زائل کرنا مقصود ہے تاکہ اِس عظیم الشان خطہ کے متعلق آیندہ کوئی طاقت کچھ دخل نہ کرسکے، اور جاپان کو چین میں کسی دوسری سلطنت سے سامنا نہ کرنا پڑے۔ جاپان کے یہ دونوں مقاصد رفتہ رفتہ پورے ہو رہے ہیں۔ چین میں امریکن جہاز ڈبوتے گئے۔ برطانوی سفیر زخمی ہوگیا۔ دریائے یانگسی میں انگریزی جہازوں

پر بمباری کی گئی - اور تازہ ترین خبروں کے مطابق جاپان نے شنگھائی سے غیر ملکیوں کو بالکل بیدخل کرنے کا تہیہ کر لیا ہے چنانچہ حال ہی میں جاپانی سپاہیوں نے انگریز پولس افسروں کو ملدیٹ کیا - جس کی وجہ سے شنگھائی کا انگریز پولس سپرنٹنڈنٹ مستعفی ہو گیا، اور جاپانی بحری سپاہیوں نے بین الاقوامی بستی میں گھس کر ایک برطانوی ہوٹل پر چھاپہ مارا اور یونین جیک کی جگہ جاپانی جھنڈا لگا دیا۔ مگر برطانیہ کی طرف سے ابھی تک شدید احتجاج کے سوا اور کچھ نہیں کیا گیا ہے جاپان اِس وقت کسی احتجاج کی پروا کرتا نظر نہیں آرہا ہے کیونکہ ایک دفعہ معافی مانگنے کے بعد بھی جاپان کی طرف سے برابر اشتعال انگیز واقعات رونما ہو رہے ہیں -

غالباً انھیں واقعات سے متاثر ہو کر اخبار "مانچسٹر گارڈین" نے لکھا ہے کہ اگر اس وقت بھی یوروپین طاقتوں نے جو تقریباً سو برس سے چین سے فائدہ اُٹھاتی رہی ہیں، چین کی مدد نہ کی تو ان کی پوزیشن نہ صرف مشرق اقصےٰ بلکہ تمام ایشیا میں کمزور ہو جائے گی -

مشرقِ اقصےٰ میں زیادہ تر تعلقات برطانیہ، فرانس اور ہالینڈ کے ہیں - اِس لئے اگر تینوں سلطنتوں نے ابھی سے جاپان کی روک تھام نہ کی تو پھر موقعہ نہ ملے گا - کیونکہ یوروپ میں اگر جرمنی کا فتنہ اُٹھا تو وہ یقیناً سب سے زیادہ ہولناک ثابت ہوگا -

جرمنی کو جسقدر صلح میں زیر کرنے کی کوشش کی گئی تھی اُسی کا نتیجہ یہ نکلا کہ اُس نے رفتہ رفتہ اپنی جنگی طاقت بڑھا کر عہدنامہ وارسائی کو پارہ پارہ کر دیا - اور اب وہ اپنی نوآبادیوں کی واپسی کیلئے جو فرانس و برطانیہ کے قبضہ میں ہیں، بار بار تقاضا کر رہا ہے - انھیں نوآبادیوں کے سلسلہ میں جرمنی نے اسپین کے باغیوں کی مدد کر کے ہسپانوی مراکش میں اپنے پاؤں جمائے ہیں اور جرمن اور اطالوی ایجنٹوں نے مراکش، الجزائر اور ٹیونس میں فرانس کے خلاف پروپیگنڈا کر کے شورش برپا کرا دی ہے ادھر اٹلی نے ریڈیو کے ذریعہ برطانیہ کے تمام عرب مقبوضات میں برطانیہ کے خلاف عربی زبانمیں پروپیگنڈا شروع کیا ہے - اُس کا ردِ عمل ہو رہا ہے، لیکن اگر جرمن نوآبادیوں کا کوئی خاطر خواہ تصفیہ نہ ہو سکا تو جرمنی برطانیہ و فرانس کیلئے طرح طرح کی مشکلات پیدا کرنے کی کوشش کرے گا -

اس کے بعد کیا ہوگا؟ یہ کہنا مشکل ہے لیکن اِسوقت مدبرین عالم انھیں پیچیدگیوں کے سُلجھانے میں مصروف ہیں - نیا سال ہولناک جنگ کا سال ہوگا یا امن و امان کا، اس سوال کا اصلی جواب تو آئندہ واقعات ہی دینگے لیکن اس کے جواب سے ہندوستان بھی دیر تک بے تعلق نہیں رہ سکتا ہے - خیر کچھ ہو، ہمارے نقطۂ خیال سے اِس سوال کو مستقل طور سے حل کرنے کے لئے ہندوستان اور برطانیہ کے مابین جو غلط فہمیاں پیدا ہو گئی ہیں، اُنھیں جلد سے جلد رفع ہو جانا چاہئیے -

---

زمانہ کا پینتیواں سال

زمانہ کی زندگی کا پینتیواں سال بھی عنقریب ہی ختم ہونے والا ہے۔ فروری ۱۹۰۳ء سے اس کی اشاعت شروع ہوئی تھی۔ چند ہی ماہ بعد یعنی نومبر ۱۹۰۳ء سے اِسکی پوری ذمہ واری موجودہ ایڈیٹر پر ہے۔ چنانچہ ہمیں اِس خدمت کو بُری بھلی طرح انجام دیتے ہوئے پورے چونتیس سال ہوگئے۔ اِس لمبی مدت میں زمانہ کو جن جن مشکلات سے سامنا ہوا۔ اور جس کوشش سے اس کی نہ صرف زندگی قائم رکھی گئی بلکہ اُس کے مقررہ معیار کو بھی برقرار رکھا گیا۔ اُس کا خیال ہمارے لئے بہت اطمینان بخش ہے اور ہمکو اُمید ہے کہ یہ دونوں باتیں قدرشناساں رسالہ کے لئے بھی باعثِ مسرت ہیں۔ زمانہ کی خصوصیات میں ہمارے ناظرین و معاونین کی مسلسل عنایت کو بہت بڑا دخل ہے۔ اسی لئے جہاں ایک طرف اُردو دان جماعت کی بے حسی کا رونا ہے جس کی وجہ سے اتنی مدت دراز کے بعد بھی ہم اپنے شوق و حوصلہ کے مطابق زمانہ شائع نہیں کرسکتے ہیں۔ وہاں ہم پر اپنے سرپرست و قدردان معاونین کی شکرگذاری بھی واجب ہے۔ جنکی قلمی و مالی اعانت کے بغیر رسالہ کا ایک پرچہ بھی مکمل نہیں ہوسکتا۔ محدود اشاعت کی وجہ سے ہم نہ اب تک زمانہ کے حجم میں اضافہ کرسکے اور نہ اور بہت سی خصوصیات کو جو شروع سے ہمارے ذہن میں ہیں رسالہ کا مستقل جزو بناسکے۔ مگر یہ بات بھی کچھ کم فخر کی نہیں ہے کہ جس بلند معیار اخبار نویسی کو پیشِ نظر رکھکر آج پینتیس سال ہوئے زمانہ کی اشاعت کی ذمہ واری اپنے سر لی گئی تھی، وہی اعلےٰ معیار اب بھی ہمارے اور تمام کارپردازان کے روبرو ہے۔ اِس معیار کی عام مقبولیت اور زمانہ کی ادبی خدمات کی قدردانی کی سب سے بڑی یہ دلیل ہے کہ زمانہ کے بیشتر مضامین نظم و نثر بہترین اُردو اخبارات و رسائل میں (اکثر بلا حوالہ) نقل ہوتے رہتے ہیں۔ اور بعض پرچوں میں تو زمانہ کی پُرانی جلدوں سے بھی خوشہ چینی ہوتی رہتی ہے۔ چنانچہ وقتاً فوقتاً ہماری توجہ اسطرف مبذول ہوتی رہتی ہے۔ ابھی چند ہی روز ہوئے کہ مکرمی محمود اسرائیلی صاحب نے بمبئی سے اِس بات پر اظہار مسرت کیا ہے کہ:۔

"اُردو کے چوٹی کے رسالے بھی زمانہ کے مضامین نظم و نثر سے مزین نظر آتے ہیں۔ چنانچہ عالمگیر کے خاص نمبر ۱۹۳۷ء اور پچھلے نظام المشائخ وغیرہ میں زمانہ کے مطبوعہ مضامین نکلے ہیں۔"

بہت سے اور پرچوں میں بھی زمانہ کے مضامین قدر کیساتھ نقل ہوتے رہتے ہیں۔ اِس سے یہی ثابت

ہوتا ہے کہ زمانہ کی ادبی خدمت ملک میں مقبول عام ہے۔ غرض بعض احباب کو اس بات کے علانیہ اعتراف میں خواہ کتنا ہی بخل ہو، لیکن اُردو رسائل میں ناچیز زمانہ کو ایک خاص پوزیشن حاصل ہو گئی ہے جسکو وہ برابر قائم کئے ہوئے ہے اور اگر ہمارے ناظرین توسیع اشاعت کیطرف ذرا بھی توجہ دیں تو اس پوزیشن میں بہت خاطر خواہ اضافہ ہو سکتا ہے۔

ہم نے پچھلے سال بھی عرض کیا تھا اور اب بھی استدعا کر رہے ہیں کہ قدر شناسان زمانہ کو یہ ضرور سوچ لینا چاہئے کہ زمانہ کے لئے صرف یہی کافی نہیں ہے کہ وہ اسکی خریداری جاری رکھیں بلکہ اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ وہ اپنے علم دوست احباب سے بھی اس کی سرپرستی کی سفارش کریں۔ ہم خود جہاں تک توسیع اشاعت کی جدوجہد کا تعلق ہے، بہت ہی ناقابل واقع ہوئے ہیں مگر ضروریات زمانہ کسی کی قابلیت یا ناقابلیت کی پابند نہیں ہیں۔ توسیع اشاعت کے بغیر نہ رسالہ کے انتظامی نقائص ہی کما حقہ درست ہو سکتے ہیں اور نہ اس کے استحکام و استقلال کے متعلق ہماری کوئی تجویز کامیاب ہو سکتی ہے۔

اس خدمت کو چونتیس ۳۴ سال تک مسلسل جاری رکھنے کے بعد دل تو یہی چاہتا ہے کہ زمانہ کی زندگی کسی شخص واحد پر منحصر نہ رہے بلکہ وہ خود اپنے ادبی خادموں کی ضروریات زندگی کا کفیل ہو۔ ابھی یہ حالت دُور ہے لیکن ہمارے مہربانوں کی (جنکو ہمارے مقاصد و طریق عمل سے ہمدردی ہے) عنایت و توجہ سے سب کچھ ممکن ہے۔ زمانہ کے قدر دانوں کا حلقہ ایسا محدود نہیں ہے کہ اگر ہمارے مہربان چاہیں تو زمانہ کے استقلال کا پورا سامان نہ ہو سکے۔

ہم نے اس سال اپنے محب و مکرم فراق صاحب و مدہوش صاحب کو اعزازی حیثیت سے ایڈیٹوریل اسٹاف میں شامل کرنا چاہا تھا۔ دونوں صاحب زمانہ کے خاص معاون ہیں۔ اور دونوں صاحبوں نے اپنے اپنے طور پر ہمارا ہاتھ بٹانے کی کوشش کی۔ مگر بعض خلاف اُمید موانع ایسے حائل ہو گئے جنکی وجہ سے جو انتظام سوچا گیا تھا قائم نہ رہ سکا۔ ہم کو اب بھی بھروسہ ہے کہ جب کبھی ضرورت ہوگی وہ زمانہ کی زندگی قائم رکھنے کی پوری کوشش کرینگے فراق صاحب کی شاعری دلوں میں ایک خاص جگہ پیدا کر رہی ہے اور وہ خود ہر وقت شعر و سخن کی پُر لطف دنیا میں زندگی بسر کرتے ہیں۔ مدہوش صاحب سچے رضا کار ہیں اور خدمت خلق ہی میں اپنی عمر تمام کر دینا چاہتے ہیں۔ جتنے مضامین اُنھوں نے زمانہ میں لکھے ہیں وہ سب ملک کے بڑے بڑے اخباروں و رسالوں میں بڑی قدر کیساتھ نقل ہوئے۔ دراصل جس موضوع پر وہ قلم اُٹھاتے ہیں، اس پر پہلے ہی سے اسقدر غور و مطالعہ کر لیتے ہیں کہ اُس کے متعلق کوئی بات اُن سے قلم انداز نہیں ہونے پاتی۔ آجکل اُن پر پبلک خدمات کا غیر معمولی بار ہے، ورنہ وہ ہر ماہ رسالہ کے لئے ایک مضمون لکھنے کا وعدہ کر چکے ہیں۔

زمانہ کے دیگر قلمی معاونین بھی جنھوں نے اس سال اپنے بہترین مضامین نظم و نثر سے ہماری قلمی امداد فرمائی، ہمارے دلی شکریہ کے مستحق ہیں۔ انمیں بہت سے صاحب ایسے ہیں جو مضامین کی تیاری میں اپنے وقت عزیز

کا بہت کافی حصہ صرف کرتے رہتے ہیں۔ اِن سب معاونین کا نام بنام شکریہ ادا کرنا تو ناممکن ہے۔ اِس لئے یہاں پر صرف اِسقدر لکھنا کافی ہوگا کہ زمانہ کو ان احباب پر جتنا ناز ہو کم ہے۔ اُردو ادب کی اصلی ترقی انھیں اصحاب کی بدولت ہو رہی ہے۔

پچھلے سال ہم نے اپنے رفیق محترم منشی پریم چند کی یادگار میں زمانہ کا ایک خاص نمبر شائع کرنے کا اعلان کیا تھا۔ ہم اُسے دسمبر ۱۹۳۶ء کے پرچے کے بجائے اپریل ۱۹۳۷ء میں شائع کرنا چاہتے تھے لیکن بعض اہم مضامین جو اس نمبر کے لئے خاص طور پر لکھائے گئے تھے۔ اِسقدر جلد تیار نہ ہو سکے اور اُن کی تعداد و حجم میں بھی اِسقدر اضافہ ہو گیا کہ ہمکو جون ۱۹۳۷ء کے پرچے کو بھی اسی نمبر میں شامل کرنا پڑا۔ مگر ایڈیٹر کی خرابی صحت اور بعض دیگر وجوہ سے اِس نمبر کی اشاعت میں غیر معمولی تاخیر ہو گئی۔ مگر اب شکر کا مقام ہے کہ ہماری محنت ٹھکانے لگی اور یادگار پریم چند اپنی تمام خصوصیات کے ساتھ تیار ہو گیا ہے اور اِس نمبر کیساتھ ہی شائع ہو رہا ہے اِس نمبر میں خاص مضامین کے ۲۵۶ صفحات کے علاوہ نو تصاویر بھی ہدیۂ ناظرین کی گئی ہیں۔ اِسطرح یہ نمبر جو دو پرچوں (دسمبر ۱۹۳۶ء و جون ۱۹۳۷ء) کے بجائے شائع ہو رہا ہے حجم کے اعتبار سے چار پرچوں کے برابر ہے۔ ہم کو اُمید ہے کہ ناظرین اسے ملاحظہ فرما کر یہ ضرور محسوس کریں گے کہ کارپردازانِ رسالہ نے اپنے ذمہ بقایا کو اصل مع سُود ملا کر ادا کر دیا ہے۔ پریم چند کے احسانات و رفاقت کا حق ہم سے ادا ہوا ہو یا نہ ہو، لیکن یہ خیال کہ زمانہ نے اپنے نامور انشاپرداز کی قابل قدر زندگی کا حتی الوسع ایک مکمل مرقع پیش کر دیا ہے، ذاتی حیثیت سے ہمارے لئے بہت تسکین بخش ہے۔ ہم کو اُمید ہے کہ جب کبھی پریم چند کی مفصل سوانح عمری لکھنے کا وقت آئے گا تو اُس کا مصنف زمانہ کے یادگار پریم چند کو کسی طرح نظر انداز نہ کر سکیگا۔

بہر حال اِس نمبر کی اشاعت کے ساتھ ناظرین کا حساب بیباق ہو جائے گا۔ اب رہا تاخیر اشاعت کا سوال اس کیلئے ہم تہ دل سے عذر خواہ ہیں۔ مگر اس کی اصلی ذمہ داری شائقین ہی پر ہے کیونکہ جب تک رسالہ کی خاطر خواہ اشاعت نہیں ہوگی۔ انتظامی مشکلات پر پورے طور پر حاوی آنا ناممکن رہیگا۔ تاہم آیندہ سال ہم اس شکایت کو رفع کرنے کی پوری کوشش کریں گے۔ اور اگر تائید ایزدی شامل حال رہی اور ہمارے احباب نے تھوڑی سی بھی توجہ کی تو یہ نقص جلد رفع ہو جائے گا۔ جنوری نمبر زیر طبع ہے اور عنقریب حاضر خدمت ہوگا۔ اس کے بعد ہم کوشش کر رہے ہیں کہ ہر ماہ کا پرچہ اُس کے خاتمے سے پہلے ہی شائع ہو جایا کرے۔ ایشور ہمارے ارادوں میں برکت دیں اور ہمارے مہربانوں کو زمانہ کی امداد کی توفیق عطا فرمائیں۔ اسی بھروسہ پر ہم زمانہ کی موجودہ جلد ختم کر رہے ہیں ہماری دلی تمنا ہے کہ:-

نیا سال زمانہ و ناظرین زمانہ کو مُبارک ہو

اگلا صفحہ ضرور ملاحظہ ہو۔

خریدارانِ "زمانہ" کی خدمت میں

ضروری اطلاع

جن صاحبوں کی خریداری جنوری نمبر سے شروع ہوتی ہے اُن کا حساب اِس نمبر سے ختم ہوگیا ہے۔ اور اب آئندہ سال کی قیمت واجب الوصول ہوگئی، لہٰذا اُن صاحبان سے درخواست ہے کہ وہ اِس نمبر کے پہونچتے ہی ایک ہفتہ کے اندر زمانہ کا سالانہ چندہ مبلغ پانچروپیہ بذریعہ منی آرڈر ارسال فرمادیں۔ ورنہ جنوری ۱۹۳۸ء کا رسالہ سالانہ قیمت کے لئے بذریعہ قیمت طلب پیکٹ (V.P.P) ارسال ہوگا۔

قیمت طلب (ویلیو پے ایبل. V.P.P) پیکٹ میں پانچ آنہ کا صرفہ ہوتا ہے کیونکہ ہر ویلیو پے ایبل (V.P.P.) کے لئے رجسٹری ہونا ضروری ہے، اِس لئے دُو آنہ فیس منی آرڈر کے علاوہ تین آنہ (۳) رجسٹری فیس بھی ادا کرنی پڑتی ہے۔ منی آرڈر سے قیمت بھیجنے والے اصحاب کو تین آنہ کی کفایت ہوسکتی ہے۔

(نوٹ) قواعد ڈاکخانہ کی رُو سے ویلیوپے ایبل پیکٹ ایک ہفتہ سے زائد ڈاکخانہ میں امانت نہیں رہ سکتے ہیں۔ اِس لئے استدعا ہے کہ جو صاحبان منی آرڈر کے ذریعہ قیمت نہ بھیجیں، وہ براہِ مہربانی جنوری نمبر کا قیمت طلب پیکٹ فوراً ہی وصول فرمالیں، ڈاکخانہ میں پڑا نہ رہنے دیں۔

منی آرڈر بھیجنے والے اصحاب کوپن میں اپنا پورا نام و پتہ مع خریداری نمبر صاف و خوشخط تحریر فرمائیں، تاکہ رجسٹر میں رقم مرسلہ کا صحیح اندراج ہوسکے۔

جن صاحبان کو آئندہ خریداری جاری رکھنا منظور نہ ہو، وہ براہِ کرم اِس نمبر کے پہونچنے کے بعد فوراً ہی اطلاع دیدیں تاکہ اُن کی خدمت میں جنوری ۱۹۳۸ء کا رسالہ نہ بھیجا جائے اور وہ قیمت طلب پیکٹ (V.P.P) کی واپسی کی زحمت سے اور دفتر زمانہ مُفت کے نقصان سے محفوظ رہے۔

جنوری سے رسالہ کی نئی جلد شروع ہوگی۔ نئے خریداروں سے پریم چند نمبر کی قیمت ایکروپیہ علاوہ محصول لیجائے گی۔

مینجر زمانہ کانپور